ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ کراچی
فروری 2016

جلد 46 • شمارہ 02 • فروری 2016 • زرِ سالانہ 800 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 60 روپے •
خط و کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 229 کراچی 74200 • فون (021) 35895313 فیکس (021) 35802551 E-mail:jdpgroup@hotmail.com

مدیر اعلیٰ
عذرا رسول

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ، کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

عزیزانِ من... السلامُ علیکم!

سردی کا موسم ہے اور اس کے اعزاز میں فروری کا حرارت آفریں شمارہ پیشِ خدمت ہے۔ آج ہم عالمِ اسلام میں جدھر نظر اٹھائیں، فتنہ پروری اور خوں ریزی کا ہولناک سماں نظر آتا ہے۔ مرنے والے اور مارنے والے، دونوں بزعم خود اسلام کے نام لیوا ہیں۔ ہر فریق کا مذہب ایک ہے لیکن تاویلیں مختلف بلکہ یکسر متضاد۔ دوسروں نے امت کے ساتھ جو کیا، سو کیا مگر اب وہ صرف تماشائی ہیں۔ سازشوں اور سرمائے کے بل بوتے پر ایسے خون آشام فتنوں کی آبیاری کی گئی ہے کہ اب باہر سے کسی کو کچھ کرنے کی ضرورت نہیں رہی۔ ہم آپس میں ہی لڑلڑ کر لہولہان اور نڈھال ہوئے جارہے ہیں اور دور دور تک ایسا کوئی مسیحا نظر نہیں آتا جو اس ستم گری کا مداوا کر سکے۔ مجموعی طور پر امت ایک نامعلوم مگر ناگوار انجام کی طرف بڑھی جارہی ہے۔ مسلمانوں کے دشمنوں نے توپ و تفنگ چھوڑ کر قلم کے نشتر سنبھال لیے ہیں۔ انہوں نے اعدادوشمار اور تحقیق و تجزیے کے سہارے یورپ میں یہ دہشت پھیلانی شروع کردی ہے کہ مسلمانوں میں نسلی افزائش کی بلند اور بڑھتی ہوئی شرح کے نتیجے میں وہ آنے والے پندرہ بیس برسوں میں پورے یورپ پر چھا جائیں گے اور دوسرے مذاہب کے ماننے والے معدومیت کا شکار ہونے لگیں گے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ ایسا خطرناک اشاریہ ہے کہ اس پر قابو پانے کی کوششیں جب بھی شروع کی گئیں تو نتائج کے ابتدائی آثار آنے میں بھی کم از کم تیس برس لگیں گے۔ حریفوں کا یہ خوف اور ہماری باہمی آویزش... دونوں متضاد سمتوں کی نشان وہی کرتی ہیں۔ ربّ العالمین سے بس دعا ہی کی جاسکتی ہے کہ امت کے رہنماؤں اور سرکردہ لوگوں کو ہدایت عطا فرمائے کہ وہ سر جوڑ کر محبت اور اخوت کی سازگار فضا تیار کر سکیں۔ غنیمت ہے کہ ہماری محفل میں یہ مطلوب فضا اب بھی موجود ہے۔ دیکھتے ہیں وہاں کیا ہو رہا ہے۔

میانوالی سے احسان سحر کی شبنمی باتیں ”نئے اور بدلتے دنوں کا جاسوسی کچھ لیٹ ملا۔ جاسوسی کے ٹائٹل تک آنکھوں کی روشنی پہنچی۔ پھول کی کشش خوب صورتی نہیں...... خوشبو ہوتی ہے۔ ایسا ہمیں ٹائٹل میں بھی نظر آیا۔ حسینہ کی بند ہوتی آنکھوں اور چہرے پر چھائی بے حد خوشی سے یہ واضح تھا کہ اسے گلاب کی خوشبو نے مدہوش کیا ہوا ہے۔ کاش ہم بھی کسی کی خوشبو ہوتے۔ ادارے کا تیخ نما پڑھا۔ جو کہ ہمارا آئینہ ہے۔ جسم میں خرابی یا خرابیاں پیدا ہو جائیں تو خود ہی ٹھیک کرنی پڑتی ہیں۔ اسی طرح حالات بھی ہمیں خود ہی ٹھیک کرنے ہوں گے۔ قدم سے قدم ملا کر چلانا ہوگا۔ شرط یہی ہے کہ پہلے خود کی اصلاح کریں۔ بہکے بہکے قدموں سے آگے بڑھے۔ ارے بھئی ہم نے کوئی نشہ نہیں کیا ہوا۔ یہ تو اندر کی خوشگواریت ہے جو نشہ بنی ہوئی ہے۔ خوشگواریت بھی تو اندر پیدا ہو کر نچاتی ہے۔ (اچھا!) آسمان پر تاروں کا نزول تھا۔ سب سے نمایاں اور چمکیلا ستارہ جاوید بلوچ تھا۔ آج کل موصوف ہارٹ کیچر بنا ہوا ہے۔ بھئی آپ کی چکاہٹ میں میٹھی روشنی کے بجائے تپش زیادہ تھی۔ آئینہ بھی دکھایا۔ مرحا گل کا تبصرہ اچھا تھا۔ لفظوں میں نرمی تھی شبنم کی طرح۔ صفدر معاویہ بھائی سال کے بے جان دنوں سے اچھی امیدیں رکھنے کے بجائے ہم انسانوں کو چاہیے کہ اچھے بن جائیں۔ غلط جسم نہیں روح بن جاتی ہے۔ یوسف سانول یہی بہت ہے کہ آپ آئے تو سہی اور ہم نے دیکھ بھی لیا۔ اللہ پاک آپ کی والدہ کو صحت کاملہ عطا فرمائے۔ سید عبادت کاظمی کا مٹھاس بھرا انداز اچھا لگا۔ میانوالی سے ریحام صاحب دو ماہ سے ابھی تک گزارشات پر اٹکی ہوئی ہیں۔ محی الدین اشفاق کم لفظوں میں سب کچھ سمیٹتے نظر آئے۔ طاہرہ گلزار اس دفعہ بھی کچھ شوخ تو کچھ سیریس موڈ میں رہیں۔ آوارہ گردکی اس قسط میں حالات نے پھر سے پلٹا کھایا ہے۔ عایدہ کے حوالے سے کیس سلجھنے کے بجائے الجھ چکا ہے۔ اب شہریار کے والد کے حوالے سے نیا محاذ کھل چکا ہے دیکھتے ہیں کیا بنتا ہے۔ مطلبی، یہ بات تو کافی حد تک صحیح ہے کہ دنیا میں لوگ مطلب کی حد تک ہی رشتے نبھاتے ہیں پر حقیقی رشتے ان میں مطلب آ بھی جائے تو کچھ لوگ ڈگمگا جاتے ہیں۔ اور کچھ لوگ ہوش و حواس قائم رکھتے ہیں۔ اچھی کہانی رہی۔ کترنیں بھی خوب رہیں۔ ساتھ کارٹونسٹ نے بھی خوب مزہ دوبالا کیا۔“

ہری پور ہزارہ سے معراج محبوب عباسی کی کہی ان کہی ”رواں برس کا پہلا شمارہ 5 جنوری کو ملا۔ سرورق پر موسم کی مناسبت سے زردی نمایاں اور نئے سال کی مبارک باد بھی موجود تھی۔ سبز رنگ سے بندھے ربن والا پھول سونے پر سہاگہ... بھی اوپر ہے۔ اس بات کا اندازہ کس سرورق کے انہماک سے ہوا کہ وہ اس کی معطر خوشبو میں اس قدر گم تھیں کہ خبر ہی نہ ہوئی کہ ہم موصوفہ کو بمع ڈائجسٹ اٹھا لائے ہیں۔ علی پور سے ہارٹ کیچر کو مبارک باد۔ جناب بیگانی شادی میں دیوانگی کی ریہرسل تو کرنی پڑتی ہے نا، اپنی شادی کے بعد ایک عدد کامیاب دیوانہ بننے کے لیے۔ مرحا گل کچھ باتیں ہر ایک نہیں سمجھ پاتا۔ عبادت بھائی، لگتا ہے کاظمی صاحب کو پڑوسن داغ مفارقت دے گئی ہے۔ ویسے یہ مستند نیوز نہیں، جناب کے جلے کٹے تبصروں سے قیاس آرائی کی ہے میں نے۔ محمد یوسف صاحب ابھی میرے برے دن شروع نہیں ہوئے مالک کا کرم ہے کہ ابھی میں نے لڈو کھایا بھی نہیں اور مزے کی بات پچھتا بھی نہیں رہا... کھائے بغیر۔ ادریس احمد خان کمال ہوشیاری سے ایک جملہ حاضرینِ محفل کے نام کر کے بزمِ کہانی کی طرف کوچ کر گئے۔ لیٹی ریحام آپ لحاف میں گھس کر موبائل پر سانپ والی گیم کھیلا کریں یا پھر ٹارزن کی اسٹوریز پڑھا کریں۔ بشیر احمد بھٹی صاحب یہ سب میرے ساتھ بھی ہوا تھا مگر میں نے بک اسٹال سے متبادل رسالہ حاصل کر کے مسئلہ حل کر لیا۔ (جی سب سے مناسب حل یہی ہے) کہانیوں میں سب سے پہلے کاشف زبیر کی اشارہ پڑھی۔ فنٹاسٹک کاشف انکل۔ ڈھائی گھنٹے کی اسٹوری میں کمال کر دکھایا ہے آپ نے۔ ضیا حامد جیسے لاتعداد کردار اس وقت ہمارے ملک کو دیمک کی طرح چاٹ رہے ہیں۔

مگر ساتھ شبیر شاہ جیسے کردار بھی ہیں اور ان کے سامنے اپنے اصولوں کے بل بوتے پر کبھی نہ جھکنے والے شفیع کے مانند بااصول و باکردار لوگ بھی۔ روبینہ رشید کی دراز دست میں زویا نے کمال بہادری سے اپنی عزیز از جان سہیلی کے قاتل کو اس کے منطقی انجام سے دوچار کرنے میں قانون کی معاونت کی تو عینی نے بھی دوست ہونے کا حق ادا کر دیا۔ خود اپنی جان پر کھیل گئی مگر دوست کو قاتل سے بچالیا۔ آشیانہ! اپنے منظر امام صاحب کی تو کیا بات ہے، ہمارے اردگرد پھیلے مسائل کے انبار کو بے حد خوش اسلوبی سے الفاظ کی ڈور میں پروتے ہیں۔ اس بار بھی اپنے اسی انداز سے لکھا، اور کیا خوب لکھا۔"

پشاور سے ناصر علی کی باتیں "بے شمار چکروں کے بعد جاسوسی کا دیدار 6 جنوری کو ہوا۔ ٹائٹل دیکھے بغیر دوستوں کی محفل میں پہنچا۔ اپنا تبصرہ دیکھ کے دل خوش ہو گیا۔ اس بار ٹائٹل زبردست تھا۔ اوپر 2016ء لکھا نظر آیا، نیچے ایک خوب صورت مشرقی حسینہ نظر آئی۔ آنکھیں بند کر کے ایک صنفِ اسمارٹ کے خوابوں میں گم تھی۔ (آپ ہی تو تھے وہ) ساتھ میں ایک سبز پٹی پر بندھا ہوا گلاب نظر آیا، بہت ہی خوب صورت ٹائٹل تھا۔ اس بار ہارٹ کچر کرسی صدارت پر موجود تھے۔ تبصرہ کافی زبردست لگا۔ مرحا گل تبصرے کے آخر میں کچھ افسردہ نظر آئیں۔ انور یوسف زئی کا تبصرہ کافی مختصر تھا۔ سید عبادت کاظمی آپ کو سید شکیل حسین کی پڑوسن کیسے یاد آگئی۔ عبدالجبار رومی کا تبصرہ بھی زبردست رہا۔ بشیر احمد آپ کی کہانی سن کر افسوس ہوا۔ طاہرہ گلزار باجی آپ کا تبصرہ کافی مفصل اور جاندار لگا۔ آپ کی کہانیوں کا انتظار رہے گا۔ فلک شیر ملک کا تبصرہ کافی جاندار اور حقیقت پر مبنی تھا۔ چوہدری محمد سرفراز کا تبصرہ کافی اچھا لگا۔ کہانیوں میں سب سے پہلے آوارہ گرد پڑھی۔ اس بار شہزی کو بہت ساری پریشانیاں اٹھانا پڑیں آخر میں بھٹی صاحب نے سسپنس برقرار رکھا۔ اس کے بعد انگارے پڑھی..... شاہ زیب نے اصل یاسر کو بھی دیکھ لیا اور شاہ زیب کے گونگے پن کا بھانڈا بھی پھوٹ گیا۔ سرورق کی پہلی کہانی دراز دست ایک خوب صورت تحریر تھی۔ سرورق کی دوسری کہانی اشارہ کاشف زبیر کا بہت زبردست سرورق تھا۔ مجھے دانیال کا کردار بہت اچھا لگا۔ رینا بہت ہمت والی لڑکی تھی جو بم سے نہیں ڈری۔ آج کل لڑکیاں تو چھپکلی سے بھی ڈرتی ہیں۔ جنونی میں سراج بابا کے ساتھ نفسیاتی مسائل تھے۔ وہ اپنے بیٹے کی جگہ کوئی اور نہیں دیکھ سکتا تھا۔ معین بھی اپنی منگیتر سیما کی وجہ سے بچ سکا۔ آشیانہ میں باپ بیٹے کا کردار پسند آیا۔ بہت اچھی کہانی ہے۔ پچھلے لمحے بہت اچھا ناول تھا۔ میں بہت کم ہی انگلش ناول پڑھتا ہوں۔ امجد رئیس صاحب کے ناول سسپنس سے بھرپور ہوتے ہیں۔"

جہلم سے نوال اینڈ مثال کی شکایت "اس بار ہم کتنے دن سے حاضری نہیں دے سکے کیونکہ ہماری مثال کی شادی تھی۔ پہلے تو ہر بار خط مثال ہی لکھا کرتی تھی۔ اس بار پہلے شادی کی تیاری اور پھر شادی کی وجہ سے ڈائجسٹ پورا نہیں پڑھ سکی، دسمبر کا جاسوسی بھی ابھی پڑھا ہے کیونکہ 6 دسمبر 2015ء کو شادی ہوئی ہے اس کے بعد شادی کے اپنے کام، آپ کو تو پتا ہے کہ آج کل کے دور میں بیٹی کی شادی کس قدر ذمے داری کا کام ہے۔ اس بار جاسوسی 9 جنوری کو ملا۔ سرورق دیکھ کر نہیں لگتا تھا کہ جاسوسی کا ہے کیونکہ ایک خوب صورت پھول ساتھ سبز ربن اور پیاری سی لڑکی۔ اپنی محفل میں پہنچے پہلے انکل جی پڑھا اور دل دکھ سے بھر گیا ہماری عدالتیں چھوٹے مقدمات ختم کرنا ہی نہیں چاہتیں۔ اس کے بعد علی پور کے ہارٹ کچر کا تبصرہ پڑھا۔ ان کا تبصرہ اے ون تھا۔ ان کی بات بالکل ٹھیک ہے کہ جب تک جاسوسی پورا نہ پڑھ لیا جائے چین نہیں آتا۔ مرحا گل، انور یوسف زئی آپ کے تبصرے بھی اچھے تھے۔ محمد صفدر معاویہ، طاہرہ گلزار، عبدالجبار رومی انصاری آپ کے تبصرے بہت اچھے تھے۔ ویری ویلڈن، نادر سیال کے والد کا سن کر دکھ ہوا۔ اللہ پاک آپ کو صبر عطا فرمائے، آمین۔ فلک شیر ملک کا تبصرہ بھی بہت اچھا تھا۔ بھائی فلک صاحب آپ بہت غور سے کہانیوں کو پڑھتے ہیں اور ان پر تبصرہ بھی بہت اچھا کرتے ہیں۔ میں بھی غور سے پڑھتی ہوں پھر بھی آپ سب جیسا لکھنا نہیں آتا۔ جتوئی کے چوہدری محمد سرفراز آپ بھی ہماری طرح جاسوسی کے عاشق ہو، سن کر اچھا لگا۔ بشیر احمد بھٹی، بہت برا ہوا آپ کے ساتھ، آپ کا سارا مزہ خراب ہوا۔ اب باری آتی ہے کہانیوں کی تو سب سے پہلے امجد رئیس کی پچھلے لمحے پڑھی۔ بہت اچھی رہی۔ پھر انگارے کی باری، وہ بھی اچھی جا رہی ہے اور پھر آوارہ گرد، یہ کیا ہو گیا شہزی سے آخر میں پڑھ کر حیران ہوئے۔ آخری سرورق اشارہ کاشف زبیر کا بہت اچھا رہا۔ باقی شمارہ زیرِ مطالعہ ہے۔ میں یعنی نوال اس بار بہت دن بعد تبصرہ لکھ رہی ہوں۔ مجھے بہت دکھ ہے کہ کسی نے ہمیں یاد نہیں کیا۔ پر ہم سب کو یاد کرتے ہیں۔ جاسوسی کی پوری ٹیم اور چینی نکتہ چینی کے تمام ساتھیوں کو ہم گھر میں بھی یاد کرتے ہیں۔"

درابن کلاہ سے مرحا گل کی تشویش "سالِ نو کا شمارہ 2016ء کے خوب صورت الفاظ سے سجا خوب صورت چہرے سے مزین کلرفل سرورق اور حسینہ کا ہیئر اسٹائل اچھا لگا۔ غالباً ذاکر انکل نے عینک لگا کر سرورق بنایا۔ ہمارے خیال میں اس کے بعد اچھلتے کودتے سنبھلتے سنبھالتے قلقاریاں مارتے اپنی محفل میں جا پہنچے جہاں سالِ نو کا پہلا تبصرہ ہارٹ کچر کا تھا۔ طنز سے بھرپور تبصرہ اچھا لگا۔ رومی صاحب کی جادوگری نے ہم پر بھی جادو سا کر دیا۔ ناصر علی کو جاسوسی کی محفل میں ویلکم تبصرے زبردست تھے۔ فلک شیر آپ کو شکوہ ہے کہ جونانی نے اچھے تبصرہ نگاروں میں آپ کا نام شامل نہیں کیا۔ چلو کوئی بات نہیں ہم شامل کر دیتے ہیں۔ فلک شیر ملک آپ کا سالِ نو کا تبصرہ سپرہٹ تھا، چوہدری محمد سرفراز صاحب، بھلا حقیقتیں بھی معصوم ہوتی ہیں وہ تو نہایت سفاک ہوتی ہیں، ہمارے حکمرانوں کی طرح ویسے آپ باز نہیں آئے۔ نادر سیال، شکیل کاظمی، معراج محبوب عباسی، بلقیس صاحبہ خاص کر محمد احتشام مرتضیٰ کہاں گم ہیں آپ سب؟ طاہرہ گلزار کی الف لیلہ نے مزہ دیا، واقعی آپ نے صحیح فرمایا میک اپ عورتوں کے لیے ہوتا ہے لڑکیوں کے لیے نہیں۔ ایم صفدر معاویہ کا تبصرہ اچھا تھا۔ نگاہیں آوارگی کرتے ہوئے آوارہ گرد پر ٹھہر گئیں۔ پھر آوارہ منظر پر اسٹوری رک گئی پلیز دی اینڈ کب ہوگا۔ انگارے بہت ایکشن میں جا رہی ہے۔ پہلے تھوڑے ملک میں زلزلے ہیں قدرتی جو کہانیوں میں بھی زلزلہ برپا ہوگا۔ یہ کیا بھئی مریم کے خان کی دیسی کہانی نے مزہ نہیں دیا۔ اتنی غیر حاضری کے بعد آئیں بھی تو دیسی کہانی لے کر پلیز کوئی آدم خوروں والی اسٹوری لائیں۔ پچھلے لمحے ایک سنسنی خیز اسٹوری تھی، ویلڈن امجد انکل، سالِ نو کا اتنا زبردست تحفہ دینے کا شکریہ۔ جنونی ایک تلخ تحریر تھی خود غرضی سے بھرپور۔ سراج بابا کو اپنے کیے کی سزا مل گئی مسکین غریب بن کر رہنے والا اتنا گھٹیا نکلے گا، یہ تو سوچا نہ تھا۔ منظر امام کی آشیانہ ایک سپرہٹ

تحریر تھی۔ کاش ہماری دنیا بھی ایسی ہو شفاف بے ریا ٹارگٹ کلنگ سے پاک۔ سلیم انور کی مختصر تحریر دلچسپ تھی۔ بریڈ کے انجام پر افسوس ہوا۔ مطلبی سیر بنارانی کی ایک دل گداز تحریر تھی، واقعی دنیا مطلبی ہے اس دنیا کا ہر انسان مطلبی ہے، ایک شخص بھی بغیر مطلب کے نہیں جی رہا۔ پہلا رنگ دراز دست کی کیا کہیں ہم، سسپنس، ایکشن، تھرل سے بھرپور رنگ تھا۔ کیا کوئی اتنا ظالم ہوسکتا ہے۔ بہت بڑھیا تحریر تھی۔ کراچی سے مسفرہ حسین لکھا کرتی تھیں ہم نے کہیں پڑھا ان کی ڈیتھ ہوگئی ہے شاید 6 مہینے پہلے پلیز کوئی پکا جانتا ہے تو بتا دے پہلے بھی کہا تھا ہم نے۔ مطلبی لوگ ضرور بتانا مسفرہ مطلبی دنیا چھوڑ کر چلی گئی ہے یا...''

نور پور تھل سے محمد یوسف سانول کی کتھا ''نئے سال کا پہلا شمارہ کسی روٹھی ہوئی محبوبہ کی طرح ملا۔ سات چکر کے بعد گوہر مقصود ہاتھ آیا۔ ہمیشہ کی طرح سرورق مصور کی کاوش کا منہ بولتا ثبوت اور حسب حال تھا۔ اداریہ پڑھا جہاں حکومتِ وقت کو کچھ تجاویز دی جارہی تھیں۔ لیکن افسوس صد افسوس کے ہمارے حکمراں آنکھ ہوتے ہوئے اندھے، کان ہوتے ہوئے بہرے اور دل کے ہوتے ہوئے احساس سے خالی ہیں۔ بجھے ہوئے دل کے ساتھ اپنی محفل میں چھلانگ لگائی جہاں علی پور کے ہارٹ کچر سے ٹاکرا ہوا۔ واہ بھئی واہ، تبصرہ شاندار تھا۔ مرحا گل، انور یوسف زئی، ادریس احمد خان، لبنیٰ ریحام، طاہرہ گلزار آپی، فلک شیر اور چوہدری محمد سرفراز کا انداز تحریر پسند آیا، باقی دوستوں کے تبصرے بھی اچھے تھے۔ 2016ء کی اسٹارٹ تاریخ کو میرے چھوٹے انکل جو کہ ایک ہر دلعزیز شخصیت تھے، انتقال کر گئے قارئین کرام سے دعا کی اپیل ہے کہ خدا ان کو جنت عطا فرمائے، وقت کی تنگی کی وجہ سے کہانیوں کو مکمل ٹائم نہیں دے سکے۔ بہرحال سرسری سا تبصرہ جو کچھ پڑھا اس پر... انگارے طاہر جاوید مغل صاحب کی لہو رنگ داستان کی ایک اور کڑی جہاں شاہ زیب پردے والی سرکار کے پاس مہمان بنے بیٹھے ہیں دیکھتے ہیں کہ اگلی قسط میں مغل صاحب کیا جادو جگاتے ہیں۔ اس کے بعد آوارہ گرد پڑھی جہاں مسٹر شہزاد حرافہ عارفہ سے سودے بازی کر رہے ہیں مجموعی تاثر قسط کا اچھا تھا۔ سرورق کی پہلی کہانی روبینہ رشید دراز دست لے کر حاضر ہوئیں لیکن کہانی پر اپنی گرفت مضبوط نہ رکھ سکیں۔ انجام بہت جلدی میں اور غیر فطری کیا۔ آخری رنگ کاشف زبیر اشارہ انوکھا تخیل لے کر حاضر ہوئے اور مجھے تو بم کا ڈی ایکٹی ویٹ کوڈ پتا چل گیا تھا۔''

واہ کینٹ سے بلقیس خان کی تفصیلات ''جنوری 2016ء کا پہلا شمارہ شاہ زیب کی تاجوری سے مزین خوب اور خوش رنگ سرورق آنکھوں کو بھلا لگا۔ اچھے موڈ کے ساتھ ابتدائیہ پڑھا، ہم جس سرزمین پر رہتے ہیں وہاں چیف جسٹس کا گریبان محفوظ نہیں تو اگر قانون سازی ہو بھی جائے تو انصاف کون دلائے گا؟ نیچے اترے، عرصے بعد دوہری شہریت والے دوست سے ملاقات ہوگئی۔ تبصرہ خاصا تیکھا اور جوشیلا تھا۔ بس دو نمبری پر اعتراض ہے پلیز، اپنے اصل نام کے ساتھ آئیں۔ ایم عمران جونانی، یہ آپ کا حسنِ ظن ہے ورنہ ہم تو عورت ذات ہیں اور ناقص العقل کہلاتے ہیں۔ قاسم رحمان، زویا اعجاز رخصت (چلی گئی) پر ہیں اب دوستی تو نبھانی ہے نا۔ (کیوں بھئی زویا... جاسوسی سے ایسی کیا ناراضی ہوگئی... ہماری آپ سے کئی بار بات ہوئی ہے پھر وجہ کیا ہوئی) نادر سیال! میں نے آپ اور سجاد خان کو اپنی دعا میں شامل رکھا ہے اللہ تعالیٰ آپ کی مدد کرے۔ سید شکیل حسین کاظمی! پرائے پھڈے میں نہ پڑیں۔ طاہرہ گلزار، اچھا تو یہ ساری مستی برفانی ریچھ عرف پہاڑی شہزادے کی ہے اور ہاں یہ ٹھمن لگانا رضوان تنولی سے آخر سیکھ ہی لیا۔ انور یوسف زئی، معراج محبوب عباسی آپ ناچیز کہاں ہو، خاصے کی چیز ہو۔ فلک شیر! کہانی نہ سہی خط نما کہانی شائع ہوہی گئی اب خوش۔ محمد صفدر معاویہ، روحی انصاری، ادریس خان، مرحا گل، طاہرہ گلزار اور چوہدری سرفراز لمبے لمبے احوال ناموں کے ساتھ چند حیا رہے تھے۔ عبادت یوسف سانول، لبنیٰ تکوکر، سعید عباسی، سید محی الدین اور ناصر علی بھی خوب رہے۔ نئے ساتھی عدنان کو خوش آمدید۔ حسب عادت انگارے سے آغاز کیا۔ دنیا کے ستائے ہوئے لوگ اللہ والوں کے آستانوں پر سکون کے لیے جایا ہی کرتے ہیں لیکن اتنی اندھی عقیدت ایسے چکر باز اور خطرناک لوگوں کا قبضہ ہے مزارات پر فیصلہ ساز کہاں مرے ہوئے ہیں؟ جہالت کے ان ٹھکانوں کا نوٹس کیوں نہیں لیا جاتا۔ آوارہ گرد کی زہرہ بانو مسافر کی میڈم ثابت ہوئی۔ دنیا کی تمام ایجنسیوں کی طرح شہزی اور اس کے والد جیسے کئی جانباز سرفروشوں کو استعمال کر کے پاور اب انڈر گراؤنڈ ہونے کے چکر میں ہے۔ مریم کے خان کی جنونی سمجھ سے بالاتر تھی۔ بیٹے کی موت کا بدلہ بے گناہ لوگوں سے لینا شاید ایسی سوچ نے ہمیں خودکش بمبار دیے۔ روبینہ رشید کا پہلا رنگ دراز دست بھی عجیب تھا، کوئی شخص اتنا ظالم کیسے ہوسکتا ہے کہ ایک لڑکی کی بے وفائی پر قتل کرتا پھرے اور زور آور بھی اتنا ہو کہ پولیس کی بھاری نفری میں دھماکا کردے اور ایس پی کو ہٹ کرے۔ دوسرا رنگ کاشف زبیر کا اشارہ خوب چڑھا۔ بدکردار حکمرانوں کے سیاہ رنگ دکھاتی اور انہیں بے نقاب کرتی سبق آموز تحریر تھی۔ اب ذکر ہو جائے پگھلتے لمحے کا۔ دل کی جواں مردی، پدرانہ محبت اور بیٹی کے لیے تنگ و تاز کے سامنے ایف بی آئی پاکستانی پولیس اور اس کے زنگ آلود ہتھیار ثابت ہوئے۔ مرحبا امجد رئیس، جی خوش کر دیا۔ منظر امام کی آشیانہ اپنے حالات کی عکاس اور مطلبی سیر بنارانی کی پُرملال تحریریں تھیں۔''

کمالیہ سے شفقت محمود کی گزارش ''اس دفعہ جاسوسی 4 تاریخ کو مل گیا جس سے کم از کم مجھے بہت خوشی ہوئی، ٹائٹل اس دفعہ کھچڑی زدہ تھا۔ سبز رین میں گلاب کا پھول لڑکی کو مسحور کرنے میں کامیاب دکھائی دے رہا تھا اور لڑکی آنکھیں بند کیے اس کی خوشبو میں کھوئی ہوئی تھی۔ چینی نکتہ چینی میں قانونی نظام کی بھیانک لیکن حقیقی تصویر کھینچی گئی۔ خطوط میں ہارٹ کچر صاحب کا خط بہت عمدہ تھا۔ مرحا گل میرے خیال میں نئی انٹری ہیں اس لیے ان کو خوش آمدید۔ باقی خطوط انور یوسف زئی، محمد یوسف سانول، محمد معاویہ صفدر، سید عبادت حسین کاظمی، ادریس احمد خان، محمد سعید عباس، سید محی الدین نواب، لبنیٰ ریحام، عبدالجبار رومی، بشیر احمد بھٹی نئے تبصرہ نگار عدنان، عابد حسین لغاری، فلک شیر ملک، ناصر علی اور محمد سرفراز ان سب کے خطوط بہت عمدہ تھے۔ طاہرہ گلزار صاحبہ اس دفعہ گلہ کرتی نظر آئیں۔ طاہرہ گلزار صاحبہ کبیر عباسی پر بہت تپ پا نظر آئیں۔ لگتا ہے فیس بک کا غصہ بذریعہ تبصرہ نکالنا چاہا جس میں کامیاب رہیں۔ لیکن مجھے سمجھ نہیں آئی کاظمی صاحب بھلا کبیر کو کیسے تمیز سکھائیں گے؟ یہ کام تو وہ خود بھی کر سکتی ہیں۔ آخر اتنی تعلیم یافتہ جو ہوئیں۔ ویسے بھی ادارے کو

چاہیے کہ ایسے الفاظ جس سے کسی کی بے عزتی ہوتی ہو یا عزتِ نفس مجروح ہوتی ہو تو ان کو شامل کرنے پر غور کرنا چاہیے اور فیس بک کے کارنامے فیس بک پر ہی نشانے چاہئیں۔ امید ہے میرے یہ الفاظ کسی کی ذات پر گراں نہیں گزریں گے۔ (ہم صرف چٹپٹی نکتہ چینی کو ارسال کیے گئے خطوط سے رابطہ رکھتے ہیں... فیس بک کی دنیا سے ہمارا کوئی تعلق نہیں) کہانیوں میں انگارے سب سے پہلے پڑھی۔ شاہ زیب فل ایکشن میں ہے۔ اس دفعہ ریشمی کو بچانے کے چکر میں خود بہت برا پھنس چکا ہے اور پردے والی سرکار بھی مجھے کافی مشکوک نظر آرہے ہیں۔ آوارہ گرد میں اسپیکٹرم کی تباہی خوش آئند ہے۔ شہزی کے والد کے بارے میں اطلاع اچھی لگی لیکن اس کے ساتھ ساتھ جو حالات دگرگوں ہورہے ہیں۔ ان سے بھی کافی پریشان ہیں۔ مغربی انتخاب پگھلتے لمحے امجد رئیس صاحب کی عمدہ تحریر تھی۔ لالچ کا انجام، الٹی بازی، سلیقہ شعار بہت اچھی لگیں۔ منظر امام صاحب کی آشیانہ بہت غضب کی تھی۔ پاگلوں کا مسکن پاگلوں کے لیے جنت تھا۔ وائٹ ہاؤس جمال دستی کی وائٹ ہاؤس اچھی کہانی تھی۔ کاسابلانکا اور وائٹ ہاؤس میں زبان کی تبدیلی نے غلط فہمی پیدا کردی۔ مطلبی بھی اچھی کہانی تھی۔ مریم کے خان کی جنونی میں سراج بابا کے جنونی پن نے اس کو پاگل بنادیا اور وہ قتل جیسی بھیانک سرگرمی میں ملوث ہوگیا۔ میرے فیورٹ رائٹر کاشف زبیر صاحب نے تو اس بار شیخ صاحب کو دن میں تارے دکھادیے۔ ضیا جیسے کرپٹ سیاست داں آج بھی ملک کو دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہے ہیں اور اپنا بچاؤ کرنے کے لیے پتا نہیں کس حد سے گزر جاتے ہیں۔ اشارہ بلاشبہ نئے سال کے لیے بہترین تحفہ تھا۔ آخر میں، میری گزارش ہے تفسیر عباس بابر، اعجاز احمد راحیل، زویا اعجاز اور کبیر عباسی سے کہ آپ تبصرہ لکھتے رہیں اور محفل میں رونق بڑھائیں۔''

مقصود احمد کا کڑ نیو سینٹرل جیل ملتان سے پہلی دفعہ لکھتے ہیں ''میں پہلی دفعہ خط لکھنے کی جسارت کررہا ہوں، کوشش تو بہت کرتا ہوں خط لکھنے کی جب بھی خط لکھتا ہوں تو کہیں نہ کہیں غلطی ہوجاتی ہے اس لیے تقریباً 6 سال بعد خط لکھ پایا ہوں۔ جھوٹ نہیں بول رہا ہوں سچ کہہ رہا ہوں۔ پہلے میں انگارے کی بات کرتا ہوں۔ طاہر جاوید مغل صاحب ایک بہترین لکھاری ہیں۔ انگارے واقعی بہت اچھی کہانی ہے ایسا نہیں ہوسکتا کہ انگارے کے دس بیس صفحات بڑھادیے جائیں، بہت جلد ختم ہوجاتی ہے۔ آوارہ گرد بھی بہت اچھی کہانی ہے۔''

ناظم آباد کراچی سے محمد ادریس خان کی پسندیدگی ''ماہ جنوری 2016ء کا حصول کوچۂ جاناں کے چکر لگانے کے مترادف ہے، کہیں جاکر 6 جنوری کو حاصل ہوا۔ مگر دیر آید درست آید کے بقول آنکھوں کی ٹھنڈک کا سبب بنا اور بے اختیار ذاکر صاحب کے لیے دعا نکلی۔ اس اچھوتے خیال اور اظہار کے لیے جس طرح انہوں نے نئے سال کے لیے پیش کیا ان کے لیے نیک تمنائیں۔ اداریہ بھی دل کی ترجمانی کررہا تھا۔ سرفہرست ہارٹ کیچر کو مبارک باد۔ تمام ہی جاسوسی کے پروانوں کو ہماری طرف سے نئے سال کی بہت بہت مبارک باد۔ محمد صفدر معاویہ، سید عبادت کاظمی، عبدالجبار رومی اور طاہرہ گلزار تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ ان لوگوں کے تبصرے بھی خوب تر ہوتے ہیں۔ طاہرہ گلزار کی بصیرت کے دل سے معترف ہیں۔ کہانیوں میں سب سے پہلے امجد رئیس کی پگھلتے لمحے بہت خوب صورت کہانی تھی۔ جذبے جواں، ہمت بلند ہو تو انسان انہونی کو ہونی میں تبدیل کردیتا ہے۔ جیسا کہ ڈاکٹر ول نے اپنی اعلیٰ ہمت سے ایک خطرناک دشمن کو مات دی وہ محبت کا جذبہ تھا۔ وہ یقین کا جذبہ تھا جس کی وجہ سے وہ سرخرو ہوا۔ لالچ کا انجام، اچھے انداز میں لکھی ہوئی کہانی تھی۔ منظر امام کی آشیانہ پُرمزاح اور بامعنی تحریر تھی کہ فرزانوں سے اچھے دیوانے تھے جنہوں نے دیوانوں میں ہی رہنے کو ترجیح دی۔ الٹی بازی میں شکار کرنے والے شکاری کو اپنا شکار کرلیا۔ برسوں دل میں رکھے ہوئے کینے کو بھی تسکین مل گئی۔ طاہر جاوید مغل صاحب کی انگارے بہترین انداز میں جاری وساری ہے اور بڑی دلچسپی سے پڑھی جارہی ہے۔ کیونکہ اس تحریر میں دلچسپی کا ہر عنصر شامل ہے جو اچھی تحریر کی خوبی ہے۔ مطلبی بھی اچھی کہانی تھی۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی آوارہ گرد بھی تسلسل سے پڑھی جارہی ہے۔ خوبی تحریر اسی کو کہتے ہیں۔ جنونی میں ایک چپراسی نے اپنے ہی افسروں کو قتل کیا اور دوسرے افسر کو قتل کے الزام میں پھنسانا چاہا مگر ہر انسان کی موت کا وقت مقرر ہے اسی طرح جرم کا بھی کبھی نہ کبھی اختتام ہوجاتا ہے۔ قاتل کبھی نہ کبھی بے پردہ ہو ہی جاتا ہے چاہے اپنا منصوبہ کتنی ہی عقلمندی سے بنائے۔ دام میں آہی جاتا ہے جیسا کہ سراج کے ساتھ ہوا۔ حقیقت میں ایک شوہر نے آفس کی رقم میں ہیرا پھیری کی اور اپنے باس کو بھی ایک لمبی رقم کے لیے قتل کردیا مگر یہ سب اپنی اور اپنی بیوی کے لیے کرنا جارج کے لیے پھانسی کا پھندا بن گیا نتیجتاً غبن کی گئی دولت اس کی بیوی گریس کو مل گئی۔ دراز دست روبینہ رشید کی کہانی بہت اچھی لگی اور آخری صفحات کی اچھی روایت کی لاج رکھی، بہت خوب صورت، دل موہ لینے والی کہانی تھی ویلڈن۔ دوسری کہانی کاشف زبیر کی اشارہ تھی۔ اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے جس طرح کاشف زبیر نے لکھی، واقعی ان کا انداز منفرد ہے۔ نئے سال کی مناسبت سے بہت موزوں کہانی تھی۔''

محمد صفدر معاویہ کی خانیوال سے عمدہ پسندی ''جنوری 2016ء کا شمارہ 4 جنوری کی شام کو خانیوال میں طاہر نیوز ایجنسی سے خریدا، سرورق کو بہت ہی خوب صورت طریقے سے سجایا گیا تھا۔ اداریے میں آپ جھوٹے مقدمات پر سزا کی بات کرتے نظر آئے۔ غریب اس لیے کہا ہے کہ صرف غریب آدمی ہی پھنستا ہے امیر کو یہاں کون پوچھتا ہے بلکہ عدالت کا قیمتی وقت بھی ضائع کیا جاتا ہے۔ محفل میں ہارٹ کیچر نمایاں تھے۔ بہت ہی عمدہ تبصرے کے ساتھ تھوڑا سا محفل کے دوستوں کو لتاڑتے بھی نظر آئے۔ باقی تمام دوستوں نے بھی عمدہ تبصرے کیے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے انگارے پڑھی، کیا ایڈونچر تھا اس قسط میں مسٹر اینق تو کوئی جن ہے ہر چیز کو ہر کام کو ایک دن میں مکمل معلومات کے ساتھ شاہ زیب کو دیتا ہے۔ یاسر بھائی کی صحت نے مایوس کردیا۔ اب سب قید میں پہنچ گئے۔ شاہ زیب کے تو مزے ہی ہوگئے تاجور کے ساتھ قید میں بھی ساتھ نصیب ہورہا ہے۔ آوارہ گرد پڑھی، وزیر جان نکل گیا۔ شہزی بہت برے موڑ پر پھنسا ایک طرف باپ اس کے بدلے میں ملک کا دشمن واپس کرنا، عابدہ کا کیس بھی الجھا رہا ہے، عارفہ سے ملاقات آخر میں بیگم صاحبہ کے گھر میں کیا ہوا کیا نہیں ہوا۔ شہزی اس ادھیڑبن میں الجھا ہوا ہے، اگلی قسط میں صورتِ حال واضح ہوگی۔ دراز دست سرورق کی پہلی کہانی روبینہ رشید کے قلم سے۔

تحریر بہت عمدہ ثابت ہوئی۔ سرورق کی دوسری تحریر اشارہ، کاشف زبیر کے قلم سے بہت عمدہ تحریر جو شفیع اللہ شیخ اور اس کی فیملی اور ضیا حامد کی چپقلش پر مشتمل تحریر تھی۔ ابتدائی صفحات پر امجد رئیس کی جھلملاتے لمحے، یہ تحریر بھی بہت عمدہ رہی خصوصاً باسل کا کردار عمدہ رہا جس نے آخر میں جو کو موت سے ہمکنار کیا۔ ول نے بھی کمالِ بہادری دکھائی، کیرین نے بھی اپنا کردار عمدگی سے نبھایا۔ باقی تمام چھوٹی کہانیاں بھی عمدہ رہیں۔ مجموعی طور پر سال کا پہلا شمارہ عمدہ رہا۔''

عبدالغفار فردوس نواں شہر ایبٹ آباد سے لکھتے ہیں ''سرورق نئے سال کے عین مطابق بہت ہی بہترین تھا۔ سرورق کی اس دفعہ جتنی تعریف کی جائے، کم ہے۔ امجد رئیس کافی عرصے بعد مغربی ادب سے زبردست انتخاب جھلملاتے لمحے کے ساتھ حاضر تھے۔ کہانی سنسنی خیزی اور سسپنس سے بھرپور تھی۔ پڑھنا شروع کی تو ایک ہی سانس میں ختم کر ڈالی شاید ہم تو سانس لینا ہی بھول گئے تھے۔ (ایسا غضب مت کیجیے!) آشیانہ، منظر امام ہمیشہ کی طرح ایک ہنساتی کھلکھلاتی سوچ و بچار والی تحریر کے ساتھ حاضر تھے۔ باقی کہانیوں میں اشارہ، دراز دست، جنونی، الٹی بازی، مطلبی بہترین کہانیاں تھیں۔ قسط وار کہانیاں بھی بہتر سے بہترین کی جانب گامزن ہیں۔''

ڈیرہ اسماعیل خان سے عدنان عالم کی مبارک باد ''6 جنوری کو ڈائجسٹ موصول ہوا۔ ٹائٹل اچھا تھا۔ محمد صفدر معاویہ، چوہدری سرفراز، نادر سیال کے تبصرے بہترین تھے۔ عبادت میرے دوست کی 10 فروری کو سالگرہ ہے بہت بہت مبارک ہو۔ انگارے میں تاجور اور شاہ زیب کی محبت اچھی لگتی ہے۔ جنونی، دراز دست، اشارہ، آشیانہ اچھی کہانیاں تھیں۔'' (پچھلے شمارے نکال کے قسطیں پڑھ لیں، مزہ آئے گا اور سمجھ میں بھی آجائے گی)

اسلام آباد سے سید شکیل حسین کاظمی کی اشد مصروفیات ''یہ روایت اب لوگوں میں عام ہوتی جارہی ہے کہ ہم ہمیشہ بات کا ایک رخ دیکھ کر فوراً اس پر ردِعمل ظاہر کر دیتے ہیں۔ سیاق و سباق سے قطعی نا آشنا ہوتے ہیں مگر رائے ایسے دیتے ہیں جیسے ہر نشیب و فراز کا علم رکھتے ہوں۔ ہر چند کہ یہی جلد بازی اکثر پشیمانی کا سبب بنتی ہے لیکن صاحب بصیرت لوگ اپنی رائے دینے میں ہمیشہ احتیاط سے کام لیتے ہیں۔ اس سال کا پہلا شمارہ تقریباً سات تاریخ تک دستیاب ہو چکا تھا۔ مگر چند مصروفیات ایسی تھیں کہ فوری مطالعے کے لیے وقت نہیں نکال سکا۔ جیسے ہی ڈائجسٹ دیکھا، حسینہ سرورق کی شکوہ کناں نظروں نے جگر پاش پاش کر دیا۔ اس طرح نظر انداز کیے جانے پر شکوہ کرنے میں وہ حق بجانب تھی۔ ہم نے اسے مزید انتظار نہیں کروایا اور اسے بھرپور توجہ دیتے ہوئے سرورق پلٹ کر فہرست پر جا پہنچے۔ فہرست میں محبوب مصنفین کے نام ستاروں کے مانند چمک رہے تھے۔ چینی نکتہ چینی میں اس سال کا پہلا تبصرہ ہارٹ کیچر صاحب کا تھا۔ اپنی شناخت کے سلسلے میں کافی حساس واقع ہوئے ہیں لیکن دوستوں نے نقاب رخ غیر زیبا اٹھا کر بتا دیا تھا کہ یہ تو اپنے پرانے تبصرہ نگار جاوید بلوچ صاحب ہیں۔ بہت اچھا تبصرہ کیا آپ نے اور کیا ہی اچھا ہوتا اگر آپ اپنے پیدائشی نام سے کرتے۔ دوسرا امیر اگزشتہ ماہ کا تبصرہ آپ کے نہیں ادارے کے نام تھا اور ان کا تسلی بخش جواب مجھے دیا جا چکا ہے۔ شاید آپ نے مکمل پڑھا نہیں تھا۔ جس دن آپ سے رائے یا مشورہ مانگوں آپ ضرور دینا۔ لیکن پھر بھی ہم آپ کی انتہائی بلاوجہ ہمدردی کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ مرحا گل اور ہم شہر انور یوسف زئی کے تبصرے بھی عمدہ تھے۔ سید محی الدین اشفاق آپ کی محبت کا شکریہ کہ آپ یاد رکھتے ہیں۔ پشاور سے محترمہ طاہرہ گلزار صاحبہ، کبیر عباسی اور ہم سب آپ کے بچوں کی عمر کے ہیں۔ اگر کبھی کوئی غلطی کوتاہی کر لیتے ہیں تو شفقت سے کام لیا کریں۔ کہانیوں کی بات کریں تو بچی بات ہے کہ قسط وار ہی پڑھی جارہی ہیں آج کل، حالانکہ امجد رئیس کی پہلے صفحات پر حاضری اور کاشف زبیر اور روبینہ رشید صاحبہ کے سرورق کے رنگ۔ کیا عمدہ چوائس ہے مگر وقت کا پہیا ہمارے لیے آج کل بہت زیادہ تیز چل رہا ہے شاید۔ انگارے کی یہ قسط اس لحاظ سے تو جاندار تھی کہ کہانی میں نیا رخ آگیا۔ لیکن مغل اعظم کی بہت ساری کہانیوں کی طرح اس میں بھی ڈبا پیروں کی اچھی درگت بنتی دکھائی دیتی ہے۔ آوارہ گرد میں ڈاکٹر عبدالرب بھٹی صاحب نے اسپیکٹرم اور بلیو کمس دونوں کی کھٹیا کھڑی کر دی۔ عابدہ کو میرا خیال ہے امریکا میں وفات پا جانا چاہیے تاکہ یہاں شہزی کھل کر کام کر سکے۔ باقی جو بھٹی صاحب مناسب سمجھیں۔''

پشاور سے طاہرہ گلزار کی معروفیت ''اس بار جاسوسی بہت لیٹ ملا۔ سرورق بہت پیارے کلر کا تھا۔ اداریے میں اس بار وکیل اور عدالتوں کے بارے میں دل سوز باتیں شامل تھیں۔ چینی نکتہ چینی میں میرا بہت اچھا دوست ہارٹ کیچر نظر آئے۔ مبارک ہو دوست۔ تم نے اپنے مخصوص انداز کے ساتھ ہم چاروں دوستوں پر تنقید کی ہے کہ ہم ایک دوسرے کی تعریف کرتے رہتے ہیں تو ڈیئر کیچر یہ دوست ہیں تو اچھے دشمنوں کی بھی کافی حد تک تعریف کرتے ہیں اگر وہ اس قابل ہوں۔ سویٹ سی سسٹر مرحا گل زبردست تبصرہ لے کر حاضر تھیں۔ انور یوسف زئی آپ کے لہجے میں میرے لیے اتنی کڑواہٹ کیوں ہے کیا میں نے آپ کا قرضہ دینا ہے۔ محمد صفدر معاویہ بھی بہت شاندار تبصرہ لے کر حاضر تھے سب کو یاد کیا سوائے مجھے یعنی اپنی باجی کو معلوم نہیں کیوں۔ سید عبادت کاظمی بھی لوگوں کی تعریف کرنے والا تبصرہ لے کر حاضر تھے بہت ہی نازک مزاج بھائی ہے۔ کراچی سے میرے بڑے بھائی ادریس احمد خان اتنے اچھے اور لاجواب تبصرہ لے کر حاضر تھے، بہت اچھے ادریس بھائی۔ سعید عباسی بھی مختصر لیکن اچھے تبصرہ کے ساتھ حاضر تھے۔ میرے فیورٹ تبصرہ نگار محی الدین اشفاق بھی اپنے مخصوص اندازِ تحریر کے ساتھ حاضر تھے۔ کاش بھائی میرا آپ سے موبائل رابطہ ہو جائے تو مجھے بہت خوشی ہوگی۔ لبنیٰ ڈیئر خط لکھنا مت چھوڑنا آتی رہنا عبدالجبار رومی بھی اپنے مخصوص اندازِ تحریر کے ساتھ حاضر تھے اور بہت سوں کو بہت مکھن لگا کے تعریف کی، واقعی رومی آپ بہت نفیس انسان ہیں۔ بشیر احمد بھٹی صاحب کا تبصرہ پڑھ کر بہت ہنسی آئی۔ فلک شیر ملک نے تو آتے ہی جونانی بھائی سے شکوہ شروع کر دیا۔ فلک شیر جی آپ نے بھی مجھے یاد نہیں رکھا ویسے تبصرہ آپ کا بھی بہت طویل اور شاندار رہا۔ بہت اچھا لکھتے ہو۔ اپنے فیورٹ رائٹر طاہر جاوید مغل کی تحریر انگارے یہ سوچ کے پڑھنا شروع کی کہ پتا نہیں یاسر طاقت کا پہاڑ ہوگا لیکن نکلا کیا ایک کمزور اور نشہ کرنے والا یاسر۔ شاہ زیب اب ریشمی کو بچانے کے لیے میدان میں کود پڑا ہے۔ اس قسط میں منظر نگاری انتہا کی ہے۔ بابر نعیم کی مغربی تحریر سلیقہ شعار مختصر کہانی اور جلد ہی قاتل کی پکڑ بھی۔ سراغ رساں کیتھی جس نے اتنی جلدی قاتل کو پہچان لیا۔ ان مردوں کے لیے لمحہ فکریہ جو عورت پر بے عقل کا لیبل لگا کے بیٹھے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی بھی آوارہ گرد لے کر حاضر تھے۔

ان کے قلم کے زور کا کیا کہنا۔ بھرپور ایکشن، اب تو والد کے ملنے کی امید دشمن کو چھوڑنے کے ساتھ بندھ گئی۔ سرورق کی دوسری کہانی اشارہ کاشف زبیر کی ایک شاہکار اور لاجواب تحریر، ہمارے یہ بے حس حکمران یہ تو کرتے رہے ہیں۔ ضیا حامد جیسے گھٹیا لوگوں کی وجہ سے شفیع شیخ جیسے نیک ایماندار لوگ تکلیف اٹھاتے ہیں ویلڈن کاشف زبیر۔ باقی کہانیاں بھی جاسوسی کی لاجواب ہیں کچھ بیماری اور کچھ کالج کی معروفیات کی وجہ سے بعد میں پڑھ لوں گی۔''

ڈیرہ اسماعیل خان سے سید عبادت کاظمی کی دوست سازی ''سالِ نو کا تازہ تازہ شمارہ 6 جنوری کو سردی میں ہیٹر کی طرح لگا۔ سرورق کچھ خاص نہیں تھا۔ اس مرتبہ صنفِ نازک نے سرورق پر قبضہ جمایا ہوا تھا۔ مخالف جنس کا نام ونشان تک نہ تھا۔ حسینہ کی بند آنکھیں غضب کا سین لگ رہا تھا۔ سرورق کے پوسٹ مارٹم کے بعد اشتہاروں کو پھلانگتے ہوئے محفلِ دل میں بنا ٹکٹ کے وارد ہو گئے جہاں پر سب سے پہلے ہارٹ کیچر نے ہمارا راستہ روک لیا۔ ہم نے بھی کہا بھئی پتا ہے آپ صفحۂ اول پر موجود ہو اور ہمیں آگے جانے کا راستہ دے دو۔ مرحا گل اپنی روایتی آن بان کے ساتھ محفل میں براجمان تھیں۔ مبارباد قبول کریں اچھا تبصرہ تھا۔ محمد صفدر معاویہ کا تبصرہ بہت زبردست تھا۔ ایک عرصے کے بعد جناب سید محی الدین اشفاق کی آمد منہ میٹھا کر گئی۔ عبدالجبار رومی جناب جان تو پھر اٹکی ہوتی ہے کیا کریں۔ میری جان میرے پیارے دوست عدنان کا تبصرہ پہلی دفعہ محفل کی زینت بنا، بہت خوشی ہوئی۔ 22 فروری کو عدنان کی سالگرہ ہے، بہت بہت مبارک باد۔ فلک شیر ملک کا تبصرہ محفل کی جان تھا۔ ناصر علی تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ سعید عباسی، چوہدری محمد سرفراز اور محمد صفدر معاویہ کے تبصرے بہترین تھے۔ انگارے اس دفعہ زبردست رہی۔ اب کہانی نے زبردست موڑ لیا ہے۔ آوارہ گرد اس دفعہ کچھ خاص نہ لگی، وہی کچھ پتا نہیں زہرہ میڈم نے چال چل لی ہے، اب شہزی کا کیا ہوگا آخر کمیل دادا موجودہ قسط سے غائب تھا، مزہ نہ آیا۔ عابدہ کی رہائی کا انتظار ہے۔ روبینہ رشید آئیں اور چھا گئیں۔ عینی کی معصوم موت کا دکھ ہوا، زویا کی ہمت اچھی لگی۔ وقاص جیسے جنونی لوگ بھی ہوتے ہیں اس دنیا میں۔ دوسرا رنگ کاشف زبیر بس ٹھیک ہی لکھا۔ امجد رئیس بہت زبردست رائٹر ہیں جو اور مارگریٹ اچھے رہے۔ انگلش تراجم بہت مشکل لگتے ہیں مجھے آشیانہ اور جنونی زبردست کہانیاں تھیں۔ 10 فروری کو میری اور میرے دوست قاسم کی بھی سالگرہ ہے۔'' (ہماری طرف سے جنم دن بہت بہت مبارک ہو آپ کو اور آپ کے دوست قاسم کو اور پیارے دوست عدنان کو ہزار ہا خوشیاں ملیں)

ملتان سے علی عمران کی تیز رفتاری ''جنوری کا جاسوسی اس بار بہت دیر سے ملا جس کی وجہ سے بہت جلدی پڑھ بھی لیا۔ سرورق پہلے کی نسبت کافی اچھا لگا۔ سب سے پہلے اپنے فیورٹ مصنف ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی تحریر آوارہ گرد سے شروع کی۔ واہ کمال کر دیا بھٹی صاحب۔ آخر کار شہزاد احمد خان اپنے باپ کی تلاش میں نوے پرسنٹ کامیاب ہو ہی گیا۔ باقی دس پرسنٹ بھی اگلی قسط تک کامیاب ہو جائے گا۔ آنسہ خالدہ کا کردار مجھے تو بہت ہی پسند آیا جو دوسرے ملک میں رہتے ہوئے بھی اپنے ہم وطنوں ہم مذہبوں کے لیے ہمدردانہ رویّہ رکھتے ہوئے بڑھ چڑھ کر ان کی مدد کرنے کو ہر دم تیار ہے۔ عابدہ کی بازیابی کے لیے عارفہ کے پاس شہزی کا جانا برا لگا اور عارفہ تو مجھے بہت ہی بری لگی جو دولت کے چکر میں اولاد کو بھی داؤ پر لگا دیتی ہے۔ بیگم صاحب کا کردار اس بار عجیب لگا۔ انگارے میں جعلی پیروں کی بہتات کر دی گئی۔ ویسے طاہر صاحب کی ہر کہانی میں کہیں نہ کہیں سے پیر وملنگ گھس آتے ہیں شاید ان کے ساتھ بھی زندگی میں کوئی ایسا واقعہ پیش آیا ہو۔ خیر باقی ڈائجسٹ میں دونوں رنگ اور ابتدائی تحریر امجد رئیس کی پچھلے لمبے کمال کی تحریریں تھیں۔''

فتح پور لیہ سے سید محی الدین اشفاق کی توصیف ''نئے سال کا جاسوسی 3 تاریخ کو ہی مل گیا۔ نائٹ گرل پھول کی خوشبو سے بے ہوش تھی۔ مدیرِ اعلیٰ نے جو لکھا درست لکھا۔ جب تک ہمارے ملک میں قانون کی حکمرانی نہیں ہوگی تب تک پاکستان کے حالات درست سمت میں نہیں جا سکتے۔ علی پور سے ہارٹ کیچر چھائے ہوئے تھے۔ مرحا گل ایک اچھے تبصرے کے ساتھ موجود تھیں۔ صفدر بھائی یہی تو المیہ ہے ہماری قوم کی تباہی اسی وجہ سے ہو رہی ہے۔ سید عبادت کاظمی کو اداسی کچھ زیادہ ہی نہیں؟ انکل جی پوچھیں اس سے خیر تو ہے؟ ہاہاہا۔ لبنیٰ ریحام ٹکو کر آپ کی فرمائش نوٹ کر لی گئی ہے۔ طاہرہ گلزار کتنے میں خریدا تھا پیج؟ لگتا تھا پوری کہانی لکھ دی ہے۔ چوہدری سرفراز بھی لگتا ہے عشق کے بخار میں مبتلا ہیں؟ اچھا تبصرہ تھا۔ کہانیوں میں مغل انکل سے ملاقات طے شدہ ہوتی ہے۔ تاجور کی دوست ریشمی کو چھڑانے کے لیے اپنے شاہ زیب صاحب پھنس گئے ہیں۔ اور پردے والی سرکار لگتا ہے کوئی خطرناک اور دلچسپ کردار ہوگا۔ آوارہ گرد میں، ڈاکٹر صاحب کا قلم تیز تر ہوتا جا رہا ہے۔ شہزی نے بڑا اٹیک کیا مگر وزیر جان اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ میجر باجوہ بھی تھوڑا دور ہوتے نظر آرہے ہیں۔ زہرہ بانو کے پاس ہونا شاید اس میں کوئی نئی چال ہو یا پھر واقعی شہزی کوئی سنگین غلطی کر چکا ہے؟ ادھر عابدہ بھی عجیب مسائل کا شکار ہے۔ اشارہ میں کاشف زبیر کے قلم کا جادو سر چڑھ کر بولا۔ دراز دست میں کچھ اتنا خاص مزہ نہیں آیا۔ مختصر کہانیوں میں سلیقہ شعار، وائٹ ہاؤس اچھی لگی۔ ابتدائی کہانی ابھی زیرِ مطالعہ ہے۔ یہ بات سچ ہے کہ جاسوسی نئے سال کا شاہکار تھا۔''

احمد پور شرقیہ سے چوہدری عاصم سعید کی آمد ''اس بار جاسوسی نے بہت انتظار کروایا اور آخر سات جنوری کو ملا۔ سرورق کی لڑکی میں کوئی قابلِ ذکر بات نہ تھی۔ محبتوں کے سفیر طاہر جاوید مغل کا نام دیکھ کر ہی دل و دماغ میں دیہاتی پس منظر میں محبت کی انوکھی داستان ابھرنے لگتی ہے۔ ان کا نیا سلسلہ انگارے خاصا تیز رفتار اور ہنگامہ پرور ہے۔ دیہاتی فضا کی بات ہی الگ ہوتی ہے اور مغل انکل کی تحریروں کا خمیر دیہات سے ہی اٹھتا ہے۔ جب سے ڈائجسٹ پڑھنا شروع کیا، تبصروں کا لطف سب سے پہلے اٹھایا۔ اداریہ میں حالاتِ حاضرہ پر ایڈیٹر کا نقطۂ نظر پسند آیا۔ ننھی کا پہلا خط بغیر چینی کے تھا، سو کڑواہٹ تو محسوس ہونا ہی تھی۔ شاید ہارٹ کیچر صاحب غلطی سے چینی کی جگہ نیم کے پتے کھا کر لکھنے بیٹھ گئے۔ ویسے اگر کوئی کسی کی تعریف کرے یا تنقید، آپ کو اس پر تنقید اور طنز کرنے کا حق نہیں۔ تاوقتیکہ وہ آپ کے خلاف کوئی لفظ منہ سے نہ نکالے۔ مرحا گل، بہت اچھا تجزیہ۔ شعر بھی مناسب ہے۔ ویلڈن۔ سید عبادت کاظمی، ویلکم کرنے کا شکریہ۔ آپ کا تبصرہ بے حد اچھا ہے۔ میں بھی آپ دوستوں کے تبصرے پڑھ پڑھ کر لکھنے کے میدان میں کودا

ہوں۔ عبدالجبار رومی، فلک شیر ملک، ناصر علی اور چوہدری محمد سرفراز محفل کی جان تھے۔ ان کے تبصروں نے بہت متاثر کیا۔ اولین صفحات، امجد رئیس نے بہت اچھا ناول پیش کیا۔ ان کے ناول بھی خوب ہوا کرتے ہیں۔ موجودہ ناول پگھلتے لمحے نئے سال کا تحفہ ثابت ہوا۔ انگارے میں یاسر کا کردار سامنے آہی گیا مگر مایوسی ہوئی۔ ریشمی کا نیا کردار عجیب لگا۔ اس کی تلاش میں کامیاب شاہ زیب ملنگوں کی قید میں پھنس گیا۔ غضب یہ کہ ساتھ تاجور اور چاچا رزاق بھی موجود ہیں۔ گونگے پن کا راز بھی کھل گیا۔ اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے۔ آوارہ گرد میں آنسہ خالدہ کا کردار بھی خوب اچھا ہے۔ اول خیر کے مشورے خوب رہے۔ شکیلہ کی ذہانت و علمیت نے بے حد متاثر کیا۔ رنگوں میں پہلا رنگ روبینہ رشید کے قلم سے ایک شاہکار کہانی تھی جس کی تعریف کرنے کے لیے الفاظ نہیں مل رہے۔ روبینہ رشید نے بہت ہی عمدہ انداز میں لکھا۔ کاشف زبیر کی اشارہ بھی زبردست ثابت ہوئی۔ منظر امام کی مختصر اسٹوری آشیانہ بہت پسند آئی۔ مریم کے خان، عرفان اظہار اور بابر نعیم کے تراجم بھی سسپنس سے بھرپور تھے۔''

تحصیل علی پور سے ہارٹ کچر کی وفا و دغا کی مدح سرائی ''یکم سے لے کر جھکم ' 6 تک کبھی بائیک پر تو کبھی ٹانگوں کی بیساکھیوں پر سوار کئی بار آمد جامد کے بعد جاسوسی بالآخر ہمارے ہتھے چڑھ ہی گیا۔ خیالی خاتون کے پھول رنگ لب اور پھول میں وفا و دغا کے تناسب کا سوچا تو پھول کو وفا باز اور لبوں کو دغا باز کہا۔ سرخ لب سفید جھوٹ بول کر دغا بازی کر جاتے ہیں مگر وفا باز پھول وفا کی مہک بکھیرتے بکھیرتے پتی پتی ہو کر بکھر کر امر ہو جاتے ہیں۔ اداریے کے آگے پیامِ مسرت ہمارا منتظر تھا۔ یعنی ہم ہے مسٹر جاسوسی واہ کیا بات ہے۔ اپنی طرف سے بس اتنی تعریف ہی کافی ہے ورنہ اپنی نظر بھی لگ سکتی ہے اور اپنی نظر خود کو لگ جانے کے ڈر کے پیشِ نظر ہم آئینہ بھی بند آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ (کیا بات ہے!) مرحا گل بھی دھیرے دھیرے دکٹری اسٹینڈ کی جانب پھدکتی جا رہی ہیں۔ شاباش بس ایک قدم اور ہمتِ نسواں مددِ خدا۔ محمد صفدر نے لفظ عمدہ کی اتنی گردان کی کہ ہمارے ہونٹوں سے بھی عمدہ سی ہنسی پھوٹ پڑی۔ طاہرہ گلزار صرف میک اپ ہی کیا بلکہ رونا دھونا، ڈریس، بول چال حال ڈھال اور ایسے کئی خواتینی کام بیشتر مرد حضرات نے اپنا رکھے ہیں۔ آوارہ گرد میں اکثر خواتینی نام مردانہ قسم کے ہیں جیسے عابد سے عابدہ۔ عارف سے عارفہ۔ شکیل سے شکیلہ۔ خالد سے خالدہ۔ سعید سے سعیدہ۔ اور آوارہ گرد کے آخری نشاط آور لمحات ہمارے لیے معتبر دل ثابت ہوئے۔ چرس پڑیوں میں نہیں بکتی بلکہ یہ ٹھوس مگر نرم حالت میں دستیاب ہوتی ہے نہ ہی اس کا نشہ اس قدر زود اثر ہوتا ہے کہ چرس نوش مدہوش ہو کر چاروں شانے چت ہو کر گر جائے اور پھر اول فول بولنا بھی شروع کر دے۔ طاہر جاوید مغل کی چرس پر تحقیق مکمل نہیں۔ بہر حال انگارے کے انگاروں پر آنکھیں سینک کر فارغ ہوئے ہی تھے کہ کاشف زبیر نے اشارہ کر کے اشارہ کی جانب بلا لیا بس پھر ہم بھی رہ نہ سکے۔ اشارہ سسپنس اور سنسنی خیزی سے بھرپور اور سالِ نو کا تحفہ خاص تھی۔ جمال دتی کی وائٹ ہاؤس میں وائٹ سراغ رساں نہ ہوتے ہوئے بھی اپنا ذہن کھپا کھپا کے قاتل کا سراغ ڈھونڈ لیا۔ انسان کو کسی کے دماغ سے کھیل لینا چاہیے مگر کبھی بھی کسی کے دل سے نہیں کھیلنا چاہیے دماغ کا ہارا ہوا شخص دنوں میں سنبھل سکتا ہے اگر دل ٹوٹ جائے تو دردکی کسک تا دم ساتھ نہیں چھوڑتی۔ بس گولڈویل نے مطلبی میں اپنی طلب برآوری کے لیے معصوم لڑکی کے دل سے کھیل کر اسے دائمی روگ سے دوچار کیا اور اس کی زندگی تباہ و برباد ہو گئی اور گولڈویل نے پچھتاوے کی آگ میں جل کر دستِ خود اپنی زندگی کا قلع قمع کیا۔ منظر امام کی تحریر آشیانہ تعمیری کاوش تھی۔ دراز دست محبتوں اور نفرتوں کا حسین و سنگین امتزاج اور دردناک کاوش تھی۔''

فیصل آباد سے سیف الرؤف کا مشورہ ''چھ ماہ پہلے محفل میں شرکت کے لیے کی گئی ناکام کوشش کے بعد پھر حاضر ہیں۔ دسمبر سے ناراض ٹائٹل گرل جنوری کے استقبالی پھولوں کی خوشبو محسوس کرتی محسوس ہوئی تبصروں میں ہارٹ کچر بازی لے گئے۔ مرحا گل، محمد صفدر معاویہ، ادریس احمد خان، سید محی الدین، بنتِ ریحام، عبدالجبار رومی انصاری کے تبصرے بہترین تھے۔ طاہرہ گلزار اتنا ہنس کر شاید کوئی غم بھلانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ طاہرہ آنٹی کے لیے مفت کا مشورہ ہے کہ شکیل کاظمی کو درمیان میں ڈالنے کے بجائے کبیر بھائی اور ''خود'' کو خود ہی سمجھا لیں۔ کئی تبصروں میں رضوان تنولی صاحب کا ذکر دیکھ کر میں نہ جاننے کے باوجود تنولی صاحب کا غائبانہ فین ہو گیا ہوں اور انشاء اللہ انہیں اپنے فین ہونے کا ثبوت دینے کے لیے ہوا پہنچاتا رہوں گا۔ کہانیوں کا آغاز انگارے سے کیا اور آوارہ گرد، شہزی حسبِ معمول شہنشاہ جذبات بنا رہا۔ اس کی جذباتیت اور بے چینیوں کا کیا کہیں۔ انڈیا کی جیت کی طرح برداشت کرتے ہیں۔ آشیانہ، منظر امام کی یہ تحریر سیدھی دل پہ لگی جیسے ای جی کی فلائنگ چپلو لگتی ہیں۔ سلیقہ شعار ہماری دیسی خواتین اس کہانی کو پڑھ کر ایک دفعہ سوچ میں ضرور مبتلا ہوں گی۔ مریم کے خان کی جنونی میں اتنا اندازہ تو ہو گیا تھا کہ قاتل سراج بابا ہی ہے لیکن وجہِ قتل نے تجسس بنائے رکھا اور دل بہت افسردہ بھی ہوا۔ حقیقت میں جارج اور بیچارہ میں ہمنر کے ساتھ خواتین کا امتیازی سلوک اور دھوکا دہی مشترک تھی۔ سیر یا راض کی مطلبی بھی کافی معقول تھی۔ پگھلتے لمحے امجد رئیس کی سابقہ تحاریر کی طرح سنسنی اور تجسس سے بھرپور تھی۔ لیکن اس بار ایک تشنگی سی محسوس ہوتی رہی۔ دراز دست میں جہاں اعلیٰ دوستی دیکھنے کو ملی وہیں بڑا سبق بھی ہے فیس بک پر اس قسم کے بہت سے درندے پائے جاتے ہیں جو خواتین کو خوشنما باتوں سے بیوقوف بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ کچھ لوگوں کی ساتھی خواتین ہی اس گھٹیا کام میں شامل ہوتی ہیں جو لوگوں کے ساتھ روابط بڑھا کر بلیک میل کرنے میں مدد دیتی ہیں۔ انگارے کی یہ قسط بھی حسبِ سابق شاندار رہی۔ پردے والی سرکار کے پردے میں سرکاری حمایت یافتہ بندہ شاہ زیب کا کوئی زہریلا شناسا ہو سکتا ہے۔ امید کرتے ہیں کہ یاسر کو شاہ زیب مایوسی والی صورتِ حال سے نکال کر دایاں بازو بنائے گا۔ اشارہ کہانی میں واضح اشارہ ہے کہ آپ حق اور سچ پر رہیں تو کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ موت بھی قریب آ کر کچھ نہیں کہتی اور دوسرا اشارہ کہتا ہے کہ سیاست دانوں سے سیاست داں ہی نمٹ سکتے ہیں۔''

ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے محبت نامے شاملِ اشاعت نہ ہو سکے۔

شاکر لطیف، لاہور۔ (آپ کی کہانی مل گئی ہے، ابھی پڑھی نہیں گئی ہے) عبدالجبار رومی انصاری، چوہنگ۔ انجم ریاض، کراچی۔ انصار احمد، کراچی۔ وقار خان، پشاور۔ سونیا جمشید، کوٹری۔ محمد اقبال، کراچی۔ حنا کاشف، حیدر آباد۔ عمران ملک، ٹنڈو آدم۔ روبینہ حنیف، کراچی۔

ادارے کے دیرینہ قلمی رفیق کاشف زبیر علالت کے باعث اسپتال میں زیرِ علاج ہیں۔
قارئین سے التماس ہے کہ ان کی صحت یابی کے لیے دعا فرمائیں۔

چہرہ در چہرہ

احمد اقبال

لوگ کس طرح سے آئینے صفت جیتے ہیں
میں تو مر جاؤں اگر کوئی مقابل نہ رہے

جب تک زندہ رہنے کی ہلکی سی اُمید بھی ہوتی ہے... انسان خواب دیکھتا رہتا ہے۔ یہ اور بات کہ ان خوابوں میں بعض اوقات ڈرائونے خواب بھی ہوتے ہیں جن سے ہر کوئی چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا ہے...اس گرداب سے باہر نکلنا چاہتا ہے۔ کچھ خواب ایسے ہوتے ہیں کہ جن میں انسان ہمیشہ کے لیے ڈوبا رہنا چاہتا ہے اور کچھ خواب اس کے آئیڈیل ہوتے ہیں۔ آنے والے دنوں کی مسرت سے لبریز کچھ خواب جاگتی آنکھوں کے ساتھ دیکھے جاتے ہیں... ان کو انسان دیکھنا چاہتا ہے اور دیکھتا رہتا ہے۔ اس کی زندگی بھی خوابوں سے مزین تھی... اور ان کی تعبیروں سے ہمکنار بھی... مگر اچانک ہی آنکھ کھلنے پر سب کچھ بکھر کے ختم ہو گیا... خوابوں سے عذابوں تک سفر شروع ہو گیا... لیکن نہ تھکنے کا عزم رکھنے والی لڑکی کے قدم کہیں ٹھہرے نہ تھمے تھے... کیونکہ اس کے پاس پھر نئے خواب تھے... اور ان کی تعبیر پانے کے لیے تمام تر ہمت... حوصلہ اور خوب صورت دل اس کے زادِ راہ تھے...

زندگی حیات کی کشمکش اور الجھنوں میں ڈگمگاتے ہوئے چہروں کا سفر در سفر

ایمن نے گھڑی دیکھ کے چیرنگ کراس سے میوزیم تک پیدل ہی جانے کا فیصلہ کیا۔ وہ تین اسٹاپس کے فاصلے کے لیے بس میں سوار ہوتی تو دس پندرہ منٹ کا فرق پڑتا جس میں سے پانچ دس تو بس کے انتظار میں کھڑے کھڑے گزر جاتے۔ موسم کہیں گرمی اور سردی کے درمیان رُکا ہوا تھا اور پنڈولم کی طرح دو موسموں میں آگے پیچھے ہوتا رہتا تھا۔ آج دھوپ اچھی لگ رہی تھی۔ وہ آزادی اور ہلکے پن کے احساس کے ساتھ فٹ پاتھ پر چلتی چلی گئی۔ سڑک پر کاروں کا اژدحام جیسے ایک دوسرے کا تعاقب کرتا ہوا لگتا تھا۔

چیرنگ کراس پر اس کا موڈ چائے یا کافی پینے کا ہوا لیکن اب نہ بیڈن روڈ کی طرف والا شیزان کونٹی نینٹل تھا اور نہ کریارام کمپاؤنڈ والا شیزان اورینٹل جس کا مشرقی طرزِ آرائش ایمن کو بہت اچھا لگتا تھا۔ وہ جی پی او کی قدیم تاریخی عمارت اور ہائی کورٹ کی باوقار خالص مغل طرزِ تعمیر کا حسن رکھنے والی عمارت کے سامنے سے گزری تو اس کے دماغ میں پھر ایک پرانے خیال نے یلغار کی۔ آخر ایسا مشرقی حسن کا انداز رکھنے والی عمارات اب کیوں نہیں بنائی جاتیں، اس کے آگے ایک طرف پنجاب یونیورسٹی تھی تو دوسری طرف

لاہور میوزیم اور کارپوریشن گورنمنٹ کالج، کیسی عجیب ہے یہ بات کہ مشرقی طرزِ تعمیر کے یہ شہکار انہوں نے تخلیق کیے جو مغرب سے آئے تھے۔

میوزیم کے اندر لوگوں کی آمد ورفت کا سلسلہ جاری تھا۔ ایمن ایک اجنبی کی طرح سب کے درمیان سے گزری۔ پورے راستے میں سامنے سے آنے والے کسی شخص کی نظر اس پر ٹھہری تھی تو یہ اس کے حسن اور جدید ملبوس میں نمایاں لان کی کشش تھی۔ کسی نظر میں بھی شناسائی نہ تھی۔ کسی نے بھی نہیں کہا تھا... یار یہ ایمن تھی نا... وہی جو ماڈل ہے، پھر فلموں میں بھی آئی تھی۔ شہرت کے اس مقام تک پہنچنا ہنوز ایک خواب لگتا تھا جہاں ہر قدم پر پرستاروں کی نظر اس کا طواف کرے اور راہ چلتے ٹھٹک کے رک جائیں۔ اس سے آٹوگراف لیں۔ اس کے ساتھ تصویر بنوانے کا اعزاز حاصل کرنے کی التجا کریں۔ شاید اب وہ منزلِ وقت کے ساتھ پیچھے ہٹتی جا رہی ہے۔ وہ بھاگتے بھاگتے تھک جائے گی لیکن اس منزل کا حصول ایک خوابِ تمنا ہی رہے گا۔

اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ فلم یونٹ ابھی نہیں آیا۔ آ گیا ہوتا تو ان کی وین باہر ہی نظر آجاتی۔ پھر بھی اس خیال سے کہ وین فلم یونٹ کو اتار کے کسی اور کام سے نہ چلی گئی ہو، اس نے داخلے کا ٹکٹ لے لیا۔ وہ ٹکٹ دینے والے کو وضاحت کرتی کہ انہوں نے میوزیم میں ایک سین فلمانے کی اجازت حاصل کرلی ہے اور وہ یونٹ کا ایک حصہ ہے تو بکنگ کلرک کہتا کہ گیٹ کیپر کو بتا کے اندر جائیں۔ پھر یہی وضاحت دوبارہ ضروری ہوتی۔ ٹکٹ خرید لینا بہتر تھا۔ گیٹ کیپر کا کیا بھروسا بغیر ٹکٹ نہ جانے دے۔

اندر ہر طرف میوزیم دیکھنے کے لیے آنے والے بکھرے ہوئے تھے۔ ہر کوریڈور اور ہال میں اوپر نیچے عورتیں، مرد اور بچے وقت کی گرد میں گم ہو جانے والے ماضی کو اپنے اپنے تصور کے پیمانے سے دیکھ رہے تھے۔ فلم یونٹ کہیں نہ تھا۔ انہیں مہاتما بدھ کے دیو قامت مجسمے کو... نظر میں رکھتے ہوئے کچھ شاٹ لینے تھے مجسمہ پُرہیبت انداز میں تماشائیوں کو دیکھ رہا تھا۔ یہ ڈھائی ہزار سال پہلے گیا س برگد کے ایک درخت کے نیچے گیان حاصل کرنے والے کپل وستو کے شاہزادے کا آسن تھا جو نروان کے لیے راج پاٹ چھوڑ کے محل سے نکل آیا تھا۔

وہ بغیر دلچسپی کے وہاں پھرتی رہی۔ میوزیم اس نے بارہا دیکھا تھا۔ فلم یونٹ کو دیر ہوگئی تھی اور اسے بہرصورت انتظار کا وقت گزارنا تھا۔ اس نے کچھ کالج کی شوخ و دلربا لڑکیوں کو دیکھا جو کسی بس میں بھر کے آئی تھیں اور ہر طرف بکھر گئی تھیں۔ آج وہ یونیفارم کی پابندی سے آزاد تھیں چنانچہ ان کے جدید شوخ رنگوں والے لباس میوزیم کی آسیب زدہ فضا میں زندگی کے حسن کا احساس جگا رہے تھے۔ دوسرے کسی اسکول کے بچے تھے جو اِدھر سے اُدھر بھاگے پھر رہے تھے۔ ان کے سامنے ابھی ایک طویل پُرامید مستقبل تھا اور وہ نہیں جانتے تھے کہ ان کا بھی مستقبل بالآخر ماضی کا حصہ بنے گا۔ جو میوزیم کے دیوار و در میں قید تھا۔ نسبتاً بڑے لڑکے کالج کی لڑکیوں کو متوجہ کرنے کی کوشش میں مصروف تھے۔ ایمن سب کے درمیان اکیلی تھی۔ اس کی طرف کوئی متوجہ نہ تھا۔

اچانک ایک سنجیدہ صورت شخص اس کے سامنے رک گیا۔ ''ایکسکیوزمی، آپ ایمن ہیں؟''

ایمن کے لبوں پر ایک فخریہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

''جی، میں ہی ایمن ہوں۔''

''آپ کی تین یا چار فلمیں دیکھی تھیں میں نے۔'' وہ یاد کرتے ہوئے بولا۔ ''کمال اداکاری تھی آپ کی۔''

''وہ آرٹ مووِیز تھیں۔''

''اب آپ صرف اشتہاروں میں کیوں آرہی ہیں، فلم کیوں نہیں کرتیں؟'' وہ بولا۔

ایمن اس سوال کے لیے تیار تھی۔ ''دیکھیے آرٹ مووِیز باکس آفس پر کم بزنس کرتی ہیں۔ ایوارڈز زیادہ لیتی ہیں اور اب پروڈیوسر صرف پیسا کمانا چاہتے ہیں۔ میں پہلے اسکرپٹ دیکھتی ہوں۔ یہ کالا گجر اور رشید ابدمعاش جیسی فلمیں نہیں کرسکتی میں۔''

''خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔'' وہ رسماً بولا اور ہاتھ مصافحے کے لیے آگے بڑھائے بغیر چلا گیا۔ بے شک کسی اجنبی عورت کا پبلک پلیس پر کسی اجنبی مرد سے ہاتھ ملانا معیوب تھا مگر وہ کوئی گھریلو جاہل عورت نہیں تھی۔ شوبز کی شخصیت تھی۔ وہ ہاتھ آگے کرتا تو ایمن ضرور اسے یہ اعزاز عطا کرتی اور کچھ نہ سہی اس سے آٹوگراف ہی لیتا۔ بس ایک جملہ تعریف کا اور ایک سوال۔ وہ سوال جو ہر جگہ کیا جاتا تھا۔ وہ کسی سے کیسے کہہ سکتی تھی کہ اسے اسکرپٹ کا نہیں کسی پروڈیوسر ڈائریکٹر کی نظرِ انتخاب کا انتظار ہے۔ اگر کوئی اسے آج کے شوخ اور بے باک رول کے لیے منتخب کرنے کا نہیں سوچتا تو وہ کیا کرے۔ ان کے سامنے جا کے پوچھے کہ آخر کیا کمی ہے مجھ میں... ابھی میری عمر بتیس سال ہے۔ جینوئن

بتیس۔۔۔ میں ایک سالگرہ دو یا تین سال نہیں کرتی اور میں چوبیس پچیس کی نوخیز لڑکی نظر آتی ہوں یا ایسا کہنے والے جھوٹے ہیں؟ میرے جسم کی کشش کو اپنی نظر سے دیکھو یا کیمرے کی آنکھ سے۔۔۔ یا اعداد و شمار سے۔۔۔ مجھے کوئی خوش فہمی نہیں کہ میں کسی سے کم نہیں۔۔۔ پھر کیا بات ہے تم مجھے کسی رول کے لائق نہیں سمجھتے؟ تم جانتے ہو کہ میں ڈانس کر سکتی ہوں اور آئٹم سونگ کرنے کو بھی تیار ہوں۔

ایک گہری ٹھنڈی سانس لے کر وہ بینچ پر بیٹھ گئی۔ فلم یونٹ کا اب تک نہ آنا اس کے ذہن میں ایک اندیشے کو جگا رہا تھا۔ کہیں شوٹ کینسل تو نہیں ہو گیا؟ ایسا ہوتا تو وہ مجھے مطلع کرتے اور کینسل ہونے کا کیا سوال جب سب فائنل ہو چکا۔ ٹی وی پر اشتہار چلنے کا ایگریمنٹ ہو چکا۔ یہ چاکلیٹ ڈرنک بنانے والی ایک کمپنی کا اشتہار تھا جس میں ایمن کو ایک ٹین ایجر کی طرح نظر آنا تھا۔ شوخ، چنچل، بے پروا، چاکلیٹ کے ذائقے اور لطف میں گم، سرشار اور بے خود۔۔۔ اس کا لباس بھی ایسا ہی تھا۔ مگر وہ ٹین ایجر نظر نہ آتی تو اسے یہ اشتہار بھی کیوں ملتا۔۔۔ شاید اشتہار کے ٹی وی پر چلنے کے بعد فلمساز اس کی طرف متوجہ ہوں۔ ٹین ایجر نہ نظر آئے مگر بتیس سال تو کوئی عمر نہیں۔ پینتالیس پچاس کی نہ جانے کتنی فلم ورلڈ اور تماش بینوں کے دلوں پر راج کر رہی ہیں۔

فون کی گھنٹی نے اسے چونکایا۔ اس کے ہیلو کہتے ہی ڈائریکٹر صاحب نے بجنا شروع کر دیا۔ ''ارے بھئی ایمن، وہ کیا ہے کہ اب یہ۔۔۔ ویگن دھوکا دے گئی عین وقت پر۔۔۔ مگر ایک مکینک کو لانے میں وقت لگا پھر بھی گھنٹا تو لگے گا اور۔۔۔'' انہوں نے جیسے اچانک بولنا شروع کیا تھا ایسے ہی اچانک بند کر دیا۔ ایک گھنٹے کا مطلب دو گھنٹے ہو سکتا تھا چنانچہ ایمن نے گھڑی دیکھ کے باہر جانے اور کچھ کھانے پینے کا سوچا۔ گیٹ کیپر نے اس کی وضاحت کو خوش دلی سے قبول کیا جو اس لیے ضروری تھی کہ وہ دوبارہ ٹکٹ خریدنے کے موڈ میں نہیں تھی۔ بھوک سے زیادہ پیاس کا غلبہ تھا چنانچہ وہ ٹالنٹن مارکیٹ سے گھوم کر اپنی انارکلی کی فوڈ اسٹریٹ میں چلی گئی جہاں سے اسے گزارے لائق سینڈوچ مل گئے جو وہ کولڈ ڈرنک کے ایک کین کے ساتھ کھا سکتی تھی۔ رش سے بچ کے وہ میوزیم میں لوٹ آئی اور باہر ہی ایک بینچ پر بیٹھ گئی۔ اس کے بالکل سامنے سووینئر فروخت ہو رہے تھے وہ آنے جانے والوں کو دیکھتی رہی۔ اسکول کے بچے اب باہر آ کے بس میں ادھم مچا رہے تھے۔ بہت سے محبت کرنے والوں کے لیے بھی یہ جائے امان تھی۔ وہ میوزیم کی راہداریوں میں ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے پھرتے رہیں، اعتراض کوئی نہیں کرتا تھا۔

کچھ دیر پہلے ایمن نے ایک نسبتاً تاریک راہداری کے موڑ پر سولہ سترہ سال کے ایک لڑکے کو اپنے سے بھی کم عمر کی لڑکی کو چومتے دیکھا تھا اور وہ گھبرا کے ایک دم الگ ہوتے ہی ایمن سے نظر ملائے بغیر مخالف سمت میں نکل گئے تھے۔ اب ایمن نے پھر انہیں باہر آتے ہوئے دیکھا تو وہ آگے پیچھے اجنبی بن کے گیٹ کی طرف جا رہے تھے۔ ایمن انہیں دیکھ کے مسکرائی تو وہ جھینپ کر دوسری طرف دیکھنے لگے۔ یہ عمر ہی ایسی ہوتی ہے کہ جوانی دل کے دروازے پر دستک دیتی ہے تو رومان پرور خیالوں کی دنیا آباد ہو جاتی ہے اور دنیا کی نظر میں دھول جھونک کے عشق کا سنسنی خیز تجربہ کرنا ان یادوں کا حصہ بن جاتا ہے جو عمر بھر ساتھ رہتی ہیں۔

☆☆☆

خود ایمن کی عمر سولہ سال تھی اور وہ فرسٹ ایئر میں پڑھتی تھی جب ارشد کے عشق نے اس کی آنکھوں اور عقل پر دیوانگی کے پردے ڈال دیے تھے۔ اس سے پہلے کے دو تین تجربات میں دل لگی تھی اور وہ نوعمری کے کھیل تھے۔ ارشد نیا نیا انگریزی کا لیکچرر مقرر ہو کے آیا تھا اور اتنا خوش شکل خوش پوش اور خوش مزاج تھا کہ روز اول ہی فرسٹ ایئر کی پوری کلاس کی لڑکیوں کی آنکھوں سے ان کے دل میں اتر گیا تھا۔ چنانچہ جب اس کی نظر نے ایمن کا انتخاب کیا تو معاملہ بہت سنگین ہو گیا۔ اپنی خوش نصیبی پر تو ایمن کو شک نہ تھا لیکن اس کے لیے پوری کلاس کی لڑکیوں سے رقابت مول لینا آسان نہ تھا۔ یہ بھی ناممکن تھا کہ ان کے عشق کا راز افشا نہ ہو۔

ایمن کی الجھن خود ارشد نے دور کر دی۔ اس نے چند ملاقاتوں کے بعد ہی پوچھ لیا۔ ''مجھ سے شادی کرو گی؟''

وہ بے ہوش ہوتے ہوتے بچی۔ اس وقت وہ ایک اوپن ائر ریسٹورنٹ کی چھت پر بیٹھے تھے اور شام ڈھل چکی تھی۔ ایمن کی تو جیسے زبان ہی گنگ ہو گئی اور اس کا حلق سوکھنے لگا۔ اس نے جگ سے گلاس میں پانی ڈال کے پیا۔

''یہ۔۔۔ کیا کہہ رہے ہو تم؟'' وہ ہکلائی۔

''وہی جو تم نے سنا جو میرے دل کا بھی فیصلہ ہے اور دماغ کا بھی۔''

''لیکن، ارشد، تمہارے ماں باپ۔۔۔ اور

میرے...''

''ان کو منانا میرا کام... تم اپنی بات کرو، ہاں یا نہ... مجھے ابھی جواب چاہیے۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولا۔

''ارشد! بہت بدنامی ہوگی میری کلاس میں۔ میں آگے کیسے پڑھوں گی؟''

وہ ہنسا۔ ''یہاں پڑھنا کیا فرض ہے۔ تم دوسرے کالج میں داخلہ لے سکتی ہو اور کالج جانا بھی کون سا فرض ہے میں تم کو ایف اے کا امتحان دلواؤں گا اسی سال، پرائیویٹ... پھر بی اے...''

اس نے اپنا ہاتھ ارشد کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ ''بس اب یہ مت کہنا کہ ایف اے بی اے کرنا بھی کون سا فرض ہے۔''

''کیا مطلب؟ بی اے کے بعد شادی کروگی؟'' اس کا چہرہ اُتر گیا۔

''نہیں، شادی کے بعد بی اے کروں گی۔'' وہ مسکرائی۔

ارشد کا چہرہ دمک اٹھا۔ گردوپیش کا احساس نہ ہوتا تو وہ شدتِ جذبات سے مغلوب ہو کے اسے یوانہ وار چوم لیتا ان کے درمیان ہونے والا یہ زندگی بھر کا عہدِ رفاقت ابھی خاندان کی توثیق کا طلب گار تھا۔ چونکہ ابتدا ارشد کی طرف سے ہونا تھی اس لیے ایمن نے خاموشی اختیار کیے رکھی۔

ارشد کو اپنے گھر میں مزاحمت کا سامنا رہا۔ اس کے والد کا سوشل اسٹینس بہت بہتر تھا اور ارشد پہلے ہی ان کی توقعات پر پورا نہیں اترا تھا۔ بزنس میں ان کا جانشین بننے کے بجائے وہ لیکچرر بن گیا تھا۔ اس کی جگہ چھ سال چھوٹے امجد نے بہت بعد میں لی مگر وہ باپ کی توقعات پر پورا نہیں اترا تھا۔ وہ لاابالی شوقین مزاج اور ذہانت میں کم تر تھا۔ دوسری وجہ ارشد کی ماں کی توقعات تھیں جو اس نے ارشد کا رشتہ ایک اور جگہ طے کرنے کے خیال سے وابستہ کرلی تھیں۔ وہ لوگ بھی بزنس پیشہ تھے اور ان کی لڑکی کسی طرح بھی اس کی ماں کے خیال میں... کم نہ تھی۔ نہ حسن میں نہ تعلیم میں، نہ اخلاق و آداب میں اور ارشد سے پوچھے بغیر وہ لڑکی کی ماں پر اپنا عندیہ ظاہر کرچکی تھی۔ تیسری وجہ ایمن کے خاندان کی روشن خیالی بن گئی۔ ان کے گھر کا ماحول ذرا بھی مذہبی نہ تھا۔ باپ اپنی بیٹی اور بیوی کے ساتھ فلم دیکھنے سینما ہال جاتا تھا۔ نہ لڑکی پردہ کرتی تھی نہ اس کی ماں۔

جیت بہرحال ارشد کی ضد کی ہوئی۔ بالواسطہ طور پر اس نے کہلوادیا کہ شادی تو ایمن سے ہی ہوگی باضابطہ طور پر نہ سہی بے ضابطہ سہی۔ وہ پیغام لے کر جانے پر مجبور ہوئے۔ خیال انہیں ارشد کے جذبات کا نہیں سوسائٹی میں اپنی عزت خراب ہونے کا تھا جس سے ارشد کی بہنوں کے لیے آنے والے رشتوں پر برا اثر پڑتا۔ رشتہ بہت اچھا تھا لیکن ان کے خیال میں ایمن کی عمر کم تھی اور اسے کم سے کم بی اے کرنے تک ازدواجی ذمے داریوں سے دور رکھنا ضروری تھا۔ ایمن کو تعلیم کا کتنا شوق تھا اس کے پیشِ نظر وہ سمجھتے تھے کہ انہوں نے رشتہ منظور کیا تو وہ کہرام مچائے گی کہ ایسی جلدی کیا ہے کون سی میری عمر نکلی جارہی ہے۔ ادھر لڑکے والے مہلت کے لیے راضی نہ تھے۔

ایمن کے ماں باپ نے انکار کے لیے ایمن کی مرضی کو ڈھال بنانے کا سوچا تھا مگر انہیں سخت حیرانی ہوئی جب ایمن نے سعادت مند بیٹیوں کی طرح سر جھکا کے کہا کہ جیسی آپ کی مرضی... انہوں نے مختلف طریقوں سے انکار کے اسباب ایمن کو فراہم کیے کہ لڑکیوں کی شادی بیس سال سے پہلے نہیں کرنی چاہیے اور تعلیم کا سلسلہ بی اے تک چلتا تو اچھا تھا۔ اس کے بعد وہ ایمن سے پوچھتے تھے کہ پھر بتاؤ تمہاری کیا مرضی ہے؟ اور وہ پھر والدین کے کندھے پر بندوق رکھتے ہوئے کہتی تھی کہ میں کیا کہوں، آپ بہتر جانتے ہیں۔

جھنجلا کے ایمن کے والد نے کہا۔ ''ٹھیک ہے پھر ہم کہہ دیتے ہیں کہ لڑکی پہلے بی اے کرنا چاہتی ہے۔''

ایمن نے ہمت کرکے کہہ دیا۔ ''مگر میں نے تو ایسا نہیں کہا۔''

اس کے والد کے لیے یہ جواب غیر متوقع تھا۔

''یعنی... بی اے نہیں کرنا تمہیں...''

''میں نے یہ بھی نہیں کہا۔'' ایمن نے اسی لہجے میں کہا۔

اور اس وقت ایمن کی ماں اپنے کوڑھ مغز شوہر کو جائے واردات سے لے گئی۔ ''اب کیا وہ منہ پھاڑ کے کہے کہ مجھے رشتہ منظور ہے، تم سمجھتے کیوں نہیں؟''

''سمجھوں خاک میں، لیکن ایک بات بتادوں، یہ بی اے نہیں کرپائے گی تمہاری طرح...''

اور یہ اس لحاظ سے مختلف شادی تھی کہ میاں بیوی کے ساتھ قاضی بھی راضی تھا۔ والدین مجبور تھے۔ ایمن کو شادی کے فوراً بعد دونوں گھروں کے مزاج اور ماحول کا فرق پتا چل گیا۔ پہلی رات ہی ساسو ماں نے دروازہ بجا کے بجانا شروع کیا۔ ''اب کیا شادی کی خوشی میں نماز کا فرض بھی بھلا دوگے؟'' اور ان کو اٹھنا پڑا۔ اگلے ایک ہفتے میں ایمن کو

اندازہ ہوگیا کہ وہ کسی طرح بھی ارشد کے والدین کی پسند نہیں اور بن بھی نہیں سکتی۔ صورتِ حال کے خانہ جنگ میں بدلنے سے پہلے ارشد نے کرائے کا گھر لے لیا جو تاجر پیشہ باپ کی کوٹھی کے سرونٹ کوارٹر جتنا تھا لیکن ان دو کمروں کے گھر میں سکون تھا اور عافیت تھی۔ رفتہ رفتہ ارشد نے اپنی بچت میں سے ضرورت کا تمام اسباب لے لیا۔ سوائے کار کے۔ ایک لیکچرر کی تنخواہ میں یہ ممکن نہیں تھا۔ وہ موٹر سائیکل پر کالج جاتا تھا، کچھ ٹیوشن پڑھاتا تھا اور شام کے بعد یا چھٹی والے دن وہ گھومتے تھے۔ والدین سے سلام دعا ارشد کر لیتا تھا۔ وہ صرف عید بقرعید سلام کرنے چلی جاتی تھی۔

ایک شام وہ گوالمنڈی کی فوڈ اسٹریٹ میں کھانے کے بعد تازہ تازہ امرتیاں بنانے والے کے پاس کھڑے تھے کہ کسی نے کہا۔ ''سر ارشد...''

ایمن نے بھی پلٹ کے دیکھا تو اسے چار لڑکیوں کا ایک گروپ نظر آیا۔ وہ سب ارشد کی شاگرد تھیں اور ان میں سے ایک کو ایمن بھی یاد تھی جو اس کے ساتھ بیٹھتی تھی۔ انہیں بھی علم تھا کہ سر ارشد نے شادی کے لیے چھٹی لی ہے اور اس خبر نے پوری کلاس کی امیدوں پر اوس ڈال دی تھی لیکن یہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ سر ارشد نے اس پوری کلاس میں سے جس کو منتخب کیا ہے وہ اب کالج نہیں آتی۔

ارشد نے مسکرا کے کہا۔ ''ہیلو بھئی... ان سے ملو، میری نصف بہتر۔''

''ہم جانتے ہیں انہیں سر، یہ ہماری کلاس میں تھیں۔'' ایمن سے کسی نے ہاتھ نہیں ملایا۔

''اب کل یہ بریکنگ نیوز سارے کالج میں نشر ہوگی۔ خیر جو کل ہوتا آج ہوگا۔ تم امرتی کھاؤ۔'' ایمن نے کہا۔

ایک سال بعد حمیرا پیدا ہوئی۔ یہ نام بعد میں حمیر ہوگیا کیونکہ ایمن کی طرح حمیر بھی ایک راگ تھا۔ یہ نکتہ ایمن کے والد نے پیدا کیا تھا جو موسیقار تو نہیں بن سکے تھے مگر موسیقی پر عبور رکھتے تھے اور ستار بھی بجاتے تھے۔ ارشد دوسرے دن اترے ہوئے چہرے کے ساتھ نمودار ہوا تو ایمن نے پوچھا۔ ''کیا ہوگیا؟ رونی شکل کیوں بنا رکھی ہے؟''

'امی اور ابا نہیں آئے۔ حالانکہ میں نے پہلے انہیں ہی بتایا تھا۔''

ایمن نے تلخی سے کہا۔ ''ان کو گلہ ہوگا مجھ سے کہ بیٹا کیوں پیدا نہیں کیا۔''

ارشد نے نظر اٹھا کے آہستہ سے اقرار میں سر ہلایا۔

''مجھے ان سے یہ امید نہیں تھی۔''

اس دن کے بعد سے ارشد کا اپنے گھر سے تعلق عملاً ختم ہوگیا لیکن اسپتال سے ایمن کے ڈسچارج ہونے سے پہلے ارشد کا ایک دوست اپنی ڈاکٹر بیوی کے ساتھ آیا۔ اس نے ایمن سے پوچھا۔ ''تمہارا اور بچی کا بلڈ گروپ کا ٹیسٹ ہوا؟''

''نہیں، مجھے اپنا تو پتا ہے، حمیرا کا خون کسی نے لیا ہو گا تو اس وقت جب وہ نرسری میں تھی۔''

''ان سے پوچھو، اچھا میں بات کر کے آتی ہوں۔'' وہ باہر نکل گئی اور آدھے گھنٹے بعد لوٹی۔

ایمن نے اسے غور سے دیکھا۔ ''کیا ہوا بھابی؟''

''کچھ نہیں، وہ ہوا جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔ پیدائش کے بعد ماں بچے کا بلڈ گروپ ٹیسٹ کرنا ضروری ہوتا ہے۔ چوبیس گھنٹے کے اندر بعض صورتوں میں خرابی سامنے آتی ہے تو گاما گلوبلین کا ایک انجکشن بچا لیتا ہے۔''

ایمن گھبرا گئی۔ ''اور انجکشن نہ لگے تو...؟''

اس نے اپنے شوہر کی طرف دیکھا اور پھر سچ بتا دیا۔ ''آئی ایم سوری، یہ اسپتال والوں کی غفلت ہے۔ اب تم دوبارہ ماں نہیں بنو گی۔''

ایمن اور ارشد پر بجلی سی گر پڑی۔ ''میں کیس کروں گا ان پر۔'' ارشد نے برہمی سے کہا۔

مہمان ڈاکٹر نے نرمی سے کہا۔ ''کوئی فائدہ نہیں۔ وہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے بتا دیا تھا۔ تم نے مخالفت کی یا انجکشن لا کے نہیں دیا۔ وہ تو یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ انجکشن لگایا تھا۔ اثر نہیں کیا۔ شاید خراب ہوگا۔ لایا تو شوہر ہی تھا۔''

ارشد اور ایمن نے نوشتۂ تقدیر کو قبول کر لیا۔ ان کی جان اب اپنی بیٹی میں اٹکی رہتی تھی۔ پرورش کے اخراجات بڑھے اور نظر آ رہا تھا کہ وہ بہترین تعلیم دلوانا چاہیں گے تو اخراجات مزید بڑھیں گے۔ ارشد لکھ سکتا تھا۔ ایک دوست کے تعارف نے اسے ایک ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں پہنچا دیا۔ ارشد کی سب کو دوست بنا لینے کی عادت بھی کام آئی۔ صلاحیت بھی اور قسمت نے بھی ساتھ دیا۔ اس کے لکھے ہوئے تین اشتہار اور دو گانے (JINGLE) ہٹ ہو گئے۔ اسے ایک بڑی کمپنی نے بلا لیا۔ تاہم ارشد نے لیکچرر شپ اور ٹیوشن جاری رکھی۔ اشتہار لکھنا پارٹ ٹائم جاب تھا جس کے لیے اس کا آفس میں بیٹھنا ضروری نہیں تھا۔

ارشد اب کالج سے فارغ ہو کے ایڈ ایجنسی چلا جاتا تھا۔ کام زیادہ ہوا تو اس نے ٹیوشن دینا چھوڑ دیا۔ شام کو بھی کبھی ایمن بھی حمیرا کے ساتھ ایجنسی پہنچ جاتی تھی۔ ان کے

اسٹوڈیوز اوپر کی منزل پر تھے۔ وہاں وہ اشتہاروں کی شوٹنگ دیکھتی تھی اور اس کی ملاقات ماڈلز سے بھی ہوتی تھی اور ٹی وی اسٹارز سے بھی۔ تین سال میں ایڈ ایجنسی ایک بڑی عمارت میں منتقل ہوئی اور ارشد کو بالآخر لیکچررشپ کو خیرباد کہنا پڑا۔ اب اس کی ماہانہ تنخواہ اتنی تھی کہ وہ گلبرگ کے ایک بنگلے کا پورشن کرائے پر لے چکے تھے اور انہیں کمپنی نے گاڑی بھی فراہم کر رکھی تھی۔ دوپہر کو گاڑی کو ایک ڈرائیور واپس گھر لاتا تھا۔ وہ حمیرا کے اسکول جاتی تھی۔ اسے پک کر کے وہ بھی اسٹوڈیو چلی جاتی تھی۔ وہاں وہ سب کے ساتھ کھانا کھاتی تھی اور سب کی باتیں سنتی تھی۔ وہ لوگ اب ایک مکمل اور جدید پروڈکشن ہاؤس بنا رہے تھے اور ان کا ارادہ فلم سازی کے میدان میں قدم رکھنے کا تھا۔ پاکستان میں فلمسازی کا نیا دور شروع ہونے کو تھا۔ اس کے لیے نیا آئیڈیا دے کر اسکرپٹ لکھنا ارشد کے لیے ایک چیلنج بن گیا تھا۔

حمیرا نے ہوش سنبھالنے سے شوبزنس کی دنیا دیکھی۔ وہ آٹھ سال کی عمر سے سب میں مقبول تھی کیونکہ وہ بولتی بہت تھی۔ اس کی باتوں پر ماڈلز اور ٹی وی ایکٹر سب بہت ہنستے تھے۔ ایک بار اس نے ٹی وی ڈرامے کا سین دیکھ کر اگلے دن اداکارہ سے سوال کر لیا۔ ''آپ نے اپنی ساس کے سر پر وہ چمچہ کیوں نہیں مارا جو آپ کے ہاتھ میں تھا؟''

''اس کا سر پھٹ جاتا۔'' وہ ہنستے ہنستے بولی۔

''مگر اس نے جھوٹ بولا تھا انکل سے۔'' اس کی مراد ٹی وی ڈرامے والے شوہر سے تھی۔

وہ بہت معروف اداکارہ تھی اور کئی چینل پر ڈراموں میں نظر آتی تھی۔ حمیرا یہ بھی پوچھتی تھی کہ وہاں تو فلاں آپ کے شوہر تھے اور دوسری جگہ وہ آپ کے بھائی بنے تھے۔ یہ تو نہیں ہوسکتا۔''

لیکن رفتہ رفتہ وہ سمجھ گئی کہ ایکٹر کو جو لکھ کے دیا جاتا ہے وہی بولنا ہوتا ہے اور یہ کہ اس کے پاپا ہی یہ ڈائیلاگ لکھتے ہیں۔ پھر وہ باپ سے بحث کرتی تھی۔ ''پاپا، یہ کیوں لکھا تھا آپ نے؟''

ایسا ہی کوئی موقع تھا جب کسی اشتہاری فلم کی شوٹنگ کے لیے پورا یونٹ تیار بیٹھا تھا اور ماڈل جو ایک نامور ایکٹرس تھی شوٹنگ کے لیے نہیں پہنچی۔ یہ کوئی ایسا واقعہ نہیں تھا کہ قیامت آجاتی۔ سب ہی تھوڑا بہت لیٹ آتی تھیں اور بعض اوقات غیر حاضر ہو جاتی تھیں۔ لیکن وہ بڑے سلیقے سے جھوٹ بول کے معذرت کر لیتی تھیں۔ یہ ماڈل عادی مجرم تھی اور معذرت وغیرہ کی قائل نہ تھی۔ اس دن ڈائریکٹر کا دماغ گھوم گیا۔ اس نے اعلان کر دیا۔ ''بس آئندہ کسی پروجیکٹ میں یہ نہیں ہوگی۔''

اس وقت جب باقی سب بھی اپنی اپنی بول رہے تھے فوٹوگرافر کو نہ جانے کیا سوجھی کہ اس نے دو انگوٹھوں اور شہادت کی دو انگلیوں کا فریم بنا کے ایمن کو فوکس کیا جیسے وہ ہو۔ ''پرفیکٹ، بالکل پرفیکٹ۔'' اس نے خود کہا مگر دوسروں کو سنانے کے لیے... سب اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

مطلب بھی سب نے سمجھ لیا تھا چنانچہ ساری نظریں گھوم کے ایمن کے چہرے پر فوکس ہوگئیں۔ خاموشی کے دو فیصلہ کن منٹ گزر گئے تو ڈائریکٹر نے دوسروں کی طرف دیکھا جن میں ایمن کا شوہر اسکرپٹ ڈائریکٹر بھی شامل تھا۔

''یہ ہوسکتا ہے۔ کیوں ارشد؟''

''بھائی مجھ سے کیوں پوچھتے ہو، جس کا چہرہ ہے اس سے پوچھو۔'' ارشد نے سر کھجایا۔

''اوکے، ایمن! اب میں بھابی نہیں کہوں گا تمہیں...'' ڈائریکٹر بولا۔ ''سامنے آؤ۔'' ڈائریکٹر بولا۔

وہ بوکھلائی۔ ''کیا مطلب؟''

''مطلب کیا، تمہارا آڈیشن ہوگا۔ ابھی، چلو اٹھو۔''

ایمن نے ارشد کی طرف دیکھا تو اس نے مسکراتے ہوئے سر ہلا دیا۔ وہ دھڑکتے دل سے اٹھی اور کیمرے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ اسے اسکرپٹ دے کے ڈائریکٹر نے ایکشن سمجھا دیا۔ پھر لائٹس آن ہوئیں تو جیسے سب کچھ ایمن کی نظر سے اوجھل ہوگیا۔ اس نے دل کو مضبوط کیا اور اسکرپٹ کو ہدایات کے مطابق بول دیا۔ لائٹس آف ہونے کے بعد اس نے ڈائریکٹر کو شور کرتے سنا۔ شاٹ اوکے ہوگیا تھا۔ سب اسے اور ارشد کو مبارک باد دے رہے تھے۔

''لوجی کوہ نور ہیرا ہماری تجوری میں اور ہم باہر تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ بھاڑ میں جائے وہ الو کی پٹھی... تم جاؤ ایمن، گیٹ ریڈی فار دی شاٹ... تم نے آج ہم سب کو تباہی سے بچالیا۔ کلائنٹ تو مجھے الٹی چھری سے ذبح کر دیتا۔ ان کا ایگریمنٹ فائنل ہے کہ اشتہار کب چلے گا۔''

خوشی سے ایمن کے ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے۔ خیال تو اسے اکثر آتا تھا کہ وہ بھی ماڈلنگ کرے۔ کوشش کرنے میں حرج کیا ہے اور بولنے والے ماڈلز کے بارے میں جو چاہیں کہیں۔ یہاں تو گھر کی بات ہے۔ جو ہوگا ارشد کے ساتھ اور اس کے سامنے ہوگا۔ پھر بھی وہ ڈرتی تھی کہ

شوہر کتنا ہی محبت کرنے والا ہو، ازدواجی زندگی میں حکم اسی کا چلتا ہے اور نوّے فیصد مرد حاسد ہوتے ہیں۔ بیوی کو ذاتی ڈائری کی طرح پرائیویٹ سمجھتے ہیں اور پبلک میں نہیں لانا چاہتے۔ کچھ بیوی کی شہرت یا ترقی نہیں دیکھ سکتے تو کچھ کے لیے عورت کی کمائی کھانا غیرت کا مسئلہ بن جاتا ہے۔ اسے خوشی ہوئی اور اس کا اعتماد ارشد پر پہلے سے زیادہ بڑھ گیا۔

دو دن میں شوٹنگ مکمل ہوگئی۔ قواعد وضوابط کے مطابق ایگریمنٹ سائن ہوا۔ کسی بھی نئی ماڈل کو پہلی بار معاوضہ یا تو ملتا نہیں کہ چانس جو مل رہا ہے اور ملے تو برائے نام۔ لیکن ایمن کو وہی معاوضہ ملا جو غیر حاضر ہونے والی ماڈل کو دیا جاتا یہ خصوصی عنایت ارشد کی وجہ سے ہی تھی۔ اشتہار چلا اور ایمن نے شوہر کے ساتھ گھر بیٹھ کے ٹی وی پر دیکھا۔ میک اپ اور کیمرے کی نظر نے اسے کیا سے کیا بنا دیا تھا۔ وہ دم بخود بیٹھی رہی اور ارشد تو خوشی سے پاگل ہوگیا۔ ''تم نے دیکھا ایمن، جو میری نظر نے بہت پہلے دیکھ لیا تھا وہ کیمرے کی آنکھ نے آج دیکھا۔ تم مس ورلڈ ہو۔ کوہ قاف کی پری ہو، حور ہو...'' وہ ہنستی رہی اور رات تک اس اشتہار کو ہر چینل پر دیکھتی رہی۔

رات کو کھانے کے بعد اس ماڈل کا فون آگیا جس کی جگہ ایمن نے لی تھی۔ ''یہ تم نے اچھا نہیں کیا۔''

''جو مجھ سے کہا گیا، میں نے کر دیا۔''

''جھوٹ مت بولو۔ تمہارے شوہر کی سفارش نہ ہوتی تو میں دیکھتی...''

ایمن نے سنبھل کے کہا۔ ''آگے چل کے تم بہت کچھ دیکھو گی جو تمہارے لیے اچھا نہیں ہوگا۔'' اور فون بند کر دیا۔

دوسرے اشتہار کا کنٹریکٹ اسے فوراً ہی مل گیا۔ آگے چل کے اسے ٹی وی ڈراموں کے رول ملنے تھے اور فلموں کے کردار بھی۔ لیکن ایک چال کا کسی کو اندازہ نہ تھا جو تقدیر چل چکی تھی۔ ارشد کے ماں باپ پاکستان سے آسٹریلیا شفٹ ہو چکے تھے۔ وہاں کی شہریت انہوں نے سرمایہ کاری کر کے حاصل کی تھی۔ کئی سال بیٹے سے لاتعلق رہنے کے بعد ماں کو بیماری میں اس کی یاد آئی اور انہوں نے فون کر دیا۔

ارشد نے رات کو سونے سے پہلے اسے بتایا۔ ''امی بیمار ہیں، مجھے بلا رہی ہیں، جاؤں؟''

''میں کیا کہوں، جا سکتے ہو تو جاؤ۔''

''انہوں نے کہا ہے کہ حمیرا کو ساتھ لاؤ، ہم ایک ہفتے میں واپس آجائیں گے۔ میں اپنے کام کا نقصان نہیں کر سکتا۔''

ایمن نے تلخی سے کہا۔ ''میرا داخلہ ابھی تک ممنوع ہے ان کے گھر میں؟''

''تم کہتی ہو... تو میں بہانہ کر دیتا ہوں۔''

''نہیں ارشد، خدانخواستہ کچھ ہوگیا تو میں زندگی بھر شرمندہ رہوں گی، تم جاؤ۔''

ایک ہفتے بعد ایمن نے باپ بیٹی کو سی آف کیا اور ائرپورٹ سے سیدھی اسٹوڈیو چلی گئی۔ لاہور کا نیا ائرپورٹ مخالف سمت میں شہر سے باہر تھا۔ ملتان روڈ کی ٹریفک سے گزر کے اسٹوڈیو پہنچنے تک اسے ایک گھنٹا لگ گیا۔ لوگ پہلے سے سنجیدہ اور چہرے لٹکائے بیٹھے تھے۔ اسے دیکھتے ہی پریشان اور بدحواس نظر آنے لگے۔ سب کچھ بند تھا۔ سب چپ بیٹھے اس سے نظریں چرا رہے تھے۔

''کیا بات ہے؟'' اس نے بیٹھنے کے بعد سوال کیا۔ ''فضا اتنی ماتمی کیوں ہے؟''

اور بالآخر اسے پتا چلا کہ وہ فلائٹ جس سے ارشد اور حمیرا آسٹریلیا جا رہے تھے کہیں سمندر میں گر گئی ابھی ایک سال پہلے دو ماہ کے وقفے سے اس کے والدین چلے گئے تھے۔ یکلخت جیسے دنیا بدل گئی۔ اس کے پاس کچھ نہ رہا جس کے لیے وہ زندہ رہتی۔ ارشد کے ساتھی اور دوست بھی اس کے غمگسار بنے اور انہوں نے دن رات کی غم گساری اور ہمدردی سے اسے ہمت دی اور قائل کرلیا کہ وہ جینے کے بہانے اور سہارے تلاش کر سکتی ہے۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے۔ حادثات تو آتے ہیں لیکن مرنے والوں کے ساتھ کون مرتا ہے اور اسے بڑی حیرانی ہوئی جب صرف چھ ماہ بعد اس نے خود کو پھر کیمرے کے سامنے پایا۔ قابلِ دید لباس میں جو اس کے حسن وشباب کو کشش دیتا تھا۔ پورے میک اپ کے ساتھ اور اسکرپٹ کی ضرورت کے مطابق ایک گانے پر لہرا کے دوسرے ایکٹر کی بانہوں میں جھولتے۔

اس کے لیے حمیرا کے بغیر گھر کا سوناپن اور ارشد کے بغیر تنہا شب کا عذاب محض ایک یاد تک محدود ہوگیا۔ دوسری اشتہاری کمپنیوں نے اس سے رجوع کیا۔ پھر ٹی وی والے آئے اور اس کے دن رات کی مصروفیت میں ارشد یا حمیرا کا خیال بھی بھولے بھٹکے فقیر جیسا ہوگیا جو کبھی دروازے پر دستک دے اور چلا جائے۔ لیکن صرف چار سال بعد کسی وجہ کے بغیر دنیا کی نظر بدل گئی۔ اس کے پاس آفرز کم ہونے لگیں۔ نئی ماڈلز کے آنے سے فرق نہیں پڑ سکتا تھا۔ وہ آتی

جاتی رہتی ہیں۔ ایمن تو تین فلموں میں بھی کاسٹ کی جا چکی تھی۔

آہستہ آہستہ وجہ اس کی سمجھ میں آگئی یا اس نے خود ہی تلاش کر لی۔ کامیابی کا پہلا دور ہمدردی کا تھا۔ ارشد کی ایڈورٹائزنگ ایجنسی نے اسے سپورٹ کیا۔ اس کی کامیابی نے دوسری کو بھی کھینچا۔ مگر ارشد نہیں رہا تو شوبزنس میں رہنے کی شرائط پوری کرنا لازمی ہوتا چلا گیا اور یہ شرائط سب کو پوری کرنی پڑتی ہیں۔ یہ ایمن کو معلوم تھا۔ شرائط بھی کیا صرف ایک شرط تھی۔ سب کو خوش کرو۔ خوش کرو کی اصطلاح میں سب آجاتا تھا۔ آگے آپ کی مرضی۔ اخلاقیات کو ہم جانیں یا معاشیات کو... چنانچہ وہ آؤٹ ہو رہی تھی۔

☆☆☆

''کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں مس؟'' ایک خاصے اوور اسمارٹ اور بولڈ لڑکے نے بیٹھنے کے بعد کہا۔

وہ چونکی۔ اس بینچ پر وہ اکیلی بیٹھی اپنے خیالوں میں گم تھی اور دن کے سائے بڑھتے بڑھتے شام بن گئے تھے۔

''ضرور بیٹھیے۔'' اس نے اٹھتے ہوئے نوجوان سے کہا۔ کچھ فاصلے پر کھڑے تین لڑکوں کے ایک گروہ نے ہنستے ہنستے اس پر آوازیں کسیں۔ وہ یقیناً ان سے شرط لگا کے آیا تھا کہ وہ اکیلی بیٹھی اس لڑکی کے پاس بیٹھے گا اور اس سے بات بھی کرے گا۔ وہ شرط ہار گیا تھا۔

گھڑی دیکھ کے ایمن کو سخت طیش آیا۔ دو گھنٹے بعد بھی یونٹ کے کسی ممبر نے اسے فون کر کے مطلع کرنے کی زحمت نہیں کی تھی کہ آج کی شوٹنگ کینسل... وین خراب ہو کے ٹھیک ہونے کی خبر دو گھنٹے پہلے کی تھی۔ اب کون آئے گا۔ اس نے موبائل فون نکال کے ڈائریکٹر کا نمبر ملایا تو وہ پھر کسی تمہید کے بغیر بجنے لگا۔ ''حد کرتی ہو تم بھی ایمن... یہ کیا طریقہ ہے، تمہارا فون کیوں بند ہے... کوئی بات بھی نہیں کر سکتا تم سے۔'' وہ عادت کے مطابق چلاتے ہوئے بولا اور کچھ سنے بغیر فون بند کر دیا۔ ایمن نے اپنے فون کو چیک کیا۔ اس میں تین مس کالیں تھیں جو اسے یہ بتانے کے لیے کی گئی ہوں گی کہ آج شوٹنگ نہیں ہو سکتی۔ مگر اس کا فون نہ جانے کیسے میوٹ پر چلا گیا تھا۔ گھنٹی کیسے بجتی۔ وہ خود کو کوستی باہر کی طرف چل پڑی۔

اب شام ہو گئی تھی۔ اسکول کالج کے بچے کب کے رخصت ہو چکے تھے۔ رہے سہے وزیٹر بھی ایک ایک کر کے باہر آ رہے تھے۔ ایمن کی نظر دس گیارہ سال کی ایک بچی پر گئی جو بیگ اور یونیفارم کے ساتھ گیٹ کے باہر ایک اسٹال کی سائڈ میں اکیلی بیٹھی تھی۔ یہ بیٹھنے کی کوئی جگہ نہ تھی مگر اسٹال والے کو شاید خبر ہی نہیں تھی۔ پاس سے گزرتے لوگ بس ایک نظر ڈال کے نکل جاتے تھے۔ ایمن بھی گزر جاتی مگر پھر اس کے خیال میں ایک صورت اتری اور وہ بے اختیار اس لڑکی کی طرف بڑھ گئی۔

اس کے قریب گھٹنوں پر جھک کے ایمن نے کہا۔ ''ہیلو، یہاں کیوں بیٹھی ہو؟ تمہیں کوئی لینے نہیں آیا؟ گاڑی کا انتظار ہے؟''

اس کے سارے سوالوں کے جواب میں لڑکی نے بس نظر اٹھا کے اسے دیکھا لیکن اس نگاہ میں کوئی جواب تھا نہ سوال۔ یہ احساس بھی نہ تھا کہ اس نے ایمن کا کوئی سوال سنا ہے یا وہ ایمن کو دیکھ رہی ہے اس کی آنکھوں میں خلا تھا اور ویرانی تھی۔

ایمن اس کے پاس بیٹھ گئی۔ ''کون ہو تم؟ نام کیا ہے تمہارا؟'' اس نے دوبارہ پوچھا۔

بچی نے کسی ردِعمل کا اظہار نہیں کیا اور یوں دیکھتی رہی جیسے اس کی سمجھ میں یہ سوال ہی نہیں آیا اور وہ غور کر رہی ہے کہ میں کون ہوں؟ میرا نام کیا ہے؟

ایمن سمجھ گئی۔ وہ اپنے ہوش میں نہیں تھی۔ ایمن نے اس کا ہاتھ تھاما تو وہ سرد تھا۔ اسے بخار نہیں تھا۔ ''سنو، تم ان اسکول کے بچوں کے ساتھ میوزیم آئی تھیں نا؟ پھر ساتھ کیوں واپس نہیں گئیں؟ تم اکیلی کیسے رہ گئیں؟''

وہ اپنی ویران آنکھوں کو جھپکتی رہی اور بے حس و حرکت بیٹھی رہی۔ ایمن نے اس کا بستہ کھینچا جو اس نے معمولی مزاحمت کے بعد چھوڑ دیا۔ ایمن نے بستہ کھول کے کاپی کتابوں پر اسکول کا اور اس لڑکی کا نام دیکھا۔ وہ ایک مشہور اسکول تھا جہاں اپر کلاس کے اور خود کو ان کے جیسا سمجھنے والوں کے بچے پڑھتے تھے۔ لڑکی کا نام مہرین شاہانی تھا۔ ایک رپورٹ کارڈ پر اس کے باپ کا نام ابراہیم شاہانی اور اس کے گھر کا پورا پتا بھی لکھا ہوا تھا مگر فون نمبر صرف اسکول کا تھا جو ظاہر ہے اس وقت بند تھا۔ اس کی کال کا جواب کسی نے نہیں دیا۔

ایمن کو مہرین کی حالت نارمل نہیں لگی۔ یہ کسی دورے کا اثر نہیں تھا تو پھر زیادہ خطرناک اور تشویش کی بات تھی۔ ایمن نے فیصلہ کیا کہ وہ مہرین کو گھر پہنچائے گی۔ اسے یہاں چھوڑ کے جانے کا تو خیر سوال ہی نہیں تھا۔ اس کو پولیس یا خدمتِ خلق کے کسی ادارے کے حوالے کرنے میں بھی رسک تھا۔ اس نے ایک گزرتی ہوئی ٹیکسی کو روکا اور

مہرین کو کھینچ کے پیروں پر کھڑا کیا، پھر ٹیکسی کی طرف دھکیلا اور اس کا بستہ خود اٹھایا۔ وہ نیند میں چلنے والے کی طرح قدم اٹھاتی ٹیکسی کی طرف بڑھی۔ ایمن نے اسے اندر دھکیل کر دروازہ بند کیا اور خود دوسری طرف سے اس کے ساتھ پچھلی سیٹ پر جا بیٹھی۔ ایمن نے ٹیکسی والے کو پتا بتایا۔

''مہرین، میری بات سنو، کیا ہوا ہے تمہیں؟''

خالی خالی نظروں سے ایمن کو دیکھتے ہوئے اس نے نفی میں سر ہلایا۔ اس کا مطلب کچھ نہیں بھی ہو سکتا تھا اور پتا نہیں بھی۔

''تم نے کچھ کھایا ہے؟ کوئی ایسی ویسی چیز، بولو... جواب دو۔'' ایمن نے اسے جھنجوڑا۔

مہرین نے اپنا ہاتھ چھڑایا اور سر پیچھے ٹکا کے آنکھیں بند کرلیں۔ ''مجھے... کچھ نہیں معلوم۔''

''اپنے بازو دکھاؤ۔'' ایمن نے اس کا ہاتھ پکڑا۔ ''کوئی انجکشن لیا ہے تم نے؟''

مہرین نے نفی میں سر ہلایا اور اپنا بازو چھڑا لیا۔ ''مجھے تنگ مت کرو۔''

ایمن کا شبہ اب یقین میں بدل گیا۔ مہرین پر نشے کا اثر غالب تھا۔ اس نے مہرین کا بستہ لے لیا اور سب کتابیں کاپیاں نکال کے ہر پاکٹ دیکھی۔ وہ کاپیاں واپس رکھ رہی تھی کہ ایک کاپی کے اندر سے دو پڑیاں نکل کے باہر گریں۔ یہ شفاف پلاسٹک کی بہت چھوٹی چھوٹی پڑیاں تھیں جن کے اندر کا سفید پاؤڈر باہر صاف دکھائی دیتا تھا۔

''مہرین، یہ کہاں سے آئیں تمہارے پاس؟ بولو۔'' ایمن نے اسے جھنجوڑا۔

مہرین نے پڑیاں اس سے چھین لیں۔ ''کہیں سے بھی نہیں، تم کون ہوتی ہو مجھ سے پوچھنے والی؟''

''تم ابراہیم شاہانی کی بیٹی ہو... وہ مشہور صنعت کار ارب پتی... میں ان سے بات کروں گی۔''

مہرین کا سرکش لہجہ بدل گیا۔ ''ہاں، وہ میرے پاپا ہیں۔ تم ان کو مت بتانا پلیز... گھر پہنچ کے میں ماما کو بتا دوں گی۔''

ایمن کو سخت افسوس تھا کہ دس بارہ سال کی اتنے اچھے اسکول میں پڑھنے والی ایک دولت مند باپ کی بیٹی نشہ کرتی ہے مگر یہ دبا تو اب غریب امیر سب کو اپنی لپیٹ میں لے رہی تھی۔ اسکول کالج کے ٹین ایجر ہر قسم کا نشہ کر رہے تھے۔ ہیروئن کے علاوہ دوائیں تھیں جو بطور نشہ استعمال ہوتی تھیں۔

''دیکھو مہرین! کیا تم جانتی ہو ان پڑیوں میں کیا ہے... یہ زہر ہے...'' ایمن نے کہا۔

وہ سیٹ پر اپنا سر پیچھے ٹکائے نیم دراز تھی۔ ''زہر ہے تو کیا میں مر گئی ہوں۔'' وہ آدھی آنکھیں کھول کے ہنسی۔

ٹیکسی نے ایک جھٹکا لیا اور چلتے چلتے رک گئی۔ ڈرائیور نے دو تین بار اس اسٹارٹ کرنے کی ناکام کوشش کی پھر اس نے معذرت کے انداز میں پلٹ کے دیکھا اور نیچے اتر گیا۔ ''ابھی ٹھیک ہو جائے گی۔'' وہ بونٹ کھول کے اندر جھک گیا۔

مہرین ڈر کے سیدھی بیٹھ گئی۔ ''مس! میری کلاس میں ایک لڑکی تھی، پہلے اس نے دی تھی مجھے... اور استعمال کرنا بھی سکھایا تھا۔ ہمارا ایک گروپ بن گیا تھا۔ پانچ لڑکیوں کا... ہم ہاف ٹائم میں انجوائے کرتے تھے۔ ہم ایک کونے میں بیٹھ جاتے تھے۔ گراؤنڈ کے لان پر دوسری لڑکیاں بھی کچھ کھاتی تھیں۔ لگتا تھا ہم بھی کچھ کھا پی رہے ہیں۔ اسنیکس اور کولڈ ڈرنک۔ مگر ہم یہ انجوائے کرتے تھے۔''

''اسکول کے اندر... کلاسز کے درمیان؟ اور جب تم پھر کلاس میں جاتی تھیں تو کسی کو پتا نہیں چلتا تھا۔ تمہیں دیکھ کر...؟'' ایمن دم بخود رہ گئی۔

''ہم کلاس کی آخری قطار میں بیٹھتے تھے۔ لیکن ایک ٹیچر کو شک ہو گیا تھا۔ وہ کلاس کے بعد اس لڑکی کو پرنسپل کے آفس میں لے گئی اور اس نے سب بتا دیا۔ یہ بھی کہ میجک کون فراہم کرتا ہے۔ ہم اسے میجک کہتے تھے۔ اس نے یہ بھی بتا دیا کہ میجک بہت قیمتی چیز ہے... سب افورڈ نہیں کر سکتے۔''

''وہ تو ظاہر ہے، ایک پڑیا کی قیمت کیا ہے؟''

''اب تو دو سو ہے... مہنگی ہو گئی ہے بہت۔ امپورٹ ہوتی ہے نا۔ اب پانچ سو کی تین پڑیاں ہیں۔''

ایمن نے اپنا سر پکڑ لیا۔ ''روز کے پانچ سو؟''

مہرین نے اقرار میں سر ہلایا۔ ''میرے ممی اور پاپا بہت دولت مند ہیں۔''

''وہ ہر روز تمہیں پانچ سو دیتے ہیں؟'' ایمن نے بے یقینی سے پوچھا۔

مہرین نے پھر سر ہلایا۔ ''ہاں، اسکول کی کینٹین بہت مہنگی ہے۔ دو سو کا برگر، سو کا کین، ستر کی بوتل۔ پاپا کہتے ہیں کہ پانچ سو پاکٹ منی زیادہ تو نہیں۔ کبھی دوسروں کو بھی کھلانا پڑتا ہے۔ لڑکیاں اس سے زیادہ بھی خرچ کرتی ہیں۔ ان کا اپنا بینک اکاؤنٹ ہے۔ آٹھ دن تو ویسے ہی چھٹی ہوتی ہے۔

ہفتہ اتوار... دو دن میرا بھی موڈ نہیں ہوتا۔ تو بیس دن کے دس ہزار...''

شاید اسکول کی ایک ٹیچر کو مہینے کی تنخواہ اتنی ہی ملتی ہو۔ دس بیس ہزار ان لاکھوں ماہانہ کمانے والوں کے لیے کیا ہیں؟ ''اچھا مہرین، چھٹی والے دن، تم کیا کرتی ہو؟''

''میں اسٹاک رکھتی ہوں یہ تین پڑیاں ہیں، ایک سٹر ڈے کی ایک سنڈے کی۔''

ایمن کو یاد آیا کہ وہ کچھ اور بتا رہی تھی۔ ''جس لڑکی کو ٹیچر نے پکڑا تھا، اس کو کیا سزا ملی؟ پرنسپل نے کیا کیا؟''

''اس کو ماں باپ لے گئے تھے وہ پھر اسکول نہیں آئی۔ لیکن... وہ جو ہمیں میجک دیتی تھی، وہ غائب ہوگئی۔''

ایمن چونکی۔ ''کیسے غائب ہوگئی؟''

''پتا نہیں، وہ اسکول سے گھر نہیں پہنچی۔ دوبارہ نظر نہیں آئی۔ اس کے ماں باپ اسکول میں آئے تھے۔ پولیس بھی آئی تھی لیکن کچھ ہوا نہیں... ایسے ہی تم بھی غائب ہو جاؤ گی مس۔''

''میرا نام ایمن ہے۔ میں کیوں غائب ہو جاؤں گی؟'' ایمن نے کہا۔

''مس ایمن، انہوں نے کہا تھا اب دو آدمی آتے ہیں۔ ایک نوجوان لڑکا ہے ایک اس کا باپ لگتا ہے مگر باپ نہیں ہے۔ انہوں نے مجھ سے کہا تھا کسی کو پتا نہیں چلنا چاہیے۔ ورنہ تم بھی غائب ہو جاؤ گی، جو لمبا ہے وہ باپ ہے۔ دوسرا چھوٹے قد کا ہے۔''

ایمن نے دہشت سے اس کی طرف دیکھا۔ ''کیا اب تم یہ کام کرتی ہو۔ دوسروں کو میجک سپلائی کرتی ہو؟''

وہ خاموش رہی۔ ڈرائیور اپنی ٹیکسی اسٹارٹ کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ ٹیکسی مال پر سیدھی چلتی گئی اور پھر دائیں جانب مڑ گئی۔ یہ نیا شہر تھا۔ جوہر ٹاؤن۔ فیصل ٹاؤن۔ ایمن پہلے کبھی ادھر نہیں آئی تھی۔ اس نے ڈرائیور سے کہا کہ وہ پتا معلوم کرلے۔ وہ ایک جگہ اتر کے کسی بیکری تک گیا اور واپس آ کے پھر ٹیکسی اسٹارٹ کی۔ مہرین اب سیٹ سے سر ٹکائے پڑی تھی۔

اچانک مہرین نے آنکھیں کھولیں۔ ''مس ایمن، چھوڑ دو مجھ گھر... اور چلو کسی سے کوئی بات مت کرنا، وہ خطرناک لوگ ہیں۔ انہوں نے مجھ سے کہا تھا۔'' وہ سرگوشی میں بولی۔ ''وہ لمبا اور چھوٹا... دونوں کے پاس پستول ہے، میں نے دیکھا تھا۔''

ٹیکسی ایک گھر کے سامنے رک گئی۔ یہ خوش حال لوگوں کا علاقہ تھا۔ کوئی بھی گھر دس مرلے سے کم کا نہ تھا۔ اس گلی کے دونوں جانب ایک کنال کے گھر تھے۔ ایک گھر کے گیٹ پر ایمن کو مسلح گارڈ بھی کھڑا نظر آیا۔ ٹیکسی ڈرائیور کو کرایہ دے کر اس نے مہرین کا ہاتھ پکڑ لیا اور بند گیٹ کے پاس لگے انٹرکام کا بٹن دبایا۔ اندر کہیں گھنٹی بجی۔ پھر کسی عورت نے پوچھا۔ ''ہیلو، کون ہے؟''

''مسز شاہانی! میں آپ کی بیٹی مہرین کو لائی ہوں، میرا نام ایمن ہے۔''

انٹرکام کی آٹومیٹک لاک کھولنے کی آواز آئی۔ وہ مہرین کا ہاتھ پکڑے اندر گئی اور گیٹ کو اپنے پیچھے پھر بند کر دیا۔ وہ چند قدم ہی چلی تھی کہ اندر سے ایک جوان اس جیسی دبلی پتلی اور ماڈرن قسم کی عورت نکل کے برآمدے میں آئی۔ اس نے نیلی جینز پر گرے اور بلیک ٹی شرٹ قسم کی چیز پہن رکھی اور صاف نظر آتا تھا کہ یہ ڈیزائنر ڈریس بہت قیمتی ہے۔ اس کے شانوں تک تراشیدہ سنہرے بال ریشم کا ڈھیر تھے جو اس کے چہرے پر جھولتے پھسلتے رہتے تھے۔ وہ چلائی۔ ''مہرو، تم کہاں رہ گئی تھیں؟ اسکول وین میں کیوں نہیں آئیں۔''

ایمن نے مہرین کا ہاتھ ماں کے ہاتھ میں دے دیا۔ ''میں نے اسے میوزیم کے باہر اکیلا بیٹھا دیکھا تو مجھے شک ہوا۔ وہاں آج جو اسکول کے اسٹوڈنٹس آئے تھے، سب جا چکے تھے۔ یہ نشے میں تھی۔ اب بھی ہے۔''

اس عورت کا رنگ فق ہو گیا۔ ''یا میرے خدا آخر میں کیا کروں۔ آیئے اندر آیئے۔''

ایمن کو شاندار طریقے پر آراستہ ڈرائنگ روم میں بٹھا کے مہرین کی ماں بیٹی کو اندر لے گئی۔ ایمن نے اس کے فون پر کسی ڈاکٹر سے بات کرنے کی آواز سنی۔ ''کچھ دیر بعد نہیں، آ بھی آؤ فوراً... مہرو، بے ہوش ہے... ہاں ہاں وہی چکر ہے۔''

اندر اب مکمل خاموشی تھی۔ ایمن ڈرائنگ روم کی آرائش کو دیکھتی رہی۔ وہاں ہر چیز امپورٹڈ اور بہت قیمتی تھی۔ کیوں نہ ہوتی۔ ابراہیم شاہانی کا نام وہ ٹی وی پر سنتی رہتی تھی۔ وہ صنعت کار، بلڈر، امپورٹر ایکسپورٹر تھا اسٹاک ایکسچینج کا صدر بھی رہ چکا تھا۔ اتنے بڑے آدمی کی بیوی صرف ایک کنال کے گھر میں رہتی تھی۔ ابراہیم شاہانی جیسے نام کے ساتھ تو تصور میں عالی شان محلات آتے ہیں جن میں سوئمنگ پول، لمبے چوڑے لان اور باغات آتے ہیں بلکہ گولف کورس اور ہارس رائیڈنگ کے ٹریک بھی رکھتے ہیں۔

گیراج میں متعدد بیش قیمت گاڑیاں اور درجنوں باوردی ملازم ہوتے ہیں اور خطرناک انداز رکھنے والے سیکیورٹی گارڈ۔ یہاں تو گیٹ پر بھی کوئی نہیں تھا اور گھر میں ابھی تک ادھیڑ عمر کی ایک ملازمہ نظر آئی تھی جو ایمن کے سامنے چائے کی ٹرے چھوڑ کے چلی گئی تھی۔

ایمن نے اپنے لیے خود ہی چائے بنائی اور ٹرالی میں سے بسکٹ اٹھا لیے۔ اس وقت اندر گھنٹی پھر بجی اور وہی ملازمہ ڈاکٹر کو ڈرائنگ روم سے گزار کے اندر لے گئی۔ ادھیڑ عمر کے ڈاکٹر کا بیگ ملازمہ نے اٹھا رکھا تھا لیکن اس کے گلے میں پڑا ہوا اسٹیتھیس اسکوپ اس کے طب کے پیشے سے وابستہ ہونے کا کھلا اظہار تھا۔ اس نے خوش اخلاقی سے مسکرا کے ایمن کو سلام کیا اور پھر اس کے سامنے سے گزرتے گزرتے شناسائی کے احساس سے رک گیا۔

''آپ وہ ہیں...'' اس نے یاد کرنے کے لیے پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ ''ایمن... رائٹ۔''

''رائٹ۔'' وہ خوش ہو کے مسکرائی۔ آج کے دن میں اس کا یہ دوسرا صورت آشنا تھا مگر اسے بھی فین بہر حال نہیں سمجھا جا سکتا تھا کیونکہ وہ مسکرا کے اندر چلا گیا تھا۔ اندر سے کسی کے کچھ کہنے سننے کی آواز ہی نہیں آرہی تھی۔ مہرین کا کمرا اندر کہیں دور تھا یا اوپر کی منزل پر تھا۔ دس منٹ، پھر پندرہ منٹ، پھر بیس منٹ گزر گئے تو اس نے فیصلہ کیا کہ اسے اب چلا جانا چاہیے مگر اس کے ساتھ ہی ڈاکٹر اسی طرف سے باہر گیا۔ مہرین کی ممی اسے باہر تک چھوڑ کے لوٹ آئی۔ وہ اس کے مقابل صوفے پر ٹک گئی۔

''آپ کا بہت شکریہ۔ آپ نے مہرین کو گھر پہنچایا۔ آپ اس کی ٹیچر تو نہیں ہیں۔ میں سب کو جانتی ہوں۔''

''جی، میری وہاں شوٹنگ تھی۔ میں ایکٹریس ہوں، مہرین۔''

''ایکٹریس ہیں آپ؟'' اس نے یوں کہا کہ لہجے میں ستائش سے زیادہ ناپسندیدگی کا شبہ ہوتا تھا۔ جیسے وہ کہنا چاہتی تھی کہ طوائف ہیں آپ... ''مہرین میری ایک ہی بیٹی ہے۔''

''پھر تو آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ کب سے نشہ کر رہی ہے؟''

''معلوم ہونے سے کیا ہے ایمن، نشے کی لت چھڑانا کوئی آسان ہوتا ہے اور پھر جب خود اپنے ہی اس کے ذمے دار ہوں۔''

''کون کرتا ہے آپ کے گھر میں نشہ... وہ تو کہہ رہی تھی کہ کسی اسکول فیلو نے اسے عادی بنایا۔'' ایمن بولی۔

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ ''ہاں، پہلے یہ جس اسکول میں پڑھتی تھی وہاں کسی لڑکی نے اس کو نشے کی لت لگا دی تھی۔ مجھے فوراً پتا چل گیا اور میں نے اسے اسکول سے نکال لیا۔ دوسرے اسکول میں ڈالنے کا مقصد تھا کہ وہ تعلق ختم ہو جائے۔ یہاں یہ ہوا کہ مجھے کراچی جانا پڑا۔ چند دن کے لیے۔ میرے والدین ہیں وہاں اور عمر ایسی ہے کہ وہ بیمار رہتے ہیں۔ ان کے ساتھ میرا بھائی تھا۔ شادی کے بعد وہ بیوی کے ساتھ ہنی مون پر گیا تو مجھے ان کی ذمے داری دے گیا۔ اور کچھ بھی نہ ہوتا اگر خود اپنے ہی دشمنی نہ کرتے۔''

وہ چونکی۔ ''کیا مطلب... گھر میں کوئی...''

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ ''اس کا پیارا... مہرین سے بہت محبت کرنے والا چاچو، آپ نے اس کا نام سنا ہو گا۔ دستور کے نام سے مصوری کرتا ہے... یہ ہمارا فیملی نیم ہے۔''

''معاف کیجیے مجھے مصوری کی کوئی شدھ بدھ نہیں... مگر دستور...''

''مہرین کے فادر کا پورا نام بھی ابراہیم دستور شاہانی ہے اور یہ اسحاق دستور شاہانی اس کا سگا بھائی نہیں ہے۔ مگر بڑا بھائی ابراہیم اس سے اتنی محبت کرتا ہے کہ لوگ سگے بھائی سے نہیں کرتے۔ وہ جو چاہے کرے، اس کے خلاف کچھ سنتا ہی نہیں۔ میں جب کراچی گئی تو مجھے گھر کی کوئی فکر نہیں تھی۔ یہ خادمہ ہے۔ اس کا شوہر اور ایک بیٹا جو شوفر ہے سب تھے گھر میں اور پھر مہرین کا چاچو اس عرصے میں یہاں رہا۔ بے شک وہ بہت چاہتا ہے مہرین کو، اور مہرین بھی چاچو چاچو کرتی پھرتی ہے لیکن اسے لت ہے نشے کی۔''

''تو کیا اس نے...؟ مطلب یہ کہ یہ کیسی محبت ہے، غیر ذمے داری کی حد ہے۔''

اس نے ایک گہری سانس لی۔ ''اچھا خاصا تعلیم یافتہ آدمی ہے۔ کسی چیز کی کمی نہیں اور مصوری کا شوق بھی برائی نہیں۔ اس کی شہرت اب ملک سے بڑھ کے عالمی ہو رہی ہے۔ ٹیلنٹ ہے اس میں... لیکن اس نے اسٹوڈیو بنا رکھا ہے ایک ایسی جگہ جہاں کوئی شریف آدمی ناک پر رومال رکھ کے نہ گزرے۔ بھنگیوں کی بستی ہے بالکل، کچے مکان... گلی میں بہتی نالیوں کی بدبو، صورت سے جرائم پیشہ نظر آنے والے سب... ایسے غریب کہ گھر میں کھانے کھلانے کو نہیں مگر نشہ کرتے ہیں، گٹکا کھاتے ہیں، جرائم پیشہ ہیں سارے۔''

''آپ کو اتنی نفرت ہے غریبوں سے۔'' مہرین کے

منہ سے نکل گیا۔

''تم خود دیکھ لینا جا کے... جرائم اور کہاں پرورش پاتے ہیں، مگر دستور کہتا ہے کہ یہی اصل زندگی کے کردار ہیں، باقی سب مصنوعی لوگ ہیں۔ نقال اور منافق... دہرے معیار رکھنے والے... اصل لٹیرے۔''

صاف نظر آتا تھا کہ مسز شاہانی اپنے دیور کو ناپسند کرتی ہے بلکہ اس سے نفرت کرتی ہے۔

''پھر وہ نشہ کرنے لگا اور میری عدم موجودگی میں کسی نے خیال نہیں رکھا۔ مہرین اس کی سگریٹیں نکال کے پیتی رہی۔ میں جب آئی تو دیکھ کے سخت صدمہ ہوا۔ بڑی مشکل سے اس کی لت چھڑائی تھی اور اس کی صحت بھی ٹھیک ہوگئی تھی۔ اب اگر وہ کلاس کی کسی لڑکی کا نام لیتی ہے تو جھوٹ ہے، وہ اپنے چاچو کو بچاتی ہے۔''

''مگر مسز شاہانی وہ لڑکی تو غائب ہوگئی اور مہرین نے کہا کہ وہ آپ کو بھی مار دیں گے۔ آپ ذرا تفتیش کریں۔ میرا مطلب ہے اسے سرسری انداز میں نہ ٹالیں۔'' وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

اس نے اقرار میں سر ہلا دیا۔ ''وہ تو میں کروں گی لیکن مس مہرین، کیا میں پھر اسکول چھڑاؤں؟ کہاں تک اسکول بدلوں، اچھے اسکول ہیں کتنے ہیں؟''

''آپ کا مطلب ہے جہاں بڑے لوگوں کے بچے پڑھتے ہیں۔ بھاری بھرکم فیسوں اور شاندار عمارات والے۔''

''اب ابراہیم شاہانی کی بیٹی گورنمنٹ اسکول میں تو پڑھے گی نہیں۔ اور اولیول کرانے والے گنے چنے اسکول ہیں۔ میں آپ کی تشویش کو قدر کی نظر سے دیکھتی ہوں۔ آپ نے بڑی ذمے داری کا ثبوت دیا۔ بتائیے میں آپ کے لیے کیا کرسکتی ہوں۔'' اس کا ہاتھ غیر ارادی طور پر اپنے ہینڈ بیگ کی طرف گیا۔ ''یہ دس ہزار ہیں۔''

''آپ معاوضہ دینا چاہتی ہیں اس ذمے داری کا۔ آپ یقیناً دے سکتی ہیں لاکھوں یا کروڑوں میں بھی... کیا ہوتا اگر میری نظر نہ پڑتی اور مجھ سے پہلے کوئی اور مہرین کو لے جاتا، تاوان مانگتا۔''

''سوری... سوری، کیا نام بتایا تھا آپ نے، ہاں ایمن... دراصل آپ اسے ٹیکسی میں لائیں، میں کرائے کا پوچھ رہی تھی۔'' وہ خفت سے بولی۔ ''اتنا تو اخلاقی ذمے داری میں شامل ہے۔''

ایمن سمجھ گئی کہ یہ دراصل ذاتی کار نہ ہونے کا طعنہ ہے۔ اس مغرور عورت کی نظر میں ایک غیر معروف اشتہاری

پروفیسر معلوم ہوتا ہے تم یہ مسئلہ سمجھ نہیں رہے ہو۔ اچھا اس کلاس میں جتنے بھی بدھو اور کوڑھ مغز ہیں، اٹھ کر کھڑے ہو جائیں۔'' کافی دیر کلاس میں خاموشی رہی آخر کار ایک لڑکا ہچکچاتے ہوئے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

پروفیسر: ''ہوں تو تم اپنے آپ کو بدھو اور کوڑھ مغز تصور کرتے ہو؟''

طالب علم: ''یونہی کہہ لیجیے، لیکن میں تو آپ کی خاطر کھڑا ہوا ہوں۔ آپ اکیلے کھڑے کچھ اچھے نہیں لگتے تھے۔''

فلموں کی اداکارہ غریب ہے جس پر مالی احسان کیا جاسکتا ہے۔

''او کے میڈم شاہانی... چار سو روپے۔'' اس نے ہاتھ پھیلا دیا اور باہر نکل آئی۔ اخلاق کی بات کرتی ہے، اخلاقی ذمے داری یہ نہیں ہے کہ مجھے ڈرائیور کے ساتھ واپس گھر پہنچا دے۔

مسز شاہانی اس کے پیچھے آئی۔ ''مس ایمن، ایک درخواست ہے آپ سے۔''

ایمن رک گئی۔ ''آپ حکم کیجیے۔''

''اس بات کا تذکرہ آپ بالکل کسی سے نہ کریں۔ یوسی، اس کے پاپا کا نام آیا تو میڈیا کو موقع مل جائے گا۔''

''آپ بالکل فکر نہ کریں۔ مہرین جتنی ہی میری بیٹی تھی۔ میرے سینے میں بھی ماں کا دل ہے۔'' وہ باہر نکل گئی۔

صاف ظاہر تھا کہ مسز شاہانی کو آئندہ مہرین کے حوالے سے ایمن کا فون کرنا بھی پسند نہیں ہوگا۔

☆☆☆

ابراہیم کی گاڑی عقبی راستے سے نشیب میں اتری۔ آٹومیٹک گیٹ کھلتے ہی تمام لائٹس یوں روشن ہوگئی تھیں جیسے جہاز کے رن وے پر اترتے وقت اندھیرے میں روشنیوں کی قطار اس کے راستے کی نشاندہی کرتی ہے آگے چلنے والی مسلح سیکیورٹی گارڈ کی ڈبل کیبن پک اپ سیدھی نکل گئی۔ اس کی پراڈو ایک فولادی دروازے کے سامنے ٹھہر گئی۔ لفٹ کے سامنے کھڑے گارڈ نے لپک کے دروازہ کھولا اور وہ خود بخود وا ہوجانے والے راستے سے لفٹ میں داخل ہو گیا۔ چند سیکنڈ کی محسوس نہ ہونے والی برق رفتاری سے لفٹ نے اسے دسویں منزل کے اس دروازے پر اتار دیا جو اس کے آفس کا عقبی راستہ تھا اور صرف اس کے آنے جانے کے لیے مخصوص تھا اس کے ملاقاتی ماتحت یا دوست سب سامنے

سے آتے تھے۔ ان کے آنے کا وقت پہلے سے طے ہوتا تھا اور خوب صورت روزی ان کو ریسپشن سے گزار کے اندر دوسرے کمرے میں بھیج دیتی تھی جہاں خفیہ کیمرے اور اسکینر دیکھ لیتے تھے کہ ان کے پاس موبائل فون، کار کی چابی یا پرس کے سوا کچھ نہیں۔

ملاقاتی سب اس کے ہم پلہ کاروباری لوگ ہوتے تھے۔ ملکی بھی اور غیر ملکی بھی۔ باتی ہے مختلف ڈائریکٹرز تھے جو ہیڈ آفس میں بیٹھ کے شاہانی گروپ کے سیٹلائٹ کی آنکھ سے کسی ایک کاروبار کے ہر شعبے اور ہر فرد کو دیکھ سکتے تھے۔ ان میں بھی ملکی اور غیر ملکی ایکسپرٹ شامل تھے۔ دوستوں کے حلقے میں دو چار مرد ضرور تھے لیکن اکثریت... خواتین کی تھی۔ ملکی اور غیر ملکی... جو کسی ایک نام سے منسوب ہوتی تھیں تو وہ شاہانی کا نام ہوتا تھا اور آفس کے ڈیکوریشن پیس کی طرح بدلتی رہتی تھیں۔ تاہم مختصر رفاقت میں بھی ان کو اپنی توقع سے کہیں زیادہ مل جاتا تھا۔

اپنی سیٹ پر بیٹھ کے اس نے انٹرکام پر روزی سے پوچھا۔ ”کافی کے بعد کون آئے گا؟“

روزی نے شوخی سے کہا۔ ”کوئی نہ آیا تو میں آجاؤں گی لیکن سر... صائمہ کا فون تھا۔“

اس کا موڈ خراب ہوگیا۔ صائمہ اس کی بیوی نمبر ون اور مہرین کی ماں تھی۔ علیٰحدگی کے مقدمے کا فیصلہ کرتے وقت فیملی کورٹ نے سب سے بڑا ظلم تو یہ کیا تھا کہ مہرین کو ماں کی تحویل میں دے دیا تھا۔ فیملی لاء کے تحت سات سال تک بیٹا اور اٹھارہ سال کی عمر کو پہنچنے تک بیٹی کی پرورش ماں کرتی ہے۔ اگر وہ دوسری شادی نہ کرے۔ اور اس کے بعد بھی عدالت سات سال کے بچے سے پوچھتی ہے کہ بتا تیری رضا کیا ہے۔ ماں کے ساتھ رہے گا یا باپ کے ساتھ۔ قانون بنانے والے پاگل کے بچے، ان کی عقل میں نہیں آتا کہ لڑکا سات سال ماں کے ساتھ رہے گا تو قانون کی مدد سے طلاق لینے والی ماں اس کے دماغ میں باپ کے خلاف نفرت کا کتنا زہر بھر چکی ہوگی۔ باپ کو اس کی نظر میں شیطان سے بھی بہتر ثابت کر چکی ہوگی۔ وہ کیسے کہہ سکتا ہے کہ میں اب باپ کے پاس رہوں گا۔ لڑکے تو یوں بھی ماں کے قدموں کی جنت میں تمام عمر گزارتے ہیں خواہ تنگیِ حالات کے باعث ان کی زندگی جہنم سے بھی بدتر ہو۔ رہی اٹھارہ سال کی لڑکی تو وہ بالغ ہے۔ اپنی مرضی کی مالک، کسی کے ساتھ نہ رہے تو عاشق کے ساتھ چلی جائے۔ ”سر وہ بہت اَپ سیٹ تھیں مہرین کی کوئی بات کرنا چاہتی تھیں۔“

روزی ابھی تک انٹرکام پر تھی۔ ”اچھا، پھر فون آئے تو ملا دینا۔“

سب لوگ پہلے اس کا حوالہ مسز شاہانی کے طور پر دیتے رہے تھے۔ پھر اس نے سختی سے پابندی لگا دی کہ شاہانی کے نام سے اس کا اب کوئی تعلق نہیں رہا۔ پھر روزی کا اسے میڈم صائمہ کہنا کھل گیا۔ ”یہ کیا میڈم کہتی رہتی ہو اسے میرے سامنے، صائمہ کافی ہے۔ ابھی اس نام کی تو اور کوئی نہیں ہے نا؟“

شاہانی کا ردِعمل بے بسی کا تھا۔ کلہاڑی خود اس نے اپنے پاؤں پر ماری تھی کیونکہ اس کے باپ نے بیوی کو صرف عورت نہیں شریکِ حیات، گھر کی مالکن اور زندگی کی گاڑی کے دوسرے پہیے جیسے خطابات دے رکھے تھے وہ تھا پرانے وقتوں کا آدمی مگر اس کی تعلیمات کا اثر ابراہیم پر پہلی شادی کے وقت ضرور تھا۔ اس نے صائمہ کو سچ مچ نصف بہتر بنا لیا۔ لائف پارٹنر کے ساتھ بزنس پارٹنر... جوائنٹ اکاؤنٹ... کوٹھی اس کے نام، وہ سچ مچ پاگل ہوگیا تھا۔ وہ متوسط طبقے کی لڑکی تھی مگر بلاشبہ اس کا حسن ایشوریا رائے کو شرماتا تھا اور اس کے انداز و اطوار کا جادو سر چڑھ کے بولتا تھا۔ عورت ایک بار دماغ پر سوار ہو جائے تو جسم کی ضرورت ثانوی ہو جاتی ہے۔ بڑے بڑے سورما اور فاتح عالم ایک عورت سے مار کھا گئے۔ شاہانی اتنا احمق ثابت نہیں ہوا تھا۔ اس کی گھاس چرنے کے لیے جانے والی عقل لوٹ آئی تھی اور اس نے صرف تین سال بعد اپنی زمانہ قبل از عقد کی زندگی کو پھر اپنا لیا تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک معمولی پروفیسر کی بیٹی میں جو ایم اے پاس بھی تھی یہ صلاحیت خداداد تھی کہ اس نے دو سال تک ابراہیم جیسے بے مہار شخص کو حکم کا غلام بنائے رکھا جو وفاداری کیا سرے سے ازدواجی بندھن کا قائل نہ تھا۔

دو سال بعد زندگی بھر کی عادت جو اب فطرت بن چکی تھی پھر اپنا رنگ دکھانے لگی۔ اور اس نے وفا کی زنجیریں توڑ کے اِدھر اُدھر کی آزاد فضاؤں میں پرواز شروع کی۔ کند ہم جنس با ہم جنس پرواز... اسی آزاد فضا میں پرواز کرنے والی بہت تھیں جو اسے جال سے نکال کے آزادی کی تکمیل پر اکساتی رہیں۔ وہ بھی تھیں جو اسے یقین دلاتی تھیں کہ قیدِ شریعت سے نکل کے بیوی کہاں جا سکتی ہے۔ ایک نے کہا کہ میری جان، اس کی خودفریبی کے لیے ایک خاتون شاعرہ ہی کہہ گئی ہے کہ... وہ جہاں بھی گیا لوٹا تو مرے پاس آیا۔ بس یہی بات ہے اچھی مرے ہرجائی کی۔ تو وہ بھی یہ شعر

پڑھ کے خود کو مطمئن کرلے گی اور جس رات تم نہ ہوئے یہ گزاے گی... جا اپنی حسرتوں پر آنسو بہا کے سو جا... اور سو جائے گی خود کو تسلی دے کر کہ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

مگر ایسا نہیں ہوا۔ افواہیں جب خبریں بن گئیں اور ثبوت خود اس کے سامنے آنے لگے تو صائمہ نے جواب طلبی کی اور بالآخر آزادی مانگ لی۔ وہی آزادی جو ابراہیم چاہتا تھا۔ فیصلہ عدالت میں ہوا۔ وہ سب جو اثاثوں کی صورت میں صائمہ کا بھی تھا۔ نصف اسے مل گیا اس میں کاروبار کے حصص، بینک کے اور دیگر اثاثے مثلاً کوٹھی اور گاڑی جو صائمہ کو بیوی کے بجائے شریکِ حیات کا مقام عملی طور پر دے دیا تھا۔ اب وہ بھی دولت مندی کے مضبوط سہارے پر اکیلی رہ سکتی تھی اور ابراہیم کے فلسفۂ حیات پر عمل کرتے ہوئے ہر رات شوہر بدل سکتی تھی۔

اپیل پر عدالت عالیہ نے صرف اتنا کیا کہ ہفتے میں ایک دن مہرین کو اپنے ساتھ رکھنے اور دو بار ماں کی موجودگی میں اس سے ملنے کی اجازت دے دی۔ چنانچہ اب ہفتے میں دو دن صائمہ اس کے ساتھ کسی ریسٹورنٹ میں لنچ کرنے آجاتی تھی۔ ظاہر ہے اس گھنٹے بھر کی ملاقات میں وہ مہرین سے کیا باتیں کرتا جبکہ ساتھ والی میز پر اس کی ماں بظاہر لاتعلق بیٹھی اپنا لنچ کرتی تھی مگر اس کی نظریں اور کان باپ بیٹی پر لگے رہتے تھے۔ بعد میں شاید انتقامی طور پر صائمہ اپنے ایک ''دوست'' پاکستان کی ٹیم کے ایک کرکٹ پلیئر کو بھی اپنے ساتھ لانے لگی۔ صرف اسے دکھانے اور جلانے کے لیے وہ کسی بیوٹی پارلر سے ہو کے آئی تھی۔ حسن اس کا پہلے ہی نظر گھمانے والا تھا۔ میک اپ سے ہر ڈائننگ ہال میں وہی مرکزِ نگاہ بن جاتی تھی اور جب وہ آگے جھک کر اور ہنس ہنس کے باتیں کرتی تھی تو کرکٹر عاشق تو ریشہ خطمی ہو جاتا تھا اور موقع کے متلاشی فوٹو گرافر تصاویر بنانے کے چکر میں رہتے تھے۔

یہ سب ابراہیم جوابی کارروائی کے انداز میں نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اس کی ٹیبل پر سامنے بیٹی ہوتی تھی اور اس کے سامنے وہ برا باپ بنتا تو مزید نقصان ہوتا۔ برا تو وہ بن ہی چکا تھا اور صائمہ بھی گھر میں ہمہ وقت بتاتی ہوگی۔ لنچ اس کے لیے خوشی کے بجائے کوفت کا سبب بننے لگا تو اس نے پروگرام منسوخ کر دیا یعنی اس کھیل میں صائمہ کو واک اوور مل گیا۔ ملاقات کا ایک دن ہفتہ یا اتوار کا ہی ہو سکتا تھا کیونکہ مہرین کے پاس چھٹی کے دو دن ہی فرصت کے ہوتے تھے مگر رفتہ رفتہ یہ بھی بیزاری کوفت اور پھر غصے کا سبب بننے لگے۔ مہرین کسی کٹھ پتلی کی طرح ملاقات کا دن گزارتی تھی۔

بس پاپا... نو پاپا... تھینکس پاپا... کھانا کیا کھاؤ گی... اپنی تھنگ پاپا... کہاں کھاؤ گی؟ جہاں آپ پسند کریں پاپا... پارک چلیں یا فلم دیکھنے؟ جہاں آپ چاہیں پاپا... لیکن اس ایک دن کے استحقاق سے وہ دستبردار نہیں ہونا چاہتا تھا۔

صائمہ کی کال بھی قانونی ہوتی تھی۔ مسٹر ابراہیم، کل صائمہ کو لینے کون سی گاڑی آئے گی، کتنے بجے آئے گی، ڈرائیور لائے گا یا آپ خود، واپسی کتنے بجے ہوگی مہرین کی۔ تھینک یو اور فون بند۔ ایک بار خود ابراہیم نے اسے فون کر کے پوچھ لیا تھا کہ ہفتے میں دو بار لنچ پر مہرین کے ساتھ وہ خود کیوں آتی ہے؟

اس نے جواب دیا تھا۔ ''مہرین کی حفاظت کے لیے۔''

''کیوں؟ میں بھی تو باپ ہوں اس کا۔''

''اسی لیے مسٹر ابراہیم، آپ اسے چھین کے بھی لے جاسکتے ہیں۔'' وہ بولی۔

''اس وقت کیا تم روک سکو گی مجھے؟''

''میں تو نہیں، مگر اس کے ساتھ آنے والے سیکیورٹی گارڈ ضرور روک لیں گے۔''

''سیکیورٹی گارڈ؟ میں نے انہیں کبھی نہیں دیکھا۔''

''وہ نیچے لاؤنج میں ہوتے ہیں ابراہیم صاحب... ہوٹل کی سیکیورٹی کو بھی خبردار کر دیا جاتا ہے کہ ایسا ہوا تو وہ بھی فریق سمجھے جائیں گے۔'' اس نے فون بند کر دیا۔ الو کی پٹھی... دو ٹکے کی عورت میرے سامنے بولتی ہے، اس نے دل ہی دل میں صائمہ کو ایک سو ایک گالیاں دیں اور اسے اغوا سے قتل کرانے تک کے تمام امکانات پر غور کیا مگر وہ ہر اندیشے کے خلاف پہلے سے حفاظتی اقدامات کیے بیٹھی تھی۔

اس کے سامنے والے سرخ فون کی لائٹ جلنے بجھنے لگی۔ اب اسے پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس فون پر اس وقت صرف صائمہ ہی کال کر سکتی تھی۔ اس نے ریسیور اٹھالیا۔ ''یس۔'' اس نے کسی تمہید کے بغیر کہا۔

''مسٹر ابراہیم، مہرین کو پھر وہی پرابلم ہے، نشہ کرنے کی۔''

''کیا؟ پہلے تو تم نے قصوروار میرے بھائی کو بنا دیا تھا۔ حالانکہ قصور سراسر تمہارا تھا۔'' وہ دہاڑا۔

''میرا کیا قصور تھا؟'' وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

''دستور کرتا ہے نشا اب بھی۔''

”تم اسے اکیلا چھوڑ کے کراچی کیوں گئی تھیں... ایک مہینے کے لیے... لیکن اب تو سو فیصد قصور تمہارا ہے۔ تم خاک پرورش کر رہی ہو اس کی۔ تمہارا تو سارا دھیان اس نئے عاشق کی طرف ہے۔“

”تم بکواس بند نہیں کرو گے تو میں فون بند کر دوں گی۔ پھر جو چاہو کرنا۔ میں آخری بار تمہیں یاد دلا رہی ہوں کہ ایسے دشمنی والے رویے کا نقصان مجھے یا تمہیں ہی نہیں... مہرین کو بھی ہوگا۔ وہ ہماری مشترکہ ذمے داری ہے ابراہیم صاحب، اگر آپ کو اس کا مفاد عزیز ہے تو کم از کم اس کے سامنے شرافت کے جامے سے باہر نہ ہوں۔“

”او کے او کے، یہ لیکچر بند کرو اور بتاؤ مہرین کو کیا ہوا ہے۔ ہم نے تو اسکول بدل دیا تھا اس کا۔“

”آج وہ اپنی کلاس کے ساتھ میوزیم دیکھنے گئی تھی۔ دو ٹیچرز ساتھ تھیں۔ باقی سب وین میں واپس آئیں، کسی نے مہرین کی غیر موجودگی کا نوٹس نہیں لیا۔ مجھے تشویش اس لیے نہیں تھی کہ اسکول ذمے دار ہے اور واپسی کا کوئی وقت مقرر نہیں تھا کہ مجھے دیر کا احساس ہوتا۔ ایک ایکٹریس ہے ایمن، جس نے مہرین کو گھر پہنچایا، ٹیکسی میں۔“

”میں نے تو یہ نام پہلے کبھی نہیں سنا۔ تم نے اسے کچھ دیا؟“

”میں نے سوچا تھا کہ اسے پانچ دس ہزار دوں مگر وہ بے امان گئی اور ٹیکسی کا کرایہ لے کر چلی گئی۔ مہرین نے اسے بتایا کہ ہیروئن اسے دو افراد نے دی تھی۔ ایک لمبا ایک چھوٹا۔ ایمن نے پتا دیکھنے کے لیے بیگ دیکھا تو اس میں پڑیاں برآمد ہوئیں۔ میں نے ڈاکٹر محسن کو اسی وقت بلا لیا تھا۔ انہوں نے کہا فکر کی کوئی بات نہیں۔“

”فکر کی یہ بات تو ہے نا کہ ایک ایکٹریس کو پتا چل گیا۔ ابراہیم شاہانی کی بیٹی نشہ کرتی ہے۔“

”میں نے اسے سمجھا تو دیا تھا کہ بات پھیلے گی تو ہمارے لیے رسوائی کا باعث ہوگی... میرا خیال ہے وہ ذمے دار عورت تھی۔ ذمے دار نہ ہوتی تو مہرین کو خود گھر کیوں پہنچاتی۔“

”ایک تو عورتوں کے پیٹ میں مروڑ اٹھتا ہے رازداری سے... دوسرے ہوسکتا ہے یہ احساسِ ذمے داری نہ ہو، لالچ ہو۔“

”کیا مطلب، اس نے تو ایک پیسا نہیں لیا۔ دس ہزار کیا کم تھے۔“

”دس لاکھ ہوتے تو لے لیتی۔ خیر، میں دیکھتا ہوں کہ اس کا منہ کیسے بند رکھا جاسکتا ہے۔ پیسے کے ساتھ دھمکی بھی ہونی چاہیے۔“ اس نے فون بند کر دیا۔ ڈاکٹر سے بات کرنے کے بعد وہ مزید پریشان ہوا۔ ڈاکٹر نے غلط نہیں کہا تھا کہ عادت چھڑانے کے لیے ماحول بدلنا ضروری ہوگا۔ تو اب کیا پھر اس کا اسکول بدلا جائے۔ اگر کوئی پیچھے لگا ہوگا تو وہ تیسرے اسکول بھی پہنچ جائے گا۔ شہر میں ایسے اسکول ہی کتنے ہیں جہاں سیٹھ ابراہیم شاہانی کی بیٹی پڑھے۔ ان کا پورا نیٹ ورک ہوگا۔

آخر زندگی اس کے ساتھ ایک ولن جیسا سلوک کیوں کر رہی تھی؟ وہ آج تک فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ صائمہ کو طلاق کے لیے مجبور کر کے اس نے کون سی عقل مندی کی تھی۔ کیا تھا اگر ایک روایتی بیوی کی طرح وہ اپنی تقدیر پر صابر شاکر ہو کے بیٹھی رہتی اور تمام عمر اس خوش فہمی میں گزار دیتی کہ وہ انتہائی خوش قسمت ہے۔ اسے اتنا محبت کرنے والا شوہر ملا اور ایسا گھر، اتنی دولت مندی، اتنی ناموری... ابراہیم نے احتیاط سے کام لیا ہوتا تو اس کے شوق بھی چلتے رہتے اور گھر بھی چلتا رہتا۔ وہ ان گنت ایسے لوگوں کو جانتا تھا جن کی بیویاں اپنے شوہروں کی قصیدہ خوانی میں مقابلہ کرتی تھیں کہ وہ ان سے کتنی محبت کرتا ہے اور کیسے ان کے حکم کا غلام ہے۔ سچ جھوٹ کا کس کو پتا۔ شوہروں کے بارے میں وہ جانتا تھا کہ باہر کیا کرتے ہیں مگر وہ ٹھنڈے دماغ کے امیر ڈپلومیٹک قسم کے شوہر تھے۔ وہ خود ضرورت سے زیادہ ری ایکٹ نہ کرتا، رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی۔ باہر جو کرتا چھپ کے احتیاط سے کرتا اور طلاق جیسا انتہائی قدم نہ اٹھاتا۔ کون عورت خوشی خوشی یہ داغِ رسوائی ماتھے پر سجاتی ہے۔ مگر اس کے رویے نے صائمہ کو یہ انتہائی قدم اٹھانے پر مجبور کیا اور وہ اپنے غرور میں مارا گیا۔

اس کی غلط فہمی تو بہت جلد دور ہوگئی تھی جب وہ پھر سے کنوارا بن کے سب حسیناؤں کی نظر میں سما رہا تھا اور ان کے دل سے بیڈ روم تک رسائی حاصل کرتے پر خود کو فاتح اعظم سمجھ رہا تھا۔ دو سال بعد ہی اسے وہ گھر یاد آنے لگا تھا جس کی تکمیل صائمہ نے کی تھی اب وہ پھر ایک خانہ بدوش تھا جس کا ہر گھر تھا مگر کوئی اپنا نہ تھا۔ جب اس نے مہرین کو گنوا دیا تو تنہائی اور شکست کا احساس دو چند ہو گیا۔ لیکن تب تک تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ صائمہ پھر اس کی نہیں ہوسکتی تھی۔

اگلے دو سال اس نے بہت شراب پی اور بہت سے جھوٹے آسروں کے پیچھے خوار ہوا۔ ذہنی انتشار اور بے سکونی کے باعث وہ کاروبار کو پوری توجہ بھی نہ دے پایا جو کسی ہشتِ پا کی طرح ہر طرف پھیلا ہوا تھا۔ شاہانی

ٹیکسٹائل، شاہانی کیمیکل، شاہانی انشورنس، شاہانی انویسٹمنٹ جو بلڈرز تھے۔ شاہانی الیکٹرانکس، شاہانی سیمنٹ، اس وقت کاروبار کو سنبھالنے والا سب سے بڑا تو اس کا سوتیلا بھائی دستور تھا جو سگوں سے زیادہ مخلص اور بے غرض تھا۔ اسے نہ منافع میں اپنے حصے سے غرض تھی اور نہ کاروبار کی ملکیت سے۔ اس کا ذاتی خرچ نہ ہونے کے برابر تھا وہ اپنی مصوری کی دنیا میں مگن رہنے والا آدمی تھا۔ یہ صلاحیت خداداد تھی اور اس نے اسحاق کو دستور بنا کے وہ شہرت اور عزت عطا کی تھی جو ابراہیم کو اس کی تمام دولت نہیں دے سکی تھی۔ اس جیسے اور اس سے دس گنا یا سو گنا بڑے بھی بہت تھے۔ دستور جیسے جینئس کے بارے میں دنیا کہتی تھی کہ صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔

بعض اوقات تو اسے دستور کی ناموری سے حسد محسوس ہوتا تھا۔ دولت اب اسے کوئی خوشی نہیں دے سکتی تھی اور خریدی ہوئی ہر خوشی بہت جلد بے معنی ہو جاتی تھی۔ یہ احساس اسے دستور ہی نے دلایا تھا کہ صائمہ کو چھوڑ کے اس نے خوشی کو خود گنوا دیا تھا اور اسی زمانے میں ابراہیم کی ملاقات مریم سے ہوئی تھی جو اسے چند ہی ملاقاتوں میں صائمہ کا نعم البدل لگی تھی۔ وہ ایک فیشن ڈیزائنر بننے سے پہلے ماڈل تھی۔ حسین ہونے کے ساتھ وہ ذہین بھی تھی اور ابراہیم جیسے دکھی مردوں کے دکھ دور کرنے کا سلیقہ بھی رکھتی تھی۔ ابراہیم نے اسے اپنا لیا تھا اور پھر تقدیر سے محرومی کے سارے شکوے ختم ہو گئے تھے۔ مریم نے ہر اعتبار سے خود کو صائمہ سے برتر ثابت کر دیا تھا۔ اگر ایک رات ڈاکو اسے قتل نہ کر جاتے تو وہ زندگی کی آخری سانس تک مریم سے محبت کرتا۔ وہ چند لاکھ کے زیورات تھے جو ڈاکو لے گئے تھے۔ مریم کا مول کوئی نہ تھا۔ اگر وہ مانگتے تو ابراہیم انہیں دس گنا سو گنا بخش دیتا، کیونکہ مریم اس کی زندگی تھی۔

مریم صرف دو سال اس کے ساتھ رہی۔ ان دو سالوں میں وہ بہت خوش رہا اور صائمہ ہی کو نہیں مہرین سے جدائی کا صدمہ بھی بھلا بیٹھا۔ اس کی توجہ کاروبار کی طرف رہی۔ دستور کی اپنی مصوری کی طرف، اسی زمانے میں شاکر اس کا پارٹنر بنا، شاکر خود ایک کامیاب بزنس مین تھا لیکن اس کا اصل اثاثہ وہ ذہانت تھی جو بعد میں شاہانی انڈسٹریز کے فروغ میں کام آئی۔ وہ نہ ہوتا تو مریم کی ناگہانی موت کے بعد کاروبار چوپٹ ہو جاتا۔ خود ابراہیم ذہنی طور پر اس قابل ہی نہ تھا کہ اپنی ساری توجہ کاروبار کو دے سکے۔ دستور اب اپنا زیادہ وقت مصوری کو دیتا تھا اور وہ شہرت کی بلندیوں پر تھا۔ اپنی تمام دولت مندی کے باوجود دنیا اسے دستور کے بھائی کی حیثیت سے زیادہ جانتی تھی۔ ''اچھا... وہ بھائی ہیں آپ کے؟'' یہ حیرانی سے بھرپور جملہ اسے بہت تکلیف بھی دیتا تھا اور خوشی بھی۔

اس کے آرٹسٹ بھائی نے ایک کارٹون کردار کے ساتھ اس کے آفس میں قدم رکھا۔ کارٹون جسمانی ڈیل ڈول سے پہلوان لگتا تھا۔ اپنا ہیئر اسٹائل خود اس کی ایجاد لگتا تھا۔ اس کے ایک کان سے بالی جھول رہی تھی اور وہ جگالی کرنے کے انداز میں زور شور سے چیونگم چبا رہا تھا۔ اس کی شرٹ پر رنگوں کے دھبے تھے جن میں چائے، کافی، سالن یا گندے ہاتھ صاف کرنے کے دھبے نظر ہی نہیں آتے تھے۔

دستور نے اسے کرسی آفر کی۔ ''برادر یہ جگ ہے۔ اور جگ یہ میرا بگ برادر جو میرے اوریجنل باپ سے زیادہ شفیق ہے۔''

ابراہیم نے پہلوان کی طرف دیکھ کے سر ہلایا۔ ''آدمی اور جگ کا فرق میری سمجھ میں نہیں آیا۔''

''یہ جلال الدین گردیزی تھا۔ پبلک کی آسانی کے لیے اس کے نام کا جوس نکال لیا۔ جگ... یہ دبئی میں ہونے والی بین الاقوامی نمائش میں میری مصوری کا سیکشن ڈیزائن کرے گا۔ اسے پانچ لاکھ دے دیں ابھی، یہ دس بعد میں لے لے گا۔ اس نے مجھے لکھ کے دیا ہے کہ میری تصویریں لاگت سے دگنی قیمت پر فروخت ہوں گی۔ اور دبئی سے جب نمائش پیرس جائے گی۔''

''دستور، تم کیا بچوں کی طرح مجھ سے پیسے مانگنے آ جاتے ہو۔ اپنا حساب رکھو۔'' ابراہیم نے چیک کاٹ کے جگ کے حوالے کیا۔

''برادر، یہ نوٹ اور ان کا حساب کتاب مجھے اتنا ہی برا لگتا ہے جتنی آپ کو تجریدی مصوری... آپ کچھ اَپ سیٹ ہیں؟''

''ہاں، مجھے تم سے ایک پرائیویٹ بات کرنی تھی۔ میں تمہارے انتظار میں بیٹھا تھا۔'' اس نے جگ کی طرف دیکھا۔

دستور نے چٹکی بجائی۔ ''تم کیوں بیٹھے ہو اب؟ چائے کافی پھر کبھی پی لینا، یا سمجھو پی لی۔''

جگ برا مانے بغیر جبڑے ہلاتا نکل گیا تو ابراہیم نے کہا۔ ''مہرین کو پھر کسی نے نشے کے چکر میں ڈال دیا ہے۔''

دستور چونکا۔ ''کس نے؟''

''یہ معلوم ہوسکتا تو میں ان کا قیمہ ٹن پیک کرا کے افریقہ کے آدم خوروں کو نہ بھیج دیتا۔ ایک ایکٹریس اسے گھر چھوڑ گئی۔ سوچو اس پر کسی بردہ فروش کی نظر پڑ جاتی تو وہ کہاں پہنچتی۔''

☆☆☆

اس کے مالی مسائل اب تشویش کا باعث ہو رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے عورت کی حیثیت سے دنیا میں اس کا ایک ہی مصرف ہے اور باقی سب قدردانوں کی فیاضی کہ اس کے لیے مالی آسانیاں فراہم کرتے رہیں، اس کے چہرے کی خوب صورتی اور نسوانی دلکشی کے علاوہ سب بیکار ہے۔ اس کی اداکاری کی اعلیٰ صلاحیت اور ذہانت یا اخلاق وغیرہ۔ حالانکہ اس آزمائشی دور کی ذلت سے وہ نہیں گزری تھی جس میں اداکاری کی شوقین ہر نئی لڑکی کے لیے نیچے سے اوپر تک کسی کو انکار کرنا گویا اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنے کے مترادف ہوتا ہے۔ ارشد کے ساتھ اس نے اپنا کیریئر باعزت انداز میں بہت اوپر سے آغاز کیا تھا۔ اب ارشد نہیں رہا تھا تو جیسے انڈسٹری کو یہ خیال آیا تھا کہ ذلت اٹھانے کا وہ کورس اب کرے۔ فائدہ اٹھانے والے اسے اپرنٹس شپ کہتے تھے نو وارد جو حالات کی مجبوری کو عذر بناتے تھے بڑی ڈھٹائی سے مشورہ دیتے تھے کہ روم میں وہی کرو جو رومن کرتے ہیں۔

بھاڑ میں گیا روم۔ اگر میں اپنی مرضی سے عزت کے ساتھ یہاں نہیں رہ سکتی تو گوجر خان یا پنڈ دادن خان میں رہ لوں گی۔ ارشد کے کہنے پر تو اس نے کچھ نہیں کیا تھا مگر پھر پرائیویٹ امتحان دے کر بی اے کیا تھا، اس خیال سے کہ وہ ایک ان پڑھ ماں نہ کہلائے۔ حالات اور اپنوں کی نظر بدلنے سے پہلے اس نے پیش بندی کی اور خاموشی سے ایم اے کا امتحان دے ڈالا۔ ذرا بھی توقع نہ ہونے کے باوجود وہ پاس ہوگئی۔ تھرڈ ڈویژن میں ہی سہی۔ اور جب آمدنی کم ہونے لگی تو اس نے ایک اسکول میں اپلائی کیا۔ اسے پرائمری کلاس ملی تھی مگر بڑی کلاس کے دو چار لڑکوں نے اسے پہچان لیا۔ بات پرنسپل تک پہنچی۔

اس نے ایمن کو بلالیا۔ ''آپ ماڈلنگ کرتی رہی ہیں پہلے، اور ایکٹنگ بھی۔''

''جی۔'' ایمن نے اعتماد سے جواب دیا جس میں فخر بھی شامل تھا۔

''آپ نے بتایا کیوں نہیں تھا؟'' اس کا لہجہ تند ہو گیا۔

''اس پروفیشن کے لیے یہ کوالی فکیشن نہیں تھی۔''

''بس، یہی کہنا تھا مجھے، یہ ڈس کوالی فکیشن تھی۔ ہم ماڈل یا ایکٹریس کو ٹیچر نہیں رکھ سکتے۔''

''کیوں؟ کیا یہ ممنوع ہے؟''

''اسٹوڈنٹس کے ماں باپ اسے پسند نہیں کریں گے۔ ٹیچنگ کا معزز پیشہ ہے۔''

وہ برہمی سے بولی۔ ''آپ میرے کردار پر حملہ کررہی ہیں۔''

''میں کچھ نہیں کررہی ہوں مس ایمن، مجھے اسی سوسائٹی میں رہنا ہے اور اسکول چلانا ہے، میں کیوں تمہارے لیے ہر ایک سے بحث کروں کہ ایسا سوچنا تنگ نظری ہے۔''

شہرت اس کے کردار پر ایک نہ مٹنے والا داغ بن کے چمٹ گئی تھی۔ دوسری جگہ بھی ایکشن ری پلے ہوا۔ یہی ڈائیلاگ دہرائے گئے پھر اس نے پرائیویٹ ٹیوشن کی اور بہت محنت سے کی لیکن چھ ماہ بعد اس کی شاگرد کی سہیلی نے اس کو پہچانا اور یہاں شاگرد کی ماں نے خاصی بداخلاقی کی۔ اس کے ایک اشتہار کا حوالہ دیا جس میں وہ ''ننگی'' ناچ رہی تھی جو سراسر جھوٹ تھا۔

وہ سارے معاشرے کا دوغلاپن دور نہیں کرسکتی تھی جو ایکٹریسوں کے پیچھے بھی بھاگتا تھا اور معاملہ رشتے جوڑنے کا آجائے تو ان سے دور بھی بھاگتا تھا۔ اسے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہوگا۔ اگر وہ مصلحت اور مصالحت کا نظریہ اپنا لے اور دوغلی اخلاقیات پر لعنت بھیج دے تو اسے فوراً کسی ...سی ای او کے ساتھ کسٹمر ریلیشن آفیسر کی نوکری اور رہائش اور کار مل سکتی ہے۔ ب اسے دن یا رات کا فرق رکھے بغیر باس کے ساتھ رہنا ہوگا۔ جہاں بھی وہ چاہے۔ کسی گھر میں، فائیو اسٹار ہوٹل میں، ملک میں یا ملک سے باہر۔

ہر رات کی طرح دیر تک کروٹیں بدلنے کے بعد بالآخر نینداس پر مہربان ہوئی ہی تھی کہ فون اپنی دھن بجانے لگا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے فون اٹھا کے نمبر دیکھا۔ یہ اس کا کوئی شناسا ہوتا تو نام آتا۔ ''ہیلو۔''

''ایمن، کون سی نیند پسند ہے تمہیں؟ ایک رات کی... یا ہمیشہ کی؟'' کسی نے نرمی سے کہا۔

''یو ایڈیٹ، میں تمہارے مطلب کی لڑکی نہیں ہوں۔ کوئی اور نمبر ٹرائی کرو۔''

''تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔'' سخت بھاری بھرکم لہجے سے وہ کوئی ٹین ایجر نہیں لگتا تھا۔

''واٹ نان سینس...''

''ایمن، زندگی سے پیار ہے تو اپنے کام سے کام رکھو۔ دخل در معقولات چھوڑ دو۔''

اس کے فون بند کرنے سے پہلے آواز بند ہوگئی۔ اس قسم کے فون کبھی کبھی آجاتے تھے۔ رات کو اپنے اپنے بیڈ رومز کی خلوت سے لڑکے لڑکیاں کرینک کالز کرتے تھے۔ نمبر کبھی قسمت سے لگ نمبر بھی بن جاتا تھا اور نہ کسی کو ایک ڈرٹی جوک سنانے یا اغوا اور قتل کی دھمکی دینے کے بعد جو گالیاں سننے کو ملتی تھیں۔ ان میں بڑا لطف تھا۔ اس کے فین تو نہ ہونے کے برابر تھے پھر بھی دو چار مرتبہ اس کے سچے عاشق بھی نکل آتے تھے جو اس پر باقاعدہ فریفتہ تھے اور اسے اپنی سم بدلنا پڑی تھی۔ نیند ڈسٹرب ہونے کے بعد وہ پھر سوئی تو اس نے پھر وہی خواب دیکھا۔ آگ کے شعلوں میں لپٹے ہوئے گھر کے اندر کوئی لڑکی چیخ رہی تھی لیکن نہ کوئی بھڑکتی آگ کو دیکھ رہا تھا۔ نہ چیخوں کو سن رہا تھا۔ وہ دیوانہ وار لوگوں کو متوجہ کررہی تھی۔ دیکھو، فائر بریگیڈ کو بلاؤ، ورنہ وہ جل کے مرجائے گی اور لوگ سنی ان سنی کرتے جارہے تھے۔ اس کی ناک میں گوشت کے جلنے کی بو آنے لگی تو وہ ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھی۔ اس کا جسم پسینے میں تر تھا اور وہ کانپ رہی تھی۔

جب ارشد کے جہاز کا کریش ہوا تھا اور اس کے ساتھ حمیرا بھی سمندر کی گہرائی میں اتر گئی تھی تو بعد میں تفتیش کے دوران یہ بھی پتا چلا تھا کہ جہاز میں پہلے آگ لگی تھی اور ایک بحری جہاز کے عملے نے آگ کا ایک گولا سا آسمان سے گرتا دیکھا تھا جو سمندر میں غائب ہوگیا تھا۔ اس زمانے میں یہ منظر اسے جاگتی آنکھوں سے بھی نظر آتا تھا پھر اس کے ڈراؤنے خوابوں کا حصہ بن گیا لیکن وقت کے ساتھ یاد کا نقش دھندلانے لگا اور خود اس نے بھی زندگی سے ہار نہ ماننے پر کمر کس لی تو یہ خواب کا آسیب بھی ختم ہوگیا۔ آج بہت عرصے بعد حمیرا اپنی تصویر میں بڑی نظر آئی۔ بالکل مہرین جیتی اور بالکل اس جیسی...

غسل کے بعد ناشتا بناتے ہوئے اسے پھر مہرین کا خیال آیا۔ وہ ذرا بھی حمیرا کی ہم شکل نہ تھی مگر ہاں، وہ زندہ ہوتی تو اتنی ہی بڑی ہوتی اور کیا پتا اسی اسکول میں پڑھ رہی ہوتی۔ ارشد کی آمدنی تب بھی کم نہ تھی۔ اب تو وہ نہ جانے ترقی کرکے کہاں پہنچتا۔ شاید اپنے ڈرامے خود پروڈیوس کرتا۔ یہ بھی بہت غنیمت تھا کہ وہ ایمن کو اکیلا چھوڑنے سے پہلے اسے ایک گھر دے گیا تھا۔ جو کار ارشد کے لیے بالکل نیا ماڈل تھی وہ بارہ سال بعد بھی بہت اچھی تھی۔ اس نے نچلی منزل کرائے پر اٹھا دی تھی جس میں ایک عمر رسیدہ ڈاکٹر اور لیڈی صرف وقت کے لیے کلینک چلا رہے تھے۔ وہ اکیلے تھے کیونکہ انہوں نے بھی محبت میں بچوں کو اعلیٰ تعلیم کے لیے باہر بھیجنے کی غلطی کی تھی۔ ایمن کا گزارا انہی کے دیے ہوئے چالیس ہزار کے کرائے سے ہورہا تھا۔ اس میں ہمت نہ تھی کہ ان سے کرایہ بڑھانے کی بات کرے اور کہے کہ آس پاس سب ساٹھ ساٹھ ہزار دیتے ہیں کیونکہ آمدنی کے ساتھ ایمن کی حفاظت بھی ہورہی تھی۔ ان کا ملازم جوڑا بھی وہیں مقیم تھا۔ عورت گھر کے اندر کا سارا کام سنبھالتی تھی۔ مرد بیک وقت ڈرائیور، مالی، چوکیدار اور باہر کے کام کرنے والا تھا اور ایمن کے بھی سارے کام کردیتا تھا۔

معلوم نہیں اس لڑکی مہرین کی حالت اب کیسی ہوگی؟ اسے ناشتے کے دوران خیال آیا۔ بارہ چودہ سال کی بچی کا ہیروئن کے چکر میں پڑنا یاں باپ کے لیے کتنا عذاب تھا اور بات صرف نشے کی نہیں تھی۔ اس لڑکی نے تو پرانے اسکول میں ایک لڑکی کے غائب ہوجانے کی بات کی تھی۔ ایک دوسرے اسکول میں بھی کچھ لوگ اس کے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ وہ ان کا آلۂ کار نہیں بنے گی تو خطرناک جرائم پیشہ گروہ کے افراد اسے بھی ماردیں گے۔ کیوں نا وہ اس کی خیریت معلوم کرنے جائے اور آج اپنی کار میں جائے جو وہ بہت کم استعمال کرتی تھی کیونکہ ہر جگہ کار میں جانا مہنگا پڑتا تھا۔ پھر اس نے فون کرلینے کا سوچا۔ مگر شاید اس کی ماں فون پر یہ بات نہ کرے۔

اس نے گاڑی کو جھاڑ پونچھ کے باہر نکالا۔ گزارے کے لیے اس میں پیٹرول تھا۔ آدھے گھنٹے بعد وہ آسانی سے مہرین کے گھر پہنچ گئی۔ کار سے اتر کے اس نے عجیب سین دیکھا۔ ایک شخص چوکیدار کو گالیاں دے رہا تھا۔ ''الو کے پٹھے، بکواس کرتا ہے تو...''

چوکیدار نے عاجزی سے کہا۔ ''سر، وہ واقعی گھر پر نہیں ہیں۔''

''گھر پر نہیں ہیں تو کہاں گئی ہیں؟'' وہ چیخ کے بولا۔

''یہ میں نہیں بتا سکتا سر۔'' چوکیدار نے جواب دیا۔

اگر اس وقت ایمن نہ پہنچتی تو وہ شخص شاید چوکیدار کو مارتا۔ ایمن کو وہ صورت آشنا لگا مگر اسے دیکھتے ہی وہ جلدی سے اپنی گاڑی میں بیٹھ کے نکل گیا۔ ''کون تھا یہ؟'' ایمن نے ناگواری سے کہا۔ ''بہت بدتمیز آدمی تھا۔''

''آپ نے پہچانا نہیں، کرکٹ کھیلتا ہے۔ صفدر محمود

نام ہے اس کا، اس وقت نشے میں تھا۔"
"بیگم صاحبہ کہاں گئی ہیں؟" سوال کرنے کے بعد اسے غلطی کا احساس ہوا۔
"وہ... بے بی کو دیکھنے اسپتال..." چوکیدار نے تذبذب سے کہا۔
"اچھا ٹھیک ہے۔ بے بی کیسی ہے اب؟" وہ پلٹتے ہوئے بولی۔ "کل میں ہی اسے لائی تھی۔"
"جی میڈم، میں نے آپ کو پہچان لیا تھا مگر... بیگم صاحبہ نے منع کیا تھا مجھے... کہ آپ پھر آئیں تو..."
چوکیدار نے جو بات نہیں کہی، وہ ایمن نے سمجھ لی۔
گاڑی میں روانہ ہونے کے بعد اسے خیال آیا کہ وہ خود ابراہیم شاہانی سے بھی تو براہِ راست بات کر سکتی تھی۔ اس کے پاس مہرین کے بیگ سے ملنے والا وہ کارڈ تھا جس پر ابراہیم شاہانی کا نام لکھا ہوا تھا اور بہت سے فون نمبر تھے۔
اس نے ایک نمبر ملایا۔ "شاہانی انڈسٹریز..." آپریٹر کی آواز آئی۔
"مجھے ابراہیم صاحب سے بات کرنی ہے۔"
"کس سلسلے میں؟ کیا آپ کی ان سے اپائنٹمنٹ تھی؟"
"نہیں، آپ بتادیں کہ میں ایمن ہوں، میں نے ہی کل ان کی بیٹی مہرین کو گھر پہنچایا تھا۔"
چند سیکنڈ میں ایمن نے ابراہیم کی آواز سنی۔ "ہیلو مس ایمن، آپ نے بہت اچھا کیا کہ خود کال کرلی۔ میں آپ کی تلاش میں تھا۔ آپ کا شکریہ ادا کرنا تھا۔"
"میری جگہ آپ ہوتے تو کیا ایسا نہ کرتے، اب وہ کیسی ہے؟"
"بالکل ٹھیک ہے۔ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ کل آپ مجھ سے مل لیں۔ آج میں مصروف ہوں۔" وہ نرمی سے بولا۔
"او کے، میں کس وقت آؤں؟"
"جس وقت آپ چاہیں۔ بہتر یہ ہوگا کہ دوپہر میں آ کے لنچ میرے ساتھ ہی کریں، پلیز۔"
ابراہیم سے بات کرتے ہوئے ایمن بالکل بھول گئی کہ اسے پیٹرول بھی لینا تھا۔ اگلے روز وہ خاصے اہتمام سے نکلی تھی مگر دیکھا تو فیول کی سوئی صفر سے بھی نیچے تھی۔ مجبوراً اس نے باہر سے گزرتی ٹیکسی پکڑی اور اسے پتا سمجھا دیا۔ شاہانی پلازا میں شاہانی انڈسٹریز کا ہیڈ آفس تھا اور خود ابراہیم شاہانی بیٹھتا تھا ایک عالی شان دس پندرہ منزلہ پلازا تھا جس کے گرد وسیع رقبے میں سیکڑوں گاڑیاں کھڑی تھیں اور باغات پھیلے ہوئے تھے۔ ایک فرلانگ اندر تک دھوپ میں پیدل جانے کے بجائے اس نے ٹیکسی کو اندر تک لے جانے کا فیصلہ کیا۔ گیٹ پر مستعد کھڑے گارڈ نے اس کا نام سنا اور سیلیوٹ کر کے گیٹ کھول دیا پھر اس نے ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ سنبھال لی۔ ایمن حیرانی سے دیکھتی رہی۔ ٹیکسی سامنے کے بجائے پیچھے گئی۔ ایک اور فولادی گیٹ کھلا اور ٹیکسی سرنگ جیسے راستے میں اتر گئی جس پر عجیب خودکار نظام کے تحت ٹیکسی کے سامنے دونوں طرف کی لائٹس آن ہوتی تھیں تو پیچھے والی بند والی بجھ جاتی تھیں۔ وہ کچھ مرعوب اور خوف زدہ سی بیٹھی تھی۔ تیسری جگہ ایک اور گارڈ نے سیلیوٹ کیا اور ٹیکسی کے لیے فولادی کمرے کے دروازے کھل گئے۔ ٹیکسی اندر گئی تو دروازے بند ہوئے اور وہ وسیع کمرا اوپر اٹھنے لگا۔ چند سیکنڈ میں لفٹ رک گئی اور آگے بیٹھے گارڈ نے لپک کے ٹیکسی کا دروازہ کھولا۔
ایمن اتری تو ابراہیم شاہانی نے بڑے تپاک سے اس کا استقبال کیا۔ ایمن کے آفس میں قدم رکھتے ہی لفٹ بند ہوگئی اور ٹیکسی کو واپس نیچے لے گئی۔ ایمن کو اندازہ ہوا کہ وہ ایک وی آئی پی مہمان کے طور پر مدعو تھی اور یہ استقبال خود ابراہیم شاہانی کی ہدایات پر ہوا تھا۔ ریسیو کرنے والے کتنے حیران ہوں گے کہ یہ وی آئی پی مہمان اپنی کار میں نہیں بلکہ ٹیکسی میں آئی تھی۔ ایمن اسی راستے سے لائی گئی تھی جس سے خود ابراہیم شاہانی اپنے آفس میں قدم رنجہ فرماتا تھا۔ اس کے آفس کی وسعت اور شان و شوکت بھی کم نہ تھی۔ چند قدم کے فاصلے پر ایک اور نسبتاً کم عمر شاندار سوٹ میں ملبوس ہینڈسم شخص نے ایمن کو مسکرا کے خوش آمدید کہا۔ ابراہیم میز کے ایک طرف اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔
"یہ میرا بھائی، دوست، مشیر، پارٹنر سب کچھ ہے۔ اسحاق دستور شاہانی، مشہور و معروف مصور۔"
"میں جانتی ہوں۔" ایمن نے کہا۔ "لیکن یہ نہیں جانتی تھی کہ یہاں میرا استقبال اس شاہانہ انداز میں ہوگا۔ میں تو صرف مہرین کے بارے میں آپ سے بات کرنے آئی تھی۔ شکریہ تو آپ نے کل ہی ادا کر دیا تھا۔"
"احسان کا بدلہ صرف شکریے کا ایک لفظ تو نہیں ہو سکتا۔ مہرین میری ایک ہی بیٹی ہے۔ خدانخواستہ وہاں سے کوئی اور اسے لے جاتا، میں اس کی طرف سے بہت پریشان ہوں۔ معلوم نہیں کون لوگ ہیں جو اس کے پیچھے لگ گئے ہیں۔"
دستور نے تائید کی۔ "اگر انہیں پیسا چاہیے تو لے

بس، مہرو کی جان چھوڑ دیں۔"

"دراصل میں اسے خود سے دور کرنا نہیں چاہتا۔ ورنہ میرے لیے اس کو تعلیم کے لیے باہر بھیجنا کیا مشکل تھا۔ مہرین نے کیا بتایا آپ کو...؟"

ایمن نے وہ سب دہرا دیا جو وہ مہرین کی ماں کو بتا چکی تھی۔ "وہ کہتی ہے ایک کلاس کی لڑکی تھی۔ وہ غائب ہو گئی۔ اب دو آدمی آتے ہیں۔ ایک لمبا ایک چھوٹا۔ ان کے پاس پستول ہیں۔ اگر میں نے مہرین کے بارے میں کسی سے بات کی تو وہ مجھے بھی مار دیں گے۔"

"میرا خیال ہے یہ سب اس کے اپنے ذہن کی اختراع ہوگی۔" دستور بولا۔ "وہ نشے میں تھی۔"

ایمن نے دستور کو غور سے دیکھا۔ "مسز ابراہیم نے کہا تھا کہ خود گھر کے لوگ ہیروئن پیتے ہوں..."

ابراہیم کا چہرہ موڈ خراب ہونے سے بگڑ گیا۔ "وہ ذلیل عورت میرے بھائی کو بدنام کرتی پھرتی ہے۔ مجھ سے زیادہ دستور اسے پیار کرتا ہے۔"

"دراصل ایک بار میں نے ایک ماڈل سے سگریٹ کا وہ پیکٹ چھین لیا تھا جو وہ پیتی تھی۔ وہ میری جیب میں گھر چلا گیا تھا۔ بھابی کو موقع مل گیا۔"

ابراہیم نے کہا۔ "شاید آپ کو معلوم نہیں اس لیے آپ حیران نظر آ رہی ہیں۔ صائمہ مجھ سے طلاق لے چکی ہے۔ میرے معاملات سے اب اس کا کوئی تعلق نہیں، لیکن میں نے مریم سے شادی کی تو اسے مزید آگ لگی۔ مریم کو گھر میں گھس کے ڈاکوؤں نے مار دیا تھا۔ دس بارہ لاکھ کے زیورات کے لیے... میں نے تو صائمہ پر الزام نہیں لگایا کہ قتل اس نے کرایا۔" وہ اچانک چپ ہو گیا۔

"مسٹر ابراہیم شاہانی! آپ کے گھریلو تنازعات سے مجھے کیا۔ میں اب چلتی ہوں۔"

"ایسے نہیں مس ایمن... میں ذرا مصروف ہوں۔ دستور آپ کو لنچ کے لیے لے جائے گا۔ دعوت آپ قبول کر چکی ہیں لیکن ایک تحفہ آپ کے لیے میری طرف سے..."

اس نے ایک گاڑی کی چابیاں اس کی طرف بڑھائیں۔ "آپ کی کار نیچے کھڑی ہے۔ میں اوپر منگوا لیتا ہوں۔"

ایمن نے ہاتھ پیچھے کر لیا۔ "تو مسٹر ابراہیم، مانا کہ آپ ایک نہیں دس کاریں دے سکتے ہیں لیکن کار ہے میرے پاس... پیٹرول نہیں تھا اس میں... اس لیے میں ٹیکسی میں آئی تھی۔ میں یہ کار نہیں لوں گی۔"

"مس ایمن! یہ میری خوشی ہے، پلیز... آپ نے ایک نیکی کی تھی۔"

"سوری سر... مجھے ہمیشہ شرمندگی رہے گی کہ میں نے اس کی قیمت لے لی۔"

"اوکے، اوکے۔" ابراہیم نے چابیاں میز پر رکھ دیں۔ "اگر میں اور کچھ کر سکتا ہوں آپ کے لیے..."

وہ پھر بیٹھ گئی۔ "ہاں، آج کل میں جاب تلاش کر رہی ہوں۔ میرے شوہر جب تک زندہ تھے مجھے ایڈ ملتے رہے کیونکہ وہ اسکرپٹ رائٹر تھے۔ ان کے انتقال کے بعد لوگوں کی نظر بدل گئی۔ میں ایم اے پاس ہوں۔ اسکول میں پڑھاتی تھی۔ انہوں نے نکال دیا کہ ہم کسی ماڈل یا ایکٹریس کو ٹیچر نہیں رکھ سکتے۔ ٹیوشن کی تو پھر یہی ہوا۔ لوگ ماڈل یا ایکٹریس اور طوائف کے پیشے میں فرق نہیں سمجھتے۔"

ابراہیم شاہانی سنتا رہا۔ "لوگ جاہل ہیں۔ آپ کا مسئلہ میں نے سمجھ لیا اور آپ کا اپائنٹمنٹ ابھی اسی وقت کیا جا رہا ہے۔ آپ جب چاہیں اسپیشل اسسٹنٹ کی حیثیت سے آ سکتی ہیں۔ ایک لاکھ ماہانہ، رہائش اور کار۔"

"سر! یہ کان کو دوسری طرف سے پکڑنے کی کوشش ہے۔ ایک کار سے بڑی قیمت دے رہے ہیں آپ مجھے... جو کام میں نے کیے ہیں وہی کر سکتی ہوں۔"

ابراہیم نے ہتھیار ڈالنے کے انداز میں کہا۔ "چلیے پھر آپ خود بتا دیجیے۔"

"میں ماڈل تھی۔ ایکٹریس تھی۔ ٹیچر بن سکتی تھی مگر بننے نہیں دیا گیا۔"

ابراہیم اس نوجوان عورت کے عزم سے متاثر ہوا تھا جو نیک نیتی اور صلاحیت کے ساتھ جدوجہد کر رہی تھی۔ "ابھی ابھی مجھے خیال آیا کہ خدمت خلق کے کام تو میں کرتا ہوں۔ ابھی تک میں نے کوئی گرلز اسکول نہیں بنایا۔ کیا حرج ہے اگر اب یہ کام آپ کے سپرد کر دوں۔"

"ایک منٹ بھائی۔" دستور بولا۔ جو اسے پلک جھپکائے بغیر دیکھ رہا تھا۔ "ان کو میرے حوالے کر دیں۔"

ابراہیم کے ساتھ وہ بھی چونکی۔ "کیا مطلب؟"

"آپ میری ماڈل بن جائیں۔ مجھے ہمیشہ ماڈل کا مسئلہ رہتا ہے۔ کوئی ملتی ہے تو زیادہ دن ٹھہرتی نہیں۔ ایڈ ایجنسی نہ لے جائے تو شوبز والے لے جاتے ہیں۔ یہ کام آپ کی مرضی کا ہے۔ معاوضہ میں اپنی مرضی سے دوں گا۔"

وہ مسکرائی۔ "مجھے منظور ہے لیکن میں بتا دوں کہ میں مصوری کو بالکل نہیں سمجھتی۔"

"مصوری میں کروں گا۔ تم سے نہیں کرواؤں گا۔ چلو

یہ مسئلہ تو حل ہو گیا۔ اب پیٹ پوجا کا مسئلہ سنگین ہو چکا ہے۔ اسے حل نہ کیا فوراً تو ہم دونوں کا مستقبل تاریک ہو جائے گا، کم آن۔''

ابراہیم شاہانی نجی زندگی میں جیسا بھی ہو یہاں اپنی پوزیشن کے مطابق لیے دیے رہنے والا شخص تھا۔ دستور اس کا پارٹنر ہونے کے باوجود غیر ذمے دار اور لاابالی لگتا تھا۔ شاید تھا نہیں ورنہ بھائی اس پر اتنا بھروسا کیوں کرتا۔ اس کی شاندار مرسیڈیز میں پیچھے بیٹھ کے ایمن کو گزر جانے والے دن کا خیال آیا جب وہ میوزیم کے باہر کوفت میں مبتلا مایوس اور بھوکی پیاسی بیٹھی تھی۔ تقدیر کی جادوگری نے ایک معمولی اتفاق سے اس کے مستقبل کو خواب سے تعبیر میں بدل دیا تھا۔

دستور بولا۔ ''بھائی کا خیال ہے کہ مجھے اپنے اسٹوڈیو کو کسی بڑی عمارت میں شفٹ کر دینا چاہیے۔ اسی آفس میں دو ٹاپ فلور خالی ہیں۔ اگر بالکل اوپر والے کو میں اپنا اسٹوڈیو بنالوں۔۔۔ تو اس سے نیچے والے میں ایڈ ایجنسی شروع کی جا سکتی ہے۔''

''ایڈ ایجنسی؟ اس میں شاید میں آپ کی مدد کر سکوں۔ مجھے خاصے قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا تھا۔ میرے شوہر اسکرپٹ ڈائریکٹر تھے۔ میں ایکٹنگ کے ساتھ پروڈکشن کا پورا پروسس سمجھتی ہوں۔''

''ارے واہ، پھر تو مزہ آ گیا۔ ملاؤ ہاتھ۔'' اس نے بے تکلفی سے ہاتھ بڑھا دیا اور ایمن کو ہاتھ ملانا پڑا۔ ''مجھے کیا معلوم تھا کہ آج تم اچانک وارد ہو کے ایک خیال کو حقیقت میں بدل دو گی۔ ہم ایک اچھی پارٹنر شپ کر سکتے ہیں۔ اس وقت بھی ہم اشتہارات اِدھر اُدھر سے بنوا لیتے ہیں مگر مجھے بڑی بھاگ دوڑ اور سر کھپائی کرنی پڑتی ہے۔ بھائی تو بہت خوش ہوں گے کہ میں نے ان کی بات مانی۔۔۔ انہیں وہ جگہ بالکل پسند نہیں جہاں اب میں نے اسٹوڈیو بنا رکھا ہے۔''

''کیوں پسند نہیں؟''

''یہ تم خود دیکھو گی تو بھائی کی طرف دار بن جاؤ گی۔ لنچ کے بعد میں تمہیں وہاں لے جاؤں گا۔''

شہر کے سب سے مہنگے اور نامور ہوٹل کے خوابناک ماحول میں دستور کے ساتھ ایک پُرتکلف لنچ کا وہ کل تک تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ ارشد کے ساتھ کسی ڈنر یا کبھی لنچ کرنے وہ ہر جگہ گئی تھی مگر وہ بارہ سال پہلے کی بات تھی۔ اب وہ اکیلی تھی اور اس کا زیادہ وقت اپنی تنہائی میں فلمیں دیکھتے یا کتابیں پڑھتے گزرتا تھا۔ مہینے بھر میں مصروفیت کے دن کم ہوتے جا رہے تھے۔ پہلے وہ پندرہ دن کام کرتی تھی۔ پھر یہ دس دن ہو گئے۔ اس کے لیے ممکن نہیں تھا کہ وہ اشتہاری کمپنیوں کے چکر لگائے اور کام مانگتی پھرے۔ ایک شادی شدہ زندگی کی اخلاقیات اب بھی اس کی راہ میں دیوار بن رہی تھیں۔ وہ کام کے لیے صلاحیت کا سودا چاہتی تھی، جسم کا نہیں۔ وہ کبھی اس بارے میں سوچتی تو اسے لگتا تھا کہ وہ ارشد سے بے وفائی کے جرم کی مرتکب ہو رہی ہے۔ حمیرا کی معصوم سوالیہ آنکھیں اسے روک لیتی تھیں۔ ماں، کیا تم کو اندازہ نہیں کہ کلاس میں کچھ لڑکے اس وقت بھی مجھے طعنے دیتے تھے۔ تمہاری ماں تو ماڈل ہے۔''

اس نے تیس لاکھ کی کار ٹھکرا دی تھی۔ ایک لاکھ روپے ماہانہ قبول نہیں کیے تھے اور شاید خدا کو اس کی یہ بات اچھی لگی تھی۔ اس نے ایمن کے لیے ایک باعزت فائدہ مند اور محفوظ مستقبل کا بندوبست کر دیا تھا۔ کوئی اور لڑکی ہوتی شاید فوراً ابراہیم کے ہاتھ چوم کے چابی اچک لیتی یا ایک لاکھ رہائش اور کار والی ملازمت کو قسمت کی لاٹری سمجھ کے خوشی سے پاگل ہو جاتی۔ لیکن وہ سب قبول نہ کر کے بھی ایمن نے گھاٹے کا سودا نہیں کیا تھا۔

اب گاڑی بہت غربت زدہ علاقے کی تنگ و تاریک گلیوں سے گزر رہی تھی۔ جہاں چھوٹے چھوٹے کچے پکے مکانوں میں رہنے والوں کی افلاس زدہ زندگی کی بدصورتی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اَن گنت لوگوں نے گاڑی روک کے اس سے ہاتھ ملایا۔ اسے سلام کیا اور دو چار نے تو اپنے دکھڑے بھی روئے۔ اس نے ایک بوڑھی عورت کو دو ہزار دیے۔ ایک جگہ گاڑی روک کے کسی بوڑھے سے ہاتھ ملایا جو چارپائی پر پلستر لگی ٹانگ پھیلائے حقہ پی رہا تھا۔ ایمن نے خود کو یہ سوال پوچھنے سے روکا کہ آخر ایسی جگہ اسٹوڈیو بنانے کی ضرورت اور مصلحت کیا تھی؟

اسٹوڈیو اچانک آ گیا۔ سامنے ایک پھاٹک تھا اور گلی بند تھی۔ اس کے ہارن دیتے ہی گیٹ کھل گیا اور جیسے دنیا بدل گئی۔ چاروں طرف سے درختوں، سرسبز لان اور پھولوں سے گھری مختصر سی مخروطی چھت والی عمارت کسی لینڈ اسکیپ کا حصہ لگتی تھی جو مری اسلام آباد یا سوات میں ہو سکتا تھا مگر یہاں گیٹ کھلنے سے پہلے اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اگلے دو گھنٹے تک وہ عمارت کے اندر مکمل اور نامکمل تصاویر دیکھتی رہی۔ وہ بتاتا رہا کہ کس کی کیا قیمت لگی تھی یا لگ سکتی تھی۔ کارنس پر ٹرافیاں اور انعامات ڈھیر تھے۔ دیواروں پر دنیا بھر میں ہونے والی ہر نمائش کی تصویر تھی۔

ہر تصویر میں وہ نہ جانے کس کس کے ساتھ موجود تھا۔

اچانک اس فرش پر شفاف پلاسٹک کی چھوٹی سی پڑیا دکھائی دی جو اس نے فوراً اٹھالی۔ ''دستور صاحب، یہ کیا؟ ایسی ہی پڑیاں تھیں مہرین کے بستے میں۔''

''میں صاحب نہیں ہوں ایمن۔'' اس نے سرسری انداز میں کہا اور پڑیا لے لی۔ ''ابھی جو ماڈل تھی۔'' اس نے ایزل پر لگی تصویر کی طرف اشارہ کیا۔ ''اسے عادت تھی۔ کہتی تھی اس کے بغیر موڈ نہیں بنتا۔'' اس نے پڑیا کو پھاڑ کے سفید سفوف کو ڈسٹ بن میں ڈال دیا۔

اچانک شور سن کے دستور نے باہر دیکھا۔ گارڈ دو افراد کو روکنے کی کوشش کررہا تھا۔ ''صاب کے مہمان ہیں اندر۔'' مگر وہ رکنے پر آمادہ نہ تھے۔ ان میں سے ایک لمبا تھا۔ دوسرا چھوٹا لیکن موٹا۔

دستور نے وہیں سے کہا۔ ''اے گولو مولو، گارڈ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ ابھی فارغ نہیں ہوں۔ میرے مہمان ہیں اندر۔'' وہ دونوں خاموشی سے کان لپیٹ کر نکل گئے۔

''دھمکی دینے والے دو تھے۔ ان میں ایک لمبا تھا۔ دوسرا چھوٹا۔'' اسے مہرین کے الفاظ یاد آئے۔ اس کے جسم میں سردی کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ ''یہ کون تھے؟'' اس نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

دستور نے سرسری لہجے میں کہا۔ ''یہ جو لمبا ہے رکشا چلاتا ہے۔ دوسرا اس کا بھائی تھا۔ چاہتا ہے کہ اسے بھی رکشا مل جائے۔ میں ضامن بن جاؤں تو بڑا بھائی قسطیں ادا کرتا رہے گا۔''

''دستور، آخر کیوں بیٹھے ہو تم اس جگہ... ایسے لوگوں کے درمیان... جو شکل سے جرائم پیشہ لگتے ہیں؟''

وہ ہنس پڑا۔ ''صورت سے میں کون سا شریف آدمی لگتا ہوں۔''

''آخر کوئی تو وجہ ہوگی کہ تم نے اس فضول جگہ کا انتخاب کیا۔ شاہانی پلازا کے ٹاپ فلور کی بات سمجھ میں آتی ہے مگر یہاں...''

''دیکھو ایمن، یہ لوگ اصلی زندگی کی جیتی جاگتی تصویر ہیں۔ وہ جو اس ملک کے عوام کی غالب اکثریت کی زندگی ہے۔ شاہانی پلازا کے ہر فلور پر سب مصنوعی زندگی ہے جو لالچ، غرور اور نفرت کے جذبات پر شائستگی کی نقاب رکھتے ہیں۔''

ایمن نے اکتا کے کہا۔ ''اچھا چھوڑو، مجھے دیکھنا تھا کہ مہرین اب کیسی ہے؟''

اس نے گھڑی دیکھی۔ ''ملاقات کا وقت ابھی نہیں ہوا۔ ایک گھنٹے میں ہم چائے پی سکتے ہیں۔'' اس نے گاڑی کو اچانک ایک ہوٹل کے پارکنگ ایریا کی طرف موڑ دیا۔ وہ انکار بھی نہ کرسکی۔ اسے احساس ہورہا تھا کہ پہلی ہی ملاقات میں یہ بے تکلفی مناسب نہیں۔

ایک کونے کی ٹیبل پر اس کے مقابل بیٹھ کے ایمن نے کہا۔ ''تمہیں کچھ اندازہ تو ہوگا کہ مہرین پر کون مہربان ہے کیوں؟''

وہ اسے پلک جھپکائے بغیر دیکھتا رہا۔ ''ہاں، میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ اس کی ہر بات سچ ہے۔''

''اس کو جھوٹ بولنے کی بھی کیا ضرورت ہے۔ اس نے تو مجھے بھی خبردار کیا تھا۔'' اسے اچانک کچھ یاد آگیا۔ ''اور اب معلوم نہیں وہ مذاق کررہے تھے یا سیریس تھے۔ لیکن کل رات کسی نے گمنام کال کر کے مجھے خبردار کیا کہ میں مہرین کے معاملے میں نہ پڑوں۔''

''تم نے نمبر نہیں دیکھا تھا؟''

''نمبر سے کیا ہوتا ہے۔ اگر یہ واقعی دھمکی تھی تو نمبر ملے گا نہیں۔ فون بند ہوگا۔ وہ سم بدل چکے ہوں گے۔ یہ لوگ غریب بچوں کو پیسے کے جال میں پھانستے ہیں۔ مہرین اتنے دولت مند اور مشہور آدمی کی بیٹی ہے۔ اسے اغوا کیا جاسکتا ہے تاوان کے لیے... مگر...''

اس نے ایمن کی بات کاٹ دی۔ ''تم کچھ ضرورت سے زیادہ دلچسپی نہیں لے رہی ہو مہرین میں...''

ایمن نے ایک گہری سانس لی۔ ''میری ایک بیٹی تھی... حمیرا... اگر وہ زندہ ہوتی تو آج مہرین کی طرح ہوتی... شاید اسی اسکول میں اس کی کلاس فیلو ہوتی۔''

☆☆☆

مہرین رات کے بارہ بجے بھی اس عورت... یا لڑکی کے بارے میں سوچ رہی تھی جو انکل دستور کے ساتھ اس سے ملنے اسپتال آئی تھی۔ وہ اب بالکل ٹھیک تھی۔ سچ تو یہ تھا کہ اسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ نشے کا کچھ زیادہ اثر تھا کہ اماں جان نے گھبرا کے ڈاکٹر کو بلا لیا۔ ڈاکٹر صاحب ویسے تو ابا کے پرانے دوست اور کلاس فیلو رہے تھے لیکن آج کل ماما کے مخلص اور ہمدرد زیادہ ہوگئے تھے۔ انہوں نے کچھ کانا پھوسی کی اور مہرین کو اسپتال منتقل کردیا گیا۔ اسپتال دراصل ان کا محل نما گھر تھا۔ ان کے ہوتے بہت سارے بچے تو آباد ہوتا۔ دو میاں بیوی نے پیچھے گیسٹ ہاؤس میں رہائش اختیار کرلی اور باقی گھر کو اسپتال بنا دیا۔ دو بیڈ کی ایکسی انہیں

کافی تھی۔ وہ خود تو صبح سے شام تک اسپتال میں ہی مصروف رہتے تھے۔ کھانا کھانے یا سونے گھر آجاتے تھے۔

مہرین درحقیقت اس انیکسی کے ایک بیڈروم میں قید تھی۔ قید اس لیے کہ ماں اس کی طرف سے متفکر تھی اور یہ چاہتی تھی کہ ابھی کچھ عرصہ وہ گھر سے دور ہی رہے تو اچھا ہے۔ مہرین نے اس قید کو خوشی خوشی قبول کیا تھا کیونکہ گھر بھی تو اسے قید خانہ ہی لگتا تھا۔ مگر یہ جگہ دلچسپ ہونے کی وجہ سے بہتر تھی۔ یہاں اماں جان کی ہر وقت کی ''یہ کرو وہ مت کرو'' کی تکرار نہیں تھی اور ڈاکٹر انکل کا رویہ بھی اتنا ہی دوستانہ تھا جتنا آنٹی کا... وہ بھی جب تک چاہتی اسپتال میں پھرتی رہتی اور مریضوں کے ساتھ باتیں کرتی۔ ماں ہرگز ایسا نہ کرنے دیتی۔ ''ایک تو وہ بیمار، پھر اجنبی، تم کیوں بے تکلف ہوتی ہو۔ اب تم اتنی چھوٹی بچی نہیں رہیں۔''

یہ خوب منطق تھی۔ گھر میں اسے بچی ہی سمجھا جاتا تھا۔ سب بڑے اسے بڑا ماننے کو تیار ہی نہ تھے۔ اب وہ انہیں کیسے بتاتی کہ بڑی تو وہ کب کی ہو چکی۔ کلاس سے اچھی جگہ بڑا ہونے کے لیے کوئی نہیں ہوتی۔ صرف اس سے بڑی ہی نہیں کچھ چھوٹی بھی ایسی تھیں جو اس بلوغت کی عمر کے سنسنی خیز تجربات سناتی تھیں۔ کچھ سچے کچھ جھوٹے۔ اور ایک سے بات دوسری تک پہنچتی تھی۔ ''مکمل رازداری'' کی قسم کھانے کے بعد... ایک نے بتایا کہ اس کی ماں آج کل گڑبڑ کر رہی ہے۔ ڈیڈ ایک ائرلائن میں فلائٹ انجینئر تھے۔ اوورسیز فلائٹ پر امریکا جاتے تھے تو تین چار دن بعد لوٹتے تھے۔ اس دوران میں ڈیڈ کے ایک دوست آجاتے تھے اور وہ تو انتظار کر کے سو جاتی تھی مگر وہ مہمان دوست موجود رہتے تھے۔ دوسری نے والد صاحب کے بارے میں انکشاف کیا کہ ہرنئی سیکریٹری کے معاملے پر ان کی اور اماں سے جنگ ہوتی تھی۔ دو کی ماؤں کو طلاق ہو چکی تھی مگر انہوں نے باپ کی شکل سالوں سے نہیں دیکھی تھی۔ وہ دوسری شادی کر کے اسے بھی بھول گئے تھے۔

صرف مہرین تھی جو دو حصوں میں بٹی ہوئی تھی۔ وہ ماں کے ساتھ بھی تھی اور باپ کے ساتھ بھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میرا کون ہے۔ غلطی کس کی تھی کہ نوبت طلاق تک پہنچی۔ اس کے ساتھ دونوں اچھے تھے۔ دونوں پڑھے لکھے اور مہذب تھے۔ ماں کی قسمت اس کی صورت سے اچھی تھی کہ محتاجی نہیں ہوئی۔ ورنہ مرد کھڑے کھڑے طلاق کہتے ہیں اور حق مہر ہاتھ میں پکڑا کے کہتے ہیں کہ چلو نکلو گھر سے... پتا نہیں یہ باپ کی فراخ دلی تھی یا ماں کی ہوشیاری کہ اسے ابراہیم شاہانی سے خوش حال زندگی گزارنے کے لیے بہت کچھ مل گیا تھا۔ اس کے خیال میں وہ طلاق کے بعد بھی ایک گھر میں رہتے تو اسے بڑی سہولت ہوتی۔ ساتھ نہیں سہی وہ اوپر نیچے کی منزل پر رہتے۔ ساتھ ساتھ والے گھروں میں رہتے۔

جب ڈیڈ نے دوسری شادی کر لی تو ماں کا غصے اور صدمے سے بُرا حال تھا۔ ان کا خیال تھا کہ ابراہیم شاہانی بے وقوف اور بد بخت نہ ہوتا تو ان کے جیسی بیوی کو چھوڑ کے مریم جیسی عورت سے شادی نہ کرتا۔ مہرین کو مریم میں بھی کوئی ایسی خرابی دکھائی نہ دی۔ وہ خوب صورت اور خوش اخلاق تھی اور ہنستی رہتی تھی۔ مہرین کے ساتھ اس کا رویہ دوستانہ اور مہربان تھا لیکن وہ زیادہ دن زندہ نہ رہی۔ اس کا قتل ہو گیا۔

اور یہ بات صرف مہرین جانتی تھی کہ اس کا قتل کیوں ہوا اور اس کے قاتل کون تھے۔ یہ قاتل وہی دونوں تھے ایک لمبا اور دوسرا چھوٹا۔ جن کا ذکر اس نے ایمن سے بھی کر دیا تھا۔ بہت بے وقوفی کی تھی اس نے۔ تھی تو وہ ایکٹریس چاچو کے ساتھ آئی تھی تو گفٹ لائی تھی۔ چاکلیٹ اور ایک پیکٹ ببل گم... اتنی سویٹ لڑکی تھی وہ کہ وہ بھی قتل کر دی گئی تو بہت افسوس کی بات ہوگی اور ایسا ہوا تو صرف مہرین کی غلطی کی وجہ سے... جس کو اس نے حفاظت سے گھر پہنچایا تھا۔ دوسری بات وہ چاچو کے ساتھ اسپتال آپہنچی تھی۔ اس نے مہرین کو فراموش نہیں کیا تھا۔ آخر چاچو اسے کیسے جانتے ہیں۔ اگر اس نے چاچو کو ان دونوں کے بارے میں بتا دیا ہوگا تو مریم کی طرح وہ بھی ماری جائے گی۔ منع کرنے سے وہ کہاں مانے گی۔ کیوں نہ وہ اسے فون کر کے کہہ دے کہ لمبا چھوٹا کوئی نہیں۔ یہ اس کے ذہن کی اختراع تھی۔ اسے پڑیاں ایک کلاس فیلو دیتی تھی۔ وہ تو غائب ہو گئی۔ اب پتا نہیں کون اس کے بیگ میں ڈالتا ہے۔ یہ حقیقت بھی تھی۔ ایک بار وہ چاچو کے اسٹوڈیو سے گھر آئی تو بیگ میں پڑیاں تھیں۔ وہ اسکول سے اسٹوڈیو گئی تھی تو بیگ میں ایسی کوئی چیز نہیں تھی۔ کیا وہ ان پر شک کرے یا گھر کے نوکروں پر... ایک بار یہ حرکت کسی نے ڈیڈی کے آفس میں کی تھی۔ تو کیا وہ ڈیڈی پر شک کرے۔ یا شاکر انکل پر جن کے کمرے میں اور کوئی نہیں آیا تھا۔

وہ دبے پاؤں لاؤنج تک گئی۔ ایمن کا نمبر ملا کے اس نے کہا۔ ''مس ایمن! میں مہرین بول رہی ہوں۔ آج چاچو کے ساتھ آپ مجھے دیکھنے اسپتال آئی تھیں؟''

''ہاں ہاں، مہرین... خیریت ہے نا، اتنی رات گئے کیوں فون کیا؟'' دوسری طرف سے آواز آئی۔

''وہ... دراصل ایک اعتراف کرنا تھا۔'' وہ بولی۔ ''میں نے جھوٹ بولا تھا آپ سے...''

''کیا جھوٹ بولا تھا؟''

''یہ کہ مجھے ایک لمبا اور دوسرا چھوٹے قد کا دو آدمی ملے تھے اور انہوں نے کوئی دھمکی دی تھی مجھے... میں نے کہا تھا کہ آپ کسی سے بات نہ کریں ورنہ وہ آپ کو بھی مار دیں گے۔''

کچھ دیر کی خاموشی کے بعد ایمن نے کہا۔ ''کیوں بولا تھا یہ جھوٹ تم نے؟''

''بس... ماما کہتی ہیں... ہماری بدنامی ہوتی ہے۔ کسی کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔ تم ٹھیک ہو جاؤ گی۔''

''بالکل ہو جاؤ گی۔ مگر اب یہ پڑیاں کہاں سے آتی ہیں آخر... اگر وہ لڑکی غائب ہو چکی ہے جو پہلے دیتی تھی؟''

''پتا نہیں مس ایمن، کون میرے بستے میں ڈال دیتا تھا۔ ایک بار مجھے گھر میں ملیں۔ اپنے کمرے میں پڑی ہوئی۔ ایک بار نام تھا ڈیڈی کا... چاکلیٹ کا پیکٹ دے گیا تھا کوئی... اندر پڑیاں تھیں۔ میں نے کسی سے ذکر نہیں کیا۔''

''اور پڑیاں رکھ لیں تاکہ ضرورت پڑے تو استعمال کر سکو پھر عادت پڑ گئی تمہیں۔''

''جی... جی... لیکن اب میں یہاں رہوں گی۔ ڈاکٹر انکل کے گھر میں تو عادت چھوٹ جائے گی۔ پرامس میں پھر نشہ استعمال نہیں کروں گی۔ آپ چاچو کی فرینڈ کب سے ہیں؟''

''میں ان کے لیے کام کرتی ہوں مہرین۔'' ایمن نے کہا اور فون بند کر دیا۔

مہرین کو اطمینان نہیں ہوا۔ شاید اس کا جھوٹ بھی رائگاں گیا تھا۔ یہ ایمن ضرور اس کے فون کا بھی چاچو کو بتا دے گی اور چاچو سے بات پہنچ گئی ڈیڈی تک تو پھر معاملہ اوپر چلا جائے گا۔ انجام وہی ہوگا جو اس کی دوسری ماں مریم کا ہوا تھا۔ کتنی اچھی تھی وہ... کہتی تھی کہ میں دوسری ماں نہیں، فرینڈ ہوں تمہاری... اور بلاشبہ وہ تھی۔ جیسے وہ خبیث لمبا چھوٹا اس کے دشمن تھے۔ پہلی بار وہ ایک فن فیئر میں سامنے آئے تھے۔ وہ تھک کر بچوں کے ہجوم سے الگ ایک بینچ پر بیٹھی جوس پی رہی تھی کہ وہ دائیں بائیں آ بیٹھے۔ لمبے نے کہا۔ ''ہیلو مہرین... ابھی ہم دیکھ رہے تھے

اصل مسئلہ

ایک خاتون نے ماہرِ نفسیات سے کہا۔ ''میرے شوہر کو سوتے میں بولنے کی عادت ہے۔''

ماہرِ نفسیات نے خاتون کا مسئلہ سمجھ کر سوال کیا۔ ''تو آپ ان کی یہ عادت ختم کرنا چاہتی ہیں؟''

''نہیں... نہیں۔'' خاتون نے جلدی سے ماہرِ نفسیات کی بات کا جواب دیا۔ ''یہ اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ اصل مسئلہ تو میرا ہے۔''

''وہ کیا؟'' ماہرِ نفسیات نے اپنے غلط اندازے پر قدرے جھینپ کر سوال کیا۔

''دراصل مجھے نیند بہت آتی ہے اس لیے میں ان کی وہ ساری باتیں دھیان سے نہیں سن پاتی۔ برائے مہربانی آپ مجھے نیند کم کرنے کا کوئی طریقہ تجویز کر دیں۔'' خاتون نے اطمینان سے جواب دیا۔

سڑک نہیں پارک

ڈاکٹر صاحب نے مریض سے کہا۔ ''جب کار ایک عورت چلا رہی تھی تو تمہیں سڑک سے دور ہٹ جانا چاہیے تھا۔''

مریض نے ڈاکٹر کی بات کا فوراً جواب دیتے ہوئے پوچھا۔

''کون سی سڑک؟ میں تو پارک میں لیٹا ہوا تھا۔''

انتخاب، کاشف عبید کاوش، بنگرام

سسرال

میلوں سفر طے ہو گیا لیکن دونوں بالکل خاموش رہے۔ تناؤ کا سبب یہ تھا کہ مکمل خاموشی سے پہلے دونوں میں سسرالی معاملات پر بحث ہو گئی۔ کوئی پسپائی پر آمادہ نہیں تھا۔ آخری نتیجہ خاموشی کی صورت میں نکلا۔

کافی لمبا سفر طے کرنے کے بعد ان کی گاڑی مویشیوں کے ایک بڑے باڑے کے قریب سے گزری جہاں بھانت بھانت کے جانور موجود تھے تو بیوی نے استہزائیہ لہجے میں اپنے شوہر سے کہا۔ ''یہ تمہارے رشتے دار لگتے ہیں۔''

''ہاں۔'' شوہر نے اطمینان سے کہا۔ ''سسرالی عزیز ہیں۔''

امریکا سے قاضی جاوید کا جواب

کہ تم اس اوپر نیچے جانے والے جھولے میں بیٹھی تھیں، لگتا ہوگا تم اڑ رہی ہو۔''
وہ اٹھنے لگی تو چھوٹے نے اسے دبوچ لیا۔ ''ہم تمہیں گھر بیٹھے اُڑنا سکھا سکتے ہیں بغیر جھولے کے۔''
لمبے نے اس کے بستے میں تین پڑیاں ڈال دیں۔ پھر ایک پڑیا کھول کے سفید پاؤڈر کی چٹکی اسے دی۔ ''اس کو سونگھو... زور سے اندر کی طرف سانس لو، ایسے۔'' اس نے خود استعمال کر کے بتایا۔ ''کم آن۔''
ڈر کی وجہ سے مہرین نے اس کی بات مان لی۔ اس کی طبیعت بگڑ گئی۔ وہ شدید متلی اور چکر محسوس کرنے لگی۔
''پہلی بار ایسا ہوتا ہے۔'' لمبے نے اس کی پیٹھ ٹھونکی۔
''اصل مزہ آئے گا دوسری بار... رات کو آزمانا گھر جا کے۔''
''مگر کسی کو بتانا نہیں کوئی بات۔'' چھوٹا بولا۔ ''ورنہ پتا ہے ہم کیا کریں گے؟''
لمبے نے کہا۔ ''ہم تمہاری ماما کو تمہارے سامنے ایسے ذبح کریں گے جیسے بقرعید پر بکرا ذبح کرتے ہیں۔ تم نے دیکھا ہوگا۔''
مہرین نے بے اختیار سر ہلا دیا۔ وہ دہشت سے بے ہوش ہونے والی تھی۔
''پھر ہم ان کے سری پائے الگ کریں گے۔ تمہارے سامنے۔'' چھوٹے نے اپنی بات جاری رکھی۔
''پیٹ کو چھری سے کاٹ کے ان کا دل گردے کلیجی سب نکالیں گے۔''
''پھر دوسری قربانی بیل کی کریں گے تمہارے پاپا کی۔'' لمبے نے کہا۔
جب وہ ہوش میں آئی تو وہ جا چکے تھے۔ وہ بڑی مشکل سے گھر پہنچی۔ اس کی بھوک اڑ چکی تھی۔ کانوں میں ابھی تک ان کے الفاظ گونج رہے تھے۔ بقرعید کو ابھی زیادہ دن نہیں ہوئے تھے۔ بکرا ماں نے قربان کیا تھا۔ اور اس نے قسائی کو بکرے پر چھری چلاتے دیکھا تھا۔ بکرا کیسے تڑپا تھا۔ کیسے بلبلایا تھا اور پھر ساکت ہوگیا تھا۔ قسائی نے اس کی بوٹیاں بنا دی تھیں۔ اور دل، گردے، کلیجی الگ رکھ دیے تھے۔ کیا اس کی ماں کے ساتھ ایسا ہوگا؟ اس نے تصور میں ماں کے سر کو کھلی آنکھوں کے ساتھ فرش پر پڑا دیکھا۔ وہ چیخ مار کے اٹھ بیٹھی۔
''کیا ہوا؟ مہرین... کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہے تم نے؟'' اس کی ماں نے اندر آ کے کہا۔ ''بے وقت سو گئی تھیں وہ بھی کچھ کھائے پیے بغیر۔''
''نہیں، میں ٹھیک ہوں ماما...'' اس نے کہا اور پانی پی کے پھر لیٹ گئی۔ ماں کے جانے کے بعد اسے پڑیا کا خیال آیا۔ اصل مزہ تو دوسری بار آئے گا۔ اسے لمبے کی بات یاد آئی اور یہی وہ بدقسمت لمحہ تھا جب اس نے دوسری پڑیا کو نکال کے دیکھا۔ کیا واقعی اس کے بعد میں بادلوں میں اڑنے لگوں گی۔ اس نے سوچا۔ کسی غیر مرئی قوت نے اسے مجبور کردیا اور اس نے واقعی خود کو بہت ہلکا پھلکا اور اڑتا ہوا محسوس کیا تھا۔ اس کے بعد سپلائی کا سلسلہ پُراسرار انداز میں جاری رہا۔ اسے کبھی پتا نہیں چلتا تھا کہ اس کے بیگ میں پڑیاں کون رکھتا تھا۔ وہ دو تو اسے پھر نظر نہیں آئے تھے۔
پھر ایک دن اسے ڈیڈی کے پاس لنچ کے لیے جانا تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ وہ ہمیشہ کی طرح اسکول سے چھٹی کے بعد لے لیں گے۔ پھر معلوم ہوا کہ ڈیڈی نہیں اسے لینے کے لیے خود مریم اسکول آرہی ہے۔ اس کا باپ مصروفیت کے باعث نہیں آسکا تھا۔ وہ کلاس سے نکلی تو گیٹ تک اس نے لان کا شارٹ کٹ لیا، سامنے والے گیٹ پر رش ہوتا تھا چنانچہ ڈیڈی پچھلی طرف آجاتے تھے۔ وہاں اچانک وہی دونوں اس کے سامنے آگئے۔
''بڑی اچھی لڑکی ہو تم... ابھی تک کسی سے بات نہیں کی۔'' چھوٹا بولا۔
''آج اپنے ڈیڈی سے ملنے جا رہی ہو نا، اس سے بھی کوئی بات مت کرنا ورنہ وہ پولیس سے مدد لے گا اور پولیس تو ہمارے ساتھ ہے۔ اسے پکڑ کے ہمارے حوالے کر دے گی، یہ لو۔'' لمبے نے اس کی پاکٹ میں دو پڑیاں ٹھونس دیں۔
وہ بھاگی اور اس نے پڑیاں پھینک دیں جو بیرونی دیوار کے ساتھ لگی جھاڑیوں میں جا گریں۔ وہ دونوں اس سے پہلے ہی نکل گئے تھے اور اچانک اس نے مریم کو تین فٹ چوڑے گیٹ میں کھڑا دیکھا۔
''مہرین، کیا بات ہے؟'' اس نے مہرین کو روک لیا۔ ''کیا ہوا؟''
''کک... کچھ نہیں۔'' وہ ہکلائی۔
''جھوٹ مت بولو، پھر بھاگ کیوں رہی تھیں؟'' اس نے مہرین کے شانے کو جھنجوڑا۔ ''کون تھے یہ دونوں جو تم سے بات کر رہے تھے؟''
''وہ... وہ پوچھ رہے تھے... مین گیٹ کدھر ہے۔ انہیں پرنسپل کے آفس جانا تھا۔''

''تم نے کیا پھینکا تھا ابھی...''

''کچھ نہیں۔ کسی کلاس فیلو نے میری جیب میں... ربر کی چھپکلی ڈال دی تھی۔''

صاف نظر آتا تھا کہ وہ مریم کو مطمئن کرنے میں ناکام رہی تھی۔ اس نے سنا کچھ نہیں مگر دور سے ان دونوں کو دیکھ لیا تھا۔ اس نے مہرین کو نروس ہوکے بھاگتا دیکھا تھا۔ اس روز مریم نے مزید کوئی بات نہیں کی تھی اور ظاہر یہی کرتی رہی تھی کہ وہ کوئی خاص بات نہیں تھی۔ لنچ کے دوران بھی وہ ہنس ہنس کے باتیں کرتی رہی اور اس کے ڈیڈی کے سامنے بھی کچھ نہیں بولی تھی مگر اسے گھر چھوڑنے کے بعد واپس جانے کے بعد اس نے اپنے شوہر کو ضرور سب بتا دیا ہوگا۔ اسی رات وہ قتل کردی گئی تھی۔ الزام ڈاکوؤں پر آیا تھا جو اس کا زیور لے گئے تھے لیکن صرف مہرین کو یقین تھا کہ اس کے قاتل کون تھے اور مریم کو کس جرم کی سزا ملی تھی۔

خیر، اب یہ لڑکی ایمن بچ جائے گی۔ مہرین کے جھوٹ کا ذکر وہ کسی سے کیوں کرے گی۔ اللہ کرے کہ وہ اپنی زبان بند رکھے۔ وہ چاچو کی فرینڈ ہے۔ شاید معاملہ اس سے زیادہ ہے۔ کہتی تو ہے کہ ان کے لیے کام کرتی ہے۔

☆☆☆

سلسلۂ روز وشب نقش گر حادثات۔ گزشتہ رات سے یہی ایک بات اس کے دماغ میں گردش کررہی تھی۔ جب اس نے بالآخر فیصلہ کیا تھا کہ اسے ایم اے کرہی لینا چاہیے تو اردو کا انتخاب اس نے ایک آسان مضمون سمجھ کے کیا تھا۔ ایک قدرتی لگاؤ کے باعث کتابیں وہ ہمیشہ پڑھتی آئی تھی جن میں زیادہ تر ناول، افسانے ہوتے تھے۔ شاعری سے اسے کوئی خاص شغف نہ تھا مگر امتحان پاس کرنے کے لیے غالب اور اقبال سے مفر کہاں ممکن تھا۔

وجہ کچھ نہ تھی۔ ایسے ہی کبھی کسی گانے کے بول بھی دماغ سے چپک کے رہ جاتے تھے۔ اب وہ ابراہیم شاہانی کے کمرے میں بیٹھی تھی۔ تب بھی اسے وہی شعر پھر یاد آیا۔ شاید یہ اس کی اپنی زندگی کا عنوان تھا۔ ایک حادثے نے اسے مسز ارشد سے پھر ایمن بنا دیا تھا۔ دوسرا حادثہ مہرین کا ملنا تھا جس نے اسے فرش سے اٹھا کے شاہانی گروپ کے چیئرمین کے مقابل لا بٹھایا تھا جو ایک ایگریمنٹ پر غور کررہا تھا۔ کل کا کیا بھروسا... پھر کوئی حادثہ اسے عرش سے فرش کی پستی میں دھکیل دے۔

''ایگریمنٹ میں نے دونوں دیکھ لیے۔'' اس نے عینک اتار کے ٹیبل پر ڈالی اور انٹرکام کا بٹن دبایا۔ ''آپ نے دیکھے؟''

وہ چونکی۔ ''جی لیکن میں نے سوچا کہ فیصلہ آپ پر چھوڑ دوں۔ میری تو عقل چکرا گئی ہے۔''

اس کی سیکریٹری دو کافی کے مگ ٹیبل پر رکھ کے سیدھی کھڑی ہوگئی۔ ''یس سر؟ آپ نے بلایا تھا؟''

''یہ دو ڈرافٹ ہیں۔ میں نے ایک میں سے کچھ لیا ہے اور دوسرے میں سے بھی۔ ان کو ملا کے ایگریمنٹ بنا کے لاؤ، ابھی...'' ابراہیم شاہانی بولا۔ سیکریٹری ایک نظر ایمن پر ڈال کے اور یس سر کہہ کے نکل گئی۔

''سر، مہرین کیسی ہے؟'' وہ شاہانی کی اپنی چہرے پر نظر جمی دیکھ کے نروس ہوگئی۔

شاہانی چونکا۔ ''وہ، ہاں بالکل ٹھیک ہے ابھی تک۔ مجھے دستور نے بتایا کہ تم اسے دیکھنے گئی تھیں اور وجہ بھی بتائی کہ اس کے لیے تمہارے یہ جذبات کیوں ہیں۔ کل اس نے آپ کی تعریف بھی کی میرے سامنے۔''

''کیا اسی لیے آپ مجھے اتنا نواز رہے ہیں؟''

''او نو، یہ سب تمہاری میرٹ پر ہے۔ جس کو ابھی تک تسلیم نہیں کیا گیا تو اس کی وجہ بھی جو میں سمجھتا ہوں۔ یہاں تم بالکل محفوظ سمجھو خود کو۔ ہم ایک فیملی میں ہیں اب۔ میں، تم، دستور، شاکر اور مہرین... صائمہ بھی... کافی پیو۔''

سیکریٹری ڈرافٹ ایگریمنٹ بنا کے لائی تو ناخوشی کے آثار اس کے چہرے پر عیاں تھے۔ ایمن کو کیوں نوازا جارہا ہے۔ اس کے ذہن میں اسباب مختلف تھے۔ اسے یقین ہوگا کہ چیئرمین اور اس کے دونوں شریک بیک وقت اس لڑکی ایمن پر فریفتہ ہوگئے تھے اور اگر وہ چیئرمین کی تیسری بیوی نہ بنی تو پھر باقی دو ٹاس کریں گے یا قرعہ اندازی... پرانے وقت ہوتے تو پستول سے ڈوئل لڑتے اور جو زندہ رہتا وہ ایمن کو جیت لیتا۔ اس کا ایسا سوچنا جائز تھا۔ ایمن نے جو ایگریمنٹ سائن کیا اس میں ماہانہ کئی لاکھ کے ساتھ رہائش کے لیے گھر، کار کے ساتھ شوفر اور بہت سی ایسی مراعات شامل تھیں جو اس سے پہلے مالکوں کے علاوہ مختلف سی ای او لے رہے تھے۔ ایک غیر معروف ماڈل اور ناکام ایکٹریس کے لیے ایسی فیاضی بے مقصد تو نہیں ہوسکتی۔ غالباً سیکریٹری حسن وشباب کے پیمانے پر خود کو ایمن سے برتر ہی سمجھتی ہوگی۔

اس کے معاوضے میں سب کچھ شامل تھا۔ دستور کے لیے بھی ماڈلنگ اور ان اشتہاری فلموں کے لیے بھی جواب شاہانی گروپ کی ایڈورٹائزنگ ایجنسی بنائے گی۔ اپنے لیے

یا کسی بھی کلائنٹ کے لیے... آج کل دستور دن رات اپنے اسٹوڈیو کو ٹاپ فلور پر منتقل کرنے کے ساتھ نیچے والے فلور پر ایڈ ایجنسی کے اسٹوڈیو وغیرہ بنوا رہا تھا اور اس کے لیے دوسری کمپنیوں سے زیادہ معاوضے پر تجربہ کار لوگ کھینچ رہا تھا۔ شاہانی گروپ کا نام سب سے بڑی گڈول تھا جو ہر شعبے کے لوگوں کو کھینچتی تھی۔ یہاں سب کو اپنا مستقبل روشن ہی نہیں محفوظ بھی نظر آتا تھا۔

ایمن کے روز و شب ایک دم بدل گئے تھے۔ ابراہیم شاہانی سے اس کی ملاقات بہت کم ہوتی تھی۔ اس نے ایڈ ایجنسی کا سارا کام دستور کی مرضی سے دوسرے پارٹنر شاکر علی کے سپرد کر دیا تھا جو انتظامی امور میں جینئس تھا اور یہ اسی کی قوتِ فیصلہ اور عمل تھا کہ ایک فلور دیکھتے دیکھتے پروڈکشن ہاؤس بن گیا۔ ہر قسم کا اسٹاف پہلے ہی حاصل ہو گیا تھا۔ اگرچہ انتظامی معاملات میں ایمن کو ذمے داری کوئی نہیں سونپی گئی تھی مگر وہ صبح سے شام تک مصروف رہتی تھی۔ کبھی دستور کے ساتھ اس کے اسٹوڈیو میں تو کبھی شاکر علی کے ساتھ پروڈکشن ہاؤس میں... اور وہ ان دونوں سے زیادہ خوش اور پُرجوش تھی۔ یہ اس کا برسوں پرانا خواب تھا جو اب شرمندۂ تعبیر ہو رہا تھا۔

کنٹریکٹ پر ہونے کے باوجود ایمن نے یہاں ایک فیملی ممبر کی حیثیت حاصل کر لی تھی۔ وہاں کام کرنے والی سیکریٹری اور ریسیپشن گرلز کی اکثریت تھی جو باس پر جادو چلا کے مالک بن جانے کے خواب دیکھتی تھی، اس صورتِ حال سے دل شکستہ اور مایوس تھی اور اب اس انتظار میں تھی کہ ایمن کو ایک اپنانے تو دو کے لیے کوشش جاری رکھی جائے۔ ابراہیم شاہانی بظاہر اس کھیل میں شامل نہ تھا۔ یہ دستور تھا یا پھر شاکر علی جن کے ساتھ ایمن کا ہر وقت کا ساتھ تھا۔ وہ دستور کے ساتھ بھی ڈنر کی دعوت قبول کر لیتی تھی اور شاکر علی کو بھی انکار نہیں کرتی تھی۔ کتنی بار وہ تینوں بھی ساتھ گئے اور ایک بار شاہانی خود ان کے ساتھ ہو لیا۔

ایمن کو یہ اندازہ کرنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ وہ تینوں اسے پسند کرتے ہیں۔ دستور یا شاکر علی کے پسند کرنے کی وجہ کچھ اور تھی۔ شاہانی اسے مریم کی جگہ دیکھتا تھا جو اس کی بیٹی مہرین کے لیے کبھی سوتیلی ماں نہیں بنی تھی۔ مہرین اس کے ساتھ زیادہ خوش رہتی تھی کیونکہ سخت گیر ماں کے مقابلے میں مریم اس کی بے تکلف دوست تھی۔ اب مریم کی صفات پر ایمن پوری اترتی تھی۔ شاید مہرین کے لیے اپنی فکرمندی کے باعث وہ ایک درجہ اوپر تھی۔ اس فکرمندی کے پیچھے بھی ماں کا وہ جذبہ تھا جو اسے مہرین میں حمیرا کی صورت دکھاتا تھا۔ وہ حمیرا جس کی راکھ بھی سمندروں کی وسعت میں موجوں کے تلاطم سے غائب ہو چکی تھی ایک بار پھر مجسم ہو کے مہرین کی صورت میں سامنے آ گئی تھی۔

دستور حددرجہ جذباتی اور لاابالی تھا۔ اس کی سیمابی فطرت اسے چین سے بیٹھنے نہ دیتی تھی اور وہ بہت جلد یکسانیت سے اکتا جاتا تھا۔ پرانی ماڈلز میں سے چند ایک بہت نامور ہو گئی تھیں مگر دستور کی شکرگزار ہونے کی وجہ سے مسلسل رابطے میں رہتی تھیں کہ اس کی جو تصاویر نامکمل رہ گئی تھیں، وہ مکمل کرا دیں۔ یہ ایمن دیکھ چکی تھی کہ اسٹوڈیو میں بے شمار پینٹنگز ادھوری پڑی ہیں۔ تکمیل سے پہلے ہی تخلیق کا بخار اتر گیا۔ اب پھر کب وہی الہامی لمحہ آئے گا، خدا ہی جانے... وہ خود نہیں جانتا تھا۔ ایمن کوئی نوعمر ناتجربہ کار لڑکی نہیں تھی ورنہ اس کے خوابوں کے شہزادے کا مکمل روپ دستور تھا۔

ایک موقع پر ایمن کے لباس اور میک اَپ کے خصوصی اہتمام نے اسے حددرجہ جذباتی کر دیا تھا۔ وہ ایک روف ٹاپ ریسٹورنٹ میں کینڈل لائٹ ڈنر کر رہے تھے۔ اوپر چودھویں کے چاند کی روشنی نے اپنا جادو پھیلا رکھا تھا اور نیچے آرکسٹرا کی دھن نے کہ دستور نے اچانک اس کا ہاتھ تھام کے کہا۔ ''ایمن! مجھ سے شادی کر دگی۔''

اس نے اپنا ہاتھ نہیں چھڑایا اور کہا۔ ''دیکھو دستور، میں تمہاری عزت کرتی ہوں اور خود بھی عزت چاہتی ہوں۔ میں نے ابراہیم شاہانی کا انعام قبول نہیں کیا تھا۔ تم جانتے ہو، اور انہیں بھی بتا دیا تھا کہ مجھے دوسری ایڈ ایجنسیوں یا فلموں میں رول اس لیے نہیں ملے کہ میں یہ شہرت اور دولت اپنی عزت دے کر کمانا نہیں چاہتی تھی۔''

اس کا چہرہ خفت سے زرد پڑ گیا۔ ''تم میری نیک نیتی کے جذبے کی توہین کر رہی ہو۔''

''نہیں، ابھی تک میں ارشد اور حمیرا کی یاد کو دل سے بےدخل نہیں کر سکی ہوں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ کسی وقت میں پھر اپنا گھر آباد کرنے کا سوچوں، تم بہت اچھے آدمی ہو، مجھے پسند بھی ہو۔ وہ لڑکی خوش قسمت ہو گی جس کو تم جیسا شریکِ زندگی ملے۔''

''او کے، او کے... میں اس وقت کا انتظار کروں گا۔'' اس نے انگوٹھی جیب میں رکھ لی۔

کھانے کے دوران ایمن کو ایک عجیب سی پریشانی دو

ویٹرز کو دیکھ کے لاحق ہوگئی۔ ان میں سے ایک نے انہیں سرو کیا تھا۔ وہ دراز قد تھا۔ یونیفارم میں ہوں تو ویٹرز ایک جیسے لگتے ہیں لیکن جب وہ سوپ کی ڈش رکھ رہا تھا تو ایمن کی نظر اس کی صورت سے ہٹ کر دروازے کی طرف چلی گئی، وہاں ان ہوٹلوں کی روایات کے مطابق ایک چھوٹے قد کا شخص آنے جانے والوں کے لیے سلام کر کے گیٹ کھول رہا تھا۔ یہ خیال اسے اچانک آیا کہ یہ دونوں وہی ہیں جو دستور کے پرانے اسٹوڈیو میں گھس آئے تھے۔ دستور نے ان کو رکشا ڈرائیور کہا تھا۔

خرابی اس وقت ہوئی جب ایمن نے پوچھا۔ ''اسے رکشامل گیا؟ وہ جو پستہ قد بھائی تھا؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں، بڑا بھی قسطیں وقت پر نہیں دے پایا۔ اس کا رکشا بھی ضبط ہو گیا تھا مگر تمہیں یہ خیال کیوں آیا؟''

''ایسے ہی، اب وہ کیا کر رہے ہیں؟''

''میں نے انہیں اس ہوٹل میں رکھوا دیا تھا۔ یہاں خوش ہیں دونوں...'' وہ سرسری انداز میں بولا۔

ایمن کے ہاتھ سے چمچہ گر گیا مگر اس نے اپنی پریشانی کو ظاہر نہیں ہونے دیا۔ اس کی چھٹی حس نے غلط گھنٹی نہیں بجائی تھی۔ وہ دونوں دستور کے ساتھ تھے۔ اس کے پیچھے یہاں تک آگئے تھے۔ مہرین ان دو کرداروں سے بہت خوف زدہ تھی جن کے بارے میں وہ اور کچھ نہیں جانتی تھی کہ ان میں سے ایک لمبا اور دوسرا چھوٹا تھا اور اس کے اندیشے بے بنیاد اور خیالی نہیں رہے جب دستور اسے گھر کے دروازے پر ڈراپ کر کے چلا گیا۔ شاہانی کے اصرار کے باوجود ایمن نے پرانا گھر نہیں چھوڑا تھا۔ اسے کسی پوش علاقے میں جدید طرز کی بڑی کوٹھی مل سکتی تھی لیکن اس نے کہہ دیا کہ یہ تین بیڈ روم اس کی ضرورت سے زیادہ ہی ہیں۔ اسے اپنے بزرگ کرائے داروں کا بھی خیال تھا اب وہ انہیں چھوڑ نہیں سکتی تھی۔ نہ معلوم کوئی اور ان کو رکھے نہ رکھے۔ اسے گرا کے نئی عمارت کھڑی کرے۔ ایمن کے لیے ارشد کے بنائے ہوئے گھر کو ایک نشانی کے طور پر محفوظ رکھنا ضروری تھا۔

وہ دبے پاؤں اوپر گئی اور دروازے بند کر کے لائٹ جلائی تو رات کے ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ وہ بیڈ پر بیٹھی اور بیگ ایک طرف رکھ کے جوتوں سمیت نیم دراز ہو گئی۔ اس کے پیر نیچے ہی لٹکتے رہے۔ یہ ایک خوشگوار شام تھی۔ دستور کی پیشکش بالکل غیر متوقع تھی۔ وہ دستور کی دلچسپی کو ایک عورت کی چھٹی حس کی نظر سے دیکھ رہی تھی۔ اس کی نظروں میں دستور کا اترا ہوا چہرہ آگیا۔ شاید اسے بالکل توقع نہیں تھی کہ ایمن ایسا بھی کر سکتی ہے لیکن ایمن ابھی اپنی آزادی اور شناخت گروی رکھنا نہیں چاہتی تھی۔

وہ ہمت کر کے اٹھی اور جوتے پیروں سے جھٹک کے لباس تبدیل کیا حالانکہ اسے نیند نے مغلوب کر رکھا تھا مگر لباس بہت تنگ تھا۔ واش روم سے نائٹ ڈریس بدل کے اس نے لیٹنے سے پہلے بیگ اٹھا کے سائڈ ٹیبل پر رکھا۔ آج دن کی دوڑ دھوپ زیادہ تھی۔ اب اس کا جسم درد کر رہا تھا۔ اس نے بہتر سمجھا کہ بیگ میں سے نکال کے درد کش دوا کی ایک گولی کھالے تاکہ سکون سے سو سکے۔ اس میں پڑی چیزوں کے درمیان گولیوں کا پتا تلاش کرتے ہوئے اس کے ہاتھ میں ایک کاغذ آگیا۔ کاغذات وغیرہ وہ دوسرے پاکٹ میں رکھتی تھی۔ اس کے ہاتھ نے وہ پرزہ نکال لیا۔

یکلخت اس کی نظر میں چار انچ لمبے اور دو انچ چوڑے سفید کاغذ کے پرزے پر لکھے ہوئے الفاظ آگئے۔ ''تم کو خبردار کر دیا گیا تھا اب مرنے کے لیے تیار رہو۔'' وہ پلک جھپکائے بغیر ساکت و صامت بیٹھی رہی۔ متعدد سوالات نے اس کے خیالات پر یلغار کی۔ یہ کہاں سے آیا؟ کیسے آیا؟ کس نے ڈالا... کب ڈالا... صاف ظاہر تھا کہ ہوٹل میں جب وہ لیڈیز روم میں گئی تھی تو بیگ کو ٹیبل پر چھوڑ گئی تھی۔ دستور وہاں موجود تھا۔ اس کے سامنے کون بیگ کھول سکتا تھا؟ یہ دستور کے ہاتھ کی تحریر نہیں تھی۔ وہ لمبا اور چھوٹا اگر مجرم تھے تو پھر شک کی گنجائش کہاں رہتی تھی کہ وہ دستور کے لیے کام کرتے تھے۔ وہی اس پر نظر رکھے ہوئے تھے، وہی ہیروئن مہرین کو دیتے تھے۔

کمرا اس کی نظر میں گھومنے لگا۔ اوہ دستور... دستور... کیا ہے یہ سب اور کس لیے... کیوں تم ان دونوں سے تعلق رکھتے ہو، کیا مجبوری ہے تمہاری، یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تم ہی مہرین کی جان کے دشمن ہو؟ اس بھائی سے اس کی اکلوتی اولاد چھین لینا چاہتے ہو جو تم پر اتنا اعتماد کرتا ہے۔ سوتیلا ہونے کے باوجود تم سے محبت رکھتا ہے۔ تمہیں سب کچھ سونپ رکھا ہے۔ سر کو جھٹک کے اس نے پانی پیا اور لمبے گہرے سانس لے کر خود کو پُرسکون کیا۔ تصدیق کے بغیر کچھ بھی فرض کرنا غلط ہوگا۔ ممکن ہے خود دستور کو اس کا علم نہ ہو۔ کسی نے دن میں یہ پرزہ بیگ میں ڈالا ہو۔ آج دن میں اس کے پاس یہ بیگ نہیں تھا لیکن کل تھا۔

اس نے جھپٹ کے فون اٹھایا۔ گھنٹی کئی بار بجی پھر اس

کی نیند میں ڈوبی آواز آئی۔ ''ایمن؟''

''دستور! ایک بات پوچھنی تھی... ہاں اس وقت... یہ بتاؤ یاد کر کے اور سوچ کے... جب ہوٹل میں ڈنر کے بعد میں لیڈیز روم گئی تھی، اس وقت تم بھی کہیں گئے تھے؟''

''یہ کیسا سوال ہے؟''

''جواب دو... تم گئے تھے یا نہیں؟''

''ہاں، کاؤنٹر تک گیا تھا۔ دراصل جیب میں کچھ نہیں تھا۔ پرس میں بھول آیا تھا۔ نقد اور کارڈ سب اس میں تھے۔ منیجر نے کہا کہ سر یہ کوئی ایسی بات نہیں۔ بس اس کے بعد میں آ گیا تھا۔''

''کتنی دیر بعد؟''

''شاید... پانچ منٹ... بلکہ اس سے بھی کم... جہاں ہم بیٹھے تھے وہاں سے کاؤنٹر کتنی دور تھا، تم خود اندازہ کر لو۔''

''ٹھیک ہے دستور... سوری کہ تمہیں ڈسٹرب کیا۔''

''ڈسٹرب تو میں ہو چکا، اب رات بھر ڈسٹرب ہی رہوں گا۔ اگر تم نے سوال کی وجہ نہیں بتائی۔''

''یہ کل بتاؤں گی۔'' اس نے کہا اور فون بند کر کے پاور آف کر دیا۔ پھر اس نے کال بیل کا سوئچ بند کیا اور بستر پر لیٹ گئی۔ اسے یقین تھا کہ دستور آئے گا۔ گھنٹی بجاتا رہے گا اور ممکن ہے نیچے والوں کو جگا کر پوچھے گا کہ ایمن کہاں گئی ہے۔ گاڑی تو کھڑی ہے۔ خیر اس کے لیے کیا پریشان ہونا۔ زیادہ اہم یہ سوال ہے کہ کیا دستور واقعی ان دونوں کے بارے میں حقیقت سے بے خبر ہے؟ یا وہ جانتا ہے سب؟ اور اس سے بڑا دوسرا سوال یہ ہے کہ وہ مہرین کو ہیروئن کا عادی کیوں بنانا چاہتا ہے؟

جواب اس پر غیب سے نازل ہوا۔ ظاہر ہے وہ مہرین کی جان لینا چاہتا ہے۔ کبھی نہ کبھی وہ ہیروئن کی اتنی مقدار استعمال کر لے گی جو مہلک ثابت ہو گی۔ مہرین ہی اس وقت ابراہیم شاہانی کی واحد وارث ہے۔ بیوی سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ وہ مرتی ہے تو یہ سب کچھ کسے ملے گا؟ بالآخر دستور کو... آج یا کل کبھی نہ کبھی ابراہیم شاہانی بھی نہیں رہے گا۔ اسے بعد میں مارا جا سکتا ہے۔ اسے بھی پُراسرار طریقے پر... اوہ مائی گاڈ... دستور ایسا نہیں ہو سکتا۔ اسے تو دولت سے دلچسپی ہی نہیں۔

اس کے خیالوں میں ایک قہقہہ گونجا۔ بے وقوف لڑکی... دنیا میں کون ہے جو دولت مندی کی خواہش سے دور ہو؟ ایسے ولی اور قلندر اب کہاں... اور وہ بھی شاہانی گروپ میں؟ دستور کا ظاہر اس کے باطن کا پردہ بھی تو ہو سکتا ہے۔

اس کا ایسا سوچنا غلط ہے کہ گھر کا کوئی فرد اسے ہیروئن نہیں دے سکتا۔ ہیروئن اسے کوئی اپنا ہی دے رہا ہے۔

☆☆☆

کال بیل سُن کے اس نے اوپر سے دیکھا اور مہرین کے ساتھ اس کی ماں کو دیکھ کے حیران رہ گئی۔ اس نے اوپر ہی سے بٹن دبا کے لاک کھولا اور زینے میں ان کا استقبال کیا۔ ''آیئے آیئے... مسز... صائمہ۔''

صائمہ مسکرائی۔ ''سوری ایمن... میں بغیر بتائے وارد ہو گئی۔''

ایمن نے انہیں لاؤنج میں صوفے پر بٹھایا۔ ''پھر کیا ہوا... میں کون سی وی آئی پی ہوں کہ ملاقاتی اپائنٹمنٹ لیں آنے سے پہلے... مجھے اچھا لگا۔ تم کیسی ہو مہرین؟''

''فائن آنٹی...'' وہ سپاٹ لہجے میں بولی اور خلا میں دیکھتی رہی۔

''مجھے اچانک تمہارا خیال آیا۔ ورنہ میں ڈاکٹر کی طرف جا رہی تھی۔ وہی جن کے پاس مہرین تھی۔'' صائمہ بولی۔

''میں جانتی ہوں انہیں... خیریت تو ہے نا؟''

''نہیں ایمن۔'' اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ ''خیریت نہیں ہے اور میری سمجھ میں نہیں آتا میں کیا کروں، میں نے مہرین کا وہ اسکول بھی چھڑوا دیا۔ اب تعلیم تو چھڑانے سے رہی۔''

''آنٹی، کیا میں اندر جا کے سو جاؤں؟'' مہرین نے بیچ میں کہا اور پھر جواب کا انتظار کیے بغیر اس کے بیڈ پر سو گئی۔

''کیا پھر مہرین کو ہیروئن ملی ہے؟''

صائمہ نے اقرار میں سر ہلایا۔ ''وہ سخت احساسِ جرم کا شکار ہے۔ جانتی ہے کہ وہ بہت بُری لت میں مبتلا ہے۔ ہمارے لیے پریشانی کا سبب بن رہی ہے۔ میں اکیلی عورت کیا کروں۔'' اس نے آنکھوں سے نکلنے والے ایک آنسو کو صاف کر کے جھٹک دیا۔ ''مجھ سے زیادہ پریشان اس کا باپ ہے۔ وہ مجھے الزام دیتا ہے کہ تمہاری کوتاہی اور نااہلی ہے سب... مہرین میرے پاس ہوتی تو میں دیکھتا۔''

''تو آپ مہرین کو کچھ عرصے وہاں رہنے دیں۔''

''یہ ہو سکتا تھا لیکن مہرین نہیں مانتی۔ وہ تو ہفتے میں دو بار کی ملاقات بھی مجبوری میں کرتی ہے اور باپ کہتا ہے کہ میں نے اسے بدظن کیا ہے۔ مہرین اس لت سے چھٹکارا پانا چاہتی ہے۔ روتی ہے میرے سامنے... وعدہ کرتی ہے کہ آئندہ استعمال نہیں کرے گی لیکن تم جانتی ہو کہ کسی لت سے چھٹکارا پانا آسان نہیں ہوتا۔ لوگ کتنے بے بس ہوتے ہیں، سگریٹ نہیں چھوڑ سکتے۔''

''آپ کو وہ کیا بتاتی ہے۔ کہاں سے آتی ہے اس کے پاس ہیروئن؟''

''وہی جو سب کو بتاتی ہے کہ مجھے نہیں معلوم۔ کبھی بستے میں، کبھی پاکٹ میں، کبھی میز کی دراز میں اور میں سمجھتی ہوں وہ جھوٹ نہیں بولتی۔'' صائمہ نے کہا۔

''کیا اس کا مطلب یہ نہیں کہ گھر کے اندر ہی کوئی اس کا دشمن ہے؟''

صائمہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ ''بالکل یہی مطلب نکلتا ہے اس کا مگر میں کس کا نام لوں۔ میرے ملازم پرانے ہیں اور ان پر شک کیا ہی نہیں جاسکتا۔ وہ لالچ میں بھی ایسا نہیں کریں گے۔ ان کے علاوہ میں ہوں، اس کا چاچو ہے، باپ ہے۔''

''یہ آفس بھی جاتی ہے؟''

''پہلے نہیں جاتی تھی۔ ایک تو مریم، ابراہیم کی دوسری بیوی... اس سے دوستی تھی، وہ تھی تو میری سوکن مگر میں ابراہیم کی بیوی ہی نہیں تو سوکن کیسی... ہاں اس نے میری جگہ ضرور لی تھی۔ لیکن ایسے نہیں جیسے کچھ عورتیں کرتی ہیں۔ کسی کا گھر برباد کر کے، وہ اچھی تھی، سب کے ساتھ اچھی تھی۔ ڈاکوؤں کے ہاتھوں ماری نہ جاتی تو مہرین وہاں بھی رہ سکتی تھی۔''

''وہ کہتی ہے اسے ڈاکوؤں نے نہیں مارا... ایک لمبا اور ایک چھوٹا آدمی ہے۔''

''ایمن وہ سب اس کے تخیل کی پیداوار ہیں۔ ایک تو ناپختہ ذہن ہے پھر نشے میں بہک جاتا ہے تو سوتے جاگتے خواب نظر آتے ہیں الٹے سیدھے... جن کو وہ حقیقت سمجھ لیتا ہے۔ آج ابراہیم نے مجھے فون پر بہت برا بھلا کہا۔'' وہ رونے لگی۔ ''اس نے غیر ذمے دار کے علاوہ مجھے بدکردار کہا، دراصل ایک ٹیسٹ کرکٹر ہے وہ میرے پیچھے لگ گیا ہے۔ مجھے پہلے اندازہ نہ تھا کہ یہ تعلق میرے لیے کتنی خرابی لائے گا۔''

''کس قسم کا تعلق؟''

وہ جھجکتے ہوئے بولی۔ ''میں تم سے کچھ چھپاؤں گی نہیں... ہاں میں نے اسے لفٹ کرائی تھی۔ وہ اچھا ہے، ہینڈسم ہے۔ میں بھی جوان ہی ہوں ابھی... خیال ضرور آتا ہے کہ زندگی کیسے اکیلے گزرے گی۔ کوئی سہارا تو ہونا چاہیے۔ صرف دولت تو زندہ رہنے کے لیے کافی نہیں ہوتی۔ محبت بھی تو ایک ضرورت ہے۔ اسے غلطی کہو یا بے وقوفی... میں اس سے ملتی تھی۔ مجھے بالکل اندازہ نہ تھا کہ اس کے پیچھے فوٹوگرافر لگے ہوئے ہیں۔ پاپارازی... جو سائے کی طرح تعاقب کرتے ہیں اور اسکینڈل بناتے ہیں۔ وہ کہتا تھا کہ مجھ سے شادی کرے گا۔ اس کے ساتھ میری تصویریں شائع ہوئیں تو ابراہیم بہت بگڑا۔ ویسے تو اس کا حق نہیں مجھ پر... مگر اس نے دھمکی دی کہ وہ تصاویر کورٹ میں پیش کرے گا کہ مہرین کو اس بدکردار عورت کے ساتھ نہیں رہنا چاہیے اور اس کو میری تحویل میں دیا جائے۔ میں نے اس کرکٹر سے ملنا چھوڑ دیا۔ اس کے بعد اس کی اصلیت سامنے آئی۔ وہ لالچ میں مجھ سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ ایک دو بار اس نے میرا پیچھا کیا۔ گھر تک آیا۔ میں نے دھمکی دی کہ پولیس کو رپورٹ کردوں گی۔''

''یہ سب مہرین کو معلوم ہے؟''

''ہاں، ایک دن اس نے کہا کہ ماما... آپ کسی سے شادی کرنا چاہیں تو کرلیں مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ میں نے اس کے منہ پر چانٹا مارا کہ اپنی ماں سے تم ایسی توقع رکھتی ہو؟ وہ کہنے لگی کہ بات میری توقع کی نہیں آپ کی ضرورت کی ہے۔ کب تک اکیلی رہیں گی آپ؟ میں بھی ایک دن چلی جاؤں گی۔ اس دن مجھے اندازہ ہوا کہ میری بیٹی اب بڑی ہوگئی ہے۔ خواہ وہ میری نظر میں بچی ہو مگر ایمن، آئندہ کا میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ ابھی تک میرا کوئی ارادہ تھا پھر شادی کرنے کا تو اب نہیں ہے۔''

ایمن نے کہا۔ ''میں آپ کے لیے چائے بناتی ہوں۔ آپ کچن میں آجائیں۔''

صائمہ کچن میں ایک اسٹول پر بیٹھ گئی۔ ''اس وقت میں ایک ضرورت سے تمہارے پاس آئی ہوں۔ مجھے کراچی جانا ہے ہفتہ دس کے لیے... کیا پتا زیادہ دن لگ جائیں۔ دو ہفتے بھی ہو سکتے ہیں۔ وہاں میرے ماں باپ ہیں۔ میرے ڈیڈی کا آپریشن ہے۔ بائی پاس سرجری ہے۔ میں ایمن کو ڈاکٹر کے گھر چھوڑنے جارہی تھی کہ اس نے آپ کا کہا کہ میں ایمن آنٹی کے پاس رہوں گی۔''

''اگر وہ کہتی ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں مگر میں اکیلی

ہوں اور مجھے کام کے لیے جانا پڑتا ہے۔''

''مجھے معلوم ہے آپ وہیں جاتی ہیں نا... جہاں اب دستور کا اسٹوڈیو ہے۔ مہرین کو بھی لے جائیں ساتھ۔''

ایمن نے اس کے سامنے چائے رکھی۔ ''ٹھیک ہے مجھے ایک بات بتائیں صائمہ... دستور کیسا آدمی ہے؟''

''تم نے اسے کیسا دیکھا؟ اس کے ساتھ رہتی ہو ہر وقت۔''

''لیکن آپ اسے برسوں سے جانتی ہیں، مجھے شک ہے کہ جیسا وہ نظر آتا ہے ویسا نہیں ہے۔''

''ہاں یہ تو ہے۔ جن لوگوں کے درمیان وہ رہتا تھا، وہ بڑے مشکوک کردار ہیں میرے نزدیک، لڑکیاں مستقل اس کے پیچھے لگی رہتی ہیں اور وہ بہرحال جوان آدمی ہے۔ کوئی فرشتہ نہیں۔ ایک کشش اس کے پیسے کی ہے۔ دوسری شہرت کی... اور تیسری اس کی اپنی... تم اس سے شادی کرنے کا تو نہیں سوچ رہی ہو؟''

ایمن چونکی۔ ''میں نے نہیں... اس نے سوچا تھا۔ اس خواہش کا اظہار بھی کیا تھا لیکن میں نے انکار کر دیا۔ یہ بات کسی اور کو معلوم نہیں۔''

''تم نے عقل مندی کی۔ میں سمجھتی ہوں کہ تمہیں ہر کوئی پسند کر سکتا ہے۔ باہر اس دنیا میں سب شکاری ہیں جو اپنے اپنے جال لیے پھر رہے ہیں۔''

''میں جانتی ہوں صائمہ... مگر میں آسان شکار نہیں ہوں۔''

وہ بولتی گئی۔ ''وہاں شاکر علی بھی ہے۔ اس نے بہت شاندار محل جیسا گھر بنوایا ہے۔ ابھی وہاں وہ صرف اپنی ماں کے ساتھ رہتا ہے۔ وہ ذمے دار آدمی ہے۔ دستور سے لاکھ درجہ بہتر، کیا ابھی تک ابراہیم نے تم میں دلچسپی نہیں لی؟''

وہ پھر چونکی۔ ''نہیں صائمہ... اس کا سب احترام کرتے ہیں۔''

''لیکن تمہاری اہمیت اس لیے بہت زیادہ ہے کہ مہرین تمہیں بہت پسند کرتی ہے اور اسے بھی مریم کی جگہ لینے کے لیے تم سے بہتر دوسری نظر نہیں آئے گی۔''

''ہو سکتا ہے ایسا ہو مگر ابھی تک اس کا رویہ مہربانی اور شفقت کا ہے میرے ساتھ۔''

''تم بڑے مضبوط کردار کی لڑکی ہو۔ مجھے معلوم ہوا تھا کہ تم نے نیکی کا معاوضہ لینے سے انکار کر دیا تھا نہ کار نہ نقد... بلکہ ایک لاکھ ماہانہ کی ملازمت سے بھی انکار کر دیا تھا۔''

''جو کام میں نے قبول کیا وہ میری صلاحیت کے مطابق تھا۔ اس سے میں مطمئن ہوں۔''

''ابراہیم نے مجھ سے کہا تھا کہ تم مری چلی جاؤ۔ وہاں ایک گیسٹ ہاؤس ہے اس کا... دس پندرہ دن یا مہینا بھر مہرین کو اپنے ساتھ رکھو، کسی کو پتا نہ ہو کہ وہ کہاں ہے۔ کوئی اس سے رابطہ نہ کر سکے۔''

''آئیڈیا تو اچھا تھا۔''

''ہاں، اور میرا کراچی جانا ضروری نہ ہوتا تو میں ضرور چلی جاتی۔'' صائمہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''میری فلائٹ چار بجے کی ہے۔ مہرین کے پاس میرا فون نمبر ہے۔ تھینک یو ایمن اس مدد کا...'' اس نے بیگ میں سے کچھ چابیاں ایمن کو دیں۔ ''یہ میرے اور مہرین کے بیڈروم کی چابیاں ہیں۔ گھر تو کھلا ہے، ملازم ہیں وہاں۔ ایمن کی ضرورت کی ہر چیز تم وہاں سے لے سکتی ہو۔''

ایمن چابیاں ہاتھ میں لیے سوچتی رہی کہ یہ ذمے داری قبول کر کے اس نے اپنے ساتھ مہرین کو بھی خطرے میں تو نہیں ڈال دیا ہے۔ اس نے صائمہ سے کسی دھمکی کا ذکر نہیں کیا تھا۔

اندر جا کے اس نے دیکھا تو نیند کا بہانہ کر کے اٹھ جانے والی مہرین جاگ رہی تھی اور شاید ان کی تمام گفتگو سن رہی تھی۔ ''کیا ہم مری جا رہے ہیں آنٹی ایمن... میں اور آپ...''

''ہاں، ارادہ تو ہے۔'' ایمن نے بتایا۔

''باز آجائیں اس ارادے سے... یہ آپ کے لیے خطرناک بات ہے۔'' وہ اٹھ بیٹھی۔ ''وہ آپ کو بھی مار ڈالیں گے۔ میں نے آپ کو پہلے ہی بتایا تھا، انہوں نے مریم آنٹی کو بھی مار دیا تھا۔ میں آپ کو بھی گنوا دوں گی۔''

''یہ کیا فضول بات ہے مہرین... سب کہتے ہیں کہ مریم کو ڈاکوؤں نے مارا تھا۔ زیورات لوٹ کے لے گئے تھے وہ۔''

''غلط کہتے ہیں سب... ان کو معلوم ہی نہیں... اصل وجہ میں جانتی ہوں۔'' وہ چلائی۔

''او کے... او کے... میں تمہارے پاپا سے کہوں گی تو وہ مسلح محافظ فراہم کر دیں گے۔''

''ان سے کہیں کہ آپ کو یہاں بھی مسلح محافظ دیں۔ میں یہاں بھی تو رہ سکتی ہوں۔ خطرے میں یہاں بھی ہیں آپ کی جان۔''

''اچھا میں آج بات کروں گی۔ ابھی تم اٹھو ہمیں

اسٹوڈیو جانا ہے اور کسی سے مری جانے کی بات مت کرنا، تمہارے پاپا کو اور چاچو کو تو معلوم ہوگا، چلو۔''

اسٹوڈیو میں آج اس کا پہلا شاٹ تھا۔ شاہانی گروپ کی کارکردگی اور منصوبوں کے بارے میں ایک دستاویزی فلم بن کے تیار ہو چکی تھی۔ آج اس کا پری ویو تھا جس میں پروڈکشن یونٹ کے تمام ارکان کو اپنی رائے دینا تھی۔ اس سے پہلے ایک اشتہاری فلم کا پہلا شاٹ تھا جو شاہانی گروپ کے نئے رہائشی منصوبے کے بارے میں تھا وہاں ابھی سپاٹ زمین کے سوا کچھ نہ تھا لیکن یہ کام کمپیوٹر ٹیکنالوجی کا تھا کہ وہاں چھوٹے بڑے مکمل گھروں کی قطاریں، صاف ستھری سڑکیں، باغ اور پلے گراؤنڈ، اسکول، اسپتال اور شاپنگ پلازا، سوئمنگ پول اور سینما سب دکھا دیے جائیں۔ پروجیکٹ کا نام ''سپنا نگری'' تھا۔ اس کو سفید لہراتے لباس میں پریوں جیسے پنکھ لگا کے لہراتے گھومتے ایک خاص مقام تک آنا تھا۔ یہ مختصر سا راستہ دونوں جانب پھولوں اور پودوں سے باغ کا تاثر دیتا تھا اور ایک لکڑی کے جنگلے پر ختم ہوتا تھا جہاں سے وہ گویا سچ مچ پرواز کر جاتی۔ پس منظر میں ایک گانا چلتا۔ ''سپنوں کا گھر ہو، سپنوں کی نگری۔۔۔ سچ ہو جائے میرا سپنا۔'' اور پھر گویا وہ اڑتی ہوئی اس گھر میں جا اترتی جو ایک سیٹ کی صورت بنایا گیا تھا۔ عام اشتہاروں کی طرح خوب صورت فرنیچر، پردوں، قالین اور آرائشی اشیا سے بھرا ہوا۔

اسے مہرین کی وجہ سے کچھ دیر ہو گئی تھی لیکن کسی نے اس سے کچھ نہیں کہا اور وہ تیار ہونے چلی گئی۔ مہرین کے لیے کچھ بھی اجنبی نہیں تھا۔ یہ سب اس کے باپ کی ملکیت تھا اور وہ آزادانہ پھرتی رہتی تھی۔ جب ساری تیاریاں مکمل ہو گئیں تو ڈائریکٹر نے چلا کے کہا۔ ''لائٹس، ساؤنڈ، ایکشن۔'' اور اس کے ساتھ ہی خاموشی چھا گئی۔ اوپر بڑے بڑے فولادی ہاتھوں میں لگی ہوئی لائٹس روشن ہوئیں کافی بلندی پر گھومنے والی یا اوپر نیچے ہونے والی ٹرالی میں بیٹھے کیمرا مین نے ایمن کو فوکس کیا۔ گانا شروع ہوا۔

ایمن کے لیے یہ کوئی مشکل شاٹ نہیں تھا۔ دو آزمائشی شاٹس ہو جانے کے بعد تیسرا فائنل شاٹ شروع ہوا تو ابراہیم شاہانی اپنی بیٹی کے ساتھ اور شاکر علی نیچے کھڑے تھے لیکن دستور موجود نہ تھا۔ وہ تین فٹ چوڑے راستے پر لہراتی گاتی پرواز کے لیے تیار آگے بڑھی تو از خود اس کی رفتار میں کچھ اضافہ ہوا۔ تقریباً بیس فٹ کے بعد ایک جنگلا تھا اور وہاں تک کا یہ راستہ اوپر والے فلور کا حصہ تھا۔ ایمن کو دونوں ہاتھ اور اس کے ساتھ دونوں۔۔۔۔ پنکھ پھیلا کے رک جانا تھا۔ اگلے شاٹ میں اسے نیچے جا کے ایک گھر میں اترتا دکھایا جاتا۔ پرواز کا سارا عمل کیمرے اور کمپیوٹر سے ہوتا۔ ایڈیٹنگ میں دونوں شاٹ جوڑ کے پرواز مسلسل بن جاتی۔

وہ بالکل جنگلے کے قریب تھی جب اچانک اس کے پیروں کے نیچے سے جیسے زمین نکل گئی۔ مصنوعی فرش کا ایک حصہ دب گیا اور وہ اپنا توازن کھو بیٹھی۔ وہ ایک جھٹکے سے آگے گئی اور مصنوعی کٹہرے پر سے سر کے بل نیچے گئی۔ مصنوعی کٹہرا جو تین فٹ اونچا تھا اکھڑ گیا تھا۔ اس کے حلق سے بے اختیار ایک چیخ نکلی۔ اسے یوں لگا جیسے دس فٹ نیچے ماربل کا فرش تیزی سے اوپر اٹھا ہے اور درمیانی فاصلہ بڑھ کے سو فٹ ہو گیا ہے۔ یہ عرش سے فرش کی مسافت زندگی سے موت کی منزل کا سفر تھی جس میں اس کی چیخ گم ہو کے رہ گئی۔

اس کا سر فرش سے ٹکراتا تو خوب صورت جھلمل کرتے ریشمی بالوں کے نیچے اس کے سر کی گولائی بھی پچک کے متعدد ٹکڑوں کی صورت میں بکھر جاتی۔ وہ دس فٹ کے اس مختصر ترین فضائی سفر کے دوران ہی بے ہوش ہو گئی تھی اور اپنی دانست میں مر چکی تھی کہ جب اس نے پھر دنیا دیکھی اور اس کی نظر نے گرد و پیش کو فوکس کیا تو وہ شاکر علی کے ساتھ فرش پر پڑی تھی اور زندہ تھی۔ پلک جھپکتے میں یونٹ کے ارکان نے ان دونوں کو اٹھا لیا اور دو صوفوں پر لٹا دیا۔ ایمن نے کئی چہرے دیکھے جو پُرتشویش تھے اور کئی آوازیں سنیں۔ خود شاہانی اس کا ہاتھ تھامے گھٹنوں کے بل فرش پر بیٹھا تھا۔ ''اِٹ از او کے ایمن۔۔۔ سب ٹھیک ہے۔ لو یہ پانی پیو۔'' اس نے کسی کے ہاتھ سے گلاس لے کر ایمن کے لبوں سے لگا دیا۔ اس پر جھکی مہرین بار بار دہراتی رہی۔ ''آپ ٹھیک ہو نا آنٹی ایمن۔''

ایمن کے ہاتھ پیر کانپ رہے تھے مگر وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ''شاکر صاحب کو کیا ہوا ہے۔ وہ ٹھیک ہیں۔''

''وہ بھی ٹھیک ہیں۔ اس نے بچا لیا تمہیں۔ ونڈر فل جاب۔'' شاہانی بولا۔

شاکر علی اٹھ بیٹھا اور اس کی طرف آیا۔ ''کم آن مجھے کچھ بھی نہیں ہوا ایمن۔'' وہ مسکرایا اور اس کے ساتھ ہی ابراہیم شاہانی اور پھر آس پاس جمع لوگوں کے چہروں پر مسکراہٹ آ گئی۔

''شاکر نے تمہیں دوڑ کے ایسے کیچ کیا جیسے شاہد آفریدی باؤنڈری پر کرتا ہے اور خود گر جاتا ہے مگر بال کو نہیں

گرنے دیتا۔'' ابراہیم شاہانی بولا۔

شاکر مسکرایا۔ ''میں نے تو کیچ ڈراپ کر دیا۔ فلمی ہیرو کی طرح کیچ کر کے سیدھا کھڑا مسکراتا رہتا تو بات تھی۔''

وہ سب ہنسے۔ شاہانی اسے اپنے کمرے میں لے گیا۔ شوٹنگ کینسل ہوگئی تھی۔ ماہرین کی ایک ٹیم حادثے کی وجہ کا جائزہ لے رہی تھی۔ ایمن کا دماغ ماؤف ہو رہا تھا۔ ریہرسل کے دوران تو سب ٹھیک تھا۔ لکڑی کا مضبوط جنگلا بھی ہٹا نہیں تھا اگر ایمن اس سے ٹکراتی تو وہ اکھڑ کیسے گیا۔ کل وہ اسی جگہ جنگلے کا سہارا لیے کھڑی رہی تھی۔ اپنے تمام بوجھ کے ساتھ اور جنگلے پر گرنے سے پہلے اس کا پیر جیسے کسی گڑھے میں گیا تھا۔ اس نے اپنے پُرخوف خیالات کو خود تک محدود رکھا کیونکہ باہر تفتیشی کارروائی جاری تھی۔ کافی فوراً ہی آگئی تھی چنانچہ اس نے پی لی۔

پھر ابراہیم نے کہا کہ ایمن شاک میں ہے۔ اسے اسپتال جا کے چیک اپ کرا لینا چاہیے اور شاکر علی کو بھی۔

شاکر علی اٹھ کھڑا ہوا۔ ''کم آن، میں تمہیں لے چلتا ہوں۔ خود کو بھی چیک کرا لوں گا۔ فکر مت کرو، میں گاڑی چلا سکتا ہوں۔''

اس نے انکار نہیں کیا اور شاکر علی کے ساتھ بیٹھ گئی۔ اس کی کار بھی بہت خوب صورت اور آرام دہ تھی۔ چمکتی دمکتی، رکھ رکھاؤ کے معاملے میں شاکر علی بالکل دستور کا الٹ تھا۔ اس کے بہترین اٹالین سوٹ ہمیشہ عمدگی سے پریس کیے ہوتے تھے۔ اس کے ساتھ میچ کرتی ٹائی کی ناٹ وہ بڑی نفاست سے باندھتا تھا۔ وہ نہ جانے کون سی سحر آفریں پرفیوم استعمال کرتا تھا۔ ایک ہفتے بعد پرفیوم بدل جاتی تھی، لباس اور خوشبو اس کی پُرکشش شخصیت کو طلسماتی بنا دیتے تھے۔ وہ پُرسکون اور دوستانہ لہجے میں بات کرتا تھا اور اس کے چہرے پر ایک خفیف سی شگفتگی دینے والی مسکراہٹ کا تاثر بھی خوش گوار ہوتا تھا۔

شاکر علی کی اس میں دلچسپی بھی ایمن سے پوشیدہ نہ تھی لیکن وہ دستور کی طرح جارحانہ مزاج نہیں رکھتا تھا۔ ایمن نے بارہا سوچا تھا کہ اگر کبھی شاکر علی نے بھی اپنے جذبات کا اظہار زبان سے کر دیا تو کیا وہ اس کو بھی اسی سپاٹ انداز میں انکار کر سکے گی جیسے دستور کو کیا تھا۔ ان دونوں میں سے کسی ایک کو اپنا مستقبل سونپنے سے پہلے یہ فیصلہ ایمن کے لیے دشوار ترین تھا کہ کسے قبول کرے۔ ایک طرف دستور کی دیوانگی آمیز محبت تھی اور اس کی مردانہ وجاہت تھی۔ جو سیکس اپیل سمجھی جاتی تھی۔ اسی پر لڑکیاں مرتی تھیں۔ مگر وہ سب کو چھوڑ کے ایمن کے لیے دیوانہ تھا۔ دوسری طرف شاکر علی کی سنجیدہ ذمے دارانہ شخصیت تھی جو زیادہ قابلِ اعتماد تھی۔ خصوصاً اس رشتے کے لیے جس کو زندگی کے اختتام تک جاری رہنا تھا۔

ان دونوں میں سے کسی کو نقصان پہنچانے والی چوٹ نہیں آئی تھی۔ جھٹکے اور اس سے زیادہ نفسیاتی شاک کا کچھ اثر تھا۔ ڈاکٹر نے انہیں اعصابی سکون کی اور درد کش دوا دے کر رخصت کر دیا۔

''مس ایمن! اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو میں آپ کو اپنا نیا گھر دکھاؤں۔ اسپتال کے پیچھے ہی ہے۔ وہاں میرے ساتھ والدہ رہتی ہیں۔'' شاکر علی نے اتنی اپنائیت سے کہا کہ وہ انکار نہ کر سکی۔

خودکار گیٹ کھلا اور ایمن نے دیکھا کہ جسے شاکر علی محض نیا گھر کہہ رہا تھا وہ درحقیقت ایک انتہائی خوب صورت محل تھا۔ بیک وقت مشرقی اور گوتھک طرزِ تعمیر کی خوب صورتی میں وائٹ ماربل کی آب و تاب شامل تھی۔ تین طرف درخت تھے جو صاف ظاہر تھا کہ یہاں بڑے نہیں ہوئے۔ یہ پندرہ سے بیس فٹ اونچے آرائشی درخت کہیں سے لا کے بڑی ترتیب سے لگا دیے گئے تھے اور عمارت کے گرد ایک ہری بھری فصیل کی طرح سایہ فگن تھے۔ سامنے والے حصے میں سبز مخملی گھاس بالکل قالین کی طرح بچھی ہوئی تھی اور اس کے وسط میں سہ منزلہ فوارہ تھا جس میں پانی ایک آبشار سے آتا تھا۔ آبشار انتہائی بائیں جانب کی دیوار پر مصنوعی مگر اصلی نظر آنے والی چٹان سے بنی دیوار کے اوپر پانی کی شفاف چادر کی طرح تھی۔ بالکل اجلے دو سارس ایک گوشے میں ساکت کھڑے مصنوعی لگتے تھے مگر اصل تھے۔ فوارے کے تالاب سے نکل کے دو بطخیں لان پر چلنے لگیں۔ ہرن کا ایک خاصا بڑا بچہ اسے حیران نظروں سے دیکھتا رہا۔

ایمن کو اس منظر نے مسحور کر لیا۔ ایسے بھی گھر ہوتے ہیں۔ اس نے حسرت اور حیرانی سے سوچا۔ پھر شاکر علی کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔ محل کا بلند محرابی دروازہ ایک باوردی ملازم نے کھولا جو سرخ اور سنہرے رنگوں والی وردی اور کلاہ سے بالکل شہنشاہ لگتا تھا۔ ایسی ہی حیرانی کے اسباب اندر بھی تھے۔ وہ سخت مرعوب اور تعریفی انداز میں سب دیکھتی گئی۔ قالین، پردے، فانوس، باوردی غلام اور کنیزیں، شاکر علی نے اسے متاثر کرنے کے لیے کوئی بات نہیں کی کہ یہ اسباب کہاں سے امپورٹ ہوا تھا اور کتنا قیمتی تھا۔ وہ اس کو کسی وی آئی پی کی طرح اپنی ماں کے کمرے میں لے گیا۔ وہ شاکر

علی جیسی ہی دبلی پتلی بیوہ عورت تھی۔ سادہ اور باوقار، شاکر علی نے صرف اتنا ہی بتایا کہ یہ ہمارے ساتھ کام کرتی ہیں اور میں ان کو اسپتال لایا تھا تو آپ سے ملوانے بھی لے آیا۔

ایمن کو دوپہر کے کھانے کے لیے رکنا پڑا۔ کھانے کے بعد جب اس کی ماں سوگئی تو شاکر علی اسے لاؤنج میں لے آیا۔ جہاں سے باہر باغ کا منظر شفاف شیشے میں لگی تصویر جیسا نظر آتا تھا۔

''آپ تو بادشاہوں کی طرح رہتے ہیں۔'' ایمن نے بیٹھ کے کہا۔ ''میں خواب میں بھی ایسے محل نہیں دیکھ سکتی۔''

شاکر علی سادگی سے بولا۔ ''بس مس ایمن، مجھے شوق ہے سلیقے سے زندگی بسر کرنے کا... جو ایک بار ہی تو ملتی ہے اور پیسا اگر ہے تو کس لیے... مجھے خوشی ملے... میرے ذوق کی تسکین ہو، آرام ہو، یہ کسی کو دکھانے یا مرعوب کرنے کی بات نہیں ہے۔''

''آپ سے بالکل الٹ ہے دستور کا اندازِ زندگی۔''

''سوری ٹو سے... مگر یہ جو تخلیق کار یا دانشور ہوتے ہیں نا... جان بوجھ کر اپنا حلیہ چونکانے والا بناتے ہیں اور بے ترتیب زندگی گزارنا، بس عادت ہوتی ہے یا فطرت۔ مجھے بال، اوٹ پٹانگ کپڑے، غلیظ بدبودار جسم کیونکہ مہینہ مہینہ نہ نہاتے ہیں نہ منہ دھوتے ہیں پھر کوئی نہ کوئی نشہ لازمی... شراب نہ سہی چرس یا ہیروئن۔''

''بیشتر تو خوش حال نہیں ہوتے۔''

''دستور کو کیا ہے؟ تم نے دیکھا وہ کیسے لوگوں کے درمیان رہتا تھا۔ بڑے بھائی نے اسٹوڈیو تو بنوادیا وہاں مگر جو لوگ وہاں آتے جاتے تھے آس پاس... میں غریبوں سے نفرت نہیں کرتا، ان کے طور طریقے، عادات اور رویے خراب ہوجاتے ہیں۔ جرائم اور کہاں پنپتے ہیں۔ ایسی ہی آبادیوں میں تمہیں معلوم ہے دستور بھی ہیروئن پیتا ہے۔''

وہ چونکی۔ ''میں نے کبھی دیکھا نہیں۔''

''آپ نے ابھی دیکھا ہی کیا ہے مس ایمن... جمعہ جمعہ آٹھ دن بھی نہیں ہوئے یہاں آئے۔ وہ عادی ہے اور سپلائی کا اسے کوئی مسئلہ نہیں۔ وہ ایک من مانگے تو سپلائی کرنے والے لاکر دیں گے۔ آس پاس والے خوب فائدہ اٹھاتے ہیں۔ پیسے کی تو کوئی بات نہیں لیکن آپ خیرات میں ہیروئن بانٹنے لگیں تو یہ رحم دلی نہیں ہے۔''

''یہ تو عادی بنانے والی بات ہے مگر اس کا ایک نفسیاتی مسئلہ ہے بلکہ بیماری ہے کہ اپنی محرومی کا انتقام دنیا سے لو، مقدر کی سزا دوسروں کو دو۔''

وہ بھونچکی رہ گئی۔ ''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ اس کو کیا محرومی ہے؟''

ایک ملازمہ کافی ان کے درمیان رکھ کے نکل گئی تو وہ بولا۔ ''محرومی دولت کی اتنا خراب نہیں کرتی جتنی محبت سے محرومی کرتی ہے۔''

''مگر اسے تو محبت بھی ملی۔ ماڈلز ایک سے ایک ملیں۔ وہ بہت نامور ہونے کے بعد بھی اس سے ملتی ہیں۔''

وہ ہنسا۔ ''ہاں اس معاملے میں وہ راجا اِندر سے کم نہیں۔ لیکن دیکھو ایمن، ایک ہوتی ہے ضرورت... ایک ہوس... جب آپ کو اچھا کھانے کو مل رہا ہو تو آپ خراب اور باسی... روکھی سوکھی بھی نہ چھوڑیں... یہ کیا ہے؟''

''میں سمجھی نہیں شاکر صاحب...''

''سمجھنے کی کیا بات ہے اس میں... جہاں اس کا اسٹوڈیو تھا، وہاں کی عورتوں کو دیکھا ہے آپ نے؟ کچھ تو پیشہ ور ہیں، کچھ بدصورت اور عمر رسیدہ... کہ دیکھ کر گھن آئے۔ وہ سب کو محبت دیتا ہے۔ محبت!'' وہ طنز سے ہنسا۔

''میں کیسے یقین کرلوں... کیا وہ جنسی مریض ہے؟''

''ذہنی مریض تو ہے نا، اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اسے باپ سے وہ محبت نہیں ملی جو بڑے بھائی کو ملی۔''

''باپ تو سوتیلا نہیں تھا۔''

''نہیں اس نے ایک شادی کی اور زندگی بہت خوش و خرم گزر رہی تھی کہ بیوی مرگئی۔ اس سے پہلے کہ وہ اسے علاج کے لیے امریکا لے جاتا، معلوم نہیں کیا بیماری تھی۔ بیماریاں بھی تو نت نئی ایجاد ہوگئی ہیں۔ میرا مطلب ہے دریافت ہوگئی ہیں۔ بخار صرف بخار نہیں رہا۔ کانگو فیور، ڈینگی فیور، نگلیریا اور پتا نہیں کیا۔ باپ نے محبت کی شادی کی تھی اور اس کی محبت سولہ سال میں سولہ گنا ہوگئی تھی۔ وہ پاگل ہوجاتا اگر اسپتال میں ایک ڈاکٹر نہ ملتی۔ وہ سو فیصد تو نہیں مگر خاصی ہمشکل تھی پہلی کی... اور علاج کے دوران اس کا رویہ بھی ایسا تھا کہ بس اس نے دوسری شادی کرلی۔ اس کا بھی ایک نفسیاتی مسئلہ تھا۔ جو عام ہوتا ہے۔ بیوی جب ماں بنی تو اس کی محبت تقسیم ہوگئی۔ زیادہ بیٹے کو ملنے لگی۔ بیوی جس کی محبت پر ابراہیم کا سو فیصد حق تھا اب صرف اس کی نہیں رہی۔ بیٹا ایک رقیب بن کے سامنے آگیا۔ دوسری شادی میں پھر یہی ہوا۔ وہ بھی ماں بنتے ہی صرف اس کی محبوبہ اور بیوی نہ رہی۔ پیار پھر بٹ گیا۔ وہ سخت مایوس ہوا اور فرسٹریشن کا شکار۔ اس نے دستور کو بھی رقیب کی جگہ دے

دی۔ لیکن دونوں بھائیوں میں ایک فرق ہمیشہ رہا۔ ایک بڑا تھا وہ اس کا اصل جانشین بن گیا۔ پرنس آف ویلز... دوسرا چھوٹا ہمیشہ چھوٹا رہا۔''

''اس سے نفسیاتی مسائل بھی پیدا ہوتے ہیں۔''

''ہاں، اور یہ مسائل ابراہیم کے کاروبار سنبھالنے سے بڑھے۔ وہ بڑا تھا، وارث دونوں تھے مگر جیسے بڑا شہزادہ تخت نشین ہوتا ہے، باپ نے ہر ذمے داری اسے سونپی۔ وہ لاکھ انصاف پسند سہی... سوتیلے بھائی کو اس نے محبت اور اعتماد دیا اور کسی قسم کا کنٹرول نہیں رکھا لیکن اس کو شراکت اور ذمے داری کے احساس سے محروم رہنا پڑا۔ وہ قانون کی مدد سے اپنا حصہ الگ مانگ سکتا تھا لیکن اس میں بزنس چلانے کی صلاحیت نہیں ہے۔ یہ صلاحیت تو بڑے بھائی میں بھی نہیں ہے۔''

''یہ کچھ عجیب سی بات ہے۔ اس نے کاروبار کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا، اتنا پھیلایا؟''

''ہاں، اتنا پھیلایا کہ سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ یہ تو پہلے دیکھنا چاہیے کہ آپ میں صلاحیت ہے یا نہیں۔ وہ بھائی کو شریک اور ذمے دار بنا دیتا مگر وہ ہے فنکار، مصور، اور ابراہیم کی بدنیتی نہ ہوتی تو وہی وارث بھی تھا۔''

ایمن کے دماغ میں ایک ایٹم بم سا پھٹ گیا۔ یہ زبردست ناقابلِ تردید انکشاف کسی اندھا کر دینے والی چمک جیسا تھا جس کے بعد کچھ نظر نہ آئے۔ اس کا ذہن پھر سمجھنے کے قابل ہوا تو اچانک اصل حقیقت اظہر من الشمس ہو گئی۔ اسے سارے سوالات کے جواب مل گئے۔ کوئی صرف مہرین ہی کو کیوں ہیروئن کا عادی بنانا چاہتا تھا۔ اس کو سپلائر کے طور پر کسی نے استعمال نہیں کیا تھا۔ اسے کوئی پیسے کا لالچ نہیں دے سکتا تھا۔ ہاں دھمکی دے کر مجبور ضرور کر سکتا تھا۔

مریم کا قتل ایک ثبوت تھا کہ دھمکی دینے والے اس پر عمل بھی کرتے ہیں۔

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''ہمیں اب چلنا چاہیے مسٹر شاکر علی۔''

☆☆☆

مہرین بہت دیر سے خلا میں نظریں جمائے اس تصویر کو دیکھ رہی تھی جس میں ایمن اپنے والدین کے ساتھ کھڑی تھی۔ اس وقت ایمن کی وہی عمر تھی جو اب مہرین کی تھی۔ ایمن کے آنے پر بھی وہ بے حس و حرکت بیٹھی رہی۔

''کیا دیکھ رہی ہو مہرین... یہ میرے والدین ہیں اور یہ ان کے ساتھ میں۔'' ایمن نے کہا۔

''وہ اب کہاں ہیں؟ مجھے ان کے بارے میں بتاؤ۔''

ایمن نے تصویر پر محبت سے ہاتھ پھیر کے گرد صاف کی۔ وہ اللہ میاں کے پاس ہیں۔ اس وقت میری بیٹی اتنی ہی بڑی تھی جتنی بڑی اب تم ہو۔ پہلے میرے والد گئے۔ دو ماہ بعد میری ماں چلی گئی۔ اتنی محبت میں ارشد سے کرتی تو زندہ نہ رہتی۔ میں بھی دنیا چھوڑ دیتی۔ نہیں، خودکشی نہیں کی تھی ماں نے... عجیب اتفاق ہی کہہ سکتے ہیں اسے... میرے والد کو ٹائیفائڈ ہوا تھا۔ امی کو بھی ٹائیفائڈ ہوا۔ ابا نے بے پروائی کی علاج میں... امی نے علاج کرایا ہی نہیں۔ انہوں نے میرے ساتھ آ کے رہنا پسند نہیں کیا۔ مجھے پتا چل جاتا ان کی بیماری کا تو میں انہیں زبردستی اپنے ساتھ لے آتی مگر انہوں نے کچھ بتایا نہیں۔ میں دوسرے تیسرے دن چکر لگا آتی تھی۔ آخری بار ایک ہفتے سے زیادہ ہو گیا تھا اور مجھے فرصت نہیں ملی۔ میں فون کرتی تھی تو وہ کہتی تھیں کہ سب خیریت ہے ایمن... دسویں دن میں گئی تو انہیں سخت بخار تھا اور وہ صرف پیناڈول کھا رہی تھیں۔ بخار میں اپنا کھانا بھی نہ جانے کیسے پکاتی تھیں۔ میں ناراض ہوئی اور ان کو اسپتال میں داخل کرا دیا لیکن تب تک بہت دیر ہو گئی تھی۔ اسی رات ان کا انتقال ہو گیا۔'' ایمن نے بے اختیار آنکھوں میں آجانے والے آنسو کو مہرین سے چھپا لیا۔

''وہ آپ سے بے حد محبت کرتے تھے؟''

وہ حیرانی سے پلٹی۔ ''بہت زیادہ... میرے والد ایک موسیقار بھی تھے۔ ستار بہت اچھا بجاتے تھے۔ ویسے وہ ایک کالج میں پروفیسر تھے اور ان کی خواہش تھی کہ میں بھی پروفیسر بنوں، میں ایک اچھی بیٹی کی طرح ان کی یہ خواہش پوری نہ کر سکی۔''

''آپ تو بہت اچھی ہیں۔ بُری میں ہوں اور مجھے اللہ میاں اسی کی سزا دے رہے ہیں۔''

اس نے مہرین کو گلے لگا لیا۔ ''ایسا کیوں سوچتی ہو تم... تم تو بہت اچھی ہو۔''

وہ سسکیاں لینے لگی۔ ''نہیں آنٹی... مجھے پتا ہے، پتا ہے ہمارے گھر میں ایک فوارہ تھا۔ اس میں دو بطخیں سفید تھیں۔ ایک کالی میری تھی، ان دونوں سفید بطخوں نے مل کے اسے مار دیا۔ پھر میں نے ان دو بطخوں کو ہٹا دیا۔ ڈیڈی نے ایک اور کالی بطخ منگوا دی۔ وہ تالاب میں اکیلی تھی۔ ایک دن صبح دیکھا تو تالاب کا پانی غائب تھا۔ پتا نہیں

کیسے... پھر وہ بھی مر گئی۔''

''مگر کچھوا بغیر پانی کے بھی زندہ رہتی ہے۔''

''ہاں، ڈیڈی نے انجینئر کو بلایا۔ اس نے دیکھا کہ فرش میں ایک درز ہے۔ پانی اس میں سے اُتر گیا تھا۔ فرش توڑ کر پھر بنایا گیا۔ لیکن دو ہفتے بعد دیکھا تو مردہ کچھوا پانی میں تیر رہی تھی۔ بس پھر میں نے کوئی کچھوا نہیں پالی۔ اللہ میاں مجھ سے وہ بھی چھین لیتے مجھے سزا دینے کے لیے۔''

''کس بات کی سزا مہرین؟''

''مجھے نہیں پتا، مگر دیکھو اس نے میرے دو ٹکڑے کر دیے۔ میرے ماں باپ کو الگ کر دیا۔ میں کسے قصوروار کہوں، ماں نے جو وجہ بتائی اس سے قصور میرے باپ کا ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ میں اسے پسند نہیں کرتی مگر مجھے اس سے ملنا پڑتا ہے۔ وہ ظاہر جو کرتا ہے کہ اسے بہت محبت ہے مجھ سے مگر ایسا اور کہیں نہیں ہوتا کہ باپ بیٹی سے تو محبت کرے اور اس کی ماں سے نفرت... اور یہی ماں کرے۔ نہیں چاہیے مجھے ایسی محبت جس میں آدھی نفرت ہو۔ مریم میرے باپ کو برا تو نہیں کہتی تھی اور میری اچھی دوست بن گئی تھی لیکن وہ بھی نہیں رہی۔ میری وجہ سے ماری گئی۔'' وہ سسکیاں لے کر روتی رہی۔

''اپنے دماغ سے نکال دو یہ سب خیال مہرین۔''

''کیسے نکال دوں۔ میں جانتی ہوں کہ اسے میری وجہ سے قتل ہونا پڑا۔ وہ میری ہمدرد بن گئی تھی۔ میں نے کیوں بتایا اسے دو شیطانوں کے بارے میں... انہوں نے منع کیا تھا مجھے کہا تھا کہ وہ قتل کر دیتے ہیں۔ میں نے پھر وہی بے وقوفی کی... مجھے کسی کو بتانے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ تمہیں بھی مار ڈالیں گے۔ بُری تو میں ہوں دنیا کی نظر میں کہ ہیروئن کی عادی ہوں۔ کلاس میں سب مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھتے ہیں اور پتا نہیں کیسی کیسی باتیں کرتے ہیں۔ بلیک بورڈ پر لکھ دیتے ہیں۔ مجھے ان دونوں سے بہت ڈر لگتا ہے۔ پتا نہیں اب وہ کسے ماریں گے۔ تمہیں یا ڈیڈی کو۔ ممی کو وہ جب چاہیں مار سکتے ہیں لیکن ان کو خطرہ تم سے ہے... یا ڈیڈی سے۔''

''شٹ اَپ مہرین، کون دونوں... کیسا خطرہ... تم سب خود سوچ سوچ کے پریشان ہو رہی ہو۔''

''نہیں آنٹی، تم مجھے چھوڑ دو... میرے ساتھ مت جاؤ۔ چاچو سے شادی کر لو۔ وہ کہہ رہے تھے کہ تم مان جاؤ گی۔''

ایمن کو شاک لگا۔ ''یہ دستور نے تم سے کہا۔ خیر، چھوڑو اس بات کو... تم جو یہ بار بار ان دونوں کا ذکر کرتی ہو... ذرا مجھے بتاؤ دیکھنے میں وہ کیسے ہیں؟ حلیہ کیا ہے ان کا؟''

وہ سوچ کے بولی۔ ''یہ تو جانتی ہیں آپ کہ ایک لمبا ہے دوسرا چھوٹا... لمبا کچھ دُبلا بھی ہے۔ انکل شاکر جیسا۔ اور چھوٹا کچھ موٹا بھی ہے۔ عمر... وہ بھی اتنی ہی ہو گی شاید... جیسی چاچو اور انکل شاکر علی کی ہے۔ رنگ لمبے کا صاف ہے۔ چھوٹا کالا ہے۔ اور لگتے دونوں جاہل ہیں بات چیت سے... شاید مکینک ہیں یا الیکٹریشن پلمبر... ایک بیگ ہوتا ہے ان کے پاس کیپ دونوں لگاتے ہیں۔''

کال بیل کی آواز پر ایمن نے ٹیرس سے نیچے جھانکا اور دروازہ کھول دیا۔ دستور اوپر آ گیا۔ ''ہیلو لیڈیز، تیار ہیں آپ لوگ؟'' وہ مسکرایا۔ ''ڈرائیور حاضر ہے۔''

آدھے گھنٹے بعد دو سوٹ کیس ڈکی میں رکھے وہ پنڈی کی جانب رواں تھے۔ ایمن کے دل میں ایک خلش سی تھی کہ دستور صرف انہیں چھوڑنے کے لیے آیا ہے لیکن درحقیقت وہ مری تک ایمن کا ساتھ چاہتا تھا اور اگر وہاں رکنا چاہتا تو یہ بھی اس کی مرضی تھی۔ ابراہیم کی طرح اپنے آفس میں موجود رہنا اس پر لازم نہیں تھا۔ ڈرائیور کو وہ خود بھی نہ لے کے جاتی۔ چھ سات گھنٹے کی ڈرائیونگ وہ خود بہ آسانی کر سکتی تھی۔ موٹر وے پر جانے کے بجائے اس نے جی ٹی روڈ کا راستہ اپنایا۔

''وہ راستہ بور ہے۔ سوا سو کی اسپیڈ پر وقت کم لگتا ہے۔ لیکن مجھے تو تمہارے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارنا ہے۔'' دستور نے راوی کا پل کراس کرنے کے بعد کہا۔ کالا شاہ کاکو سے موٹر وے پر بائیں جانب مڑنے کے بجائے وہ سیدھا چلتا گیا۔ ''ابھی ہم پہلے تو میاں جی کا دال پراٹھا کھائیں گے لنچ میں۔ مجھے یقین ہے تم اب تک اس نعمت سے محروم ہو، پھر دریائے جہلم کے اوپر بنے ہوئے ٹیولپ ریسٹورنٹ میں چائے پینے کا مزہ ہی کچھ اور ہے۔''

ایمن نے بات بدل دی۔ ''فلم کی ریلیز کا شیڈول اور ایگریمنٹ ہو گیا فائنل۔''

''وہ بھائی نے کر لیا۔ سب جگہ نئے سال کے دوسرے مہینے فلم ریلیز ہو گی۔ یکم فروری 1916ء... ہم اس دن سارے پروگرام اسپانسر کریں گے۔ تم اور میں درمیان میں اینکر کے ساتھ ہوں گے لائیو شو کا اسکرپٹ لکھا جا رہا ہے۔''

''ہم مہرین کو بھی ساتھ رکھیں گے۔'' ایمن نے مڑ

کے کہا مگر وہ پچھلی سیٹ پر دراز ہو کے سو چکی تھی۔

دستور نے اچانک موضوع بدل کے سوال کر دیا۔

''تم نے شاکر علی کا گھر دیکھا؟''

''گھر نہیں محل کہو... اور اس کی شان و شوکت... غلام اور کنیزیں... سب باوردی۔''

وہ تلخی سے ہنسا۔ ''ایسے لوگ اسی طرح رہتے ہیں کہ دیکھنے والا دم بخود اور مرعوب ہو۔''

''ایسے سے کیا مراد ہے تمہاری؟''

''یہ ڈان اور مافیا کے سربراہ... منشیات کی دنیا کے بے تاج بادشاہ۔''

''شاکر علی کا ان سے کیا موازنہ دستور؟''

''مائی سویٹ بھولی بھالی انجان ایمن... تم کیا سمجھتی ہو کہ جیسا وہ نظر آتا ہے ویسا ہی ہے؟ نو... اس کا ظاہر جتنا پرکشش اور متاثر کرنے والا ہے... باطن اس کے برعکس ہے۔''

''تم کیا کہنا چاہتے ہو آخر؟''

''میں تمہیں اس کی اصلیت بتانا چاہتا ہوں... کیا تمہیں معلوم ہے کہ وہ دو بار شادی کر چکا ہے۔''

''جھوٹ بولتے ہو تم...'' ایمن نے شاک میں کہا۔

''تم خود پوچھ لینا اس سے... انکار کرے تو مجھے بتانا... اس کی ایک خاندانی بیوی خیبر ایجنسی میں بیٹھی ہے۔ اس کے آبائی گھر میں نہیں... اپنے ماں باپ کے گھر میں۔ دوسری کو وہ طلاق دے چکا ہے شہر میں۔ اس سے تم لاہور میں مل سکتی ہو۔ وہ آج کل ایک بیوٹی پارلر چلا رہی ہے کامیابی سے۔ گلیمر اینڈ گریس... اس کا نام ہے گلناز۔''

ایمن اس شاک میں پلک جھپکائے بغیر دستور کو دیکھتی رہی۔ اب وہ دستور کو جھوٹا نہیں کہہ سکتی تھی۔ ''خیبر ایجنسی سے اس کا کیا تعلق؟''

وہ ہنسا۔ ''اس کا پورا نام ہے شاکر علی آفریدی... میں نے دیکھا نہیں سنا ہے کسی آفریدی کا ڈھائی سو بیڈ روم والا گھر ہے خیبر ایجنسی میں... آفریدی ہاؤس... کوئی سیاح جائے تو دیکھ سکتا ہے۔ یہ لوگ آئل... ٹرانسپورٹ اور منشیات سے دولت مند ہوئے... اس کا باپ تو مر گیا مگر ایک چچا ہے زرتاج آفریدی۔ وہ اس کے پاس آتا رہتا ہے۔ اس کا اصل کاروبار ہیروئن کا ہے۔ ویسے پشاور میں گڈز ٹرانسپورٹ کا بزنس ہے۔ ٹرک اور کنٹینر کراچی تک جاتے ہیں۔''

''اس کی پہلی بیوی کون ہے؟''

''تایا کی بیٹی... تایا بھی زندہ نہیں۔ شاکر اسے طلاق دے تو اس عورت کے بھائی گولی مار دیں۔ بدقسمتی سے وہ لاولد رہی۔ ویسے بھی دو یا تین شادیوں کو وہ جرم نہیں سمجھتے... وہ عورت آخری سانس تک اس کی منکوحہ رہے گی اور انتظار کرتے کرتے مر جائے گی۔ شاکر کو مجرم کوئی نہیں سمجھے گا۔ وہ تدفین میں ضرور شریک ہوگا۔''

ایمن نے بے چینی سے کہا۔ ''اور یہ دوسری گلناز؟''

''وہ ماڈل تھی۔ ٹاپ کی ماڈل... پتا نہیں اس نے شاکر میں کیا دیکھا اور یہ جو تیسری آس لگائے بیٹھی ہے۔ میں تمہاری بات نہیں کر رہا۔ ایک بے وقوف ہے گولڈن گرل قرش... تم نے کیٹ واک میں دیکھا ہوگا اسے... دبئی میں رہتی ہے۔''

''وہ... وہ شادی کرنا چاہتی ہے شاکر علی سے؟''

''اتنا حیران پریشان نظر مت آؤ۔ یہ شوق ہے اس کا... قرش چھ مہینے اسی آس میں رہی۔ اب پریشان ہے۔ ایک افواہ بھی سن لو کہ اس شاکر علی کے چکر میں وہ تھی تو ماں بن چکی ہوتی اب تک... بیوی بننے کے لیے اس نے یہ بھی برداشت کر لیا تھا اور سوچا ہوگا کہ وہ شاکر کے پاؤں کی زنجیر بن جائے گی۔ اسے بلیک میل کر سکے گی... پھر شاکر کو شادی کرنی پڑے گی مگر وہ بہت شاطر ذہن رکھنے والا آدمی ہے۔ قرش کے سارے پلان فلاپ ہو گئے۔ شاکر نے میڈیا کو ہوا بھی نہ لگنے دی۔ قرش کو وارننگ دے دی تھی کہ ایک سطر کا اسکینڈل بھی نظر آیا کہیں تو میں اسی دن تردید کردوں گا اور ہم اس کے بعد ملیں گے بھی نہیں... یہ رازداری بھی قرش کو مہنگی پڑی۔ لیکن وہ ابھی تک چپ ہے۔ اس پاگل کو امید ہے کہ شاکر اس کو مل جائے گا۔ اپنے صبر، ضبط اور استقامت کی وجہ سے وہ شاکر کو جیت لے گی۔'' اس نے ایک دم گاڑی کو بہت سی دوسری گاڑیوں کے درمیان روک لیا۔ ''پتا نہیں یہ عورتیں کیوں فریفتہ ہوتی ہیں اس پر... وجہ دولت کی کشش ہی نہیں ہوتی۔''

ایمن کی بھوک مر گئی تھی مگر اس نے مہرین کو جگایا۔ کھانے کے بعد وہ پھر روانہ ہوئے تو راولپنڈی تک دو ڈھائی گھنٹے کی مسافت تھی۔ ایمن کے دماغ میں بگولے سے ناچ رہے تھے۔ کیا میں نے بھی ان بے وقوف عورتوں میں اپنا نام لکھوا دیا ہے جو شاکر علی پر فریفتہ ہوتی ہیں۔ اس کی دولت پر نہیں... وہ تو اس کا رکھ رکھاؤ دیکھ کر اور اس کی ماں سے مل کر تقریباً فیصلہ کر چکی تھی کہ وقت آیا تو وہ بلاتوقف دستور پر شاکر علی کو ترجیح دے گی۔ وہ مہذب اور شائستہ،

ذ تے دار اور ذہین آدمی تھا جس پر بھروسا کیا جا سکتا تھا کہ زندگی میں کبھی دکھ نہیں دے گا۔ اس کے ظاہر و باطن میں زمین آسمان کا فرق ہوگا، یہ تو وہ خواب میں بھی نہیں سوچ سکتی تھی... ایسا زبردست کریکٹر ایکٹر ہے وہ...

''دستور... اس کا وہ کاروبار... جو اس کی فیملی کرتی ہے۔'' ایمن نے ہیروئن کا نام لینے سے گریز کیا۔

''ایک بات بتاؤ مجھے... بھائی کا بزنس بڑا ہے یا شاکر علی کا... یہاں تو اس نے ابھی شراکت قبول کی ہے۔ اس سے پہلے امپورٹر تھا۔ ایک فیکٹری پشاور میں تھی جوتے بنانے کی۔ ایک گارمنٹس کی نوشہرہ میں۔ دوسری وزیر آباد میں... میں نے دیکھی نہیں۔ لیکن ایسا محل تو شاہانی گروپ کے مالک کا بھی نہیں... لیکن دنیا بھر میں جو مافیا کنگ ہیں، ان کا یہی لائف اسٹائل ہے۔ کون رہتا ہے وہاں اس کی بوڑھی ماں کے سوا... ایسا محل تعمیر کرنے کے لیے کہاں سے آئی اتنی دولت؟''

''کیا تمہارے بھائی کو یہ سب معلوم نہیں تھا۔ اسے پارٹنر بناتے وقت؟''

''وہ اس کی انتظامی صلاحیت سے متاثر ہوئے کیونکہ شاکر علی نے انہیں قائل کیا کہ وہ اکیلے ان سب کو نہیں سنبھال سکتے۔ جو کاروبار بھائی نے پھیلا لیے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں بھائی نے غلطی کی۔ عہدہ وہ کوئی قبول نہ کرتا۔ ایم ڈی یا سی ای او جیسا خواہ تنخواہ ایک کروڑ دی جاتی۔ اس نے پارٹنر شپ کی۔ اس کے تین کارخانے اور بھائی کا پورا گروپ آف انڈسٹری... تم نے وہ لطیفہ سنا ہے۔ کسی کے کباب مشہور تھے جو چکن اور بیف کو ملا کے بنائے جاتے تھے۔ کسی نے پوچھا کہ ان کو کس تناسب سے ملاتے ہو؟ اس نے کہا کہ ففٹی ففٹی... گاہک مطمئن ہو گیا کہ آدھا چکن اور آدھا بیف... جبکہ وہ ایک مرغی اور ایک گائے کی بات کر رہا تھا۔ تو شاکر علی اور شاہانی گروپ ایسے ہی ہیں۔ ایک چکن ایک گائے۔'' وہ ہنسا۔

''تم نے بھائی کو روکا نہیں؟''

''میں؟ میری یہ اوقات کہاں؟'' وہ تلخی سے بولا۔ ''سوتیلا... چھوٹا... غیر ذمے دار مصور... تھرڈ کلاس لوگوں میں رہنے والا جس کے لیے بھائی نے خزانوں کا منہ کھول رکھا ہے جتنا چاہو لے لو... میں لالچی نہیں ہوں ایمن... مجھے دولت سے زیادہ شہرت کی ہوس ہے۔'' وہ نگاہ سڑک پر رکھے گاڑی چلاتا رہا۔ ''ہم مصور بطور خاص بدنام ہیں۔ میری ماڈل ہر قسم کی لڑکیاں رہی ہیں، عام عزت دار گھروں کی لڑکیاں، کچھ پیسے کے لیے اور کچھ شہرت کے لیے آتی ہیں۔ لیکن ایک مصور یا مجسمہ ساز کے لیے ان میں جنس کی کشش ثانوی ہو جاتی ہے، وہ صرف حسن کو کینوس پر اتارتا ہے یا مجسم کرتا ہے۔ قوس و خم دائرہ در دائرہ عورت کا جسم جمالیاتی شاہکار ہے قدرت کی تخلیق کا... مگر یہ کون سمجھتا ہے۔ کیا تم سمجھ پا رہی ہو؟''

''اور اس کے بعد... جب ایک تخلیقی عمل ختم ہوتا ہے؟''

''کام ختم... وہ اپنا معاوضہ وصول کر لیتی ہے اور میں اس کے تعاون کا شکریہ ادا کر کے اسے رخصت کر دیتا ہوں۔ وہ میرے لیے ایک ورکر... سیکس ورکر نہیں... اس کا استحصال کروں تو میں فنکار نہیں خرکار ہوں۔''

ایمن نے پیچھے مڑ کے پھر یقین کیا کہ مہرین یہ سب نہیں سن رہی ہے۔ وہ کھانے کے بعد پھر سو گئی تھی۔ گاڑی اب اسلام آباد ایکسپریس وے پر دوڑ رہی تھی۔ پھر راول پارک کی طرف سے کشمیر روڈ پر ہو گئی جس کا ایک روڈ سائن اب بھی مری کے علاوہ سری نگر کا فاصلہ بتا رہا تھا۔ اس نے کہیں پڑھا تھا کہ اس سڑک پر کسی ہندو کے تانگے چلتے تھے جو مسافروں کو دو دن میں سری نگر سے راولپنڈی پہنچاتے تھے جہاں سے وہ ٹرین کے ذریعے لاہور اور امرتسر جاتے تھے۔ چھرہ پانی پر اس نے گاڑی روکی تو مہرین اٹھ بیٹھی۔

''چاچو... میں انڈے کے پکوڑے کھاؤں گی۔''

''پہلے ہم کھائیں گے بھتیجی۔'' وہ بولا اور ایمن بھی ہنس پڑی۔ بہت دیر سے ان کے درمیان حائل بوجھل خاموشی کی دیوار ٹوٹ گئی۔ سڑک کے دوسری طرف قطار میں کھڑی کاروں کے درمیان گاڑی روک کے وہ خستہ حال ریسٹورنٹ میں جا بیٹھے۔ مقامی لڑکوں نے اوپر پہاڑوں پر سے آنے والے پانی سے گاڑی کو دھو کر چمکانا شروع کیا۔ ایمن کھڑکی سے نیچے گہرائیوں میں جھانکتی رہی جہاں سبز رنگ فرش سے اوپر آسمان کی نیلاہٹ تک پھیلا ہوا تھا۔ انڈا پکوڑا یہاں کی وہ سوغات تھی جو اور کہیں نہ تھی۔

''کیا تم ٹھہرو گے یہاں؟'' ایمن نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

''نو... کام نہ ہوتا تو ضرور رک جاتا۔ میری ایک تصویر نامکمل تھی کیونکہ ماڈل لندن چلی گئی تھی۔ وہ ایک ہفتے کے لیے آئی ہے۔''

مری کا ریسٹ ہاؤس کشمیر پوائنٹ پر اس موڑ کے نزدیک تھا جہاں سے سڑک سیدھی گورنر ہاؤس کی طرف نکل

جاتی تھی۔ اس کے قریب وزیراعظم کی رہائش تھی جہاں ہر وقت پولیس کی موبائل کے علاوہ راستے سے گاڑیاں اٹھانے والا لفٹر بھی کھڑا ہوا تھا۔ گارڈ نے اندر سے انہیں جھانک کر بھی دیکھا اور پھر گیٹ بے آواز طریقے سے ایک طرف سلائڈ کر گیا۔ گاڑی سو گز تک سیدھی گئی اور پھر گھوم کے پورچ میں رک گئی جہاں ایک بالکل نئی مرسیڈیز پہلے سے کھڑی چم چم کر رہی تھی۔ گاڑی کی آواز پر اندر سے سفید وردی والا شوفر برآمد ہوا۔ اس کے ساتھ بیوی تھی۔ وہ تیس پینتیس سال کی سادہ سی عورت تھی۔ انہوں نے ہاتھ اٹھا کے دستور کو سلام کیا۔ یہ یہاں ہمہ وقت موجود رہنے والے ملازم تھے۔ ان کی حیرانی بتاتی تھی کہ وہ مالکوں کی آمد سے بے خبر تھے۔

''ہیلو آنٹی رضیہ... انکل محمود...'' مہرین نے ان سے خوش اخلاقی کے ساتھ ہاتھ ملایا اور رضیہ کے ساتھ اندر چلی گئی۔ محمود ڈکی میں سے سوٹ کیس نکال رہا تھا جب دستور نے کہا۔ ''محمود! کسی کو ہمارے یہاں آنے کی خبر نہیں ہے، اور نہ ہونی چاہیے۔ یہ مس ایمن مرزا ہیں۔ ہماری ایک ڈائریکٹر... اور پارٹنر... یہ بھی دو چار دن یہاں رہیں گی۔''

''جی سر... آپ فکر ہی نہ کریں۔''

''ابراہیم صاحب نے سیکیورٹی بڑھانے کا کہا تھا۔''

''جی سر... کل چاروں طرف کیمرے لگ گئے تھے۔ تین گارڈ ہر طرف موجود رہتے ہیں چوتھا گیٹ پر ہے سب کے پاس اسلحہ ہے۔''

اب شام ہو گئی تھی۔ ایمن کا خیال تھا کہ اتنی لمبی ڈرائیو کے بعد دستور شاید رات گزار کے صبح واپس جائے مگر وہ چائے پی کے کھڑا ہو گیا۔ ایمن نے اسے اخلاقاً روکا لیکن اسے واپس پہنچ کے اپنا کام ختم کرنے کی فکر تھی۔ خود ان کا تھکن سے برا حال تھا۔ مہرین نے رات کو پیزا کھانے کی فرمائش کی۔ وہ محمود مری سے فریش بنوا کے لایا۔ مہرین تو کھاتے ہی سو گئی۔ ایمن اپنے کمرے میں کچھ دیر ٹی وی دیکھتی رہی۔ وہ دستور سے شاکر علی کا کچا چٹھا سن کے کچھ اپ سیٹ اور مایوس تھی۔ اس نے دونوں کی شخصیت اور رویے کے فرق کو دیکھنے کے بعد تقریباً فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ شاکر علی کے کہتے ہی اس کو قبول کر لے گی۔ اس کی ماں بھی بے ضرر سی شفیق عورت تھی۔ شاکر علی کے محل اور شاہانہ اندازِ رہائش کی اسے خواہش ہرگز نہ تھی لیکن اس پریوں کے محل جیسی جگہ پر رہنا بھی وہ خواب ہے جس کی تعبیر ہر ایک کو نہیں ملتی... ایمن کا تمام تر اندازہ غلط ہو گیا تھا۔ شاکر علی کی دہری شخصیت اتنی پُرفریب ہو گی۔ یہ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ کوئی وجہ نہ تھی کہ دستور نے اس کے فیملی بیک گراؤنڈ کے بارے میں جھوٹ بولا ہو۔ دستور جیسا تھا ویسا نظر آتا تھا۔ خرابی تھی تو اس پر اچھائی کا کوئی پردہ نہ تھا۔

موبائل فون کی گھنٹی پر وہ چونکی۔ اسکرین پر نام کسی کا نہیں تھا ایک نمبر تھا جو لاہور کا لگتا تھا۔

''ہیلو...'' اس نے محتاط انداز میں کہا۔

''آپ مس ایمن بول رہی ہیں؟'' کسی نے شائستگی سے انگلش میں پوچھا۔

''جی... آپ کون ہیں؟''

''میں قرش ہوں۔ شاید آپ نے میرا نام سنا ہو۔ ایک بیوٹی پارلر چلاتی ہوں میں... بہت بڑا تو نہیں۔''

''جی مجھے معلوم ہے۔ آپ کا تعلق رہا ہے... شاکر علی صاحب سے۔''

''وہ نہیں مس ایمن، وہ تعلق سے زیادہ کی بات تھی۔ اس نے مجھے پروپوز کیا تھا اور بھروسے پر میں اس کے ساتھ بھی رہی کچھ عرصہ اس کے گھر میں... مجھے ابارشن بھی کرانا پڑا تھا۔''

''یہ سب مجھے بتانے کا کیا مقصد ہے مس قرش۔''

''میں آپ کو بتانا چاہتی تھی کہ کل رات اس نے میرے ساتھ کیا بدسلوکی کی۔ میں اس کے بلانے پر بہت غلط توقعات لے کر گئی تھی۔'' وہ ہسٹریائی انداز میں چلانے لگی۔ ''اس نے مارا مجھے...''

''مارا؟ کس بات پر؟'' ایمن چونکی۔

''اس نے کہا کہ میں ایمن سے شادی کر رہا ہوں اور اسے معلوم نہیں ہونا چاہیے تمہارے میرے تعلق کے بارے میں۔ میں بھڑک گئی۔ میں تو یہ توقع لے کر گئی تھی کہ شاید اب وہ شرمندہ ہو گا۔ مجھے مس کر رہا ہو گا اور شادی کی بات کرے گا۔ میں نے کہا کہ شاکر علی صرف ایمن ہی کو نہیں... اب میں ساری دنیا کو بتاؤں گی۔ مجھے اپنی بدنامی کی فکر نہیں۔ میں تمہاری مہذب شریف اور نیک شخصیت کا بھانڈا پھوڑ دوں گی۔ چوراہے پر ننگا کر دوں گی تمہیں کہ دنیا دیکھ لے اندر سے تم کیسے شیطان ہو۔''

''آئی ایم سوری قرش۔''

''یہی تمہارے ساتھ بھی ہو گا اگر تم اس سے شادی کے چکر میں ہو۔ تمہاری عزتِ نفس دو کوڑی کی ہو جائے گی۔''

"تھینک یو قرش کہ تم نے مجھے خبردار کیا۔ میں نے اس کے بارے میں جو سنا تھا، تم نے اس کی تصدیق کر دی۔ تم اپنا خیال رکھو اور بھول جاؤ اس بات کو... تم خوب صورت ہو اور نامور بھی۔ بہت ملیں گے تمہیں چاہنے والے... سچے اور اچھے لوگ۔"

فون بند ہو جانے کے بعد اچانک بھڑک اٹھنے والے غصے میں اس نے شاکر علی کا نمبر ملا لیا۔

"ہیلو بیوٹی فل... مری میں تمہیں میری یاد آئی... کتنا خوش قسمت ہوں میں۔"

"مسٹر شاکر علی... ابھی قرش کا فون آیا تھا میرے پاس... وہ آپ سے ملنے آئی تھی؟"

"ہاں... اس نے تم سے بات کی؟ وہ بلیک میلر ہے۔"

"آپ نے اس کو مارا تھا گھر بلا کے؟ کیا یہ صحیح ہے؟"

"صحیح ہے۔ مگر کیا اس نے بتایا کہ وہ میرے ہیرے کے کف لنکس چوری کر کے لے جا رہی تھی۔ ٹاپس بنوا کے پہنتی... اور وہ خود آئی تھی میں نے نہیں..."

ایمن نے اس کی بات کاٹ دی۔ "اتنے قیمتی تھے وہ کف لنکس آپ جیسے ارب پتی کے لیے... اس کا تو چھوٹا سا بیوٹی پارلر ہے۔ ان ہیرے کے کف لنکس کے نقصان کا شاک اتنا شدید تھا؟ آپ کا جو بچہ اس کو ضائع کرنا پڑا؟"

فون بند ہو گیا۔ ایمن کا غصے سے برا حال تھا۔ اس نے پانی پیا اور خود کو ٹھنڈا کیا۔ اتنا جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ شخص جیسا ہے ویسا ہی رہے گا۔ بس خدا کا شکر ادا کرو جس نے تمہیں بچا لیا۔ اس کے باوجود ایمن نے کسی سکون آور گولی کی ضرورت محسوس کی۔ نیند اسے آدھی رات کے بہت بعد آئی۔ سونے سے پہلے اس نے تکیے کے نیچے اپنے ریوالور کو چیک کیا۔

صبح اس نے عادت کے مطابق ناشتا کرنے سے پہلے چائے طلب کی اور اخبار کی ضرورت محسوس کی مگر اخبار دستیاب نہ تھا تو اس نے ٹی وی آن کر لیا۔ چائے پیتے ہوئے اس نے ایک ماڈل قرش کے قتل کی خبر سنی جس کو گزشتہ رات ڈاکوؤں نے اس کے گھر میں گھس کے مار دیا تھا۔ اس کے سر، گردن اور سینے میں گولیاں لگی تھیں۔ اس کی رہائش اسی گھر میں تھی جس میں وہ ایک بیوٹی پارلر چلاتی تھی۔ ایمن کو احساس ہی نہ ہوا کہ چائے کا کپ اس کے ہاتھ سے گر چکا ہے۔

☆☆☆

مہرین پر سخت بوریت طاری تھی۔ آخر سارا دن وہ کیا کرے؟ ان درختوں اور نیلے آسمان یا اڑتے بادلوں اور پرندوں کو دیکھتی رہی؟ یا آنٹی ایمن کے ساتھ شام کو مری کے مال کے دو چار چکر لگائے اور وہ کہیں کھانا کھا کے یا بے مقصد شاپنگ کر کے لوٹ آئیں؟ دن بھر ٹی وی پر کارٹون یا فلمیں دیکھنا بھی بیزار کر دیتا تھا۔

وہ اسکول جانا چاہتی تھی۔ پڑھنا چاہتی تھی اور کلاس میں اپنے ہم عمر لڑکیوں سے وہ گپ شپ کرنا چاہتی تھی جو ایمن آنٹی سے نہیں ہو سکتی اور کسی سے نہیں ہو سکتی... بے شک اسے حفاظت کے خیال سے یہاں بھیجا گیا تھا تاکہ وہ ان دونوں شیطانوں سے بھی دور رہے جو اسے ہیروئن دیتے تھے۔ اب اسے یہ طلب بھی نروس کر رہی تھی۔ لیکن یہاں کچھ بھی ملنا ناممکن تھا۔ وہ خود ہیروئن کی عادی بن کے اپنی زندگی تباہ نہیں کر سکتی تھی۔ لیکن احتیاط اور کنٹرول کے ساتھ کبھی دن میں ایک بار اس نشے کا لطف لینے میں کوئی حرج بھی نہیں۔ اسے خود پر کنٹرول حاصل تھا لیکن خطرہ بہر حال تھا کیونکہ کنٹرول بالآخر نہیں رہتا۔

وہ ہوا سے کھل جانے والی کھڑکی بند کرنے اٹھی تو اس نے باہر اندھیرے میں گم ہو جانے والے منظر کا صرف تصور کیا۔ اس وقت نہ درخت نظر آ رہے تھے نہ پہاڑ اور وادی... پھر اسے اندھیرے میں کچھ حرکت محسوس ہوئی۔ اس نے آنکھیں پھاڑ کے دیکھا۔ تاریکی میں دو سائے متحرک دیکھ کے اس کا دل ڈوبنے لگا۔ یہ وہی دونوں شیطان تھے۔ تمام سیکیورٹی اور رازداری کے باوجود وہ یہاں بھی آ گئے تھے۔ ایمن آنٹی کو بتانے میں خطرہ تھا۔ مریم کی طرح وہ بھی ماری جائیں گی۔ کیوں نہ وہ باہر جا کے ان سے پڑیاں لے لے۔ پھر چاہے وہ انہیں فلیش میں بہا دے۔ ان سے بات کرنے میں کیا حرج ہے کہ وہ پڑیاں دیتے رہیں اور پیسے چاہیں تو لیتے رہیں... اس نے کسی کو بھی ان کے بارے میں نہ بتایا ہے اور نہ بتائے گی۔ صرف اسی طرح ایمن بچ سکتی ہے لیکن کیوں نا وہ ان دونوں کا کھیل ہی ختم کر دے۔

وہ کھڑکی کے راستے باہر اتری۔ باہر رات خنک تھی اور ہوا میں نمی بہت زیادہ تھی۔ دو تین گھنٹے میں یہ نمی پھولوں پر اور گھاس پر شبنم بن کر چمکنے لگے گی۔ وہ چپل گھسیٹتی اندھیرے میں آنکھیں پھاڑے دیکھتی رہی۔ وہاں تو کوئی بھی نہیں تھا۔ جہاں اس نے وہ سائے متحرک دیکھے تھے۔

ایک لمبا اور دوسرا چھوٹا... اس نے گاؤن کو کس کے باندھا اور ہاتھ اس کی جیب میں ڈالے کھڑی ہر طرف دیکھتی رہی۔ شاید وہ کہیں چھپ گئے ہوں۔ اچانک اسے ایک شعلہ سا نظر آیا۔ تاریکی کے سیاہ وجود میں روشنی کا ایک تارا چمکا جو چند سیکنڈ میں بجھ گیا مگر اس کا حقیر سا اجالا بھی دو سایوں کو نمایاں کرنے کے لیے کافی تھا۔

وہ پلٹ کے گیٹ کی طرف چل پڑی۔ گیٹ کا لاک اندر سے کھولا جا سکتا تھا۔ اس نے گارڈ کے کیبن میں جھانکا۔ وہ کرسی پر بیٹھا بیٹھا سو گیا تھا۔ بیچارہ... کتنی سخت ڈیوٹی ہے اس کی۔ رات بھر گن لیے بس بیٹھا رہے۔ کرنے کو کام کچھ نہیں۔ نہ کوئی بات کرنے والا نہ ٹی وی۔ باہر آ کے اس نے دیوار کے ساتھ ایک سمت میں چلنا شروع کیا۔ اس کا اندازہ غلط نہ تھا۔ وہ دونوں وہاں موجود تھے۔

☆☆☆

ایمن نے دروازہ کھول کے دیکھا۔ مہرین بیڈ پر نہیں تھی۔ اس کی نظر واش روم کے دروازے پر گئی۔ ''مہرین...'' اس نے ناک کر کے کہا۔ ''تم اندر ہو؟'' اور جواب نہ پا کے دروازہ کھولا۔ وہ اندر نہیں تھی۔ ایمن نے لاؤنج اور ڈرائنگ روم میں دیکھنے کے بعد باہر باغ میں جھانکا۔ مہرین کہیں بھی نہ تھی۔ اسے خطرے کے احساس نے گھیر لیا۔ وہ کچن کی طرف لپکی۔ ''آیا۔'' وہ چلائی۔ ''ایمن بے بی کدھر ہے؟''

حواس باختہ آیا نے پلٹ کے کہا۔ ''اپنے بیڈ پر ہوں گی میڈم... ابھی سو کر نہیں اٹھیں۔''

''بے وقوف، پہلے وہیں دیکھا تھا میں نے۔ وہ گھر میں نہیں ہے۔'' ایمن باہر دوڑی اور پھر پلٹی۔ اپنا ریوالور نائٹ گاؤن کی جیب میں ڈال کے اس نے ایک ہاتھ سے پکڑ لیا۔ گاڑی صاف کرتا محمود بھی ایمن کے سوال پر آنکھیں جھپکانے لگا تو وہ گیٹ کی طرف دوڑی۔ رات کا سیکیورٹی گارڈ صبح آٹھ بجے دوسرے گارڈ کو چارج دیتا تھا ابھی وہ نہیں آیا تھا۔

''گارڈ... بے بی کہاں ہے؟ مہرین۔''

گارڈ نے بوکھلا کے کہا۔ ''اندر ہوں گی میڈم۔''

''اندر ہوتی تو میں تم سے پوچھتی؟ وہ باہر تو نہیں گئی؟''

''نو میڈم۔ وہ باہر کیسے جا سکتی تھیں۔ گیٹ تو لاک ہے اور میں رات بھر یہاں تھا۔'' اس نے کسی وقت پلک جھپک لینے کا ذکر نہیں کیا۔

''یہ کیا ہے؟ دیکھو...'' اس نے گھاس پر نمی میں جوتوں کے نشان دیکھے جو مہرین کے ہی ہو سکتے تھے۔ سبزے سے سیمنٹ کے راستے پر نقش سوکھ چکے تھے مگر غور سے دیکھنے پر نظر آتے تھے۔ ''وہ گیٹ سے باہر گئی ہے صبح صبح... یہ اس کے جوتوں کے نشان ہیں۔ جو شبنم سے بھیگ گئے تھے۔ دیکھو غور سے... وہ گیٹ کھول کے باہر گئی۔ اور تم نے نہیں دیکھا، یو فول... تم سو رہے تھے۔''

''خدا کی قسم میڈم...''

''شٹ اپ... دروازہ کھولو... میں دیکھتی ہوں باہر جا کے وہ کدھر گئی ہے۔'' ایمن باہر نکل گئی۔ کہیں کہیں شبنم ابھی باقی تھی۔ گھنے درختوں سے چھن کر آنے والی دھوپ سڑک کے کنارے لگی گھاس تک ابھی نہیں پہنچی تھی۔ کسی سراغ رساں کی طرح وہ مہرین کے فٹ پرنٹ دیکھتی گئی جو کہیں کہیں نمی کا ہلکا سا دھبا رہ گئے تھے۔ یہ ریسٹ ہاؤس کی باؤنڈری وال کے ساتھ جا رہے تھے۔ کچھ دیر بعد ان کا وجود بھی مٹ جاتا جب نمی دھوپ سے بخارات بن کے اڑ جاتی۔

ایمن کی نظر نے اچانک سڑک سے کچھ فاصلے پر مہرین کے گلابی نائٹ گاؤن کی جھلک دیکھی۔ وہ ایک درخت سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی اور خلا میں دیکھ رہی تھی۔

''مہرین...'' وہ چلائی اور دیوانہ وار لپکی۔ اس کے حلق سے ایک دہشت کی چیخ نکلی۔ مہرین سے چند گز کے فاصلے پر دو لاشیں پڑی تھیں۔ ایک منہ کے بل گرا تھا۔ دوسرا سیدھا لیٹا کھلی آنکھوں سے چیڑ اور دیودار کے بلند قامت درختوں سے بھی اوپر دیکھ رہا تھا۔ ان کا اپنا خون شبنمی گھاس اور جھاڑیوں کے درمیان چمک رہا تھا۔

مہرین نے خالی خالی نظروں سے ایمن کو دیکھا۔ ''میں نے مار دیا ان دونوں کو آنٹی...'' اس نے ایک ہاتھ میں پکڑے ریوالور کو آگے بڑھا دیا۔

ایمن گھٹنوں کے بل اس کے پاس بیٹھ گئی۔ ''یہ... یہ کس کا ریوالور ہے؟''

''ڈیڈی کا... میں ان کے بیڈ روم سے چرا کے لائی تھی۔ وہ میز کی دراز میں رکھتے تھے۔ میں نے سوچا کہ اگر وہ وہاں بھی پہنچے... تو میں انہیں قتل کر دوں گی... اور میں نے کر دیا۔''

''اٹھو، اٹھو مہرین...'' ایمن نے اس کے ہاتھ سے ریوالور لے لیا۔ ''تم نے ہیروئن لی ہے؟''

مہرین نے اقرار میں سر ہلایا۔ اور گاؤن کی جیب سے تین پڑیاں نکالیں۔ ''میں نے کھڑکی سے ان کو دیکھ لیا تھا۔ وہ اندر نہیں آ سکتے تھے۔ لمبے والے نے سگریٹ جلائی نا... تو مجھے لائٹ سی نظر آئی۔''

''اچھا، تم یہ سب کسی کو نہیں بتاؤ گی۔ سنا تم نے... یہ پڑیاں پھینک دو... تم کو بس یہی کہنا ہے کہ تم تو اپنے کمرے سے باہر نہیں آئیں۔ جب ہم واپس جائیں گے نا... تو ڈیڈی کا ریوالور وہیں رکھ دیں گے۔ سن رہی ہو نا میری بات۔''

مہرین نے سر ہلایا اور ٹھٹک کر رک گئی۔ ایک گاڑی ابھی ابھی گیسٹ ہاؤس کے گیٹ سے اندر گئی تھی۔

''مہرین... یہاں... ادھر آؤ۔ اس جھاڑی کے پیچھے۔ جب تک میں نہ آؤں تم یہیں بیٹھی رہو گی... رائٹ۔''

مہرین نے سر ہلایا۔ ''کیا آپ نے بھی انکل شاکر کو دیکھا؟''

ایمن چونکی۔ ''انکل شاکر... یہ ان کی گاڑی تو نہیں تھی۔''

''مگر میں نے دیکھا۔ گاڑی وہی چلا رہے تھے۔''

ایمن کا دماغ اب تیزی سے کام کر رہا تھا۔ یہ مافیا کنگ... راجا اندر... خیبر ایجنسی کا ڈان... صبح صبح اس کا گیسٹ ہاؤس آنا... وہ بھی کسی اور کی گاڑی میں؟ اندر سے ایک فائر کی آواز آئی... پھر دوسرے کی... وہ گیٹ سے پیچھے کی طرف لپکی جہاں پچھلا دروازہ گیلری میں کھلتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی چھوٹا سا باغ تھا جس میں رضیہ اور محمود کچھ ہری مرچیں، ہرا دھنیا اور ٹماٹر وغیرہ لگاتے تھے۔ ایمن نے ابراہیم کا ریوالور گاؤن کی جیب میں رکھ کے اپنا ریوالور مضبوطی سے ہاتھ میں پکڑ لیا اور کچن کے گیٹ کو خاموشی سے کھول کر اندر داخل ہو گئی۔ اسے ایک چکر سا آیا۔ کچن کے فرش پر وہ دونوں نمک خوار ایک دوسرے پر پڑے تھے۔ ان کے زخموں سے نکلنے والا خون ابھی تک ٹائل کے فرش پر بہہ کے سنک کی نالی کی طرف بہہ رہا تھا۔

'نہیں... مجھے بے ہوش نہیں ہونا ہے۔' ایمن نے اپنے سر کو جھٹکا۔ تازہ خون کی بو سے اسے متلی ہو رہی تھی۔ وہ دبے پاؤں کچن سے باہر آئی۔ کاریڈور میں کوئی نہیں تھا۔ لاؤنج سے اس نے شاکر علی کو دیکھا۔ وہ پھر باہر جا رہا تھا۔ ایمن نے دونوں ہاتھ گاؤن کی جیب میں رکھے اور چہرے پر بشاشت طاری کی۔ ''ہیلو شاکر علی...'' اس نے نرمی سے کہا۔

وہ ایک دم پلٹا۔ ''تم...؟ تم کہاں تھیں؟ اندر کیسے آ گئیں؟''

ایمن نے اسے ریوالور نکالنے کی مہلت نہ دی اور ایک ہاتھ گاؤن کی جیب میں سے نکال لیا۔ ''سیدھے کھڑے رہو اپنی جگہ شاکر علی... ورنہ میں رعایت نہیں کروں گی۔''

''رعایت کیسی رعایت...؟'' وہ بدستور پُرسکون اور پُراعتماد نظر آنے کی کوشش کرتا رہا۔

''یہ ہوسکتا ہے کہ میں تم کو نکل جانے دوں۔ اسی گاڑی میں جس میں تم آئے تھے۔ آگے قانون سے نمٹنا تمہارے لیے مشکل نہیں ہوگا۔ یہ سب کیوں کیا تم نے... ان دو غریب ملازموں کو اس لیے قتل کر دیا کہ انہوں نے میرے اور مہرین کے بارے میں بتانے سے انکار کیا ہوگا کہ ہم کہاں ہیں... لیکن اپنے کارندوں کے ذریعے مہرین کو ہیروئن پہنچانے کا مقصد کیا تھا؟''

وہ اسے گھورتا رہا۔ ''میں نہ بتاؤں تو...؟ مس ایمن... تم کیا کرو گی؟''

''میں ساری گولیاں تم پر چلا دوں گی... مسٹر شاکر علی۔''

وہ ہنسا اور بے خوف اور پُراعتماد کھڑا رہا۔ ''میں... ابراہیم کو ذہنی طور پر پریشان رکھنا چاہتا تھا۔ تاکہ وہ کاروبار کو توجہ نہ دے سکے۔ مریم کو قتل کرنے کا مقصد بھی یہی تھا۔ وہ پاگل ہو گیا تھا۔ کاروبار سے اس کی توجہ ہٹ گئی تھی۔ مہرین بھی کسی دن ہیروئن زیادہ لیتی تو مرجاتی۔ ورنہ میں اس کے حلق سے اتار دیتا۔ میں اس کا پارٹنر اسی لیے بنا تھا۔ اس کے کاروبار پر قبضہ کرنے کے لیے... اور میں نے سب سنبھال ہی رکھا ہے۔ مہرین مرجاتی تو ابراہیم پاگل خانے پہنچ جاتا یا خودکشی کر لیتا۔''

''لیکن دستور تو ہے... اس کا جانشین...''

''جانشین... وہ پاگل فنکار... مصور... اسے کیا پتا بزنس کیا ہوتا ہے۔ سب میرے ہاتھ میں ہوتا اور بعد میں بھی وہ بھی مر سکتا تھا کیونکہ ہیروئن وہ بھی استعمال کرتا تھا۔ سب جانتے ہیں۔ اس کو اوورڈوز ہو جاتی ہے۔ ابھی تو وہ ایک فلمی ہیروئن پر مرتا ہے۔ قاتل دونوں ہوتی ہیں۔ ہیروئن بھی اور ہیروئن بھی... ایک نشے سے مارتی ہے دوسری ناز و ادا سے۔'' وہ ہنسا۔ ''فرق صرف زیر زبر کا ہے۔ اسے یقین ہے کہ آج نہیں تو کل تم اسے ہی قبول کرو گی۔ زیر زبر کا شہید بیچارہ فنکار۔''

''زیر زبر کا فرق واقعی کچھ نہیں... جیسے کل اور کل میں فرق نہیں۔ ایک گزرا ہوا دوسرا آنے والا... کیا پتا کوئی جو کل تھا کل نہ ہو...'' ایمن کی نظر نے شیشے میں سے مہرین کو آتا دیکھا۔ اس کا دل بیٹھنے لگا۔ منع کرنے کے باوجود وہ آ گئی تھی۔

اور اس وقت شاکر علی نے بڑی پھرتی سے ریوالور نکالنا چاہا تھا مگر ایمن کے ریوالور سے نکلنے والی گولیوں نے اسے مہلت ہی نہ دی۔ وہ پیچھے گرا۔ ایک دروازے کا شیشہ بکھر گیا تھا۔ وہ اس میں سے باہر جا گرا۔ اسی دروازے سے مہرین اندر آئی۔ اس نے دروازے کے قریب دم توڑتے شاکر علی کو دیکھا اور ایک چیخ مار کے ایمن کی طرف لپکی۔ ''آنٹی... آنٹی... میں نے چاچو کو فون کر دیا ہے۔ وہ آ رہے ہیں۔ ڈیڈی کے ساتھ۔''

''یو آر اے بریو گرل... مہرین...'' ایمن نے کہا اور بے ہوش ہو گئی۔

☆☆☆

ایمن نے فرسٹ فلور پر اپنے کمرے کی کھڑکی کھول کے پائیں باغ میں خوب صورتی سے ایستادہ سرو کے درختوں... فضا میں نمی بکھیرتے فوارے... سبزے کی مہک اور پھولوں کی خوشبو سب کو محسوس کیا۔ صرف اپنے خیال میں... آرام دہ کرسیوں پر وہ مریض بیٹھے تھے جن کو باہر جانے کی اجازت تھی۔

دروازے پر دستک سن کے وہ پلٹی۔ دستور تازہ رنگین پھولوں کا گلدستہ لیے اندر آیا اور اس کے پاس آ کے پھول پیش کرتے ہوئے سرنگوں ہوا۔ اس نے مسکراتے ہوئے پھول لے لیے۔ ''تھینک یو۔''

دستور نے اس کا ہاتھ تھاما اور اسے نیچے لے گیا۔ دھوپ میں بڑی توانائی بخش حرارت تھی۔ کرسی ایک ہی خالی تھی۔ وہ اس کے قدموں میں سبزے پر آلتی پالتی مار کے بیٹھ گیا۔ ''دنیا کا کوئی عظیم ترین مصور بھی تمہارے اس لمحے کے حسن کی بشاشت اور تابانی کو کینوس پر نہیں لا سکتا۔ ابھی وہ رنگ ایجاد ہی نہیں ہوئے۔''

حیا کی شوخی ایمن کی ہنسی میں اتر آئی۔ ''مصور تو تھے جیسے بھی... اب شاعر بن رہے ہو۔''

''دیکھو آگے تمہاری محبت کیا بناتی ہے۔ میں بتا نہیں سکتا کہ آج میں کتنا خوش ہوں۔ جب تم میرے ساتھ جا رہی ہو۔''

''کوئی نہیں بتاتا مجھے کیا ہوا تھا۔ کیا میں بالکل پاگل

ہوگئی تھی۔''
وہ ہنسا۔ ''پاگل تو ہمیشہ سے ہو تم... ورنہ اس چکر میں ہی کیوں پڑتیں۔ تمہارا نروس بریک ڈاؤن ہوگیا تھا۔ تم سوتے میں اٹھ کر بھاگنے کی کوشش کرتی تھیں اور چلاتی تھیں۔ ڈاکٹر نے کمال کیا، صرف دس دن میں۔ تم آج مجھ سے زیادہ نارمل ہو۔''

''کہاں ہے مہرین...''

''وہ تمہارا گھر پر استقبال کرے گی۔ کل سے تیاری میں پاگل ہوئی ہے۔ روز آتی تھی ابراہیم بھائی کے ساتھ۔ بھائی تو کہتے ہیں کہ مہرین کو بچا کے تم نے سب کو بچالیا۔ اپنا سب کچھ دے کر بھی وہ تمہارا احسان نہیں اتار سکتے۔''

وہ کچھ دیر بعد بولی۔ ''دستور! ایک دن وہ آئی تھی۔ حمیرا... اس نے کہا کہ ماما... میں نے اپنا نام بدل کے مہرین رکھ لیا ہے اور وہ میرے پاس بیٹھی رہی۔ میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر... اس نے اپنی آخری سالگرہ والے کپڑے پہن رکھے تھے۔ جاتے وقت وہ کہنے لگی۔ پاپا سے کہیے گا کہ اب مہرین ہوں میں۔ حمیر... نہیں... اور دروازہ کھول کر جانے سے پہلے اس نے میری پیشانی کو چوما۔''

''ایک بات اور بتاؤں؟ مہرین کی ماں صائمہ نے دوسری شادی کر لی ہے۔ ایک ٹیسٹ کرکٹر سے... اور وہ انگلینڈ چلی گئی ہے۔ مہرین کو تمہارے حوالے کرگئی ہے۔ میرا خیال ہے تمہارے ریلیز کے کاغذات تیار ہو گئے ہوں گے۔ چلو...''

وہ دستور کا ہاتھ تھام کے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''یہ تو میں نے پوچھا ہی نہیں... کہ اس کا کیا بنا؟''

''شاکر کا...؟ وہ بھائی نے مری کے ایس پی کو بلا لیا تھا۔ بس اس نے سب سیٹ کر دیا۔ اخبار دیکھنا اس میں ڈکیتی کی واردات کا ذکر ہے۔ انہوں نے رضیہ اور محمود کو بھی مارا... شاکر علی وہاں رات کو ٹھہرے تھے۔ ڈاکو ایک لاکھ نقد لے گئے۔ تمہارا یا مہرین کا کوئی ذکر نہیں۔ جو گارڈ ڈیوٹی پر تھے ان کو یہاں رکھ لیا گیا ہے۔ مرنے والوں کی ایک ہی بیٹی تھی۔ اسے دس لاکھ دے دیے تھے بھائی نے۔ اچھا اب تم بیٹھو گاڑی میں... میں پیپرز سائن کر کے آتا ہوں۔''

وہ پندرہ منٹ اکیلی بیٹھی اس دوسری زندگی کے بارے میں سوچتی رہی۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ فلم کا انٹرول تھا۔ اور انٹرول کے بعد وہیں سے پھر شروع ہوئی ہے تو سب کچھ وہی ہے۔ بس نام بدل گئے ہیں۔ ارشد کی جگہ دستور نے لے لی ہے اور حمیر کی جگہ مہرین نے۔ مگر نہیں... بہت کچھ بدلا بھی ہے۔ یہ شان و شوکت، یہ دولت پر لامحدود تصرف کے اختیارات... یہ سوشل اسٹیٹس...

دستور آ کے بیٹھا تو وہ چونک پڑی۔ وہ پرانی راہگزاروں پر نئی امیدوں اور نئے خوابوں کی تعبیر کے ساتھ چلتی گئی۔ دستور نے کہا۔ ''ہم نے انہیں پکڑ لیا تھا جن کی وجہ سے تمہارے ساتھ ایک حادثہ ہوا تھا۔''

''اور فلم... وہ مکمل ہوگئی۔''

''وہ اب ہو جائے گی... تمہارے ایک شاٹ کا اضافہ رہ گیا ہے۔ کوشش کریں گے کہ شام تک ہو جائے۔ اگر تمہارا شاٹ ہوگیا۔''

وہ پرعزم لہجے میں بولی۔ ''شاٹ میں آج دوں گی بلکہ ابھی... مگر یہ تم جا کدھر رہے ہو؟''

دستور شرارت سے مسکرایا۔ ''اپنے گھر... میرے اور تمہارے گھر۔''

گاڑی ایک دم موڑ کاٹ کے ایک گیٹ میں داخل ہو گئی۔ اندر پورچ تک کے راستے پر رنگین جھنڈیاں غبارے اور پھول سجے ہوئے تھے۔ خوش آمدید اور ویلکم کے بینر جھول رہے تھے۔ وہ دم بخود دیکھتی رہی۔ ابراہیم شاہانی کا گھر کچھ آگے دائیں طرف مگر قریب ہی تھا۔ وہ اور مہرین سامنے گلدستے لیے کھڑے تھے۔

''ویلکم ہوم۔'' ابراہیم آگے بڑھا اور اس نے ایمن کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھا۔

''ہیپی نیو ایئر ماما... ہیپی نیو لائف...'' مہرین نے اس کے گلے لگ کر کہا۔

آنٹی کے بجائے وہ اسے ماما کہہ رہی تھی۔ ایمن کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ''مہرین... نیا سال تو کل شروع ہوگا۔''

''کل تو نئی زندگی شروع ہوگی ہماری ماما...'' وہ بولی۔

''کیسا لگا تمہیں اپنا نیا گھر...؟'' ابراہیم نے کہا۔ ''یہ میری طرف سے تمہاری نئی زندگی کا تحفہ ہے۔''

''جی... تھینک یو... مگر ابھی تو یہ مکان ہے۔ اسے مکان ہی رہنے دیں۔ گھر وہ ہے جہاں میں سب کے ساتھ ہوں گی۔ آپ سب کے ساتھ۔''

دستور سوچتا رہا کہ کیا کوئی مصور گھر اور مکان کے فرق کو رنگوں میں دکھا سکتا ہے۔

شیطانی انڈا

سلیم انور

عمر بھر کی رفاقتیں اس لیے استوار کی جاتی ہیں کہ ایک دوسرے کے دکھ سکھ بانٹیں جائیں... مگر بعض اوقات یہی رفاقتیں آستین کا سانپ بن جاتی ہیں۔ ایک ایسی ہی پیچیدہ کہانی... جہاں طالب و مطلوب یکدم ہی قلابازی کھاگئے...

قاتل کی تلاش اور تفتیش کے دائرۂ کار میں گھومتی جرم و سزا کی دلچسپ کتھا...

''مجھے یقین ہے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ہمیں کیا مشکل درپیش آرہی ہے مسٹر پالسن۔'' سراغ رساں راجر گرین نے کہا۔ ''مسز ڈوروتھی کی موت سنکھیا کی ایک خوراک کھانے سے واقع ہوئی ہے اور ہم نے آپ کے ریفریجریٹر میں چھوٹی مچھلیوں کا ایک مرتبان رکھا ہوا پایا ہے جس کے اوپر سنکھیا کا چھڑکاؤ موجود ہے اور اس مرتبان پر صرف آپ کی انگلیوں کے نشانات موجود ہیں۔ آپ کے پاس اس بارے میں اب بھی کوئی وضاحت ہے؟''

جیرالڈ پالسن نے بمشکل تمام تھوک نگلتے ہوئے اپنے شانے اچکا دیے۔ ''نہیں سر، مجھے خدشہ ہے کہ میں اس بارے میں کوئی وضاحت پیش نہیں کر سکتا۔ لیکن کاش میں کر سکتا۔''

سراغ رساں راجر گرین ابھی کھڑا ہوا تھا۔ وہ تفتیشی کمرے میں جیرالڈ پالسن سے سوالات کر رہا تھا۔ اس نے ایک کرسی گھسیٹ کر میز کے پاس رکھ دی اور اس کی پشت گھما کر اس پر جھک کر کھڑا ہو گیا۔ ''او کے، ایک بار پھر شروع سے سب کچھ بتائیں، مسٹر پالسن۔''

''مجھے جو کچھ یاد تھا وہ میں بتا چکا ہوں۔'' جیرالڈ پالسن نے کہا۔

''لیکن بعض اوقات کسی کہانی کو دوبارہ بتانے سے کوئی ایسی مختلف تفصیل سامنے آجاتی ہے جو آپ کو پہلے بیان کرنا یاد نہ رہی ہو۔'' راجر گرین کی ساتھی سراغ رساں آرین سمرز نے کہا جو خود بھی تفتیشی کمرے میں موجود تھی۔

''جیسا کہ میں نے پہلے بتایا، میں نے ایک پارٹی کا اہتمام کیا تھا۔'' جیرالڈ پالسن نے بیان کرنا شروع کیا۔ ''جن لوگوں کو میں نے مدعو کیا تھا وہ ہمارا وہ گروپ ہے جو آپس میں باری باری پارٹیوں کا اہتمام کرتا رہتا ہے۔ ہم مہینے میں ایک بار یہ پارٹی کرتے ہیں اور ہر ایک کو میزبانی کا شرف حاصل ہوتا ہے۔ یہ ہماری کوئی تنظیم نہیں ہے بلکہ آپس میں صرف ایک مفاہمت ہے کہ ہم میں سے کوئی ایک کسی وقت ایک پارٹی کا انعقاد کرے گا۔ میں نے کافی عرصے سے کسی پارٹی کی میزبانی نہیں کی تھی سو میں نے معمول سے ہٹ کر پارٹی کرنے کا فیصلہ کیا۔''

''وہ معمول کیا ہے؟'' آرین سمرز نے پوچھا۔

''ہم عام طور پر طے شدہ تعطیلات کا انتخاب کرتے ہیں جب وہ نزدیک ہوتی ہیں۔ جیسے کوئی چار جولائی امریکا کے یوم آزادی کا انتخاب کرتا ہے تو کوئی کرسمس کا۔ ہیلووین بھی آنے والا تھا۔ لیکن یہ تہوار سب کے علم میں ہوتے ہیں۔ میں کچھ مختلف کرنا چاہتا تھا۔ میں نے انٹرنیٹ پر تلاش کیا تو پتا چلا کہ دو نومبر کو نیشنل ڈیولڈ ایگ ڈے منایا جاتا ہے۔ لہٰذا میں نے فیصلہ کیا کہ میں دو نومبر کو پارٹی کا اہتمام کروں گا اور نیشنل ڈیولڈ ایگ ڈے کا تہوار مناؤں گا۔ میں نے چار درجن اور دو انڈے ابال لیے اور کچھ مزید بھی تیار رکھے کیونکہ مجھے اندازہ تھا کہ ان میں چند خراب بھی نکل سکتے ہیں اور نکلے۔ میں نے مختلف قسم کے تیز مسالوں میں تیار کردہ اُبلے ہوئے انڈوں کی ریسیپی بھی ڈھونڈ نکالی تھی۔ اس طرح میں نے سات مختلف ملکوں کی اُبلے ہوئے انڈوں کی اور ایک اپنے امریکا کی اسپیشل ڈشیں تیار کرلیں۔ اس طرح یہ بھی پتا چل گیا کہ کئی مختلف ملکوں میں اسپیشل ڈیولڈ انڈے تیار کیے جاتے ہیں۔''

''اچھا کون سا ملک اُبلے ہوئے انڈوں پر چھوٹی مچھلیاں ڈالتا ہے؟'' سراغ رساں راجر گرین نے پوچھا۔

''درحقیقت وہ اہم ملک سویڈن ہے جہاں انڈوں پر چھوٹی مچھلیاں ڈالی جاتی ہیں لیکن میں نے انہیں استعمال نہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ ان لوگوں کے ساتھ اتنا عرصہ گزارنے کے بعد مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ وہ کیا پسند اور کیا ناپسند کرتے ہیں۔ صرف ایک فرد ایسا تھا جو کسی بھی چیز پر چھوٹی مچھلیوں کو پسند کرتا تھا اور وہ ڈوروتھی ہیٹفیلڈ تھی جس کی موت واقع ہوئی ہے۔ میں نے اسے ایک بار اپنے پزا پر چھوٹی مچھلیوں کا آرڈر دیتے ہوئے سنا تھا۔''

''کورونر کا کہنا ہے کہ جب اس نے ڈوروتھی کی لاش کا معائنہ کیا تو اس کے پیٹ میں چھوٹی مچھلیاں پائی گئیں۔ آپ اس کی وضاحت کس طرح کریں گے؟''

''میں وضاحت نہیں کر سکتا۔'' جیرالڈ پالسن نے نظریں جھکاتے ہوئے کہا۔ ''میں تو اس بات کی بھی کوئی وضاحت نہیں کر سکتا کہ چھوٹی مچھلیوں کا وہ مرتبان میرے ریفریجریٹر میں کس طرح پہنچا اور یہ تو دور کی بات ہے کہ اس پر میری انگلیوں کے نشانات کیوں کر موجود ہیں۔ ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ انگلیوں کے نشانات اس وجہ سے آئے ہوں کہ میں نے اس مرتبان کو کسی اور شے کو رکھنے کے لیے کھسکایا ہو یا کسی اور مرتبان یا کوئی اور شے کی تلاش میں اسے باہر نکال کر دوبارہ ریفریجریٹر میں رکھ دیا ہو۔ میرے پاس مختلف قسم کے مرتبانوں کا ایک ڈھیر تھا جو پارٹی کے بعد باقی بچ رہے تھے اور وہ اشیا عام طور پر نہیں خریدتا۔ ہوسکتا ہے کہ اس طرح میری انگلیوں کے نشانات ان مرتبانوں پر آگئے ہوں جنہیں میں نے ریفریجریٹر میں محفوظ رکھ دیا تھا۔''

''ایک بار پھر سے اس بات کی وضاحت کریں کہ آپ نے ایس ہارڈویئر سے سنکھیا کی تھوڑی سی مقدار کیوں خریدی تھی؟''

''میں پہلے بھی بتا چکا ہوں۔ میری اپارٹمنٹ بلڈنگ کے بیسمنٹ میں چوہے ایک مسئلہ بنے ہوئے تھے۔ میرے اسٹوریج یونٹ میں موجود سامان کو یہ چوہے تباہ و برباد کر رہے تھے اور بلڈنگ کا منیجر اس مسئلے کو حل

کرنے میں کوئی زیادہ تُندہی سے کام نہیں لے رہا تھا۔ سو میں نے یہ معاملہ اپنے طور پر حل کرنے کا سوچا۔ کسی نے مجھے بتایا تھا کہ سنکھیا چوہوں سے نجات کا بہترین حل ہے، سو میں نے خرید لیا۔''

''اور وہ 'کسی' کون تھا؟''

''ایمان داری سے مجھے صحیح یاد نہیں کہ وہ مشورہ کس نے دیا تھا۔ غالباً ان ہی میں سے کوئی تھا جن کے ساتھ میرا ملنا جلنا ہے۔ شاید کوئی عورت رہی ہوگی۔'' جیرالڈ پالسن نے کہا۔

''سو آپ نے چھوٹی مچھلیاں تو نہیں خریدی تھیں لیکن سنکھیا ضرور خریدا تھا؟'' سراغ رساں نے کہا۔

جیرالڈ پالسن نے ایک لمبا سانس لیا اور بولا۔ ''جی ہاں۔''

''کیا آپ کسی ایسے سے واقف ہیں جو ڈوروتھی ہیٹفیلڈ کو نقصان پہنچانا چاہتا تھا؟''

''بدقسمتی سے نہیں۔''

سراغ رساں راجر گرین اور اس کی ساتھی آئرین سمرز ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ ''فی الحال تو ہم آپ کو گھر جانے کی اجازت دے رہے ہیں مسٹر پالسن۔ لیکن آپ کو شہر چھوڑ کر جانے کے بارے میں قطعی نہیں سوچنا ہے۔''

''نو پرابلم۔''

''ایک اور بات مسٹر پالسن..... آپ اس پارٹی کے شرکاء میں واحد فرد ہیں جو مسز ڈوروتھی کی موت کے اسباب کے بارے میں جانتے ہیں۔ ہمیں آپ کو اس لیے بتانا پڑ گیا کہ حالات ہی کچھ ایسے تھے۔ لیکن ابھی تک اس کے شوہر کو بھی اس کی موت کا سبب معلوم نہیں ہے۔ وہ اب بھی یہی سمجھ رہا ہے کہ اسے دل کا دورہ پڑا تھا جس کے سبب اس کی موت واقع ہوئی ہے۔ ہم نے اسے بتایا کہ ہمیں ابھی تک موت کے اسباب کے بارے میں کورونر کی رپورٹ موصول نہیں ہوئی ہے۔ سو اس بات کو آپ اپنی ذات تک محدود رکھنا۔ اگر یہ بات ہم نے کسی اور کے منہ سے سنی تو ہم سمجھ جائیں گے کہ آپ نے انہیں بتایا ہے اور یہ بات آپ کے حق میں اچھی نہیں ہوگی۔''

''جی ہاں، یقیناً۔''

جیرالڈ پالسن کے جانے کے بعد راجر گرین اور آئرین سمرز اپنی اپنی میزوں پر جا بیٹھے۔

'' اس شخص کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟'' راجر گرین نے پوچھا۔

''مجھے تو حقیقت میں معقول شخص لگتا ہے۔ میں اس کی بات پر یقین کرنے کے لیے تیار ہوں۔ وہ اس قسم کا آدمی قطعی نہیں لگتا کہ کسی کو قتل کر سکتا ہو اور پھر اس کا جواز کیا تھا؟ ہم ہر اس فرد سے بات کر چکے ہیں جو پارٹی میں موجود تھا۔ ان میں سے کسی کے بھی پاس ڈوروتھی ہیٹفیلڈ کو قتل کرنے کا جواز نہیں ہے۔''

''ابھی تک ہمیں صرف موقع اور طریق کار کے بارے میں پتا چلا ہے اور اس کے سوا کچھ نہیں۔ کوئی چھوٹی مچھلیوں کا مرتبان لے کر پارٹی میں آیا تھا، اس میں سے کچھ اس نے ایک اسپیشل ڈش کے انڈے پر ڈال دیں اور مرتبان ریفریجریٹر میں رکھ دیا۔ جیسا کہ جیرالڈ پالسن کا کہنا ہے، اس نے مرتبان کو کھسکایا ہوگا جس کی وجہ سے مرتبان پر اس کی انگلیوں کے نشانات ثبت ہو گئے لیکن قاتل کو یہ کیسے پتا تھا کہ ڈوروتھی ہیٹفیلڈ اسی مخصوص انڈے کو کھائے گی جس پر اس نے سنکھیا آمیز مچھلیاں رکھی تھیں؟''

''ہوسکتا ہے کہ وہ زہریلا انڈا ڈوروتھی..... کے لیے ہی نہ ہو۔ ہوسکتا ہے کہ ڈوروتھی نے وہ انڈا غلطی سے کھا لیا ہو اور قاتل دوبارہ کوشش کرنے کا ایک اور چانس نہ لینا چاہتا ہو؟''

سراغ رساں راجر گرین نے یہ سن کر اپنا پین اپنی میز پر اچھال دیا۔ ''ہوں' یہ خیال مددگار ثابت ہوسکتا ہے۔''

آئرین سمرز نے وہ فائل اٹھالی جس پر انہوں نے گفتگو شروع کی تھی۔ ''دیکھو، ہمیں ابھی تک جو بھی کچھ پتا چلا ہے اس کو دہراتے ہیں۔ شاید کوئی اور چیز کلک کر جائے۔ کوشش کرتے ہیں۔''

''اوکے۔''

''ہم جانتے ہیں کہ اس گروپ کے بیشتر لوگ خاصے دولت مند ہیں ان میں سے چار کی ملازمت ایسی ہے کہ یہ ہر بدھ کی سہ پہر چھٹی کر لیتے ہیں اور گالف کھیلتے ہیں اور تقریباً یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایک صحیح سیاسی گروپ بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ آٹھ جوڑے ہیں جن میں سے ایک جوڑا سیاہ فام ہے۔ دو جوڑے ہم جنس پرست مردوں اور ہم جنس پرست عورتوں کے ہیں۔ باقی پانچ جوڑے سفید فام ہیں اور جہاں تک مجھے معلوم ہے وہ راستی پر ہیں۔ ان میں بیشتر ایک ہی چرچ میں جاتے ہیں۔ لگتا ہے ان کی آپس میں ملاقات وہیں ہوئی تھی۔ ان میں سے ایک شخص اور دو خواتین بدھ کی سہ پہر چرچ میں بائبل اسٹڈی گروپ اٹینڈ کرتے ہیں اور عورتوں میں سے پانچ نے ایک بک کلب بنایا ہوا ہے جہاں منگل کی رات وہ ملاقات کرتی ہیں۔''

اتنے میں آفیسر جینٹ مارشل ان کی میزوں کے پاس

آ گئی۔ ''تمہیں فون کمپنی سے جو معلومات درکار تھیں وہ یہ رہیں۔ جیسا کہ توقع تھی ان میں سے بیشتر خواتین ہر ہفتے ایک دو بار ایک دوسرے کو فون ضرور کیا کرتی ہیں جبکہ گالف کھیلنے والے مرد ایک دوسرے کو شاذونادر ہی فون کیا کرتے ہیں۔ میں نے ان کے کنٹری کلب سے بھی رابطہ کیا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ ان کا ہر بدھ کی سہ پہر گالف کھیلنے کا وقت طے شدہ ہے اور وہ اس پر پابند رہتے ہیں۔ البتہ ایک دلچسپ بات سامنے آئی ہے۔''

''اوہ؟''

''ہاں، ہر منگل کو مائک اپسن، مسز ڈوروتھی کو فون کیا کرتا تھا۔ پھر وہ ایک اور نمبر پر فون کرتا تھا لیکن ہمیشہ مسز ڈوروتھی کو فون کرنے کے فوراً بعد۔''

''تم نے دوسرے نمبر کو چیک کیا؟''

''ہاں، وہ اسپرنگ ٹاؤن میں کیلرز موٹیل کا نمبر ہے۔''

راجر گرین نے اپنی فائل میں دیکھا اور بولا۔ ''مائک اپسن ایک ڈینٹسٹ ہے جو بدھ کے روز اپنا کلینک بند رکھتا ہے۔ اس کی بیوی سہ پہر کو بائبل اسٹڈی کے لیے چرچ چلی جاتی ہے اور مسٹر ہیٹفیلڈ بدھ کی سہ پہر باقاعدگی سے اپنے گروپ کے ہمراہ گالف کھیلتا ہے۔''

''سو مائک اپسن کی بیوی کو اس معاشقے کا پتا چل گیا اور اس نے اپنے شوہر کی محبوبہ کو ٹھکانے لگا دیا؟''

''میں شوہر کو دوش دوں گی۔'' آفیسر جینٹ مارشل نے کہا۔

''میں بھی۔'' سراغ رساں آرین سمرز نے تائید کی۔

سراغ رساں راجر گرین نے فائل کے ایک صفحے کی جانب اشارہ کیا اور بولا۔ ''دیگر دو خواتین نے ہمیں جو بتایا ہے اس کے مطابق جس واحد فرد کو انہوں نے بوفے کی میز پر سے جاتے ہوئے دیکھا تھا وہ ڈینٹسٹ کی بیوی مسز اپسن تھی۔ ان کا کہنا ہے کہ مسز اپسن نے اپنا پرس اٹھایا تھا اور پاسن کے کچن کے برابر میں بنے ہوئے ...... باتھ روم میں چلی گئی تھی۔ دونوں نے بس یہی خیال کیا تھا کہ مسز اپسن کو مخصوص زنانہ پرابلم درپیش ہوگا۔ البتہ یہ بات انہیں اس لیے یاد رہ گئی تھی کہ ان میں سے ایک نے اس بارے میں ایک فقرہ بھی کسا تھا کہ وہ 'دی گولڈن گرلز' کے ٹی وی پروگرام کی اسٹیل گیٹی کے مانند اداکاری کر رہی ہے۔''

''یا شاید اس کے پرس میں چھوٹی مچھلیوں کا مرتبان رہا ہو اور واپس آنے سے پہلے اس نے وہ مرتبان ریفریجریٹر میں رکھ دیا ہو۔'' آرین سمرز نے کہا۔

''ہمیں مسٹر مائک اپسن اور اس کی بیوی کو یہاں لانے کی ضرورت ہوگی تاکہ ان کے ساتھ ایک اور مرتبہ بات چیت کر لی جائے۔'' راجر گرین نے کہا۔

جب اس جوڑے کو پولیس اسٹیشن لایا گیا تو انہیں الگ الگ تفتیشی کمروں میں رکھا گیا۔ راجر گرین مائک اپسن کے پاس چلا گیا جبکہ آرین سمرز اس کی بیوی برتھا کو ساتھ لے گئی۔

''اوکے، مائک، بات یہ ہے کہ ہم اس معاملے پر پہلے بھی گفتگو کر چکے ہیں لیکن میں چاہتا ہوں کہ تم ابتدا سے دوبارہ شروع ہو جاؤ اور مجھے اس ڈیولڈ ایگ پارٹی کی مکمل روداد سنانا شروع کر دو جو پیر کی شب منعقد ہوئی تھی۔''

''لیکن تم نے ابھی تو کہا کہ ہم اس پر پہلے ہی گفتگو کر چکے ہیں۔''

''ہاں، لیکن بعض اوقات لوگوں کو ایسی مختصر باتیں یاد آ جاتی ہیں جو وہ پہلی مرتبہ بتانا بھول گئے ہوتے ہیں۔ میں ایک بار پھر جاننا چاہتا ہوں۔ تم ابتدا سے شروع ہو جاؤ۔''

ہال کے تیسرے کمرے میں سراغ رساں آرین سمرز نے بھی الفاظ برتھا اپسن کے سامنے دہرا دیے۔

''یہ تو نرا احمق پن ہے۔'' برتھا اپسن نے کہا۔ ''ہماری یہ مختصر سی پارٹیاں زمین پر لرزہ طاری کر دینے والی نہیں ہوتیں۔ میرے پاس ایسا کوئی بھونڈا آئیڈیا نہیں جو مجھے اب یاد آ جائے جس سے تمہیں یہ اندازہ لگانے میں کوئی مدد مل سکے کہ ڈوروتھی ہیٹفیلڈ کو کس نے قتل کیا ہے۔''

''ہم وثوق سے نہیں کہہ رہے کہ اسے قتل کیا گیا ہے۔''

تم یہ بات کیسے کہہ رہی ہو؟''

برتھا نے بے ساختہ قہقہہ لگایا۔ ''درست! اگر اسے قتل نہیں کیا گیا ہے تو پھر تم ہومی سائڈ کے سراغ رساں اس معاملے میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی کیوں لے رہے ہو؟''

''ہم ہر موت کو ہومی سائڈ کے طور پر برتتے ہیں جب تک کہ اس کی نوعیت مختلف ثابت نہ کر سکیں۔''

''اوہ۔''

ادھر پہلے تفتیشی کمرے میں مائک اپسن سراغ رساں راجر گرین کو یہ بتا رہا تھا کہ وہ جب بھی کہیں باہر جانے کی تیاری کر رہے ہوتے ہیں تو کس طرح اس کی بیوی ہمیشہ دیر کر دیتی ہے۔

''اس کی دیر سے تیار ہونے کی عادت جو کہ تمہارے کہنے کے مطابق کوئی غیر معمولی بات نہیں، کیا اس کے علاوہ

پیر کی شب کوئی غیر معمولی بات رونما ہوئی تھی؟''

''دیکھو سراغ رساں، یہ پارٹیاں روزمرہ کی زندگی کا ایک معمول سمجھی جاتی ہیں۔ ہم سب کو اپنے اپنے کام کرنے ہوتے ہیں اور میرے کام میں ایسا کچھ کم ہی ہوتا ہے جو پارٹی میں موجود دیگر مردوں کے لیے کسی دلچسپی کا باعث ہو۔''

''سو تم لوگ پارٹی میں عام طور پر مردوں اور عورتوں کا علیحدہ گروپ بنا لیتے ہو؟''

''ہاں، میرا تو یہی خیال ہے۔''

☆☆☆

''ہم سات بجے کے کچھ ہی بعد وہاں پہنچے تھے۔ ہم سے پہلے ہی وہاں موجود ہر کوئی کاک ٹیل لیے ہوئے تھا۔ ہم نے بھی ایک جام لے لیا ہے۔ پھر جیرالڈ نے ڈائننگ روم ٹیبل پر کھانا سجانا شروع کر دیا۔'' برتھا بتا رہی تھی۔

''تو پھر تم سب لوگ کھانے کے لیے میز پر بیٹھ گئے تھے؟''

''نہیں، ہم عام طور پر ایسے موقعوں پر کھڑے ہی رہتے ہیں۔ ہم کسی قسم کے تکلفات سے کام نہیں لیتے۔ ہم تمام کھانے سب سے بڑی دستیاب میز پر رکھ دیتے ہیں۔ پھر اپنی اپنی پلیٹیں بھر لیتے ہیں اور پھر کھڑے رہتے ہیں یا کسی کو بیٹھنا ہوتا ہے تو بیٹھنے کی کوئی جگہ تلاش کر لیتا ہے۔''

''کیا تمہیں یاد پڑتا ہے کہ جب تم سب لوگ کھا رہے تھے تو کسی کو ڈائننگ روم سے باہر نکلتے ہوئے دیکھا ہو؟'' سراغ رساں آئرین سمرز نے پوچھا۔

''نہیں، لیکن مجھے یقین ہے کہ میں ہر کسی کی ٹوہ لینے کی کوشش میں مصروف نہیں تھی۔'' برتھا نے جواب دیا۔

☆☆☆

''جب تم سب لوگ کھانا کھا رہے تھے تو کیا تم نے کسی کو ڈائننگ روم سے باہر جاتے ہوئے دیکھا تھا؟'' سراغ رساں راجر گرین نے مائنگ ایسن سے سوال کیا۔

''یہ میرا کام نہیں تھا کہ ہر ایک پر نگاہ رکھوں۔ البتہ مجھے یاد پڑتا ہے جو واحد فرد جسے میں نے باہر جاتے ہوئے دیکھا تھا، وہ میری بیوی تھی۔ وہ باتھ روم گئی تھی۔''

''اس کے سوا اور کوئی باہر نہیں گیا تھا؟''

''جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے اور کوئی نہیں گیا تھا۔'' مائنگ ایسن نے جواب دیا۔ اس کی آواز کا سر قدرے بلند ہو گیا۔ اس نے سر ہلا دیا۔

''یعنی ہر کوئی کھڑا کھاتا رہا اور مختصر گفتگو کرتا رہا؟''

''اس نوعیت کی پارٹیوں میں عموماً ایسا ہی ہوتا ہے سراغ رساں گرین۔'' مائنگ ایسن نے میز پر انگلی مارتے ہوئے کہا۔

''کیا تم نے کسی عورت سے بھی بات کی تھی؟''

کرسی پر بیٹھے ہوئے مائنگ ایسن کا جسم تن گیا اور اس کی سانسیں تیز ہو گئیں۔ ''میرا خیال ہے، یقیناً کی تھی۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟''

سراغ رساں راجر گرین نے قدرے توقف کیا، پھر مائنگ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بولا۔ ''یہ سوچ کر کہ تم اگلے روز فون کرنے کی زحمت سے بچ جاؤ گے؟''

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟''

''صرف یہ سوچ رہا ہوں کہ کیا تمہاری ڈورو تھی سے کوئی بات چیت تھی؟''

اس بات پر مائنگ ایسن اپنی کرسی پر ڈوبک گیا اور فرش کو گھورنے لگا۔ ''تمہیں کیسے پتا چلا؟''

''کیا پتا چلا؟''

''کم آن! میرے ساتھ بلی چوہے کا کھیل مت کھیلو۔''

''چلو اس طرح صاف بات کرتے ہیں۔ تم اپنے سیل

موجد

بہت سے ملکوں کے ماہرین جمع تھے اور اپنے اپنے ملک کی سرخروئی کے لیے اپنی ایجادات پیش کر رہے تھے۔ امریکی، روسی، فرنچ، جرمن، برطانوی اور اطالوی ماہرین کے نمونے دیکھ کر سب حیران ہو رہے تھے۔ یہ کہنا مشکل تھا کہ ان میں کون سب سے آگے ہے۔ آخر میں ایک جاپانی نے بال سے بھی پتلی ایک نلکی پیش کر کے گویا میدان مار لینے کا ارادہ کیا۔

شیشے کی اس نلکی کو سب نے دیکھا اور اس کی تعریف کیے بغیر نہ رہ سکے۔ سب کے ہاتھوں سے گزرتی ہوئی، وہ نلکی آخر میں پاکستانی مندوب کے پاس پہنچی۔ وہ عینک لگائے کئی منٹ تک اسے الٹ پلٹ کر دیکھتا اور کھرچتا رہا پھر اس نے مسکراتے ہوئے وہ نلکی جاپانی کو پکڑا دی۔

بھن بھن شروع ہوئی اور طے پایا کہ جاپانی کی ایجاد سب سے بہتر اور برتر ہے۔ پاکستانی نے پُرزور احتجاج کرتے ہوئے مطالبہ کیا کہ جاپانی کی نلکی کو بہت غور سے دیکھا جائے۔

دیکھا گیا تو اس نلکی پر MADE IN PAKISTAN لکھا جا چکا تھا۔

ڈھاکا سے خرم علیم کا تعاون

فون میں سے اپنی فون کالز کا ریکارڈ ڈیلیٹ کر سکتے ہو لیکن کمپنی کے پاس ریکارڈ محفوظ ہوتا ہے۔ کیا کیلرز موٹیل والے تمہیں بطور مستقل مہمان کسی قسم کا ڈسکاؤنٹ دیتے ہیں؟''

مائک ایپسن براہِ راست سراغ رساں کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔ ''چاہے یہ بات کتنی ہی احمقانہ لگے لیکن میں اب بھی برتھا سے محبت کرتا ہوں۔ اس کے باوجود بھی کہ میرا افیئر چل رہا تھا۔ کیا یہ معلومات میری بیوی تک پہنچانا ضروری ہوں گی؟''

''فی الحال تو ضروری نہیں لیکن اگر اس کیس کا حصہ بن گئیں تو پھر مجبوری ہوگی۔''

مائک ایپسن نے اچانک اپنے ہاتھ اپنے چہرے پر رکھ لیے۔ ''اوہ، مائی گاڈ! تو یہ چھوٹی مچھلیاں تھیں، ہے نا؟ اسے میں نے مار ڈالا تھا۔''

''مجھے حقیقت میں معلوم نہیں۔ تم ہی مجھے بتاؤ۔ تم نے وہ چھوٹی مچھلیاں کہاں سے حاصل کی تھیں؟''

☆☆☆

''سو تمہاری ان سب لوگوں سے اچھی دوستی تھی؟'' سراغ رساں آرین سمرز نے برتھا سے پوچھا۔

''اچھی' کی وضاحت کرو گی؟''

''میرا خیال ہے تم سمجھتی ہو کہ میرا کیا مطلب ہے۔''

''جب ہمیں ڈوروتھی ہیٹفیلڈ کے مرنے کی خبر ملی تو میری نیند زیادہ نہیں اڑی تھی۔''

''وضاحت کی زحمت کرو گی؟''

برتھا نے اپنی انگلی کے لمبے ناخن میز کی سطح پر ہلکے سے رگڑے اور بولی۔ ''ضروری نہیں ہے۔''

''پارٹی میں شریک کسی اور سے کوئی شکوہ شکایت؟''

''میرے خیال سے یہ ڈون اور لوئسی کے لیے خاصی احمقانہ بات تھی کہ وہ انہیں ڈیولڈ انڈوں کے بجائے اینجل انڈے کہہ رہے تھے کیونکہ وہ کسی بھی شے کو شیطان کے حوالے سے منسلک نہیں کرنا چاہتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ وہ اپنے مذہبی عقائد میں کچھ زیادہ ہی آگے نکل جاتے ہیں۔''

☆☆☆

مائک ایپسن اٹھ کھڑا ہوا اور کمرے میں ٹہلنا شروع کر دیا۔

''جب برتھا باتھ روم سے واپس آئی تو وہ کچن میں سے چند تازہ انڈے بھی لے آئی تھی۔ اس نے چند انڈے کھائے اور پھر پلیٹ مجھے تھما دی۔ اس نے کہا کہ اس کا پیٹ بھر گیا ہے۔ میں نے غور کیا کہ ان دو نیم انڈوں میں سے ایک پر چھوٹی مچھلیاں رکھی ہوئی تھیں۔ میں انہیں کھا سکتا تھا لیکن وہ مجھے مرغوب نہیں تھیں۔ مجھے درحقیقت اس وقت اطمینان ہوا تھا جب میں نے پہلی بار میز پر موجود کھانے کی ڈشز کو دیکھا تھا اور کسی بھی انڈے پر چھوٹی مچھلیوں کو موجود نہیں پایا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ برتھا نے چھوٹی مچھلی کی ٹاپنگ والے انڈے کہاں تلاش کر لیے تھے۔ اس دوران میں نے ڈوٹ کو دیکھ لیا۔ میں ڈوروتھی ہیٹفیلڈ کو ڈوٹ کہہ کر پکارتا تھا۔ وہ سب سے الگ تھلگ بیٹھی ہوئی تھی۔ میں اس بات کی تصدیق کرنے کے لیے اس کے پاس چلا گیا کہ کیا وہ بدھ کی سہ پہر مجھ سے ملاقات کے لیے تیار ہے۔ جب اس نے انڈے پر چھوٹی مچھلی کی ٹاپنگ دیکھی تو پوچھا کہ یہ مجھے کہاں سے ملا ہے۔ اس نے کہا کہ اسے چھوٹی مچھلیوں سے بے حد رغبت ہے لیکن اسے میز پر یہ ڈش کہیں دکھائی نہیں دی۔ میں نے وہ انڈا اسے پیش کیا تو اس نے خوشی خوشی لے لیا۔'' مائک ایپسن یہ کہہ کر میز کے پاس رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا اور اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا۔

پھر چونکتے ہوئے بول پڑا۔ ''اوہ گاڈ! وہ انڈا میرے لیے تھا، ہے نا؟''

''ہوسکتا ہے۔ لیکن کیوں؟'' سراغ رساں راجر گرین نے پوچھا۔

''یہ ہم دونوں کی دوسری شادی ہے۔ میں نے برتھا سے شادی سے قبل بڑا مضبوط قسم کا معاہدہ کیا تھا۔ اگر ہمارے درمیان طلاق ہوگئی تو اسے عملاً کچھ بھی نہیں ملے گا۔ اگر میں مر جاتا ہوں تو سب کچھ اسی کا ہوگا۔'' مائک ایپسن نے بتایا۔

''میں ابھی واپس آتا ہوں۔'' سراغ رساں راجر گرین نے کمرے سے تیزی سے نکلتے ہوئے کہا۔

وہ سیدھا تفتیشی کمرا نمبر چار میں چلا گیا جہاں اس کی ساتھی سراغ رساں آرین سمرز برتھا ایپسن کے ساتھ موجود تھی۔

راجر گرین نے کمرے میں داخل ہوتے ہی برتھا کو مخاطب کیا۔ ''برتھا ایپسن، میں تمہیں اقدامِ قتل اور دوسرے جرم پر خود کو اکسانے کے الزام میں حراست میں لے رہا ہوں۔ تمہیں خاموشی اختیار کرنے کا حق حاصل ہے۔''

یہ سنتے ہی سراغ رساں آرین سمرز نے برتھا کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پہنا دیں جس پر سکتے کی سی کیفیت طاری ہوچکی تھی۔

قصبوں اور گاؤں کی خوشگوار فضائیں کبھی کبھی اس طرح آلودہ ہو جاتی ہیں کہ جسم و جاں شل ہو جاتے ہیں... ایک چھوٹے سے گاؤں میں کام کرنے والے مزدوروں کے روز و شب... ایک دوسرے کے ساتھ کام کرنے کے ساتھ وہ دکھ سکھ میں بھی شریک تھے... مگر اچانک ہی ایک لڑکی کی آمد نے ان سب کو پریشان اور منتشر کردیا...

ایک ہی جرم میں الجھے ہوئے کئی مجرموں کی شراکت داری کا پرافسوں ماجرا...

تنویر ریاض

احساسِ جرم

وہ جمعے کی ایک گرم صبح تھی جس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ دن میں مزید گرمی پڑے گی۔ میں بیکنگ پاؤڈر کا باکس کھول کر اس میں سے ڈبے نکال کر شیلف میں رکھ رہا تھا جب میں نے کمپنی اسٹور کا بیرونی دروازہ زور سے بند ہونے کی آواز سنی۔ میں نے اپنے کتے بوسٹر کی طرف دیکھا جو راہداری کے فرش پر سو رہا تھا۔ اس نے اپنی ایک آنکھ کھولی اور کچھ سننے کی کوشش کرتا رہا۔ جب اسے یقین ہوگیا کہ کوئی ہنگامی صورتِ حال نہیں ہے تو اس نے دوبارہ آنکھ

بند کرلی۔ میں بھی اپنے کام میں لگ گیا۔
''بے شرم، آوارہ لڑکی...!'' کسی نے زور سے چلّاتے ہوئے کہا۔
''اوہ۔'' میں نے وہ باکس بند کردیا جو تھوڑی دیر پہلے کھولا تھا اور اسے راستے سے ہٹا کر ایک طرف کردیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ کوئی اس سے ٹھوکر کھا کر اپنی ٹانگ تڑوا بیٹھے۔ جیسا کہ میرے ساتھ ہوا تھا اور میں ابھی تک لنگڑا کر چل رہا تھا۔ میں احتیاط سے سیڑھیاں اترتا ہوا اسٹور میں گیا۔ وہاں اس وقت بہت کم گاہک تھے۔ جیمز ہیریسن کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا۔ وہی اس اسٹور کا انچارج تھا اور میری مما کے بورڈنگ ہاؤس میں رہا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ اس کی ایک اضافی ذمے داری یہ بھی کہ وہ مل کا کانسٹیبل بھی تھا۔
''ہم یہاں کوئی جھگڑا نہیں چاہتے۔'' وہ دو عورتوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہہ رہا تھا جو ایک دوسرے کو کھا جانے والی نظروں سے گھور رہی تھیں۔
جولیا سمپسن نے سبز لباس پہن رکھا تھا اور سر پر زرد رنگ کا اسکارف باندھا ہوا تھا جس پر سبز بتیاں بنی ہوئی تھیں۔ میں اسٹاک بوائے ہونے کے ناتے اپنے اسٹور میں دستیاب اشیا سے واقف تھا اور جانتا تھا کہ یہ اسکارف ہمارے اسٹور کا نہیں لہٰذا میں سوچنے لگا کہ جولیا نے یہ اسکارف کہاں سے لیا ہوگا۔ اس گاؤں کے سب لوگ اپنی ضرورت کی تمام اشیا کمپنی کے اسٹور سے ہی خریدتے تھے اور ان کی قیمت مل سے تنخواہ ملنے پر ادا کرتے تھے۔ ہم اس اسٹور میں آٹا، مکئی کا دلیا، گوشت، ڈبوں میں بند خوراک، کپڑے، جوتے، اوزار، میز پوش، چادریں، برتن، کراکری، چاکلیٹ، کولڈ ڈرنک اور میگزین وغیرہ بھی کچھ رکھتے تھے۔ چھٹی کے دنوں میں، میں یہ رسالے پڑھتا رہتا اور جیمز نے کبھی مجھے منع نہیں کیا۔ مجھے بلیک ماسک جیسی جاسوسی کہانیاں پسند تھیں۔
''میں چند منٹ کے لیے نئے موزے دیکھنے آئی تھی مسٹر ہیریسن۔ کوئی جھگڑا نہیں کررہی۔'' جولیا نے کہا۔
''مجھے یقین نہیں آرہا کہ تم نے اس جیسی فضول عورت کو اس اسٹور میں کیسے آنے دیا۔'' ایستھر ایلبری نے کہا جو سفید بلاؤز کے ساتھ عمدہ قسم کا سرمئی سوٹ پہنے ہوئے تھی۔ وہ مسٹر آرتھر ہنری بیسٹ کی مل میں سیکریٹری تھی۔ وہ خاموش طبیعت اور اچھے طور طریقے والی عورت تھی لہٰذا اس کی آنکھوں میں نفرت دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔

مجھے اعتراف ہے کہ وقتاً فوقتاً میں جولیا کے بارے میں بھی کچھ ایسا محسوس کیا کرتا تھا۔ میرا اب تک جتنی عورتوں سے واسطہ پڑا، وہ ان میں سب سے زیادہ بے وقوف تھی۔ ان میں وہ عورتیں بھی شامل تھیں جو اسٹور میں خریداری کے لیے آتیں اور وہ بھی جو مل میں کام کرتیں اور ماما کے بورڈنگ ہاؤس میں رہتی تھیں۔ جولیا سمپسن بہت خوب صورت تھی اور اسی وجہ سے اس وقت مجھے اور جیمز کو اس سے نمٹنے میں دشوار ہورہی تھی۔
''تم دونوں کے ساتھ کیا مسئلہ ہے؟'' جیمز نے اپنے معمول کے خلاف گرج دار آواز میں کہا جبکہ وہ ہمیشہ دھیمے لہجے میں بات کیا کرتا تھا۔
''میں کسی مسئلے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی مسٹر ہیریسن۔'' جولیا نے پلکیں جھپکاتے ہوئے کہا۔ ''جیسا کہ تمہیں بتا چکی ہوں کہ اپنے لیے موزے دیکھنے آئی تھی اور مجھے ٹوائلٹ کے لیے معطر پانی بھی چاہیے تھا۔'' یہ کہہ کر اس نے اس طرح ہاتھ ہلایا جیسے مکھیاں بھگا رہی ہو۔
''تمہارے لیے ٹوائلٹ ہی مناسب جگہ ہے بے شرم لڑکی۔'' مسز ایلبری نے لعنت دکھانے کے انداز میں اپنا ہاتھ اس کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔ ''کوئی بھی عقل مند شخص تم جیسی لڑکی کے پاس آنا پسند نہیں کرے گا۔''
جولیا طنزیہ انداز میں مسکراتے ہوئے بولی۔ ''کیوں مسز ایلبری۔ کیا تم یہ کہہ رہی ہو کہ تمہارے شوہر کے پاس عقل نہیں ہے۔''
مسز ایلبری سے برداشت نہ ہوسکا۔ وہ تیزی سے جولیا کی طرف بڑھی۔ اسے ایک زوردار تھپڑ رسید کیا اور اس کے سر سے اسکارف کھینچ لیا۔
''مجھے بھی جواب دینا آتا ہے۔'' جولیا اپنا گال سہلاتے ہوئے بولی پھر اس نے آگے بڑھ کر مسز ایلبری کے سر سے وہ مہین جالی چھین لی جس سے اس نے اپنے بال ڈھانپ رکھے تھے۔ ''یہ کسی نے مجھے تحفے میں دیا تھا اور تمہیں میری چیزیں چوری کرنے کا کوئی حق نہیں۔''
''سب سے بڑی چور تو تم خود ہو۔'' مسز ایلبری کا چہرہ غصے سے سرخ ہورہا تھا۔ ''نہ جانے اب تک کتنے شوہروں، بیٹوں اور باپوں کو...''
اچانک ہی جیمز ان دونوں کے درمیان آگیا۔ اس نے اتنی تیزی اور خاموشی سے حرکت کی تھی جیسے اڑتا ہوا آیا ہو۔ اس نے دونوں عورتوں کو بازو سے پکڑ کر علیحدہ کیا اور بولا۔ ''یہ لڑائی جھگڑے کی جگہ نہیں ہے۔ ایستھر، تم جولیا کو اس

کا اسکارف واپس کر دو اور جولیا تم بھی ماریا کو اس کی جالی دے دو۔‘‘

’’تم چاہتے ہو کہ میں اپنے بڑوں سے معافی بھی مانگوں۔‘‘ جولیا منہ چڑاتے ہوئے بولی۔

مسزی ایلبری نے ایک بار پھر اس کی جانب بڑھنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکی کیونکہ ہیریسن نے اس کا بازو مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔

’’تمہیں خود اپنے آپ سے شرم آنی چاہیے، گندی لڑکی۔‘‘ وہ پھنکارتے ہوئے بولی۔

’’کیا تمہاری یہ خواہش نہیں کہ میری طرح خوب صورت ہوتیں۔‘‘ جولیا نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ’’ممکن ہے اس صورت میں تمہارا شوہر زیادہ وقت گھر پر گزارتا لیکن شاید نہیں کیونکہ تم خود بھی گھر پر زیادہ نہیں رہتیں۔‘‘

’’تم اپنے والدین کے لیے باعثِ شرم ہو۔‘‘ مسز ایلبری تلملاتے ہوئے بولی۔

’’اور تم کیا ہو، بوڑھی، ہڈیوں کا ڈھانچا۔‘‘

’’تم ایک احمق لڑکی ہو۔‘‘

’’تم اپنے آپ کو ہم سب سے بہتر سمجھتی ہو کیونکہ مسٹر بیسٹ کے لیے کام کرتی ہو۔‘‘

یہ لفظی جنگ کچھ دیر یونہی جاری رہی اور میں حیران تھا کہ جیمز نے انہیں اس انداز میں گفتگو کرنے کی اجازت کیسے دے دی لیکن اس کا اپنا ایک منصوبہ تھا لہٰذا میں کچھ فاصلے پر کھڑا رہا البتہ ضرورت پڑنے پر مدد کے لیے تیار تھا۔

’’محترم خواتین!‘‘ جیمز نے اپنے مخصوص انداز میں انہیں مخاطب کرتے ہوئے کہا گو کہ اس کی آواز زیادہ اونچی نہیں تھی لیکن اس میں کوئی ایسی بات ضرور تھی جس نے ان دونوں عورتوں کو خاموش ہونے پر مجبور کر دیا۔ انہوں نے ایک دوسرے کی چیزیں واپس کر دیں تو جیمز نے کہا۔ ’’آج کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔ چلو میں تمہیں دروازے تک چھوڑ آؤں۔‘‘

وہ دونوں باہر نکل گئیں۔ ان کا رخ مختلف سمتوں میں تھا۔ جولیا آئس کریم پارلر کو جانے والی سڑک پر چل دی جبکہ مسز ایلبری نے اپنے دفتر کو جانے والے راستے کا انتخاب کیا جہاں وہ سیکریٹری کے فرائض انجام دیتی تھی۔ ہم سب بھی اپنے اپنے کاموں میں لگ گئے کیونکہ تماشا ختم ہو چکا تھا۔

’’سام، تم میری یہ بات لکھ لو کہ یہ لڑکی جولیا ایک دن

کسی بڑی مشکل کی وجہ بنے گی۔'' جیمز نے کہا۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو جیمز۔'' میں نے جواب دیا اور اسٹور روم میں چلا گیا تاکہ اپنا کام ختم کرسکوں۔

☆☆☆

اتوار کی صبح میں نے معمول کے مطابق ناشتے کے برتن دھونے میں ماما کی مدد کی، پھر اپنے کتے بوسٹر اور کچھ دوستوں کے ساتھ دریا کے پل پر پہنچ گیا تاکہ گرجا جانے سے پہلے مچھلیاں پکڑ سکوں۔ کئی سالوں سے ہر اتوار کو ہمارا یہی معمول تھا اور اس طرح ماما کو دوپہر کے کھانے کے لیے بڑی مقدار میں مچھلیاں مل جاتی تھیں۔ اس کے علاوہ مہینے میں دو مرتبہ ہفتے کی سہ پہر میں مل کا رنگوں والا حوض بھی خالی کیا جاتا تھا لہٰذا ہمیں یہ اشتیاق بھی ہوتا تھا کہ اس کے بعد آنے والے اتوار کو حوض کے پانی کا رنگ کیسا ہوگا۔

''میں نے گزشتہ رات ہیرم ایلبری اور اس کی بیوی کے درمیان جھگڑے کی آوازیں سنی تھیں۔'' میرے ساتھی آسکر نے مچھلی پکڑنے والے ہک میں ڈوری ڈالتے ہوئے کہا۔

''تمہیں ان کی پرائیویٹ باتیں نہیں سننا چاہئیں۔'' زیک کارلائل بولا۔ اس کا باپ گاؤں کے گرجا میں پادری اور ماں مل میں کام کرتی تھی۔

''اسے پرائیویٹ نہیں کہا جاسکتا کیونکہ ہمارے گھر برابر برابر ہیں اور وہ چلا چلا کر بول رہے تھے۔'' آسکر نے اپنا ہک پانی میں ڈالتے ہوئے کہا۔

آسکر کا باپ بھی ہیرم ایلبری کی طرح سپروائزر رہی ہے۔ لہٰذا وہ مل کے اوپر پہاڑی پر بنے ہوئے تین بڑے مکانوں میں سے ایک میں رہتا ہے۔ آسکر اور زیک دونوں مجھ سے عمر میں چھوٹے ہیں اور انہوں نے ابھی مل میں کام کرنا شروع نہیں کیا تھا۔ گوکہ زیک عنقریب چودہ سال کا ہونے والا تھا اور پہلے ہی سوئپر کا کام کررہا تھا لیکن وہ بہت جلد ٹیکسٹائل انسٹی ٹیوٹ میں جانے والا تھا جہاں وہ ایک ہفتہ پڑھتا اور ایک ہفتہ کام کرتا۔

وہ ایک خوش گوار صبح تھی اور ابھی موسم گرم نہیں ہوا تھا۔ دریا کے پانی کا رنگ سورج کی روشنی میں ارغوانی ہورہا تھا۔ گویا گزشتہ شب حوض میں نارنجی رنگ جمع کیا گیا تھا۔ رات میں ہونے والی بارش کی وجہ سے زیادہ تر رنگ بہہ گیا تھا اس کے علاوہ تیز آندھی اور ہوائیں چلنے سے درختوں کی شاخیں بھی ٹوٹ کر دریا میں گرگئی تھیں۔ میں پل کی ریلنگ پر جھکا دریا کا پانی دیکھ رہا تھا کہ میری نظر کسی چیز پر گئی جو شاخوں میں پھنسی ہوئی تھی۔ میں شاید اس پر توجہ نہ دیتا لیکن اس کے تیز نارنجی رنگ نے مجھے چونکا دیا جیسے مل کی ڈائنگ شاپ سے کوئی کپڑا بہتا ہوا وہاں تک آگیا ہے۔

''وہ دیکھو۔'' میں نے اپنے ساتھیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

وہ دونوں میرے قریب آگئے۔ آسکر نے جھانک کر دیکھا اور بولا۔ ''شاید کچھ کپڑا حوض میں رہ گیا ہوگا۔''

''نہیں، مجھے تو لگتا ہے یہ ضائع شدہ کاٹن ہے۔''

''چلو دیکھتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

ہم تقریباً دوڑتے ہوئے دریا کے کنارے تک آگئے۔ ٹانگ کی تکلیف کے باعث میں ان دونوں سے پیچھے رہ گیا تھا۔ اسی وجہ سے میں نے مل میں کام کرنا چھوڑ دیا تھا حالانکہ میری عمر کام کے قابل تھی۔ ہم پانی میں اتر گئے۔ شاخوں کو پکڑا اور اس گٹھڑی کو کھینچتے ہوئے ساحل تک لے آئے۔ پہلے تو میں یہی سمجھا کہ آسکر ٹھیک کہہ رہا تھا۔ واقعی شاخوں میں کپڑا پھنسا ہوا تھا کیونکہ اس پر تازہ تازہ نارنجی رنگ ڈائی کیا گیا تھا۔ ہم نے شاخیں ہٹائیں اور اپنا ہاتھ اس چیز پر رکھا جو سرد اور گوشت پوست کی لگ رہی تھی۔

میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''کپڑے کے اندر کوئی ہے۔''

شاخوں کو ہٹائے جانے کے بعد ہمیں کسی کے بازو، ٹانگیں اور سر نظر آیا۔ یہ تمام حصے نارنجی رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے۔

''لگتا ہے کوئی رنگ والے حوض میں گر گیا تھا۔'' آسکر نے کہا۔

زیک نے منہ ہی منہ میں دعائیں مانگنا شروع کردیں۔ میں نے اس جسم کو پلٹا۔ میرے سامنے جولیا سمپسن کا چہرہ تھا جس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں جیسے وہ آسمان کی طرف دیکھ رہی ہو۔

''جاؤ فوری طور پر جیمز ہیریسن کو تلاش کرکے کہو کہ وہ ہمیں ڈروری کی جنازہ گاہ پر ملے۔'' میں نے زیک سے کہا پھر میں نے آسکر سے کہا۔ ''کچھ بڑی شاخیں اکٹھا کرلو۔ ہم اسے اس حالت میں یہاں نہیں چھوڑ سکتے۔ ہمیں اسے جنازہ گاہ تک لے جانا ہوگا۔''

مسٹر ڈروری، مل کی جنازہ گاہ کے منتظم تھے جو گاؤں کے عقب میں ساتویں اسٹریٹ پر واقع تھی۔ آسکر کے دروازہ کھٹکھٹانے پر وہ باہر آئے۔ جیمز ہیریسن بھی وہاں پہنچ چکا تھا۔ مسٹر ڈروری کے کچھ کہنے سے پہلے وہ بول پڑا۔

''تم لوگ کسے لے کر آئے ہو؟''

''دیکھنے میں جولیا سمپسن لگ رہی ہے۔'' میں نے ہانپتے ہوئے کہا۔

''اور اس کا رنگ نارنجی ہو گیا ہے۔'' آسکر نے کہا۔

''یہ ضرور رنگ کے تالاب میں ڈوب کر مری ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے جیمز؟''

جیمز ایک قدم آگے بڑھا اور لاش کا بغور معائنہ کرنے لگا۔ یہ اس کی عادت تھی۔ وہ اسٹور میں آنے والے سامان کی بھی اسی طرح جانچ پڑتال کیا کرتا تھا یا جب وہ مل کا نسٹیبل کی حیثیت سے کسی معاملے کا تصفیہ کرتا تب بھی اس کی یہی کیفیت ہوتی۔ اس نے انگلی بڑھا کر جولیا کی گردن میں پڑے ہوئے نارنجی اسکارف کو چھوا جو اب زرد ہونا شروع ہو گیا تھا۔

''ہمیں اس لاش کو اندر لے جانا چاہیے۔'' مسٹر ڈروری نے کہا۔ ''اس سے پہلے کہ کوئی یہاں آجائے۔ ویسے بھی آج اتوار ہے اور یہ اچھا نہیں لگتا کہ ایک لاش اس طرح کھلے آسمان کے نیچے پڑی رہے۔ تم لوگوں نے گلیوں میں کسی کو دیکھا تو نہیں تھا؟''

''نہیں۔'' میں نے جلدی سے کہا۔ اتوار کی وجہ سے گلیاں اور سڑکیں سنسان پڑی ہوئی تھیں۔ زیادہ تر لوگ چرچ جانے کے لیے تیار ہو رہے ہوں گے یا کچھ لوگ رات کو نشہ کرنے کے بعد دیر تک سو رہے ہوں گے۔

ہم نے جولیا کی لاش اٹھائی اور اسے جنازہ گاہ کے عقبی کمرے میں لکڑی کی ایک لمبی سی میز پر لٹا دیا۔ میں نے وہاں سے وہ شاخیں بھی ہٹا دیں۔ اس کے بعد آسکر اور زیک چلے گئے لیکن میں جیمز کے ساتھ ہی رہا۔

''مسٹر ڈروری، میں ایک مرتبہ تفصیل سے لاش کا معائنہ کرنا چاہتا ہوں۔'' جیمز نے کہا۔

''تاکہ کوئی سراغ مل جائے۔'' میں نے لقمہ دیا۔

''سیموئل۔'' مسٹر ڈروری نے کچھ کہنا چاہا لیکن جیمز اپنا ہاتھ اٹھاتے ہوئے بولا۔ ''سام میرے ساتھ ہے، اسی نے لاش دریافت کی تھی اور مجھے اس سے وہ سب کچھ معلوم کرنا ہے جو یہ جانتا ہے۔''

''بے چاری جولیا ڈوب گئی۔'' مسٹر ڈروری اپنے دونوں ہاتھ مسلتے ہوئے بولے۔ ''میں نہیں جانتا کہ اس کی لاش پر سے یہ رنگ کیسے صاف ہوگا۔ یقیناً اس کے لیے مجھے ایک بند کفن کا انتظام کرنا ہوگا۔''

''میں نہیں سمجھتا کہ وہ ڈوب کر مری ہے۔'' جیمز نے کہا جو جولیا کے گلے میں بندھے ہوئے اسکارف کی گرہ کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجھے لگا کہ اسے اس کام میں مشکل پیش آرہی تھی۔ یہ گرہ اس کی گردن کی پشت پر سختی سے باندھی گئی تھی اور اب وہ اس کی گردن کی کھال میں دھنس گئی تھی۔ میں نے اپنا جیبی چاقو نکال کر اسے دے دیا۔

''شکریہ سام۔'' اس نے چاقو سے اسکارف کاٹتے ہوئے کہا۔

جولیا کے لباس کے نیچے مجھے نرم گوشت میں ایک گہرا کھانچا نظر آیا جس میں کوئی چیز پھنسی ہوئی تھی اور کسی دھات کی طرح چمک رہی تھی۔ جیمز نے جھک کر جولیا کی گردن کو غور سے دیکھا۔ اس وقت میں نے سوچا کہ کاش میرے پاس بھی کہانیوں کے سراغ رسانوں کی طرح محدب عدسہ ہوتا لیکن جیمز کی نظریں بہت تیز تھیں۔ وہ سیدھا کھڑا ہو گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک باریک سی چین لٹک رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ پوچھتا اس نے وہ چین اپنی جیب میں رکھ لی۔

''یہ ڈوبی نہیں تھی۔'' جیمز نے چاقو بند کر کے مجھے دیتے ہوئے کہا۔ ''دیکھو یہ نشانات کتنے گہرے ہیں۔ لگتا ہے کہ اس کا اپنے ہی اسکارف سے گلا گھونٹا گیا ہے۔''

''لیکن وہ دریا تک کیسے پہنچ گئی؟'' مسٹر ڈروری نے پوچھا۔

مسٹر ڈروری نے کبھی مل میں کام نہیں کیا تھا لہٰذا میں نے انہیں بتایا۔ ''وہ ضرور رنگ کے تالاب میں ہو گی۔ اسے مہینے میں دو مرتبہ خالی کیا جاتا ہے۔ ہمیشہ ہفتے کی سہ پہر۔''

''بالکل ایسا ہی ہوتا ہے سام۔'' جیمز نے کہا۔ ''لیکن مسئلہ یہ نہیں کہ وہ رنگ کے تالاب میں تھی۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کس نے اسے قتل کر کے اس کی لاش وہاں چھپا دی؟''

میں نے جولیا کی لاش کی طرف دیکھا جسے مسٹر ڈروری سیدھا کر رہے تھے۔ جولیا کے جسم کو ہاتھ لگانے سے مسٹر ڈروری کے ہاتھ بھی رنگین ہو گئے تھے۔ اسی وقت میری نظر ایک چیز پر گئی اور میں بے اختیار بول اٹھا۔ ''اس کا داہاں ہاتھ دیکھو جیمز۔ اس کی مٹھی سختی سے بھنچی ہوئی ہے جبکہ دوسرے ہاتھ کی مٹھی کھلی ہوئی ہے۔ لگتا ہے کہ بند مٹھی میں کچھ ہے۔''

مسٹر ڈروری نے اس کی مٹھی کھولی تو اس میں سے کپڑے کا ایک ٹکڑا برآمد ہوا۔ جیمز نے اسے پھیلا کر دیکھا لیکن اس پر جولیا کے کپڑوں اور جلد کی طرح رنگ نہیں چڑھا

تھا۔ جولیا نے اسے مٹھی میں بند کر رکھا تھا اس لیے یہ رنگ سے محفوظ رہا۔

''یہ تو وہ جالی ہے جو عورتیں اپنے سر کو ڈھانپنے کے لیے استعمال کرتی ہیں۔'' میں نے سرگوشی میں کہا۔

آگے بڑھنے سے پہلے ضروری ہے کہ میں جیمز کا مکمل تعارف کروا دوں۔ وہ اسٹور چلانے کے ساتھ ساتھ کمپنی کا کانسٹیبل بھی تھا۔ پہلے وہ بھی مل میں کام کیا کرتا تھا۔ وہ انجینئر تھا اور اس نے اس علاقے کی ملوں میں لوم اور اسپننگ مشینیں نصب کی تھیں۔ جنگ عظیم کے دوران وہ فرانس چلا گیا۔ وہ ان دنوں کے بارے میں زیادہ بات نہیں کرتا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ جنگ سے واپس آنے کے بعد وہ دوبارہ مل میں نہیں گیا کیونکہ اسے شور پسند نہیں تھا جبکہ مل میں چوبیس گھنٹے مشینیں چلتی رہتی تھیں۔ اس کے علاوہ وہاں گرمی اور گرد و غبار بھی ہوتا تھا چنانچہ مسٹر آرتھر ہنری بیسٹ نے اسے جی بی سیون کے کمپنی اسٹور میں ملازمت دے دی، اس کے کچھ دنوں بعد اسے گاؤں کا کانسٹیبل بھی مقرر کر دیا۔ وہ دس سال پہلے اس گاؤں میں آیا تھا اور تب سے ہی میری ماما کے بورڈنگ ہاؤس میں رہائش پذیر تھا۔ گو کہ اس وقت میں بہت چھوٹا تھا لیکن مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب جیمز دوسری منزل کے آخری کمرے میں شفٹ ہوا تھا۔ اس وقت میرے ڈیڈی زندہ تھے۔ بعد میں وہ مل میں ایک حادثے کا شکار ہو گئے۔ میری ماما اور جیمز کے بہت اچھے تعلقات تھے اور میرے خیال میں وہ خوش تھی کہ میں مل میں کام کرنے کے بجائے جیمز کی مدد کر رہا تھا۔ ڈیڈی کے انتقال کے بعد ماما نہیں چاہتی تھیں کہ میں مل میں کام کروں لیکن جب میں پندرہ سال کا ہوا تو انہوں نے مجھے اجازت دے دی، پھر میرے زخمی ہونے اور ٹانگ ٹوٹنے کے بعد انہوں نے مجھے مل جانے سے منع کر دیا۔ میں اسٹور پر کام کر کے ہی خوش تھا اور میری خواہش تھی کہ کسی دن ایک بڑا مصنف بنوں۔

جب جیمز اور میں، جولیا سمپسن کی مشتبہ موت کی تحقیقات کر رہے تھے تو میں مسلسل اپنی نوٹ بک میں کچھ لکھتا رہا پھر اپنے کام سے فارغ ہو کر جیمز نے لاش مسٹر ڈروری کے سپرد کی تاکہ وہ اس کی تجہیز و تکفین کا بندوبست کریں پھر بولا کہ وہ مسٹر ہیرم ایلبری سے بات کرنا چاہتا ہے۔

''وہ کیوں؟'' پھر اپنی نوٹ بک کے ایک صفحے پر ہیرم ایلبری کا نام لکھ دیا۔

جیمز میری طرف دیکھتے ہوئے مسکرایا اور بولا۔ ''ہمیں اسے اس لاش کے بارے میں بتا دینا چاہیے۔ جولیا اس کی بلڈنگ میں کھانے پینے کی اشیا کی ٹرالی لے کر جاتی تھی۔''

یہ ٹرالی ایک چلتی پھرتی دکان تھی جس میں بسکٹ، کولڈ ڈرنک، سینڈوچ اور کھانے پینے کی دیگر اشیا ہوتی تھیں۔ وہ یہ چیزیں مشینوں کے آپریٹرز کو فروخت کرتی تاکہ وہ اپنی مشینیں چھوڑ کر کہیں نہ جائیں۔

''ہاں یہ تو میں جانتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن میں نے سنا ہے کہ اس کے بارے میں لوگ الٹی سیدھی باتیں کیا کرتے تھے۔''

''مجھے یہ سن کر حیرت نہیں ہوئی۔'' جیمز نے ایلبری کے گھر کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ میں بھی اس کے پیچھے لنگڑاتا ہوا چل رہا تھا۔

''ہاں، مل میں یہی سب سے آسان کام تھا۔'' میں نے کہا۔

''تم جانتے ہو کہ سپروائزر نے اسے اس کام پر لگایا تھا۔''

''اور وہ سپروائزر مسٹر ایلبری تھے۔'' میں نے رک کر اپنی نوٹ بک نکالی اور اس پر لکھ دیا۔ جولیا کا سپروائزر اور اس کے نیچے مسٹر ایلبری کا نام لکھا۔

''میں سوچ رہا ہوں کہ اب جولیا کی جگہ یہ کام کون کرے گا؟'' جیمز نے پوچھا۔

میرے پاس اس سوال کا جواب دینے کے لیے وقت نہیں تھا کیونکہ ہم ایلبری کے مکان پر پہنچ چکے تھے۔ جیمز نے دروازے پر دستک دی تو کسی نے اندر سے چلا کر کہا۔ ''اندر آجاؤ۔''

مجھے اس پر تعجب نہیں ہوا کیونکہ گاؤں میں شاید ہی کوئی اپنے گھر کا دروازہ بند کر کے رکھتا ہوگا۔ جیمز نے دروازہ کھولا اور ہم اندر داخل ہو گئے۔ بیرونی کمرے میں عمدہ قسم کا فرنیچر پڑا ہوا تھا۔

''جیمز ہیریسن، تم کیسے ہو؟'' ہیرم نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''اور تمہارا کیا حال ہے سام؟ امید ہے کہ تمہاری ماما بھی خیریت سے ہوں گی۔''

''ہم دونوں بالکل ٹھیک ہیں۔'' میں نے کہا۔

''ہم یہاں تم سے ملنے نہیں بلکہ ایک بری خبر لے کر آئے ہیں۔'' جیمز نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔

ہیرم کا چہرہ زرد پڑ گیا اور وہ ہکلاتے ہوئے بولا۔ ''بُری خبر، کیا ایستھر...؟''

''کیا وہ گھر پر نہیں ہے؟'' ہیریسن نے پوچھا۔

''ہاں، وہ جی پی فائیو گئی تھی۔'' اس نے کہا۔ ''ہفتے کی شام معمول کے مطابق ہم نے مل کے دفتر میں مسٹر بیسٹ کے ساتھ میٹنگ کی۔ بعد میں اس کے بیٹے جوناتھن نے اسے اپنی کار میں چھوڑنے کی پیشکش کی۔ اسے اپنی چھوٹی بہن سے ملنے کے لیے جانا تھا۔ تم تو جانتے ہی ہو کہ ایستھر کو لوگوں کی مدد کرنا پسند ہے۔''

''بیٹھ جاؤ ہیرم۔'' جیمز نے کہا۔ ''مجھے اور دوسرے لڑکوں کو پُل کے نیچے سے جولیا سمپسن کی لاش ملی ہے۔''

''جولیا سمپسن!'' ہیرم نے اس طرح کہا جیسے کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ''وہ چھوٹی سی پیاری لڑکی جو ٹرالی پر سامان بیچا کرتی تھی۔ بے چاری، کیا اس نے خودکشی کی ہے؟''

جیمز نے کہا۔ ''نہیں۔ بظاہر یہی لگتا ہے کہ اس کے اپنے اسکارف سے اس کا گلا گھونٹا گیا ہے۔''

ہیرم کا چہرہ جو پہلے زرد تھا، اب لٹھے کی طرح سفید ہو گیا۔ ''کیا وہ زرد رنگ کا اسکارف تھا؟'' اس نے پوچھا۔

''اگر یہ وہی ہے جو میں نے اس کے گلے میں دیکھا تھا تو وہ پیلے رنگ کا ہی تھا اور اس طرح کے اسکارف ہمارے اسٹور میں نہیں ہوتے۔'' میں نے کہا۔

''ہم دونوں نے ہی اسے زرد رنگ کے اسکارف کے ساتھ دیکھا تھا...'' جیمز بولا۔ ''اس روز جولیا اور ایستھر کے درمیان اسٹور میں جھڑپ بھی ہوئی تھی۔ کیا تم جانتے ہو کہ کس وجہ سے ایستھر اسے ناپسند کرتی تھی؟''

ہیرم آگے کو جھکا اور اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔ عین اسی وقت ایستھر ایلبری دونوں ہاتھوں میں بہت سے بنڈل تھامے اندر داخل ہوئی۔

''ہائے جیمز، ہائے سام۔'' اس نے کہا پھر وہ ہیرم سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔ ''معاف کرنا، مجھے امید تھی کہ وقت پر گھر پہنچ کر تمہارے لیے ناشتا تیار کر سکوں گی لیکن تھروسا نے آنے ہی نہیں دیا۔ میں بسکٹ لائی ہوں۔ اسی سے گزارا کر لو۔''

''بیٹھ جاؤ ایستھر۔'' جیمز نے کہا۔ ''ہمیں تم سے جولیا سمپسن کے بارے میں کچھ سوالات کرنے ہیں۔''

ایستھر کے چہرے سے دوستانہ مسکراہٹ غائب ہو گئی اور وہ غصے سے بولی۔ ''میں تمہیں اس کتیا کے بارے میں بہت کچھ بتا سکتی ہوں لیکن اپنی زبان خراب نہیں کروں گی۔ اب اس نے کیا مشکل کھڑی کر دی؟''

''سام کو آج صبح وہ دریا سے ملی ہے۔''

''اسے دریا میں چھلانگ لگانے کا شوق ہوا ہوگا جبکہ وہ گرجا جانے کا وقت ہوتا ہے۔''

''اس نے چھلانگ نہیں لگائی بلکہ وہ مر چکی ہے۔''

یہ سنتے ہی وہ چکرا کر گر پڑی اور اس کا سر کرسی سے ٹکرایا۔ میں نے فوراً ہی ڈاکٹر کی طرف دوڑ لگا دی۔ اس کا مکان زیادہ دور نہیں تھا۔ اس وقت وہ کسی کام سے باہر جا رہا تھا لیکن میرے کہنے پر فوراً ہی چلا آیا۔ اس نے ایستھر کا معائنہ کیا اور بولا۔ ''اسے کوئی صدمہ پہنچا ہے لیکن کوئی سنجیدہ بات نہیں ہے۔ میں نے دوا دے دی ہے۔ یہ کچھ دیر سوتی رہے گی۔''

''یہ ٹھیک نہیں ہوا۔'' جیمز نے کہا۔ ''مجھے اس سے کچھ مزید سوالات کرنا تھے۔''

ڈاکٹر کے جانے کے بعد ہیرم بولا۔ ''کیسے سوالات؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ ایستھر اس کی ذمے دار ہے۔ بالکل نہیں، وہ تو ایک مکھی بھی نہیں مار سکتی۔ ویسے بھی میں بتا چکا ہوں کہ ہم رات نو بجے تک مسٹر بیسٹ اور مسٹر جوناتھن کے ساتھ تھے۔ جہاں تک جولیا کے گلے میں اسکارف ڈال کر گلا گھونٹنے اور اسے رنگ والے حوض میں پھینکنے کی بات ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ ایستھر میں اتنی طاقت نہیں ہے۔''

''تم سے رنگ والے حوض کی بات کس نے کی؟'' جیمز نے پوچھا۔

''ظاہر ہے کہ تم نے کہا ہے یا پھر سام نے کہا ہوگا۔''

''نہیں۔'' میں نے اپنا سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ہم نے صرف یہ کہا تھا کہ جولیا کا گلا اس کے اپنے اسکارف سے گھونٹا گیا ہے۔ رنگ والے حوض کی کوئی بات نہیں ہوئی۔''

ہیرم چکرا کر سیٹی پر گر پڑا اور بولا۔ ''میں نے اسے نہیں مارا۔''

جیمز نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ''میں نے کبھی نہیں کہا کہ تم نے ایسا کیا ہے۔''

میں کچھ نہیں بولا۔ البتہ میں نے اپنی نوٹ بک اور پنسل نکال لی تھی تا کہ ضروری باتیں لکھ سکوں۔

''تم جانتے ہو کہ جولیا میرے ڈپارٹمنٹ میں کھانے پینے کی چیزوں کی ٹرالی لے کر آتی تھی۔'' ہیرم نے کہنا شروع کیا۔

''نہ جانے کیوں ایستھر اس سے حسد کرنے لگی تھی۔

اس نے مجھ سے کہا کہ جولیا اس کام کے لیے مناسب نہیں ہے۔ اس نے بھی ٹھیک ہی کہا تھا۔ جولیا زیادہ وقت مردوں سے ہنسی مذاق کرنے میں گزارتی اور ان عورتوں کو نظرانداز کر دیتی تھی جو اس سے چیزیں خریدنا چاہتی تھیں۔''

''پھر تم نے اسے یہ کام کیوں سونپا؟'' جیمز نے پوچھا۔

ہیرم نے ہیریسن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میرے پاس کوئی اور راستہ نہیں تھا۔''

''کیوں، تم سپروائزر ہو۔ تمہارے ہاتھ میں سب کچھ ہے۔''

''ہاں۔'' اس نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ ''لیکن میں مل کا مالک نہیں ہوں۔''

میں بڑی تیزی سے ہیرم کا بیان قلم بند کر رہا تھا۔ اس کی باتوں سے لگ رہا تھا کہ جولیا ایک سے زیادہ لوگوں کی نظروں میں تھی اور ان میں سے ایک مسٹر آرتھر ہنری بیسٹ کا سب سے چھوٹا بیٹا جوناتھن گریڈی بیسٹ تھا۔ میں نے اسے دیکھا ضرور تھا لیکن کبھی بات کرنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا، وہ ان لوگوں میں سے تھا جو اپنے آپ کو ہم سے بالاتر سمجھتے ہیں کیونکہ ان کے باپ کے پاس پیسا تھا اور ہم زندگی گزارنے کے لیے کام کرنے پر مجبور تھے۔

جب جوناتھن دو سال پہلے کالج کی تعلیم مکمل کر کے گاؤں واپس آیا تو اس کے ڈیڈی نے فیصلہ کیا کہ اسے مل میں نچلے درجے سے کام سیکھنے کی ضرورت ہے چنانچہ اس سے کہا گیا کہ وہ باری باری مل کے مختلف شعبوں یعنی اسپننگ، ویونگ اور فنشنگ وغیرہ میں جا کر کام سیکھے کیونکہ ایک دن اسی کو یہ کمپنی چلانی ہے۔ چنانچہ باپ کے کہنے پر عمل کرتے ہوئے اس نے ایک ایک مہینا اسپننگ اور ویونگ میں گزارا، اب وہ فنشنگ میں کام کر رہا تھا جہاں کپڑوں کو رنگا جاتا ہے۔

''اس لڑکے کا دماغ خچر کی طرح ہے۔'' ہیرم نے کہا۔ ''میں نے اسے بتا دیا تھا کہ جولیا اچھی لڑکی نہیں ہے اور اس کے ڈیڈی یہ کبھی نہیں چاہیں گے کہ وہ اس سے راہ و رسم بڑھائے لیکن اس نے میری باتوں پر کوئی توجہ نہیں دی اور اس کے ساتھ وقت گزارنے لگا۔ اسی کے کہنے پر میں نے جولیا کو یہ ذمے داری دی تھی۔''

''اس سے بھی زیادہ بُری بات یہ ہوئی۔'' ہیرم سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''اس نے جولیا کے لیے تحائف لانا شروع کر دیے جن میں ایک زرد اسکارف، ایک لاکٹ اور ریشمی موزے شامل تھے۔ وہ جولیا سے کھلے عام باتیں کرتا اور تمام مزدور انہیں دیکھا کرتے چنانچہ یہ بات اس کے باپ تک پہنچ گئی اور مسٹر آرتھر بیسٹ دو ہفتے پہلے مجھ سے ملنے آ گئے۔''

''مسٹر بیسٹ ڈائنگ اور فنشنگ ڈپارٹمنٹ میں آتے تھے؟'' جیمز حیران ہوتے ہوئے بولا۔

''نہیں۔'' ہیرم نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''وہ میرے گھر آئے تھے اور اسی کرسی پر بیٹھے جس پر اس وقت سام بیٹھا ہوا ہے۔''

میں نے یہ پوائنٹ بھی اپنی نوٹ بک میں لکھ لیا۔

''اور انہوں نے مجھ سے کہا کہ کسی طرح جولیا تھمسن سے جان چھڑاؤ۔'' اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے کرسی کو پکڑا اور بولا۔ ''ہاں، ان کا یہی مطلب تھا کہ اسے ملازمت سے برطرف کر دیا جائے۔ حالانکہ عام حالات میں یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی لیکن تم جانتے ہو کہ انہوں نے ایسا کیوں کہا تھا؟''

جیمز اپنا ہاتھ بلند کرتے ہوئے بولا۔ ''تم پُرسکون ہو جاؤ ہیرم۔ میں صرف حقائق جمع کر رہا ہوں۔ اپنا بیان جاری رکھو۔''

ہیرم نے جیب سے رومال نکال کر چہرہ صاف کیا اور بولا۔ ''دوسرے روز جب میں نے جولیا کو بتایا کہ اسے ملازمت سے فارغ کر دیا گیا ہے تو وہ بولی۔ ''میں ایسا نہیں سمجھتی۔'' اس کے بعد وہ ٹرالی دھکیلتی ہوئی چلی گئی اور اپنے معمول کے مطابق لوگوں سے ہنسی مذاق کرنے لگی۔''

''گویا تم نے اسے نوکری سے نہیں نکالا؟'' جیمز نے پوچھا۔

''میں ایسا نہیں کر سکا۔ جوناتھن بیسٹ نے مجھ سے کہا کہ میں اس کے باپ کا حکم نظرانداز کر دوں۔'' یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے رکا اور باری باری ہم دونوں کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ ''ذرا سوچو، یہ کیسے ممکن ہے کہ میں مسٹر آرتھر ہنری بیسٹ کے احکامات نظرانداز کر دوں۔''

میں نے تائید میں اپنا سر ہلایا۔ واقعی یہ تصور کرنا ہی محال تھا۔ وہاں سب لوگ مسٹر بیسٹ کے لیے کام کرتے تھے اور ان کے احکامات کو نظرانداز کرنا ایسا ہی تھا جیسے کوئی امریکی صدر یا برطانیہ کے بادشاہ کا حکم ماننے سے انکار کر دے۔

''گویا جوناتھن بیسٹ تم سے ایک بات کہہ رہا تھا اور اس کا باپ اس سے مختلف بولی بول رہا تھا۔'' جیمز نے کہا۔ ''تم تو چکی کے دو پاٹوں کے درمیان پس گئے۔ پھر تم

نے کیا کیا؟''

''میں نے بیسٹ سینئر کو پیغام بھیج دیا کہ اس کا بیٹا جوناتھن مجھے جولیا کو فارغ نہیں کرنے دے گا اور میں نے اس سے پوچھا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میں کس کی سنوں؟''

''پھر مسٹر بیسٹ سینئر نے تم سے کیا کہا؟''

''اس نے کہا کہ اس بارے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ میرا خیال رکھے گا۔''

''ایک بات اور۔'' جیمز نے کہا۔ ''پھر میں تمہیں ایستھر کی تیمارداری کے لیے چھوڑ دوں گا۔''

''وہ کیا؟'' ہیرم نے قدرے پُرسکون ہوتے ہوئے پوچھا۔

''تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ جولیا رنگ والے کے حوض میں تھی؟''

ہیرم نے آہستہ سے نفی میں سر ہلایا اور بولا۔ ''میں تمہیں یہ نہیں بتا سکتا۔ صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ ایستھر کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں۔ اس نے کچھ نہیں کیا۔'' یہ کہہ کر وہ اٹھا اور دروازہ کھولتے ہوئے بولا۔ ''جیسا کہ تم نے کہا تھا اب مجھے اپنی بیوی کی تیمارداری کرنی ہے۔''

جیمز دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ ''ہیرم، ہم دوبارہ بھی آئیں گے۔''

سڑک پر آنے کے بعد میں نے پوچھا۔ ''اب ہم کہاں جائیں گے؟''

''ہمیں مسٹر بیسٹ کے گھر جانا چاہیے تاکہ ہیرم نے جو کہانی سنائی ہے، اس کی تصدیق کر سکیں۔''

''جولیا کو ملازمت سے نکالنے کے بارے میں؟''

''نہیں، ہمیں اس بات کی تصدیق کرنا ہے کہ گزشتہ روز کام بند ہو جانے کے بعد وہ، ایستھر اور دونوں باپ بیٹے مل کے دفتر میں موجود تھے۔''

میں جانتا تھا کہ یہ ایک اہم بات ہے لیکن اتوار کے روز مسٹر بیسٹ کے گھر جانا آسان نہیں تھا کیونکہ وہ قصبے میں رہتے تھے اور اتوار والے دن وہاں جانے کے لیے کوئی سواری دستیاب نہیں تھی۔

''پہلے تم کچھ کھالو۔'' جیمز نے کہا۔ ''کیونکہ ناشتا کیے کافی دیر ہو چکی ہے۔ اس کے بعد ہم موٹر سائیکل پر وہاں جائیں گے۔''

ہم بورڈنگ ہاؤس پہنچے تو ماما کھانے پر ہمارا انتظار کر رہی تھیں۔ ہمیں دیکھتے ہی بولی۔ ''جلدی سے آجاؤ۔ میں کتنی دیر سے تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔''

استادیاں

استاد (شاگرد سے): ''یہ بتاؤ چاند ساری رات روشن کیوں رہتا ہے؟''

شاگرد (معصومیت سے): ''جناب واپڈا والے وہاں نہیں پہنچے ہیں اس لیے۔''

☆☆☆

استاد: ''بُلبل کا مذکر بتاؤ۔''

شاگرد: ''بُلبلہ۔''

استاد: ''اور جمع؟''

شاگرد: ''ابابیل۔''

☆☆☆

استاد نے دینیات پڑھاتے ہوئے سوال کیا۔ ''بتاؤ اللہ تعالیٰ نے انسان کو کیوں پیدا کیا؟''

ایک لڑکے نے ہاتھ اوپر کیا۔

استاد۔ ''ہاں بتاؤ کس لیے؟''

شاگرد۔ ''ماسٹر صاحب! دوسروں کا تو میں بتا نہیں سکتا لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کو میری پٹائی کے لیے پیدا کیا ہے۔''

محمد عظیم اللہ خاں درانی، صادق آباد

''سارہ ڈیئر.... تم واقعی ایک مہربان خاتون ہو۔'' جیمز نے کہا۔ ''اور سو میل تک تم سے اچھا باورچی کوئی نہیں۔''

ماما نے اس کے چہرے پر تولیا دے مارا لیکن میں اسے شرماتا ہوا دیکھ سکتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ ماما اور وہ ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔ ہم کچن ٹیبل پر بیٹھ گئے۔ میری تیرہ سالہ جڑواں بہنیں بیٹی اور نیلی خالی پلیٹیں اپنے ہاتھوں میں لیے چلی آئیں۔

''تھوڑے سے بسکٹ اور ٹماٹر چاہئیں۔'' بیٹی نے کہا۔

''اور مکھن بھی۔'' نیلی بولی۔ ''تم کیسے ہو مسٹر جیمز؟''

''بالکل ٹھیک۔'' جیمز مسکراتے ہوئے بولا۔

جب وہ دونوں چلی گئیں تو ماما نے پوچھا۔ ''یہ میں کیا سن رہی ہوں کہ تم دونوں کو دریا سے کوئی لاش ملی ہے۔''

مجھے امید تھی کہ اب تک یہ خبر پورے گاؤں میں پھیل چکی ہوگی کیونکہ جس وقت وہ لاش ملی تو آسکر اور زیک میرے ساتھ تھے۔ لہٰذا ہم دونوں نے ماما کو پورا واقعہ سنا دیا۔

''اوہ جولیا۔'' ماما نے کہا۔ ''اس کے ساتھ یہی ہونا تھا۔''

''تم اس کے بارے میں کیا جانتی ہو سارہ جین؟''

جیمز نے پوچھا۔

''اس کے والدین اچھے انسان تھے لیکن اس کے ڈیڈی کا ایک حادثے میں انتقال ہو گیا اور ماں نے دوسری شادی کر لی۔ اب جولیا بالکل آزاد تھی اور اسے سنبھالنے والا کوئی نہ تھا۔ وہ ہر وقت اِدھر اُدھر پھرتی اور لڑکوں سے باتیں کیا کرتی۔ ہمیں امید تھی کہ جب وہ چودہ سال کی ہو جائے گی اور اسے مل میں ملازمت مل جائے گی تو اس کی زندگی میں ٹھہراؤ آ جائے گا لیکن اس کی بدتمیزیاں بڑھتی گئیں۔ وہ اپنی کمائی میں سے ماں کو کچھ نہیں دیتی تھی بلکہ سارے پیسے اپنے پاس ہی رکھ لیتی تھی۔ میرے حساب سے وہ ایک خود غرض عورت تھی۔''

جیمز اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ ''میں تمہاری اجازت سے سام کو ایک لمبے سفر پر لے جانا چاہتا ہوں۔''

''امید ہے کہ تم اسے صحیح سلامت واپس لے آؤ گے۔'' ماما نے مسکراتے ہوئے کہا۔

جیمز نے باہر آ کر شیڈ میں کھڑی ہوئی موٹر سائیکل پر سے ترپال ہٹائی، سر پر ہیلمٹ رکھا۔ میں نے پیچھے بیٹھ کر اسے مضبوطی سے پکڑ لیا اور تھوڑی دیر بعد ہم مسٹر آرتھر کے گھر پہنچ گئے۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ ان کا مکان قصبے میں سب سے بڑا تھا اور اس کے چاروں طرف لوہے کی مضبوط باڑھ لگی ہوئی تھی۔ ہم پورچ میں پہنچے تو وہاں پہلے سے پرانے ماڈل کی دو کاریں کھڑی ہوئی تھیں جن میں سے ایک کو میں پہچانتا تھا وہ جوناتھن بیسٹ کے استعمال میں تھی۔

جیمز نے دروازے پر دستک دی لیکن اس سے پہلے کہ کوئی دروازہ کھولتا، ہمیں اپنے عقب میں ایک شور سا سنائی دیا۔ پلٹ کر دیکھا تو وہاں ایک بڑی سی زرد رنگ کی اسٹیشن ویگن آ کر رکی تھی۔ اس میں سے ایک طویل قامت شخص برآمد ہوا۔ اس نے اپنے دستانے اور چشمہ کار کی سیٹ پر پھینکا اور ہماری طرف بڑھا۔

''ہیلو۔'' اس نے خوش دلی سے کہا۔ ''کیا بات ہے، دروازہ کھولنے کوئی نہیں آیا۔ یہ ٹھیک نہیں ہے۔'' پھر اس نے خود ہی دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا جیسے یہ اس کا اپنا ہی گھر ہو۔ جیمز اور میں نے بھی اس کی تقلید کی۔ عین اسی وقت ایک خادمہ سفید ایپرن پہنے راہداری میں آئی۔

''مسٹر بلوم فیلڈ اس نے کہا۔'' وہ کچھ گھبرائی ہوئی لگ رہی تھی۔

''کوئی بات نہیں بیلا۔'' وہ بولا۔ ''معاف کرنا مجھے کچھ دیر ہو گئی۔ دراصل میں راستہ بھول گیا تھا۔ بہرحال اب میں یہاں پہنچ گیا ہوں اور تم ہم سب کے لیے کوئی ٹھنڈا مشروب لا سکتی ہو۔''

خادمہ کے جانے کے بعد ایک اور آواز سنائی دی۔ ''بلوم فیلڈ، یہ تم ہو، اندر آ جاؤ۔''

مسٹر آرتھر ہنری بیسٹ ایک مہاگنی کی میز کے عقب میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ کمرے میں ایک اور شخص بھی آتش دان کے پاس کھڑا ہوا تھا جسے میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا لیکن وہ بھی اپنی وضع قطع سے کوئی امیر شخص لگ رہا تھا۔

مسٹر بیسٹ نے لکھنا بند کیا اور بولا۔ ''جیمز ہیریسن، تم یہاں کیا کر رہے ہو؟'' اس کا انداز کاٹ کھانے والا تھا۔

''مجھے ایک بے وقوف لڑکی کے بارے میں اطلاع ملی ہے اور میں توقع کر رہا تھا کہ تم اس چھوٹے سے معاملے سے نمٹ لو گے لیکن تم اس لڑکے کے ساتھ یہاں چلے آئے۔''

جیمز آگے بڑھا اور میں نے بھی اس کی تقلید کی۔ مجھے یاد تھا کہ جب مل میں ایک حادثے کے دوران میری ٹانگ ٹوٹ گئی تھی تو مسٹر بیسٹ ماما سے ملنے بورڈنگ ہاؤس آئے تھے۔ میں نے اپنے کمرے سے ان کی گفتگو سنی۔ مسٹر بیسٹ نے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ مل میں ہونے والے ہر چھوٹے موٹے حادثے کے ذمے دار نہیں۔ اس لیے میری ماما کو کسی معاوضے کی توقع نہیں کرنی چاہیے۔ میری ماما نے جواب میں جو کچھ کہا، وہ میں نہیں سن سکا لیکن اس کے بعد سے ہی میں مسٹر بیسٹ کو ناپسند کرنے لگا۔

''یہ چھوٹا معاملہ نہیں ہے، مسٹر بیسٹ۔'' جیمز نے نرم لہجے میں کہا۔ ''ایک عورت مر گئی ہے میں اسے چھوٹا معاملہ نہیں سمجھتا۔''

''میں نے سنا ہے کہ اس طرح کے حادثے مسٹر بیسٹ کے کارخانوں میں ہوتے رہتے ہیں۔'' بلوم فیلڈ بولا۔

''یہ حادثہ نہیں قتل ہے۔'' جیمز آہستہ سے بولا۔

''قتل۔'' مسٹر بیسٹ اپنی جگہ سے اچھل پڑا۔ ''بے وقوف، یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ میں تو تمہیں بہت عقل مند سمجھتا تھا، یہ بے ہودہ خیال تمہارے ذہن میں کیسے آیا؟''

جیمز بڑے صبر کے ساتھ مسٹر بیسٹ کی میز کے سامنے کھڑا ہوا تھا لیکن مجھے اپنی زخمی ٹانگ کی وجہ سے کھڑے ہونے میں مشکل پیش آ رہی تھی۔ میں بار بار اپنا بوجھ ایک ٹانگ سے دوسری ٹانگ پر منتقل کر رہا تھا۔

''کیا تم نہیں سمجھتے ڈیڈی کہ تمہیں اپنے مہمانوں کو

کرسی پیش کرنا چاہیے۔''

میں نے مڑ کر دیکھا۔ جوناتھن بیسٹ راہداری میں کھڑا ہوا تھا۔

''مہمان۔'' مسٹر بیسٹ نے تحقیر آمیز لہجے میں کہا۔

''یہ مہمان نہیں بلکہ میرے ملازم ہیں۔''

جوناتھن نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ دیوار کے ساتھ رکھی ہوئی دو کرسیاں گھسیٹ کر ہمارے نزدیک لے آیا۔ میں فوراً ہی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ جوناتھن اور جیمز نے بھی اپنی نشستیں سنبھال لیں۔

''اب ہم آرام سے گفتگو کرسکیں گے۔'' مسٹر آرتھر بیسٹ نے طنزیہ انداز میں کہا۔''میں تمہارا بہت مشکور ہوں گا اگر تم اپنے غیر معمولی بیان کی وضاحت کرسکو ہیریسن۔''

جیمز نے پورا واقعہ بیان کر دیا کہ کس طرح جولیا کی لاش پل کے نیچے مجھے ملی، وغیرہ وغیرہ۔

''ہاں، میں یہ سب سن چکا ہوں۔'' مسٹر بیسٹ نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔''بے چاری لڑکی دریا میں گر پڑی اور ڈوب گئی۔ البرٹ کول مین نے صبح ہی مجھے ڈپو سے فون کر کے بتا دیا تھا۔''

البرٹ کول مین اس ریلوے ڈپو کا انچارج تھا جہاں سے مل کے لیے ریل گاڑی سامان لانے اور لے جانے کے لیے چلتی تھی اور گاؤں میں وہی واحد جگہ تھی جہاں ٹیلی فون کی سہولت موجود تھی۔

''اس نے تمہیں کیا بتایا تھا؟'' جیمز نے پوچھا۔

''یہی کہ ایک لڑکی کی لاش دریا سے ملی ہے اور بس۔'' مسٹر بیسٹ نے غصے سے سرخ ہوتے ہوئے کہا۔ ''ظاہر ہے کہ یہ ایک حادثہ تھا۔''

''نہیں جناب۔'' میں نے کہا۔''مجھے اس کی لاش ملی تھی اور وہ نارنجی رنگ میں ڈوبی ہوئی تھی جس کا مطلب ہے کہ وہ کافی دیر رنگوں کے حوض میں پڑی رہی۔ جولیا کا اپنا اسکارف اس کی گردن کے گرد سختی سے بندھا ہوا تھا اور اس کی گرہ پیچھے کی جانب تھی۔ یہ حادثہ نہیں تھا۔''

''جولیا۔'' جوناتھن چونکتے ہوئے بولا۔''تم جولیا سمپسن کی بات کر رہے ہو؟''

''ہاں جولیا سمپسن۔'' جیمز نے کہا۔''لگتا ہے کہ کسی نے اس کا گلا گھونٹ کر مار دیا ہے۔''

''یہ گاؤں کا مسئلہ ہے۔'' مسٹر بیسٹ نے ناگواری سے کہا۔''اور میں تمہیں اسی کام کی تنخواہ دیتا ہوں۔ بے چاری لڑکی کا گلا گھونٹ کر دریا میں پھینک دیا گیا۔ اس کا میری مل سے کوئی تعلق نہیں۔''

''نہیں جناب۔'' جیمز نے آہستہ سے کہا۔''میں آپ سے اتفاق نہیں کرتا، یہ تو طے ہے کہ اس کا گلا گھونٹا گیا اور اس کی لاش دریا سے ملی لیکن وہ پوری طرح نارنجی رنگ میں رنگی ہوئی تھی جس کا مطلب ہے کہ وہ فنشنگ پلانٹ میں رنگوں کے حوض میں پڑی رہی اور وہاں سے بہتی ہوئی دریا تک پہنچ گئی۔''

میں اس دوران جوناتھن کو دیکھتا رہا۔ اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور مسٹر بیسٹ کی میز کے قریب آکر بولا۔''ڈیڈی!''

''اپنا منہ بند رکھو لڑکے۔'' مسٹر بیسٹ نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔''بیٹھ جاؤ اور اپنے آپ پر قابو رکھو۔ اس سے پہلے کہ تم ہمیشہ سے زیادہ احمق نظر آنے لگو۔''

''مسٹر بیسٹ۔'' جیمز نے کہا۔''میں آپ سے اور آپ کے بیٹے سے چند سوالات کرنا چاہوں گا۔''

''تمہیں اس گاؤں سے باہر کوئی اختیار نہیں ہے۔'' مسٹر بیسٹ نے کہا۔''اور نہ ہی اس لڑکی سے ہمارا کوئی تعلق تھا۔''

''وہ تمہاری ایک مل میں کام کرتی تھی۔'' جیمز نے یاد دلایا۔

''وہ فنشنگ ڈپارٹمنٹ میں تھی۔'' جوناتھن نے کہا۔ ''جہاں میں تربیت لے رہا تھا۔ میں اسے جانتا ہوں اور ڈیڈی تم بھی اس سے واقف ہو۔ تم ہی نے ایک ہفتے پہلے مجھ سے کہا تھا کہ اس سے دوبارہ نہ ملوں۔ اس بات سے تمہارا کیا مطلب تھا؟''

''میں جاننا چاہوں گا کہ تمہارے بیٹے نے ابھی جو کہا، اس کا کیا مطلب ہے۔'' جیمز بولا۔''میں جانتا ہوں کہ تمہاری یا تمہارے بیٹے کی اس افسوسناک حادثے میں شامل ہونے کی کوئی سوچ نہیں تھی لیکن مجھے تمام حقائق معلوم کرنا ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ تم میری بات سمجھ رہے ہو گے۔''

جوناتھن بولا۔''ہاں، میں کسی طرح بھی اس معاملے میں ملوث نہیں ہوں اور مجھے یقین ہے کہ ڈیڈی تم بھی اس میں شامل نہیں ہو۔''

جیمز نے مسٹر بلوم فیلڈ اور اس دوسرے آدمی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جو آتش دان کے پاس کھڑا ہوا تھا۔ ''کیا آپ دونوں تھوڑی دیر کے لیے باہر جانا پسند کریں گے کیونکہ آپ لوگوں کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔'' مسٹر بلوم فیلڈ اور وہ دوسرا شخص خاموشی سے باہر چلے

گئے۔ ان کے جانے کے بعد جیمز نے کہا۔ ''مسٹر بیسٹ اور مسٹر جوناتھن، میں تم دونوں کو وہ سب کچھ بتانا چاہتا ہوں جو میں اور سام اب تک معلوم کر سکے ہیں لیکن میرے خیال میں یہ کافی نہیں ہے۔''

اس کے بعد جیمز نے تمام واقعہ تفصیل سے بتایا کہ جولیا کے گلے میں اسکارف کتنی مضبوطی سے باندھا گیا تھا۔

''ایسے اسکارف ہماری کمپنی کے اسٹور میں نہیں ہوتے۔'' میں نے بھی بولنا ضروری سمجھا۔

مسٹر بیسٹ نے غصے سے کہا۔ ''یہ کوئی اہم بات نہیں ہے۔''

''ڈیڈی! اتنا برہم ہونے کی ضرورت نہیں۔'' جوناتھن نے کہا۔ ''یہ بات بہت اہم ہے کیونکہ اس کیس میں یہ اسکارف ہی آلۂ قتل ہے۔''

''اسکارف ہی واحد چیز نہیں بلکہ ہمیں اس کے بائیں ہاتھ کی مٹھی سے سر پر باندھنے والی جالی بھی ملی ہے۔''

''تب تو اس میں کوئی عورت ملوث ہو سکتی ہے۔'' مسٹر بیسٹ نے کہا۔

''ممکن ہے۔'' جیمز بولا۔ ''اس کے علاوہ ہمیں ایک چیز اور بھی ملی ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر وہ چمکتی ہوئی چین نکالی جو جولیا نے اسکارف کے نیچے پہنی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ دل کی شکل کا لاکٹ لٹکا ہوا تھا۔ جیمز نے انگلیوں کی مدد سے وہ لاکٹ کھولا تو اس میں سے کاغذ کا ایک چھوٹا ٹکڑا برآمد ہوا۔

''کیا تم دونوں میں سے کوئی اس نیکلس کو پہچانتا ہے؟''

جوناتھن ایک گہری سانس لیتے ہوئے بولا۔ ''پہلے میں سمجھا کہ یہ میرا ہے لیکن میں غلطی پر تھا۔ یہ ایک سستا سا لاکٹ ہے جس پر سونے کا پانی چڑھایا گیا ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں پہلے اسے نہیں دیکھا۔''

''میرا بیٹا ٹھیک کہہ رہا ہے ہیریسن۔'' مسٹر بیسٹ نے کہا۔ ''میں نہیں جانتا کہ تم ہم سے کس ردِعمل کی توقع کر رہے تھے۔ امید ہے کہ اب تم مطمئن ہو گئے ہو گے۔''

''جی جناب۔'' جیمز نے کہا۔ ''میں مکمل طور پر مطمئن ہو گیا ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے وہ لاکٹ دوبارہ اپنی جیب میں رکھ لیا اور بولا۔ ''اگر تم خیال نہ کرو تو میں مزید چند سوالات کرنا چاہتا ہوں۔''

''جو پوچھنا ہے جلدی پوچھو۔'' مسٹر بیسٹ نے کہا۔

''میں ایک مصروف شخص ہوں لیکن تمہیں تھوڑا سا وقت اور دے سکتا ہوں۔''

''ہم جانتے ہیں کہ جولیا کا گلا گھونٹا گیا ہے اور یہ کارروائی کل سہ پہر میں کسی وقت ہوئی ہے کیونکہ وہ رنگوں کے حوض سے نکل کر دریا تک پہنچی۔''

''وہ حوض ہر دوسرے ہفتے تقریباً سات بجے خالی کیے جاتے ہیں۔'' جوناتھن نے کہا۔

''ہاں۔'' جیمز بولا۔ ''اور مجھے ہیرم ایلبری نے بتایا ہے کہ تم دونوں اور ایستھر ایلبری بھی کل شام مل میں موجود تھے۔''

''ہم دفتر میں کچھ فائلیں دیکھ رہے تھے۔'' مسٹر بیسٹ نے کہا۔ ''ایستھر ایلبری سیکریٹری ہے۔ اس لیے وہ بھی ہمارے ساتھ کام کر رہی تھی۔''

''اور تمہارا کام کس وقت ختم ہوا؟'' جیمز نے پوچھا۔

''ہم نے تقریباً چھ سے نو بجے تک کام کیا۔'' جوناتھن بولا۔ ''ایستھر نے کہا کہ وہ اپنی بہن کے پاس جانا چاہتی ہے۔ لہٰذا میں نے اسے اپنے ساتھ چلنے کی پیشکش کر دی۔''

''ہاں، ہیرم ایلبری نے بھی یہی بتایا تھا۔'' جیمز نے تائید میں سر ہلایا۔ ''گویا تم چاروں کل شام مل کے دفتر میں موجود تھے جو فنشنگ ڈپارٹمنٹ اور رنگ والے حوض کے برابر میں ہی ہے۔ کیا تم لوگوں نے اس دوران کوئی غیر معمولی بات دیکھی یا سنی؟''

''نہیں۔'' مسٹر بیسٹ نے کہا۔

''کیا تم چاروں اس دوران پورے وقت اکٹھے رہے؟''

''ہاں، اس وقت تک ہم سب ساتھ تھے، پھر جوناتھن، ایستھر ایلبری کو چھوڑنے چلا گیا اور میں نے ہیرم کو اپنی کار میں اس کے گھر اتار دیا۔ میں دس بجے سے پہلے اپنے گھر پہنچ چکا تھا۔''

''اب میں سمجھا۔'' جیمز نے کہا۔ ''میں صرف اپنا یقین کرنا چاہ رہا تھا۔ چلو سام، ہمیں اور بھی کام کرنے ہیں۔ مسٹر بیسٹ، مسٹر جوناتھن، تمہارے قیمتی وقت کا شکریہ۔''

میں تھوڑا سا حیران ہوا لیکن فوراً ہی اپنی جگہ سے اچھل کر کھڑا ہو گیا اور ایسا کرتے ہوئے میرا پاؤں فرش پر رکھے ہوئے گلاس سے ٹکرایا جو میں وہاں رکھ کر بھول گیا تھا لیکن اس سے پہلے کہ کوئی گڑبڑ ہوتی، جوناتھن نے اپنا بایاں ہاتھ بڑھا کر وہ گلاس پکڑا اور اسے اپنے باپ کی میز پر رکھ دیا۔

''یہ تمہارے بازو پر زخم کیسا ہے؟'' جیمز نے کہا۔

''اوہ، یہ زخم نہیں، رنگ کا دھبا ہے۔'' جوناتھن نے

اپنی آستین کا کف نیچے کرتے ہوئے کہا۔ ہم دونوں کی نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ ہمیں دیکھتے ہوئے بولا۔
''میں فنشنگ ڈپارٹمنٹ میں سپروائزر کی تربیت حاصل کررہا ہوں۔ تم جانتے ہو کہ وہاں رنگ کے چھینٹے اڑتے رہتے ہیں اور ان کے دھبے کبھی صاف نہیں ہوتے۔''
''جی جناب۔'' جیمز نے کہا۔ ''میں نے بھی جنگ سے پہلے ان تالابوں میں مکسر لگوائے ہیں لیکن ان کے اوپر ڈھکنے ہوتے تھے تاکہ رنگ کے چھینٹے باہر نہ جائیں۔ کیا یہ ڈھکنے وہاں نہیں ہیں؟''
''ان ڈھکنوں کی وجہ سے ہمارا کام متاثر ہورہا تھا۔'' مسٹر بیسٹ نے کہا۔ ''اس لیے ہم نے استعداد بڑھانے کے لیے انہیں ہٹادیا۔''
''کیا اس طرح رنگائی کا عمل غیر محفوظ نہیں ہوگیا۔'' جیمز نے کہا۔
''بالکل نہیں۔'' مسٹر بیسٹ نے کہا۔ ''یہ بالکل محفوظ طریقہ ہے اور اس میں کوئی خطرہ نہیں۔''
''مجھے یقین ہے کہ ڈائی روم میں ہر چیز محفوظ ہے۔ اگر میں ایک نظر وہ جگہ دیکھنا چاہوں تو تمہیں کوئی اعتراض تو نہ ہوگا۔ ویسے بھی آج مل بند ہے۔''
''تم وہاں جاسکتے ہو لیکن میں تمہیں چابیاں نہیں دے سکتا کیونکہ سپروائزر کے پاس صرف دو سیٹ ہیں البتہ تم ایلبری سے چابیاں لے سکتے ہو۔'' مسٹر بیسٹ نے کاغذات پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔
''شکریہ جناب۔'' جیمز بولا۔ ''سام چلو۔''
گاؤں واپس آنے کے بعد ہم تھوڑی دیر کے لیے بورڈنگ ہاؤس میں رکے۔ موٹر سائیکل شیڈ میں کھڑی کی اور کھانا کھانے کے بعد چابیاں لینے کے لیے ہیرم ایلبری کے مکان کی جانب چل دیے۔ جیمز نے دروازے پر دستک دی۔ ہیرم باہر آیا تو جیمز نے پہلے اس کی بیوی کا حال پوچھا تو ہیرم نے کہا۔ ''وہ جاگ گئی ہے اور بستر پر نیم دراز ہے۔ اس کی بہنیں اور دو پڑوسی آگئے ہیں جو اس کی دیکھ بھال کررہے ہیں۔''
''یہ جان کر خوشی ہوئی کہ ایستھر کی طبیعت اب بہتر ہے۔ مسٹر بیسٹ نے کہا ہے کہ میں تم سے چابیاں لے لوں۔ البتہ تمہیں یہ زحمت نہیں دوں گا کہ تم بھی ہمارے ساتھ چلو۔''
ہیرم اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں چابیوں کا گچھا تھا، وہ بولا۔ ''مجھے تم دونوں کے ساتھ جاکر خوشی ہوگی تاکہ تمہیں وہ سب کچھ دکھا سکوں جو تم دیکھنا چاہو۔''
گریڈی بیسٹ مل نمبر سات، کارخانوں کی قطار میں سب سے آخری تھی اور یہ ساری ملیں مسٹر آرتھر ہنری بیسٹ کی ملکیت تھیں۔ یہ مل سب سے زیادہ بڑی اور نئی تھی۔ اس میں کارکن بھی زیادہ تھے اور تمام مشینری جدید تھی۔
جیمز، ہیرم اور میں دریا کا پل پار کرکے مل کے گیٹ پر پہنچے تو دربان نے ہمیں دیکھ کر گیٹ کھول دیا۔ ہم تینوں مل کے دفتر کے آگے سے گزرتے ہوئے فنشنگ پلانٹ پر پہنچے۔ ہیرم نے تالا کھولا تو جیمز نے پوچھا۔
''جب تم یہاں نہیں ہوتے تو اپنی چابیاں کہاں رکھتے ہو؟''
''اپنے گھر کے بیرونی دروازے کے باہر لگے ہوئے ہک میں۔'' ہیرم نے کہا۔ ''تاکہ جب کام پر جانے لگوں تو چابیاں لینا نہ بھولوں۔''
وہ ایک بڑا سا اونچی چھت والا ہال تھا۔ وہاں رنگوں کے کئی حوض تھے جن کے درمیان پچیس فٹ کا فاصلہ تھا۔ ہم ان تالابوں کے درمیان سے گزرے جو سرخ، نیلے، سبز اور دیگر رنگوں سے بھرے ہوئے تھے۔ ہمارے چاروں طرف دیواروں، چھت اور فرش پر رنگ ہی رنگ تھے اور جابجا ان کے چھینٹے پڑے ہوئے تھے۔ ہم اس طویل قطار کے آخری حوض تک پہنچے جو خالی تھا لیکن اس کے اردگرد نارنجی رنگ کے چھینٹے پڑے ہوئے تھے۔ میں نے اس کے کناروں پر ہاتھ رکھ کر اندر جھانکنے کی کوشش کی۔ وہ بہت گہرا، تاریک اور ڈراؤنا تھا۔ گزشتہ رات خالی کرنے کے بعد اسے پانی سے دھویا گیا تھا۔ میں نے جیمز سے پوچھا۔
''ہمیں کس چیز کی تلاش ہے؟''
جیمز اندر جھانکتے ہوئے بولا۔ ''کوئی ایسی جگہ جہاں جدوجہد کے آثار نظر آئیں۔''
میں تالاب کی دوسری طرف گیا اور اندر جھانکنے کے بجائے فرش اور دیواروں کا معائنہ کرنے لگا۔ میں بتا نہیں سکتا لیکن وہ دھبے مجھے تازہ لگ رہے تھے۔ میں نے گھٹنوں کے بل جھک کر عقبی دیوار پر ہاتھ رکھا تو وہ نارنجی ہوگیا اور وہ جگہ مجھے گیلی لگی۔ میں نے جیمز کو اپنا ہاتھ دکھایا۔ اس نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر دیکھا پھر دیوار کو دیکھتے ہوئے بولا۔
''میں نے جنگ سے پہلے یہاں کچھ کام کیا تھا اور مجھے یاد پڑتا ہے کہ یہاں ایک دروازہ بھی تھا۔''
''کچھ عرصہ پہلے جب عمارت میں داخلے کے لیے

نئے دروازے بنائے گئے تو اسے اینٹوں سے چن دیا گیا تھا۔'' ہمارے پیچھے کھڑے ہوئے ہیرم نے بتایا۔

جیمز نے دیوار پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''میں دیکھ رہا ہوں کہ اس کا رنگ مختلف ہے۔ کسی نے بہت عمدگی سے یہ کام کیا ہے۔''

پھر اس نے حوض کے گرد ایک چکر لگا کر فرش اور دیواروں کو دیکھا اور ہمارے پاس آکر کہنے لگا۔ ''تم فرش پر قدموں کے نشان دیکھ رہے ہو، یہ بالکل نئے لگ رہے ہیں۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ یہاں کس وقت کیا کام ہوتا ہے؟''

ہیرم سنبھلتے ہوئے بولا۔ ''ہفتے کو آدھے دن کام ہوتا ہے اس لیے دوپہر کو آخری رنگائی ہوتی ہے اس کے بعد رنگ بنانے والے آتے ہیں اور وہ پیر کی صبح کے لیے تیاری کرتے ہیں۔ ان کا کام پانچ بجے ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد صفائی والے چھ سات بجے تک فرش کی صفائی کرتے ہیں۔ نو بجے کے قریب مکینک اور اس کا مددگار مشینوں کو چیک کرتے اور والو کھولتے ہیں۔ ہفتے کے روز صفائی والے سات بجے چلے گئے اور پونے نو بجے مکینک آیا تھا۔''

''اس کا مطلب ہے کہ یہاں سات سے پونے نو کے درمیان کوئی نہیں تھا۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں جو دیکھنا تھا وہ دیکھ لیا۔'' جیمز نے کہا۔

''ٹھیک ہے پھر میں تالا لگا دیتا ہوں۔'' ہیرم نے پُرسکون ہوتے ہوئے کہا۔ ''رنگ ملانے والے بارہ بجے آئیں گے تاکہ صبح کے لیے رنگ تیار کر سکیں۔''

''ان کے لیے تالا کون کھولتا ہے؟'' جیمز نے پوچھا۔

''میں ہی ہمیشہ ان کے ساتھ ہوتا ہوں۔'' ہیرم نے کہا۔ ''ہمارے پاس ایک چابی اور بھی ہے لیکن وہ دفتر کے سیف میں رہتی ہے۔''

''تم اسی دفتر کی بات کر رہے ہو، جہاں گزشتہ شام تم اور ایستھر، مسٹر بیسٹ اور ان کے بیٹے کے ساتھ میٹنگ کر رہے تھے۔''

''ہاں، ہم تقریباً نو بجے تک وہاں رہے۔''

بورڈنگ ہاؤس واپس آنے کے بعد جیمز نے کہا۔ ''ہم ایک نظر جولیا کے کمرے کو بھی دیکھ لیتے ہیں۔ اس کے بعد میں بتا سکوں گا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا۔''

وہ کمرا بھی بورڈنگ ہاؤس کے دوسرے کمروں جیسا ہی تھا، وہاں ایک سنگل بیڈ، سائڈ ٹیبل، ایک الماری کے علاوہ کچھ فلمی اداکاروں کی تصویریں میز پر رکھی ہوئی تھیں۔ جیمز نے الماری کھول کر دیکھی اور اسے بند کرتے ہوئے بولا۔ ''میں نہیں سمجھتا کہ یہاں ہمارے مطلب کی کوئی چیز ہے۔ اب میں بتاتا ہوں کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔''

☆☆☆

چار گھنٹے بعد میں دوبارہ ہیرم ایلبری کے گھر گیا۔ وہاں وہ تمام لوگ موجود تھے جن سے ہم سارا دن باتیں کرتے رہے۔ مسٹر آرتھر بیسٹ ایک بڑی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ جیبی گھڑی اس کے ہاتھ میں تھی اور وہ بار بار اس میں وقت دیکھ رہا تھا جبکہ اس کا بیٹا جوناتھن آرام سے پیر پھیلائے سیٹی پر نیم دراز تھا۔ سب سے زیادہ حیرت مجھے مسٹر بلوم فیلڈ کو دیکھ کر ہوئی جسے جیمز نے دوسرے لوگوں کے ساتھ یہاں بلایا تھا۔ ایستھر اپنے ہاتھوں میں ایک ٹرے لے کر آئی۔ اس نے ہر ایک کو مشروب کا گلاس پیش کیا۔

''کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تم نے ہم لوگوں کو یہاں کیوں بلایا ہے؟'' مسٹر بیسٹ نے لیمن کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

''جانتا ہوں کہ تم سب لوگ بہت مصروف ہو۔ اس لیے تمہارا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔'' پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''سام، تم اپنی نوٹ بک لائے ہو؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ بولا۔ ''یہاں جو بات بھی کہی جائے وہ لکھتے جاؤ تاکہ ہم پولیس کو دکھا سکیں۔''

ہیرم ایلبری کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ ''تم جانتے ہو کہ جولیا تھمپسن کو کس نے قتل کیا؟''

''ہاں مجھے معلوم ہے۔'' جیمز نے جواب دیا۔

''پھر تم نے پہلے ہی اسے گرفتار کرنے کے لیے پولیس کو کیوں نہیں بلا لیا؟'' جوناتھن نے پوچھا۔

''مسٹر آرتھر نے صبح مجھے یاد دلایا تھا کہ یہ گاؤں کا معاملہ ہے۔'' جیمز نے اپنی نرم آواز میں کہا۔ ''جولیا فنشنگ پلانٹ میں کام کرتی تھی۔ ہیرم ایلبری اس کا سپروائزر تھا۔ اس کی بیوی مل میں سیکریٹری ہے۔ مسٹر جوناتھن وہاں زیرِ تربیت ہے اور مسٹر آرتھر تم اس مل کے مالک ہو۔''

''تم فضول باتیں کر رہے ہو۔'' مسٹر بیسٹ نے غصے سے کہا۔ ''میں تمہارے کام سے مطمئن نہیں ہوں۔ ممکن ہے کہ مجھے تمہاری جگہ کوئی دوسرا آدمی تلاش کرنا پڑے۔''

جیمز کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ ''یہ تمہارے اوپر منحصر ہے لیکن میں اب بھی کانسٹیبل ہوں اور تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ جولیا کی موت کیسے واقع ہوئی۔''

''ٹھیک ہے، بتاؤ۔'' مسٹر بیسٹ نے بیزاری سے کہا۔

جیمز نے باری باری سب کو دیکھا اور بولا۔ ''سب سے پہلے مجھے ایستھر پر شبہ ہوا۔ جولیا سے اس کی حال ہی میں جھڑپ ہوئی تھی۔ یہی نہیں بلکہ جب جولیا کی لاش دریا سے نکالی گئی تو اس کی مٹھی میں اسی رنگ کی بالوں والی جالی دبی ہوئی تھی جو ایستھر استعمال کرتی ہے۔''

''کئی عورتیں اس طرح کی جالی استعمال کرتی ہیں۔'' ایستھر نے کہا۔ ''اور ان کے رنگ بھی مختلف نہیں ہوتے۔''

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔'' جیمز نے کہا پھر ہیرم سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''تم اس کے سپروائزر تھے اور تم نے ہی اسے اس کام پر لگایا تھا اور اسٹور میں جھڑپ کے دوران ایستھر نے کچھ ایسی بات کہی تھی جیسے تم جولیا پر کچھ زیادہ ہی مہربان تھے۔''

جوناتھن قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ ''جبکہ وہ اس کی طرف دیکھنا بھی پسند نہیں کرتی تھی۔''

اس کے بعد جیمز نے جوناتھن کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''تم بھی اس پر بہت زیادہ مہربان تھے اور اسے تحفے دیا کرتے تھے۔''

جوناتھن کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا، وہ بولا۔ ''میں تو کئی لڑکیوں کو تحفے دیتا ہوں، اس میں کیا ہرج ہے؟''

''واقعی کوئی ہرج نہیں ہے۔'' جیمز سر ہلاتے ہوئے بولا پھر اس نے مسٹر بیسٹ سے کہا۔ ''تمہیں یہ پسند نہیں تھا کہ تمہارا بیٹا جولیا پر توجہ دے۔ اسی لیے تم نے ہیرم سے کہا تھا کہ وہ اس لڑکی کو ملازمت سے فارغ کردے۔''

''اگر وہ میرے حکم کی تعمیل کرتا تو یہ واقعہ پیش نہ آتا۔''

''لیکن اس کے باوجود تم میں سے کوئی بھی اسے قتل نہیں کرسکتا تھا کیونکہ کل شام چھ بجے سے نو بجے تک تم سب لوگ دفتر میں میٹنگ کررہے تھے۔''

''تم نے خود ہی اعتراف کرلیا ہے جیمز کہ ہم میں سے کوئی بھی اسے قتل نہیں کرسکتا تھا پھر ہم سب کو یہاں کیوں جمع کیا گیا ہے؟'' مسٹر بیسٹ نے ناراضی سے کہا۔

''لیکن تم سب چاہتے تھے کہ وہ مرجائے۔ ایستھر اس سے حسد کرتی تھی۔ جوناتھن اس سے کھیل رہا تھا۔ ہیرم بھی اس پر مہربان تھا اور مسٹر بیسٹ تم چاہتے تھے کہ وہ تمہارے بیٹے کی زندگی سے نکل جائے۔''

''ہم سب دفتر میں اکٹھے تھے جب تمہارے کہنے کے مطابق یہ قتل ہوا؟'' جوناتھن نے کہا۔

مسٹر آرتھر اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ''میں یہ بکواس سنتے سنتے تنگ آگیا ہوں۔ اٹھو جوناتھن، ہم جارہے ہیں۔''

''میں پوری بات سننا چاہتا ہوں۔'' مسٹر بلوم فیلڈ نے کہا۔

''ٹھیک ہے۔ تم اپنی بات جاری رکھو۔'' مسٹر بیسٹ نے تھکے ہوئے لہجے میں جیمز سے کہا۔

''میرے پاس کوئی ثبوت تو نہیں ہے لیکن اتنا کہہ سکتا ہوں کہ تم سب پورے وقت دفتر میں اکٹھے نہیں رہے اور تم سب اس جگہ سے بہت قریب تھے جہاں یہ قتل ہوا۔ تم میں سے کسی ایک یا ایک سے زیادہ نے اسے قتل کرکے رنگ والے حوض میں پھینک دیا۔ اس امید پر کہ حوض کو جب خالی کیا جائے گا تو وہ بھی پانی کے ساتھ بہتی ہوئی دریا میں چلی جائے گی اور کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا کہ اسے قتل کرکے حوض میں ڈال دیا گیا تھا لیکن ایک رات پہلے دریا میں طوفان آیا تھا جس کی وجہ سے کئی شاخیں بھی بہتی ہوئی آگئیں جن میں سے ایک میں جولیا کی لاش پھنس گئی اور سام نے مچھلی پکڑنے کے دوران اسے دیکھ لیا۔''

مسٹر بلوم فیلڈ نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ''ہیریسن! میں اس مل کا نیا مالک ہوں۔ مجھے خوشی ہے کہ تم نے اس شخص کی حقیقت سے آگاہ کیا جس سے میں ایک بڑی رقم کا معاہدہ کرچکا ہوں۔ اگر یہ سب اپنے اعصاب پر قابو رکھتے تو اس لڑکی کے قتل کا معما کبھی حل نہیں ہوتا لیکن مجھے شبہ ہے کہ ان میں سے کوئی ایک ٹوٹ جائے گا۔''

آخر میں وہ کچھ ہوگیا جس کی مجھے بالکل توقع نہیں تھی۔ مسٹر آرتھر بیسٹ نے ایک کاغذ پر جرم کی مکمل تفصیل لکھی اور اپنے بیٹے سمیت دیگر تین افراد کو بھی موردِالزام ٹھہرایا۔ پھر اس نے مہاگنی کی میز پر اپنا سر زور سے مارا اور خودکشی کرلی۔ بقیہ تینوں ملزم جیل میں مقدمہ شروع ہونے کا انتظار کررہے ہیں۔

مسٹر بلوم فیلڈ ایک اچھے مالک ثابت ہوئے۔ وہ مسٹر بیسٹ کے مقابلے میں مل کے مزدوروں کا زیادہ خیال رکھتے ہیں۔ جیمز اب بھی اسٹور چلارہا ہے لیکن لگتا ہے کہ وہ جلد ہی شادی کرنے کے بارے میں سوچ رہا ہے۔ ممکن ہے کہ اس کی صورت میں مجھے اور میری بہنوں کو سوتیلا باپ مل جائے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے تو میں اپنی پہلی کہانی پر کام کررہا ہوں۔ اس کا پلاٹ تو مجھے مل گیا ہے۔ اگر اسے کہانی کی شکل نہ دی گئی تو یہ میرے لیے باعث شرم ہوگا۔

خود گرفتہ

جمال دستی

بعض کیس اتنے سہل ہوتے ہیں کہ سراغ رساں اپنی ہی کوششوں پر شرمندہ ہو جاتے ہیں... ایک سادہ و آساں قتل کی تفتیش کہ مجرم نظروں سے اوجھل ہی نہ ہو سکا...

آپ اپنے دام میں صیاد آگیا کی عملی تفسیر...

پولیس ڈیٹیکٹو برنیڈ اوائٹ نے اپنی پولیس گشتی کار کے فلیٹ ٹائر پر ایک ٹھوکر رسید کی اور بڑبڑانے لگی۔ ''اسے بھی اسی وقت پنکچر ہونا تھا۔''

''کوئی مشکل درپیش ہے، ڈیٹیکو؟'' ایک آواز نے پکارا۔

''ارے، مسٹر میئر۔ ہاں، میں قتل کی ایک جائے واردات پر جا رہی ہوں اور یہ کچھ ہو گیا۔'' برنیڈ اوائٹ نے اپنی پٹرول کار کے فلیٹ ٹائر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''میرے ساتھ بیٹھ جاؤ۔ میں تمہیں وہاں پہنچا دیتا

ہوں۔'' میئر نے جواب دیا۔
برنیڈا وائٹ، میئر کے برابر کی پسنجر سیٹ پر بیٹھ گئی اور میئر نے کار آگے بڑھا دی۔
''کس کا قتل ہوا ہے؟'' میئر نے پوچھا۔
''مجھے نہیں معلوم۔ مجھے بس یہی بتایا گیا ہے کہ وہ ایک ادھیڑ عمر آدمی ہے، اس کی جسامت درمیانی اور دیکھنے میں نیولے کے مانند لگتا ہے۔ مجھے یہ کیس سپرد کرتے ہوئے چیف نے بس یہی معلومات فراہم کی ہیں۔'' سراغ رساں برنیڈا وائٹ نے جواب دیا۔
''ویل، گڈ لک ڈیٹیکٹو۔ مجھے امید ہے کہ تم یہ کیس جلد حل کرلوگی۔''
ان کا بقیہ سفر خاموشی میں گزر گیا۔ میئر نے برنیڈا وائٹ کو شہر کے نواحی علاقے میں واقع ایک بدوضع سے موٹیل پر اتار دیا جہاں متعدد پولیس کاریں پہلے سے کھڑی ہوئی تھیں۔
''مجھے یقین ہے کہ ان پولیس افسران میں سے کوئی نہ کوئی تمہیں واپس پہنچا دے گا۔'' میئر نے برنیڈا وائٹ کے گاڑی سے نیچے اترنے کے بعد کہا اور اپنی کار آگے بڑھا دی۔
سراغ رساں برنیڈا وائٹ کی نگاہ ایک پٹرول مین پر پڑی جو ماضی میں اس کے ساتھ کام کرچکا تھا۔
''سارجنٹ مورالس۔'' برنیڈا...... نے اسے آواز دی۔ ''ہمارے پاس اب تک کی کیا معلومات ہیں؟''
''ڈرائیور لائسنس کے مطابق مقتول کا نام اینڈریو کولیئر ہے۔ وہ ویسٹ اسٹریٹ کا رہائشی ہے۔ ہم نے اپنے عملے کو وہاں روانہ کردیا ہے۔''
''اور جائے واردات؟''
''اس قسم کے میل جول کی جگہ کے لحاظ سے یہ خاصا صاف ستھرا موٹیل ہے۔ فارنسک کے عملے کو کمرے میں صرف ایک انگلی کا نشان ملا ہے جو بیڈ کے ساتھ رکھے ہوئے نائٹ اسٹینڈ پر تھا۔ ہمیں نہیں معلوم کہ وہ نشان کس کا ہے لیکن وہ مقتول کی انگلیوں کے نشانات سے میچ نہیں کرتا۔''
''وہ نشان پرانا اور کئی ہفتوں کا بھی ہوسکتا ہے۔'' برنیڈا...... نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔
''ہم چیک کرلیں گے۔'' سارجنٹ مورالس نے کہا۔ ''اینڈریو کولیئر کو گلا دبا کر مارا گیا ہے اور لگتا ہے کہ قاتل نے ننگے ہاتھوں سے اس کا گلا دبایا ہے۔ فارنسک کے لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ مقتول کی گردن پر سے نشانات حاصل کرلیں گے۔ اگر وہ نشانات نائٹ اسٹینڈ پر موجود نشانات سے میچ کر گئے تو......''
''ہمیں امید رکھنی چاہیے کہ ایسا ہی ہو۔ کیا موت کے وقت کا تعین کیا جاچکا ہے؟'' سراغ رساں نے پوچھا۔
''درجۂ حرارت اور نیل کے نشانات کی بنیاد پر اینڈریو کولیئر کی موت لگ بھگ نصف شب کے وقت واقع ہوئی ہے۔''
''تب تو میں یہاں مزید اور کچھ نہیں کرسکتی۔'' برنیڈا وائٹ نے کہا۔ ''میں واپس پولیس اسٹیشن جانا چاہتی ہوں۔ مجھے اپنی پٹرول کار میں وہاں لے چلو۔''
پھر جب وہ دونوں سارجنٹ مورالس کی کار کی جانب چلنا شروع ہوئے تو مقتول کے کمرے کے برابر والے کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک عورت باہر جھانکنے لگی۔
''ایکسکیوزمی، مس۔'' برنیڈا وائٹ نے اس عورت کو مخاطب کیا۔ ''کیا آپ ہماری کچھ مدد کرسکتی ہیں؟''
''کس قسم کی مدد؟''
''کیا آپ رات بھر اسی کمرے میں مقیم تھیں؟''
''ہاں۔'' عورت نے جواب دیا۔ ''کیا یہ گہما گہمی اس شوروغل کی وجہ سے تو نہیں جو رات کو اس کمرے میں ہورہا تھا؟'' عورت نے مقتول کے کمرے کی سمت اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔
''شوروغل؟''
''ہاں، میں فلوریڈا جانے کے لیے سفر کررہی تھی تو تھکن کے باعث میں نے آرام کرنے کا فیصلہ کیا اور اس موٹیل پر رک گئی۔ رات کو سوتے ہوئے میری آنکھ کھل گئی۔ نیند سے بیداری کا سبب وہ شوروغل تھا جو برابر کے کمرے میں ہورہا تھا۔ دو آدمی کسی بات پر آپس میں زور زور سے باتیں کررہے تھے۔'' عورت نے بتایا۔
''کیا آپ نے سنا تھا کہ وہ کیا باتیں کررہے تھے؟'' برنیڈا...... نے جاننا چاہا۔
''ان میں سے کسی نے کچھ اس قسم کی بات کہی تھی۔ میں اب مزید ادا نہیں کروں گا۔ اور دوسرے نے کہا تھا۔ تب میرا خیال ہے کہ مجھے اخبارات تک جانا پڑے گا۔''
یہ سن کر سراغ رساں اور سارجنٹ ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔
''بلیک میل؟'' سارجنٹ مورالس نے خیال ظاہر کیا۔
''ایسا ہی لگتا ہے۔'' برنیڈا...... نے اثبات میں سر

بارہ بجے

امرتسر کے سردار دوسری برادریوں کے ان طعنوں سے تنگ آگئے کہ بارہ بجے سکھوں کی عقل سونے چلی جاتی ہے۔ ہر زبان سے یہ سن کر ان کے سیانوں نے فیصلہ کیا کہ دن کے بارہ بجے گھنٹا گھر پر سارے سردار جمع ہو کر دیکھیں کہ بارہ بجے کچھ نہیں ہوتا۔ یوں وہ اس لعنت سے نجات حاصل کرلیں گے۔

مقررہ دن بارہ بجنے سے پہلے ہی امرتسر کے سارے سکھ گھنٹا گھر پر امڈ آئے۔ سب کی نظریں گھڑیال پر تھیں۔ سوئیاں سرکتی رہیں... پھر بارہ بجنے میں صرف تین منٹ رہ گئے۔ سب لوگ ہیجان میں مبتلا تھے۔ وقت گزرتا رہا لیکن گھڑیال کی سوئیاں وہیں رکی رہیں۔ جب ان کی دستی گھڑیوں میں پندرہ منٹ اور گزر گئے تو سب کو تشویش ہوئی۔ چند ہوشیار سکھ گھنٹا گھر کی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر چل دیے تاکہ دیکھیں کہ ماجرا کیا ہے۔ وہ گھڑیال برسوں سے ٹھیک وقت دیتا آرہا تھا، اس اہم وقت پر اس میں کیا خرابی آگئی تھی۔

وہ اوپر پہنچے تو دیکھا ایک سردار گھنٹے کے پنڈولم سے لٹکا ہوا تھا۔ اس کے منہ سے جھاگ اڑ رہے تھے اور اس نے بس ایک ہی جملے کی رٹ لگائی ہوئی تھی۔ ''آج میں بارہ ہی نہیں بجنے دوں گا...''

کراچی سے شمس باحلیم کا تعاون

ہلاتے ہوئے کہا۔ پھر وہ عورت سے مخاطب ہوئی۔ ''کیا آپ کو ان دونوں یا ان میں سے کسی ایک کی صورت دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا، مس؟''

''نہیں، ایسا کوئی اتفاق نہیں ہوا۔ اس لیے کہ اس کے بعد خاموشی چھا گئی تھی اور مجھے بھی دوبارہ نیند آگئی تھی۔''

سراغ رساں برنیڈا ..... نے اس عورت کا نام اور پتا اپنے پاس نوٹ کرلیا اور پھر وہ سارجنٹ مورالس کے ہمراہ پولیس اسٹیشن کے لیے روانہ ہوگئی۔

پولیس اسٹیشن میں اس کی میز پر ایک رپورٹ رکھی ہوئی تھی۔ ''تمہارے لوگوں نے مقتول کولیئر کے کمرے کا جائزہ لے لیا ہے۔'' اس نے سارجنٹ سے کہا۔ ''انہیں وہاں ایک بینک بک ملی ہے جس میں ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو ایک ہزار ڈالر جمع کرانے کا اندراج ہے۔''

''کل پہلی تاریخ تھی۔'' سارجنٹ مورالس نے کہا۔

''لگتا ہے کہ کولیئر نے اپنے بلیک میلنگ کے شکار سے ماہانہ ادائیگی کے لیے ملاقات طے کی ہوئی تھی اور اس کے شکار نے یہی فیصلہ کیا کہ کولیئر نے اس کا بہت خون چوس لیا ہے اور اب وہ مزید کوئی ادائیگی نہیں کرے گا۔''

''ایسا ہی لگ رہا ہے۔'' سراغ رساں نے سارجنٹ کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن تمہارے آدمیوں کو وہاں ایسی کوئی فہرست نہیں ملی جس میں کولیئر کے بلیک میل کیے جانے والے کے نام درج ہوں۔ اس طرح تو اس کے قاتل کی تلاش کا کام خاصا دشوار ثابت ہوگا۔''

''ہمیں انگلیوں کے جو نشانات ملے ہیں، ہم انہیں اپنے ڈیٹابیس سے گزار کر چیک کریں گے۔'' سارجنٹ مورالس نے کہا۔ ''امید کرتے ہیں کہ ہمارا مطلوبہ قاتل اس ڈیٹابیس میں موجود ہوگا۔''

سراغ رساں برنیڈا وائٹ نے کچھ سوچتے ہوئے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ کچھ دیر بعد جب اس نے آنکھیں کھولیں تو وہ مسکرا رہی تھی۔

سارجنٹ مورالس نے استفہامیہ نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا۔

''میں ایک ایسی جگہ سے واقف ہوں جہاں سے ہم ان انگلیوں کے نشانات کی تصدیق کا آغاز کرسکتے ہیں۔'' سراغ رساں نے کہا۔ ''آؤ، وہیں چلتے ہیں۔''

برنیڈا وائٹ کو یاد آگیا کہ جب اس نے میئر کی لفٹ کی پیشکش قبول کرتے ہوئے اسے یہ بتایا تھا کہ وہ قتل کی ایک جائے واردات پر جارہی ہے اور اس کی کار کا ٹائر پنکچر ہوگیا ہے تو اس نے یہ بات میئر کو قطعی طور پر نہیں بتائی تھی کہ جائے واردات کون سی اور کس جگہ ہے۔

اس کے باوجود میئر اسے سیدھا اس موٹیل پر لے گیا تھا جہاں اینڈریو کولیئر کا قتل ہوا تھا۔

بھلا میئر کو کیونکر علم ہوا تھا کہ جائے واردات کون سی ہے، ماسوائے اس کے کہ وہ خود وہاں پر موجود رہا تھا اور اینڈریو کولیئر کا قتل اسی نے کیا تھا۔

سراغ رساں برنیڈا وائٹ جائے واردات اور مقتول کی گردن پر سے ملنے والے انگلیوں کے نشانات کو میئر کی انگلیوں کے نشانات سے میچ کرنے میں کامیاب ہوگئی اور میئر کو اپنے جرم کا اعتراف کرنا پڑ گیا۔

ڈھال

سیرینا راض

بیتا ہوا وقت کسی خزانے سے کم نہیں ہوتا... اس کی ذات میں بھی وہ چند دنوں کا قلیل وقت ایک طویل مدت کے مانند بسیرا کر چکا تھا... ان دنوں کی سنہری یادوں میں کسک کے ساتھ ایسی مٹھاس تھی جو اسے افسردگی و تشنگی سے دور رکھتی تھی... بظاہر وہ اپنی معمول کی جیتی جاگتی... بھاگتی دوڑتی ہلچل زدہ زندگی میں مصروف تھی... مگر اس کے اندر کا موسم کہیں اور ٹھہرا ہوا تھا...

دل لبھاتی... احساسات جگاتی... پرفریب مناظر میں ڈوبی دلکش کہانی...

وہ ہفتے کی سہ پہر تھی جب کلارا کی ٹیکسی اس کے اپارٹمنٹ کے سامنے آ کر رکی۔ وہ نیویارک کے ایک پبلشنگ ہاؤس میں ایڈیٹر تھی اور لندن میں تین ہفتے گزارنے کے بعد واپس آئی تھی جہاں اس کی ملاقات کئی مصنفین سے ہوئی۔ اسے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ ان میں سے دو نے اپنا کام مکمل کر لیا تھا گو کہ وہ اس سفر کے دوران میں کافی تھک گئی تھی لیکن یہ اطمینان ضرور ہو گیا تھا کہ آئندہ موسم بہار تک اس کی دو کتابیں شائع ہو جائیں گی۔

رات کو بھرپور نیند لینے اور صبح ڈٹ کر ناشتا کرنے کے بعد اس نے کچھ وقت اخبار کی ورق گردانی کی پھر وہ اپنی میز پر بیٹھ کر وہ ڈاک دیکھنے لگی جو اس کی غیر موجودگی میں جمع ہوگئی تھی۔ اس میں غیر ضروری خطوط، میگزین، بل اور بینک کے بھیجے ہوئے مالیاتی گوشوارے شامل تھے لیکن اس کی توجہ کا مرکز وہ مخصوص لفافہ تھا جو نیویارک کی ایک قانونی فرم کی جانب سے بھیجا گیا۔ وہ اس فرم سے واقف نہیں تھی۔ اس نے لفافہ کھولا جس میں ایک خط کے ساتھ چوہتر سالہ مائیکل ڈینیئل کی موت کی اطلاع بھی تھی۔ اس نے وہ خبر غور سے پڑھی اور پھر خط کی جانب متوجہ ہوئی جو کہ قانونی فرم کے پارٹنر کی جانب سے بھیجا گیا تھا اور اس پر ایون ڈینیئل نامی شخص کے دستخط تھے۔ اس نے سوچا کہ شاید یہ مرنے والے کا بھائی ہو۔ خط میں لکھا تھا کہ متوفی کی ہدایت کے مطابق اسے یعنی کلارا براؤننگ کو اس کی موت کی اطلاع دی جارہی ہے۔ جیسے ہی اس کی جانب سے اس خط کے ملنے کی تصدیق ہوجاتی ہے، اسے ایک پیکٹ بھیج دیا جائے گا۔

صاف ظاہر تھا کہ یہ خط اسے غلطی سے بھیج دیا گیا تھا۔ وہ کسی مائیکل ڈینیئل کو نہیں جانتی تھی۔ البتہ اسے اس بارے میں تجسس ضرور ہوگیا تھا۔ وہ یہ سوچ کر حیران ہورہی تھی کہ یہ خبر سن کر حقیقی وصول کنندہ کا ردِعمل کیا ہوگا۔ اس نے وہ خط ایک طرف رکھا اور دیگر ڈاک کی طرف متوجہ ہوگئی۔ اسے اس کام میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ تمام بلوں کی ادائیگی کرنے کے بعد اس نے چیک بک بند کی اور دوبارہ اس خط کو پڑھنے لگی۔ اس معاملے میں زیادہ سر کھپانے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کا آسان حل یہ تھا کہ اگلے روز وہ قانونی فرم کو فون کر کے صورتِ حال کی وضاحت کردے۔

سوموار کی صبح اس نے مذکورہ فرم کا نمبر ملایا۔ وہ اخباری تراشہ اس کے سامنے رکھا ہوا تھا۔ اس نے ایک نظر اس پر ڈالی اور غلطی سے مائیکل ڈینیئل کا نام لے دیا جبکہ وہ ایون ڈینیئل سے بات کرنا چاہ رہی تھی۔

''میں اس کے بیٹے سے تمہاری بات کروا دیتی ہوں۔'' استقبالیہ پر بیٹھی ہوئی لڑکی نے کہا پھر دوسرے ہی لمحے ایک آواز سنائی دی۔ ''ہیلو، میں ایون ڈینیئل بول رہا ہوں۔ شاید تم میرے باپ سے بات کرنا چاہ رہی تھیں۔''

ایک لمحے کے لیے کلارا باپ بیٹے کے رشتے کے بارے میں جان کر گڑبڑا گئی لیکن گفتگو جاری رکھنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ محتاط انداز میں بولی۔ ''میرا نام کلارا براؤننگ ہے۔ مجھے تمہارا خط ملا جس کے ساتھ تمہارے والد کی موت کی اطلاع بھی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ یہ خط مجھے کیوں بھیجا گیا ہے جبکہ میں اسے نہیں جانتی۔ میرا خیال ہے کہ یہ خط غلطی سے بھیج دیا گیا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے رکی اور پھر دھیمی آواز میں بولی۔ ''بہرحال مجھے تمہارے والد کی وفات پر افسوس ہوا۔''

''شکریہ۔'' اس نے کہا۔ ''میں تمہارے جذبات کی قدر کرتا ہوں۔''

''میں اس صورتِ حال سے تھوڑی سی پریشان ہوگئی ہوں۔'' وہ بولی۔ ''اس خط میں لکھا ہے کہ تمہاری فرم کے پاس میرے لیے کوئی پیکٹ ہے جو میرے پتے کی تصدیق ہونے پر مجھے بھیج دیا جائے گا۔''

''ہاں، یہ صحیح ہے۔ میں تم سے ملنا چاہ رہا ہوں۔ اس طرح آمنے سامنے بیٹھ کر صورتِ حال کی وضاحت کرنا آسان ہوگا جو کہ ٹیلی فون پر ممکن نہیں۔ کیا تم میرے دفتر آسکتی ہو؟''

''بالکل آسکتی ہوں لیکن میں نہیں سمجھتی کہ اس کی کوئی ضرورت ہے۔ جیسا کہ پہلے بتا چکی ہوں کہ میں تمہارے والد سے کبھی نہیں ملی۔''

''ہاں، میں نے سن لیا ہے لیکن میرے پاس اس پر یقین کرنے کی دوسری وجوہات ہیں۔'' اس نے قدرے توقف کرنے کے بعد کہا۔ ''میں یہ اعتراف کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتا کہ اب مجھے بھی تم سے ملنے میں دلچسپی ہوگئی ہے۔''

کلارا غصے سے بولی۔ ''اس کا جواز نہیں بنتا کیونکہ میں تمہارے باپ کو نہیں جانتی۔''

''میں ٹیلی فون پر یہ بات نہیں کرنا چاہ رہا تھا لیکن تمہیں مطمئن کرنے کے لیے تھوڑی سی وضاحت کرنا ضروری ہوگیا ہے۔'' وہ لمحہ بھر توقف کرنے کے بعد بولا۔ ''کلارا، میں سمجھتا ہوں کہ تم میرے باپ کو کسی اور نام سے جانتی ہو۔''

''دوسرے نام سے؟'' وہ حیران ہوتے ہوئے بولی۔ اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ یہ معاملہ کچھ پُراسرار لگ رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔ ''کیا میں وہ نام جان سکتی ہوں؟''

''اسکائلر۔ اسکائلر جونز۔'' وہ لمحہ بھر کے لیے حیران رہ گئی جیسے اس سے سننے میں غلطی ہوگئی ہو۔ اس نے سرگوشی میں کہا۔ اسکائلر، اور کرسی کی پشت سے سر لگا دیا۔ اس کا دماغ گھومنے لگا۔ ریسیور ابھی تک اس کے کانوں سے لگا ہوا تھا اور وہ ماضی کی بھول بھلیوں میں کھو چکی تھی۔

''کلارا، کیا تم لائن پر موجود ہو۔ میں ایون بول رہا ہوں۔تم ٹھیک تو ہو؟''

وہ ایک گہرا سانس لیتے ہوئے بولی۔''میں یقین سے نہیں کہہ سکتی۔اس بات کو عرصہ ہوگیا۔تقریباً تیس سال سے بھی زیادہ۔''

''لیکن تمہیں یاد تو ہے نا؟''

''ہاں، مجھے یاد ہے۔''وہ نرمی سے بولی۔

☆☆☆

یہ کافی پرانی بات ہے جب ان کی پہلی ملاقات ہوئی تھی۔اس نے کینیا میں امن فوج کے ساتھ دو سال مکمل کر لیے تھے۔پہلے وہ انگریزی پڑھاتی رہی پھر ملک کے بالائی علاقے میں چلی گئی۔جہاں اس نے ایک اور رضا کار کے ساتھ مل کر امدادِ باہمی کی سرگرمیاں شروع کر دیں۔وہ مقامی قبائلی عورتوں کے ساتھ مل کر کام کر رہے تھے تاکہ ان کی بنائی ہوئی دستکاری کے نمونوں کو بازار میں فروخت کیا جا سکے۔کلارا جانتی تھی کہ اپنی مدت پوری ہونے کے بعد وہ براہِ راست گھر نہیں جائے گی۔لہٰذا اس نے دوسرے منصوبے بنانا شروع کر دیے۔نقشے پر نظر ڈالی تو کینیا سے ہندوستان بہت زیادہ دور نہیں تھا۔چنانچہ اس نے بڑی احتیاط سے سفر کی منصوبہ بندی کی۔کشمیر اس کی اصل منزل تھی۔اس نے سن رکھا تھا کہ ڈل جھیل میں ایسی کشتیاں لنگر انداز ہیں جن میں قیام و طعام کی تمام سہولتیں دستیاب ہیں۔نیروبی میں ہونے والی کاک ٹیل پارٹی میں فارن سروس سے تعلق رکھنے والے نے اس بارے میں تفصیل بتائی تو اس کی آتشِ شوق بھڑک اٹھی۔ان کا کہنا تھا''اس کشتی میں قیام کرنا ایک شاندار تجربہ تھا۔مجھے یقین ہے کہ اگر تم وہاں گئیں تو کبھی اسے نہ بھول پاؤ گی۔''اس کے علاوہ بھی انہوں نے بہت کچھ بتایا تھا جسے سننے کے بعد کلارا نے کشمیر جانے کے لیے اپنا ذہن بنا لیا۔

بالآخر وہ دن بھی آگیا جب وہ نیروبی سے بذریعہ ہوائی جہاز بمبئی کے لیے روانہ ہوئی۔اس کی اگلی منزل نئی دہلی تھی۔اس نے رہائش کے لیے ایک اچھے سے ہوٹل کا انتخاب کیا۔شہر کی سیر کی اور تاج محل دیکھنے ایک دن کے لیے آگرہ بھی گئی۔اگلے دن وہ ٹیکسی کے ذریعے نئی دہلی ائرپورٹ پہنچی اور سرینگر کے لیے روانہ ہوئی۔اس دن کافی گرمی تھی اور درجۂ حرارت چھتیس سینٹی گریڈ... کو چھو رہا تھا۔وہ جب اپنی نشست پر براجمان ہوئی تو اسے جہاز کے اندر بھی گرمی کا احساس ہوا۔ساڑی میں ملبوس ایک ائرہوسٹس مسافروں میں دستی پنکھے تقسیم کرتے ہوئے کہہ رہی تھی کہ جہاز ٹیک آف کرتے ہی ائرکنڈیشننگ سسٹم چل پڑے گا۔

جہاز کے روانہ ہونے تک اس کے برابر والی نشست خالی تھی لیکن چند لمحے قبل ایک مسافر وہاں آگیا۔وہ ایک لمبے قد کا امریکی تھا۔اس نے نشست کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے ایک طویل سانس لی اور بولا۔''آج کا دن سفر کے لیے اچھا نہیں ہے لیکن میرا جانا بھی ضروری ہے۔خوشی اس بات کی ہے کہ نشست مل گئی۔''

کلارا نے خیر مقدمی مسکراہٹ چہرے پر لاتے ہوئے کہا۔''اور وہ بھی ایک ایسے مسافر کے برابر میں جو تمہاری زبان بولتی ہے۔''

''یقیناً یہ ایک اضافی فائدہ ہے۔''وہ کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے بولا۔''تمہارا تعلق کہاں سے ہے؟''

''میں گزشتہ دو سال سے امن فوج کے ساتھ کینیا میں رضا کار کے طور پر کام کر رہی تھی لیکن میری فیملی نیو انگلینڈ میں رہتی ہے۔میں بہت جلد گھر چلی جاؤں گی۔''

''کیا تم وہاں انگریزی پڑھاتی تھیں؟''

''ہاں، شروع میں انگلش ٹیچر تھی لیکن حالیہ مہینوں میں ان عورتوں کے ساتھ کام کرتی رہی ہوں جو مختلف قسم کے ہنر میں مہارت رکھتی ہیں جیسے ٹوکریاں بُننا اور چٹائیاں بنانا۔میں نے ایک اور رضا کار کے ساتھ مل کر امدادِ باہمی کی تنظیم بنائی تاکہ ان کی بنائی ہوئی اشیا بہ آسانی فروخت ہو سکیں۔میں نے کالج کی تعلیم مکمل ہوتے ہی امن فوج کے ساتھ کام کرنا شروع کر دیا تھا۔''

اس کے بعد وہ کتابوں کے بارے میں گفتگو کرنے لگے اور کلارا نے اسے امن فوج کے بک لاکر کے بارے میں بتایا جو ہر ایک والنٹیئر کو دیا جاتا تھا۔''جب میں ملک کے بالائی حصے میں کام کر رہی تھی تو تنہائی کے دن اور راتیں گزارنے میں یہ کتابیں میری بہترین ساتھی تھیں۔''کلارا نے بتایا۔

''کیا میں تمہارا نام جان سکتا ہوں؟''اجنبی نے اس کی طرف جھکتے ہوئے کہا۔

''کلارا۔کلارا براؤننگ اور تم؟''اس نے کسمساتے ہوئے کہا۔''تم نے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔''

''مجھے اسکائلر جونز کہتے ہیں۔پیشے کے لحاظ سے وکیل ہوں۔دہلی میں ایک منصوبے پر کام کر رہا تھا۔اس میں چھوٹی سی رکاوٹ آگئی اور اس طرح مجھے تھوڑا سا وقت

مل گیا۔ سوچا کہ ایک مرتبہ پھر کشمیر کا چکر لگا لوں۔ اس سے پہلے کہ سیزن ختم ہو جائے۔''

کلارا جس دور دراز گاؤں میں کام کر رہی تھی، وہاں دنیا کی خبریں بہت کم اور دیر سے پہنچتی تھیں کیونکہ کینیا میں انڈین آبادی کافی تعداد میں تھی اس لیے وہ لوگ ہندوستان کی خبروں میں دلچسپی لیتے اور ان کے بارے میں گفتگو کیا کرتے تھے۔ کلارا نے بھی اپنی نشست بک کرانے سے پہلے امریکی سفارت خانہ جا کر یہ اطمینان کر لیا کہ ان حالات میں ہندوستان کا سفر محفوظ رہے گا یا نہیں۔

''تم نے عقل مندی یہ کی کہ سفارت خانے جا کر اس خطے کے حالات معلوم کیے کیونکہ ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات کبھی بھی اچھے نہیں رہے جس کی سب سے بڑی وجہ کشمیر کا تنازعہ ہے۔''

''میں نے بھی نئی دہلی کے ہوٹل میں ایک آدمی سے سنا تھا کہ روسی اس آگ کو مزید بھڑکانا چاہتے ہیں۔''

''وہ کس طرح؟'' اسکائلر نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

''اس نے کھل کر تو بات نہیں کی لیکن اس کی گفتگو سے یہی تاثر ملا کہ امریکی اس خطے میں امن قائم کرنا چاہتے ہیں جبکہ روسیوں کی خواہش ہے کہ یہ دونوں پڑوسی ہمیشہ لڑتے رہیں۔''

''یہ سچ ہے۔'' اس نے پھیکی سی مسکراہٹ سے کہا پھر متفکر لہجے میں بولا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ ان کے درمیان کشیدگی میں مزید اضافہ ہوگا۔''

جہاز کے رن وے پر اترنے سے پہلے ائرہوسٹس نے مسافروں میں ٹافیاں تقسیم کیں۔ اسکائلر نے ریپر ہٹا کر ایک ٹافی منہ میں رکھی اور بولا۔ ''تم نے کشمیر آنے کا فیصلہ کیوں کیا؟''

''میرے والدین کو اس علاقے سے خصوصی دلچسپی ہے۔ ممکن ہے کہ اس کے بارے میں سوچ کر انہیں مسرت ملتی ہو۔''

''اس بات سے تمہارا کیا مطلب ہے؟''

''میری ماں بہت اچھا پیانو بجاتی ہے اور میرے ڈیڈی اس کے ساتھ مل کر گاتے ہیں۔ انہیں پرانے محبت بھرے گیت پسند ہیں جن میں سے ایک کشمیری گانا بھی ہے اور یہ اُن کا سب سے پسندیدہ گیت ہے۔ شاید تم نے بھی سنا ہو اس کے بول ہیں۔ زرد ہاتھوں ....''

''ہاں، میں نے بھی سنا ہے۔'' وہ دھیرے سے بولا۔ ''لیکن میں گا نہیں سکتا۔ کیا تمہارے والد کی آواز بہت اچھی ہے؟''

''ہاں، وہ بہت اچھے گلوکار بن سکتے تھے لیکن انہوں نے اسے شوق کی حد تک رکھا۔ ایسے اور بھی کئی کام ہیں جو وہ کرنا چاہتے تھے۔''

''جیسے کشمیر کا سفر۔''

''نہیں۔'' وہ سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ''اس کے علاوہ بھی اور کئی خواہشات ہیں۔ جیسے ایک بڑا مکان، بچوں کے تعلیمی اخراجات کی ادائیگی وغیرہ وغیرہ۔''

اس نے سنجیدہ گفتگو سے جان چھڑانے کے لیے کھڑکی سے باہر دیکھنا شروع کر دیا۔ زمین پر حدِ نگاہ تک کھیتوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا جن میں مختلف رنگوں کے پودے لہلہا رہے تھے۔ لگتا تھا جیسے زمین پر قوسِ قزح کے سارے رنگ بکھر گئے ہوں۔ اس نے ایک بار پھر کرسی کی پشت کا سہارا لیا اور اس کی طرف جھکتے ہوئے بولی۔

''میں نے ایسا حسین نظارہ کبھی نہیں دیکھا۔''

''یہ تو ابھی شروعات ہے۔'' اسکائلر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''میں اسی لیے کشمیر کو یادگار مقامات میں سرِفہرست سمجھتا ہوں۔''

وہ دونوں کچھ دیر خاموش رہے پھر وہ کلارا کی طرف مڑتے ہوئے بولا۔ ''کیا تم نے یہ سوچا کہ کہاں قیام کرو گی؟''

''اس بارے میں کوئی تحفظات نہیں ہیں لیکن نیروبی میں دوستوں نے مشورہ دیا تھا کہ کسی ہاؤس بوٹ میں قیام کرنا ایک ناقابلِ فراموش تجربہ ہوگا۔ غالباً سری نگر ائرپورٹ کے باہر ہی ان کشتیوں کے مالکان، گاہکوں کے انتظار میں کھڑے ہوتے ہیں۔''

''انہوں نے صحیح بتایا ہے۔'' اسکائلر نے تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا پھر کچھ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ ''جانتا ہوں کہ ہمیں ملے تھوڑی دیر ہی ہوئی ہے لیکن کشمیر ایک ایسی جگہ ہے جہاں کسی کا ساتھ بہت اچھا رہے گا۔ کیا تم اس بارے میں غور کر سکتی ہو؟''

وہ دھیرے سے مسکرا دی۔ سچ تو یہ ہے کہ اسے اسکائلر سے باتیں کرنا اچھا لگ رہا تھا اور وہ خود بھی کچھ ایسا ہی سوچ رہی تھی لیکن فیصلہ نہ کر سکی کہ کس طرح وہ یہ بات زبان پر لائے۔ وہ اس سفر کے دوران میں اس کا خیال رکھ سکتا تھا۔ ائرپورٹ سے باہر آنے کے بعد انہیں کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ وہاں ہر قسم کی ہاؤس بوٹ قیام و طعام کی تمام سہولتوں کے ساتھ دستیاب تھیں اور ان کا کرایہ بارہ ڈالر یومیہ تھا۔

ایک عمر رسیدہ کشمیری ڈھیلی پتلون، واسکٹ اور قراقلی

ٹوپی پہنے ہوئے ان کے پاس آیا اور اس نے تعظیماً جھک کر انہیں اپنی ہاؤس بوٹ کی تصویر دکھائی اور بولا۔ ”میں اسے ایک الگ تھلگ جگہ پر رکھتا ہوں۔ میں اور میری فیملی اس کے عقب میں ایک کشتی پر ہی رہتے ہیں۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنا کارڈ پکڑا دیا اور بولا۔ ”میرا نام عمر شودا ہے۔“

انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور عمر سے چند سوالات کرنے کے بعد دو ہفتے کے لیے بات کر لی۔ اس کے بعد وہ عمر کے ساتھ اس جگہ آئے جہاں ایک قطار میں گدھا گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں۔ وہ ان میں سے ایک گاڑی پر سوار ہو گئے جبکہ عمر گاڑی بان کے ساتھ بیٹھ گیا۔ اس نے راستے میں بتایا کہ اس گاڑی کے ذریعے وہ ڈل جھیل کے کنارے تک جائیں گے جہاں سے ایک شکارا، انہیں ہاؤس بوٹ تک لے جائے گا۔

اسکاٹلر جو پہلے بھی یہاں آ چکا تھا، اس نے بتایا۔ ”شکارا، کشمیری زبان میں بجرے کو کہتے ہیں لیکن یہ عام بجروں سے کہیں بہتر ہے۔ اس میں بیٹھنے کے لیے آرام دہ نشستیں اور سائے کے لیے ترپال کی چھت ہوتی ہے۔ سیاحوں اور تاجروں کے لیے جھیل میں سفر کرنے کے لیے یہ ایک پسندیدہ سواری ہے۔“

جب وہ اپنی منزل پر پہنچے تو عمر نے ایک شکارا کرائے پر لیا اور وہ اس میں سوار ہو گئے۔ اس میں بھی آرام دہ نشستیں لگی ہوئی تھیں۔ بوڑھا کشمیری ان کے سامنے ہی فرش پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا جبکہ ملاح کشتی کے عقبی حصے میں بیٹھا چپو چلا رہا تھا۔ انہوں نے جھیل کا چوڑا پاٹ عبور کیا اور ایک تنگ آبی راستے سے گزرتے ہوئے اس مقام تک پہنچ گئے جہاں ہاؤس بوٹ کھڑی ہوئی تھی، اس پر سفید رنگ کیا گیا تھا اور پیلے رنگ کا سائبان تھا۔ عمر نے بڑے فخریہ انداز میں انہیں ہاؤس بوٹ کے عرشے پر اتارا۔ جہاں انہیں آئندہ دو ہفتوں تک قیام کرنا تھا۔ وہاں ایک آراستہ نشست گاہ اور طعام گاہ کے علاوہ دو بیڈ روم مع باتھ روم بھی تھے۔ عمر نے انہیں پانی کی سپلائی کے بارے میں بتایا اور پھر سیڑھیوں کے ذریعے بالائی عرشے پر لے گیا جہاں سے برف پوش ہمالیہ کے پہاڑ صاف نظر آ رہے تھے اور دھوپ میں ان کا عکس جھیل کی سطح پر پڑ رہا تھا۔

عمر نے ایک چوڑے تختے کی طرف اشارہ کیا جو ہاؤس بوٹ کو ایک اور کشتی سے ملاتا تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ اپنے خاندان کے ساتھ اس کشتی میں رہتا ہے۔ اس کا خاندان بیوی، بیٹے، بہو اور ان کے بچوں پر مشتمل تھا۔ اس اثنا میں دو عورتیں سر پر شال اوڑھے آئیں اور انہوں نے مہمانوں کو سلام کیا۔ کلارا کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ ان میں ایک اس کی بہو اور دوسری بیوی تھی۔

اس شام کلارا اور اسکاٹلر نے عرشے پر سورج ڈوبنے کا نظارہ کیا اور رات کے کھانے کا انتظار کرنے لگے۔ عمر نے عرشے پر ہی ایک چھوٹی میز اور دو عدد کرسیاں لگا دی تھیں۔ اس نے اپنے سات سالہ پوتے موسیٰ کے ہمراہ کھانا لگایا جو سوپ، بھیڑ کے گوشت، تلے ہوئے آلو، گاجر اور خربوزے پر مشتمل تھا۔ ساتھ ہی اس نے ابلے ہوئے پانی کی بوتل بھی میز پر رکھ دی تھی۔ کھانا بہت لذیذ تھا۔ دونوں نے پیٹ بھر کر کھایا۔ جب عمر کھانے کے برتن لے کر چلا گیا تو وہ وہیں بیٹھے آسمان پر ستاروں کی کہکشاں دیکھتے رہے۔ ہر طرف چاندنی پھیلی ہوئی تھی اور وہ خاموش بیٹھے اس حسین منظر سے لطف اندوز ہو رہے تھے پھر انہوں نے اگلے دن کے پروگرام کے بارے میں گفتگو شروع کر دی۔

”کیوں نہ ہم شکارے پر گھومنے چلیں۔“ کلارا نے تجویز پیش کی۔

اسکاٹلر نے تائید میں سر ہلایا اور اس کی طرف جھکتے ہوئے بولا۔ ”تمہیں تھوڑا سا محتاط رہنا ہوگا۔ تم اپنے پسندیدہ مناظر کی تصویریں لے سکتی ہو لیکن ہم دونوں کی کوئی تصویر نہیں لی جائے گی اور اگر تم ڈائری لکھنے کا پروگرام بنا رہی ہو تو اس میں بھی ہمارے فرضی نام درج ہوں گے۔“

وہ ہنستے ہوئے بولی۔ ”گویا تم یہ کہہ رہے ہو کہ ہمیں اپنے آپ کو خفیہ رکھنا ہوگا؟“

”تم ایسا کہہ سکتی ہو۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ”ایک بات اور۔ میں شوقیہ مصوری کرتا ہوں۔ تمہیں میرا ساتھ دینا ہوگا۔“

”میں کچھ سمجھی نہیں۔“ وہ پُراشتیاق لہجے میں بولی۔ ”مجھے تفصیل سے بتاؤ۔“

وہ دانت نکالتے ہوئے بولا۔ ”کل سب معلوم ہو جائے گا۔“

دوسری صبح جب وہ شکارے پر سوار ہوئے تو اسکاٹلر نے ایک لکڑی کا بکس بھی اٹھایا ہوا تھا۔ اپنی جگہ پر بیٹھ کر اس نے بکس کا ڈھکنا اٹھایا تو وہ ایک ایزل کی شکل میں تبدیل ہو گیا جبکہ برش اور رنگ وغیرہ بکس میں رکھے ہوئے تھے۔ وہ اس کے سامنے کشن سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی اور سوچنے لگی کہ کیا یہ اس کی پہلی تصویر ہوگی۔ جھیل میں گھومتے ہوئے وہ کئی ایسے شکاروں کے پاس سے گزرے جن میں مختلف اشیا

فروخت کے لیے رکھی ہوئی تھیں۔ زیادہ تر میں خوب صورت پھول اور تازہ سبزیاں نظر آرہی تھیں۔ کچھ لوگ لکڑی کے مجسمے، انگوٹھیاں اور اسی طرح کا دوسرا سامان بیچ رہے تھے۔ ایک شکارے پر انہیں گہرے نیلے رنگ کے نارنجی پھول نظر آئے۔ اسکائلر نے ان کے دو چھوٹے گلدستے خرید کر کلارا کو دے دیے۔ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

''میں نے پارلر کی سائڈ ٹیبل پر تانبے کا گلدان دیکھا ہے۔ یہ اس کے لیے مناسب رہیں گے۔''

جب وہ واپس آئے اور انہوں نے عمر کو اپنی تفریح کے بارے میں بتایا تو وہ بولا۔ ''کل صبح ہی سارے دکان دار اس ہاؤس بوٹ کے ساتھ کھڑے ہو کر اوپر آنے کی اجازت مانگ رہے ہوں گے۔ جیسا کہ تم نے دیکھا کہ ان کے پاس بیچنے کے لیے بہت کچھ ہے۔ اونی ملبوسات، ریشمی کپڑے، مجسمے، ہیرے موتی، زیورات، مصالحے اور کئی دوسری اشیا۔ ایک شکارے پر درزی بھی ہوتا ہے جس کے پاس عمدہ ریشمی اور اونی کپڑے ہیں۔ اگر تم نہیں چاہتے تو میں انہیں واپس بھیج دوں گا۔''

کبھی کبھی اسکائلر اکیلے ہی شکارے پر شہر کی طرف چلا جاتا۔ اس بارے میں اس کا رویہ بہت پُراسرار اور رازدارانہ ہوتا تھا۔ ایک سیاح کی ڈاک ہی کتنی ہوتی ہے مگر وہ کہتا تھا کہ وہ اپنی ڈاک دیکھنے امریکن ایکسپریس کے دفتر جاتا ہے۔ ایک دن وہ اور کلارا عرشے پر بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ اس نے کلارا سے پوچھا۔

''کبھی تم نے سوچا ہے کہ اپنے گھر واپس جا کر کیا کام کرو گی؟''

''میرے ذہن میں کچھ آئیڈیاز ہیں لیکن ابھی کچھ طے نہیں کیا۔ میں لکھنے پڑھنے کا کام کرنا چاہتی ہوں۔ ممکن ہے کہ کسی اخبار یا رسالے میں ملازمت کر لوں۔''

اسکائلر تائید میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''یہ تمہارے لیے بالکل مناسب رہے گا۔ کیونکہ تم نے کافی مطالعہ کیا ہے۔ پبلشنگ ہاؤس کے بارے میں کیا خیال ہے؟ نیویارک میں ایسے کئی ادارے ہیں جہاں نئے لوگوں کو ملازمت مل سکتی ہے۔ یہ تمہارے لیے اس شعبے میں قدم رکھنے کا ایک اچھا ذریعہ ہوگا۔''

''میں نے ابھی اس بارے میں نہیں سوچا۔ تمہارے مشورے کا شکریہ۔ میرے والدین کا گھر نیویارک میں ہے۔ وہاں رہ کر میں بہت کچھ کر سکتی ہوں۔''

ایک دن جب اسکائلر باہر گیا ہوا تھا۔ کلارا نے عمر کے ذریعے درزی کو ہاؤس بوٹ پر بلایا اور سلک کے کئی تھان کھلوا کر دیکھے پھر اس نے ان میں سے اپنی پسند کا رنگ منتخب کیا اور درزی کو اسکرٹ کے ساتھ ساتھ ایک جیکٹ کا ناپ بھی دے دیا پھر اس نے کشمیری اون کا تھان کھلوایا اور اپنے لیے براؤن رنگ کی شال منتخب کی۔

دوسرے دن جب درزی ٹرائل کے لیے آیا تو اس نے خبر سنائی کہ سرینگر میں ایک روسی سرکس آیا ہے جس میں ریچھ اور مسخرے ناچتے ہیں۔ یہ سنتے ہی کلارا خوشی سے اچھل پڑی اور بولی۔

''واہ یہ ناچ دیکھنے میں بہت مزہ آئے گا۔ ہمیں ضرور جانا چاہیے۔ ہمیں یہ سرکس دیکھنے کا موقع کب ملے گا؟''

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔'' اسکائلر نے کہا۔ پھر وہ عمر کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''سرکس میں بچے زیادہ دلچسپی لیتے ہیں۔ تم چار ٹکٹ خرید لو تاکہ تم اور تمہارا پوتا بھی ہمارے ساتھ چل سکے۔''

''موسیٰ بہت خوش ہوگا صاحب۔ وہ کبھی سرکس نہیں گیا۔'' عمر نے ممنون لہجے میں کہا۔

اگلے روز جب وہ تنہا تھے تو کلارا نے اسکائلر سے پوچھا۔ ''تمہارے خیال میں روسی سرکس کے یہاں آنے کی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟''

اس نے غور سے کلارا کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''روسی اپنے گشتی سرکس کی وجہ سے مشہور ہیں۔ یہ ساری زندگی اسی طرح گھومتے پھرتے گزار دیتے ہیں جب تک کوئی بڑی تبدیلی نہ آجائے اور تا حال ایسا کچھ نہیں ہوا۔''

''لیکن تم سمجھتے ہو کہ ایسا ہوگا۔'' کلارا نے کہا۔

''کشمیر کئی بڑے ملکوں کے درمیان پھنسا ہوا ہے اور یہ کہنا مشکل ہے کہ کس قسم کا دباؤ آسکتا ہے کیونکہ یہاں جنگ اور امن ایک پنڈولم کی طرح ہیں۔''

اگلے روز رات کے کھانے کے بعد وہ لوگ سرکس دیکھنے گئے۔ تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے اس بڑے سے رنگین خیمے تک پہنچ گئے جس میں لوگوں کی ایک بڑی تعداد سرکس دیکھنے آئی تھی۔ جب وہ اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے تو اسکائلر نے عمر کے پوتے کو اپنے گھٹنوں پر بٹھا لیا تھا تاکہ وہ آگے بیٹھے ہوئے لوگوں کے سروں کے پار دیکھ سکے۔ اسٹیج پر جمناسٹ اور بازی گروں کے کرتب دکھائے جا رہے تھے۔ موسیٰ مسخروں کی حرکات اور ریچھوں کا ناچ دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ اس دوران وہ مسلسل قہقہے لگاتا اور تالیاں بجاتا رہا۔ وقفہ ہوا تو اسکائلر نے کہا کہ وہ کچھ کھانے کا سامان اور

ٹافیاں لینے باہر جا رہا ہے۔ اس نے موسیٰ کو اس کے دادا کے حوالے کیا اور تیزی سے باہر چلا گیا۔ کلارا نے اسے تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن وہ مجمع میں گم ہو چکا تھا۔ ادھر دوسرا ایکٹ شروع ہونے والا تھا اور وہ ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ کلارا بار بار گردن گھما کر خیمے کے داخلی دروازے کی طرف دیکھتی رہی، اسے حیرت ہو رہی تھی کہ اسکاٹلر کو واپس آنے میں اتنی دیر ہو گئی۔

خدا خدا کر کے وہ واپس آیا اور خاموشی سے اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔ اس وقت اسٹیج پر ڈرم اور شہنائی کی آواز گونج رہی تھی۔ موسیٰ کا دل خوشی سے جھوم اٹھا جب اس نے تین ریچھوں کو اسٹیج پر چھلانگیں لگاتے دیکھا۔ وہ ایک دوسرے کی کمر پر چڑھ کر مینار بنا رہے تھے پھر انہوں نے ایک رنگین گیند سے کرتب دکھانا شروع کر دیے۔ واپس آتے وقت بھی موسیٰ شکارے میں سرکس ہی کی باتیں کرتا رہا پھر اسے اپنے دادا کے بازوؤں میں نیند آ گئی۔ اس کے ہاتھ میں ابھی تک ٹافیوں کا چھوٹا سا پیکٹ دبا ہوا تھا جو اسکاٹلر اس کے لیے کر لایا تھا۔

دوسری صبح بالائی عرشے پر ناشتا لگاتے ہوئے عمر نے بتایا کہ پہاڑوں پر برف باری شروع ہو چکی ہے۔

''یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟'' کلارا نے پوچھا۔

''میری ساری زندگی یہیں گزری ہے۔'' وہ اپنے سر کو تھوڑا سا خم دیتے ہوئے بولا۔ ''ان دنوں برف باری ہونا لازمی ہے۔''

''بالکل۔'' اس نے اپنے اطراف کا جائزہ لیتے ہوئے کہا اور خوب صورت نظاروں سے لطف انداز ہونے لگی۔ قریبی ساحل پر درخت اور پھول ہوا سے جھوم رہے تھے۔ موسم گرم اور خوشگوار تھا اور ان دنوں سرینگر میں موسم بہار کی آمد تھی۔ اس کے باوجود پہاڑوں پر برف باری کا نیا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ وہ حیران تھی کہ سردیوں میں کیا ہوتا ہوگا۔ اس نے عمر سے پوچھا۔

''یہاں بہت سردی ہوتی ہوگی؟''

''ہاں۔'' وہ تائیدی انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''ہم اپنی چھتوں پر گھاس پھوس ڈال دیتے ہیں تاکہ سردی سے محفوظ رہ سکیں۔ اس کے علاوہ اتنی خوراک ذخیرہ کر لیتے ہیں جو سرد ترین مہینوں کے لیے کافی ہو۔ کیونکہ کئی ہفتوں تک شہر جانے کا راستہ نہیں ملتا۔ امیر لوگ سردیاں آنے سے پہلے ہی نئی دہلی چلے جاتے ہیں جہاں کا موسم ہمیشہ گرم رہتا ہے لیکن مجھ جیسے لوگ یہاں رہنے پر مجبور ہیں۔''

انتخاب

ٹائپسٹ کی ملازمت کے لیے امیدواروں کا انتخاب ہو رہا تھا۔ ایک امیدوار سے انٹرویو کرنے والے نے پوچھا۔

''آپ ٹائپنگ کے علاوہ اور کیا جانتے ہیں؟''

امیدوار نے کہا۔ ''مذاق کرنا۔''

انٹرویو کرنے والے نے کہا۔ ''کیا آپ اس کا عملی مظاہرہ کریں گے؟''

''کیوں نہیں۔'' یہ کہہ کر امیدوار نے کمرے کا دروازہ کھول کر باہر بیٹھے ہوئے امیدواروں سے کہا۔ ''آپ لوگ جا سکتے ہیں کیونکہ میرا انتخاب کر لیا گیا ہے۔''

نادر سیال، میانوالی، کندیاں

''مجھے یاد ہے تم نے کہا تھا کہ تم سے پہلے تمہارے والد اس ہاؤس بوٹ کے مالک تھے۔''

''ہاں اور اس سے پہلے یہ میرے دادا کی ملکیت تھی۔ ان دنوں گرمیوں میں کئی یورپین نئی دہلی کی گرمی سے بچنے کے لیے کشمیر آیا کرتے تھے۔ انہیں یہاں زمین خریدنے کی اجازت نہیں تھی لہٰذا ان میں سے کچھ لوگوں نے یہ ہاؤس بوٹ بنا لیں۔ میرے دادا نے کئی سال تک اس خاندان کی خدمت کی جو اس ہاؤس بوٹ کا مالک تھا۔ اس خاندان کا سربراہ ہیروں کی کان کا مالک تھا اور یہ ہاؤس بوٹ اس کی بیوی کی پسند تھی۔ اس کے پاس سونے کے کئی زیورات تھے جن میں قیمتی پتھر جڑے ہوئے تھے۔ اس کے شوہر کا انتقال جلد ہی ہو گیا تھا لیکن مرنے سے پہلے اس نے یہ ہاؤس بوٹ میرے دادا کے نام کر دی۔''

ان کے دو ہفتے تیزی سے گزر رہے تھے۔ اس دوران کلارا نے کئی مرتبہ عمر سے گفتگو کی اور اس کی بتائی ہوئی باتیں ذہن نشین کر لیں۔ ایک دن وہ صبح کے وقت بالائی عرشے پر بیٹھی قریب سے گزرنے والے شکارے کو دیکھ رہی تھی جس پر پھول لدے ہوئے تھے کہ ٹھیک آٹھ بجے عمر ناشتے کی ٹرے لے کر آ گیا۔

''سلام میم صاحب۔'' اس نے گردن جھکا کر معمول کے مطابق سلام کیا اور ٹرے میز پر رکھ دی۔ اس میں کافی کی کیتلی اور گرم دودھ کی بوتل تھی لیکن پیالی صرف ایک ہی

تھی۔ اس کے علاوہ خربوزے کا ایک ٹکڑا، ایک آملیٹ اور چند توس رکھے ہوئے تھے اور یہ صرف ایک آدمی کا ناشتا تھا۔

گویا عمر جانتا تھا کہ اسکائلر چلا گیا۔ اس نے رات میں کسی وقت ہاؤس بوٹ چھوڑ دی ہوگی۔ عمر اس کی نقل و حرکت سے واقف رہتا تھا۔ اس لیے کلارا کو بالکل بھی حیرت نہیں ہوئی۔ وہ اور اس کی فیملی جس کشتی میں رہتے تھے وہ ان کی ہاؤس بوٹ سے چند فٹ کے فاصلے پر بندھی ہوئی تھی۔

اس روز وہ معمول سے کچھ پہلے ہی بیدار ہوگئی تھی اور یہ تجویز عمر ہی کی تھی کہ وہ صبح سویرے اٹھ کر سورج نکلنے کا نظارہ کرے جو ایک ہالے کی صورت میں نمودار ہوتا ہے اور برف پوش چوٹیوں کے عقب سے ابھرتی ہوئی روشنی آسمان پر رنگوں کی کہکشاں بکھیر دیتی ہے۔ اس نے بتایا تھا کہ پہاڑیوں کے دامن میں آڑو اور ناشپاتی کے درخت ہیں جبکہ سرسوں، پھلی اور خربوزے کے کھیتوں کا سلسلہ چٹانوں تک پھیلا ہوا ہے۔ دھوپ میں ان پہاڑیوں کا عکس جھیل پر پڑتا تو کلارا کو یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا کہ وہ کس جانب دیکھے۔

ہر روز صبح اٹھ کر اسکائلر کے کمرے کے پاس سے گزرتے ہوئے وہ اپنے سینڈل ہاتھ میں لے لیتی تا کہ ایڑی کی کھٹ کھٹ سے اس کی نیند میں خلل نہ پڑے لیکن ایک روز وہ اسے علی الصباح ضرور بیدار کرے گی تا کہ وہ بھی اس کے ساتھ سورج نکلنے کا نظارہ کر سکے لیکن اس سلسلے میں وہ اس سے کوئی جھگڑا مول نہیں لینا چاہتی تھی کیونکہ اسکائلر نے اسے صاف صاف بتا دیا تھا کہ جب تک وہ کافی کی مہک نہ سونگھ لے اس کی آنکھ نہیں کھلتی۔

”اگر اس کے باوجود میری آنکھ نہ کھلے تو تمہیں اجازت ہے کہ آٹھ بجے میرے دروازے پر دستک دے دو۔“ یہ بات اس نے عمر سے کہی تھی۔

اسکائلر کے کمرے کے پاس رک کر وہ گزشتہ شب ہونے والی گفتگو یاد کر کے مسکرا دی۔ اسکائلر آدھی رات کو اس کے پاس سے اٹھ کر چلا گیا تھا۔ کیونکہ اس کے خیال میں کلارا کا بستر دو افراد کے لیے ناکافی تھا۔ کلارا نے اس سے بحث نہیں کی کیونکہ وہ صرف تیئس سال کی تھی اور اسے ایک رات کی دوستی کا کوئی تجربہ نہیں تھا جبکہ پینتالیس سالہ اسکائلر نے اس کی نسبت بھرپور زندگی گزاری تھی۔ جب اس نے اسکائلر سے پوچھا کہ کیا وہ شادی شدہ ہے تو اس نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”شادی مجھ جیسے بندے کے لیے مناسب نہیں۔ میری ایک بیوی اور لڑکا ہے لیکن ان کے صبر کا پیمانہ بھی لبریز ہو چکا ہے۔“

”تمہارا بیٹا کتنا بڑا ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”تقریباً تمہاری ہی عمر کا ہے۔“

کلارا نے بیڈ روم کے ادھ کھلے دروازے سے اندر جھانکا۔ اسکائلر کا بستر خالی تھا اور رضائی نیچے گری ہوئی تھی۔ اس نے ہال میں جا کر دیکھا۔ وہ وہاں بھی نہیں تھا پھر وہ سیڑھیاں چڑھ کر بالائی عرشے پر گئی اور سرگوشی کے انداز میں بولی۔ ”تم کہاں ہو؟“ لیکن کوئی جواب نہیں آیا۔ اس کی جھنجلاہٹ بڑھ گئی۔ وہ واپس نیچے آئی۔ اس کے باتھ روم کا دروازہ بھی کھلا ہوا تھا۔ اس نے آہستہ سے پکارا۔ ”اسکائلر۔“

وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی آواز سروس بوٹ تک جائے۔ پھر اس نے بڑی احتیاط سے ہاؤس بوٹ کے دوسرے کمروں، بیٹھک اور طعام گاہ میں جا کر دیکھا۔ وہ بڑی احتیاط سے قدم اٹھا رہی تھی کہ کہیں اندھیرے میں کسی میز، کرسی یا الماری سے نہ ٹکرا جائے پھر وہ اس میز تک پہنچ گئی جس پر مہمانوں کی کتاب رکھی ہوئی تھی۔ اور وہاں قیام کرنے والا ہر فرد جاتے وقت اس میں دستخط کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے تاثرات درج کرتا۔ عمر نے یہ کتاب انہیں اسی وقت دکھا دی تھی جب وہ ہاؤس بوٹ پر آئے تھے۔ اس کا کہنا تھا کہ یہ کتاب اس کے دادا کے زمانے سے زیرِ استعمال ہے۔

ایک سہ پہر جب اسکائلر اپنے کسی مشن پر باہر گیا ہوا تھا تو اس نے میز پر بیٹھ کر اس پرانی کتاب کی ورق گردانی شروع کر دی۔ حالانکہ وہ محسوس کر رہی تھی کہ یہ مداخلت بے جا نہیں ہے لیکن وہ یہاں آنے والے پرانے مسافروں کے تاثرات معلوم کرنا چاہ رہی تھی۔ شروع کے کچھ صفحات کی سیاہی کا رنگ مٹ چکا تھا اور تحریر پڑھنے میں مشکل پیش آرہی تھی۔ اس نے چمڑے کی جلد پر ہاتھ پھیرا تو اسے اسکائلر کے ہاتھوں کی جلد یاد آنے لگی۔ اس نے کہا تھا۔ ”اسے حقیقی محبت سمجھنے کی غلطی نہ کرنا“ اس وقت وہ دونوں ایک شکارے میں کشن کے سہارے کندھے سے کندھا ملائے بیٹھے تھے اور ان کے ہاتھ آپس میں جڑے ہوئے تھے۔

وہ بالائی عرشے پر واپس آئی۔ اس کا ناشتا ٹھنڈا ہو چکا تھا لیکن اس نے عمر کو آواز دینا مناسب نہیں سمجھا۔ اسے بہت زور کی بھوک لگ رہی تھی۔ لہٰذا جو کچھ سامنے رکھا تھا، اسے غنیمت جان کر حلق میں اتارنا شروع کر دیا۔ وہ دل ہی دل میں اسکائلر سے مخاطب تھی۔ ”میں تنہا ہی ٹھیک تھی لیکن تم نے میری زندگی میں آکر ہلچل مچا دی اور اب بغیر بتائے غائب ہو گئے۔ اگر معلوم ہوتا کہ یہ ساتھ وقتی ہے تو کبھی تمہیں

آگے بڑھنے کا موقع نہ دیتی۔'

وہ کافی دیر تک عرشے پر بیٹھی اپنے اردگرد کا جائزہ لیتی رہی۔ وہ حیران تھی کہ اسکاٹلر بغیر کچھ کہے کہاں اور کیوں چلا گیا۔ اس کا سامان اور مصوری کا بکس بھی نہیں نظر آرہا تھا جس سے وہ سمجھ گئی کہ اب وہ واپس نہیں آئے گا۔ اس نے اپنے والدین کو جو پوسٹ کارڈ بھیجا تھا اس کی پشت پر ڈل جھیل کی خوب صورت تصویر بنی ہوئی تھی جس میں ترنجان کے پھولوں سے لدا ہوا شکارا تیر رہا تھا اور عقب میں برف سے ڈھکی ہوئی ڈھلوان پہاڑیاں نظر آرہی تھیں۔ اس نے کارڈ پر لکھا تھا۔ ''یہ جگہ میرے تصور سے بھی زیادہ خوب صورت ہے۔ میں ایک ہاؤس بوٹ میں ٹھہری ہوئی ہوں جو ایک چھوٹا سا تیرتا ہوا محل ہے۔ جب گھر آؤں گی تو میرے پاس بتانے کے لیے بہت کچھ ہوگا۔''

اس نے تین دن تک اسکاٹلر کا انتظار کیا۔ دو ہفتے پورے ہو گئے تھے اور اسے واپس جانا تھا۔ عمر نے ایک شکارے کا بندوبست کیا اور اس کے ساتھ جھیل کے دوسرے کنارے تک آیا تاکہ اسے گدھا گاڑی میں سوار کرا سکے۔ وہ اس وقت تک اسے ہاتھ ہلاتی رہی جب تک ڈل جھیل نظروں سے اوجھل نہ ہو گئی۔ وہ جانتی تھی کہ اب اسے کسی ملاح کی ضرورت نہیں پڑے گی جو چپو چلاتے ہوئے اسے گزرے دنوں کی یاد دلا سکے۔

یادوں کا ایک ریلا تھا جو اس کے ذہن کی دیواروں سے ٹکرا رہا تھا۔ اس کی میز پر وہ اخباری تراشہ پڑا ہوا تھا۔ اس کے برابر ہی وہ پیکٹ رکھا ہوا تھا جو پیغام رساں کے ذریعے آیا اور اس میں ایک خط بھی تھا جو اسکاٹلر نے موت سے چند روز قبل لکھا تھا۔ اس خط کا مضمون کچھ یوں تھا:

پیاری کلارا!

کچھ باتیں ایسی ہیں جو میں تمہیں کشمیر میں قیام کے دوران میں کسی مجبوری کی وجہ سے نہ بتا سکا لیکن اب وقت بدل گیا ہے اور میں تمہیں پوری کہانی سنا سکتا ہوں۔ سادہ لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ میں بظاہر ایک سیاح تھا لیکن درحقیقت ایک امریکی ایجنسی کی طرف سے خاص مشن پر کشمیر آیا ہوا تھا۔ تم نے نادانستگی میں میرا ساتھ دیا جو میری ایک چال تھی کیونکہ میرے لیے ضروری تھا کہ کسی کو ڈھال بنا کر اپنا مشن پورا کروں اور تم نے یہ کردار بخوبی نبھایا۔ عمر کو بھی معلوم نہیں تھا کہ میں کیا کر رہا ہوں اور یہ اس کی عقل مندی تھی کہ مجھ سے اس بارے میں کوئی سوال نہیں کیا۔

اب میں تمہیں بتا ہی دوں کہ میرا مشن کچھ روسیوں سے رابطہ کرنا تھا جس کی ابتدا سرکس سے ہوئی جہاں میں اور تم گئے تھے۔ میں کسی روسی شکار کی تلاش میں تھا جو مجھے مل گیا لیکن پھر مجھے کشمیر سے آگے جانا پڑ گیا اور اسی لیے تمہیں بتائے بغیر چلا آیا۔ ہماری پریشانی کشمیر میں روسیوں کی موجودگی نہیں تھی بلکہ ہم افغانستان کے بارے میں ان کا منصوبہ جاننا چاہ رہے تھے۔ میں نے اپنے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ جو کام کیا، اس سے ہمیں تیاری میں کافی مدد ملی لیکن ہم روسیوں کو افغانستان میں لڑائی شروع کرنے سے نہ روک سکے۔

حال ہی میں ہماری حکومت کی طرف سے اعتراف کیا گیا ہے کہ ہم لوگوں نے جو کام کیا، وہ قابلِ تعریف ہے۔ میں نے سب کچھ اپنے بیٹے کے نام کر دیا ہے اور مجھے امید ہے کہ جب تم دونوں کو ملنے کا موقع ملے گا تو ضرور ایک دوسرے کو پسند کرو گے۔

میں نے کچھ تصویروں کا انتخاب کیا ہے جو تمہیں ان ناقابلِ فراموش دنوں کی یاد دلائیں گی جو ہم نے کشمیر میں ایک ساتھ گزارے تھے۔ ان میں دو چھوٹے بچوں کی تصویر بھی شامل ہے جو سرخ قمیصیں پہنے ایک چھوٹی سی کشتی کو چپوؤں سے دھکیل رہے تھے۔ میں نے ان دنوں کی یادوں کو کسی خزانے کے مانند سنبھال کر رکھا ہے اور ہمیشہ تمہاری بہتری کا خواہاں رہوں گا۔ ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا لیکن میں اپنے فرض کے ہاتھوں مجبور تھا۔ فقط اسکاٹلر۔''

کلارا اس خط میں بیان کی گئی تفصیلات پڑھ کر حیران رہ گئی۔ اس کے لیے یہ تصور کرنا محال تھا کہ جس ہاؤس بوٹ پر انہوں نے دو ہفتے گزارے، وہ اتنی بڑی سازش کا ذریعہ بن جائے گی۔ اسے اسکاٹلر کی ذہانت پر بھی رشک آرہا تھا کہ اس نے اسے کس خوب صورتی سے ڈھال کے طور پر استعمال کیا اور اپنا کام نکل جانے کے بعد وہ چپکے سے اس کی زندگی سے نکل گیا۔

اس نے اسکاٹلر کے بیٹے ایون سے کئی بار ٹیلی فون پر بات کی تھی اور اب وقت آگیا تھا کہ وہ دونوں باقاعدہ ملاقات کریں۔ ان کے پاس کہنے سننے کے لیے بہت کچھ تھا۔ انہیں اکٹھے بیٹھ کر اس شخص کے لیے اپنے جذبات کا اظہار کرنا تھا جسے وہ اسکاٹلر کے نام سے جانتی تھی اور جو دنیا سے رخصت ہوتے وقت اسے ایون کی شکل میں ایک نفیس تحفہ دے گیا تھا۔

طاہر جاوید مغل

انگارے

آٹھویں قسط

نیکی کر دریا میں ڈال... بات محاورے کی حد تک ٹھیک ہو سکتی ہے لیکن خود غرضی اور سفاکی کے اس دور میں نیکی کرنے والے کو ہی کمر میں پتھر باندھ کر دریا میں ڈال دیا جاتا ہے۔ انسان بے لوث ہو اور سینے میں دردمند دل رکھتا ہو تو اس کے لیے قدم قدم پر ہولناک آسیب منہ پھاڑے انتظار کررہے ہوتے ہیں۔ بستیوں کے سرخیل اور جاگیرداری کے بے رحم سرغنہ لہو کے پیاسے ہو جاتے ہیں... اپنوں کی نگاہوں سے نفرت کے انگارے برسنے لگتے ہیں... امتحان در امتحان کے ایسے کڑے مراحل پیش آتے ہیں کہ عزم کمزور ہو تو مقابلہ کرنے والا خود ہی اندر سے ریزہ ریزہ ہو کر بکھرتا چلا جاتا ہے لیکن حوصلہ جوان ہو تو پھر ہر سازش کی کوکھ سے دلیری اور ذہانت کی نئی کہانی ابھرتی ہے۔ وطن کی مٹی سے پیار کرنے والے ایک بے خوف نوجوان کی داستان جسے ہر طرف سے وحشت و بربریت کے خون آشام سایوں نے گھیر لیا تھا مگر وہ ان پیاسی دلدلوں میں رکے بغیر دوڑتا ہی چلا گیا... اثرورسوخ اور درندگی کی زنجیریں بھی اس کے بڑھتے ہوئے قدم نہیں روک سکیں۔ وقت کی میزان کو اس کے خونخوار حریفوں نے اپنے قدموں میں جھکا لیا تھا مگر وہ ہار مان کر پسپا ہونے والوں میں سے نہیں تھا...

سطر سطر رنگ بدلتی... ایک لہو رنگ اور دل گداز داستان...

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

میں ڈنمارک سے اپنے پیارے وطن پاکستان لوٹا تھا۔ مجھے کسی کی تلاش تھی۔ یہ تلاش شروع ہونے سے پہلے ہی میرے ساتھ ایک ایسا واقعہ ہوگیا جس نے میری زندگی کو تہ و بالا کر دیا۔ میں نے سرِراہ ایک زخمی کو اٹھا کر اسپتال پہنچایا جسے کوئی گاڑی ٹکر مار کر گزر گئی تھی۔ مقامی پولیس نے مجھے مددگار کے بجائے مجرم ٹھہرایا اور یہیں سے جبر و ناانصافی کا ایسا سلسلہ شروع ہوا جو مجھے شکیل داراب اور لالہ نظام جیسے خطرناک لوگوں کے سامنے کھڑا کر دیا۔ یہ لوگ ایک قبضہ گروپ کے سرغنہ تھے جو رہائشی کالونیاں بنانے کے لیے چھوٹے زمینداروں اور کاشت کاروں کو ان کی زمینوں سے محروم کر رہا تھا۔ میرے چچا حفیظ سے بھی زبردستی ان کی آبائی زمین ہتھیانے کی کوشش کی جارہی تھی۔ چچا کا بیٹا ولید اس جبر کو برداشت نہ کرسکا اور شکیل داراب کے دستِ راست انسپکٹر قیصر چودھری کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہوگیا۔ اس جرأت کی سزا اسے یہ ملی کہ ان کی حویلی کو اس کی ماں اور بہن فائزہ سمیت جلا کر راکھ کر دیا گیا اور وہ خود دہشت گرد قرار پاکر جیل پہنچ گیا۔ انسپکٹر قیصر اور لالہ نظام جیسے سفاک لوگ میرے تعاقب میں تھے، وہ میرے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ میں WWF کا یورپی چیمپئن تھا، وسطی یورپ کے کئی بڑے بڑے گینگسٹر میرے ہاتھوں ذلت اٹھا چکے تھے۔ میں اپنی پچھلی زندگی سے بھاگ آیا تھا لیکن وطن پہنچتے ہی یہ زندگی پھر مجھے آواز دینے لگی تھی۔ میں نے اپنی چچی اور چچازاد بہن فائزہ کے قاتل لالہ نظام کو بیدردی سے قتل کر دیا۔ انسپکٹر قیصر شدید زخمی ہوکر اسپتال نشیں ہوا۔ شکیل داراب ایک شریف النفس زمیندار کی بیٹی عاشرہ کے پیچھے ہاتھ دھوکر پڑا ہوا تھا۔ وہ اسی عارف نامی نوجوان سے محبت کرتی تھی جسے میں نے زخمی حالت میں اسپتال پہنچانے کی ”غلطی“ کی تھی۔ میں نے شکیل داراب کی ایک نہایت اہم کمزوری کا سراغ لگایا اور یوں اس پر دباؤ ڈال کر عاشرہ کی جان اس سے چھڑا دی۔ میں یہاں بیزار ہوچکا تھا اور واپس ڈنمارک لوٹ جانے کا تہیہ کرچکا تھا مگر پھر ایک انہونی ہوئی۔ وہ جادوئی حسن رکھنے والی لڑکی مجھے نظر آگئی جس کی تلاش میں، میں یہاں پہنچا تھا۔ اس کا نام تاجور تھا اور وہ اپنے گاؤں چاند گڑھی میں نہایت پریشان کن حالات کا شکار تھی۔ میں تاجور کے ساتھ گاؤں پہنچا اور ایک ٹریکٹر ڈرائیور کی حیثیت سے اس کے والد کے پاس ملازم ہوگیا۔ انیق بطور مددگار میرے ساتھ تھا۔ مجھے پتا چلا کہ تاجور کا غنڈا صفت منگیتر اسحاق اپنے ہمنواؤں زمیندار عالمگیر اور پیر ولایت کے ساتھ مل کر تاجور اور اس کے والد دین محمد کے گرد گھیرا تنگ کر رہا تھا۔ پیر ولایت نے گاؤں والوں کو باور کرا رکھا تھا کہ اگر تاجور کی شادی اسحاق سے نہ ہوئی تو چاند گڑھی پر آفت آئے گی۔ ان لوگوں نے چاند گڑھی کے راست گو امام مسجد مولوی فدا کو بھی اپنے ساتھ ملا رکھا تھا۔ تاجور کے گھر میں آئی مہمان نمبردارنی کو کسی نے زخمی کر دیا تھا۔ اس کا الزام بھی تاجور کے کو دیا جارہا تھا۔ ایک رات میں نے چہرے پر ڈھاٹا باندھ کر مولوی فدا کا تعاقب کیا۔ وہ ایک ہندو میاں بیوی رام پیاری اور وکرم کے گھر میں داخل ہوئے۔ پہلے تو مجھے یہی غلط فہمی ہوئی کہ شاید مولوی فدا یہاں کسی غلط نیت سے آئے ہیں لیکن پھر حقیقت سامنے آگئی۔ مولوی فدا ایک خداترس بندے کی حیثیت سے یہاں وکرم اور رام پیاری کی مدد کے لیے آئے تھے۔ تاہم اسی دوران میں وکرم اور رام پیاری کے کچھ مخالفین نے ان کے گھر پر حملہ بول دیا۔ ان کا خیال تھا کہ ٹی بی کا شکار وکرم ان کے بچے کی موت کا باعث بنا ہے۔ اس موقع پر مولوی فدا نے دلیری سے وکرم اور رام پیاری کا دفاع کیا، لیکن جب حالات زیادہ بگڑے تو میں نے ہڈیوں کے ڈھانچے وکرم کو کندھے پر لادا اور رام پیاری کو لے کر وہاں سے بھاگ نکلا۔ میں نمبردارنی کو زخمی کرنے والے کا کھوج لگانا چاہتا تھا۔ یہ کام مولوی صاحب کے شاگرد طارق نے کیا تھا۔ وہ تاجور کی جان لینا چاہتا تھا کیونکہ اس کی وجہ سے مولوی صاحب کسی بلیک میلنگ کا شکار ہو رہے تھے۔ طارق سے معلوم ہوا کہ مولوی جی کی بچی زینب ایک عجیب بیماری کا شکار ہے۔ وہ زمیندار عالمگیر کے گھر میں ٹھیک رہتی ہے لیکن جب اسے وہاں سے لایا جائے تو اس کی حالت غیر ہونے لگتی ہے۔ اسی دوران میں ایک خطرناک ڈاکو سجاول نے گاؤں پر حملہ کیا۔ حملے میں عالمگیر کا چھوٹا بھائی مارا گیا۔ میں تاجور کو حملہ آوروں سے بچا کر ایک محفوظ جگہ لے گیا۔ ہم دونوں نے کچھ اچھا وقت گزارا۔ واپس آنے کے بعد میں نے بھیس بدل کر مولوی فدا سے ملاقات کی اور اس نتیجے پر پہنچا کہ عالمگیر وغیرہ نے زینب کو جان بوجھ کر بیمار کر رکھا ہے اور یوں مولوی صاحب کو مجبور کیا جارہا ہے کہ وہ اپنی بچی کی جان بچانے کے لیے اسحاق کی حمایت کریں۔ میں نے مولوی صاحب کو اس ”بلیک میلنگ“ سے نکالنے کا عہد کیا مگر اگلی رات مولوی صاحب کو قتل کر دیا گیا۔ میرا شک عالمگیر اور اسحاق وغیرہ پر تھا۔ رات کی تاریکی میں، میں نے عالمگیر اور اسحاق کو کسی خاص مشن پر جاتے دیکھا۔ وہ ایک ویرانے میں پہنچے۔ میں نے ان کا تعاقب کیا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ عالمگیر، سجاول کے کندھے سے کندھا ملائے بیٹھا تھا۔ میں نے چھپ کر ان کی تصاویر کھینچ لیں۔ میں اقبال کا تعاقب کرتا ہوا یاسر تک جا پہنچا اور چھپ کر ان کی باتیں سنیں... وہ بے بس و مظلوم شخص تھا اور چھپ کر ایک قبرستان میں اپنے دن گزار رہا تھا... ایک دن میں اور انیق پیر ولایت کے والد پیر سائیں جی کے اس ڈیرے پر جا پہنچے جو کسی زمانے میں جل کر خاکستر ہو چکا تھا۔ اور اس سے متعلق متعدد کہانیاں منسوب تھیں۔ اس ڈیرے پر لوگ دم درود وغیرہ کرانے آتے تھے۔ تاجور کی قریبی دوست ریشمی شادی کے بعد دوسرے گاؤں چلی گئی تھی... اس کا شوہر شکی مزاج اور تشدد پسند شخص تھا۔ اس نے ریشمی کی زندگی عذاب بنا رکھی تھی۔ ایک دن وہ ایسی غائب ہوئی کہ اس کا شوہر ڈھونڈتا رہ گیا۔ میں تاجور کی خاطر ریشمی کا کھوج لگانے کا بیڑا اٹھا بیٹھا اور ایک الگ ہی دنیا میں جا پہنچا۔ ریشمی ایک ملنگ کا روپ دھار چکی تھی اور آستانے پر اپنی دلکش و سریلی آواز کی باعث پاک بی بی کا درجہ حاصل کر چکی تھی۔ میں تاجور کو لے کے اس آستانے تک جا پہنچا... اور ایک ہیبت ناک واقعے کا چشم دید گواہ ہونے کے باعث ان کے قیدی بن گئے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

تاجور کی آنکھوں میں مجھے حیرت آمیز اضطراب نظر آیا۔ یقیناً اس نے چاچارزاق کی یہ بات سُن لی تھی کہ ملنگی ڈیرے والوں نے مجھے آفر کی ہے کہ میں تاجور کے ساتھ رہ سکتا ہوں۔ تاجور کے چہرے پر برہمی کی ہلکی ہلکی سرخی دکھائی دینے لگی تھی یقیناً یہ برہمی ڈیرے والوں کے لیے ہی تھی اور شاید تھوڑی بہت انیق کے لیے۔

وہ میرے پاس آکر بولی۔ ''شاہ زیب! آخر یہ سب کیا ہے؟ ہم کون سا ایسا جرم کر بیٹھے ہیں اور یہ انیق؟ اس کی بھی کچھ سمجھ نہیں آرہی...''

میں نے تاجور کے تاثرات دیکھے۔ اسے اب سب کچھ بتانا ضروری ہوگیا تھا۔ میں نے اسے بیٹھنے کے لیے کہا۔ وہ چاول کی چھال پر میرے پاس ہی بیٹھ گئی، میں نے کہا۔ ''تاجور! یہاں ملنگی ڈیرے پر ایک بہت سنگین واقعہ ہو چکا ہے اور قسمت کا پھیر یہ ہے کہ ہم اس واقعے کے چشم دید گواہ بن گئے ہیں۔''

''کیسا واقعہ؟''

''لاہور سے یہاں پہنچنے والے ایک لڑکے کو ان ملنگوں نے بیدردی سے قتل کر دیا ہے۔ وہ شاید یہاں اپنی کسی عزیزہ کے لیے آیا تھا۔ جیسے ہم یہاں ریشمی کے لیے آئے ہیں۔''

''کب ہوا یہ؟'' تاجور نے لرزتی آواز میں پوچھا۔

''اسی دن جب میں سیڑھیاں اُتر کر یہاں نیچے آیا تھا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے اس لڑکے کی لاش دیکھی۔ اسی دوران میں پہریداروں نے مجھے دیکھ لیا۔ انہوں نے مجھے اس طرح گھیرا کہ میں بھاگنے کی کوشش کرتا تو یہ سراسر خودکشی کے کھاتے میں آتا۔''

وہ حیرت سے سُن رہی تھی۔ میں نے چیتوں والی بات گول کر دی، تاکہ تاجور کے خوف و ہراس میں اضافہ نہ ہو۔

''اب... کیا ہوگا؟'' وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولی۔

''مقتول لڑکا لاہور کے کسی بڑے پولیس آفیسر کا بیٹا تھا۔ ملنگوں نے اسے مار تو دیا ہے، پر اب بہت ڈرے ہوئے بھی ہیں۔ عین ممکن تھا کہ اس قتل کا نشان مٹانے کے لیے وہ ہم تینوں کو بھی مار ڈالتے لیکن انیق نے اس معاملے کو بڑی ہوشیاری سے سنبھالا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کی نیت پر شک کرنے کے بجائے ہمیں اس کا شکرگزار ہونا چاہیے۔ اگر میں یہ کہوں تو غلط نہ ہوگا کہ اس نے ہماری موت کی سزا کو قید کی سزا میں بدلوا لیا ہے۔ اس نے یہ سب کیسے کیا ہے؟ یہ ابھی مجھے ٹھیک سے معلوم نہیں۔ لیکن یہ ہے ویسے ہی جیسے میں کہہ رہا ہوں۔''

چاچارزاق نے ذرا تلخ لہجے میں کہا۔ ''لیکن تمہیں یہ سب کیسے معلوم ہوا ہے۔ اس غنڈے نے میرے سامنے تو تم سے ایسی کوئی بات نہیں کہی۔''

''چاچا آہستہ بولو۔'' میں نے تیز سرگوشی میں کہا۔ ''ان پہرے داروں کے کان بڑے تیز ہیں اور وہ سامنے ہی بیٹھے ہوئے ہیں۔''

چاچارزاق نے اپنی نیم سفید داڑھی کھجائی اور بے چینی سے پہلو بدلا۔ میں نے چاچا کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''میں، انیق کو اتنا ہی جانتا ہوں جتنا اپنے آپ کو۔ آپ اس بارے میں بالکل فکرمند نہ ہوں۔ فی الحال ہمیں صرف اس بات کی فکر کرنی چاہیے کہ ہماری زندگیوں کا لاحق خطرہ ٹل جائے۔''

میں سرگوشیوں میں دیر تک تاجور اور چاچارزاق کو صورتِ حال کی نزاکت سمجھاتا رہا۔ ان کی بے چینی میں تھوڑا بہت فرق پڑا تھا۔ ان دونوں کو سب سے زیادہ فکر یہ تھی کہ اگر وہ جلد ہی یہاں سے نکل نہ سکے تو چاند گڑھی میں کیا طوفان مچے گا۔ تاجور کی آنکھوں میں بار بار آنسو جمع ہو رہے تھے۔

اگلے روز دوپہر کو ہمیں اسی پتھریلے چیمبر میں منتقل کر دیا گیا جس کی چھت صرف سات فٹ اونچی تھی اور جس کی ایک دیوار میں بڑی بڑی آہنی کھڑکیاں لگی ہوئی تھیں۔ انہی وزنی، زنگ آلود کھڑکیوں کی دوسری جانب وہ خوب صورت جگہ تھی جسے یہاں ''سایہ'' کہا جاتا تھا۔ پتھریلے چیمبر میں داخل ہونے کا واحد راستہ ایک چھوٹا سا تنگ دروازہ تھا۔ ہم اس میں سے جھک کر بمشکل گزرے۔ لوہے کا وزنی دروازہ ہمارے پیچھے بند ہوگیا۔ دروازہ بے شک لوہے کا تھا لیکن اس پر باہر کی طرف چار پانچ چپٹے پتھر اس طرح جوڑ دیے گئے تھے کہ دروازہ بند ہونے پر اس تنگ راستے کی نشاندہی مشکل ہو جاتی ہوگی۔ باہر سے یہ پتھریلی دیوار ہی دکھائی دیتی ہوگی۔ ہمیں یہ پتا بھی چلا کہ اس چیمبر کو ''جنگلارے'' کا نام دیا جاتا ہے۔ شاید یہ لفظ جنگلے سے نکلا تھا۔

چیمبر کے اندر کا منظر وہی تھا جو ہم پہلے بھی دیکھ چکے تھے۔ یہاں کم و بیش تیس مرد و زن رہائش پذیر تھے۔ ان میں سے دس بارہ افراد جوڑوں کی شکل میں تھے۔ باقی انفرادی طور پر رہ رہے تھے۔ زیادہ تر افراد کا تعلق آزاد کشمیر یا سیالکوٹ وغیرہ کے علاقوں سے ہی لگتا تھا... وہ یہاں قیدیوں کی حیثیت سے موجود تھے مگر لگتا تھا کہ اب یہاں کے روز و شب انہیں راس آچکے ہیں۔ چند ایک کے

سو اسب ہی مطمئن دکھائی دیتے تھے۔ جو بات چونکاتی اور پریشان کرتی تھی، وہ یہی تھی کہ وہ سب کے سب لنگڑا کر چلتے تھے اور انیق نے بتایا تھا کہ ان کی چال کا یہ نقص پیدا کیا گیا ہے۔ میں جانتا تھا کہ اس حوالے سے تاجور کی زبان پر بھی کوئی سوال آنے والا ہے۔ میں نے خود کو اس سوال کے لیے تیار کر رکھا تھا... ہمیں رہنے کے لیے دو حجرے دیے گئے تھے۔ دونوں بالکل ساتھ ساتھ تھے۔ ایک حجرہ تاریک تھا اور دوسرے کے اندر روشنی ہو رہی تھی۔ اس روشنی کی وجہ تھوڑی دیر بعد سمجھ میں آئی۔ یہاں خربوزے کی شکل کا ایک ایسا پتھر رکھا ہوا تھا، جو بے حد چمکیلا تھا اور اس چمک کی وجہ سے حجرے میں ہلکی سی روشنی محسوس ہوتی تھی۔ حجروں کا فرش قدرتی پتھر کا تھا۔ یہ ناہموار فرش مسلسل استعمال سے چکنے اور شفاف ہو چکے تھے۔ دونوں حجروں میں آرام دہ گدے بچھے ہوئے تھے، لکڑی کی ایک ایک الماری تھی اور ضروریات زندگی کی دیگر اشیا موجود تھیں، جن میں لباس، کھانے کے برتن اور پانی کے کولر وغیرہ شامل تھے۔

چاچا رزاق نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ ''نوری یہاں بھی نظر نہیں آرہی۔''

میں خود بھی نوری کے لیے پریشان تھا۔ غالب گمان یہی تھا کہ وہ پکڑی گئی ہے۔ ہمارا خیال تھا کہ شاید وہ سیدھی چیمبر میں پہنچا دی گئی ہو، لیکن وہ یہاں بھی نظر نہیں آرہی تھی۔ میں نے ایک پہریدار سے کہا۔ ''ہماری ایک اور ساتھی بھی تھی؟''

وہ پھنکارا۔ ''اپنی چونچ بند رکھو اور جو کہا گیا ہے، بس اس پر عمل کرو۔ کھانا تمہیں پکا پکایا ملے گا۔ لیکن اپنے کمرے کی صفائی ستھرائی... اور اپنے کپڑے برتن وغیرہ دھونے کی ذمے داری تمہاری اپنی ہوگی۔ نہانے اور پیشاب وغیرہ کے لیے وہ سامنے تالاب کے ساتھ ساتھ چوکیاں بنی ہوئی ہیں۔ بائیں طرف والی چوکیاں مردوں کے لیے اور دائیں طرف والی زنانیوں کے لیے ہیں۔''

جنہیں وہ چوکیاں کہہ رہا تھا، وہ چھوٹے چھوٹے غسل خانے تھے۔

ضروری ہدایات دینے کے بعد پہریدار مجھے کڑی نظروں سے گھورتا ہوا باہر چلا گیا۔ اس کے گھورنے کی وجہ یقیناً وہی کل والا واقعہ تھا۔ میں نے اپنے ہاتھ بندھے ہونے کے باوجود دو پہریداروں کی ٹھکائی کر دی تھی... اور اس سے پہلے بھی میں اوپر سیڑھیوں پر ان کے دو ساتھیوں کو زخمی کر چکا تھا۔

چاچا نے فکر مند لہجے میں کہا۔ ''کہیں اس وچاری کڑی کے ساتھ کچھ ہو نہ گیا ہو۔'' چاچا کا اشارہ نوری کی طرف تھا۔

''آپ پریشان نہ ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ جلد ہی انیق سے ملاقات ہوگی اور وہ ہمیں صحیح پوزیشن بتا دے گا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ کسی وجہ سے ڈیرے پر واپس ہی نہ آئی ہو... اور ابھی تک بچی ہوئی ہو۔''

''لیکن اس کو آنا تو تھا نا۔'' تاجور نے روہانسی آواز میں کہا۔

''ہمیں اچھے کی امید رکھنی چاہیے... دعا کرنی چاہیے، اپنے لیے بھی اور اس کے لیے بھی۔'' چاچا رزاق نے کہا اور ہال کی دیوار کے ساتھ ٹکا کے گدے پر بیٹھ گئے۔

حجرے کے ادھ کھلے دروازے میں سے اس قید خانے کے کئی مکین پر تجسس نظروں سے ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ صاف پتا چلتا تھا کہ وہ جلد از جلد ہمارے بارے میں جاننے کے خواہش مند ہیں۔

اس سے پہلے کہ ان میں سے کوئی ہمارے پاس آبیٹھتا اور ''انٹرویو'' شروع کر دیتا ہمیں اس ''قید خانے'' کا مختصر دروازہ کھلتا نظر آیا۔ انیق جو ایک ریشمی کوٹ پہنے ہوئے تھا، جھک کر اندر آگیا۔ کوٹ کے نیچے اس نے وہی نیلا چغا پہن رکھا تھا جو ملنگوں کے پاؤں تک چلا جاتا تھا۔ اس کے سر پر ایک نیلی گول ٹوپی بھی تھی۔ اس ہیئت کذائی میں وہ عجیب لگا۔ اس کے پیچھے پیچھے گول چہرے والا وہی کرخت پہریدار تھا جو ابھی تھوڑی دیر پہلے مجھے گھورتا ہوا یہاں سے گیا تھا۔ پہریدار کے ہاتھ میں ایک لمبے عصا کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ میں نے دیکھا تھا کہ پہریدار اس چیمبر میں آتے وقت اپنے ہاتھ میں کوئی آتشیں ہتھیار نہیں رکھتے تھے۔

انیق نے رسمی کلمات ادا کیے اور پھر ہمارے حجرے میں بیٹھ گیا۔ ایک خدمت گار نے ہمارے سامنے فوراً چائے کی پیالیاں اور کچھ خشک میوے رکھ دیے۔ انیق کے چہرے سے ظاہر تھا کہ وہ کوئی اہم بات کہنا چاہ رہا ہے اور اس کے لیے مناسب الفاظ تلاش کر رہا ہے۔ اس نے اپنے گلے میں موجود لکڑی کی تسبیح کو اپنی انگلیوں میں گردش دی اور گلا صاف کرتے ہوئے بولا۔ ''شاہ زیب بھائی! کوئی جادو سا ہے یہاں کے ماحول میں۔ یقین کریں میں تو حیران رہ گیا ہوں۔ اتنا سکون ہے، اتنا امن ہے، یوں لگتا ہے کہ دنیا میں جنت کا مزہ مل رہا ہے۔ کل میں نے اوپر مزار کے سامنے جاکر پردے والی سرکار کا خطاب بھی سنا ہے، ان کی باتیں دل میں اترتی چلی جاتی ہیں۔''

''کیا یہی سب کچھ بتانے کے لیے یہاں آئے ہو؟''

چاچا نے تلخ لہجے میں پوچھا۔

''ہاں چاچا! بتانے آیا ہوں اور آپ سے ایک درخواست کرنے بھی آیا ہوں۔'' اس نے اپنے چغے کے اندر ہاتھ ڈالا اور ایک کتابچہ سا مجھے تھما دیا۔ کتابچے کا عنوان تھا۔ ''سرکار جی کی باتیں۔''

''یہ کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''شاہ زیب بھائی! آپ اس کو ایک بار تسلی سے پڑھیں ضرور۔ مجھے یقین ہے یہ سب کچھ آپ کے دل پر بھی ویسا ہی اثر کرے گا جیسا میرے دل پر کیا۔ مختصر بات کی جائے تو دنیا کے سارے غموں کا علاج ان چند صفحوں میں بتا دیا گیا ہے۔''

''یعنی تم ہمیں بھی اپنی طرح یہ نیلا چولا پہنانا چاہتے ہو؟'' چاچا رزاق نے پھر خشک لہجے میں کہا۔

''میں کچھ نہیں چاہتا چاچا، اور نہ ہی یہاں زبردستی کوئی آپ پر کچھ تھوپے گا۔ آپ کو جو کرنا ہے، اپنی مرضی سے کرنا ہے...''

انیق کے ساتھ آنے والا پہریدار چند قدم دور کھڑا تھا۔ ہماری اکثر باتیں اس کے کانوں تک بھی پہنچ رہی تھیں۔

تاجور نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا۔ ''اگر ہم اس مصیبت سے نکلنے کے لیے جھوٹ موٹ سرکار کے مرید بن جائیں اور تمہاری طرح نیلا چولا پہن لیں تو پھر...؟''

انیق نے بڑے وجدانی انداز میں اپنا سر دائیں بائیں ہلایا اور بولا۔ ''نہیں تاجور بہن! یہی تو کمال ہے سرکار جی کا۔ دلوں کا حال ان سے چھپا نہیں رہتا۔ آپ نیلا چولا نہ پہنیں، لیکن اگر آپ کے دل نے نیلا چولا پہن لیا تو سرکار جی کو فوراً پتا چل جائے گا، اصل بات تو ہمارے اندر کی ہوتی ہے اور اندر کی بات اندر کی آنکھ والے دیکھتے ہیں۔''

انیق کے کپڑے ایک انوکھی خوشبو میں بسے ہوئے تھے اور اس کے چہرے پر سرخی جھلکتی تھی۔ اسی دوران میں اس کے ساتھ آنے والے پہریدار کو کسی نے آواز دی اور وہ ہمارے حجرے کے سامنے سے پلٹ کر تالاب کی طرف چلا گیا۔ انیق نے کن انکھیوں سے اسے دیکھا اور پھر بدلے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''شاہ زیب بھائی! یہاں معاملہ خراب ہوتا جارہا ہے۔ یہ خبیث پردے والی سرکار، ٹوٹے ہوئے چھتر کی طرح پھیلتی جارہی ہے۔''

''کیا ہوا ہے؟'' میں نے بھی سرگوشی میں پوچھا۔

''میرے پاس تفصیل بتانے کا وقت نہیں ہے، بس یہ سمجھ لیں کہ ریشمی کی تلاش میں ہمارا یہاں آنا ریشمی کے لیے مصیبت کا سبب بن رہا ہے۔ پردے والی سرکار سمجھ گئی ہے کہ ریشمی کی تلاش میں یہاں لوگ آنا شروع ہوگئے ہیں اور وہ کسی بھی وقت اڑن چھو ہو سکتی ہے۔ وہ اس سونے کے انڈوں والی مرغی کو ہاتھ سے جانے نہیں دے سکتے۔''

''تو پھر؟''

''مجھے پتا چلا ہے کہ پردے والی سرکار ریشمی کو ازدواجی بندھن میں باندھنا چاہ رہی ہے۔ یہ بات تو شاید پہلے بھی چل رہی تھی مگر اب اس میں ایک دم تیزی آگئی ہے۔ دو ٹوک بات ہورہی ہے اور شاید دو چار دن میں کوئی فیصلہ ہوجائے گا۔''

چاچا رزاق کا رنگ زرد ہوگیا۔ یوں لگا جیسے انہیں کچھ ہوجائے گا۔ میں نے ان کا ناتواں کندھا تھپکتے ہوئے کہا۔ ''چاچا! حوصلہ رکھیں۔ ہمارے ہوتے ریشمی پہ کوئی آنچ نہیں آئے گی۔''

تاجور نے لرزتے ہاتھوں سے چاچا کو پانی پلایا۔ پہریدار اب کسی بھی وقت واپس آسکتا تھا۔ میں نے انیق سے پوچھا۔ ''نوری کا کچھ پتا چلا ہے؟''

''نہیں بھائی! یہ لوگ کہتے ہیں کہ وہ واپس ڈیرے پر نہیں آئی۔''

''جھوٹ بول رہے ہیں، یہ کیسے ہوسکتا ہے؟''

''میں تو وہ... لگا رہا ہوں، آپ فکر نہ کریں۔'' اسی دوران میں عقابی نگاہوں والا پہریدار واپس پہنچ گیا۔ انیق نے لب و لہجہ پھر بدل لیا۔ سمجھانے والے انداز میں بولا۔ ''سرکار جی کہتے ہیں، خوشی کا تعلق دولت اور آرام آسائش سے نہیں... خوشی تو اپنے آپ کو فنا کردینے میں ہے۔ سب کچھ چھوڑ دینے میں...'' وہ بول رہا تھا اور ہم سن رہے تھے... میرے دماغ میں ہلچل تھی۔ اگر واقعی ریشمی کے ساتھ کچھ ہونے والا تھا تو پھر اسے روکے جانے کی ضرورت تھی۔ اسی دوران میں پہریدار نے اشارے سے انیق کو باہر بلایا اور اس کے کان میں کچھ کھسر پھسر کی۔ انیق نے اثبات میں سر ہلایا اور واپس ہمارے پاس آن بیٹھا۔ اس نے کہا۔ ''بڑے مجاور کرتالی صاحب کا حکم ہے کہ آپ تینوں کو اس ناخوشگوار واقعے کے بارے میں بالکل خاموش رہنا ہے۔ یہاں اس چیمبر کے کسی شخص سے اس بارے میں بات نہیں کرنی... آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے۔ میں لاہوری لڑکے والی بات کررہا ہوں۔''

میں نے انیق کو یقین دلایا کہ ایسا ہی ہوگا۔ کچھ دیر

ہمارے پاس بیٹھنے کے بعد انیق واپس چلا گیا۔ وہ غضب کا اداکار تھا۔ اس نے بڑی خوبی سے خود کو یہاں کے حالات میں ڈھالا تھا۔ لمبے نیلے چغے .... اور ٹوپی کے ساتھ وہ واقعی کوئی مست ملنگ نظر آنے لگا تھا۔ جیسا کہ میں نے پہلے بتایا ہے، انیق کی خوبی یہ تھی کہ وہ عام قد کاٹھ اور عام شکل و صورت کا تھا۔ لوگوں میں گھلنے ملنے میں اسے بڑی آسانی رہتی تھی۔ کسی وقت اپنی شکل اتنی معصوم بنا لیتا تھا کہ اس پر کسی طرح کی چالاکی یا دھوکا دہی کا شبہ کیا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ انیق کی ایک اہم خوبی کا پتا مجھے بھی پچھلے دنوں ہی چلا تھا... یہ کہ وہ پنجابی کے علاوہ کئی دوسری علاقائی زبانیں بھی روانی سے بول سکتا تھا اور اس سے زیادہ حیرانی کی بات یہ تھی کہ انگلش کے علاوہ بھی اسے کچھ غیر ملکی زبانوں کی شدبد تھی۔ اس کے باوجود وہ بڑی معصومیت کے ساتھ چاند گڑھی میں پہلوان حشمت راہی کے ساتھ نثر اور شاعری کی بونگیاں مارتا تھا۔ ایسی ہی ایک نشست میں پہلوان نے اپنا ایک تازہ شعر بڑی سنجیدگی کے ساتھ سنا تھا۔ سگریٹ کے پیکٹ پر لکھا ہوا یہ شعر کچھ اس طرح تھا۔ جب بھی مجھے اس سے اپنا رومانی سفر یاد آتا ہے... شالامار، شاہی قلعہ اور چڑیا گھر یاد آتا ہے۔ ستم بالائے ستم یہ کہ سفر کو صفر لکھا گیا تھا اور شاہی قلعہ کو شاہی کلا۔ اس کے باوجود انیق نے پہلوان کو کھل کر داد دی تھی۔

انیق کے جانے کے بعد میں اپنے حجرے میں چلا گیا اور بے چینی سے مختصر جگہ پر ٹہلنے لگا۔ انیق کی بات سمجھ میں آرہی تھی۔ ہمارا یہاں پہنچنا، ریشمی کے لیے نیک فال ثابت نہیں ہوا تھا اور اب یہ لوگ اسے کسی بندھن میں باندھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مجھے ایک دن پہلے دیکھا ہوا وہ منظر یاد آیا، جس میں ہم نے ریشمی کو پردے والی سرکار کے ہمراہ ڈولی سے اترتے دیکھا تھا۔ اسی سے اندازہ ہو گیا تھا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔

ریشمی خوش شکل تھی مگر کوئی ایسی حسین و جمیل بھی نہیں تھی۔ ''جوان ملنگنیوں'' میں شاید کچھ اس سے زیادہ خوب صورت ہوں۔ اصل میں ریشمی کی آواز ہی اس کے لیے وجۂ مصیبت بن رہی تھی۔ اس آواز کی وجہ سے لوگ ملنگی ڈیرے کی طرف کھنچ کر آرہے تھے... اور ڈیرے والوں کی آمدنی میں بھی یقیناً اضافہ ہو رہا تھا۔

ریشمی کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے ہوتا تھا کہ اب اس کی آواز کی کیسٹس بھی فروخت ہونا شروع ہو گئی تھیں۔ مجاوروں کو مستقبل قریب میں یقیناً ریشمی سے مزید فائدے کی توقع تھی۔

رات کو بھی میں دیر تک جاگتا رہا۔ دوسرے حجرے میں چاچا رزاق اور تاجور سوئے ہوئے تھے۔ پتا نہیں کہ وہ بھی سو رہے تھے یا جاگ رہے تھے۔ ماحول میں سناٹا تھا۔ بس کبھی کبھار کسی حجرے سے کسی بوڑھے شخص کے کھانسنے کی آواز ابھرتی تھی اور بند چیمبر میں گونج کر رہ جاتی تھی۔ یہاں جو کچھ بھی تھا لیکن ایک سکون تھا کہ خونخوار جیوپارڈ چیتوں کی آوازیں سنائی نہیں دیتی تھیں۔ نیند آنے لگی تو میں ایک صاف ستھرا ڈبل کمبل اوڑھ کر سو گیا۔

صبح گھڑیال کی ایک زوردار آواز نے ہمیں جگایا۔ سونے اور جاگنے کے وقت کا تعین، گھڑیال کی یہی زوردار آواز کرتی تھی۔ چائے اور باقر خانی کا ناشتا تازہ اور مناسب تھا۔ میرے اور تاجور کے اصرار کے باوجود چاچا رزاق نے بس چائے کے دو تین گھونٹ لینے پر اکتفا کیا۔ ریشمی کا دکھ جیسے انہیں اندر سے توڑ پھوڑ رہا تھا۔

وہ کراہ کر بولے۔ ''مجھے کسی طرح اس پردے والی سرکار کے پاس پہنچا دو۔ میں اس کے پاؤں پکڑ کر اپنی دھی کی جان اس سے چھڑوا لوں گا۔''

میں نے کہا۔ ''چاچا! سمجھنے کی کوشش کریں، یہاں منت سماجت سے کچھ نہیں ہونے والا۔''

''اگر... وہ منت سماجت سے نہیں مانے گا تو پھر... میں مر جاؤں گا یا مار دوں گا۔'' چاچا نے جذباتی لہجے میں کہا۔

''لیکن چاچا... اس سے پہلے ایک اور خاص بات ہے جو ہمارے لیے جاننا بہت ضروری ہے۔ کیا ریشمی بھی یہاں سے نکلنا چاہتی ہے؟ آپ جانتے ہی ہیں، تاجور نے اس سے ملاقاتیں کی ہیں لیکن وہ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہوئی، بلکہ اس نے تاجور کو بھی اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی۔ لگتا ہے کہ وہ یہاں کے رنگ میں بری طرح رنگ گئی ہے۔''

میں نے سوالیہ نظروں سے تاجور کی طرف دیکھا۔ لٹیں اس کے چہرے پر جھول رہی تھیں۔ زرد رنگ کی ایک موٹی اونی شال اس کے کندھوں پر تھی۔ یہاں جنگلارے میں محبوس تمام افراد کے کپڑوں پر ایک چوڑی زرد پٹی تھی۔ یقیناً ٹاٹنگ کے نقص کی طرح یہ پٹی بھی ان کی شناخت تھی۔ تاجور جیسے کسی سوچ میں گم تھی۔ کھوئے کھوئے انداز میں بولی۔ ''آپ کی بات ٹھیک ہے شاہ زیب! لیکن... اب جو نئی صورتِ حال بن رہی ہے، شاید اس نے ریشمی کی سوچ پر

بھی اثر ڈالا ہو۔‘‘

’’تمہارا مطلب ہے کہ پردے والی سرکار کی زوجیت میں آنے والی بات؟‘‘

تاجور نے اثبات میں سر ہلایا۔ ’’میں نے محسوس کیا ہے کہ ریشمی اس پردے والی سرکار کو اپنے کسی بڑے یا بزرگ کی سی حیثیت دیتی ہے۔ شاید بڑے مجاور کرنالی نے یا کسی دوسرے مجاور نے پہلے بھی ریشمی سے اس طرح کی کوئی بات کی تھی اور اسے پردے والی سرکار کے نکاح میں آنے کو کہا تھا مگر ریشمی نے کہا تھا کہ وہ ایسا سوچ بھی نہیں سکتی۔‘‘

تاجور کی بات میں وزن تھا۔ ریشمی سے دوسری ملاقات کے بعد تاجور نے یہ بھی بتایا تھا کہ ریشمی دنیاداری کے سارے معاملات سے دور نظر آتی ہے، مثلاً شادی... بال بچے وغیرہ۔

ہماری گفتگو جاری ہی تھی کہ اس قید خانے کے تین ساتھی ہمارے پاس آ گئے۔ ان میں دو مرد اور ایک عورت تھی۔ عورت درمیانی عمر کی گوری چٹی تھی۔ مردوں میں سے ایک عمر رسیدہ اور دوسرا جوان تھا۔ عمر رسیدہ نے اپنا نام خدا بخش بتایا۔ جوان کا نام بھولا تھا اور وہ پانچ سال پہلے مظفر آباد میں معمار کا کام کرتا تھا۔ عورت دوسرے حجرے میں جا کر تاجور سے باتوں میں مصروف ہو گئی۔ خدا بخش اور بھولا ہم سے بات چیت کرنے لگے۔ جلد ہی خدا بخش نے وہ سوال ہم سے پوچھ لیا جس کی ہم توقع کر رہے تھے۔ اس نے پنجابی میں پوچھا کہ ہم یہاں کیسے اور کیونکر آ پھنسے ہیں؟

کل انیق نے ہمیں خاص طور سے ہدایت کی تھی کہ ہمیں لڑکے والے واقعے کے بارے میں کوئی بات نہیں کرنی۔ ہم یہ بات بھی نہیں کر سکتے تھے کہ ہم یہاں اس لڑکی کی رہائی کے لیے آئے ہیں جسے ’’پاک بہن‘‘ کہا جاتا ہے۔ ہم نے اس سوال کا جواب پہلے ہی تیار کر رکھا تھا۔ میں نے بتایا کہ ایک قریبی گاؤں میں میلے کے موقع پر ہمارا جھگڑا ملنگی ڈیرے کے لوگوں سے ہو گیا۔ اس لڑائی میں ڈیرے کے کچھ ملنگ اور دو ملنگنیاں زخمی ہو گئیں۔ سنا ہے کہ ان میں سے ایک ملنگ بعد میں مر گیا۔ یہ لوگ ہمیں اغوا کر کے یہاں لے آئے۔

باتوں کا سلسلہ شروع ہوا تو طویل ہوتا چلا گیا۔ معلوم ہوا کہ یہاں موجود زیادہ تر مرد و زن وہی ہیں جو کسی وجہ سے پردے والی سرکار کے عتاب کا شکار ہوئے ہیں۔ ان کو رہا نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ان کے رہا ہونے سے ’’سرکار جی‘‘ کے بھید کھلتے ہیں۔ مثلاً بھولا نامی یہ نوجوان پانچ سال پہلے ملنگ بن کر یہاں آیا تھا۔ دراصل اس کی بیوی شادی کے صرف دس ماہ بعد فوت ہو گئی تھی۔ اس کے غم میں وہ نیم دیوانہ ہو گیا اور پھر سب کچھ چھوڑ کر اس ڈیرے پر پہنچ گیا۔ یہاں اس نے ڈھائی تین سال پردے والی سرکار کی محبت میں ڈوب کر گزارے لیکن پھر ایک دن وہ بدقسمتی سے ڈیرے کے ممنوعہ علاقے کی طرف چلا گیا۔ وہاں اس نے ایک خاص مجاور کو ایسی حالت میں دیکھ لیا کہ جو اسے ہرگز نہیں دیکھنا چاہیے تھا۔ نتیجے میں بھولے کو پکڑ کر اس زندان میں ڈال دیا گیا۔

جو درمیانی عمر کی عورت دوسرے حجرے میں تاجور سے باتیں کر رہی تھی، وہ گوجرانوالہ کی رہنے والی تھی، اس کا نام فہمیدہ تھا۔ چار پانچ سال پہلے وہ جوان اور خوب صورت تھی۔ وہ اولاد حاصل کرنے کی غرض سے ملنگی ڈیرے پر آئی تھی۔ مجاور کرنالی نے دو تین ماہ میں اس سے کئی ہزار روپیا اینٹھا اور پھر ایک دن اسے روحانی عمل سے گزارتے گزارتے ’’جسمانی عمل‘‘ کی طرف لے آیا۔ بہت سی عورتیں یہ سب کچھ بھی برداشت کر جاتی ہوں گی لیکن فہمیدہ نہ کر سکی۔ اس نے کرنالی کا سر پھوڑ دیا اور نیم برہنہ حالت میں زائرین کے سامنے آنے کی کوشش کی۔ نتیجہ یہ تھا کہ اب وہ چار پانچ سال سے یہاں سڑ رہی تھی اور حالات سے سمجھوتا کر چکی تھی۔ اسی طرح یہاں موجود ہر شخص کی ایک کہانی تھی۔

مجھے لگا کہ ہم واقعی ایک خوفناک جگہ پر آن پھنسے ہیں۔ اور اب ہمارا یہاں سے نکلنا کوئی آسان کام نہیں۔ چند روز پہلے جب ہم ریشمی کا کھوج لگانے کے لیے چاند گڑھی کے خوب صورت ماحول سے نکلے تھے تو بالکل اندازہ نہیں تھا کہ آگے جا کر یہ ’’تلاش‘‘ اتنی سنگین صورتِ حال کا سبب بن جائے گی۔

تاجور اب حجرے میں موجود نہیں تھی۔ اس لیے میں نے خدا بخش سے وہ سوال کیا جو کافی دیر سے کرنا چاہ رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ’’بزرگو! آپ لنگڑا کر چل رہے ہیں۔ یہاں تقریباً سارے لوگ ہی لنگڑاتے ہیں... یہ کیا ہے؟‘‘

خدا بخش نے گہری سانس لی۔ ’’پٹھا کاٹ دیتے ہیں یہ لوگ۔‘‘

’’پٹھا؟ کیا مطلب؟‘‘

’’میں تمہیں ڈرانا نہیں چاہتا پتر! لیکن سچ یہی ہے کہ تمہارے ساتھ بھی یہ سب کچھ ہونا ہے۔‘‘

میں سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس

نے دائیں بائیں نگاہ دوڑا کر اپنا لمبا اونی چولا، بائیں پنڈلی سے اٹھایا۔ گھٹنے سے نیچے پنڈلی کے پر گوشت حصے پر ''کٹ'' کا پرانا نشان نظر آ رہا تھا۔ خدا بخش نے کہا۔ ''یہ لوگ ہرے گنے کے چھلکے سے ایک خاص طرح کا چاقو بناتے ہیں۔ اس چاقو سے ٹانگ کا ایک پٹھا کاٹ دیا جاتا ہے۔ پھر وہ شخص کبھی ٹھیک سے چل نہیں سکتا اور نہ تیزی سے بھاگ سکتا ہے۔ یہ ایک طرح سے یہاں کے قیدی کی نشانی ہوتی ہے۔''

''یہاں آنے کے کتنی دیر بعد یہ کام ہوتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''بس ہفتے دو ہفتے کے اندر۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ تمہارے ساتھ جو کڑی (لڑکی) ہے وہ بچ جائے۔ کیونکہ کسی کسی عورت کو یہ چھوڑ بھی دیتے ہیں، خاص طور سے جوان کو۔'' پھر وہ چاچا رزاق کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔ ''آپ کی ٹانگ تو پہلے ہی نقص والی ہے، آپ کو بھی کچھ نہیں کہا جائے گا۔''

خدا بخش کی بات کا مطلب یہ تھا کہ یہ سنگین عمل بس میرے ساتھ ہی ہوگا۔

بات کرتے کرتے خدا بخش رک گیا۔ اس نے دور سے پہریدار کو آتے دیکھ لیا تھا۔ اس تنومند پہریدار کا نام ہمیں بعد از اں جہاناں معلوم ہوا اور یہ پتا بھی چلا کہ وہ اس چیمبر کا انچارج ہے۔ دوسرے لفظوں میں کہا جا سکتا تھا کہ اس قید خانے کا داروغہ... اسے اس بات پر سخت غصہ تھا کہ میں نے اپنے بندھے ہاتھوں کے باوجود اس کے دو ساتھیوں پر حملہ کیا اور انہیں چوٹیں لگائیں۔ وہ جیسے بدلہ لینے کے لیے کسی موقع کی تلاش میں تھا۔

فی الوقت وہ چاچا رزاق سے بات کرنے آیا تھا۔ پتا چلا کہ چاچا کی ملاقات ان کی بیٹی ریشمی سے کرائی جا رہی ہے۔ چاچا بڑی جذباتی کیفیت میں نظر آنے لگے۔ ان کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔ جہانے نے انہیں تیار ہونے کا حکم دیا۔ جہانے کی ہدایت کے مطابق، غسل کے بعد انہوں نے زرد پٹی والا لمبا چولا پہنا اور اس کے اوپر نیلے رنگ کی گرم شال لی۔ جہانے کے کہنے پر انہوں نے اپنے لباس پر عطر وغیرہ بھی لگایا۔ کچھ دیر بعد وہ اپنی لاٹھی یعنی ہاکی کے سہارے چلتے ہوئے چیمبر سے باہر نکل گئے۔ ان کا رخ یقیناً اس پر فضا، دلکش جگہ کی طرف تھا جسے یہاں ''سایہ'' کہا جاتا تھا۔

چاچا کی واپسی میں دیر ہوئی تو ہمیں فکر لاحق ہونے لگی۔ یہاں ہم میں سے کسی کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ تاجور نے کہا۔ ''دو گھنٹے ہونے کو آئے ہیں لیکن ابھی تک وہ واپس نہیں آئے۔''

''آ جائیں گے۔ جو کچھ بھی ہے لیکن ریشمی کی یہاں بہت اہمیت ہے اور وہ ریشمی کے باپ ہیں۔ ان کے ساتھ کوئی نامناسب سلوک نہیں ہو سکتا۔''

''یہ بھی تو نامناسب ہی ہے کہ انہیں ہمارے ساتھ اس جگہ قید کیا گیا ہے۔''

''یہ تو اب کی صورت حال ہے۔ کل کیا ہونا ہے کسے پتا...''

تاجور ایک بار پھر روہانسی ہو گئی۔ ''شاہ زیب! میرے اندازے کے مطابق اباجی مجھے لینے کے لیے کوٹلی پہنچ چکے ہوں گے۔ ان پر کیا بیتے گی جب انہیں پتا چلے گا کہ میں اور نوری گھر میں موجود نہیں ہیں۔ عافیہ انہیں کیا جواب دے گی؟''

''ہو سکتا ہے کہ وہ انہیں اس ملنگی ڈیرے کے بارے میں بتائے، اور وہ ہمیں ڈھونڈتے ہوئے یہاں پہنچ جائیں۔''

تاجور کا رنگ مزید زرد ہو گیا۔ ''یہ تو اور بھی بری بات ہے۔'' وہ کراہی۔ ''یہ ملنگ انہیں بھی کسی مشکل میں ڈال سکتے ہیں۔''

''لیکن میرا خیال ہے تاجور کہ وہ اس معاملے کو اور نہیں بڑھائیں گے۔ کوئی ہمارے بارے میں پوچھنے آئے گا تو وہ ہماری موجودگی سے صاف انکار کر دیں گے اور سرخرو ہو جائیں گے۔''

تاجور کی آنکھوں کے کٹوروں میں اندیشوں کا پانی چمکنے لگا۔ میں نے تاجور کا ہاتھ تھام لیا اور اسے تسلی دینے لگا۔ اسی دوران میں چاچا رزاق واپس آتے دکھائی دیے۔ وہ ہاکی ٹیکتے ہوئے چلے آ رہے تھے۔ جہاناں اب ان کے ساتھ نہیں تھا۔ چاچا کا چہرہ بس نارمل ہی نظر آ رہا تھا۔ وہ نرم گدے پر دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ ''میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا کہ یہاں کیا ہو رہا ہے۔'' انہوں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''کسی وقت لگتا ہے کہ وہ یہاں بالکل ٹھیک ہے۔ کسی وقت لگتا ہے کہ ٹھیک نہیں ہے، بس ظاہر کر رہی ہے کہ ٹھیک ہے۔''

''ایسا کیوں کہہ رہے ہیں آپ؟'' میں نے پوچھا۔

وہ کھوئے کھوئے انداز میں بولے۔ ''میں تقریباً دو گھنٹے اس کے پاس بیٹھا ہوں۔ کھانا بھی کھایا ہے اس کے

ساتھ۔ دیکھنے میں تو وہ بہت آرام میں لگتی ہے۔ پردے والی سرکار کی اور بڑے مجاوروں کی تعریفیں بھی کی ہیں اُس نے۔ مگر اندر سے وہ بالکل بجھی ہوئی ہے۔ میری بچی ہے، میرے جگر کا ٹوٹا ہے۔ میں اس کے سارے اتار چڑھاؤ جانتا ہوں۔''

''کیا آپ کو مکمل تنہائی میں بات کرنے کا موقع نہیں ملا؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں پندرہ بیس منٹ تنہائی کے بھی ملے مگر وہ کچھ خاص نہیں بولی۔ لیکن اگر...'' وہ کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گئے۔

میں نے ان کے بولنے کا انتظار کیا پھر کہا۔ ''آپ کچھ بتانے لگے تھے چاچا۔''

وہ چند سیکنڈ تذبذب میں رہنے کے بعد بولے۔ ''مجھے یوں لگا جیسے ریشمی کے منہ پر چپیڑ (طمانچے) کا نشان ہے۔ میں پھر کہتا ہوں شاہ زیب! وہ مجھ سے بہت کچھ چھپا رہی تھی۔ میں نے جب اس سے پوچھا کہ ''پردے والی سرکار'' تم سے نکاح کرنا چاہتی ہے تو اس نے بس گول مول سی بات کی۔ بولی۔ کچھ اس طرح کی بات ہوئی تو تھی لیکن ابھی میں نے کوئی فیصلہ نہیں کیا اور آپ کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں کروں گی۔''

''اپنے خاوند پرویز کی موت کے بارے میں بھی اس نے کچھ کہا؟''

''نہیں، وہ اس بارے میں کچھ بھی سننا یا جاننا نہیں چاہتی۔ ہاں اپنی ماں اور دوسرے رشتے داروں کے بارے میں اس نے باتیں کیں اور ان کا حال احوال پوچھا۔''

''آپ نے اس سے نوری کے بارے میں دریافت کیا؟''

''ہاں... لیکن وہ کچھ نہیں جانتی۔ اسے تو یہ بھی پتا نہیں کہ بدھ کے روز جس لڑکے کو ڈیرے کے چیتوں نے مارا ہے وہ کون تھا؟ کہاں سے آیا اور کس قصور میں مارا گیا۔ ہاں وہ یہ جانتی ہے کہ ہم اس قتل کے گواہ بن گئے ہیں اور اس وجہ سے پردے والی سرکار نے ہمیں گرفتار رکھنے کا حکم دیا ہے۔ وہ تاجور کی وجہ سے بھی بہت پریشان تھی۔''

''آپ نے اس سے پوچھا کہ ہماری رہائی کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟''

''وہ اس بارے میں کچھ نہیں جانتی شاہ زیب! ہاں اس کی باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر وہ کوشش کرے تو ہمیں اس قید خانے کے اندر ہی کچھ سہولتیں مل سکتی ہیں...''

بات کرتے کرتے چاچا رزاق اچانک چونک گئے۔ ان کا ہاتھ اپنے نیلے چولے کی طویل بغلی جیب میں تھا۔ انہوں نے ہاتھ جلدی سے باہر نکالا۔ ہاتھ میں ایک تہ شدہ کاغذ تھما ہوا تھا۔ چاچا کے تاثرات سے اندازہ ہوا کہ وہ خود بھی اس کاغذ کی موجودگی سے بے خبر تھے۔

میں نے چونک کر دیکھا۔ آس پاس کوئی پہریدار موجود نہیں تھا۔ میں نے تہ شدہ کاغذ چاچا کے ہاتھ سے لے لیا۔ ''کہاں سے آیا یہ؟'' میں نے تیز سرگوشی میں پوچھا۔

''پتا نہیں۔'' وہ بوکھلائے ہوئے انداز میں بولے۔

میں نے تاجور کو اشارہ کیا، اس نے اٹھ کر حجرے کا دروازہ اچھی طرح بند کر دیا۔ لیمپ کی روشنی میں، میں نے کاغذ کی تہیں کھولیں۔ یہ دیکھ کر جسم میں سنسناہٹ محسوس ہوئی کہ یہ ایک خط تھا۔ سفید لائن دار کاغذ پر فونٹین پین سے باریک لکھائی میں لکھا گیا تھا۔ پہلی سطر پڑھتے ہی پتا چل گیا کہ یہ ریشمی کا خط اپنے اباجی یعنی چاچا رزاق کے لیے ہے۔ یہ سنسنی خیز تحریر کچھ یوں تھی۔

''اباجی! دعا کرتی ہوں کہ یہ خط حفاظت کے ساتھ آپ کے پاس پہنچ جائے اور آپ اسے پڑھ بھی لیں۔ میں آپ کو بتانا چاہتی ہوں کہ پچھلے سات آٹھ روز میں میری آنکھیں بہت اچھی طرح کھل گئی ہیں۔ میں سمجھ گئی ہوں کہ میں غلط راستے پر تھی۔ میں کرنالی صاحب اور پردے والی سرکار کو جو کچھ سمجھ رہی تھی، یہ وہ لوگ نہیں ہیں۔ ان کا اندر اب بالکل کھل کر میرے سامنے آ گیا ہے۔ جس شخص کو پردے والی سرکار کہا جاتا ہے، وہ مجھ سے نکاح کرنا چاہتا ہے اور مجھے لگتا ہے کہ اس کے لیے وہ مجھ سے زبردستی بھی کر سکتا ہے۔ مجھے یہ بھی پتا چلا ہے کہ دو لڑکیاں پہلے بھی بیوی کی طرح اس کے ساتھ رہتی ہیں... ان میں سے بھی ایک کو اس نے زبردستی بیوی بنایا ہے۔ میں آپ سے اور اپنے آپ سے بہت شرمندہ ہوں اباجی۔ میں غلط راستے پر تھی۔ میری وجہ سے آپ کو بہت دکھ پہنچے ہیں... اور اب اس سے بڑا دکھ اور کیا ہوگا کہ مجھے ڈھونڈتے ڈھونڈتے تاجور اور آپ ان ڈھونگیوں کے پاس آ پھنسے ہیں۔

''تاجور نے چند دن پہلے مجھے بتایا ہے کہ آپ کے ساتھ شاہ زیب نام کے کوئی بھائی صاحب ہیں۔ وہ ان پر بہت بھروسا کرتی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ وہ ہر قسم کے حالات میں ہماری مدد کر سکتے ہیں۔ اللہ کرے وہ میری اور آپ سب کی مدد کر سکیں۔ میں سمجھ گئی ہوں یہ بڑے خطرناک

لوگ ہیں۔ اپنی بات نہ ماننے والوں کے ساتھ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ میں یہاں سکون کے لیے آئی تھی اور مجھے سکون ملا بھی۔ لیکن اب اصل باتوں کا پتا چلا ہے تو یہاں میرا دم گھٹنے لگا ہے۔ کسی وقت مجھے لگتا ہے کہ میری سانس بند ہو جائے گی اور میں مر جاؤں گی۔ اگر... مجھے کچھ ہو گیا تو ابا جی... آپ میرے گناہ معاف کر دیں۔ میں نے امی کو بھی بہت دکھ دیے ہیں۔ آپ ان سے بھی کہنا کہ مجھے معافی دے دیں۔
فقط آپ کی بدنصیب بیٹی۔''

میں نے ریشمی کی یہ تحریر پہلے خود پڑھی، پھر دھیمی آواز میں چاچا رزاق اور تاجور کو بھی سنا دی۔

چاچا رزاق کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ خاص طور سے ان آخری فقروں نے چاچا کو بہت متاثر کیا جن میں اس نے اپنی موت کی صورت میں ان سے معافی مانگی تھی۔ چاچا ہچکیوں سے رونے لگے۔ بولے۔ ''تم کیوں معافی مانگتی ہو میری بچی، معافی تو ہمیں تجھ سے مانگنی چاہیے۔ ہم نے اپنی من مرضی کی۔ تیرے نہ چاہتے ہوئے بھی تیری شادی اس ظالم بچے سے کر دی۔ تجھے اپنے ہاتھوں سے دوزخ میں ڈال دیا۔ کاش ہم سے ایسا نہ ہوا ہوتا...''

چاچا رزاق نے گھٹنوں میں منہ چھپا لیا اور ہچکیاں روکنے کی کوشش کرنے لگے۔ تاجور اور میں انہیں دلاسا دینے لگے۔

وہ روتے روتے بولے۔ ''میں تم سے کہتا تھا نا کہ وہ بہت کچھ چھپا رہی ہے۔ وہ ہمیشہ سے ایسی ہی تھی۔ اس خیال سے کہ ہمیں دکھ نہ پہنچے اپنی بڑی سے بڑی تکلیف پر پردہ ڈال لیتی تھی۔ بچپن میں اپنا بخار تک ہم سے چھپاتی تھی۔ بڑی ہو گئی اور شادی ہو گئی تو شوہر کی ماریں کھاتی رہی لیکن ہمیں کچھ نہ بتایا۔ اس خبیث نے ٹھڈے مار مار کر اس کا بچہ ضائع کر دیا لیکن ہم سے کہا کہ سیڑھیوں سے گر گئی ہوں۔ کیا کیا بتاؤں اس کی باتیں۔ ابھی... ابھی میں نے کہا تھا نا کہ اس کے منہ پر چھری کا نشان ہے۔ میں نے کہا تھا نا تمہیں۔''
چاچا کی آواز بیٹھ گئی اور وہ پھر سسکنے لگے۔

میں پیشاب کے بہانے غسل خانوں کی طرف چلا گیا اور وہاں ریشمی کا خط ضائع کر کے پانی میں بہا دیا۔ واپس آیا تو چاچا گدے پر نیم دراز تھے اور تاجور ان کا اکلوتا پاؤں دبا رہی تھی۔ چاچا کا جھریوں بھرا چہرہ دکھ کی تصویر بنا ہوا تھا۔

رات کو ایک دم لڑائی جھگڑے کی آوازیں آنے لگیں۔ دو افراد آپس میں مار پیٹ کر رہے تھے۔ پھر دو مزید افراد ان میں شامل ہو گئے۔ چیمبر یعنی جنگلارے کا دروازہ کھلا اور پانچ چھ مسلح پہریدار اندر داخل ہو گئے۔ انہوں نے رائفلوں کے کندے اور لاٹھیاں مار مار کر لڑنے والوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ کیا اور حجروں میں بند کر کے باہر سے تالے لگا دیے۔ لڑنے والوں میں ایک اٹھارہ انیس سال کا دبلا پتلا لڑکا بھی شامل تھا۔ اس کا گریبان پھٹ گیا تھا اور ہونٹوں سے مسلسل خون بہہ رہا تھا۔

اندازہ ہوتا تھا کہ اس طرح کے لڑائی جھگڑے یہاں ہوتے رہتے ہیں۔ اگر جھگڑا شدید نوعیت کا ہو تو لڑنے والوں کو سزا بھی دی جاتی ہے۔

اگلے روز دوپہر کے وقت انیق سے ہماری ملاقات پھر ہو گئی۔ وہ اپنے حلیے سے یہاں کا سکہ بند ملنگ لگ رہا تھا۔ سر پر چوگوشا ٹوپی، لمبا نیلا چولا جو فرش پر گھسٹ رہا تھا۔ گلے میں دو تین رنگوں کی مالائیں۔ آج کلائیوں میں کڑوں کا اضافہ بھی نظر آ رہا تھا۔ یہ لکڑی کے کڑے تھے۔ اس کی آنکھیں سوجی سوجی تھیں۔ شاید دیگر ملنگوں کی طرح اس نے بھی بھنگ پی تھی۔ وہ سیدھا ہمارے پاس آیا۔ آج پہریدار بھی ساتھ نہیں تھا۔ لہٰذا ہم نظر بچا کر سرگوشیوں میں بات کر سکتے تھے۔

انیق نے کہا۔ ''میں کوشش کر رہا ہوں کہ یہاں آپ کو کوئی تکلیف نہ پہنچے۔ آپ کے لیے ایک اچھی خبر ہے اور ایک بُری۔ اچھی یہ کہ ان لوگوں نے تاجور بہن کو آراسی سے چھوٹ دے دی ہے۔''

''آراسی؟ یہ کیا چیز ہے؟''

''یہی ٹانگ کا پٹھا کاٹنے والا عمل۔ اسے یہاں آراسی کہتے ہیں۔''

''اور بُری خبر؟''

''وہ آپ کو چھوٹ نہیں دے رہے۔ مگر میں کوشش کر رہا ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ کامیابی ہو جائے۔ میں نے ان کو یہ رائے بھی دی ہے کہ آپ کو یہاں جنگلارے کا اندرونی نگراں مقرر کر دیا جائے۔''

''اندرونی نگراں؟ کیا مطلب؟''

''جس طرح جیلوں میں مقدم وغیرہ ہوتے ہیں، یہ قیدیوں کے اندر سے ہی ایسے سینئر قیدی ہوتے ہیں جو ساتھیوں کو کنٹرول کرتے ہیں۔ آپ نے مار کٹائی میں اپنی صلاحیت تو ثابت کر ہی دی ہے۔ اگر آپ کو آراسی سے چھوٹ دے دی جائے تو آپ سے مقدم والا کام لیا جا سکتا ہے۔''

''تو کیا کہتے ہیں یہ لوگ؟''

''کرنالی صاحب میری بات دھیان سے سنتے ہیں۔ شاید وہ مان جائیں۔''

میں نے کہا۔ ''تم نے ایک دو بار پہلے بھی کرنالی کا ذکر کیا ہے۔ لگتا ہے تم نے اسے شیشے میں اتار لیا ہے۔''

''بس یہی سمجھ لیں۔ ایک پرانے واقعے کی وجہ سے کچھ آسانی ہوگئی ہے مجھے۔''

''پرانا واقعہ؟'' چاچا رزاق نے پوچھا۔

چاچا کی آواز ذرا بلند تھی اس لیے ہم چونک گئے۔ دائیں بائیں دیکھا۔ کچھ دور وہی نوعمر لڑکا بیٹھا تھا جس نے رات کو جھگڑا کیا تھا۔ وہ اپنی چوٹوں کو چشمے کے پانی سے دھو رہا تھا۔ اس کی توجہ ہماری طرف نہیں تھی۔ میں نے چاچا کو اشارے سے سمجھایا کہ وہ دھیمے لہجے میں بولیں۔

''تم کس واقعے کی بات کر رہے ہو؟'' میں نے انیق سے پوچھا۔

''بس ایک زبردست اتفاق ہوا ہے جس کی وجہ سے مجھے یہاں جگہ بنانے میں مدد ملی ہے... یہ کوئی دو سال پہلے کی بات ہے۔ لاہور میں یہ مجاور کرنالی ایک دورے پر آیا تھا۔ قریباً دو مہینے اس نے لاہور کے ایک مزار پر ڈیرے ڈالے تھے۔ بہت سے لوگوں نے اس سے جھاڑ پھونک اور علاج معالجہ کروایا تھا۔ داؤد بھاؤ کی ایک ادھیڑ عمر ملازمہ تھی۔ اس کے سر میں رسولی تھی۔ ہر وقت تکلیف سے تڑپتی رہتی تھی۔ ڈاکٹر بے بس تھے۔ انہوں نے ایک طرح سے جواب دے دیا تھا۔ مجھے کسی نے کرنالی کا بتایا۔ میں حمیدہ کو اس کے پاس لے گیا۔ ہاں... حمیدہ نام تھا اس کا۔ کرنالی نے اس کے ماتھے پر ایک تعویذ باندھا اور کوئی پاؤڈر سا پانی میں گھول کر پینے کو دیا۔ حیرت انگیز طور پر حمیدہ کا درد ٹھیک ہوگیا۔ وہ ہنسنے بولنے لگی۔ وہ اتنا خوش ہوئی کہ کرنالی کی تقریباً مریدنی بن گئی۔ اس نے چار پانچ تولے زیور بھی کرنالی کو دیا تھا۔ جب تک کرنالی لاہور میں رہا وہ ہر تیسرے چوتھے روز اسے سلام کرنے جاتی رہی۔ میں ہی اسے لے کر جاتا تھا۔''

''اب کہاں ہے حمیدہ؟''

''جہاں اسے ہونا چاہیے تھا... قبر میں۔''

''یعنی مرگئی؟''

''بالکل... اسے عارضی افاقہ ہوا تھا۔ کرنالی کے لاہور سے جانے کے کوئی دو ہفتے بعد ہی اس کی رسولی پھٹ گئی اور وہ اللہ کو پیاری ہوگئی۔''

''تو اس کو آرام کیسے آیا تھا؟''

''ڈاکٹروں کا یہی خیال تھا کہ اسے کوئی نشہ آور چیز دی جاتی رہی ہے جس کی وجہ سے اس نے اپنے آخری ڈیڑھ دو مہینے سکون سے گزار لیے، مگر رسولی جو شاید کچھ مہینے اور نہ پھٹتی، جلدی پھٹ گئی۔''

''تو اس بات سے فائدہ کیسے اٹھایا تم نے؟'' چاچا رزاق نے سرگوشی میں وضاحت چاہی۔

''جب پانچ دن پہلے ان لوگوں نے مجھے پکڑا تو سیدھا کرنالی کے پاس ہی لے کر گئے۔ میں نے کرنالی کو قریب سے دیکھا تو پہچان لیا اور کسی حد تک اس نے بھی پہچان لیا۔ میں اس کے پاؤں میں گر گیا اور اس کے منحوس ہاتھوں کو بار بار چوما اور ماتھے سے لگایا۔ میں نے کہا۔ ''مجھے کچھ پتا نہیں تھا کہ یہاں میری ملاقات آپ سے ہونے والی ہے۔ اگر پتا ہوتا تو میں سر کے بل چل کر آپ کے پاس آتا۔ میں نے اسے یہ بھی بتایا کہ حمیدہ چنگی بھلی ہے اور دن رات آپ کو دعائیں دیتی ہے۔''

انیق کی بات اب کافی حد تک میری سمجھ میں آرہی تھی۔ میں بھی حیران تھا کہ انیق نے یہاں آتے ہی اتنی جلدی اپنی جگہ کیسے بنالی اور کس طرح ان لوگوں کا اعتماد حاصل کیا۔ یہ سب کچھ اس دو سال شناسائی کا نتیجہ تھا۔ انیق نے اس شناسائی کو بروقت اور ہوشیاری سے استعمال کیا تھا۔

وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔ ''اب میں کرنالی کا بے دام کا غلام ہوں اور اس کے ایک اشارے پر اپنی جان بھی قربان کرسکتا ہوں۔''

میں نے پوچھا۔ ''یہاں تمہاری حیثیت کیا ہے۔ میرا مطلب ہے کہ پابند ہو یا ڈیرے سے باہر جانے کی آزادی ہے؟''

''ابھی ڈیرا چھوڑنے کی آزادی تو نہیں ہے لیکن ڈیرے کے اس حصے میں ہر جگہ گھوم سکتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ جلد ہی اوپر مزار پر جانے کی اجازت بھی مل جائے گی اور پھر ہوسکتا ہے کہ کرنالی کی تسلی ہوجائے تو میں ڈیرے سے باہر بھی جاسکوں۔''

میں نے سرگوشیوں میں بات کرتے ہوئے انیق کو اس خط کے بارے میں بتایا جو ریشمی نے اپنے والد کی جیب میں ڈالا تھا۔ خط کے مندرجات سن کر انیق بھی حیران ہوا۔ اس نے کہا۔ ''میرا اپنا بھی یہی خیال تھا کہ ریشمی کے رویے میں جلد ہی تبدیلی آنے والی ہے۔ جہاں تک مجھے پتا چلا ہے، پردے والی سرکار چاہتی ہے کہ ریشمی کو جلد از جلد

ڈیرے پر رہنے کا پابند کرلیا جائے اور اس کا طریقہ یہی ہے کہ اسے ازدواجی بندھن میں باندھا جائے جبکہ ریشمی اس کے لیے بالکل تیار نہیں۔ اس نے تو شاید ایک مرتبہ یہ بھی کہا تھا کہ پردے والی سرکار اس کے باپ کی طرح ہیں۔''

اسی دوران میں ہماری طویل گفتگو اختتام پذیر ہوگئی کیونکہ پہریدار جہاناں ٹہلتا ہوا ہماری جانب آرہا تھا۔ انیق نے تیز سرگوشی میں کہا۔ ''اب میں شاید تین چار دن یہاں نہ آسکوں لیکن آپ فکر نہ کرنا۔ میں آپ کی طرف سے پوری طرح باخبر رہوں گا۔''

جہاناں خشمگیں نظروں سے انیق کو دیکھ رہا تھا۔ انیق ہمیں خدا حافظ کہہ کر واپس چلا گیا۔

اس نے تین چار دن بعد آنے کا کہا تھا مگر اگلے ہی روز وہ پھر جنگلارے میں آگیا۔ چاچا اس وقت کمبل اوڑھے سو رہے تھے اور تاجور سامنے تالاب پر منہ ہاتھ دھو رہی تھی۔ میں نے دور ہی سے دیکھ لیا، انیق کے چہرے پر پریشانی کے آثار تھے۔ اس نے آتے ہی اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی اور بغیر سلام دعا کے بولا۔ ''میری ایک چھوٹی مالا نہیں مل رہی۔ کہیں وہ کل اِدھر تو نہیں گری؟''

میں نے کہا۔ ''اگر گری ہوتی تو یہیں پر ہوتی...''

اس نے ایک بار پھر دائیں بائیں دیکھ کر اچانک اپنا لہجہ بدلا اور گمبھیر آواز میں سرگوشی کی۔ ''سوری شاہ زیب بھائی! میں ان لوگوں کو رضامند نہیں کرسکا۔ وہ آر اسی کرنا چاہتے ہیں۔''

''کیا مطلب؟''

''وہی ٹانگ کا پٹھا کاٹنے والا معاملہ۔ آج رات کسی وقت وہ آئیں گے اور آپ کو جنگلارے سے باہر لے جائیں گے۔ پٹھا کاٹنے اور مرہم پٹی وغیرہ کرنے کے بعد آپ کو یہاں واپس پہنچا دیا جائے گا۔ رات کا جو کھانا آپ کو دیا جائے گا اس میں نشہ آور دوا ہوگی۔ آپ نیم بے ہوشی کی حالت میں چلے جائیں گے۔ اسی حالت میں آپ کو یہاں سے لے جائیں گے۔''

میں سناٹے میں رہ گیا۔ انیق نے کچھ مزید تفصیل بتائی۔

میں نے پوچھا۔ ''سارے کھانے میں نشہ آور چیز ہوگی۔''

''جی ہاں۔'' انیق نے جلدی سے جواب دیا۔ ''بہتر ہے کہ آپ یہ کھانا نہ کھائیں۔ چاچا اور تاجور کو کھانے دیں۔''

شاید وہ کچھ اور بھی کہتا لیکن اسی دوران میں جہاناں ہمارے سر پر آن کھڑا ہوا۔ ''مالا ملی یا نہیں؟'' اس نے کرخت لہجے میں پوچھا۔

انیق نے نفی میں جواب دیا۔ وہ مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ ''اس کی تلاشی لو۔ اس کی آنکھ میں سؤر کا بال نظر آتا ہے مجھے۔''

''نہیں جہانے، ان کے پاس نہیں ہے۔'' انیق نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ جہانے کے ساتھ چلتا جنگلارے سے باہر جاچکا تھا۔

میرے ذہن میں آندھی سی چلنا شروع ہوگئی تھی۔ انیق جو کچھ بتا گیا تھا، وہ کافی تشویش ناک تھا۔ وہ مالا کے بہانے یہاں آیا تھا اور بات کی تھی، ممکن تھا کہ وہ کچھ اور بھی کہتا مگر جہانے کے آنے کے سبب اسے جانا پڑا۔

تاجور منہ ہاتھ دھو کر واپس آچکی تھی۔ اس نے کھوجی نظروں سے میری جانب دیکھا۔ ''کیا بات ہے شاہ زیب... یہ انیق کچھ گھبرایا ہوا نظر آرہا تھا؟''

''کچھ نہیں، اس کے گلے کی ایک مالا کہیں گرگئی ہے۔ اسے ڈھونڈتا پھر رہا ہے۔'' میں نے بات بنائی۔

''آپ کچھ چھپا تو نہیں رہے؟''

میں نے زبردستی مسکراتے ہوئے کہا۔ ''تم سے بس ایک ہی چیز چھپائی تھی اور اس کا بھی تمہیں پتا چل گیا ہے۔'' میں نے شہادت کی دونوں انگلیوں اور انگوٹھوں کو جوڑ کر دل کا نشان بنایا اور اسے دکھایا۔

تاجور نے چونک کر چاچا رزاق کی طرف دیکھا، ان کی آنکھیں بند تھیں۔ ''خدا کا خوف کریں۔'' وہ تیز سرگوشی میں بولی۔

''خدا کا خوف ہی تو کررہا ہوں۔ ورنہ تم سے اتنا قریب رہتے ہوئے اتنا دور رہنا کتنا مشکل ہے، یہ کچھ میں ہی جانتا ہوں۔''

''مجھے لگتا ہے کہ آپ بات ٹالنے کی کوشش کررہے ہیں۔''

چاچا رزاق ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ ''کون، کس کو مارنے کی کوشش کررہا ہے؟'' چاچا کے چہرے پر ہراس ہی ہراس تھا۔

میں نے چاچا کے پاس جاکر انہیں تسلی دی۔ ''نہیں چاچا! ہم کوئی اور بات کررہے تھے۔ آپ پریشان نہ ہوں۔''

''ریشمی... کا کچھ پتا چلا؟'' وہ روہانسی آواز میں

بولے۔

''وہ بالکل خیریت سے ہے۔ ابھی انیق آیا تھا۔ اس نے بتایا ہے۔'' میں ان سے تسلی تشفی کی باتوں میں مصروف ہو گیا لیکن دل و دماغ میں جو کچھ چل رہا تھا، وہ کچھ مجھے ہی پتا تھا۔

رات کا کھانا، آلو گوشت اور تڑکے والے چاولوں پر مشتمل تھا۔ میں جان چکا تھا کہ اس میں کوئی ایسی ''ٹرینکو لائزر'' ملا دی گئی ہے جس کی وجہ سے ہم کچھ دیر کے لیے انٹا غفیل ہو جائیں گے۔ پروگرام کے مطابق میں نے معدے میں درد کا بہانہ بنایا اور صرف ایک دو لقمے چاولوں کے لیے۔ چاچا اور تاجور نے حسبِ معمول کھانا کھا لیا۔ آدھ پون گھنٹے تک تو وہ ٹھیک رہے اور مجھے شبہ ہونے لگا کہ شاید انیق کی معلومات پوری طرح درست نہیں ہیں لیکن پھر معلومات درست ہونے کے آثار پیدا ہو گئے۔ تاجور دیوار سے ٹیک لگائے لگائے سو گئی۔ چاچا رزاق جو سہ پہر کو بھی کافی دیر سوئے تھے پھر زوردار جماہیاں لینے لگے۔ وہ جیسے کمر سیدھی کرنے کے لیے پہلو کے بل لیٹے اور چند سیکنڈ کے اندر ان کے خراٹے پورے حجرے میں گونجنے لگے۔ یہ سب کچھ معمول کے مطابق نہیں تھا۔

میں نے اٹھ کر تاجور کے کندھے تھامے اور اسے بڑی آہستگی کے ساتھ گدے پر لٹا کر اس پر کمبل ڈال دیا۔ اس دوران میں وہ ذرا سا کسمسائی لیکن آنکھیں نہیں کھولیں۔ کھانے میں موجود نشہ اپنا اثر دکھا چکا تھا۔ میں اپنے حجرے میں پہنچا اور گدے پر پڑ کر بے سدھ ہو گیا۔ یہ ''بے سدھ ہونا'' دکھاوے کا تھا۔ میں اپنے اردگرد سے پوری طرح باخبر تھا۔ رات کے قریباً دس بجے ہوں گے جب مجھے اپنے حجرے کے باہر قدموں کی چاپ سنائی دی۔ یہ ایک سے زیادہ افراد تھے پھر کسی نے مجھے ہلا جلا کر دیکھا۔ جہانے کی بھاری آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ ''ہاں ٹھیک ہے، اٹھا لو۔''

چند افراد نے اپنے مضبوط ہاتھوں سے مجھے اٹھایا اور کسی اسٹریچر نما چیز پر ڈال دیا۔ اسٹریچر کو اٹھا کر حجرے سے باہر نکالا گیا اور پھر جنگلارے کے چھوٹے دروازے سے گزر کر ہم ایک پتھریلی راہداری میں آ گئے۔ میں سیدھا لیٹا تھا اور آنکھوں کی باریک جھری میں سے راہداری کی چھت کو دیکھ رہا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ مجھے اسٹریچر پر لے جانے والے افراد کی تعداد چار ہے۔ جہانا بھی ان میں شامل تھا۔ مجھے ٹھیک سے معلوم نہیں تھا کہ مجھے ابھی مزاحمت کرنی چاہیے یا نہیں۔ بہرحال مزاحمت کا فیصلہ تو میں کر چکا تھا۔ اسی دوران میں ہم ایک اور دروازے سے گزرے اور پھر ایک تپلی سی راہداری سے گزر کر ایک ہال نما کمرے میں آ گئے۔ اس جگہ کی چھت نسبتاً اونچی تھی یعنی آٹھ نو فٹ کے قریب۔ یہاں آتے ہی میرے نتھنوں میں دواؤں کی بو گھسی۔ اور یہ دیسی دواؤں کی نہیں، ایلوپیتھک دواؤں کی بو تھی۔ اسپرٹ، آیوڈین اور وکس وغیرہ۔ جہاں جہاں سے گزر کر ہم آئے تھے، وہاں لالٹینیں یا گیس لیمپس تھے، مگر یہاں برقی روشنی موجود تھی۔

''کتنی دیر میں فارغ ہو جائے گا؟'' جہانے کی پاٹ دار آواز میرے کانوں میں پڑی۔

''دو گھنٹے تک لے جانا۔'' ایک نسوانی آواز نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے جی۔ لیکن ذرا احتیاط رکھنا۔ خطرناک بندہ ہے۔ ہاتھ پاؤں بہت چلاتا ہے۔''

اس کے بعد قدموں کی چاپ سے اندازہ ہوا کہ مجھے یہاں لے کر آنے والے چاروں افراد باہر جا چکے ہیں۔ اب میرے اردگرد دو افراد متحرک تھے۔ ان میں سے ایک تو ورزشی جسم والا ایک نوجوان تھا۔ دوسری کوئی لڑکی تھی۔ مگر مجھے ابھی تک اس کی شکل نظر نہیں آئی تھی۔ ہاں مالاؤں کی کھڑکھڑاہٹ اور کڑوں کی کھن کھن سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کوئی ملنگنی ہی ہے۔ لیکن ایک ملنگنی کا ڈاکٹری دواؤں کے درمیان کیا کام تھا؟

کچھ دیر بعد نوجوان نے اپنا رخ میری طرف پھیرا تو میں آنکھوں کی درزوں میں سے اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ گھنے بالوں اور ستواں ناک والا ایک دلکش نوجوان تھا۔ رنگ سرخ و سپید، شانے چوڑے، وہ کسی یونانی مجسمے کی طرح جاذبِ نظر تھا۔ میرے اندازے کے مطابق وہ گجرات جہلم کی سائڈ کا رہنے والا تھا۔ میں نے دیکھا تھا اور انیق نے بھی مجھے بتایا تھا کہ اس علاقے کے لوگ ایسی شکل و صورت کے مالک ہوتے ہیں۔ (بہرحال بعد میں وہ کراچی کا رہنے والا نکلا)

اسی دوران میں ملنگنی کی جھلک بھی مجھے دکھائی دی۔ اس نے چولا پہن رکھا تھا، گلے میں مالائیں اور ہاتھوں میں سفید دستانے دکھائی دے رہے تھے۔

''رضوان! باندھو اس کو۔'' ملنگنی نے کہا اور اس کے لب و لہجے نے مجھے یقین دلایا کہ وہ پڑھی لکھی ہے۔

اس کی عمر تیس سال کے لگ بھگ تھی۔ ماتھا چوڑا،

کندھے فربہ اور شکل وصورت درمیانی تھی۔ اس کے چہرے پر مجھے چڑچڑاپن دکھائی دیا۔ اس کی ہدایت کے مطابق رضوان نامی وہ خوبرو نوجوان میرے پاؤں کی طرف گیا اور اس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ اس اسٹریچر کے ساتھ ایسی چرمی پٹیاں بھی لگی ہوئی ہیں جن کے ذریعے اسٹریچر پر لیٹے ہوئے شخص کے ہاتھ پاؤں باندھے جاسکتے ہیں۔ نوجوان نے پہلے میرے دائیں پاؤں کو اسٹریپ میں کسنا چاہا۔ اگر میں اب بھی حرکت نہ کرتا تو یہ بڑی بے وقوفی ہوتی۔ میں آنکھوں کی درز سے اس جگہ کا حدود اربع کسی حد تک دیکھ چکا تھا۔ دائیں طرف دروازہ تھا جو بند تھا۔ چوڑے ماتھے والی ملنگنی کھڑکی کے قریب کھڑی تھی۔ کھڑکی بھی بند تھی۔ اس ہال نما کمرے میں کوئی اور متنفس دکھائی نہیں دیتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب میں نے سیدھے لیٹے لیٹے اپنا سر اٹھایا اور اپنی بائیں ایڑی گھما کر خوبرو رضوان کی کنپٹی پر رسید کی تو وہ اپنی جگہ سے حرکت بھی نہیں کر سکا۔ ضرب اتنی کاری اور ٹو دی پوائنٹ تھی کہ وہ کٹے ہوئے شہتیر کی طرح قریبی صوفے پر گرا اور وہاں سے لڑھک کر فرش پر آگیا۔

ملنگنی... یا جو کوئی بھی وہ تھی چند لمحے کے لیے سکتہ زدہ رہ گئی اور یہ چند لمحے میرے لیے کافی سے زیادہ تھے۔ میں نے جھپٹ کر اسے اپنی گرفت میں لے لیا۔ اس سے پہلے کہ وہ پورا منہ کھول کر چلاتی میں اس کی گردن کے ایسے حصے پر دباؤ ڈال چکا تھا کہ وہ منہ پورا کھلا ہونے کے باوجود آواز نہیں نکال سکی اور بس ایک لمبی آہ لے کر رہ گئی۔ ”تمہارا منہ کھلا ہے۔ چلاؤ اگر چلا سکتی ہو تو۔“ میں نے بڑے اطمینان سے کہا۔

”وہ بس میری گرفت میں مچل کر رہ گئی۔ میری نگاہیں فرش پر لڑھکے ہوئے نوجوان پر تھیں۔ وہ بے سدھ ہو چکا تھا۔ میرے تجربے نے مجھے بتایا کہ وہ پانچ سے دس منٹ کے درمیانی وقفے میں ہوش میں آجائے گا۔

ملنگنی نے اپنا منہ بند کر لیا تھا۔ میں نے بھی اس کے گلے کی رگ پر دباؤ ختم کر کے ہتھیلی سے اس کا منہ ڈھانپ لیا۔ اس نے ایک بار پھر پورا زور مارا۔ اس کی چلائی ہوئی ٹانگ سے دواؤں کی کچھ بوتلیں فرش پر گر کر ٹوٹ گئیں اور کیمیکلز کی بو مزید بڑھ گئی۔

میں نے اسے اٹھا کر اوندھے منہ صوفے پر پٹخ دیا اور اپنا وزن اس پر ڈال دیا۔ وہ میرے نیچے مچھلی کی طرح تڑپ رہی تھی۔ اس کے چھریرے جسم میں کافی زور تھا۔ مجبوراً مجھے اس کی کنپٹی پر بھی ایک جچی تلی ضرب لگا کر اسے نڈھال کرنا پڑا۔ اس نے نیم بے ہوشی کی سی کیفیت میں ہاتھ پاؤں پھینک دیے اور کراہنے لگی۔ وہ نوجوان کی طرح مکمل طور پر اتنا غافل نہیں ہوئی تھی۔ مجھے ہر گھڑی دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کوئی یہاں پہنچ نہ جائے۔ میں نے سب سے پہلے کپڑے کی ڈیڑھ انچ چوڑی میڈیکل ٹیپ کے ذریعے لڑکی کے ہاتھ مضبوطی سے اس کی پشت پر باندھے، اور اس کے ساتھ ہی اس کے منہ میں ایک کپڑا ٹھونس کر اوپر سے ٹیپ کے دو تین چکر دے دیے۔

پاتھا پائی میں اس کا نیلا اونی چولا اوپر کمر تک چڑھ گیا تھا اور ٹانگیں عریاں نظر آرہی تھیں۔ میں نے بمشکل کھینچ تان کر چولا نیچے اس کے ٹخنوں تک کیا اور پھر اس کے پاؤں بھی عارضی طور پر میڈیکل ٹیپ سے ہی جکڑ دیے۔

نیچے فرش پر پڑے خوبرو نوجوان نے بھی اب کسمانا شروع کر دیا تھا۔ ”پپ... پانی۔“ اس نے کراہ کر کہا۔

میں نے ایک گلاس میں اسے پانی پلایا۔ دیوار سے ٹیک لگا کر اس نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ سفید پتلون اور سرخ جرسی میں تھا۔ پتلون اتنی ٹائٹ تھی کہ اس کی ٹانگوں کا حصہ محسوس ہوتی تھی۔ باریک کپڑے کی ایسی ٹائٹ پتلونیں وہ لڑکے پہنتے ہیں جو راہ چلتی لڑکیوں کو ریجھانے کی خواہش رکھتے ہیں اور عام طور پر زبردست قسم کے فلرٹ ہوتے ہیں۔

بہرحال یہ لڑکا مجھے اپنی ساتھی ملنگنی سے کہیں کم خطرناک دکھائی دیا۔ اب میرے ہاتھ میں ایک تیز دھار نشتر نظر آرہا تھا اور وہ اس نشتر سے خاصا ڈرا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ اس کی گہری سیاہ آنکھوں میں ایک طرح کی حیرت بھی منجمد تھی۔ یقیناً یہ حیرت ایک سوال کی وجہ سے تھی اور سوال یہی تھا کہ میں جنگلارے میں ڈنر تناول فرمانے کے بعد بے ہوش ہو چکا تھا، پھر آناً فاناً اتنی پھرتی سے اٹھ کر کیسے بیٹھ گیا؟

تب اس کی نظر کسمساتی اور منہ سے غوں غوں کی آواز نکالتی ہوئی ملنگنی پر پڑی اور وہ مزید خوف زدہ دکھائی دینے لگا۔ ”تم... تم کون ہو؟“ وہ بولا تو اس کی آواز میں لرزش واضح تھی۔

”بڑا بے وقوفی والا سوال کیا ہے تم نے۔ میری ٹانگ کی رگیں کاٹ کر مجھے لنگڑا بنانے جارہے تھے اور یہ جانے بغیر ہی کہ میں کون ہوں... کس باغ کی مولی ہوں؟“

”تم اپنے لیے اچھا نہیں کر رہے۔ بہت سخت سزا ملنے والی ہے تمہیں۔“ وہ بولا۔

”تمہیں تو دھمکی دینی بھی نہیں آتی۔ تمہارے جیسے

لڑکے... کالجوں میں لڑکیوں کے پیچھے بھاگتے اور فلموں، ڈراموں کی نقل کرتے ہی اچھے لگتے ہیں۔''

وہ ہونٹ بھینچ کر رہ گیا۔ اس کے ہونٹ بہت سرخ اور پیشانی چمکیلی تھی۔ کسی رومانی فلم کا ہیرو دکھائی دیتا تھا لیکن کوئی دم خم نہیں تھا اس میں، اس کی ایک جھلک دیکھ کر ہی میں جان گیا تھا کہ یہ لڑائی بھڑائی والا بندہ نہیں ہے۔ میں نے تیز نشتر اس کی ٹھوڑی کے نیچے شہ رگ کے قریب رکھا اور خطرناک لہجے میں کہا۔ ''کوئی چالاکی دکھاؤ گے یا کسی کو پکارنے کی کوشش کرو گے تو سانس کی نالی کاٹ دوں گا۔ جب میں سانس کی نالی کاٹتا ہوں تو عام طور پر غلطی سے خوراک کی نالی بھی کٹ جاتی ہے۔ یعنی سانس ختم اور دانہ پانی بھی ختم۔ اگر یقین نہیں تو کسی کو آواز دینے کی کوشش کرو۔'' میں نے تیز نشتر کا دباؤ اس کی گردن پر بڑھاتے ہوئے کہا۔ اس کا رنگ برف کی طرح سفید ہو گیا۔

میں نے کہا۔ ''ایسے دیتے ہیں دھمکی۔''

ملنگنی کے حلیے والی اب اپنے حواس میں آچکی تھی۔ میں نے دیکھا کہ رضوان کی گردن پر نشتر دیکھ کر وہ بے طرح مچلی ہے۔ اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر بس غوں غوں کی آواز نکال کر رہ گئی۔

میں اب تک اچھی طرح اندازہ لگا چکا تھا کہ ملنگنی کے روپ میں نظر آنے والی یہ جواں سال خاتون کوئی کوالیفائڈ ڈاکٹر ہے۔ کچھ دیر بعد اس کی تصدیق بھی ہو گئی۔ میرے ایک سوال کے جواب میں رضوان نے اعتراف کیا کہ یہ ایک ڈاکٹر ہیں اور گائناکالوجسٹ بھی۔

میں نے کہا۔ ''اب لگے ہاتھ یہ بھی بتا دو کہ یہ اچھی بھلی گائناکالوجسٹ یہاں اس ملنگی ڈیرے پر دھونی رچا کر کیوں بیٹھی ہوئی ہے؟ کہیں شہر میں کوئی جرم وغیرہ کر کے تو بھاگی ہوئی نہیں ہے؟ میرا مطلب ہے بھگوڑن؟''

''ایسی کوئی بات نہیں۔ یہ اپنی مرضی اور خوشی سے یہاں رہ رہی ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''کسی بندے کی ٹانگ تو یہاں کبھی کبھار ہی کٹتی ہو گی اس کے علاوہ کیا کاٹتی ہیں یہ؟''

''در... دراصل... بڑے مجاوروں نے انہیں اپنے... علاج وغیرہ کے لیے رکھا ہوا ہے۔'' رضوان کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

''بہت خوب... بلکہ بہت ہی خوب... زبردست... لوگوں کا علاج تو یہاں تعویز گنڈے اور رنگ برنگی نیلی پیلی لال پڑیوں اور چولہے کی راکھ وغیرہ سے ہوتا ہے مگر ذاتی علاج کے لیے ان مست ملنگوں نے ڈاکٹر رکھی ہوئی ہے۔''

''کبھی کبھار ان سے...'' وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

مجھے پتا چل رہا تھا کہ وہ کافی کچھ چھپا رہا ہے۔ میں اس کو اپنی نگاہ میں رکھے ہوئے سامنے ایک طویل میز کی طرف چلا گیا۔ یہاں بہت سے کاغذات اور نسخے وغیرہ رکھے تھے۔ میں نے دیکھا سفید رنگ کی بے شمار چھوٹی چھوٹی پرچیاں ایک بڑے ڈسٹ بن میں پڑی ہیں۔ میں نے چند پرچیوں کو اٹھا کر دیکھا، مجھے یاد آیا، اوپر مزار پر جب چار بڑے مجاور مریضوں سے ملتے تھے تو ان کے نام ایسی ہی پرچیوں پر لکھتے تھے۔ پھر بیماری اور تکلیف کے بارے میں چند الفاظ پرچی پر لکھ دیتے تھے۔ اب یہ ڈھیروں پرچیاں یہاں اس اسپیشلسٹ ڈاکٹر کے ڈسٹ بن میں نظر آرہی تھیں۔ ہر پرچی کے نیچے والے حصے میں بیماری کا ڈاکٹری علاج درج تھا۔ مثلاً ڈسپرین... ڈیک لاران... نوسپا... میوکین... کرافلم... موسیگار... اور پتا نہیں کیا کچھ۔

اس کا مطلب تھا کہ پڑیوں کے سفوف، راکھ اور مٹی وغیرہ کچھ نہیں۔ ان میں یہ ایلوپیتھک دوائیاں ملائی جاتی ہیں۔ کہیں کم اور کہیں زیادہ... اور اس سے بھی خوفناک انکشاف مجھ پر یہ ہوا کہ یہاں ''سٹی رائیڈز'' بھی استعمال کی جارہی تھیں۔ خاص طور سے جو پانی کی بوتلیں وغیرہ دم کر کے دی جاتی تھیں ان میں یہ ممنوعہ اور نہایت مضر دوا شامل ہوتی تھی اور یہ سب کچھ ان سیکڑوں پرچیوں سے ثابت ہو رہا تھا جن کے نچلے حصے میں اس بہروپن ملنگنی نے اپنے ہاتھوں سے لکھا ہوا تھا۔

وہ صوفے پر پڑی بری طرح کسمسا رہی تھی۔ بے بس ہونے کے باوجود اس کی آنکھوں میں جارحیت دکھائی دیتی تھی۔ اس کے منہ سے ٹیپ اتارنے اور کپڑا نکالنے کا مطلب مصیبت کو دعوت دینا تھا اگر میں نے اسے صوفے سے باندھا نہ ہوتا تو وہ اب تک ٹانگیں چلا چلا کر اس انڈر گراؤنڈ کلینک کا کباڑا کر چکی ہوتی۔ وہ کافی حد تک جنونی دکھائی دیتی تھی۔

اچانک میری نگاہ اس کے قریب پڑے سیل فون پر پڑی۔ اس جگہ چونکہ برقی توانائی موجود تھی۔ لہٰذا سیل فون چارجنگ پر لگا ہوا تھا۔ میں نے موبائل فون اٹھایا اور اسے چیک کرنے لگا۔ کیمرے میں جا کر دیکھا تو تصویریں نظر آئیں۔ زیادہ تر تصویریں اس لڑکے رضوان ہی کی تھیں۔

سیل فون میں اس کا نام ''رضوان ٹی'' کے الفاظ میں محفوظ تھا۔ کہیں اس نے شاندار شلوار قمیص پہن رکھی تھی، کہیں پینٹ شرٹ اور کہیں اس کا بالائی جسم عریاں نظر آتا تھا۔ یہ عریاں جسم والی تصویریں یقیناً ایک دو دن پہلے ہی اتاری گئی تھیں۔ رضوان کی چھاتی پر کھرونچوں کے نشان تھے۔ یا پھر شاید سفلی جذبات کی شدت میں اسے کاٹا گیا تھا۔ ایک سیلفی غالباً چند گھنٹے پہلے ہی بنائی گئی تھی اور ابھی تک ''ڈیلیٹ'' نہیں کی جاسکی تھی۔ اس میں ڈاکٹر موجودہ لباس میں ہی تھی اور رضوان سے چمٹی ہوئی تھی۔

ان تصویروں کو دیکھنے کے بعد کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں رہی۔ میں سمجھ گیا کہ یہ عام شکل وصورت والی ڈاکٹر اس رضوان ٹی نامی نوجوان پر بری طرح فریفتہ ہے۔ اس کی فوٹوگرافی سے اس کے شدید لگاؤ کا اندازہ ہوتا تھا جو وہ رضوان سے رکھتی تھی مگر یہ ویسا ہی لگاؤ تھا جو اپنے کسی پیارے پالتو جانور سے رکھا جاتا ہے۔

''بہت خوب، تو یہاں یہ سلسلے چل رہے ہیں۔'' میں نے رضوان کے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

وہ اپنے سرخ ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گیا۔ تیز دھار نشتر ابھی تک میرے ہاتھ میں تھا۔ اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ میری رگوں میں لہو سنسنا اٹھا۔ رضوان نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ''پوچھو، کون ہے؟'' میں نے سرگوشی میں کہا۔

''کون ہے؟'' رضوان نے بلند آواز میں پوچھا۔

''بشارت، تھوڑی سی صاف روئی مل جائے گی؟'' بھاری آواز میں کہا گیا۔

''کہو اس وقت نہیں ہے۔'' میں نے رضوان کو ہدایت جاری کی۔

اس نے یہی جواب دیا۔ لیکن اس کی آواز میں لرزش سی تھی۔

چند لمحے توقف کے بعد پوچھا گیا۔ ''کیا کر رہے ہو؟''

''بولو، کام کر رہے ہیں۔'' میں نے لقمہ دیا۔

رضوان نے بلند آواز میں میرا کہا ہوا فقرہ دہرایا۔ دوسری طرف خاموشی چھا گئی۔ اس دوران میں ڈاکٹر بری طرح تڑپتی مچلتی رہی تھی اور گلے سے گھٹی گھٹی آوازیں نکالتی رہی تھی۔

دستک دینے والا اب واپس جاچکا تھا۔ اندازہ یہی ہورہا تھا کہ اسے کوئی شک نہیں ہوا۔ میں ایک بار پھر سیل فون کی طرف متوجہ ہوا۔ میری توجہ دو سیکنڈ کے لیے رضوان کی طرف سے کم ہوئی۔ پتا نہیں اس کے دل میں کیا آئی۔ اس نے اٹھ کر دروازے کی طرف لپکنا چاہا۔ اگر وہ سمجھ رہا تھا کہ میں غافل ہوں تو یہ اس کی بھول تھی اور اگر اس کا خیال یہ تھا کہ وہ پھرتی دکھا کر دروازے تک پہنچ جائے گا اور چٹخنی گرا کر باہر نکل جائے گا تو وہ سراسر حماقت کررہا تھا۔ میں نے تڑپ کر اس کی گردن اپنے بازو کی گرفت میں لی اور اسے گھما کر اوندھے منہ فرش پر گرا دیا۔ اس نے مزاحمت کرنا چاہی مگر ناکام ہوا۔ گردن اس طرح بازو کے شکنجے میں تھی کہ ڈاکٹر والا سین ''ری پیٹ'' ہوگیا تھا۔ رضوان کا منہ کھلا تھا مگر وہ آواز نہیں نکال سکتا تھا۔ اگر اسے میری خود ستائشی نہ سمجھا جائے تو یہی کہوں گا کہ پروفیشنل فائٹرز سے لڑلڑ کر اب عام حریف مجھے بے حد ''آسان'' نظر آتے تھے۔ میں نے رضوان کو... بالوں سے پکڑ کر اس کی گردن پیچھے کی طرف موڑی تو اس کا چہرہ تکلیف کی وجہ سے بگڑ گیا۔ یہی وقت تھا جب میری نگاہ صوفے سے بندھی ہوئی ڈاکٹر پر پڑی۔ اسے دیکھ کر لگا کہ ابھی اسے دل کا دورہ پڑ جائے گا اور وہ جہانِ فانی سے کوچ کر جائے گی۔ اس کی جارحیت کی جگہ اب دہشت نے لے لی تھی اور جنون کی جگہ منت سماجت کی کیفیت دکھائی دیتی تھی اور یہ سب کچھ رضوان کی وجہ سے ہوا تھا۔

میں نے تیز دھار نشتر رضوان کی کمر پر بائیں جانب رکھا اور زہریلے لہجے میں کہا۔ ''یہاں سے یہ تیرے اندر گھساؤں گا تو سیدھا دل میں اتر جائے گا۔ اب آواز نہ نکالنا ورنہ وہ آخری آواز بن جائے گی۔''

وہ میرے نیچے اوندھا پڑا تھرتھر کانپ رہا تھا۔ میں نے اس کی گردن چھوڑی۔ اس کے دونوں بازو پیچھے کی طرف موڑے اور انہیں بھی کپڑے کی چوڑی ٹیپ کے ساتھ باندھ دیا۔

رضوان کے اس طرح مزاحمت کرنے اور تکلیف اٹھانے کا ایک فائدہ ضرور ہوا تھا اور وہ یہ کہ مجھے اس جنونی ڈاکٹر پر غلبہ پانے کا طریقہ سمجھ میں آگیا تھا۔ میرے دل نے گواہی دی تھی کہ جس طرح جن کی جان طوطے میں ہوتی ہے اسی طرح اس ڈاکٹر کی جان خوبرو رضوان میں تھی۔ کم از کم اتنا تو ضرور تھا کہ وہ اسے کسی تکلیف میں نہیں دیکھ سکتی تھی یا شاید یہ کہنا چاہیے کہ یہ نہیں دیکھ سکتی تھی کہ کوئی اور اسے تکلیف پہنچائے۔ اسے خود تو وہ یقیناً تکلیف پہنچاتی تھی اور اس کا ثبوت رضوان کے جسم پر ''اندھا دھند محبت'' کے نشان

تھے۔

میڈیکل ٹیپ یہاں وافر مقدار میں موجود تھی۔ رضوان کرسی پر بیٹھا تھا۔ میں نے ٹیپ کے تین چار بل دے کر اسے کرسی سے ہی باندھ دیا۔ اس کے بعد ایک کاؤنٹر کے نچلے دراز سے میں نے ایک پلاس نکال لیا۔ پلاس عام طور پر کیل وغیرہ اکھاڑنے کے کام آتا ہے لیکن یہاں میں اس سے کوئی اور کام لینا چاہتا تھا۔ چست پتلون میں سے رضوان کی صحت مند رانیں نظر آتی تھیں۔ میں نے ایک ران کے گوشت کو پلاس میں جکڑا تو تکلیف کی شدت سے بے ساختہ اس کا منہ کھل گیا۔ میں پہلے سے تیار تھا۔ ایک کپڑا میں نے پھرتی سے رضوان کے منہ میں گھسیڑ دیا اور اوپر سے میڈیکل ٹیپ چڑھا دی۔ ڈاکٹر کا چہرہ دھواں ہو رہا تھا۔ میں نے پلاس کا دباؤ بڑھایا تو رضوان کی حالت غیر ہو گئی اور اس سے زیادہ ڈاکٹر کی غیر ہو گئی۔ وہ نہایت بے قراری سے نفی میں سر ہلانے لگی۔ آنکھوں میں کرب ہی کرب تھا۔ میرا طریقہ کارکام کر رہا تھا۔

پلاس کے دباؤ سے رضوان کی ٹانگ کا گوشت کچلا گیا تھا۔ اور اس کی سفید پتلون پر خون کی سرخی نمودار ہو رہی تھی۔ میں نے ڈاکٹر سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''ابھی تو صرف ران ہے۔ تمہارے معشوق کا پورا جسم پڑا ہے، یہ پلاس دائیں بائیں کہیں بھی اپنے دانت جما سکتا ہے۔''

وہ کچھ کہنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن منہ میں کپڑا ٹھنسا ہونے کی وجہ سے بے بس تھی۔ تین چار منٹ کے اندر ہی صورتِ حال میری مرضی کے مطابق ہو گئی۔ میں نے رضوان کے منہ میں تو کپڑا رہنے دیا لیکن ڈاکٹر کے منہ سے نکال دیا۔ وہ میرے سوالوں کے جواب دینے پر آمادہ نظر آ رہی تھی۔

میں نے سب سے پہلے اس کا نام پوچھا۔

''ارم... ڈاکٹر ارم۔'' اس نے پُروحشت آواز میں جواب دیا۔

میں نے کہا۔ ''ڈاکٹر تم تو خود کو نہ ہی کہو تو اچھا ہے، یہ جو کچھ تم یہاں کر رہی ہو کوئی قسائی تو کر سکتا ہے مسیحا نہیں۔''

''تم جو کچھ کر رہے ہو، بہت برا کر رہے ہو۔ اس کا انجام تمہارے خیالوں سے کہیں زیادہ برا ہونے والا ہے۔ تم ان لوگوں کو جانتے نہیں ہو۔''

''جاننے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ تمہیں دیکھ کر ہی پتا چل جاتا ہے کہ تم جن کے لیے کام کر رہی ہو، وہ کتنے اعلیٰ پائے کے بدمعاش ہوں گے۔ بہرحال تم میری فکر نہ کرو۔ اپنی کرو اور اپنے اس چکنے بوائے فرینڈ کی کرو۔ تمہاری ہٹ دھرمی کی وجہ سے جو کچھ اس کے ساتھ ہوگا... اور اس کی مردانہ صفات پر جس طرح کے اثرات پڑیں گے وہ تمہارے تصور میں بھی نہیں آ سکتا۔''

''کیا چاہتے ہو مجھ سے؟''

''سب کچھ بتاؤ، جو جو کچھ تمہارے علم میں ہے اور مجھے پتا ہے تم بہت کچھ جانتی ہو۔''

اگلے قریباً بیس منٹ میں ڈاکٹر ارم نے واقعی میری معلومات میں گراں قدر اضافہ کیا۔ وہ جہاں اٹکی، وہیں میں نے رضوان کے گوشت پر پلاس کا دباؤ بڑھایا اور فوراً ہی اس کی زبان کو روانی مل گئی۔

ڈاکٹر ارم نے اعتراف کیا کہ وہ لاہور کی رہنے والی ہے اور لاہور میں اس پر ناجائز ابارشن کرنے کے قریباً ایک درجن کیس بنے ہوئے ہیں، اب وہ پچھلے قریباً پانچ سال سے اس ملنگی ڈیرے کے زیریں حصے میں موجود تھی اور ''پردے والی سرکار'' کے لیے کام کر رہی تھی۔ اسے یہاں ٹھیک ٹھاک معاوضہ مل رہا تھا اور دیگر بے شمار سہولتیں بھی تھیں۔ یہ لوگ مریضوں کو بتائے بغیر انہیں ایلوپیتھک دوائیں اور خاص طور سے مضرِ صحت سٹی رائیڈز... کھلاتے تھے اور اپنی پیری فقیری چمکاتے تھے۔ اب یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آ رہی تھی کہ پچھلے چند سالوں میں یہ ملنگی ڈیرا کیونکر اتنی تیزی سے مقبول ہوا اور ''روحانی علاج'' کا مرکز بن گیا۔

میں نے ڈاکٹر ارم سے پوچھا۔ ''چھ سات سال سے تم لوگ یہ پریکٹس فرما رہے ہو، کیا کبھی کسی نے کھوج نہیں لگایا کہ دیسی دواؤں اور راکھ، مٹی کی پڑیوں کے بجائے یہاں ڈاکٹری دوائیں بھونڈے طریقے سے دی جا رہی ہیں۔''

''چند کیسوں میں ایسا ہوا ہے... لیکن... میں نے تمہیں بتایا ہے نا کہ ان لوگوں کے ہاتھ تمہاری سوچ سے زیادہ لمبے ہیں۔ کئی اعلیٰ افسر اور جج تک پردے والی سرکار کے قدموں میں آ کر بیٹھتے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''مجھے پتا چلا ہے کہ تم ٹانگ کے پٹھے کاٹ دیتی ہو اور اس کام کے لیے کچے گنے کے چھلکے سے بنا ہوا چاقو استعمال کرتی ہو۔ مجھے تو یہاں ایسا کوئی چاقو نظر نہیں آ رہا۔''

''بس یہ افواہ ہے۔ یہ کام میں ڈاکٹری اوزاروں سے ہی کرتی ہوں۔''

''بہت خوب... کتنے فخر سے اعلان کر رہی ہو، لوگوں کو معذور بنانے کا۔ شرم آنی چاہیے تمہیں۔''

ڈاکٹر ارم کا رنگ انگارے کی طرح دہک گیا۔ ایک سیکنڈ کے لیے لگا کہ وہ جنونی انداز میں مجھ پر چلانے لگے گی لیکن پھر اس کی نگاہ پلاس پر اور پلاس کے ہدف پر جم گئی۔ وہ لہو کا گھونٹ بھر کر رہ گئی۔

دفعتاً دروازے پر پھر دستک ہوئی۔ اس مرتبہ کسی ملنگنی کی آواز آئی۔ ''باجی جان، نصرت کی بیٹی کو پھر بڑا درد ہو رہا ہے۔''

میں نے سرگوشی میں کہا۔ ''اسے کوئی مناسب جواب دو۔ اسے پھر یہاں نہیں آنا چاہیے۔''

چند لمحے تذبذب میں رہ کر ڈاکٹر ارم نے بلند آواز میں کہا۔ ''ابھی کام کر رہی ہوں۔ وہی پہلے والی دوا دو اُسے۔''

عورت 'جی اچھا' کہہ کر چلی گئی مگر چند سیکنڈ بعد ہی دروازے پر پھر دستک ہو گئی۔ ''کون؟'' ڈاکٹر ارم نے پوچھا۔

''بندہ فارغ ہو گیا ہے جی؟'' بھاری آواز میں پوچھا گیا۔ یہ آواز یقیناً انچارج جہانے ہی کی تھی۔

''اسے کہو، ابھی دیر لگے گی۔ ایک گھنٹا۔'' میں نے تیز سرگوشی میں ہدایت کی۔ ڈاکٹر ارم نے جھلا کر بلند آواز سے کہا۔ ''ابھی جاؤ... کام کر رہی ہوں۔''

''لیکن آپ نے...''

''ابھی جاؤ۔'' ڈاکٹر ارم جھنجلا کر چلائی۔ ''اس کا خون بند نہیں ہو رہا۔ ابھی ایک آدھ گھنٹا لگے گا۔''

وہ لوگ واپس چلے گئے۔ ''اب کیا چاہتے ہو تم؟'' وہ میری آنکھوں میں دیکھ کے بولی۔

''وہی جس کے لیے ہم یہاں آئے ہیں۔ میں ریشمی سے ملنا چاہتا ہوں کسی بھی صورت... تم یہاں کی سینئر موسٹ مجاور ن ہو۔ مجھے بتاؤ، میں کیسے مل سکتا ہوں اُس سے؟''

''کوئی فائدہ نہیں۔ جو کچھ تم چاہتے ہو وہ نہیں ہو سکتا۔ تین دن بعد اس کا نکاح ہے پردے والی سرکار سے۔ آج کل وہ سخت پہرے میں ہے۔ اگر کوئی حماقت کرو گے تو پھر تمہیں پتا ہی ہے، پل والے محافظوں کا... وہ ہڈیاں تک نہیں چھوڑتے۔''

ڈاکٹر کی آنکھوں میں وارننگ تھی۔ میں اس کا اشارہ سمجھ گیا تھا۔ وہ پل والے خونخوار چیتوں کا ذکر کر رہی تھی۔ وہ کافی گہری اور مضبوط اعصاب کی مالک تھی۔ ابھی تک مزاحمت جاری رکھے ہوئے تھی۔ میں نے کہا۔ ''مجھے سن گن ملی ہے کہ یہاں کوئی ایسا پوشیدہ راستہ بھی ہے جو سیدھا پردے والی سرکار کے رہائشی حصے تک پہنچا دیتا ہے۔ یقیناً ریشمی بھی اسی حصے میں ہوگی۔'' میں نے اندھیرے میں تیر چھوڑا تھا لیکن پتا چلا کہ یہ نشانے پر نہیں لگا۔

وہ نفی میں سر ہلا کر بولی۔ ''مجھے ایسے کسی راستے کا پتا نہیں۔''

وہ راستے کی موجودگی کا انکار کر رہی تھی، پھر بھی میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ وہ مجھے ریشمی سے ملانے کا کوئی نہ کوئی راستہ نکال سکتی ہے۔ اس کی ہٹ دھرمی دیکھ کر میں نے کہا۔

''ڈاکٹر ارم! اب تک تم ہی یہاں لوگوں کے پٹھے کاٹتی رہی ہو لیکن لگتا ہے کہ آج مجھے بھی کچھ نہ کچھ کاٹنا پڑے گا۔''

میں نے پلاس کو حرکت دی اور اس کے ساتھ ہی رضوان کی گردن بازو میں جکڑ کر اس کی ستواں ناک کی چونچ پلاس کی گرفت میں لے لی۔ وہ تڑپ اٹھا۔ میں نے کہا۔ ''یہ جسم کے نازک حصوں میں سے ہے، چلو پہلے اسی پر کوشش کرتے ہیں۔''

رضوان کا رنگ خوف سے یکسر سفید پڑ گیا تھا۔ ذاتی طور پر وہ مجھے برا شخص نہیں لگا تھا۔ پتا نہیں کہ یہاں کیونکر پھنسا ہوا تھا۔ میں اسے کوئی ایسا نقصان نہیں پہنچانا چاہتا تھا جو نا قابلِ تلافی ہو۔ میں جو کچھ کر رہا تھا وہ اس ڈھیٹ عورت کو راہِ راست پر لانے کے لیے تھا۔

اور پھر ڈاکٹر ارم نے ہارے ہوئے لرزاں لہجے میں ایک ایسا انکشاف کیا جس نے واقعی چونکا دیا۔ وہ بولی۔ ''تمہیں اس لڑکی کو ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ... تھوڑی دیر میں خود... یہاں پہنچنے والی ہے...''

ابھی ڈاکٹر ارم کی بات ختم ہی ہوئی تھی کہ اس کمرے کے دروازے پر پھر دستک ہو گئی لیکن اس مرتبہ یہ دستک ایک چھوٹے سے اندرونی دروازے پر ہوئی تھی اور کافی مدھم تھی۔ ''کون؟'' ڈاکٹر ارم نے پوچھا۔

''جی میں فضیلت ہوں، کرنالی صاحب پوچھ رہے ہیں کیا ''پاک بہن'' کو یہاں بھیج دیا جائے؟''

ڈاکٹر ارم نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا، پھر بولی۔ ''ہاں... دس منٹ تک بھیج دو۔''

''جی اچھا...'' کی آواز کے بعد خاموشی چھا گئی۔

میں نے ارم سے پوچھا کہ ریشمی یہاں کس لیے آ رہی ہے؟

وہ بولی۔ ''اس کے کان چھیدے جانے ہیں۔ اس کے کانوں میں خاص طرح کی بالیاں پہنائی جائیں گی۔ پردے والی سرکار کی بیوی بننے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ اس کے کانوں میں یہ بالیاں ہوں۔''

''ٹھیک ہے، تم اس کو آنے دو۔ میں تمہیں کھول دیتا ہوں۔ تم خود اسے ریسیو کرنا۔ لیکن اس دوران میں کوئی ہوشیاری دکھائی تو تمہارے اس ڈارلنگ کا حشر خراب ہو جائے گا۔''

اس نے ہونٹوں پر زبان پھیر کر اثبات میں سر ہلایا۔

تیز دھار نشتر بدستور میرے بائیں ہاتھ میں تھا اور وہ دونوں اچھی طرح جان چکے تھے کہ میں اس کا بے دریغ استعمال کر سکتا ہوں۔ میں نے اسی نشتر کی مدد سے ڈاکٹر ارم کی بندشیں کاٹ دیں۔ اس جگہ اور ایسی کوئی شے دکھائی نہیں دے رہی تھی جسے ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جا سکتا۔ اس حوالے سے مجھے مکمل اطمینان تھا۔ ارم مجھے یہ بھی بتا چکی تھی کہ پاک بہن یعنی ریشمی اکیلی ہی اس آپریشن تھیٹر نما کمرے میں آئے گی۔

میں نے رضوان کو کرسی سمیت گھسیٹا اور ایک قدم آدم الماری کے عقب میں ہو گیا۔ اس جگہ میں اندر آنے والے کی نظروں سے اوجھل رہ سکتا تھا اور دروازے پر نگاہ بھی رکھ سکتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہی دروازے پر پھر دستک ہو گئی۔ میں نے نشتر رضوان کی گردن پر رکھا ہوا تھا۔ آنکھوں آنکھوں میں، میں نے پھر ڈاکٹر ارم کو دھمکی دی کہ اگر اس نے کوئی چالاکی دکھائی تو پھر اس طوطے کی گردن پر چھری چل جائے گی جس میں اس کی جان ہے۔

ڈاکٹر ارم نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا اور ایک لڑکی کو اندر لے آئی۔ میں پہلی بار ریشمی کو براہِ راست دیکھ رہا تھا۔ وہ درمیانے قد کی قبول صورت لڑکی تھی۔ رنگ زردی مائل سفید اور ٹھوڑی پر تل تھا۔ وہ گم صم و اداس نظر آتی تھی۔ اس نے چمکدار گہرا نیلا چولا پہن رکھا تھا۔ سر پر نیلی شال تھی۔ گلے میں کئی مالائیں نظر آرہی تھیں۔ اس کے اندر آنے کے بعد میری ہدایت کے مطابق ڈاکٹر ارم نے دروازے کو اندر سے بولٹ کر دیا۔

''زیادہ درد تو نہیں ہوگا؟'' ریشمی نے سہمی سہمی آواز میں پوچھا۔

''نہیں، میں لوشن لگا کر سن کر لوں گی۔'' ڈاکٹر نے جواب دیا۔

یہی وقت تھا جب میں ریشمی اور ڈاکٹر ارم کے سامنے آ گیا۔ مجھے دیکھ کر ریشمی حیران ہوئی اور سوالیہ نظروں سے ارم کی طرف دیکھنے لگی۔

میں نے کہا۔ ''ریشمی! اس کی طرف مت دیکھو، یہ تمہیں کچھ نہیں بتائے گی جو پوچھنا ہے مجھ سے پوچھو۔''

''آ... آپ کون؟'' وہ بولی۔ اس کی آواز واقعی خوب صورت تھی۔ جیسے گرمیوں کی دوپہر میں آموں کے باغ میں کوئل کوک رہی ہو۔

میں نے کہا۔ ''یہاں تمہاری ملاقات تاجور سے ہو چکی ہے۔ اس نے تمہیں میرے بارے میں کچھ نہ کچھ بتایا ہوگا۔''

اس نے پوری آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھا، پھر اس کے چہرے پر حیرت کے سائے گہرے ہوتے چلے گئے۔ انگلی سے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ''کہیں آپ بھائی شاہ زیب تو نہیں؟''

''تم نے ٹھیک اندازہ لگایا ہے۔'' میں نے خوش ہو کر کہا۔

''مم... مگر آپ یہاں کیسے؟''

''میرا ابھی یہاں آپریشن ہونا ہے۔ تمہیں پتا ہی ہو گا۔ اپنے مہمانوں کی ٹانگ کا پٹھا وغیرہ کاٹ کر یہ لوگ میزبانی کا حق ادا کرتے ہیں۔''

بات کرتے ہوئے میری نگاہ بدستور ڈاکٹر ارم پر تھی۔ میں اسے ہوشیاری دکھانے کا کوئی موقع فراہم کرنا نہیں چاہتا تھا۔ بہرحال خطرہ ہر گھڑی موجود تھا۔ میں نے پہلا کام یہ کیا کہ تیز دھار نشتر کے زور پر ڈاکٹر ارم کو ملحقہ واش روم میں بند کر دیا۔ اس بات کی تسلی میں پہلے ہی کر چکا تھا کہ اس مختصر واش روم میں ایسی کوئی شے موجود نہیں جو ڈاکٹر ارم کو کسی طرح کا فائدہ پہنچا سکے۔

ڈاکٹر کو لاک کرنے کے بعد میں رضوان کو کرسی سمیت گھسیٹ کر ریشمی کے سامنے لے آیا۔ رضوان کو اس حالت میں دیکھ کر ریشمی کی حیرت کئی گنا بڑھ گئی۔ اس کی ڈری ڈری نظر رضوان کی دائیں ران پر مرکوز تھی جہاں سفید پتلون خون سے سرخ ہو رہی تھی۔

''یہ کیا ہے؟'' وہ خوف زدہ آواز میں بولی۔

''اسے اردو میں ''جیسے کو تیسا'' کہتے ہیں اور پنجابی میں کہتے ہیں ''جیسا منہ ویسی چپیڑ۔''

''میں کچھ سمجھ نہیں پا رہی؟''

میں نے کہا۔ ''ریشمی! مجھے تمہارے بارے میں سب معلوم ہو چکا ہے۔ وہ خط بھی میں پڑھ چکا ہوں جو تم نے

اپنے والد کو لکھا۔ اب کچھ بھی چھپا ہوا نہیں ہے۔ میں تمہیں یہاں سے چھڑانے آیا ہوں اور میں چھڑا کر لے جاؤں گا۔''

اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''یہ بہت مشکل ہے بھائی، بہت زیادہ مشکل۔ آپ... یہ کیسے کر سکیں گے؟''

''جیسے میں یہ کر سکا ہوں۔'' میں نے کرسی سے بندھے ہوئے رضوان کی طرف اشارہ کیا۔ ''تمہارے سامنے اس زہریلی ڈاکٹرنی کو میں نے واش روم میں بند کیا ہے۔ کیا ہے یا نہیں؟''

وہ لاجواب سی ہو کر میری طرف دیکھنے لگی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا۔ ''مجھ پر بھروسا رکھو۔ میں یہ کر گزروں گا۔ کوئی مجھے روک نہیں سکے گا۔''

میرے انداز نے جیسے اس کی ڈھارس بندھائی۔ اس نے ایک سسکی سی لے کر ہونٹوں پر ہاتھ رکھ لیا۔

اسی دوران میں، میں نے محسوس کیا کہ رضوان اپنی جگہ پر مچل رہا ہے اور بے قراری کے عالم میں کچھ کہنا چاہ رہا ہے۔ میں نے اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس رکھا تھا۔ اس کی کیفیت دیکھ کر میں نے کپڑا اس کے منہ سے نکال دیا، اس نے چند گہری سانسیں لیں اور میری طرف دیکھ کر بولا۔

''میں آپ سے ایک دو باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ کیا ہم چند منٹ کے لیے اس سامنے والے کمرے میں جا سکتے ہیں؟''

وہ جسے کمرا کہہ رہا تھا، وہ ایک اسٹور روم تھا۔ یہاں مرہم پٹی کا سامان، دوائیں، بیساکھیاں، آرتھوپیڈک کی پلیٹیں وغیرہ رکھی تھیں۔ میں ابھی ریشمی کی طرف سے بھی پوری طرح مطمئن نہیں تھا۔ میں نے دونوں طرف کے دروازے لاک کر دیے اور رضوان والی کرسی گھسیٹ کر اسٹور روم میں لے آیا، اسٹور روم کا دروازہ میں نے ادھ کھلا رہنے دیا تاکہ باہر نظر رکھ سکوں۔

تھوڑی سی تمہید باندھنے کے بعد رضوان نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ 'شاہ زیب صاحب! میں خود بھی یہاں سے نکلنا چاہتا ہوں۔ یہاں سے نکلنے کے لیے میں ہر طرح آپ کا ساتھ دینے کو تیار ہوں۔''

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا، مجھے اس کی خوب صورت آنکھوں میں سچائی نظر آئی۔ اگلے چار پانچ منٹ میں میرے اور اس کے درمیان جو بات ہوئی اس سے عیاں ہو گیا کہ وہ اس زندگی سے بری طرح اکتایا ہوا ہے۔

ڈاکٹر ارم تو باہر بھی آجا سکتی تھی۔ کیونکہ وہ اپنی مرضی سے یہاں رہ رہی تھی، مگر رضوان کی اپنی حیثیت ایک قیدی کی سی تھی۔ وہ ڈیرے کے ایک محدود حصے میں نقل و حرکت کر سکتا تھا۔ ڈاکٹر ارم اک بلا کی طرح اس سے چمٹی ہوئی تھی۔ وہ اس سے محبت کرتی تھی لیکن کبھی کبھی وہ اس محبت میں ''نفسیاتی'' نظر آنے لگتی تھی۔ وہ اس کی ہر آسائش کا خیال رکھتی تھی مگر اس کے عوض اسے ہر وقت اپنی نگاہ اور دسترس میں رکھنا چاہتی تھی۔

میں نے اس سے پوچھا۔ ''تم یہاں کتنے عرصے سے ہو؟''

وہ بولا۔ ''ڈھائی سال سے۔ میں کراچی سے ایک کام کے سلسلے میں یہاں آیا تھا اور اس جنونی کے چکر میں پھنس گیا اور پھر یہاں پہنچ گیا۔''

میں نے کہا۔ ''تم ڈھائی سال سے یہاں ہو لیکن یہاں سے نکلنے کا خیال تمہارے دماغ میں آج ہی کیوں آیا ہے...؟''

وہ بولا۔ ''اگر سچ پوچھتے ہیں تو اس سے پہلے مجھے اس قبرستان میں کوئی ایسا نظر ہی نہیں آیا تھا جس میں زندگی کی جھلک پائی جاتی ہو۔ آپ کو دیکھا، آپ کو سنا تو مجھے لگا کہ یہاں اس ملنگی ڈیرے پر کچھ ہونے والا ہے۔ شاید کچھ دیواریں گرنے والی ہیں، کچھ زنجیریں ٹوٹنے والی ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''پڑھے لکھے لگتے ہو، اِن چکروں میں کیسے پھنس گئے؟''

''یہ ذرا لمبی کہانی ہے شاہ زیب صاحب۔ اگر یہاں سے بہ خیریت نکل گئے تو آپ کو ضرور سناؤں گا۔ میں آپ کو اپنا سینہ چیر کر نہیں دکھا سکتا لیکن وہی کہہ رہا ہوں جو میرے دل میں ہے۔ میں یہاں سے نکلنا چاہتا ہوں اور اس حوالے سے آپ کے ساتھ ہر طرح کا تعاون کروں گا اور سب سے پہلا تعاون تو یہ ہوگا کہ میں آپ کو اس دروازے کی چابی دوں گا جس میں آپ بند ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ جنگلارے کے اکلوتے دروازے کی چابی۔''

میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟''

''یہ ہو چکا ہے جی، ایک سال پہلے ہو چکا ہے۔ اتفاق سے اس جنگلارے کی ایک ڈپلی کیٹ چابی مجھے مل گئی تھی اور وہ اب تک میرے پاس ہے۔''

''اس چابی کا کیا استعمال ہو سکتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''آپ جنگلارے سے نکل سکتے ہیں، اس کی مکمل پلاننگ میں آپ کو بتا سکتا ہوں۔''

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”لیکن یہ سب کچھ تو تب ہوگا نا جب تمہاری یہ ڈاکٹرانی کچھ کرنے دے گی۔ اس کا تو یہی کہنا ہے کہ پہلے میری لاش سے گزرو، پھر جو مرضی کرنا۔“

رضوان نے گہری سانس لے کر واش روم کے بند دروازے کی طرف دیکھا۔ وہاں وہ عورت موجود تھی جو اس سے محبت کرتی تھی... اور اس کی آقا بھی تھی۔ وہ بولا۔ ”مجھے پچانوے فیصد امید ہے کہ جب ڈاکٹر ارم کو معلوم ہوگا کہ میں نے یہاں سے نکلنے کا تہیہ کرلیا ہے تو وہ بھی جانے پر آمادہ ہو جائے گی۔“

”اور اگر نہ ہوئی تو؟“

وہ عجیب لہجے میں بولا۔ ”وہ مجھے مرتا ہوا نہیں دیکھ سکتی۔ اگر اس نے مجھے زبردستی روکنا چاہا تو میں اس کے سامنے ہی اپنے ساتھ کچھ کرگزروں گا... بلکہ... یہ فیصلہ ابھی ہو جائے گا۔ دس پندرہ منٹ کے اندر۔ میں ڈاکٹر ارم سے دوٹوک بات کرتا ہوں ابھی، اسی وقت...“ لگتا تھا کہ رضوان اپنے تحمل اور برداشت کی آخری حدوں کو چھو رہا ہے۔

پتا نہیں کہ میرے دل میں کیا آیا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تو کرو اس سے بات۔“

وہ تیار ہو گیا۔ اس نے کہا کہ میں چند منٹ کے لیے اسے ڈاکٹر ارم کے ساتھ اس اسٹور روم میں اکیلا چھوڑ دوں۔ میں نے بڑی باریک بینی سے اسٹور روم کا جائزہ لیا۔ وہاں باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ کوئی کھڑکی تک نہیں تھی۔ ایک دو چیزیں ایسی ملیں جنہیں ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جاسکتا تھا، وہ میں نے وہاں سے اٹھالیں۔ ریشمی بدستور سہمی ہوئی کرسی پر بیٹھی تھی اور یہ ساری کارروائی دیکھ رہی تھی۔ میں نے ڈاکٹر ارم کو واش روم سے نکالا اور رضوان کے پاس اسٹور میں پہنچا دیا۔ رضوان کی درخواست پر میں نے دروازہ اس طرح بند کردیا کہ اس میں بس تھوڑی سی درز باقی رہ گئی۔ وہ دونوں تقریباً آدھ گھنٹے تک وہاں رہے۔ کسی وقت وہ بہت دھیمے لہجے میں بات کرتے۔ کسی وقت آوازیں بلند ہو جاتیں اور ان میں تلخی آجاتی۔ رضوان کے اس طرح کے الفاظ بھی ہمارے کانوں میں پڑے... میں ختم کرلوں گا اپنے آپ کو... لعنت ہے ایسی زندگی پر... اور اس طرح کی دیگر باتیں...

قریباً آدھ گھنٹے بعد دونوں باہر نکلے تو اُن کے چہرے لال بھبوکا ہو رہے تھے۔ تاہم ایسا لگتا تھا کہ رضوان کافی حد تک ڈاکٹر ارم کو قائل کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔

ڈاکٹر ارم نے ریشمی کے کانوں کا معائنہ کیا اور بولی۔ ”جو بالیاں تمہیں پہنائی جاتی ہیں، وہ خاص قسم کی ہیں۔ اس کے لیے ذرا بڑے سوراخ کرنے پڑیں گے۔ فی الحال میرے پاس وہ اوزار نہیں جس سے سوراخ کرسکوں۔ تمہیں کل تک انتظار کرنا پڑے گا۔ میں کوئی دوسرا طریقہ ڈھونڈتی ہوں۔“

رضوان نے آنکھوں آنکھوں میں مجھے سمجھایا کہ وہ جان بوجھ کر ایسا کررہی ہے... ریشمی واپس جانے کے لیے تیار نظر آرہی تھی۔ رضوان نے اسے ”پاک بہن“ کہہ کر مخاطب کیا اور بولا۔ ”آپ بالکل تیار رہیں۔ کل رات کسی وقت ہم یہاں سے نکل جائیں گے...“

ریشمی کراہ کر بولی۔ ”لیکن... یہ لوگ ایسا نہیں ہونے دیں گے۔ میرے اباجی یہاں ہیں۔ تاجور بھی یہاں ہے۔ میں ان کی زندگی کے لیے کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتی۔“

”کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔ ڈاکٹر ارم کل کسی وقت اندر جاکر آپ سے ملاقات کریں گی۔ وہ آپ کو سارے پروگرام سے آگاہ کردیں گی۔ ہم کوشش کریں گے کہ آپ کے اباجی اور آپ کی دوست کو آپ سے پہلے ہی یہاں سے نکال لیں۔“

رضوان نے تائید طلب نظروں سے ڈاکٹر ارم کی طرف دیکھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”ہاں، میں کل ملوں گی تم سے۔“

اتنی دیر میں اندرونی دروازے پر پھر دستک ہوئی۔ رضوان نے کہا۔ ”پاک بہن! آپ کو لینے آگئے ہیں۔ آپ جائیں اور وہی کہیں جو آپ کو بتایا ہے۔ آپ کو کل پھر یہاں آنا ہے۔“

ڈاکٹر ارم نے دروازہ کھولا... میں نے تسلی بخش انداز میں ریشمی کی طرف دیکھا۔ وہ ڈبڈباتی آنکھوں کے ساتھ باہر چلی گئی۔

رضوان نے کہا۔ ”شاہ زیب بھائی! وقت کم ہے۔ آپ لیٹ جائیں۔ ارم آپ کی ٹانگ پر یونہی پٹی وغیرہ باندھ دیتی ہیں۔ میں اس دوران میں آپ کو تفصیل بتاتا ہوں۔“

میں آپریشن ٹیبل پر لیٹ گیا۔ ڈاکٹر ارم نے میری پنڈلی پر دوا لگا کر اور روئی رکھ کر پٹی باندھنا شروع کردی۔ رضوان نے ایک الماری کے کسی اندرونی خانے سے ایک لمبی چابی نکالی اور اسے میری گھیردار شلوار کے نیفے میں

داخل کر دیا، بولا۔ ''یہ چابی آج سے کوئی ایک سال پہلے کسی اور شخص نے بنائی تھی یہاں سے کسی کو نکالنے کے لیے، وہ اس کا بھائی تھا۔ وہ اسے تو نہ نکال سکا مگر خود زندگی کی قید سے نکل گیا۔ مجاوروں نے جان لے لی اس کی۔ یہ چابی میرے پاس آ گئی۔ یہ بالکل درست چابی ہے۔ اندر اور باہر دونوں طرف سے دروازے کو لگتی ہے۔''

''اس سے میں کیا کروں گا؟''

''اس سے آپ دروازہ کھولیں گے اور اپنے دونوں ساتھیوں سمیت باہر نکل جائیں گے۔''

''اور پہرے دار مجھے یہ سب کرنے دیں گے؟''

''جب آپ یہ کریں گے، پہرے دار وہاں موجود نہیں ہوں گے۔'' رضوان نے بڑے اعتماد سے کہا۔

میرے پوچھنے پر اس نے تفصیلاً سب کچھ بتایا۔ اس تفصیل کا خلاصہ کچھ اس طرح تھا۔ ہر رات پورے نو بجے اوپر مزار پر ایک چھوٹا گھڑیال بجتا تھا جس کی آواز نیچے تک سنائی دیتی تھی۔ یہ لنگر کھلنے کا اعلان ہوتا تھا اور یہی وقت پہرے داروں کے تبدیل ہونے کا بھی تھا۔ گھڑیال بجنے کے فوراً بعد جنگلارے کا پہرا بھی تبدیل ہوتا تھا۔ پہلے پہرے داروں کے جانے اور نئے پہرے داروں کے آنے کے درمیان آٹھ دس منٹ کا مختصر وقفہ ہوتا تھا۔ پلاننگ کے مطابق ہمیں اسی مختصر وقفے سے فائدہ اٹھانا تھا۔ رضوان کا کہنا تھا کہ گھڑیال کی آواز سننے کے فوراً بعد میں اپنے دونوں ساتھیوں یعنی چاچا رزاق اور تاجور کے ساتھ دروازے پر پہنچ جاؤں اور دروازے کو اندر کی طرف سے چابی لگا کر اسے کھول لوں۔ اس کے بعد دائیں طرف والی راہداری میں داخل ہو جاؤں جو قریباً سو گز تک نشیب میں جائے گی اور ہمیں لکڑی والے پل تک پہنچا دے گی۔

میں نے کہا۔ ''بالفرض دروازے کے باہر کوئی پہریدار موجود ہوا یا نیچے جاتی ہوئی راہداری میں کسی سے مڈبھیڑ ہوئی تو؟''

وہ فوراً بولا۔ ''میں ابھی ڈیڑھ دو گھنٹے بعد آپ کے پاس حجرے میں آؤں گا۔ بہانہ یہی ہوگا کہ آپ کی پنڈلی دیکھنی ہے۔ خون بند ہوا ہے یا نہیں۔ میں ایک گن آپ کو دوں گا اور مجھے یقین ہے کہ آپ گن کا استعمال بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔'' وہ معنی خیز انداز میں میری طرف دیکھنے لگا۔

میں نے کہا۔ ''لیکن... ریشمی اور تم، ہم تک کیسے پہنچو گے؟''

''پاک بہن کو ڈیرے کے اندرونی حصے سے نکالنا بہت مشکل ہے لیکن جب وہ کان چھدوانے کے لیے یہاں ہمارے پاس اس کمرے میں ہوگی تو یہاں سے اس کے لیے نکلنا آسان ہوگا۔ میرے ذہن میں ایک پلان ہے۔'' اس کی چمکدار کشادہ پیشانی پر سوچ کی لکیریں تھیں۔ وہ تیزی سے دماغ دوڑا رہا تھا۔

اپنی پلاننگ کے بارے میں بتاتے ہوئے اس نے جو کہا وہ مختصراً یوں تھا۔ کل ساڑھے آٹھ بجے کے لگ بھگ ڈاکٹر ارم نے ریشمی کو یہاں اپنے پاس بلانا تھا۔ یہاں اس نے ڈاکٹر ارم والا لباس پہننا تھا اور رضوان کے ہمراہ یہاں سے نکل کر چوبی پل کی طرف روانہ ہو جانا تھا۔ ڈاکٹر ارم کام کرتے وقت کبھی کبھی اپنا چہرہ سرجیکل ماسک میں بھی چھپاتی تھی اس لیے وہ ماسک ریشمی کی شناخت چھپا سکتا تھا۔ ریشمی اور رضوان کے نکلنے کے فوراً بعد ڈاکٹر ارم کو ایک دوسرے راستے سے پل تک پہنچ جانا تھا۔ اس دوسرے راستے پر محافظ ملنگوں سے مڈبھیڑ ہو سکتی تھی مگر ڈاکٹر ارم کے راستے میں ان کی کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ رضوان کا کہنا تھا کہ لکڑی کا وہ پل ہی واحد راستہ ہے جو انہیں اس ملنگی ڈیرے کی بے رحم سنگین دیواروں سے نکال سکتا ہے۔

اب میرے ذہن میں دو سوال تھے۔ ایک تو انیق کا۔ دوسرا گمشدہ نوری کا۔ میں نے رضوان اور ڈاکٹر ارم سے پوچھا۔ ان دونوں کو بھی نوری کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا۔ ہاں انیق کے بارے میں رضوان اچھی طرح جانتا تھا اور اس سے ملاقات بھی کر چکا تھا۔ میں نے اسے انیق کے بارے میں کچھ ضروری ہدایات دیں۔ وہ بولا۔ ''میں کل دوپہر سے پہلے اس سے مل کر اسے ساری پلاننگ سے آگاہ کر دوں گا۔''

ہمارے درمیان کچھ مزید گفتگو ہوئی پھر دروازے پر دستک ہو گئی۔ جہاناں مجھے لینے کے لیے آ گیا تھا۔

☆☆☆

رات کے بارہ بج چکے تھے۔ تاجور سو چکی تھی۔ چاچا رزاق میرے والے حجرے میں ہی بیٹھے تھے۔ چاچا رزاق کی آنکھوں میں ابھی تک دوا سے پیدا ہونے والی غنودگی موجود تھی۔ ہم نے پتھریلی دیوار سے ٹیک لگا رکھی تھی اور گھٹنوں تک کمبل لیے ہوئے تھے۔ میں نے چاچا رزاق کو ساری صورتِ حال سے آگاہ کر دیا تھا۔ اگلے چوبیس گھنٹے ہمارے لیے بڑے ہیجان خیز ثابت ہونے والے تھے۔ ہم یہاں سے نکل بھی سکتے تھے اور کسی بہت بڑی مصیبت کا

شکار بھی ہو سکتے تھے۔ بہرحال جو کچھ ہو رہا تھا، بروقت ہو رہا تھا اگر اس میں تاخیر ہوتی تو پھر ریشمی "پردے والی سرکار" کے حرم میں داخل ہو جاتی، دوسرے لفظوں میں ہمیشہ کے لیے ملنگی ڈیرے کی کنیز بن جاتی۔

چاچا رزاق کسی گہری سوچ میں نظر آتے تھے۔ آج ان پر عجیب سا موڈ طاری ہو گیا تھا۔ کھوئی کھوئی آواز میں کہنے لگے۔ "میں بڑا کامیاب گول کیپر تھا۔ اگر یہ چوٹ نہ لگی ہوتی تو بہت آگے جاتا تھا میں نے۔ میرے کوچ مجھے ہیرو ڈیفنڈر کہتے تھے، ڈیفنڈر کو اردو میں کیا کہیں گے؟ بچانے والا؟"

"ہاں... بچانے والا۔ دفاع کرنے والا۔"

"بالکل، میں دفاع کرنے والا تھا اور گول کیپر دفاع کرنے والا ہی تو ہوتا ہے۔ وہ کبھی کسی پر حملہ نہیں کرتا۔ بس، حملہ کرنے والوں کو روکتا ہی ہے۔ سامنے والی ٹیم کے فارورڈز ہر وقت طوفانی رفتار سے اس کی طرف آتے رہتے ہیں۔ ان کی آنکھوں میں آگ ہوتی ہے۔ پنڈے میں جیسے بجلیاں بھری ہوتی ہیں۔ گول کیپر نے انہیں روکنا ہوتا ہے۔ دفاع کرنا ہوتا ہے۔"

انہوں نے چند لمحے توقف کیا اور گمبھیر آواز میں بولے۔ "میں کھیل کے میدان سے باہر بھی اپنی پوری زندگی میں بس دفاع ہی کرتا رہا ہوں۔ اپنی خراب ٹانگ کا دفاع۔ اپنی اللہ بخشے ماں کا دفاع، جسے میرا سخت باپ مار کر گھر سے نکال دینا چاہتا تھا۔ اپنے تین مرلے کے گھر کا دفاع جسے پٹواری کا رشتے دار ہضم کرنا چاہتا تھا۔ اپنی بیٹی کا دفاع جسے وہ ظالم جابر بیچا کر گیا تھا اور اپنے گاؤں کا دفاع۔ ہاں کچھ عرصہ ایک توڑے دار بندوق کے ساتھ اپنے گاؤں کی چوکیداری بھی کی تھی میں نے۔ گول کیپر تھا نا...... گول کیپر بس دفاع ہی کرتا ہے... کبھی کامیاب ہوتا ہے... کبھی نہیں ہو سکتا..."

اپنی بات ادھوری چھوڑ کر وہ پھر کسی گہری سوچ میں کھو گئے۔ اندھیرے میں، میں دیکھ نہیں سکتا تھا لیکن میں جانتا تھا، ان کی آنکھوں میں بیٹی کا دکھ ہے اور آنسوؤں کی نمی ہے وہ دھیرے دھیرے اپنے پہلو میں رکھی ہاکی کو سہلا رہے تھے۔ کچھ دیر بعد کھوئے کھوئے لہجے میں بولے۔ "شاہ زیب پتر! کبھی کبھی مجھے لگتا ہے جیسے مجھے اپنی زندگی کا آخری میچ کھیلنا ہے۔ ابھی ایک آخری بار مجھے پھر میدان میں آنا ہے۔ میں خیالوں میں دیکھتا ہوں... مخالف ٹیم کے فارورڈ آندھی کی رفتار سے میری طرف آ رہے ہیں۔ ان کے چہرے لال بھبھوکے ہو رہے ہیں۔ ان کی آنکھوں میں شعلے ہیں۔ میں انہیں روک رہا ہوں، گر رہا ہوں، اٹھ رہا ہوں، پھر گر رہا ہوں۔ ان کے سامنے آخری دیوار بنا ہوا ہوں... ہاں، کبھی کبھی مجھے لگتا ہے..."

اچانک دروازے کی طرف قدموں کی چاپ سنائی دی۔ ہم نے مڑ کر دیکھا۔ ٹارچ کی روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ یہ دو افراد تھے۔ آگے رضوان تھا۔ اس کے عقب میں مسلح ملنگ پہرے دار چلا آ رہا تھا۔ اس چیمبر یعنی جنگلارے کے اندر آنے والے پہرے داروں کے پاس آتشیں اسلحہ نہیں ہوتا تھا، وہ عموماً بڑے سائز کی لاٹھی سے مسلح ہوتے تھے۔ رضوان کے ہاتھ میں ایک بیگ تھا...... بعد میں پتا چلا اس میں مرہم پٹی کا سامان تھا۔ رضوان اندر آ گیا۔ پہرے دار حجرے کے دروازے کے سامنے کچھ فاصلے پر کھڑا رہا۔ رضوان نے ٹارچ کی روشنی میری ٹانگ پر ڈالی اور پوچھا۔ "اب کیسا لگ رہا ہے تمہیں؟ خون رکا یا نہیں؟"

"خود ہی دیکھ لو۔" میں نے کراہتی ہوئی سی آواز میں کہا۔

"خون تو آ رہا ہے۔" اس نے کہا اور پٹی کے بل کھولنے میں مصروف ہو گیا۔

پہرے دار ایک دوسرے شخص کی طرف متوجہ تھا۔ رضوان نے تیز سرگوشی میں کہا۔ "گڑبڑ ہو گئی ہے جی، سارا پلان الٹ پلٹ ہو گیا ہے۔ اب ہم کل تک انتظار نہیں کر سکتے۔ ہمیں جو کرنا ہے ابھی کرنا ہو گا۔" اس کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔

"کیوں کیا ہوا؟"

"وہ حرام زادی کسی صورت نہیں مان رہی تھی۔ مجاوروں کو بتانے کی دھمکیاں دے رہی تھی۔ میں نے اسے بے ہوش کر کے باتھ روم میں بند کر دیا ہے۔"

"بے ہوش کر دیا ہے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"جی ہاں، اس کے سوا چارہ نہیں تھا۔ میں نے اس کے سر پر لوہے کے راڈ سے دو تین چوٹیں لگائی ہیں۔ ہاتھ پیر بھی باندھ دیے ہیں۔ صبح تک تو یہ بات چھپی رہے گی مگر پھر سب کو پتا چل جائے گا کہ ڈاکٹر کے ساتھ کیا ہو چکا ہے۔ ہمیں دن چڑھنے سے پہلے پہلے یہاں سے نکلنا ہو گا۔" اس کے ساتھ ہی رضوان نے اپنے لبادے کے اندر سے ایک چھوٹی نال والی آٹومیٹک رائفل نکالی اور تکیے کے پیچھے چھپا دی۔ دو اڑھائی والے تھیلے میں ایک اضافی میگزین اور فالتو راؤنڈ بھی تھے۔ وہ بھی اس نے تکیے کے نیچے گھسیڑ دیے۔ یہ

دواؤں والا تھیلا ایک طرح سے ''ایمونیشن'' بیگ تھا۔

''اب کیا کرنا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔ بہر حال میں یہاں سے نکلنے کے بعد باہر کھڑے پہرے داروں کا دھیان بٹانے کی کوشش کرتا ہوں۔ آپ چابی سے دروازہ کھول کر باہر نکلیں اور اپنے طور پر کلینک تک پہنچنے کی کوشش کریں۔''

''ٹھیک ہے۔ ہم کتنی دیر تک یہاں سے نکلیں؟''

''میرے نکلنے کے قریباً تین چار منٹ بعد۔ اگر کوئی مزاحمت ہو تو پھر آپ بھی گولی چلا دیں۔ اس کے سوا اب کوئی چارہ نہیں ہے۔ اس الو کی پٹھی نے سارے منصوبے کا بیڑا غرق کر دیا ہے۔ اب میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے، میں جاتا ہوں۔''

رضوان نے جلدی جلدی دوائیں سمیٹیں اور اٹھ کھڑا ہوا۔ چاچا رزاق کے چہرے پر بھی ہیجان نظر آنے لگا تھا۔ رضوان کے جانے کے بعد میں نے جلدی جلدی رائفل چیک کی۔ یہ روسی ساخت کی کلاشنکوف تھی۔ میں اسے پہلے بھی استعمال کر چکا تھا۔ فالتو راؤنڈ میں نے اپنے چولے کی طویل پاکٹ میں ڈالے اور دوسرے حجرے میں جا کر تاجور کو جگا دیا۔

وہ ہڑبڑا کر بولی۔ ''کیا ہوا؟''

میں نے کہا۔ ''ابھی تو کچھ نہیں ہوا مگر ہونے والا ہے۔ ہم یہاں سے نکل رہے ہیں۔''

''آ... آپ تو کل یا پرسوں کا کہہ رہے تھے؟''

''نہیں، اب پروگرام چینج ہوا ہے ہمیں ابھی یہ جگہ چھوڑنا ہوگی۔''

''اور ریشمی؟''

''اس کو بھی دیکھ لیتے ہیں۔'' میں نے تیزی سے کہا۔

''شاہ زیب! مجھے ڈر لگ رہا ہے۔''

میں اپنے چہرے پر مسکراہٹ لے آیا۔ پھونک مار کر میں نے اس کے چہرے پر جھولتی ہوئی دولٹوں کو اس کی آنکھوں پر سے ہٹایا اور کہا۔ ''یہ تو پھر وہی گانے والی بات ہوئی... بابا مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ بھئی، جب میں تمہارے ساتھ ہوں تو پھر ڈر کیسا؟''

میرے انداز نے اس کا خوف قدرے کم کیا۔ تھوڑی ہی دیر میں ہم جانے کے لیے تیار تھے۔ جنگلارے میں بیشتر لوگ سوئے پڑے تھے۔ سردی کی وجہ سے حجروں کے دروازے بند تھے۔ ہم تینوں نکلے اور نکاسی والے دروازے کی طرف بڑھے۔ اب جو کچھ بھی کرنا تھا رسک لے کر ہی کرنا تھا۔ میرے کمبل کے نیچے رائفل بالکل تیار حالت میں موجود تھی۔ میں نے وزنی دروازے کی چابی نکالی اور اسے آہنی قفل میں ڈال کر ہولے سے گھمایا۔ دوسری تیسری کوشش پر چابی گھوم گئی۔ میں نے دھکیلا تو دوازہ کھل گیا۔ لگتا تھا کہ رضوان کو اپنے مقصد میں کامیابی ہوئی ہے۔ وہ مسلح پہرے داروں کو کسی بہانے دروازے کے سامنے سے ہٹانے میں کامیاب ہوا تھا۔

باہر نکلنے کے بعد میں نے دوازے کو دوبارہ بھیڑ دیا۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے دروازے پر باہر کی طرف اس طرح پتھروں کے ٹکڑے جوڑے گئے تھے کہ یہ مختصر دروازہ دیوار کا حصہ ہی محسوس ہوتا تھا۔ میں نے سوراخ میں چابی گھما کر اسے دوبارہ لاک بھی کر دیا۔

ہم آگے پیچھے چلتے اس راہداری کی طرف بڑھے جو ڈاکٹر ارم کے ٹھکانے کی طرف جاتی تھی۔ چند گھنٹے پہلے جب میں اسٹریچر پر یہاں سے گزرا تھا تو میں نے اپنی بند آنکھوں میں جھری رکھی تھی اور راستے کو دیکھتا رہا تھا۔ میں آگے تھا۔ میرے پیچھے چاچا رزاق اپنی ہاکی ٹیکتے آرہے تھے، آخر میں تاجور تھی۔ میری انگلی رائفل کی لبلبی پر تھی اور میں کسی بھی وقت اسے حرکت دے کر سامنے آنے والے شخص پر آگ برسا سکتا تھا۔ ایمونیشن والا تھیلا بھی میں نے کندھے سے لٹکا کر چولے کے نیچے چھپا لیا تھا۔

اچانک ایک موڑ پر ایک پہرے دار سامنے آگیا۔ وہ حیرت سے ہماری طرف دیکھنے لگا۔ چند سیکنڈ کے لیے اس کی سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ وہ کیا دیکھ رہا ہے اور اسے کیا کرنا چاہیے۔ یہ وقت میرے لیے ضرورت سے کافی زیادہ تھا۔ میں نے اس کی کنپٹی پر رائفل کے دستے کا بھرپور وار کیا۔ وہ بغیر کوئی آواز نکالے، کٹے ہوئے شہتیر کی طرح زمین بوس ہو گیا مگر میں نے اسے زمین بوس نہیں ہونے دیا اور ہاتھوں پر سہار کر ایک طرف تاریک گوشے میں ڈال دیا۔ اس کی رائفل میں نے کندھے سے اتار لی۔ ایک طرف بوسیدہ سی چٹائی پڑی تھی۔ تاجور نے اسے چٹائی سے ڈھانپ دیا۔ اب فوری طور پر اسے دیکھے جانے کا خدشہ نہیں تھا۔ کچھ ہی دیر بعد ہم کلینک والے دروازے کے سامنے تھے۔ مجھے ہرگز ....توقع نہیں تھی کہ ہم اتنی آسانی سے ڈاکٹر روم تک پہنچ جائیں گے۔ غالباً اس آسانی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی اور یہاں سیکیورٹی کی چوکسی کا لیول کم ہو چکا تھا۔ دروازہ کھلا تھا، ہم اندر چلے گئے مختلف دواؤں کی تیز بو ہمارے نتھنوں میں گھسی۔

"یہاں تو کوئی نہیں ہے۔" تاجور نے سرگوشی کی۔

"ہے... کم از کم ایک تو ہے۔" میں نے کہا اور آگے بڑھ کر احتیاط سے واش روم کا دروازہ کھولا۔

میری توقع کے عین مطابق ڈاکٹر ارم فرش پر بے سدھ پڑی تھی۔ اس کے سر سے بہنے والا خون گیلے فرش پر پھیلا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں بندھے تھے اور وہ ابھی تک بے ہوش تھی۔ اسی دوران میں رضوان بھی ہانپتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔

"آپ خیریت سے تو ہیں؟"

"تمہارے سامنے کھڑے ہیں۔" میں نے کہا۔

"بس راستے میں ایک، چولے والا سائڈ ہیرو ملا تھا۔ اسے انٹاغفیل کر کے ڈال آئے ہیں۔"

"کہاں؟"

"جہاں سے تم گزر کر آئے ہو۔ اگر تمہیں نظر نہیں آیا تو اس کا مطلب ہے کہ اوروں کو بھی جلدی دکھائی نہیں دے گا۔"

وہ بولا۔ "ڈیڑھ بج چکا ہے۔ روشنی ہونے میں بہت زیادہ وقت نہیں ہے۔ ہمیں جو کرنا ہے، اجالا ہونے سے پہلے کرنا ہے۔"

"اور کیا کرنا ہے؟" میں نے پوچھا۔

وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر سوچنے لگا۔ پیشانی پر پسینے کی نمی تھی۔ بے شک وہ یہاں سے نکلنے کے لیے ہمت اور جرأت کا ثبوت دے رہا تھا۔ مگر میں بھانپ چکا تھا کہ وہ مار دھاڑ والا شخص نہیں ہے۔ اسلحے سے بھی اس کو بس واجبی سی واقفیت تھی۔ وہ دوسری رائفل دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ یہ اس پہرے دار کی ہے، جسے ہم نے راستے میں گرایا ہے۔

وہ بولا۔ "پاک بہن کے لیے ہماری پلاننگ تو یہ تھی کہ کل جب وہ کان چھدوانے کے لیے یہاں آئے تو ہم اسے یہاں سے لے نکلیں۔ مگر اب تو ایسا نہیں ہو سکتا۔ اب اسے "سایہ" کے اندرونی حصے سے نکالنا ایک بہت مشکل کام ہے۔"

میں نے کہا۔ "مشکل کام کرنے کے لیے ہی تو ہم یہاں آئے ہیں۔ تم مجھے صرف راستہ سمجھاؤ اور یہ بتاؤ کہ راستے میں کس کس سے مڈبھیڑ ہو سکتی ہے۔ باقی کام مجھ پر چھوڑ دو۔ میں پاک بہن کو وہاں سے نکال لوں گا۔"

"شاہ زیب بھائی! مجھے یہ کام کافی مشکل نظر آتا ہے۔ معاف کیجیے آپ کی جان جا سکتی ہے۔"

"جان تو ویسے بھی جا سکتی ہے۔ اب ہم قدم اٹھا چکے ہیں۔ تم ڈاکٹر ارم کے ساتھ فل ٹکر لے چکے ہو، اور ہم جنگلارے کی جیل توڑ کر نکل آئے ہیں۔ اب تو جو ہونا ہے، وہ ہونا ہے۔"

اس نے ایک بار پھر خشک لبوں پر زبان پھیری۔

"آپ کا کیا خیال ہے، جنگلارے میں آپ کی غیر موجودگی کب تک راز رہے گی؟"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ ہاں باہر نکلنے کے بعد میں نے تالے میں چابی گھما کر اسے پھر لاک ضرور کر دیا تھا۔"

"یہ تو آپ نے واقعی بہت اچھا کیا۔ کوئی اور ہوتا تو شاید افراتفری میں یہ نہ کر سکتا۔ اب امید ہے کہ صبح سات بجے تک تو آپ کا فرار راز ہی رہے گا۔"

"شرط یہ ہے کہ جس پہرے دار کو چٹائی کے نیچے چھپایا ہے وہ نیچے ہی رہے۔" تاجور نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔

رضوان نے کہا۔ "سب سے پہلے تو آپ تینوں کو جنگلارے والے لباس سے نجات حاصل کرنا ہوگی اور بھائی، اگر آپ "سائے" کے اندرونی حصے کی طرف جانا چاہتے ہیں تو بھی آپ کا لباس بدلنا بہت ضروری ہے۔ بلکہ میری تو رائے ہے کہ آپ میرے والے کپڑے پہن لیں۔ سائز میں تھوڑا بہت فرق ہوگا مگر کام چل جائے گا۔" رضوان اب پینٹ شرٹ کے بجائے گہرے نیلے چولے اور پاجامے میں تھا۔ گلے میں صافہ ڈال رکھا تھا۔

ہم تینوں نے تیزی سے حرکت کی اور جنگلارے والے "خطرناک زرد پٹی لباس" سے نجات حاصل کر لی۔ تاجور پر ڈاکٹر ارم کے کپڑے بالکل صحیح آئے۔ میرے لیے رضوان والا چغا اور ٹراؤزر تھوڑا چھوٹا تھا مگر کام چل گیا۔ میں نے گلے میں مالائیں ڈال لیں اور سر پر صافہ نما چادر رکھ لی، چاچا رزاق نے بھی رضوان کا ایک جوڑا پہن لیا۔ پہلے والے کپڑے اسٹور روم میں چھپا دیے گئے۔

ڈاکٹر ارم ابھی تک بے ہوش تھی۔ میں نے رضوان سے کہا کہ وہ مجھے "سائے" کے اندرونی حصے کا نقشہ سمجھائے اور دیگر تفصیل بتائے۔ اس نے کاغذ قلم سنبھال لیا مگر چہرے پر شدید تذبذب نظر آ رہا تھا۔ اس نے ایک نظر چاچا رزاق کی طرف دیکھا، پھر مجھے لے کر تھوڑی دور چلا گیا۔ سرگوشی میں بولا۔ "بھائی، میں آپ کو اپنے دل کی بات بتا رہا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس وقت اگر ہم نے پاک بہن کو یہاں سے نکالنے کی کوشش کی تو... شاید... ہم سب ماریں

جائیں گے۔ اگر ہم دل کے بجائے دماغ سے سوچیں تو پھر بہتر راستہ یہ ہے کہ ابھی... وقتی طور پر... پاک بہن کا خیال دل سے نکال دیں۔''

''تمہارا مطلب ہے اس کے بغیر یہاں سے نکلنے کی کوشش کریں۔''

''بالکل... اگر ہم بچ کر نکل گئے تو پھر اس کے لیے بھی بہت کچھ کرسکیں گے ورنہ...''

''نہیں رضوان۔'' میں نے اس کی بات کاٹی۔ ''اس کی جان اور عزت دونوں خطرے میں ہیں۔ اگر ہم اسے چھوڑ کر نکلیں گے تو پھر... اسے جان بچا کر بھاگنا ہی کہیں گے۔ اب جو ہوگا، ہم سب کے ساتھ ہوگا۔''

''آپ... مجھے... ڈرپوک تو نہیں سمجھ رہے؟''

''یہ بالکل غیر ضروری سوال کیا ہے تم نے۔ اگر تم ڈرپوک ہوتے تو اس طرح کی کارروائی کی پلاننگ ہی نہ کرتے۔ پلاننگ خراب ہوگئی ہے، صرف اس لیے کہ تم دوسری طرح سوچنے پر مجبور ہو رہے ہو۔''

اس نے ایک گہری سانس لی اور جیسے ہر طرح کے اندیشے ذہن سے نکال کر کاغذ پر جھک گیا۔ وہ مجھے ملنگی ڈیرے کے اس اندرونی حصے کی تفصیل بتا رہا تھا، جہاں پاک بہن یعنی ریشمی موجود تھی۔ یہ راہداریوں اور چوکور کشادہ جگہوں کا ایک سلسلہ تھا۔ آگے جا کر آٹھ دس قالین پوش زینے آتے تھے۔ یہ زینے طے کر کے میں سایہ نامی جگہ کے اس خاص الخاص حصے میں داخل ہو جاتا جہاں پردے والی سرکار، اس کی بیویوں اور مجاوروں سے میری مڈبھیڑ ہوسکتی ہے۔

نقشے کو پوری طرح سمجھنے کے بعد میں نے تاجور اور چاچا رزاق کو تیار رہنے کی ہدایت کی اور خود آگے جانے کو تیار ہو گیا۔ تاجور کا رنگ اُڑا ہوا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اگلے آدھے گھنٹے میں میرے ساتھ کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ وہ منمنائی۔ ''شاہ زیب! اگر آپ کو کچھ ہو گیا تو... مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔''

''اب رسک تو لینے ہی پڑیں گے تاجور۔''

''اگر... انہوں نے آپ کو گھیر لیا تو، آپ گرفتاری دے دینا، اگر جان بچی رہے گی... تو ہم پھر... کوئی کوشش کرسکیں گے۔''

میں اسے تسلی بخش نظروں سے دیکھ کر آگے بڑھ گیا۔ کلینک کے چھوٹے اندرونی دروازے سے گزر کر میں ایک نیم تاریک راہداری میں داخل ہوا، یہاں بھی چھت زیادہ بلند نہیں تھی بمشکل ساڑھے سات فٹ اونچی رہی ہوگی۔ میرے پاؤں ننگے تھے۔ ہلکی پھلکی لیکن طاقتور رائفل میرے بائیں ہاتھ میں تھی اور ہاتھ نیلگوں شال کے نیچے تھے۔ راہداری میں داخل ہوتے ہی مجھے اس بھینی بھینی مدھر خوشبو کا احساس ہوا جس کا تذکرہ تاجور نے کیا تھا۔ یہ ساری جگہ جیسے اس معطر خوشبو میں بسی ہوئی تھی۔ جوں جوں میں آگے بڑھتا گیا، سردی کی شدت ایک خوشگوار حرارت میں بدلتی گئی۔ تاجور نے بتایا تھا کہ یہاں ہر وقت بڑی بڑی انگیٹھیاں دہکتی رہتی ہیں۔ جلد ہی مجھے ایک ایسی انگیٹھی دکھائی بھی دے گئی۔ یہ لوہے کی تین چار فٹ اونچی انگیٹھی ایک موڑ پر رکھی تھی۔ قریب ہی ایک پہرے دار کھڑا ہاتھ تاپ رہا تھا۔ اس کا رخ مخالف سمت میں تھا۔ میں پنجوں کے بل بے آواز چلتا اس کے سر پر پہنچا۔ رائفل کے دستے سے بہترین ضرب لگانے کے لیے میرے پاس کافی ٹائم موجود تھا۔ میں نے پہرے دار کی گدی کے نازک مقام کو نشانہ بنایا۔ بڑی پرفیکٹ ضرب تھی۔ اس کے گرنے سے پہلے ہی میں نے اسے بازو پر سہارا لیا اور فرش پر لٹا دیا۔ بہر حال بند جگہ پر چوٹ کی آواز گونجی تھی اور پہرے دار نے ہلکی سی کراہ بھی خارج کی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک اوٹ سے ایک اور پہرے دار برآمد ہوا۔ مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر حیرت کی یلغار ہوئی۔ اس نے پھرتی سے اپنی رائفل کندھے سے اتارنا چاہی۔ تب تک میں اس کی کمر کے گرد اپنے بازوؤں کا حلقہ قائم کر چکا تھا۔ میں نے اسے تیزی سے اوپر اٹھایا، اسے پتا ہی نہیں چلا ہوگا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ اس کے سر اور پتھریلی چھت کا زوردار تصادم ہوا اور اس کی گردن ڈھلک گئی۔ میں نے احتیاط سے اسے بھی انگیٹھی کے قریب لٹا دیا۔ مجھے اس کی کمر کے ساتھ چمڑے کے غلاف میں ایک خنجر بندھا نظر آیا۔ میں نے یہ خم دار خنجر... غلاف سمیت اس کی کمر سے کھول کر اپنی کمر سے باندھ لیا۔ دوسرے پہرے دار کی رائفل بالکل اسی رائفل کی طرح تھی جو میرے پاس تھی۔ میں نے اس رائفل کا میگزین اتار کر اپنے چولے کی طویل جیب میں ڈال لیا۔ دونوں رائفلوں کو انگیٹھی کے عقب میں اس طرح کھڑا کر دیا کہ وہ فوراً نظر نہ آئیں۔ دونوں پہرے دار انگیٹھی کے قریب یوں پہلو بہ پہلو لیٹے تھے جیسے خوشگوار حرارت کے سبب سو گئے ہوں۔ ہاں غور سے دیکھنے پر دوسرے پہرے دار کے سر سے رستا ہوا خون نظر آسکتا تھا۔

اندازہ ہوا کہ یہاں آس پاس کوئی اور موجود نہیں۔

اگر ہوتا تو اب تک رونمائی کرا چکا ہوتا۔ میں مزید آگے بڑھا۔ ان ساری راہداریوں میں برقی روشنی موجود تھی۔ رات کا آخری پہر تھا، اس لیے بہت سے بلب بجھا دیے گئے تھے۔ میرے پاس وہ نقشے والا کاغذ موجود تھا۔ جہاں کنفیوژن ہوتی تھی، میں کاغذ دیکھ لیتا تھا۔ جلد ہی مجھے کشادہ قالین پوش زینے نظر آگئے۔ پاس ہی کہیں باتوں کی بھنبھناہٹ سنائی دی۔ میں دیوار سے لگ گیا اور سننے لگا۔ دونوں پہرے دار بڑے رومانی موڈ میں تھے اور محبت کی باتیں کررہے تھے۔ یہ دراصل میل اور فی میل پہرے دار تھے۔ میل نے شاید کوئی چھیڑ خانی کی۔ فی میل جو یقیناً جواں سال عورت تھی۔ جھنجلا کر بولی۔ ”دیکھو یہ تم ٹھیک نہیں کررہے، میں کرنالی جی سے شکایت کروں گی۔“

”تمہیں پتا ہے، اس میں تمہارا ہی نقصان ہوگا۔ تمہیں کہیں اور بھیج دیا جائے گا۔ جہاں سائے جیسی عیاشیاں نہیں ملیں گی تمہیں۔“ مرد پہرے دار نے بے پروائی سے کہا۔

لگتا تھا فی میل پہرے دار اس کی ماتحت ہے اور وہ اس کو ہراساں کررہا ہے۔

”لیکن کوئی حد بھی ہوتی ہے جیدے! ہم اس وقت ڈیوٹی دے رہے ہیں۔“ عورت پھر جھنجلائے ہوئے لہجے میں بولی۔

”اچھا چلو معاف کرو، لیکن... کل تو ڈیوٹی نہیں ہے۔ کل آجانا۔ رات کے کھانے کے بعد۔“ وہ ڈھیٹ پن سے بولا۔

انہوں نے تھوڑی دیر اسی طرح کی باتیں کیں۔ پھر ان کی آواز مدھم ہوگئی۔ وہ آگے نکل گئے تھے۔ میں نے اوٹ سے دیکھا۔ وہ سیڑھیوں کی طرف جارہے تھے۔ جواں سال عورت بھرے بھرے جسم والی ملنگنی تھی۔ اس نے پہرے داروں والا گہرے نیلے رنگ کا چولا پہن رکھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں لٹھ تھا جبکہ مرد پہرے دار رائفل سے مسلح تھا۔ میں نے تقریباً ایک منٹ انتظار کیا پھر خود بھی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آگیا۔ یہاں بہت سے حجرے نظر آرہے تھے۔ راہداریاں بھی تھیں جن میں نیلگوں بلب روشن تھے۔ یہاں پہنچ کر مجھے گانے کی مدھم آواز سنائی دی۔ کوئی لڑکی بڑے مدھر سُروں میں گا رہی تھی۔ رات کے اس سناٹے میں اس کی آواز ان سنگی دیواروں میں تواتر سے ڈوب ابھر رہی تھی۔ مجھے یہ سمجھنے میں زیادہ دیر نہیں لگی کہ یہ ریشمی کی آواز ہے، عجیب سوز تھا، عجیب درد تھا۔ الفاظ سمجھ

میں نہیں آ رہے تھے مگر وہ جو کچھ بھی پڑھ رہی تھی، دل پر اثر کرنے والا تھا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا یہ پنجابی زبان کی کوئی کافی تھی جس میں جدائی کا ذکر تھا۔ فاصلوں کا ذکر تھا اور روح کی تڑپ کا ماجرا تھا۔ دنیا کی ستم ظریفی سے روح اور جسم ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے ہیں اور انہونی کی تلاش میں انتظار کے اندھے غاروں میں بھٹکنے لگتے ہیں۔

اتنا درد کیوں تھا اس کی آواز میں، شاید اس لیے کہ اس نے بھی کبھی کسی سے پیار کیا تھا۔ اس کی کنواری آنکھوں میں سپنے اترے تھے مگر وہ کسی اور کی ڈولی میں بیٹھ گئی تھی۔ ایک ایسا سنگ دل شریکِ حیات جس نے اسے لاہور کی گلیوں میں رسوا کیا اور توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔

آواز ملنگی ڈیرے کی ان دیواروں میں گونج رہی تھی اور انوکھا سحر پیدا کر رہی تھی۔ رات کے آخری پہر ابھرنے والی یہ غمناک جادوئی آواز مجھے میری منزل کا پتا بھی دے رہی تھی۔ میں جوں جوں آگے بڑھتا گیا، آواز واضح ہوتی گئی۔ میں بڑی احتیاط سے چلتا اور دیواروں کی اوٹ لیتا جلدی ہی آواز کے ماخذ تک پہنچ گیا۔

میں ایک شفاف راہداری میں کھڑا تھا۔ بالکل جیسے کسی محل یا قلعے کی غلام گردش ہو یہاں بڑی مسحور کن مہک تھی۔ یہ مہک خاص طرح کی اگربتیوں سے خارج ہوتی تھی اور در و دیوار کو معطر کرتی تھی۔ ایک جانب لوہے کی ایک بڑی انگیٹھی میں ادھ بجھے انگارے موجود تھے۔ میں نے شیشم کے خوب صورت دروازے پر ایک انگلی سے مدھم دستک دی۔ گانے کی آواز معدوم ہو گئی۔ دوسری دستک پر کسی نے پوچھا۔ ''کون ہے؟''

بے شک یہ ریشمی ہی کی آواز تھی۔ وہ دروازے کے بالکل پاس سے بول رہی تھی۔ میں نے دروازے سے منہ لگایا اور مدھم سرسراتی آواز میں کہا۔ ''شاہ زیب۔''

''کون؟'' پھر پوچھا گیا۔

''شاہ زیب۔'' میں نے اسی طرح سرگوشی میں جواب دیا۔

دروازہ کھل گیا۔ سامنے ریشمی تصویر حیرت بنی کھڑی تھی۔ اس حیرت میں نمایاں طور پر خوف کی آمیزش بھی تھی۔ میں جلدی سے اندر چلا گیا۔ ریشمی نے دروازہ اندر سے بولٹ کیا اور گھبرائی ہوئی میری طرف پلٹی۔ ''آ... آپ یہاں؟''

''ہاں ریشمی، سارا پروگرام پلٹ گیا ہے۔ اب ہمارے پاس صرف دو ڈھائی گھنٹے ہیں ہمیں اسی وقت یہاں سے نکلنا ہو گا۔''

اس نے میرے ہاتھ میں رائفل دیکھ لی تھی اور یہ بھی سمجھ گئی تھی کہ میں ہر خطرے کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہو کر آیا ہوں۔

اس سے پہلے کہ وہ جواب میں کچھ کہتی، راہداری میں بھاگتے قدموں کی آواز آئی۔ اس کے ساتھ ہی دروازے کھٹکھٹائے جانے لگے اور پہرے داروں کی بلند آوازیں سنائی دیں۔ چند لمحے بعد ریشمی کے حجرے والا دروازہ بھی کھٹکھٹایا گیا۔ ریشمی نے دائیں بائیں دیکھا۔ ایک قدِ آدم الماری کے پیچھے خلا موجود تھا۔ میں اس خلا میں چلا گیا۔ ریشمی نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ کسی پہرے دار نے بھاری آواز میں پوچھا۔ ''پاک بہن! آپ خیریت سے ہیں؟''

''ہاں میں ٹھیک ہوں، کیا ہوا؟'' ریشمی نے پوچھا۔ اس کی آواز کی لرزش میں صاف محسوس کر رہا تھا۔

''کوئی شخص یہاں گھس آیا ہے۔ اس کے پاس رائفل بھی ہے۔ خطرناک بندہ ہے۔ آپ دروازہ اندر سے بند کریں اور آواز پہچانے بغیر نہیں کھولیں۔''

''ٹھیک ہے۔'' ریشمی نے اثبات میں جواب دیا اور دروازہ پھر اندر سے بولٹ کر دیا۔ اس کے گہرے نیلے کپڑے شکن شکن تھے۔ بال بھی بڑی حد تک منتشر نظر آتے تھے۔ آنکھیں ورم زدہ تھیں۔ وہ جیسے کسی نشہ آور چیز کے زیرِ اثر تھی۔ عجیب کھوئی کھوئی آواز میں بولی۔ ''میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا، یہاں کیا ہو رہا ہے۔ مجھے بس ایک فکر ہے، میرے اباجی اور میری نکی کی جان بچ جائے۔ بھائی، آپ یہاں کیوں آئے ہو، آپ کو یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔''

میں نے کہا۔ ''ریشمی! تم خود کو سنبھالو، تمہارے اباجی اور تاجور یہاں سے نکلیں گے اور تم بھی نکلو گی۔ میں سب ٹھیک کر لوں گا۔''

''مجھے لگتا ہے کہ کچھ ٹھیک نہیں ہو گا۔ سب ختم ہو جائے گا۔ میرے دل میں عجیب وسوسے آ رہے ہیں۔ میں دو دن سے بہت زیادہ پریشان ہوں۔ ایک ہی چیز بار بار میرے دماغ میں آ رہی ہے۔ بار بار آ رہی ہے۔'' اس نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھاما اور گدے پر گر سی گئی۔ اس کی پشت دیوار سے ٹکی ہوئی تھی۔

مجھے لگا کہ وہ سوئی ہوئی سی کیفیت میں ہے۔ شاید یہی کیفیت تھی جس میں وہ رات کے اس پہر جاگ رہی تھی اور گا رہی تھی۔

''کیا چیز بار بار تمہارے دماغ میں آرہی ہے؟'' میں نے دریافت کیا۔

''آپ نہیں سمجھ پائیں گے۔ میرا مذاق اُڑائیں گے...کوئی نہیں سمجھے گا۔''

''تم بتاؤ تو سہی۔'' میں نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

وہ بولی۔ ''میں نے ایک آواز سنی ہے۔ وہی آواز جو چاند گڑھی میں آتی تھی۔ یہ چاند گڑھی والی آواز ہی ہے۔''

''کیسی آواز؟''

''میں آپ کو نہیں بتا سکتی لیکن مجھے لگتا ہے کہ... میں پہچان گئی ہوں۔ اگر وہ...''

لیکا یک دروازے پر پھر دستک ہوئی اور ریشمی کی بات ادھوری رہ گئی۔ وہ پھر خوف زدہ نظروں سے دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔ ''کون ہے؟'' اس نے لرزاں آواز میں پوچھا۔

''دروازہ کھولو پاک بہن۔'' دوسری طرف سے اسی پہرے دار کی آواز آئی۔

میں نے رائفل اٹھائی اور جلدی سے واپس الماری کی اوٹ میں چلا گیا۔ ریشمی نے ایک بلب بجھا دیا تاکہ کمرے میں روشنی کم ہوجائے۔ اس کا رنگ ہلدی ہورہا تھا۔ آگے بڑھ کر اس نے دروازہ کھولا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ دروازے پر ایک سے زائد افراد موجود ہیں۔ پھر کوئی ایک اندر آگیا اور باقی واپس چلے گئے۔

''س...سرکار...آپ یہاں؟'' ریشمی کی آواز میرے کانوں میں گونجی اور میرے جسم میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔

اس ملنگی ڈیرے کا اہم ترین شخص یہاں اس کمرے میں ریشمی کے سامنے موجود تھا۔ غالباً اس نے کوئی قیمتی خوشبو لگا رکھی تھی۔ پھر اس کی بھاری رعب دار آواز میرے کانوں تک پہنچی۔ ''ہاں، میں نے سوچا حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ تمہیں ڈر آرہا ہوگا مجھے تمہارے پاس جانا چاہیے۔''

وہ گدے پر نہیں بیٹھا بلکہ ایک آرام دہ نشست پر ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ میں اب الماری کے تاریک عقبی غلاف سے اسے دیکھ سکتا تھا۔ اس کے گلے میں لکڑی اور قیمتی پتھروں کی کئی مالائیں تھیں۔ ہاتھوں میں بھی جگمگاتی انگوٹھیاں تھیں۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں مجھے کڑے نظر آئے۔ یہ سنہری کڑے سونے کے تھے اور ان پر سبز نگینے جڑے تھے۔ چمکیلے کڑھائی دار سفید لبادے میں وہ دونوں بازو پھیلائے بیٹھا تھا...اور سب سے انوکھی بات وہی تھی جس کا نظارہ میں پہلے بھی دو مرتبہ کرچکا تھا۔ پردے والی سرکار کا چہرہ بدستور سفید گھونگھٹ میں چھپا ہوا تھا۔ یہ ایک چادر سی تھی جو اس طرح وہ اپنے سر پر ڈالے رکھتا تھا کہ سر، چہرہ اور گردن مکمل طور پر اس میں اوجھل ہوجاتے تھے۔ وہ جب دائیں بائیں دیکھتا تھا تو یہ چادر اس طرح جھولتی تھی جیسے سفید ہاتھی کی سونڈ۔

''کھڑکی کا یہ پردہ ٹھیک کردو۔'' پردے والی سرکار نے ریشمی سے کہا۔

وہ اٹھی اور پردہ درست کرکے دوبارہ سفید پوش شخص کے سامنے گدے پر بیٹھ گئی۔ وہ گمبھیر آواز میں ٹھہر ٹھہر کر بولا۔ ''ریشمی، پرسوں تم نے جو بات کہی، وہ ابھی تک میرے دماغ میں چکرا رہی ہے۔ تم نے کہا تھا کہ میری آواز تمہارے گاؤں چاند گڑھی کے کسی شخص سے ملتی ہے۔ وہ وہاں کا کوئی پیر تھا۔ جھاڑ پھونک کرتا تھا۔''

''ج...جی ہاں...مجھے کئی دن سے یہ لگ رہا تھا۔ پھر پرسوں میں نے آپ سے اپنے دل کی بات کہہ دی۔''

''اچھا کیا، دل کی باتیں دل میں نہیں رکھنی چاہئیں۔ دیکھو ریشمی جس طرح شکلوں سے شکلیں ملتی ہیں، آوازوں سے آوازیں بھی ملتی ہیں۔ اب اپنی آواز کو ہی دیکھو، لوگ کہتے ہیں یہ وہی آواز ہے جو ڈھائی تین سو سال پہلے بھی اس ڈیرے پر گونجتی تھی... یہ مستاں مائی کی آواز تھی۔ لوگ دیوانہ وار اس کی طرف کھنچے آتے تھے۔ آج وہی مست کر دینے والی آواز تمہارے گلے میں ہے۔ میں نے تمہاری اس آواز سے بہت سی امیدیں لگائی ہوئی تھیں، لیکن...'' وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

کمرے میں چند سیکنڈ خاموشی رہی۔ اس خاموشی میں بس راہداریوں میں بھاگ دوڑ کرنے والے پہرے داروں کی چاپیں ہی سنائی دیتی تھیں۔ یقیناً یہ لوگ اس ''گھس بیٹھیے'' کو ڈھونڈ رہے تھے، جس نے رات کے آخری پہر یہاں گھس کر دو پہرے داروں کو لہولہان کردیا تھا اور ان کے لیے ایک سخت مصیبت کھڑی کردی تھی۔

چند لمحے بعد پردے والی سرکار نے اپنا ادھورا فقرہ جوڑتے ہوئے کہا۔ ''اس آواز سے بہت سی امیدیں لگائی ہوئی تھیں لیکن اب مجھے لگتا ہے کہ یہ آواز شاید اب میری مدد نہ کرسکے۔''

''میں سمجھی نہیں سرکار جی۔'' ریشمی کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

''غلطی مجھ سے ہی ہوئی ہے۔ مجھے سمجھنا چاہیے تھا کہ کبھی کبھی شکل کے علاوہ آواز بھی مصیبت بن جاتی ہے۔''

''میں آپ کی بات اب بھی سمجھ نہیں پا رہی ہوں۔'' ریشمی نے کہا۔

پردے والی سرکار نے ایک گہری سانس لی۔ ''میرا خیال ہے ریشمی کہ تم بہت تھک گئی ہو۔ پچھلے دنوں کافی پریشان رہی ہو نا۔ اب تم کو آرام کرنا چاہیے۔'' وہ شخص اردو میں بات کر رہا تھا مگر لہجے میں پنجابی کی جھلک موجود تھی۔

ریشمی نے جھجک کر کہا۔ ''آپ آرام کی بات کر رہے ہیں... مگر شادی...؟''

''میں نے ایک اور فیصلہ بھی کیا ہے ریشمی۔'' پردے والی سرکار نے گمبھیر لہجے میں بات کاٹ کر کہا۔ ''میں تمہاری مرضی کے بغیر تم سے شادی نہیں کروں گا۔ بلکہ اب تو دل چاہتا ہے کہ... تم جس طرح دوسروں کے لیے پاک بہن ہو، میرے لیے بھی پاک بہن ہی رہو۔''

''جی... جی؟'' ریشمی پر جیسے حیرت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا۔ ''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟''

''میں نے کہا ہے نا... تم بہت تھک گئی ہو۔ تمہارے جسم اور دماغ کو اب آرام کی ضرورت ہے۔ لمبے آرام کی۔'' پردے والی سرکار نے کہا۔ اس کے انداز میں کچھ جدا سی بات تھی۔

میں نے چونک کر دیکھا۔ آرام دہ نشست پر... چہرے کو گھونگھٹ میں چھپائے بیٹھا، وہ عجیب لگ رہا تھا۔ اس نے اپنا انگشتریوں والا ہاتھ بڑھایا اور ریشمی کے گلے میں ڈال کر اسے اپنے گھٹنوں کے ساتھ لگا لیا۔ وہ ذرا ٹھٹکنے کے بعد اس کے گھٹنوں سے لگ گئی۔

تب میں نے ایک اور منظر دیکھا اور دم بخود رہ گیا۔ مجھے پردے والی سرکار کے ہاتھوں میں موٹی رسی کا ایک ٹکڑا نظر آیا۔ یہ ٹکڑا اس نے دفعتاً ریشمی کے گلے میں لپیٹا اور اسے پورے زور سے کس ڈالا۔ ریشمی کا منہ بے ساختہ کھل گیا۔ اس کا چہرہ خون کے دباؤ سے سرخ ہو گیا۔ وہ چلانے کی کوشش کر رہی تھی مگر ناکام ہو رہی تھی۔ وہ پھول دار گدے پر بری طرح تڑپی۔ اس کا پاؤں لگنے سے ایک چھوٹے سائز کی منقش تپائی دور لڑھک گئی۔ اب میرا بے حرکت رہنا خطرناک تھا۔ میں الماری کی اوٹ سے نکلا اور پردے والی سرکار پر جھپٹا۔ میں نے عقب سے اس کی گردن میں اپنا بازو ڈالا اور ایک خاص انداز میں اس کی شہ رگ کو اپنے شکنجے میں کس لیا۔ اس اچانک افتاد نے اس شخص کو بوکھلا ڈالا۔ ریشمی کی گردن پر سے اس کی گرفت کمزور ہو گئی۔ ریشمی نے تڑپ کر خود کو اس سے چھڑایا اور ایک طرف گر کر بری طرح کھانسنے لگی۔

پردے والی سرکار نے زور مارا۔ مجھے اس شخص سے اتنی شدید مزاحمت کی توقع نہیں تھی۔ کچھ دیر پہلے اس کی آواز سے میں نے اندازہ لگایا تھا کہ اس کی عمر چالیس پینتالیس سال کے لگ بھگ ہوگی مگر اب وہ جس طرح زور مار رہا تھا، مجھے اپنا اندازہ غلط محسوس ہوا تھا اور پھر اس شخص نے وہ کام کیا جس کا مجھے بالکل بھی اندیشہ نہیں تھا۔ اس کا دایاں ہاتھ کہیں اس چرمی غلاف سے چھو گیا تھا جس میں، میں نے خنجر اُڑسا ہوا تھا، اس نے تیز دھار خنجر نکال لیا۔ دستے پر اس کی گرفت مضبوط تھی اور اس کا انگوٹھا دستے کی عقبی جانب تھا۔ وہ اس پوزیشن میں تھا کہ میرے دائیں پہلو کو خطرناک طریقے سے نشانہ بنا سکتا تھا۔ میں نے اسے اس عمل سے روکنے کے لیے اس کی گردن پر دباؤ بڑھایا اور یہیں پر اس شخص سے وہ دوسری غلطی ہوئی جو اس کے لیے بے حد مہلک تھی۔ اس نے خود کو پلٹنے کے لیے زور مارا... اور اس کی گردن کا منکا ٹوٹ گیا۔ یہ آواز بڑی واضح تھی اور اس آواز کا ارتعاش مجھے اپنے بازو کے نیچے ہولناک لگا۔ ایک دم اس شخص کا زور مارتا ہوا جسم ڈھیلا پڑ گیا۔ اس کے دونوں بازو بے جان ہو کر اس کے دونوں پہلوؤں پر لٹک گئے۔ خنجر اس کے ہاتھ سے نکل کر گدے پر گرا۔

ریشمی ابھی تک ابکائیاں لے رہی تھی۔ اس کے بال اس کے چہرے پر منتشر تھے۔ اسے ابھی تک پتا نہیں چلا تھا کہ پچھلے تین چار سیکنڈ میں کتنا بڑا واقعہ ہو چکا ہے۔ اس ملنگی ڈیرے کا اہم ترین شخص اپنی تمام تر شان اور پُراسراریت کے ساتھ موت کی وادی میں اتر چکا ہے...

میں نے پردے والی سرکار کا بے حرکت جسم گدے پر ڈالا۔ وہ اوندھے منہ تھا۔ میں نے اسے سیدھا کیا۔ سفید گھونگھٹ ابھی تک اس کے لمبوترے چہرے پر تھا۔ اب وہ مرحلہ تھا جس کے لیے میرے اندر ایک شدید تجسس مسلسل لہریں لے رہا تھا اور یقیناً یہ تجسس روتی ہچکیاں لیتی ریشمی کے اندر بھی موجود تھا... میں نے ہاتھ بڑھا کر ''پردے والی سرکار'' کا پردہ الٹ دیا۔

چند لمحے کے لیے ہم دونوں سکتہ زدہ رہ گئے۔ ریشمی میں تو شاید اتنی ہمت بھی نہیں رہی تھی کہ وہ چلا سکے۔ ہم حیرت زدہ نظروں سے دیکھ رہے تھے، ہمارے سامنے جو شخص پڑا تھا۔ اس کا چہرہ (اگر اسے چہرہ کہا جائے تو)

نہایت کریہہ منظر پیش کر رہا تھا... وہ بری طرح جھلسا ہوا تھا۔ ایک سائڈ تو مکمل طور پر جل چکی تھی۔ اس جانب کی آنکھ بھی بغیر پلک کے تھی اور خوفناک منظر پیش کرتی تھی۔ چہرے کی دوسری سائڈ بھی ایک تہائی متاثر تھی... چہرے کے باہری گھونگھٹ کے نیچے ایک اور چھوٹا نقاب بھی تھا۔ پردے والی سرکار کا پورا چہرہ دیکھنے کے لیے اس نقاب کو بھی سرکانا پڑا۔

ریشمی نے کانپتی ہوئی ہراساں آواز میں کہا۔ ''مم... میرا... اندازہ... ٹھیک تھا۔ یہ وہی ہے، وہی شیطان پیر ساتسا ہے۔ ہمارے گاؤں میں لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ آگ میں جل چکا ہے، اپنے دو مریدوں سمیت ڈیرے پر سواہ (راکھ) ہو گیا ہے... مم... مجھے ابھی تک اپنی نظروں پر یقین نہیں آ رہا... یہ میں کیا دیکھ رہی ہوں...''

وہ جیسے خوف کے سبب کھسکتی ہوئی ''پردے والی سرکار'' سے کچھ اور دور ہٹ گئی۔ اسے ابھی تک معلوم نہیں تھا کہ یہ کریہہ المنظر شخص مر چکا ہے... ملنگی ڈیرے کے اس خاص الخاص حصے میں ایک ایسا حادثہ ہو چکا تھا جو یہاں تہلکہ مچا سکتا تھا۔

''اسے کیا ہوا ہے؟'' ریشمی نے دہل کر پوچھا۔

''لگتا ہے، بے ہوش ہو گیا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ (پہلے سے دہشت زدہ ریشم کو میں مزید دہشت زدہ کرنا نہیں چاہتا تھا)

''اب کیا ہوگا؟'' وہ ہکلائی۔

میں نے اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے تیزی سے ''پردے والی سرکار'' کی تلاشی لی۔ اس کے بیش قیمت لبادے کا کپڑا موٹے ''ویل وٹ'' کا تھا اس کی جیبوں سے مجھے چند دیگر اشیا کے ساتھ چابیوں کا ایک گچھا بھی ملا۔ اس میں تین چار لمبی چابیاں تھیں۔ یہ چابیاں دیکھ کر ریشمی چونک گئی۔ اس نے پیتل کی ایک چابی کو گھما پھرا کر دیکھا اور بولی۔ ''مجھے لگتا ہے بھائی، یہ دوسرے دروازے کی چابی ہے۔''

''کون سا دوسرا؟''

جواب دینے کے بجائے اس نے مجھے ساتھ لیا اور ایک در سے گزر کر کمرے کے دوسرے حصے میں آ گئی۔ اس مستطیل حصے میں ایک اور دروازہ نظر آ رہا تھا۔ اس کی چوڑائی بمشکل دو ڈھائی فٹ رہی ہوگی۔ وہ بولی۔ ''مجھے لگتا ہے، یہ اس دروازے کی چابی ہے۔ ایک بار یہ پردے والی سرکار یہاں سے بھی آیا تھا۔''

ریشمی کی بات خوش آئند تھی۔ اگر یہ چابی واقعی اس دروازے کے قفل میں لگ جاتی تو ہم اس عقبی دروازے سے بھی نکل سکتے تھے۔ میں نے واپس جا کر پردے والی سرکار (یا پیر ساتسا) کا نہایت بدنما چہرہ کپڑے سے ڈھک دیا۔ اب اس شخص کے حوالے سے سب کچھ سمجھ میں آ رہا تھا، کیونکہ ریشمی نے اسے پہچان لیا تھا۔ برسوں پہلے اس شیطان صفت شخص نے چاند گڑھی میں زبردست من مانیاں کی تھیں اور آخر ایک معصوم لڑکی کی عزت سے کھیلنے کے پاداش میں زندہ جلا دیا گیا تھا مگر وہ زندہ نہیں جلا تھا۔

دروازے سے باہر پہرے داروں کی زبردست نقل و حرکت موجود تھی۔ اگر ہم اس جانب سے نکلنے کی کوشش کرتے تو مڈبھیڑ لازمی تھی۔ میں نے رائفل سنبھالی۔ خنجر فرش سے اٹھا کر دوبارہ چمڑے کے غلاف میں لگایا اور ریشمی کا ہاتھ پکڑ کر عقبی دروازے کی طرف بڑھا۔ اس جانب نسبتاً خاموشی تھی۔ میں نے پیتل کی چابی کو قفل میں ڈالا اور بہت آہستہ سے حرکت دی۔ دوسری کوشش میں یہ قفل کھل گیا۔

اب باہر نکلنے کا خطرناک ترین مرحلہ تھا۔ میں نے رائفل کو ایک بار پھر چیک کیا۔ ریشمی نے میرا بازو تھاما اور ہم باہر نکل آئے۔ ابھی ہم چند ہی قدم چلے تھے کہ ایک شخص ہمارے سامنے آ گیا۔ وہ ہمیں دیکھ کر ٹھٹکا اور ہم اسے دیکھ کر۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی حرکت کرتا یا میری رائفل اس پر آگ اگلتی۔ میں سناٹے میں رہ گیا۔ ملنگ کے روپ میں جو درمیانے قد کا نوجوان میرے سامنے کھڑا تھا، وہ انیق تھا۔

مجھے دیکھ کر اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اس نے تیزی سے دائیں بائیں دیکھا، پھر میرے قریب آ کر بولا۔ ''آگے پہرے دار ہیں۔ آپ... کو دیکھتے ہی فائر کھول دیں گے...''

وہ مجھے اور ریشمی کو تقریباً دھکیلتا ہوا واپس اسی دروازے میں لے آیا جو ہم نے ابھی کھولا تھا۔ اندر آ کر اس نے دروازہ جلدی سے بند کر دیا اور پھر چابی گھما کر اسے لاک بھی کر دیا۔ وہ متوحش نظروں سے ہماری طرف دیکھ کر بولا۔ ''شاہ زیب بھائی! مجھے پہلے ہی شک ہو گیا تھا کہ آپ یہاں گھس آئے ہیں، لیکن... رضوان نے تو کچھ اور بات بتائی تھی۔ اس نے کہا تھا، آپ نے کل کارروائی کرنی ہے۔''

''سمجھو کہ پلان الٹ پلٹ ہو گیا ہے۔ رضوان کا ڈاکٹر ارم سے جھگڑا ہوا ہے۔ وہ کلینک کے واش روم میں بے ہوش پڑی ہے۔ صبح سویرے مجاور کرنالی کو اس سے ملنے آنا ہے۔ اس کے بعد سارا راز کھل جائے گا۔ ہمیں جو کرنا

ہے اس سے پہلے ہی کرنا ہے۔''

''چاچا اور تاجور کہاں ہیں؟''

''دونوں رضوان کے پاس کلینک میں ہیں۔ اگر ہم کسی طرح کلینک تک پہنچ جائیں تو وہاں سے پل کی طرف جانا آسان رہے گا۔''

''مگر یہاں سے نکلنے کے لیے یہ بڑا اوقت ہے شاہ زیب بھائی، پہرے دار چاروں طرف آپ کو ڈھونڈ رہے ہیں، پاک بہن بھی آپ کے ساتھ ہیں۔ وہ آپ کو دیکھتے ہی فائر کھول دیں گے۔ میں ان کے تیور دیکھ کر آیا ہوں۔''

''تمہارے لیے ایک اور اہم خبر ہے انیق۔'' وہ سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا، میں نے کہا۔ ''پردے والی سرکار اب ہم میں نہیں رہی۔ وہ اس دار فانی سے کوچ کر چکی ہے۔''

انیق کی آنکھیں حیرت سے کھلی رہ گئیں۔''... یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟''

میں نے دیکھا کہ ریشمی کا دہشت زدہ چہرہ بھی مزید دہشت کی زد میں آگیا ہے۔ میں نے کمرے کے دوسرے حصے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔''وہاں پڑی ہے اس کی لاش۔'' انیق لپک کر دوسرے کمرے میں پہنچا۔ میں اور ریشمی بھی ساتھ تھے۔ انیق کے ذہن میں بھی وہی بات آئی جو اس سے پہلے میرے اور ریشمی کے ذہن میں آئی تھی۔ اس کے تاثرات سے اندازہ ہوا کہ وہ گھونگھٹ الٹ کر اس کی صورت دیکھنا چاہتا ہے۔

میں نے کہا۔''رہنے دو انیق! نہ ہی دیکھو تو اچھا ہے، بری طرح جھلسا ہوا ہے اس کا تھوبڑا۔''

انیق نے پردے والی سرکار یعنی وڈے پیر سائیں کے بالکل بے حرکت جسم سے اندازہ لگا لیا کہ وہ واقعی مر چکا ہے۔ اس نے میری طرف دیکھ کر لرزاں آواز میں پوچھا۔''یہ کیسے ہوا... شاہ زیب بھائی؟''

''یار! میں نے اپنے ہاتھوں سے مشکل آسان کی ہے اس کی۔''

''آپ... اس کو ''ایزی'' لے رہے ہیں۔ یہ بہت بڑی گڑبڑ ہوگئی ہے شاہ زیب بھائی، یہاں تو طوفان آجائے گا۔''

''تو ہم نے کون سا توقع لگائی ہوئی تھی کہ یہاں بادِ بہاری چلے گی۔''

ایک دم میرے ذہن میں ایک نئی بات آئی۔ میں نے دھیان سے پیر سائیں کے بے حرکت جسم کی طرف دیکھا۔

وہ لمبے قد کاٹھ کا تھا۔ میں نے انیق کی طرف دیکھا۔ وہ جیسے میری نگاہوں سے ہی میرا مافی الضمیر سمجھ گیا۔ اس کے تاثرات بھی بدل گئے۔ میں نے ریشمی سے مخاطب ہو کر کہا۔''ریشمی، تم ذرا پانچ منٹ کے لیے دوسری طرف چلی جاؤ اور گھبرانا بالکل نہیں۔ اگر گھبراؤ گی تو تمہارے ابا جی اور تاجور سمیت ہم سب خطرے میں پڑ جائیں گے۔''

اس نے تھوک نگل کر اثبات میں سر ہلایا اور کمرے کے اس مستطیل حصے کی طرف چلی گئی جہاں عقبی دروازہ تھا۔

ہم دونوں نے مل کر تیزی سے پیر سائیں کو بے لباس کیا۔ انیق نے اس کا چہرہ اور جسم دیکھ کر اپنی کراہیت بمشکل دبائی۔ چہرے کی طرح پیر سائیں کا بایاں پہلو بھی کئی جگہ سے جلا ہوا تھا۔ یہ زخم اسے قریباً سات سال پہلے لگے تھے مگر ابھی تک ان کے نشان دل میں دہشت پیدا کرتے تھے۔

پیر سائیں کو نیم برہنہ حالت میں ہم نے الماری کے اندر ٹھونس دیا اور الماری باہر سے لاک کر دی۔ اس کی انگوٹھیاں، کڑے، مالائیں، جوتی وغیرہ ہم نے سب کچھ اتار لیا تھا۔ میں نے تیزی سے پیر سائیں کا بیش قیمت لباس پہن لیا۔ کہیں سے مجھے فٹ بیٹھا اور کہیں سے نہیں لیکن گزارا ہو گیا۔ اس کی بیش قیمت انگوٹھیاں، طلائی کڑے اور مالائیں، میں نے سب کچھ پہن لیا۔ کھسے نما جوتی کا مسئلہ تھا۔ وہ مجھے کھلی تھی مگر کسی نہ کسی طرح میں نے اس کو بھی ایڈجسٹ کر لیا۔ کراہت ہو رہی تھی مگر مجبوری تھی۔ پہلے میں نے پیر سائیں کا نیچے والا نقاب اپنے چہرے پر چڑھایا پھر چمکیلی سفید چادر کا گھونگھٹ نکال لیا۔ کندھوں پر سفید گرم شال لٹکا کر میں نے رائفل بغل کے نیچے اس طرح چھپالی کہ فوراً سے پہلے اسے استعمال میں لایا جا سکے۔

ریشمی مجھے اس روپ میں دیکھ کر ہکا بکا رہ گئی۔ میں نے اسے سمجھا دیا کہ ہمیں کیا کرنا ہے اور کیسے؟ کمرے میں سے مشکوک نشانیاں مٹا کر ہم باہر نکلنے کے لیے تیار ہو گئے۔ اس مرتبہ مجھے اور ریشمی کو سامنے والے دروازے سے نکلنا تھا اور انیق کو پچھلے چھوٹے دروازے سے۔ ایک راہداری میں چھوٹا سا چکر کاٹنے کے بعد ہمیں ایک دوسرے سے مل جانا تھا۔

میں نے دروازہ کھولا اور ریشمی کے ساتھ باہر آ گیا۔ پروگرام کے مطابق میں اس سے دھیمی آواز میں باتیں کر رہا تھا اور وہ مسلسل اثبات میں سر ہلا رہی تھی۔ ہم پہلو بہ پہلو چلتے پہرے داروں کے درمیان سے گزرے۔ وہ ہماری دونوں جانب مؤدب کھڑے ہو گئے۔ ایک موڑ کاٹ کر ہم

بڑی راہداری میں آ گئے۔ یہاں انیق موجود تھا۔ اس نے رکوع کی سی حالت میں جھک کر مجھے سلام کیا اور پھر ہمارے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ میں جہاں جہاں سے گزر رہا تھا، پہرے دار اور دیگر افراد مؤدب کھڑے ہو جاتے تھے اور اپنے دونوں ہاتھ ناف پر باندھ لیتے تھے۔ جوں جوں ہم آگے بڑھ رہے تھے، خوش گوار حرارت اور اگربتیوں کی مست خوشبو میں کمی واقع ہو رہی تھی۔ ہم اسی جگہ سے گزرے جہاں قریباً ایک گھنٹا پہلے میں نے دو توانا پہرے داروں کو زیر کیا تھا اور انگیٹھی کے قریب فرش پر لٹایا تھا۔ وہاں اب پہرے داروں کا جمگھٹا تھا۔ فرش پر خون ابھی تک موجود تھا۔ اس کے گرد پتھر کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے رکھ دیے گئے تھے۔ ہم گزرے تو پہرے داروں نے دیواروں کے ساتھ لگ کر ہاتھ ناف پر باندھ لیے اور رکوع کے بل جھک گئے۔

مجھے امید نہیں تھی کہ ''سایہ'' نامی جگہ کے اس اندرونی حصے سے نکلنا اتنا آسان ثابت ہوگا۔ قریباً تین چار منٹ کے اندر ہم کلینک میں داخل ہو گئے۔ مجھے، یعنی پردے والی سرکار کو اپنے سامنے دیکھ کر رضوان کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ تاجور اور چاچا رزاق بھی ہکا بکا ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ مجھے ڈر محسوس ہوا کہ گھبراہٹ کے عالم میں رضوان کوئی الٹی سیدھی حرکت نہ کر بیٹھے۔

میں نے گھونگھٹ اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''گھبرانے کی ضرورت نہیں، یہ میں ہوں۔''

رضوان کے سینے سے ایک طویل سانس خارج ہو گئی۔ تاجور لپک کر ریشمی کے گلے سے لگ گئی۔ ریشمی سسکیاں بھرنے لگی۔

''یہ سب کیسے ہوا؟'' رضوان نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔

''پردے والی سرکار خالقِ حقیقی کو لبیک کہہ چکی ہے۔'' میں نے اطمینان سے کہا۔ ''اب ہمیں بھی جلد از جلد یہاں سے نکلنا ہے۔''

رضوان کے ساتھ ساتھ چاچا رزاق کا منہ بھی کھلا رہ گیا۔ ریشمی تاجور سے الگ ہوئی تو اپنے بوڑھے والد سے لپٹ گئی۔ وہ ہچکیوں سے رو رہی تھی۔ چاچا رزاق مسلسل اس کے سر پر بوسے دیے جا رہے تھے۔ ''نہ رو میری دھی رانی! سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ہم تجھے لے جائیں گے یہاں سے۔ نہ رو میری بچڑی۔''

واش روم کے اندر سے کھٹ پٹ کی مدھم آوازیں آ رہی تھیں۔ رضوان نے کہا۔ ''ارم ہوش میں آ چکی ہے۔ منہ میں کپڑا ہے، نہیں تو اس نے آسمان سر پر اٹھا لینا تھا۔ مسلسل خود کو چھڑانے کی کوشش کر رہی ہے۔''

میں نے دیکھا، اپنی بیٹی کو دیکھ کر اور اس سے مل کر چاچا رزاق کے بوڑھے جسم میں نئی توانائی آ گئی تھی۔ ان کا کمزور سینہ جیسے تن گیا تھا اور وہ اپنی کمزور جان کے ساتھ ہر طرح کی صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کو تیار نظر آتے تھے۔

میں نے سب کو سمجھایا کہ اب ہمیں کیا کرنا ہے اور کس طرح ہمیں یہاں سے نکل کر لکڑی کے پل تک پہنچنا تھا۔ ہمارے سامنے پہلا مرحلہ یہی تھا۔ میری موجودگی میں یعنی پردے والی سرکار کی موجودگی میں ریشمی کو بھیس بدلنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ ہاں تاجور کا مسئلہ تھا۔ اس نے ڈاکٹر ارم کا ایک جوڑا پہن لیا تھا اور اس کے اوپر ایک ملنگی چولا ڈال لیا تھا۔ ڈاکٹر ارم کسی وقت سرجیکل ماسک بھی استعمال کرتی تھی۔ یہ ماسک اور ٹوپی پہننے سے تاجور کی شناخت کافی حد تک چھپ گئی۔ انیق اور رضوان وغیرہ کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ چاچا رزاق کو ہم نے اپنے درمیان رکھا۔ وہ رائفل جو میں نے شروع میں کلینک کی طرف آتے ہوئے ایک پہرے دار سے چھینی تھی، اس وقت انیق کے ہاتھ میں تھی اور وہ اسے استعمال کرنے کے لیے بھی تیار نظر آتا تھا۔ بہرطور ہماری دلی خواہش تھی کہ ہم بغیر کسی خون خرابے کے لکڑی کے پل تک پہنچ جائیں۔

اللہ کا نام لے کر ہم کلینک کے مین دروازے سے نکلے۔ ابھی چند قدم ہی چلے تھے کہ مجھے ٹھٹک کر رکنا پڑا۔ میرے پہلو میں چلتا ہوا رضوان بھی رک گیا۔ اس نے کہا۔ ''کرنالی آ رہا ہے۔''

گول چہرے اور توانا جسم والا بڑا مجاور کرنالی تین چار مسلح پہرے داروں کے ساتھ سیدھا میری طرف آ رہا تھا۔ اس کے کرخت چہرے سے خشونت برس رہی تھی۔ مخمل کا گہرا نیلا، لمبا کڑھائی دار چغا فرش پر گھسٹتا چلا آ رہا تھا۔ میرے قریب آ کر اس نے مؤدبانہ انداز اختیار کیا اور پاٹ دار آواز میں بولا۔ ''سرکار! میں تو سمجھ رہا تھا کہ آپ پاک بہن کے کمرے میں ہیں۔''

میں نے بس سر کو ہولے سے نفی میں ہلا دیا۔

وہ مجھے دھیان سے دیکھ رہا تھا، بولا۔ ''ابھی تک کچھ پتا نہیں چلا سرکار! ہر جگہ تلاش ہو رہی ہے۔ سارے راستوں پر ناکے لگا دیے ہیں۔''

میں نے ایک بار پھر اثبات میں سر ہلایا۔ میرے

لیے ممکن نہیں تھا کہ بول کر اسے جواب دیتا۔ وہ کچھ چونک سا گیا۔ اس نے مجھے سرتاپا دیکھا۔ ریشمی کو دیکھا۔ رضوان کو دیکھا۔ ایک بار پھر مجھ پر نگاہیں جمائیں۔ اس کے تاثرات میں غیر معمولی تبدیلی آئی۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنے شک میں کچھ اور آگے بڑھتا یا پھر میں ہی ساتھیوں سمیت وہاں سے چل پڑتا، راہداری کے موڑ سے ایک پہرے دار بھاگتا ہوا نمودار ہوا۔ یہ وہی داروغہ تھا جو ہمیں گاہے بگاہے جنگلارے میں بھی نظر آتا تھا۔

وہ دور ہی سے چلایا۔ ''پردے والی سرکار کو مار دیا گیا ہے۔ یہ پردے والی سرکار نہیں ہے... یہ نہیں ہے۔''

ایک دم جیسے بہت بڑے چھناکے سے ایک بلند و بالا آئینہ چکنا چور ہو گیا... ایک سیکنڈ سکتے کی سی کیفیت میں رہنے کے بعد پہرے داروں نے اپنے ہاتھ رائفلوں کی طرف بڑھائے لیکن ہم پہلے سے تیار تھے۔ میں نے موٹی شال کے نیچے سے روسی ساخت والی کلاشنکوف نکالی اور فائرنگ کر دی۔ خوفناک تڑتڑاہٹ کے ساتھ دو پہرے دار الٹ کر فرش پر گرے۔ انیق نے بے دریغ کرنالی کو نشانہ بنایا مگر گولیاں اس کے پٹھان باڈی گارڈ کو لگیں اور کرنالی جھک کر ایک طرف کو بھاگا۔

یہی وقت تھا جب میری نگاہ پھر ''داروغہ'' کی طرف اٹھ گئی۔ وہ بھاگتے بھاگتے رائفل سیدھی کر چکا تھا اس سے پہلے کہ وہ پورا برسٹ میرے جسم میں اتار دیتا، میں نے اسے نشانہ بنایا۔ دو گولیاں سیدھی اس کے ماتھے پر لگیں، وہ ایک انگیٹھی سے ٹکرا کر نیچے گرا۔ ہر طرف انگیٹھی کے انگارے بکھر گئے۔ ان انگاروں میں ان رنگ برنگی مالاؤں کے دانے بھی تھے جو اس شخص کے گلے سے ٹوٹی تھیں۔

تاجور اور ریشمی چلاتی ہوئی ایک دیوار کے ساتھ لگ گئی تھیں۔ ایک پہرے دار نے ان کی طرف رائفل سیدھی کی تو بوڑھے چاچا رزاق نے ہاکی کا بھرپور وار اس کے ہاتھ پر کیا اور کلائی توڑ کر رکھ دی۔ اگلے ہی لمحے انیق کی گولی نے اسے فرش پر لڑھکا دیا۔ پہرے دار کے لمبے بالوں میں خون کا پھول کھل گیا تھا۔

ہر طرف کہرام سا مچ گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ مزید پہرے دار پہنچتے ہم مشرقی سمت بھاگے، چاچا رزاق کو بھاگنے میں دقت ہو رہی تھی مگر وہ ہماری توقع سے زیادہ ہمارا ساتھ دے رہے تھے۔ انہیں COVER دینے کے لیے انیق سب سے آخر میں موجود تھا اور ایک طرح سے الٹے پاؤں بھاگ رہا تھا۔ آج میں پہلی بار اس کی اسلحہ شناسی اور فائٹنگ اسپرٹ دیکھ رہا تھا۔ وہ دبنگ گینگسٹر داؤد بھاؤ کا تربیت یافتہ تھا اور یقیناً ایسے بہت سے سنگین مرحلے دیکھ چکا تھا۔ میں نے ایک ہاتھ میں تاجور کی کلائی پکڑ رکھی تھی اور اسے قریباً کھینچتا ہوا اپنے ساتھ لا رہا تھا۔ رضوان نے ریشمی کا بازو پکڑ رکھا تھا۔

ہم نیچی چھت والے اس راستے پر پہنچے جو بتدریج نشیب میں اترتا جاتا تھا اور بالآخر لکڑی کے پل تک پہنچ جاتا تھا۔ اچانک گرنے کی آواز آئی۔ یہ چاچا رزاق تھے۔ ہاکی ان کے ہاتھ سے لڑھک کر دور جا گری۔ انیق نے انہیں اٹھانے کی کوشش کی مگر وہ تیزی سے نہیں اٹھ سکے۔ میں نے ان کے منع کرنے کے باوجود انہیں کندھے پر لاد لیا۔ ان کی بیساکھی یعنی ہاکی رضوان نے تھام لی۔

''وہ آرہے ہیں۔'' رضوان نے چلا کر کہا۔

ایک موڑ سے دو مسلح پہرے دار نمودار ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک کو میں نے گولی کا نشانہ بنایا۔ دوسرے کو انیق نے لمبا لٹا دیا۔ اب میں نے رائفل صرف ایک ہاتھ سے تھام رکھی تھی۔ دوسرے ہاتھ سے چاچا کو کندھے پر سہارا دے رکھا تھا۔ وہ دھیمی آواز میں مسلسل اختلاف کر رہے تھے۔ ''نہ کرو پتر! میرے لیے خود کو مصیبت میں نہ ڈالو۔ مجھے اتار دو... میں چل لوں گا۔''

وہ بار بار یہی بات کہہ رہے تھے۔ عقب سے اب ''بھاگو پکڑو'' کی آوازیں آنا شروع ہو گئی تھیں اور یہ کوئی دو چار افراد نہیں تھے۔ درجنوں تھے۔ تاہم ابھی وہ ہم سے کافی فاصلے پر تھے۔ ایک گرل نما آہنی دروازے نے ہمارا راستہ روک لیا۔ اس جہازی سائز کے دروازے میں پیتل کے دو بڑے قفل جھول رہے تھے مگر پہرے دار کوئی نہیں تھا۔ مجھے پتا تھا یہاں پہرے دار کیوں نہیں ہے؟ میرے اشارے پر انیق نے سات آٹھ فٹ کی دوری سے تالوں پر فائرنگ کی۔ دھماکوں سے ہر طرف گولیوں کے خول بکھرے اور ساتھ ہی تالے بھی بکھر گئے۔ فولڈنگ دروازے کو دائیں بائیں ہٹا کر ہم اندر داخل ہو گئے۔ میں اب پوری طرح چوکس ہو چکا تھا۔ ہاں میں جانتا تھا کہ آہنی دروازے پر کوئی پہرے دار کیوں موجود نہیں تھا اور یہاں پل کے سامنے ہمارا سامنا کس سے ہو سکتا ہے اور پھر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ مجھے ایک نامانوس مدھم آواز سنائی دی، جو تیزی سے ہمارے قریب آرہی تھی۔ اس آواز کو سن کر تاجور کا رنگ ہلدی ہو گیا۔ میں نے چاچا رزاق کو نیچے اتار دیا اور کلاشنکوف سے نیا

میگزین اٹیچ کرلیا۔ میں جانتا تھا، یہ چنگھاڑتی ہوئی سی لرزہ خیز آواز کس کی ہے۔ اس آواز نے آنا ہی تھا اور یہ آگئی تھی... اور یہ ایک نہیں دو آوازیں تھیں۔ تاجور میرے کندھے سے چمٹ گئی۔ میں نے انگلی لبلبی پر رکھی ہوئی تھی اور پوری طرح تیار تھا... اور پھر پہلا جیوپارڈ چیتا برق کی رفتار سے لپکتا ہوا ہماری طرف آیا۔ قد تقریباً سات فٹ وزن تقریباً 110 کلوگرام۔ وہ پھرتی اور طاقت کا خوفناک امتزاج تھا۔ وہ کمان سے نکلے تیر کی طرح ہماری طرف بڑھا۔ میں اچھی طرح جانتا تھا، میرے پاس غلطی کی گنجائش نہیں۔ نشانہ خطا جانے کا مطلب تھا، ہم میں سے کم از کم ایک شخص کی فوری موت۔ تاجور اتنی شدت کے ساتھ میرے بازو سے چمٹی تھی کہ بازو کا حصہ بن کر ہی رہ گئی تھی۔ خون آشام جانور سے ہمارا فاصلہ قریباً تیس فٹ تھا جب میں نے ٹریگر دبایا۔ چھ گولی والا برسٹ فائر ہوا۔ کم از کم چار گولیاں اس کے سر اور جسم میں لگیں۔ وہ لڑکھڑایا، گرا اور فرش پر پھسلتا چلا گیا۔ وہ عین ہمارے قدموں میں پہنچا۔ اتنے قریب سے اس کی دید ہیبت ناک تھی۔ اس کی پھنکاریں ہمیں اپنے پاؤں پر محسوس ہوئیں۔ اس کے جسم سے خون کے فوارے چھوٹ رہے تھے... وہ پھڑک رہا تھا۔

اور یہی وقت تھا جب تڑتڑاہٹ کی سماعت شکن آواز سے ایک اور برسٹ چلا۔ یہ دوسرا چیتا تھا جسے انیق نے شکار بنایا تھا۔ وہ چکنے فرش پر کئی لڑھکنیاں کھا کر گرل دار دروازے سے ٹکرایا اور اسے ہلا کر رکھ دیا۔ چند ہی لمحے میں وہ اپنے ہی خون کے اندر لت پت تھا۔ میں جانتا تھا، یہاں ایک جیوپارڈ چیتا اور ہے لیکن وہ کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

یکایک اس کی چلاتی ہوئی سی پھنکار سنائی دی، وہ ایک پتھر کی اوٹ سے نکلا۔ چاچا رزاق سے اس کی دوری بیس بائیس فٹ سے زیادہ نہیں تھی۔ چاچا رزاق جب تھوڑی دیر پہلے گرے تو ان کی پیشانی سے خون بہنے لگا تھا۔ غالباً یہی خون اب چیتے کی حس شامہ کو کشش کر رہا تھا۔ وہ گولی کی طرح ان کی طرف آیا۔ چاچا نے اس سے بچنے کی کوشش کی اور دیوانہ وار ہاکی کی ضرب اس کے چہرے پر لگائی۔ یہ ضرب اس درندے کا کیا بگاڑ سکتی تھی۔ تاہم اتنا ضرور ہوا کہ وہ اس کے پہلے حملے سے بچ گئے۔ خطرناک افریقن جیوپارڈ کو دوسرے حملے کا موقع دینے کا مطلب چاچا کی موت تھی۔ اگر میں یا انیق فائر کرتے تو چاچا رزاق بھی زد

میں آتے .... لیکن رسک تو لینا تھا۔ میں نے فرش پر اوندھے گر کر ایک برسٹ مارا۔ دو گولیاں چیتے کے جسم کے پچھلے حصے میں لگیں۔ اس نے ایک پلٹی کھائی پھر اٹھ کر بھاگا لیکن ہماری سمت نہیں، مخالف سمت میں، دو ہی سیکنڈ میں وہ اوجھل تھا۔

ہم ایک بار پھر پل کی طرف لپکے۔ چند سیڑھیاں اتر کر ہم ایسی جگہ پر آ گئے جہاں چھت کے بجائے کھلا آسمان تھا۔ آسمان پر تارے چمک رہے تھے۔ یخ بستہ ہوا تھی اور رات کا اندھیرا اب دن کے اجالے میں بدلنا شروع ہو گیا تھا، لکڑی کا یہ طویل جھولتا ہوا پل ایک گہری تاریک کھائی پر واقع تھا۔ یہاں ہمیں کوئی پہرے دار نظر نہیں آیا۔ ہم نے پل کی طرف قدم بڑھائے۔ عین کنارے پر پہنچ کر میں ٹھٹک کر رک گیا۔ پل آغاز میں ہی درست حالت میں موجود نہیں تھا۔ لکڑی کے کم از کم چودہ پندرہ تختے غائب تھے اور نیچے سیکڑوں فٹ گہری کھائی نظر آتی تھی۔

''یہ کیا ہے؟'' تاجور نے ڈری ڈری آواز میں کہا۔

''لگتا ہے ان لوگوں نے جان بوجھ کر ایسا کر رکھا ہے۔ احتیاط کے طور پر تختے اتار کر کہیں رکھ دیے ہیں۔'' رضوان نے کہا۔

''اگر ایسا ہے تو تختے یہیں کہیں ہوں گے۔'' چاچا رزاق نے دائیں بائیں دیکھتے ہوئے کہا۔

''میرے خیال میں وہ پڑے ہیں۔'' رضوان نے انگلی سے ایک طرف اشارہ کیا۔

یہاں پل کی حفاظت کے لیے ایک مورچا سا بنایا گیا تھا۔ اینٹوں کی چنائی تھی سامنے ریت کی بوریاں رکھی تھیں۔ مگر کوئی موجود نہیں تھا۔ پل سے اتارے جانے والے تختے اوپر تلے مورچے کی دیوار کے ساتھ رکھے تھے۔

انیق نے غور سے پل کے خلا کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ان تختوں کو آسانی سے پھر جوڑا جا سکتا ہے۔''

اس کی بات درست تھی۔ تختوں کو دوبارہ رکھنا ضروری تھا۔ میں، انیق اور رضوان تو شاید بھاگ کر یہ خلا پھلانگ جاتے مگر تاجور، ریشمی اور چاچا کے لیے یہ ممکن نہیں تھا۔

ہم سب تختوں کی طرف لپکے... مگر محسوس ہو رہا تھا کہ ہمارے پاس وقت ختم ہو چکا ہے۔ درجنوں افراد بھاگتے اور شور مچاتے اس جگہ تک پہنچ چکے تھے جہاں دو جیوپارڈ چیتوں کی لاشیں پڑی تھیں۔ پھر اچانک زبردست فائرنگ شروع ہو گئی۔ ہم سب نے مورچے کے عقب میں پناہ لی۔ انیق اور میں مورچے کی دائیں اور بائیں جانب تھے۔ ہم نے پوزیشن لے کر جوابی فائرنگ شروع کر دی۔ دھماکوں سے وسیع و عریض خلا گونج اٹھا۔ شعلے چمکے، گولیوں کے خول بکھرے اور ہر طرف بارود کی بو پھیلنے لگی۔ ہمارے جوابی حملے نے ملنگی ڈیرے کے خونخوار پہرے داروں کی پیش قدمی روک دی۔ وہ جو مست سانڈوں کی طرح سیدھے لپکے چلے آ رہے تھے، مختلف جگہوں پر پوزیشنیں لے کر فائرنگ کرنے پر مجبور ہو گئے۔

رضوان تختوں کی طرف گیا۔ اور دو تختوں کو گھسیٹ کر پل کے خلا پر لے آیا۔ وہ گولیوں کی زد سے بچنے کے لیے ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل چل رہا تھا اسی دوران میں انیق کو گولی لگ گئی۔ میں نے اسے کندھا پکڑ کر دہرا ہوتے دیکھا، آٹومیٹک رائفل اس کے ہاتھ سے نکل گئی تھی۔

یکایک ڈیرے کے محافظوں نے شدید حملہ کر دیا۔ گولیاں بارش کی طرح برسنے لگیں۔ چاچا رزاق نے ہمت کی۔ انہوں نے انیق والی رائفل اٹھائی اور میرا ساتھ دینے لگے۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ اسلحے کا استعمال جانتے ہیں لیکن یہ امید نہیں تھی کہ ایسی سنگین صورتِ حال میں وہ باقاعدہ خم ٹھونک کر لڑنے لگیں گے۔ یہ ساری توانائی انہیں ان کی بیٹی کے پیار نے دی تھی۔ انہوں نے اپنی بوڑھی جان کے ساتھ سینہ تان لیا تھا اور لڑائی کا حصہ بن گئے تھے۔

انیق کے کندھے میں گولی لگی تھی۔ اس کا گہرا نیلا چولا خون سے سرخ ہو رہا تھا اور بازو کانپتا جا رہا تھا۔ دوسری طرف جب تاجور اور ریشمی نے دیکھا کہ رضوان کامیابی سے دو تختے گھسیٹ کر پل تک لے آیا ہے تو وہ بھی اس کا ساتھ دینے لگیں۔ یہ سب خطرناک تھا مگر خطرے کا سامنا تو اب ہمیں کرنا ہی تھا۔

انیق نے کراہتے ہوئے کہا۔ ''وہ لوگ قریب آتے جا رہے ہیں۔ ہمیں جلد کچھ کرنا ہو گا۔''

پھر وہ میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی پل کی طرف رینگ گیا۔ وہ تختے رکھنے میں رضوان کا ہاتھ بٹانا چاہ رہا تھا۔ ہم تھوڑا تھوڑا خلا دے کر آٹھ دس تختے بھی رکھ لیتے تو پل پار کیا جا سکتا تھا۔ مگر اندھا دھند فائرنگ یہ موقع ہی نہیں دے رہی تھی۔ ملنگی ڈیرے کے پہرے دار ان خون آشام بھیڑیوں کی طرح تھے جو اپنے شکار کو مختلف اطراف سے گھیر رہے ہوں۔ وہ ایک ایک انچ کھسکتے، قریب آتے جا رہے تھے۔ اب ہم ان کی للکارتی ہوئی وحشی آوازیں صاف سن سکتے تھے۔ اپنی ''پردے والی سرکار'' کی موت نے انہیں سرتاپا قہر بنا دیا تھا۔ وہ اپنے راستے میں آنے والی

ہر شے کو بھسم کر دینا چاہتے تھے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اگر وہ ہم پر غالب آجاتے تو ریشمی اور تاجور وغیرہ کے ساتھ کیا سلوک ہوتا۔

ایک پکارتی ہوئی گرج دار آواز میرے کانوں تک پہنچی..... ''ان لوگوں میں سے کسی ایک کو بھی بچنا نہیں چاہیے۔ آگے بڑھو، ٹکڑے کر دو ان کے۔''

میں نے پہچان لیا۔ یہ بڑے مجاور کرنالی ہی کی آواز تھی۔

جی چاہا کہ وہ سامنے ہو اور میں سیدھا اس کی کھوپڑی میں سوراخ کر دوں... چند گولیاں سنسناتی ہوئی میرے سر پر سے گزر گئیں۔

ہمارے پاس بہت زیادہ گولیاں نہیں تھیں۔ ہم زیادہ سے زیادہ پانچ منٹ ان کو روک سکتے تھے۔ ہمیں جو بھی کرنا تھا ان پانچ چھ منٹ کے اندر ہی کرنا تھا۔ جوں جوں وہ لوگ آگے بڑھ رہے تھے، ان کی فائرنگ زیادہ موثر ہوتی جارہی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق ہم ان کی سات آٹھ لاشیں گرا چکے تھے۔ اور ایسا اسی وجہ سے تھا کہ وہ کھلی جگہ پر تھے اور ہمیں ایک محفوظ مورچا نما جگہ میسر تھی۔ لیکن یہ سب کچھ زیادہ دیر چلنے والا نہیں تھا۔ وہ تعداد میں بہت زیادہ تھے۔ ان کے پاس اسلحہ بھی وافر مقدار میں تھا۔ اس کے علاوہ ہلاکتوں نے بھی ان کے اندر ایک بارود سا بھر دیا تھا۔ ان میں سب سے اہم ہلاکت اس ''سیٹ اپ'' کے اہم ترین شخص پیر سانتا کی تھی۔

میں نے فائرنگ کرتے کرتے مڑ کر دیکھا۔ رضوان نے تاجور اور ریشمی کے ساتھ مل کر آٹھ دس تختے رکھ لیے تھے۔ اچانک مجھ پر خوفناک انکشاف ہوا کہ چاچا رزاق زخمی ہو چکے ہیں۔ دو گولیاں ان کے نچلے دھڑ میں لگی تھیں اور لباس خون سے سرخ ہوتا جارہا تھا مگر وہ اپنی جگہ جمے ہوئے تھے... اور مسلسل سنگل شاٹ فائر کر رہے تھے۔

میں نے کہا۔ ''چاچا! اب ہمیں یہاں سے نکلنا ہوگا۔''

''لیکن ان کو روکے گا کون؟'' وہ بے ساختہ بولے۔

''ہم روکیں گے اور پیچھے بھی ہٹیں گے۔''

کہنے کو تو میں نے کہہ دیا لیکن میں جانتا تھا کہ فائر کرنا اور ساتھ ساتھ پیچھے ہٹنا چاچا رزاق کے لیے ممکن نہیں۔ انہیں تو اب کندھے پر اٹھا کر ہی یہاں سے نکالا جاسکتا تھا۔ میں انہیں کچھ دیر پہلے کندھے پر اٹھا چکا تھا اور اب بھی اٹھا سکتا تھا، لیکن میں دیکھ رہا تھا کہ وہ اپنی جگہ سے ہلنے کو بالکل تیار نہیں تھے۔

انہوں نے مجھے جھڑک کر کہا۔ ''بے وقوفی والی باتیں مت کرو۔ ہم میں سے ایک کو یہاں رکنا پڑے گا اور میں رکوں گا۔ میری حالت ایسی نہیں کہ یہاں سے ہل بھی سکوں۔ تم لوگ نکلو یہاں سے۔''

''چاچا! ہم آپ کو چھوڑ کر نہیں جائیں گے۔'' میں نے مصمم ارادے سے کہا۔

''مجھے لے جا کر بھی کیا کرو گے۔'' وہ کراہتے ہوئے بولے۔ انہوں نے اپنا لبادہ پیٹ پر سے ہٹایا، ایک گولی ان کا پہلو چیر کر کمر کی طرف سے نکل گئی تھی۔

عقبی جانب سے رضوان اور انیق پکارنے لگے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ ہم فائر کرتے ہوئے پیچھے کی طرف آئیں۔

میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ میں نے رضوان کو آواز دی۔ وہ گولیوں کی بارش میں جھک کر دوڑتا ہوا ہمارے پاس پہنچا۔ میں نے چاہا کہ چاچا رزاق سے رائفل لے کر رضوان کو تھما دوں۔ وہ لبلبی دبا کر گولی تو چلا ہی سکتا تھا۔ میں چاچا رزاق کو کسی طرح پل کی طرف لے جانے کی کوشش کر سکتا تھا مگر جب میری ہدایت پر رضوان نے چاچا سے رائفل لینے کی کوشش کی تو وہ بھڑک اٹھے۔ وہ چلانے لگے۔ ''جاؤ... دفع ہو جاؤ۔ سارے مارے جاؤ گے... چلے جاؤ۔ میں روکتا ہوں ان کو۔''

میں ان کا انداز دیکھ کر سمجھ گیا کہ وہ یہاں سے ہلیں گے نہیں۔ فیصلہ تو بہت صدمے والا تھا لیکن منطقی انداز سے سوچا جاتا تو اس صورت حال میں یہی فیصلہ کیا جاسکتا تھا۔ یہ پل اسی صورت میں پار کیا جاسکتا تھا، جب کم از کم ایک شخص اس ناکے پر موجود ہوتا اور محافظوں کو پل کی طرف آنے سے روکتا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ میں نے رضوان کو واپس جانے کا اشارہ کیا۔ وہ جھک کر بھاگتا ہوا واپس پل تک پہنچ گیا۔ یہ قریباً چالیس میٹر کا فاصلہ بڑا خطرناک تھا۔

میں نے دل پر پتھر رکھ کر دو بھرے ہوئے میگزین زخمی چاچا رزاق کے قریب رکھے اور خود بھی جھک کر بھاگتا ہوا پل پر پہنچ گیا۔

''میرے ابا جی؟'' ریشمی نے کراہ کر کہا۔

''وہ بھی آتے ہیں۔'' میں نے کہا اور ریشمی کو بازو سے پکڑ کر پل کے تختوں پر چلاتا ہوا، محفوظ تختوں تک لے آیا۔ وہ پلٹ پلٹ کر عقب میں دیکھ رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس کے محترم والد ابھی تک دکھائی کیوں نہیں دیے۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ قریباً ڈیڑھ سو فٹ آگے، راستے کے خم پر جو شخص مورچے میں ڈٹا ہوا ہے اور آگے

بڑھنے والوں کو روک رہا ہے وہ اس کا والد ہی ہے۔

وہاں گولیاں بارش کی طرح برس رہی تھیں۔ ہر طرف دھماکوں کی گونج اور چنگاریوں کی بوچھاڑ تھی اور وہ ڈٹا ہوا تھا۔ اس کا کام ہی ڈٹ جانا اور روک دینا تھا۔ وہ ایک ''ڈیفنڈر'' تھا... ماضی کا ایک نامور گول کیپر تھا اور اس نے شاید ٹھیک ہی کہا تھا کہ ابھی اپنی زندگی کا ایک آخری میچ اس کو کھیلنا ہے۔ شاید یہ اس کی چھٹی حس تھی جس نے اسے بتا دیا تھا کہ اسے ایک بار پھر ''سپر ڈیفنڈر'' کا کردار ادا کرنا ہے۔

ہم اندھا دھند بھاگتے... اور ریشمی کو اپنے ساتھ تقریباً کھینچتے ہوئے پل کے دوسرے سرے پر پہنچ گئے۔ ریشمی بھی شاید اب صورتِ حال سمجھ رہی تھی۔ وہ پلٹ پلٹ کر چلا رہی تھی۔ ''اباجانی... اباجانی...''

اور اباجانی بہت دور تھے۔ اپنی زندگی کا آخری مقابلہ کر رہے تھے۔ میں نے تصور کی نگاہ سے دیکھا... اُن کے ہاتھوں میں ہاکی کے بجائے رائفل تھی۔ دشمن کے فارورڈز ان پر حملہ آور ہو رہے تھے۔ ان کے چہرے تمتمائے ہوئے تھے، آنکھوں میں آگ تھی اور چاچا انہیں روک رہے تھے۔ ان کے پے در پے حملوں کو پسپا کر رہے تھے۔ آج ان کے عقب میں گول پوسٹ نہیں تھی، ان کی لاڈلی دھی رانی تھی، آج وہ کسی کو گول پوسٹ تک کیوں پہنچنے دیتے۔

پل سے اترنے سے پہلے ہی میں نے لوہے کے ان دو موٹے کیبلو کو دیکھ لیا تھا جن پر پل کا دارومدار تھا۔ میں نے ساتھیوں کو چند قدم پیچھے ہٹایا اور پھر نشانہ باندھ کر ان آہنی کیبلو پر خاص طرح سے فائرنگ کی۔ دونوں کیبلز یعنی ''آہنی رستے'' ٹوٹ گئے اور قریباً 200 فٹ لمبا چوبی پل ایک مہیب آواز کے ساتھ کھائی میں گر کر جھول گیا۔

یہی وقت تھا جب کھائی کے دوسرے کنارے پر ملنگی ڈیرے کی طرف ایک زوردار دھماکا ہوا۔ میں فوراً جان گیا، یہ دستی بم کا دھماکا تھا، شعلے کے ساتھ ہی بہت سی اینٹیں اور دیگر ملبا ہوا میں اُڑتا نظر آیا۔ غالب گمان یہی تھا کہ وہ مورچا اُڑا دیا گیا ہے جہاں ماضی کے نامور گول کیپر نے پوزیشن سنبھال رکھی تھی لیکن اب اس سے کیا فرق پڑتا تھا؟ پل کے ناکے پر ہونے والے ''میچ'' کا وقت ختم ہو چکا تھا اور وقت ختم ہونے کے بعد ''گول'' ہو بھی جائے تو بے معنی ہوتا ہے۔ ہاں... اپنا آخری میچ گول کیپر نے ہارا نہیں تھا۔

دھماکا ہونے کے فوراً بعد ہی اردگرد کی چٹانوں پر چنگاریاں سی بکھرنے لگیں۔ مطلب یہ تھا کہ اب وہ لوگ آگے آگئے تھے اور ہمیں نشانہ بنانے کا سوچ رہے تھے۔ ہم اب ان کی زد سے دور تھے۔ ہم پتھروں کے عقب میں چلے گئے۔

''اب کس طرف جانا چاہیے؟'' میں نے رضوان سے پوچھا۔

''میرا خیال ہے کہ سیدھا نکل چلیں تو آگے کھلا راستہ مل جائے گا۔ باقی ان ملنگوں کی طرف سے اب کوئی فوری خطرہ نہیں ہے۔ یہ کھائی پار نہیں کر سکتے اور چکر کاٹ کر آئیں گے تو ایک ڈیڑھ گھنٹا تو لگ ہی جائے گا۔''

ریشمی مسلسل آہ و بکا کر رہی تھی۔ وہ جان چکی تھی کہ اس کے ''اباجی'' وہاں سے زندہ سلامت نہیں نکل سکے۔ تاجور مسلسل اسے سنبھالنے میں لگی ہوئی تھی۔ اسے بانہوں میں لے رکھا تھا۔ کبھی اس کا سر چومتی تھی، کبھی گال سہلاتی تھی۔

ہمارے اردگرد بھربھرے اور سخت دونوں طرح کے پتھر تھے۔ کہیں کہیں بلند پتھروں کے درمیان تنگ راستے تھے، انیق نے اپنا زخمی کندھا دوسرے ہاتھ سے دبا رکھا تھا۔ خون اس کی انگلیوں کے اندر سے ٹپک رہا تھا۔ وہ بڑی ہمت کا ثبوت دے رہا تھا۔ لیکن ہمیں ضرورت تھی کہ ایک دو منٹ کے لیے کہیں ٹھہر جائیں اور اس کا زخم دیکھیں۔ اس کے علاوہ ریشمی کو بھی سنبھالے جانے کی ضرورت تھی۔ ''پردے والی سرکار'' کا ریشمی چولا اس طرح کا تھا کہ مجھے چلنے اور پتھروں پر چڑھنے میں سخت دشواری ہو رہی تھی۔ میں نے یہ چولا اتار کر اور لپیٹ کر جھاڑیوں میں پھینک دیا۔ اب میں اپنی ٹانگوں کو آزادی سے حرکت دے سکتا تھا۔ میں نے قیمتی انگوٹھیاں، مالاؤں اور طلائی کڑوں کے وزن سے بھی نجات حاصل کر لی۔ یہ اشیا میں نے کلاشنکوف کے ایمونیشن بیگ میں ٹھونس دیں۔ نیچے سے میں نے وہی جنگلارے کا زرد پٹی والا چولا پہن رکھا تھا۔ اب ہم گولیوں کی پہنچ سے دور تھے۔ ایک تنگ جگہ پر رک گئے۔ اب دن کا اجالا پھیل چکا تھا۔ قرب و جوار روشن ہو چکے تھے۔ دور مشرقی افق پر جموں کشمیر کی جانب سے نئے دن کا سورج طلوع ہونے والا تھا۔ تاجور ابھی تک ڈاکٹر ارم والے لباس میں تھی۔ بہرحال سرجیکل ماسک اب اس نے اپنے چہرے سے ہٹا لیا تھا۔ سرخ و سپید رخساروں پہ بالوں کی لٹیں جھول رہی تھیں۔ اس کی دلکش آنکھوں میں وہی چمک تھی، جو انسان کو خطرات سے نمٹنے کے لیے درکار ہوتی ہے۔ پچھلے دو تین دنوں میں مجھے تاجور کے متعلق ایک خاص بات معلوم ہوئی تھی اور وہ یہ کہ خطرے کے وقت اس کا ذہن زیادہ تیزی سے کام کرتا تھا۔ گھبرانے کے بجائے وہ صورتِ حال سے نکلنے کا کوئی کارآمد حل سوچتی تھی۔ وہ پنجاب کی مٹیار تھی۔ کسان گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ غصے، شرم یا خطرے کی کیفیات میں اس کے چہرے پر خون

کی یورش یوں ہوتی تھی جیسے کسی نے اچانک چہرے پر سرخ رنگ پھیر دیا ہو۔ اس وقت وہ ریشمی کو تسلی دینے کی کوشش کررہی تھی۔ رضوان بھی اس کا ساتھ دے رہا تھا۔

میں نے اپنے چرمی غلاف میں سے تیز دھار خنجر نکالا اور انیق کا لبادہ کندھے پر سے چاک کر دیا۔ تشویش ناک بات یہ تھی کہ گولی اندر ہی تھی۔ فی الحال سب سے اہم کام خون روکنا تھا۔ شاید کوئی بڑی نس، کٹ چکی تھی۔ فرسٹ ایڈ کے اصول کے مطابق میں نے زخم پر کس کر پٹی باندھ دی۔

اب ہم آگے جانے کے لیے تیار تھے۔ ہم ملنگی ڈیرے کے نہایت مہلک گھیرے سے نکل آئے تھے... لیکن یہ ہماری بھول تھی۔ ابھی ایک اور افتاد ہم پر ٹوٹنے والی تھی۔ اس افتاد کا آغاز ایک بلند آواز کی صورت میں ہوا۔ یہ رضوان کی آواز تھی۔ وہ کہیں قریب ہی تھا اور اس نے پکار کر مجھے بلایا تھا۔ میں انیق کو چھوڑ کر اس کی طرف دوڑا۔ وہ ایک کھوہ نما جگہ پر تھا۔ یہ کھوہ دہانے سے تنگ اور اندر سے کشادہ تھی۔ کھوہ میں ایک طرف ایک گڑھا سا کھودا گیا تھا۔ گڑھے میں سے نکلنے والے پتھر اور بھربھری مٹی ایک طرف ڈھیر کی صورت میں پڑی تھی۔ اس ڈھیر کے پاس ہی ایک لاش پڑی تھی... اور یہ نوری کی لاش تھی۔ میں دم بخود دیکھتا چلا گیا۔ اس بدنصیب کے جسم پر ابھی تک وہی شلوار قمیص تھی جس میں چند دن پہلے وہ ہمارے ساتھ کوٹلی سے روانہ ہوئی تھی۔ اس کے بال بکھرے تھے اور جسم پر جگہ جگہ خراشوں کے نشان نظر آتے تھے۔ صاف پتا چلتا تھا کہ پچھلے کئی دن سے اس کے ساتھ بدسلوکی ہوتی رہی ہے۔ اس کی کنپٹی پر گولی کا زخم تھا اور وہاں سے بہنے والا خون ایک لوتھڑے کی طرح بھربھری مٹی پر نظر آرہا تھا۔ میں سکتہ زدہ رہ گیا۔

”لگتا ہے کہ اسے دو تین گھنٹے پہلے ہی مارا گیا ہے۔“ رضوان نے کپکپاتی آواز میں کہا پھر اس نے غور سے میرا چہرہ دیکھا اور میرے تاثرات دیکھ کر چونک گیا۔ ”کیا... آپ... اسے جانتے ہیں؟“

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور قریب پڑی ہوئی ایک چادر اس کی لاش پر ڈال دی۔ میرے پیچھے پیچھے انیق اور تاجور بھی وہاں پہنچ گئے تھے۔ دفعتاً مجھے شدید خطرے کا احساس ہوا۔ میں نے کھوہ کے اندرونی نیم تاریک حصے کی طرف دیکھا... رائفل کے دستے پر بے ساختہ میری گرفت مضبوط ہو گئی۔ ”باہر نکلو“ میں نے ایک ساتھ سب سے مخاطب ہو کر کہا۔

لیکن اس سے پہلے کہ ہم اپنی جگہ سے حرکت کرتے

بس

عورتوں سے ایک بھری بس کہیں جا رہی تھی کہ اس کا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ ان سب عورتوں کے شوہر ایک ایک ہفتے روتے رہے۔ ایک آدمی دو ہفتے روتا رہا۔ کسی نے اس سے پوچھا کہ تم دو ہفتے کیوں روتے رہے ہو تو اس نے کہا کہ میری بیوی کی بس چھوٹ گئی تھی۔

مرغا

باپ حیرانی سی۔ ”بیٹا تم مرغا کیوں بنے ہوئے ہو؟“

بیٹا۔ ”ابا جان آپ نے ہی تو کہا تھا کہ اسکول میں جو کام کروایا جائے اسے گھر آکر دہرایا جاتا ہے۔“

اسکردو سے سجاد علی شگری کی سوغات

ایک کرخت آواز نے ہمارے قدم جکڑ لیے۔ ”باہر نہیں نکلو... بس یہیں پر کھڑے رہو۔“

آواز کھوہ کے تاریک حصے میں سے آئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی دو فائر ہوئے ایک گولی رضوان کے سر پر سے اور دوسری میرے سر پر سے گزر گئی۔ دوسری کڑک دار آواز سنائی دی۔ ”بندوقیں پھینکو، نہیں تو مارے جاؤ گے۔“

لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں، کر بھی سکتے ہیں۔ سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ وہ ہمیں دیکھ رہے تھے اور ہم انہیں دیکھ نہیں سکتے تھے۔ یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ ان کی تعداد کیا ہے اور ان کے پاس کیا اسلحہ ہے۔ اس صورت حال میں رائفلیں پھینکنے کے سوا چارہ نہیں تھا۔ پہلے میں نے کلاشنکوف زمین پر گرائی پھر رضوان نے بھی رائفل پھینک دی۔ تاجور کا چہرہ لیموں کی طرح زرد ہو رہا تھا۔ ابھی اس نے نوری کی لاش نہیں دیکھی تھی، ورنہ شاید بے ہوش ہو کر گر جاتی۔ دراصل سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا کہ مجھے کچھ سوچنے سمجھنے کا موقع ہی نہیں ملا۔

جلد ہی ہمیں اندازہ ہو گیا کہ ہم نے ہتھیار پھینک کر اچھا کیا ہے، کھوہ کی تاریکی سے نکل کر ہمارے سامنے آنے والے افراد کی تعداد چار تھی، اور چاروں ہی مسلح تھے۔ دو افراد نے آٹومیٹک رائفلیں ہماری طرف سیدھی کر رکھی تھیں جبکہ باقی دو افراد کے پاس بھی رائفلیں موجود تھیں۔ یہ

چاروں ملنگی ڈیرے کے نیلے کپڑوں والے محافظ تھے اور ان کی سفاکیاں ہم پچھلے دنوں میں ملاحظہ کر ہی چکے تھے۔ ان چاروں کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں، جیسے رات بھر نشے میں دھت رہے ہوں۔ اب بھی وہ نشے میں ہی لگتے تھے۔ ان میں مجھے وہ رنگا نامی محافظ بھی نظر آیا جس نے شروع میں ہمیں پکڑا تھا (اس شخص سے یہ غلطی ہوئی تھی کہ اس نے مجھے، چاچا رزاق اور تاجور کو ایک ہی کوٹھڑی میں بند کیا تھا اور اس کے لیے اسے سزا بھی بھگتنا پڑی تھی) دو رائفل برداروں کی انگلیاں لبلبی پر تھیں، اور وہ ایک لمحے میں ہم پر پگھلے ہوئے سیسے کی بوچھاڑ کر سکتے تھے۔

ایک شخص نے اپنے ٹوٹے ہوئے دانت کی نمائش کی اور زہرخند لہجے میں بولا۔ ''ڈیرے کی طرف سے فائرنگ کی آوازیں آرہی تھیں۔ ہمیں پتا تھا کوئی گڑبڑ ہو چکی ہے۔ اب تم منحوسوں کی شکل میں یہ ''گڑبڑ'' ہمارے سامنے کھڑی ہے۔''

ریشمی ابھی تک ان لوگوں کی نظروں سے اوجھل تھی، لیکن وہ اکیلی عورت ذات تھی اور غم کے گھیرے میں تھی، وہ بھلا کیا کر سکتی تھی۔

رائفل برداروں نے حکم دیا کہ ہم اپنی پھینکی ہوئی رائفلوں سے دور ہٹ جائیں اور خود کو دیوار کے ساتھ لگالیں۔

ان کی ہدایت پر عمل کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ مکمل طور پر ہم پر حاوی تھے لیکن وہ اس آگ سے بے خبر تھے جو نوری کی ترس ناک لاش دیکھنے کے بعد میرے سینے میں بھڑک چکی تھی۔ اس کا نتیجہ ان لوگوں کے لیے بہت برا نکلنے والا تھا مگر یہ نتیجہ کیسے نکلے گا، خود مجھے بھی پتا نہیں تھا۔

ذرا دیر بعد باہر سے رونے چلانے کی نسوانی آوازیں آئیں۔ یقیناً یہ ریشمی ہی تھی۔ چند سیکنڈ بعد ایک ہٹا کٹا محافظ ریشمی کو بازو سے پکڑ کر کھینچتا ہوا کھوہ میں لے آیا۔ محافظ کے دوسرے ہاتھ میں پستول تھا۔ اس نے دھکا دے کر ریشمی کو نوری کی لاش کے پاس گرا دیا۔ وہ وہیں پڑی، سسکتی رہی۔

ٹوٹے ہوئے دانت والا شخص ان محافظوں کا انچارج لگتا تھا۔ اس نے غور سے ریشمی کو دیکھا اور طنزیہ انداز میں بولا۔ ''اوہو... تو پاک بہن بھی یہاں موجود ہے۔ یہ تو بڑی برکت والی صبح ہے کہ پاک بہن کے قدم یہاں پڑے ہیں۔''

نئے آنے والے ہٹے کٹے شخص نے ہانپتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''دلام صاحب! ڈیرے پر بہت گڑبڑ لگ رہی ہے۔ پل ٹوٹ کر کھائی میں گرا ہوا ہے۔ میں دور سے ٹھیک طرح دیکھ نہیں سکا لیکن لگتا ہے کہ پل کی دوسری طرف کافی لڑائی ہوئی ہے اور دستی بم بھی پھینکا گیا ہے۔''

دلام نامی انچارج نے گمبھیر آواز میں کہا۔ ''جو کچھ ہوا ہے یہ ان حرام کے جنوں کی وجہ سے ہی ہوا ہے۔ یہ وہاں سے پاک بہن کو لے کر بھاگے ہیں۔ یہاں اس طرف آنے کے بعد انہوں نے پل توڑ دیا ہے۔''

نئے آنے والے پہرے دار نے اپنے پستول کا دستہ پورے زور سے رضوان کی گدی پر مارا، وہ اوندھے منہ گرا اور کراہنے لگا۔ صورتِ حال کی سنگینی نے رضوان کے خوبرو چہرے پر ہلدی سی پھیر دی تھی۔

اسی دوران میں دلام کی نظر میری کمر سے بندھے چرمی غلاف پر پڑ گئی۔ اس میں تیز دھار خنجر تھا۔ اس نے غضب ناک آواز میں مجھے حکم دیا کہ میں خنجر غلاف سے نکال کر رائفلوں کے قریب پھینک دوں۔ میں نے خنجر پھینک دیا۔ ''اور کیا ہے تمہارے پاس؟'' وہ پھنکارا۔

''کچھ نہیں۔''

''اگر کچھ نکل آیا تو بہت برا حال کروں گا۔'' وہ بولا۔

اس کی آواز میں بے پناہ سفاکی تھی اور اس سفاکی کا ثبوت نوری کی لاش کی صورت میں میرے سامنے تھا۔ پتا نہیں کیوں میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ نوری کو کسی نے قتل نہیں کیا بلکہ خود پر ٹوٹنے والے ستم سے عاجز آکر اس نے خود اپنی جان لی ہے۔ (بعدازاں یہ اندازہ درست ثابت ہوا)

صبح کے سورج کی سنہری کرنیں اب کھوہ کے اندر تک آنے لگی تھیں۔ ہوا کا ایک سرد جھونکا آیا اور اس نے نوری کے چہرے پر پڑا ہوا کپڑا الٹ دیا۔ تاجور اور ریشمی کی نگاہ پہلی بار نوری کے چہرے پر پڑی۔ ریشمی تو سکتہ زدہ کھڑی رہی مگر تاجور نے لرز کر ''نوری'' پکارا اور پھر چلتی ہوئی اس کی طرف لپکی۔ ''رک جاؤ۔'' دلام دہاڑا۔

لیکن وہ رکنے والی کہاں تھی۔ وہ اس کی لاش سے لپٹ گئی اور دہاڑیں مار مار کر رونے لگی۔

دلام نے ہمارے قدموں کے قریب زمین پر دو فائر کیے اور دھمکی آمیز انداز میں گرجا۔ ''خبردار، کوئی ہلا تو۔''

ابھی ہلنے کا موقع بھی نہیں تھا۔ تاجور بلک رہی تھی اور کہہ رہی تھی۔ ''نوری آنکھیں کھولو... نوری میری طرف دیکھو۔'' پھر وہ رائفل برداروں کی طرف چہرہ پھیر کر بولی۔ ''تم نے اسے مار دیا... اس کی جان لے لی، تم قاتل ہو، درندے ہو.....''

وہ ایک بار پھر لاش سے لپٹ کر آنسو بہانے لگی۔

کچھ دیر بعد دلام نے ہٹے کٹے پہرے دار کو اشارہ

کیا۔ اس نے تاجور کو بازو سے پکڑا اور کھینچ کر ہمارے قریب کھڑا کر دیا۔ ریشمی سسک رہی تھی اور آنسو دھاروں کی طرح اس کے رخساروں پر حرکت کر رہے تھے۔ ٹوٹے دانت والے دلام کی کرخت آواز ایک بار پھر ہمارے کانوں میں گونجی۔ ''تم سب اپنے منہ دیوار کی طرف کر لو... چلو جلدی کرو۔''

ہمیں تذبذب میں دیکھنے کے بعد اس نے ایک بار پھر فائر کیے۔ اس مرتبہ یہ پورا برسٹ تھا اور ہمارے قدموں کے بالکل قریب چلایا گیا تھا۔ بہت سے سنگریزے اُڑ کر ہمارے زیریں جسموں سے ٹکرائے اور کھوہ میں بارود کی تیز بو پھیل گئی۔ ان لوگوں کے سر پر خون سوار تھا اور یہ ہر حد تک جانے کے موڈ میں تھے۔

میں نے انیق اور رضوان کو اشارہ کیا۔ ہم نے اپنے منہ دیوار کی طرف پھیر لیے۔ تاجور ابھی تک ہچکیاں لے رہی تھی۔ میں نے گھما کر اس کا منہ بھی دیوار کی طرف کر دیا۔

''اسی طرح نیچے زمین پر بیٹھ جاؤ۔'' دلام نے نیا حکم جاری کیا۔

ہم بیٹھ گئے۔ میں نے کندھے کے پاس سے تاجور کا بازو تھام رکھا تھا کہ کہیں وہ اضطراب میں کوئی غلط حرکت نہ کر بیٹھے۔ میری دائیں جانب انیق تھا۔ اس کے زخم سے مسلسل خون رس رہا تھا۔

یہ لوگ کافی ہوشیار تھے۔ ان کے شکنجے سے نکلنا آسان نہیں تھا۔ مگر میری پوری صلاحیتیں بیدار تھیں اور ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ میں نے وہیں اسی پوز میں بیٹھے بیٹھے دلام سے پوچھا۔ ''اس بے گناہ کے خون سے ہاتھ کیوں رنگے تم نے؟ زندگی تک چھین لی اس کی؟''

وہ پھنکارا۔ ''خود مری ہے، یہ حرام زادی۔ پہلے گولی چلا کر میرے بندے کا ہاتھ پھٹل کیا پھر خود کو فائر مار لیا۔''

''تم نے اسے اس حال تک پہنچایا تو اس نے فائر مارا نا۔ اس عمر میں مرنے کو کس کا دل چاہتا ہے۔''

''بہت پیار سے رکھا ہوا تھا اِسے... لیکن بہت بڑی الو کی پٹھی نکلی یہ۔''

میں نے دل میں سوچا... تم لوگوں کا پیار تو نظر آ رہا ہے اس کے چہرے پر اور ہاتھ پاؤں پر۔ وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''لیکن تم الو کے پٹھے اور الو کی پٹھیاں نہ نکلنا۔ جس طرح کہا ہے، اسی طرح بیٹھے رہو۔ ہم ذرا آپس میں مشورہ کر لیں کہ تم لوگوں کی کیا خدمت کی جا سکتی ہے۔''

رضوان نے کراہتی ہوئی سی آواز میں کہا۔ ''میں...

تم سے بات کرنا چاہتا ہوں دلام بھائی۔''
دلام پھنکارا۔ ''پردے والی سرکار سے غداری کر کے، تم نے بات کرنے کا حق کھو دیا ہے سوہنے منڈے۔ اب تیرا بھی وہی انجام ہوگا جو اِن کا ہوگا۔''
ایک دوسرے پہرے دار نے رضوان سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''بدبختا! اچھی بھلی رات کی نوکری ملی ہوئی تھی تجھے... اور وہ بھی بستر پر۔ تو نے اپنے مقدر کو خود لات ماری ہے۔ اب چونچ بند رکھ... اور ذرا چھری تلے سانس لے۔''
انہوں نے آپس میں کھسر پھسر شروع کر دی۔ نوری کے ساتھ جو کچھ ہوا، اس کے متعلق اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا۔ وہ پانچ چھ دن پہلے ملنگی ڈیرے واپس آنے پر پکڑی گئی تھی۔ مگر بدنیت دلام یا اس کے کسی ساتھی نے اس کے پکڑے جانے کو راز رکھا تھا۔ یہ لوگ اسے چھپا کر یہاں لے آئے تھے۔ ملنگوں کے لیے یہ جگہ ایک چیک پوسٹ کی طرح تھی۔ اس طرف بالکل سنسان پہاڑیاں تھیں مگر پھر بھی یہاں لکڑی کا پل موجود تھا۔ لہٰذا چند پہرے دار یہاں رہتے تھے۔ بدنصیب نوری دو تین دن سے یہیں موجود تھی، آج رات پچھلے پہر جب یہ لوگ سو رہے تھے، وہ کسی طرح ایک پستول تک پہنچ گئی تھی، اس نے پہلے ایک پہرے دار پر فائر کیا مگر نشانہ خطا جانے کے بعد اس نے دوسرا فائر اپنے کنپٹی پر کر کے اپنی زندگی ختم کر لی تھی۔ اب کھوہ کے اندر جو گڑھا کھدا ہوا نظر آ رہا تھا، وہ یقیناً نوری کے جسدِ خاکی کے لیے ہی تھا۔ یہ بہت دکھ دینے والا واقعہ تھا۔
پہرے داروں کی کھسر پھسر جاری تھی۔ کبھی کبھی کسی کی آواز بلند بھی ہو جاتی تھی۔ ایک دو بار کسی سیل فون کا ذکر بھی ہوا۔ یہ سیل فون شاید رنگا کا تھا اور وہ کام نہیں کر رہا تھا۔ اس پر رنگا کو ''انچارج دلام'' سے ڈانٹ بھی پڑی۔ دلام نے رنگا کے لیے ''کنجر کے پتر'' کا لفظ استعمال کیا اور کہا کہ اگر فون کام کر رہا ہوتا تو ڈیرے کی صورتِ حال کا پتا تو چلتا۔
لگتا تھا کہ یہ سیل فون، ان کے پاس ڈیرے سے رابطے کا واحد ذریعہ تھا اور وہ چارجنگ نہ ہونے کے سبب یا کسی اور وجہ سے بند ہو گیا تھا۔
کچھ دیر بعد دلام اور اس کے ساتھیوں کی مشاورت ختم ہو گئی۔ دلام غالباً شراب بھی پی رہا تھا کیونکہ جب وہ بولا تو اس کی آواز میں لڑکھڑاہٹ نمایاں تھی۔ اس نے کہا۔ ''بتاؤ اب کیا کیا جائے تم پانچوں کے ساتھ...''
میں نے کہا۔ ''بہتر تو یہی ہے کہ چھوڑ دیا جائے، کیونکہ...''

اس نے میری بات کاٹ کر کہا۔ ''میرے لال بجھکو، دل تو میرا بھی یہی چاہتا تھا کہ چھوڑ دیا جائے۔ کیونکہ تم میں دو سوہنی سوہنی کڑیاں بھی ہیں۔ جو اس اینگل سے بھی سوہنی ہی لگ رہی ہیں لیکن... مسئلہ یہ ہے لال بجھکو کہ تم اور تمہارے ساتھی کافی بدبخت ثابت ہوئے ہو، پہلے تم لاہوری منڈے کے قتل کے گواہ بن گئے اور جنگلارے میں جا پہنچے۔ اب خیر سے تم اس نوری کے قتل کے ''چشم دید گواہ'' ہو گئے ہو، اب تمہیں چھوڑنا خود کو سخت مصیبت میں ڈالنا ہے۔''
رضوان نے منہ پھیر کر کچھ کہنا چاہا۔ دلام لڑکھڑاتی آواز میں دہاڑا۔ ''خبردار اپنا منہ دیوار کی طرف رکھ، ورنہ پہلی گولی تیرے بھیجے میں گھسے گی۔''
اس کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ ٹُن ہو رہا ہے اور کسی بھی وقت کچھ بھی کر سکتا ہے۔ اب مزید انتظار خطرناک تھا۔ یہ لوگ یقیناً ہمیں مارنے کا فیصلہ کر چکے تھے اور اس کی بڑی وجہ نوری کی موت ہی تھی۔ نوری کے ساتھ ان لوگوں نے جو کچھ کیا تھا، وہ ڈیرے میں کسی کے علم میں نہیں تھا۔ اب یہ لوگ مجاوروں اور ''پردے والی سرکار'' کے غضب سے بچنے کے لیے ہمیں بھی مار دینا چاہتے تھے۔ یہ ہمیں بھی یہاں کہیں دفن کر سکتے تھے یا پھر کہہ سکتے تھے کہ ہم بھاگنے کے دوران میں ان کی گولیوں کا شکار ہوئے ہیں۔ یوں ان کے سینوں پر شاباشی کا تمغا بھی سج سکتا تھا۔ ان کو جو کچھ بھی کرنا تھا، جلدی کرنا تھا، کیونکہ یہ جانتے تھے کہ پل ٹوٹنے کے بعد ملنگی ڈیرے سے بہت سے لوگ ہم پانچوں کے تعاقب میں نکل پڑے ہوں گے۔ وہ کھائی کا چکر کاٹ کر یہاں آئیں گے اور اس کام میں اب انہیں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔
میں نے دیوار کی طرف رخ رکھے رکھے کہا۔ ''میں تمہیں ایک خبر دینا چاہتا ہوں دلام! اور اس کے ساتھ ساتھ ایک آفر بھی کرنا چاہتا ہوں۔''
''فرماؤ۔'' اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔
''تمہاری پردے والی سرکار اللہ کو پیاری ہو چکی ہے۔ ڈیرے پر ہونے والی جھڑپ میں کئی اور بڑے مجاور بھی ختم ہو گئے ہیں۔''
''کیا بکواس کر رہے ہو؟'' دلام دہاڑا۔ اس کے سر پر جیسے کسی نے وزنی بم پھوڑ دیا تھا۔

خونریزی اور بربریت کے خلاف
صف آرا نوجوان کی کھلی جنگ
باقی واقعات آیندہ ماہ پڑھیے

محمد فاروق انجم

بھرم

احساسات... واقعات کی پیداوار ہوتے ہیں... واقعات رونما نہ ہوں تو احساسات جذبات کہیں دور جا سوئیں... لیکن واقعات کی لہریں زندگی کے دریا میں کبھی تند اور کبھی سبک انداز میں اٹھتی رہتی ہیں... ایسے ہی گھر کی کہانی جس کے مکین محبتوں اور چاہتوں کے خمیر سے گندھے تھے... دونوں کی طویل رفاقت نے انہیں ایک دوسرے کا مزاج آشنا ہونے کے ساتھ ساتھ چہرہ شناس بھی بنا دیا تھا... لمحوں میں دل کے بھید جان لیتے تھے... آخری دم تک اپنے شوہر کا بھرم رکھنے والی عورت کا خوب صورت و دل گداز فسانہ...

پیمانۂ محبت کے تقاضوں پر پورا اترنے والوں کی صداقت...

اسپتال کی طویل راہداری سے گزرتے ہوئے پروفیسر خاور صدیقی کے قدم ایسے اُٹھ رہے تھے جیسے اُن میں جان ختم ہوگئی ہو اور ہر قدم ایک من وزنی ہوگیا ہو۔ اُن کا چہرہ اُترا ہوا تھا اور چہرے سے پریشانی عیاں تھی۔ وہ محسوس کر رہے تھے کہ اب اُن کے بوڑھے جسم میں توانائی ختم ہو چکی ہے، وہ اپنا بوجھ گھسیٹ کر چل رہے ہیں۔ انہیں یہ بھی اندیشہ تھا کہ وہ اس راہداری سے باہر نہیں نکل پائیں گے اور کسی بھی وقت گر جائیں گے۔ چلنا دوبھر ہو رہا تھا لیکن وہ پھر بھی چل رہے تھے۔

اس اندیشے کے باوجود وہ چلتے رہے اور راہداری عبور کر کے دروازے تک جا پہنچے اور اسپتال کی عمارت سے باہر نکل کر ایک طرف کھڑے ہوگئے۔ پروفیسر صدیقی کے

بالکل سامنے سڑک کے سرے پر وہ گیٹ تھا جس سے گزر کر وہ اسپتال کی حدود سے باہر نکل سکتے تھے۔

دن اپنا سفر مکمل کر کے شام کے اندھیرے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ آغاز سرما کا وہ دن بھی نہ زیادہ گرم اور نہ زیادہ سرد۔ پروفیسر صدیقی گیٹ کی طرف چل پڑے۔ ان کی چال دھیمی اور بوجھل سی تھی۔ چہرہ سوچوں اور اداسی میں ڈوبا ہوا تھا۔

پروفیسر صدیقی اپنی بیوی کو آج صبح ہی اس اسپتال میں لے کر آئے تھے۔ یہ شہر کا سب سے بڑا دل کا اسپتال تھا۔ چند ہفتے قبل ان کی بیوی عذرا کو دل کی تکلیف ہوئی تھی اور پھر ایک رات ہلکا سا ہارٹ اٹیک بھی ہو گیا۔ بروقت طبّی امداد سے عذرا ایک بڑے ہارٹ اٹیک سے بچ گئی تھیں لیکن ڈاکٹر نے چیک اپ کے بعد کہہ دیا تھا کہ ان کا بائی پاس آپریشن لازمی ہے، ورنہ کسی بھی وقت ان کو ہارٹ اٹیک ہو سکتا تھا۔ جو اُن کے لیے جان لیوا بھی ثابت ہو سکتا ہے۔

وقتی طور پر ڈاکٹر نے کچھ دوائیں لکھ دی تھیں جن کو کھانے سے افاقہ بھی ہوا تھا لیکن وہ دوائیں آپریشن کا نعم البدل نہیں تھیں۔ تکلیف پھر سر اُٹھانے لگی تھی اور دوبارہ چیک اپ کے بعد ڈاکٹر نے واضح بتا دیا تھا کہ ان کا جتنی جلدی آپریشن ہو جائے اتنا ہی بہتر ہے۔ عذرا کی حالت روز بروز خراب ہو رہی تھی اور آج صبح پروفیسر صدیقی اپنی بیوی کو اسپتال لے آئے تھے۔ انہوں نے عذرا کو یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ آپریشن کی غرض سے اسپتال لے کر جا رہے ہیں بلکہ یہ کہا تھا کہ وہ چیک اپ کے لیے لے کر جا رہے ہیں۔ اسپتال پہنچ کر جب عذرا کو اسپتال میں داخل کر لیا گیا تو عذرا نے متحیّر ہو کر پوچھا۔

''آپ تو کہہ رہے تھے کہ میرا چیک اپ ہونا ہے؟''

''ڈاکٹر صاحب کہہ رہے ہیں کہ اب آئے ہو تو لگے ہاتھوں ان کا بائی پاس آپریشن بھی کرالو۔'' پروفیسر صدیقی مسکرا کر بولے۔

عذرا اُن کا چہرہ تکنے لگیں۔ وہ وہیل چیئر پر تھیں اور ایک تیس سال سے زیادہ عمر کی نرس کلثوم ان کے پاس کھڑی تھی۔ کلثوم کا چہرہ کھِلا ہوا تھا اور اس اسپتال میں کام کرنے والی تمام نرسوں سے زیادہ اچھی عادات کی وہ مالک تھی۔ وہ سب کے ساتھ مسکرا کر اور دھیمے لہجے میں بات کرنے کی عادی تھی۔

کلثوم کو نرس کے فرائض انجام دیتے ہوئے چند سال ہو گئے تھے لیکن عذرا کی شخصیت میں اسے ایک عجیب سی کشش دکھائی دی تھی۔ ان کا چہرہ محبت سے بھرا ہوا تھا اور کلثوم کا دل چاہا کہ وہ سب مریضوں کو چھوڑ کر صرف عذرا کی دیکھ بھال پر مامور ہو جائے۔ وہ اسے بالکل اپنی ماں جیسی لگ رہی تھیں۔

وہیل چیئر کو پروفیسر صدیقی کمرے تک لے گئے تھے، ان کے ساتھ کلثوم بھی چل رہی تھی۔ اسپتال کے کمرے کے بیڈ پر عذرا کو لٹا دیا گیا تھا اور پروفیسر صدیقی بہانہ تلاش کر رہے تھے کہ وہ کسی طرح کمرے سے باہر چلے جائیں۔ کیونکہ عذرا کی سوالیہ نگاہیں بدستور ان کا تعاقب کر رہی تھیں۔ اگر کلثوم کمرے میں نہ ہوتی تو عذرا ان پر سوالوں کی بوچھاڑ کر دیتیں۔ عذرا کے ہر سوال کا جواب ان کے پاس نہیں تھا بلکہ ان کے اپنے اندر اُٹھنے والے سوال بھی جواب سے عاری تھے۔

''میں پانی کی بوتل لے آؤں۔'' پروفیسر نے کمرے سے جانے کا بہانہ تلاش کر ہی لیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ کمرے سے باہر نکل گئے تھے۔

پروفیسر صدیقی نے بڑی تسلی سے پانی کی بوتل خریدی اور دھیرے دھیرے چلتے ہوئے واپس کمرے میں آئے تو عذرا ان کی منتظر تھیں۔ کلثوم اس وقت کمرے میں نہیں تھی۔ پروفیسر صدیقی نے پانی کی بوتل ایک طرف رکھی اور بولے۔

''تم ٹھیک ہو؟''

''کیا میرا بائی پاس آپریشن ہو رہا ہے؟'' عذرا نے ان کے سوال کا جواب دینے کے بجائے متانت سے پوچھا۔

''ہاں ڈاکٹر صاحب کہہ رہے ہیں کہ آپریشن ہوگا۔'' پروفیسر صدیقی نے آنکھیں ملائے بغیر جواب دیا۔

''میرے آپریشن کے لیے پیسے ہیں آپ کے پاس؟'' عذرا کی نگاہیں ابھی تک ان کے چہرے پر مرکوز تھیں۔

اس سوال کا جواب پروفیسر صدیقی کے پاس نہیں تھا۔ وہ چپ ہو کر سوچنے لگے کہ وہ کیا جواب دیں۔ تیس سال کی اس رفاقت میں عذرا اپنے شوہر کو اپنی ذات سے بھی زیادہ جانتی تھیں۔ انہیں معلوم تھا کہ وہ جھوٹ نہیں بولتے۔ انہوں نے ساری زندگی کبھی کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلایا تھا۔ اپنی ضرورت کے لیے بھی انہوں نے کبھی کسی سے سوال نہیں کیا۔ جب شادی کے شروع کے ایام میں پروفیسر صدیقی کنٹریکٹ پر پڑھاتے تھے اور پھر ان کی جاب چلی گئی تھی تو بھی انہوں نے ساڑھے تین ماہ تک وہی خرچ کیا تھا جو انہوں

نے پس انداز کیا تھا۔ وہ پیدل آتے جاتے تھے۔ شیو کرنے کے لیے جب شیونگ کریم ختم ہوگئی تھی تو وہ پانی کے ساتھ شیو کرتے تھے۔ اور بھی انہوں نے اپنی ضروریاتِ زندگی کو بہت محدود اور ختم کر دیا تھا۔ اس کڑے وقت میں انہوں نے ایسے ہی بھرم میں وہ چپتی دوپہر گزار دی تھی۔

جب وہ ریٹائر ہوئے اور جو کچھ ملا، وہ انہوں نے اپنے اکلوتے بیٹے کو کاروبار کے لیے دے دیا۔ بیٹے نے کاروبار سیٹ کیا، اپنی پسند کی شادی کی اور ان کو خدا حافظ کہہ کر الگ سے دنیا بسالی۔

پروفیسر صدیقی نے ایک بار بھی بیٹے کے پاس جاکر اپنا دیا ہوا پیسہ نہیں مانگا اور خاموش ہوگئے۔ جبکہ عذرا نے کئی بار کہا تھا کہ اگر بیٹے نے ان کے ساتھ ایسا کیا ہے تو آپ کو حق ہے کہ آپ اپنا پیسہ اس سے مانگیں لیکن پروفیسر صدیقی نے تقاضا نہیں کیا۔

اب ان کی گزر بسر پنشن پر تھی۔ عذرا جانتی تھیں کہ ان کے پاس پس انداز کی ہوئی کوئی رقم نہیں ہے۔ ان کے پاس ایک چھوٹے سے گھر کے سوا کوئی قیمتی چیز نہیں ہے کہ جسے وہ بیچ سکیں۔

''میں نے آپ سے کچھ پوچھا ہے؟'' پروفیسر صدیقی کی خاموشی دیکھ کر عذرا نے پھر کہا۔

پروفیسر صدیقی چونکے اور مسکرا کر بولے۔ ''سب ٹھیک ہوجائے گا۔''

''کیسے ٹھیک ہوجائے گا۔ میں نے کلثوم سے پوچھ لیا ہے کہ میرے آپریشن پر کتنا خرچہ آئے گا۔ جتنا خرچہ اس نے بتایا ہے اتنے پیسوں کا انتظام کرنا بہت مشکل ہے۔'' عذرا نے کہا۔

''تم آرام کرو اور یہ سب سوچنا چھوڑ دو۔ سب ٹھیک ہوجائے گا۔'' پروفیسر صدیقی نے عذرا کی چادر ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔

''آپ ابھی مجھے یہاں سے لے جائیں۔ ڈاکٹر صاحب سے صاف کہہ دیں کہ ہمارے پاس آپریشن کے لیے پیسے نہیں ہیں۔ ہم آپریشن نہیں کراسکتے۔ آپ مجھے گھر پر ہی مرنے دیں۔'' عذرا نے جلدی سے کہا۔

''تم کیسی بات کررہی ہو۔ تم جانتی ہو کہ تمہارا معاملہ سنگین ہوگیا ہے۔ تم اب چل پھر نہیں سکتی ہو، تمہارے سینے میں تکلیف شروع ہوجاتی ہے، بائی پاس آپریشن بہت ضروری ہوگیا ہے۔'' پروفیسر صدیقی نے پیار سے سمجھایا۔

''صبح تک آپ کو میرے آپریشن کے لیے وہ بڑی رقم جمع کرانی ہے۔ کہاں سے کرائیں گے؟'' عذرا نے متانت سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''سب ٹھیک ہوجائے گا۔'' پروفیسر صدیقی کے پاس اس کے سوا کوئی جواب نہیں تھا۔ پتا نہیں وہ اپنے آپ کو تسلی دے رہے تھے کہ اپنی بیوی کو۔

''آپ کا یہ جملہ سنتے ہوئے میرے سر پر سفید بال آگئے ہیں۔'' عذرا بولیں۔

پروفیسر صدیقی نے عذرا کے سر کے بالوں میں جھانکا اور کہا۔ ''مجھے تو ایک بھی بال سفید نظر نہیں آرہا ہے۔''

''اس وقت آپ کا مذاق مجھے اچھا نہیں لگ رہا ہے۔'' عذرا نے کہا۔

اچانک عذرا کے سینے میں تکلیف ہونے لگی۔ پروفیسر صدیقی بھاگ کر ڈاکٹر کو بلا لائے۔ انہوں نے نرس کو ایک ٹیکا لگانے کا کہا اور زیادہ بات کرنے سے منع کرکے چلا گیا۔ کلثوم کے ٹیکا لگانے سے عذرا کو نیند آگئی۔

پروفیسر صدیقی اپنی بیوی کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔ ان کی جیب میں آپریشن کے لیے بالکل بھی پیسے نہیں تھے لیکن عذرا کا آپریشن ناگزیر تھا۔ صبح نو بجے تک ان کو آپریشن کی رقم جمع کرانی تھی۔

''اگر آپ ان کے پاس رہیں تو میں تھوڑی دیر کے لیے کہیں جانا چاہتا ہوں۔'' پروفیسر صدیقی نے کلثوم سے کہا۔

''انکل آپ بے فکر ہوکر جائیں، میں ان کے پاس ہوں۔'' کلثوم نے مسکرا کر کہا۔ پروفیسر صدیقی نے ایک بار پھر اپنی رفیقِ حیات کا چہرہ دیکھا اور کمرے سے باہر نکل گئے۔

وہ اسپتال کے باہر سڑک کی ایک جانب کھڑے سوچ رہے تھے کہ وہ کہاں جائیں؟ صبح نو بجے ان کو آپریشن کے لیے پیسے جمع کرانے تھے۔ سب سے پہلا خیال یہی آیا کہ وہ اپنے بیٹے کے پاس چلے جائیں۔ ساری زندگی بھرم سے گزر گئی تھی لیکن اب بیوی کے لیے انہیں اپنے بیٹے کے آگے ہاتھ پھیلانا ہی تھا۔ اس میں کچھ غلط بھی نہیں تھا۔ وہ ان کی اولاد تھی، اس کو انہوں نے پالا پوسا تھا، پڑھایا تھا اور کاروبار کے لیے اپنا پیسہ دیا تھا۔ اس کا فرض تھا کہ وہ اپنے والدین کے لیے اپنی کمائی خرچ کرے۔ لیکن پھر یہ خیال آیا کہ جو بیٹا اپنے پیروں پر کھڑا ہوتے ہی ان کو چھوڑ کر چلا گیا، اب اس سے کیا اپنی ضرورت کا رونا روئیں لیکن پھر خیال آیا کہ بیوی کی زندگی کے لیے انہیں بیٹے سے دستِ سوال کرنا ہی پڑے

گا۔ بات ان کی اپنی ذات تک ہوتی تو وہ نظر انداز کرسکتے تھے۔ وہ اس سے بھی زیادہ تکلیف برداشت کرسکتے تھے لیکن اب بات ان کی بیوی کی تھی جو اُن کے اکلوتے بیٹے کی ماں بھی تھیں۔

یہ سوچ کر پروفیسر صدیقی جیسے ہی سڑک عبور کرنے کے لیے آگے بڑھے ایک کار ان سے ایک فٹ کے فاصلے پر آرکی، اس کار کے اچانک بریک لگانے پر ٹائر چرچرائے تھے اور پروفیسر صدیقی نے بھی گھبرا کر کار کی طرف دیکھا۔

کار رک چکی تھی۔ اچانک کار کا دروازہ کھلا اور ایک شخص باہر نکلا۔ اس نے پروفیسر صدیقی کو دیکھتے ہی کہا۔

''پروفیسر صدیقی...... تم اس عمر میں میری کار کے نیچے آکر مجھے جیل کی ہوا کھلانا چاہتے ہو؟''

اتنا بے تکلفانہ جملہ سن کر پروفیسر صدیقی نے اس شخص کی طرف غور سے دیکھا اور پھر بولے۔ ''ارے زمان علی......''

''شکر ہے تم نے مجھے پہچان لیا۔'' وہ شخص آگے بڑھا اور دونوں.... ایک دوسرے سے بغل گیر ہو گئے۔ دونوں کالج کے زمانے کے دوست تھے۔ ان کی آخری ملاقات تقریباً بارہ سال پہلے ہوئی تھی اور اس کے بعد وہ آج اچانک مل رہے تھے۔

''کہاں جا رہے ہو؟'' زمان علی نے پوچھا۔

''تم کہاں سے آرہے ہو۔'' جواب دینے کے بجائے پروفیسر صدیقی نے سوال کردیا۔

اچانک پیچھے کھڑی گاڑیوں نے ہارن بجائے۔ زمان علی نے ان گاڑیوں کی طرف دیکھا اور پروفیسر صدیقی سے کہا کہ وہ جلدی سے کار میں بیٹھ جائے۔ پروفیسر صدیقی اس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ انہوں نے کار آگے بڑھا دی اور سڑک کی ایک جانب روک دی۔

''اب بتاؤ کیا حال ہے اور کہاں گم ہو تم؟''

''میں تو اسی شہر میں اسی گھر میں رہتا ہوں۔ گم تو تم رہتے ہو۔'' پروفیسر صدیقی نے کہا۔

''تم تو جانتے ہی ہو کہ میرا کاروبار اب اس ملک میں نہیں رہا۔ بچے بڑے ہوئے تو کاروبار بھی باہر لے گئے۔ بیوی فوت ہوگئی اور میں اکیلا ہوگیا۔'' زمان علی کچھ اداس ہوگیا۔

''تم اکیلے کیسے ہوگئے۔ تمہارے پانچ بیٹے ہیں۔'' پروفیسر صدیقی نے کہا۔

''پانچوں اپنے اپنے کاروبار میں مصروف ہیں۔ اچھا کہیں بیٹھتے ہیں۔''

''بیٹھے ہی ہوئے ہیں۔ کار میں کیا کھڑے ہیں۔'' پروفیسر صدیقی کو مذاق سوجھ گیا۔

زمان علی ہنسا۔ ''تم شکل سے بوڑھے ہوئے ہو، اپنی باتوں سے ابھی بھی جوان ہو۔''

''میں شکل سے بھی بوڑھا نہیں لگتا۔ تم اپنی نظر چیک کراؤ۔'' پروفیسر صدیقی نے فوراً اس کی بات کی نفی کردی۔

دونوں نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔

زمان علی نے کار آگے بڑھا دی۔ رات کے سائے گہرے ہوگئے تھے۔ کار کچھ آگے گئی تو زمان علی نے کہا۔

''کہیں جا کر کھانا کھاتے ہیں۔ بھوک لگ رہی ہے۔ کیا خیال ہے؟'' زمان علی نے کہہ کر اس کی طرف دیکھا۔

پروفیسر صدیقی نے صبح محض ناشتا کیا تھا۔ بھوک تو انہیں بھی لگ رہی تھی۔ وہ بولے۔

''کھانے سے بھلا کون انکار کرسکتا ہے۔ بتاؤ کیا کھانا چاہتے ہو؟''

''میں تمہیں اپنی پسند کے ریسٹورنٹ میں لے جا کر اپنی پسند کا کھانا کھلاؤں گا۔''

''اس کا مطلب ہے کہ کھانا تم کھلا رہے ہو؟''

''یہ میری طرف سے دعوت ہے۔''

''ٹھیک ہے لیکن بل میں دوں گا۔''

''اگر وہ ہوٹل والے تم سے بل لے لیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔'' زمان علی کہہ کر ہنسا۔ پروفیسر صدیقی جانتے تھے کہ زمان علی جس ریسٹورنٹ کی طرف جا رہا ہے، وہ اس کے ایک عزیز کا ہے۔ جو کسی بھی صورت پروفیسر صدیقی سے بل نہیں لیں گے۔

گاڑی ریسٹورنٹ کی کار پارکنگ میں کھڑی کردی۔ دونوں باہر نکلے اور ریسٹورنٹ کے ہال میں چلے گئے۔ اس وقت اتنا زیادہ رش نہیں تھا کیونکہ ابھی اتنی زیادہ رات نہیں ہوئی تھی اور لوگ اس ریسٹورنٹ میں کھانے پینے کے لیے دیر سے ہی آتے تھے۔ جیسے جیسے رات گزرتی تھی، اس ریسٹورنٹ میں رش بڑھتا ہی جاتا تھا۔

دونوں ایک میز کی طرف بڑھے اور آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ ویٹر کو کھانے کا پُرتکلف آرڈر دیا اور دونوں باتیں کرنے لگے۔ پرانی یادوں کے ساتھ ایک کے بعد ایک یاد کا

سفر اُلٹنے لگے۔ اس دوران میں کھانا آگیا۔ دونوں کھاتے ہوئے بھی باتیں کرتے رہے اور پرانی باتوں پر ہنستے رہے۔ پروفیسر صدیقی کچھ دیر کے لیے اپنا غم اور فکر بھول گئے تھے۔

کھانے سے فارغ ہوئے تو بھی وہ باتیں کرتے رہے۔ پھر زمان علی نے بل ادا کیا اور دونوں کار میں جا بیٹھے۔

رات کے ابھی ساڑھے نو ہوئے تھے۔

زمان علی نے اس بار اپنی کار کے بریک ایک مکان کے سامنے لگائے۔ پروفیسر صدیقی نے چونک کر دیکھا۔

''یہ تو تمہارا گھر ہے......''

''میں نے سوچا کچھ دیر گھر میں بیٹھتے ہیں۔'' زمان علی نے کہا۔

''مجھے اجازت دے دیتے تو مہربانی ہوتی۔'' پروفیسر صدیقی بولے۔

''تم نے گھر جا کر کون سا ہل چلانا ہے۔ آؤ ابھی بیٹھتے ہیں۔'' زمان علی نے بے پروائی سے کہا۔

زمان علی نے گھر کا دروازہ کھولا اور دونوں اندر چلے آگئے۔ زمان علی گھر کی ایک ایک لائٹ جلانے لگا۔

''تم اکیلے رہتے ہو؟''

''ہاں میں اکیلا رہتا ہوں۔'' زمان علی کا چہرہ یکدم اداسی میں ڈوب گیا۔ دونوں ایک دوسرے کے سامنے بیٹھ گئے۔ زمان علی بولا۔ ''بیوی کے چلے جانے کے بعد میں بالکل ہی اکیلا ہو گیا ہوں۔ بچے اپنے اپنے کاروبار اور اپنی اپنی دنیا میں مصروف ہیں۔ وہ میرا خیال رکھتے ہیں۔ میرے اکاؤنٹ میں ہر ماہ پیسے جمع کرا دیتے ہیں تاکہ میں اپنی ہر ضرورت پوری کر سکوں اور میرا اکاؤنٹ پیسوں سے بھرا ہوا ہے۔ بچے اسے اور بھرے جا رہے ہیں۔''

زمان علی کہہ کر چپ ہو گیا۔ اس کا چہرہ جو کھلکھلا رہا تھا اب اچانک اداسی کی سیاہ گھٹا میں ڈوب گیا تھا۔ پروفیسر صدیقی اس کی طرف دیکھتے ہوئے سوچ رہے تھے کہ کیسی بات ہے، اس کے پاس بیوی کا علاج کرانے کے پیسے نہیں ہیں اور زمان علی اپنے بھرے ہوئے اکاؤنٹ سے پریشان ہے۔

کچھ خاموشی کے بعد زمان علی بولا۔ ''زندگی یہ ہے کہ پورا کنبہ ایک ساتھ بیٹھے، گپ شپ کرے، ہنسے کھیلے، ایک ساتھ کھائے اور مزے کرے۔ یہ زندگی نہیں ہے کہ کنبہ اپنے اپنے کام کی وجہ سے بکھرا ہوا ہے اور بے زبان پیسہ پاس ہے۔ میں کیا کروں اس پیسے کا۔'' زمان علی اُٹھا اور ایک الماری کھول کر اس کی دراز سے ایک چیک بک نکال لایا۔ اس نے وہ چیک بک پروفیسر صدیقی کے سامنے رکھ دی۔

''دیکھو، میں نے پوری چیک بک پر اپنے دستخط کیے ہوئے ہیں۔ مجھے پیسے کی پروا نہیں ہے۔ کوئی لے جاتا ہے تو لے جائے۔ میں تنگ آ گیا ہوں اس زندگی سے...... ایسی تنہائی کی زندگی مجھے ڈسنے لگی ہے۔ سال میں آٹھ ماہ میں بیرونِ ملک اپنے بچوں کے پاس ہوتا ہوں اور بچے مجھے آتے جاتے ایسے پوچھتے ہیں جیسے راہ گیر کسی کا حال پوچھ لے۔ میں یہاں آ جاتا ہوں۔ پرانے دوست اور پرانی یادیں تلاش کرتا ہوں اور رات کو روتا ہوا سو جاتا ہوں۔'' زمان علی اور بھی اداس ہو گیا تھا۔

پروفیسر صدیقی کے سامنے دستخط شدہ چیک بک پڑی تھی۔ وہ کبھی چیک بک کو اور کبھی زمان علی کو دیکھ رہے تھے۔ بیوی کے آپریشن کے لیے جو رقم ... درکار تھی، وہ زمان علی چٹکی بجاتے ہی دے دیتا۔ لیکن پروفیسر صدیقی کے اندر ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ وہ اس سے اپنی ضرورت کہہ سکتے۔ وہ عجیب کشمکش میں اپنے آپ سے لڑ رہے تھے۔ وہ سوچ رہے تھے کہ شاید قدرت نے ان کو زمان علی سے اسی لیے ملوایا ہے کہ ان کی ضرورت پوری ہو سکے۔ لیکن پروفیسر صدیقی سوچ رہے تھے کہ وہ کیسے مانگیں۔ بات کیسے شروع کریں؟

''اب تو بہانہ تلاش کر رہا ہوں کہ مجھے اس زندگی سے چھٹکارا مل جائے۔'' زمان علی نے مرجھائے ہوئے دھیمے لہجے میں ایسے کہا جیسے وہ طویل مسافت سے تھک گیا ہو۔

اچانک دروازے پر بیل ہوئی۔ زمان علی نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔ ''ڈھائی ماہ سے میں یہاں ہوں۔ پہلی بار کسی نے میرے دروازے پر بیل دی ہے، میں دیکھتا ہوں۔''

زمان علی اُٹھا اور دروازے کی طرف چلا گیا۔ پروفیسر صدیقی نے کانپتے ہاتھوں سے چیک بک کو چھوا اور چیک بک کو ایک طرف سے پکڑ کر کھولا، ہر چیک پر زمان علی کے دستخط موجود تھے۔ پروفیسر صدیقی کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ عذرا کا چہرہ سامنے آ گیا لیکن یکدم ایک دھماکا سا ہوا۔ دروازہ ایک دھماکے سے کھلا تھا۔ پروفیسر

صدیقی نے چونکتے ہوئے گھبرا کر عقب کی طرف دیکھا۔ اس گھبراہٹ میں چیک بک نیچے گر گئی تھی۔

پروفیسر صدیقی نے دیکھا کہ زمان علی کو دو نقاب پوشوں نے دبوچ رکھا ہے۔ دونوں کے ہاتھوں میں اسلحہ تھا۔ پروفیسر صدیقی کو دیکھ کر ایک نے اپنی پستول کا رخ ان کی طرف کر لیا۔ وہ گھبرا کر کھڑے ہو گئے۔

''کوئی حرکت نہیں ورنہ گولی مار دوں گا۔'' ایک نقاب پوش نے درشت لہجے میں کہا۔

''دیکھو بھائی جو کچھ لینا چاہتے ہو، لے جاؤ۔ میری نقدی اور میری مرحومہ بیوی کا تھوڑا سا زیور اس الماری میں رکھا ہے۔ اس کے علاوہ اس گھر میں کوئی پیسہ نہیں ہے۔'' زمان علی نے سامنے والی الماری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

ایک ڈاکو فوراً اس الماری کی طرف بڑھا۔ اس نے الماری کی تلاشی لی، سامان دائیں بائیں کیا اور ایک دراز نکال کر پروفیسر صدیقی کے پاس لے آیا اور دراز کو میز پر رکھ دیا۔ اس دراز میں کچھ زیور اور کئی ہزار ہزار کے نوٹ تھے۔ پروفیسر صدیقی کی آنکھیں حیرت زدہ رہ گئی تھیں۔ جتنے پیسے اس دراز میں تھے شاید اتنے ہی پیسوں کی اسے ضرورت تھی۔

سب کچھ سمیٹ کر اس نے ایک تھیلے میں ڈالا اور... پھر زمان علی کے پاس جا کر غصے سے بولا۔

''اور کیا ہے اس گھر میں؟''

''اور کچھ نہیں ہے۔ بس تم لوگوں کے مطلب کی چیز یہی تھی۔'' زمان علی نے بتایا۔

دوسرا نقاب پوش بولا۔ ''نکلتے ہیں۔''

''چلو۔''

دونوں زمان علی کو چھوڑ کر جانے ہی لگے تھے کہ زمان علی نے فوراً گھوم کر ایک کو دبوچ لیا۔ پروفیسر صدیقی کے لیے یہ بات حیران کن تھی کہ ابھی زمان علی کہہ رہا تھا کہ اسے پیسے کی ضرورت نہیں ہے اور اب لوٹنے پر وہ مزاحمت کر رہا تھا۔

اچانک گولی چلی اور زمان علی نے اس ڈاکو کو چھوڑ دیا۔ گولی زمان علی کے پیٹ میں لگی تھی۔ خون نکل رہا تھا اور زمان علی کے دونوں ہاتھ اس جگہ پر تھے جہاں گولی لگی تھی۔ گولی چلاتے ہی دونوں ڈاکو بھاگ نکلے۔

''یہ کیا کیا تم نے؟ تم نے مزاحمت کیوں کی؟'' پروفیسر صدیقی فوراً بھاگ کر اس کے پاس چلے گئے۔ زمان علی کا خون تیزی سے بہہ رہا تھا اور وہ نیچے فرش پر لیٹ گیا تھا۔

زمان علی گھٹی اور تکلیف دہ آواز میں بولا۔ ''میں نے ان کو رقم کے لیے نہیں پکڑا تھا۔''

''پھر کیوں پکڑا تھا؟'' پروفیسر صدیقی نے پوچھا۔

''میں نے تمہیں بتایا تھا کہ میں اس زندگی سے تنگ آ چکا ہوں۔ میں نے مزاحمت اسی لیے کی تھی کہ وہ مجھے گولی مار دیں...... اور انہوں نے مجھے گولی مار دی......'' زمان علی بولا۔

''میں ریسکیو کو فون کرتا ہوں۔''

''اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں جینا نہیں چاہتا۔'' اچانک زمان علی کی آواز بند ہو گئی اور جسم ڈھیلا پڑ گیا۔

پروفیسر صدیقی کا ماتھا پسینے سے بھر گیا تھا۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کریں۔ اگر وہ پولیس کو اطلاع کرتے ہیں تو پولیس آ کر ان سے کئی سوالات کرے گی۔ ہو سکتا ہے کہ وہ قتل کا شک ہی ان پر کر دیں۔ جبکہ ان کی بیوی اسپتال میں تھی اور وہ اس معاملے میں الجھ کر کسی مصیبت میں نہیں پڑنا چاہتے تھے لیکن یہ بات ان کے ضمیر نے گوارا نہیں کی اور انہوں نے پولیس کو فون کر کے اطلاع کر دی۔ جب تک پولیس آتی پروفیسر صدیقی اسی جگہ ٹہلتے رہے۔

اچانک ان کی نظر فرش پر پڑی چیک بک پر ٹھہر گئی۔ ایک ایک چیک پر دستخط موجود تھے۔ وہ اپنی بیوی کے علاج کے لیے ایک چیک بھر سکتے تھے۔ اور پھر اپنی پنشن کا سارا پیسہ وہ اس وقت تک زمان علی کے اکاؤنٹ میں جمع کراتے رہتے جب تک لیا ہوا پیسہ پورا نہیں ہو جاتا تو اس کا قرض بھی اتر سکتا تھا۔

پروفیسر صدیقی کے اندر سے آواز آئی کہ یہ غلط ہے تم نے ساری زندگی کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلایا اور بھرم میں ہی زندگی گزار دی اور اب تم اپنے دوست کی چیک بک اُٹھانے کا سوچ رہے ہو۔ پروفیسر صدیقی اپنے آپ سے بولے، جب میں پیسہ واپس کرنے کی نیت کر رہا ہوں تو غلط کیسے ہوا۔ میں ایک ایک پائی اپنی پنشن سے واپس کروں گا۔ اس وقت مجھے صرف اپنی ضرورت پوری کرنی ہے۔

اسی اثنا میں باہر پولیس وین کے رکنے کی آواز آئی۔ پروفیسر صدیقی نے جلدی سے وہ چیک بک اُٹھائی اور

اپنی جیب میں رکھ لی۔
پولیس اندر آئی، پروفیسر صدیقی کا بیان ہوا اور سوال و جواب ہوئے۔ اتفاق سے ہمسایہ نے ڈاکوؤں کو باہر نکلتے دیکھ لیا تھا اس لیے اس کی گواہی بھی شامل ہو گئی تھی۔ اس کے بعد لاش سرد خانے میں منتقل کر دی۔ پروفیسر صدیقی نے پولیس سے کہا کہ ان کی جب بھی ضرورت ہو گی، وہ حاضر ہو جائیں گے

☆......☆......☆

پروفیسر صدیقی جب اسپتال واپس لوٹے تو رات کے سوا ایک بجے کا وقت تھا۔ چیک بک ان کی جیب میں تھی اور ان کا جسم ابھی تک گھبراہٹ میں تھا اور دل دھڑک رہا تھا۔
پروفیسر صدیقی نے بڑی احتیاط سے کمرے کا دروازہ کھولا کہ کوئی آواز پیدا نہ ہو۔ اور اندر جا کر بھی دروازہ بند کرنے میں اسی احتیاط سے کام لیا لیکن وہ یہ دیکھ کر چونک گئے کہ عذرا جاگ رہی تھیں۔
''تم سوئی نہیں۔'' انہوں نے مسکرا کر پوچھا۔
''آپ کا انتظار کر رہی تھی۔'' عذرا نے سنجیدگی سے جواب دیا۔
''میں باہر بیٹھا تھا۔'' پروفیسر صدیقی کرسی اُٹھا کر عذرا کے پاس ہی آگئے اور بیٹھ گئے۔
''پروفیسر صاحب کیا زندگی کے اس حصے میں آپ مجھ سے جھوٹ بولیں گے؟''
''جھوٹ کیسا؟''
''سچ بتایئے کہاں گئے تھے؟ پیسوں کا انتظام کرنے گئے تھے؟ ہو گیا انتظام؟''
''ہاں ہو گیا۔'' پروفیسر صدیقی نے جھٹ سے پُراعتماد لہجے میں جواب دیا۔
''کیسے ہو گیا؟'' عذرا نے ان کی طرف دیکھا۔
''بس سمجھ لو کہ غیبی مدد پہنچ گئی۔'' پروفیسر صدیقی پیار سے اس بات کو ختم کرنا چاہتے تھے۔
''میں جانتی ہوں کہ آپ کسی کے آگے اپنا ہاتھ نہیں پھیلا سکتے۔ یہاں تک کہ اپنے بیٹے کے آگے بھی۔'' عذرا بولیں۔
''تم آرام کرو۔ میں نے انتظام کر لیا ہے۔ یہ سب سوچنا چھوڑ دو۔'' پروفیسر صدیقی نے کہا۔
''پروفیسر صاحب گھر چلتے ہیں۔ رات ختم ہونے میں چند گھنٹے باقی رہ گئے ہیں۔ ورنہ پیسے نہ ہونے کی وجہ سے اسپتال والے ہمیں کہہ کر واپس بھیج دیں گے۔'' عذرا نے گویا تجویز دی۔
پروفیسر صدیقی مسکرائے۔ ''کل تمہارا بائی پاس آپریشن ہو گا اور ہم تب ہی اسپتال سے جائیں گے جب تمہیں نئی زندگی مل جائے گی۔''
عذرا نے پروفیسر صدیقی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں جانتی ہوں کہ آپ نے ساری زندگی کبھی ہمت نہیں ہاری اور اب بھی آپ لڑ رہے ہیں۔''
''میری تعریف کرنے کا شکریہ۔ لیکن اب تم سو جاؤ۔'' پروفیسر صدیقی نے پیار سے عذرا کے ماتھے پر ہاتھ رکھا اور مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔
''وہ نرس بہت اچھی ہے۔'' اچانک عذرا بولیں۔
''اس کا نام کلثوم ہے۔''
''ہاں......وہ کہتی ہے کہ اسے میری صورت میں اس کی ماں دکھائی دے رہی ہے۔ بے چاری کی ماں ایک سال پہلے فوت ہو گئی تھی۔'' عذرا نے کہا۔
''واقعی وہ اچھی اور نیک بچی ہے۔''
''وہ مجھ پر بہت توجہ دیتی ہے۔ کہہ رہی تھی کہ کل اس کی ڈیوٹی نہیں ہے لیکن وہ پھر بھی میرے لیے میرے پاس رہنے کے لیے صبح نو بجے آجائے گی۔''
''خدا اسے اجر دے۔''
''آپ نے بیٹے کو اطلاع دی کہ میں اسپتال میں ہوں۔'' عذرا نے بات کا رخ شاید یہی پوچھنے کے لیے موڑا تھا۔
''پرسوں اس نے فون کیا تو تھا۔ تم سے بات بھی کی تھی۔ اور تم نے بتایا تھا کہ کل ہم ڈاکٹر صاحب کو چیک اپ کرانے جا رہے ہیں۔ مجھ سے تو اس نے نہیں پوچھا کہ ڈاکٹر صاحب کو چیک اپ کرایا تو کیا کہا انہوں نے۔ تم سے کوئی بات ہوئی ہو تو مجھے پتا نہیں ہے۔''
''مجھ سے ڈھیروں باتیں ہوئی ہیں۔'' عذرا نے کھوئے ہوئے انداز میں کہا۔
''اچھا......اس کا فون آیا تھا۔''
عذرا کھلی آنکھوں سے چھت کو گھور رہی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں نمی اُتر آئی اور وہ دھیمے لہجے میں بولیں۔ ''وہ میرے خیالوں میں آیا تھا اور مجھ سے لپٹ کر اس نے باتیں کی تھیں۔''
پروفیسر صدیقی نے دائیں بائیں دیکھ کر اپنی گھڑی پر

وقت دیکھا اور کہا۔ ''رات بہت ہوگئی ہے' اب تم سو جاؤ۔ اتنا نہ سوچا کرو۔''

''اب مجھے سو ہی جانا چاہیے۔'' عذرا نے اسی انداز میں کہہ کر آہستہ آہستہ اپنی آنکھیں بند کرلیں۔

☆......☆......☆

کلثوم واقعی ٹھیک نو بجے عذرا کے پاس آگئی تھی۔ اس کے آتے ہی پروفیسر صدیقی باہر نکلے اور ایک طرف جا کر اپنی جیب سے وہ چیک بک نکالی اور اسے غور سے دیکھا۔ ان کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور دل دھڑک رہا تھا۔ پھر انہوں نے ایک چیک نکالا اور چیک بک اپنی جیب میں رکھ لی۔

وہ کچھ دیر تک چیک کو دیکھتے رہے اور پھر اُٹھ کر استقبالیہ کی طرف گئے۔ وہاں موجود لڑکے سے اتنی رقم بھروائی جتنی انہیں جمع کرانی تھی۔ ان کے ہاتھ کانپ رہے تھے اس لیے وہ چیک پر کچھ نہیں لکھ سکتے تھے۔ اسی لیے انہیں اس لڑکے سے مدد لینی پڑی تھی۔ چیک پر رقم دیکھ کر انہوں نے وہ چیک اسی لڑکے کی طرف بڑھا دیا۔

لڑکے نے نرم لہجے میں کہا۔ ''ہم چیک نہیں لیتے آپ کیش لے آئیے۔''

پروفیسر صدیقی نے کانپتے ہاتھوں سے چیک واپس لیا اور اسے جیب میں ڈال کر بے جان قدموں سے دروازے کی طرف چل پڑے کہ اچانک کلثوم سامنے آگئی۔

''انکل کہاں جارہے ہیں آپ؟''

''میں وہ...... اسپتال والے چیک نہیں لیتے...... میں نے ان کو چیک دیا تھا...... اب کیش لینے جارہا ہوں۔'' پروفیسر گھبرائے سے انداز میں بولے۔

''ٹھیک ہے۔'' کلثوم مسکرائی اور کمرے کی طرف چلی گئی۔

پروفیسر صدیقی کسی نہ کسی طرح بینک تک پہنچے۔ انہوں نے چیک دیا اور پیسے لے کر جیب میں ڈال لیے۔ ان کا دل ڈوب رہا تھا۔ وہ بار بار اپنے آپ سے کہہ رہے تھے۔ یہ ادھار ہے۔ میری پنشن کا ایک ایک پیسہ اس اکاؤنٹ میں جمع ہوگا اور میں سارا ادھار چکادوں گا......''

وہ یہی کہتے ہوئے اسپتال پہنچ گئے۔ ابھی وہ استقبالیہ کی طرف جا ہی رہے تھے کہ کلثوم ان کی طرف بھاگ کر آئی اور روتے ہوئے بولی۔

''انکل...... بات سنیں...... آنٹی...... اب دنیا میں نہیں رہیں......''

پروفیسر صدیقی کو ایسا لگا جیسے سب کچھ بکھر گیا ہو۔

☆......☆......☆

عذرا کی تدفین سے فارغ ہوکر پروفیسر صدیقی نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ وہ پیسہ اسی اکاؤنٹ میں جمع کرادیا۔ وہ مغموم بینک سے باہر نکلے اور پیدل ہی ایک طرف چل پڑے۔

واپس گھر پہنچے تو کچھ مہمان اُن کے منتظر تھے۔ ان میں کلثوم بھی تھی۔ کچھ دیر کے بعد مہمان چلے گئے اور کلثوم ان کے پاس رہ گئی۔

''بیٹی میں تمہارا احسان مند ہوں کہ تم نے عذرا کی بہت خدمت کی۔''

''اس میں احسان مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے انکل۔ وہ میری ماں جیسی تھیں۔''

''پھر بھی تمہارا شکریہ۔''

''وہ بہت اچھی تھیں۔ میں نے اُن کے ساتھ ڈھیروں باتیں کی تھیں۔ وہ آپ سے بہت پیار کرتی تھیں۔ آپ کی فکر بھی بہت تھی ان کو۔'' کلثوم بتانے لگی۔

''ہاں یہ تو ہے۔ اسے میری بہت فکر تھی اور میرا بڑا خیال تھا۔'' پروفیسر صدیقی کی آنکھیں پانی سے بھر آئیں۔

''جب آپ کمرے سے باہر تھے تو انہوں نے مجھے کہا کہ دیکھو پروفیسر صاحب کہاں ہیں۔ میں باہر آئی تو آپ چیک کیش کرانے بینک جارہے تھے۔ میں نے آکر آنٹی کو بتایا تو انہوں نے سن کر خاموشی اختیار کرلی لیکن بے چین ہوگئیں اور پھر بولیں۔ کیا انہوں نے چیک دیا تھا؟ میں نے بتایا کہ وہ یہی کہہ رہے تھے۔ تب وہ اور بھی بے چین ہوگئیں۔ اور پھر وہ ڈوبتی ہوئی آواز میں بولیں۔ اے خدا پروفیسر صاحب کا بھرم قائم رکھنا۔ وہ یہی کہتی جارہی تھیں اور ان کی آواز ڈوبتی جارہی تھی۔''

پروفیسر صدیقی بہتی آنکھوں سے کلثوم کی طرف دیکھے جارہے تھے...... پھر کلثوم نے کہا۔

''یہی کہتی رہیں اور ان کی آواز بند ہوگئی۔ وہ چلی گئیں۔''

کمرے میں خاموشی چھا گئی اور پھر پروفیسر صدیقی مغموم آواز میں بولے۔ ''میری بیوی سے بڑھ کر مجھے کوئی نہیں جانتا تھا...... اس تکلیف دہ حال میں بھی اسے اپنی زندگی سے زیادہ میرے بھرم کی فکر لاحق تھی۔''

پروفیسر صدیقی کا چہرہ گہری اداسی میں ڈوبتا جارہا تھا۔

سائرس او برن کا تعلق ان دس فیصد امریکیوں میں سے تھا جن کی شادی نہیں ہوئی۔ تیس فیصد امریکیوں کی طرح وہ بھی تنہا رہتا تھا اور اس کا شمار ان پچانوے فیصد امریکیوں میں کیا جا سکتا تھا جو رات کے کھانے کے بعد اونگھنے لگتے ہیں۔ اچانک اس کے کانوں میں ہلکی ہلکی موسیقی کی آواز آئی۔ عام طور پر آئسکریم بیچنے والے اپنی گاڑیوں میں گاہکوں کو متوجہ کرنے کے لیے گانے لگاتے ہیں لیکن سال کے اس حصے میں کسی آئسکریم ٹرک کی آمد متوقع نہیں تھی اور

نگرانی

تمکین رضا

زندگی آسانی اور خوش دلی کے ساتھ گزاری جا سکتی ہے... مگر دوسروں کی دولت کو ہتھیانے کا منصوبہ بنانے والے ایسی سوچوں سے دور رہتے ہیں... وہ بظاہر سادہ سا شخص تھا... سادہ سی زندگی تھی... مگر اس کے پسِ حال میں کچھ فتور کا دخل تھا...

ایک ماہر سراغ رساں کی فطرت... جو وقت سے پہلے کام کرنے کا عادی تھا...

ویسے بھی عموماً وہ 'ٹوئنکل ٹوئنکل لٹل اسٹار' جیسے گانے لگاتے ہیں لیکن یہ آواز ایسی تھی جیسے کسی کھڑی ہوئی کار میں ریڈیو بج رہا ہو۔

اب اوبرن پوری طرح بیدار ہو چکا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر کرسی کے برابر رکھے ہوئے کاغذات ٹٹولے۔ ان میں دانتوں کے ڈاکٹر کی جانب سے یاد دہانی کا خط، سالانہ چندہ کی ادائیگی کے نوٹس، تین فلاحی اداروں کی طرف سے عطیہ دینے کی استدعا اور ایک پمفلٹ شامل تھا جس پر پرانے ریکارڈز کی خرید و فروخت کا اشتہار چھپا ہوا تھا۔

وہ شام سات بجے کے قریب گھر سے باہر نکلا تو اس کی نظر بلاک کے آخری کونے پر کھڑے ہوئے ایک ٹرک پر گئی جس پر میری لینڈ کی نمبر پلیٹ لگی ہوئی تھی۔ وہ سائز میں ایک چھوٹی وین کے برابر تھا اور اس پر خیرہ کن انداز میں سرخ و زرد رنگ کیا گیا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے حال ہی میں سستے داموں ریکارڈ بیچنے کا کاروبار شروع کیا ہے۔ اس سے کچھ فاصلے پر تین بچے اسے حیرت اور دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ ممکن ہے وہ وین کے باہر لکھی تحریر نہ پڑھ سکتے ہوں لیکن انہیں یہ اندازہ ضرور تھا کہ اس کے ذریعے کھانے پینے کی چیزوں کے بجائے کچھ اور فروخت کیا جا رہا ہے۔

فٹ پاتھ کی جانب اس گاڑی میں ایک بڑی سی کھڑکی اور کاؤنٹر نظر آ رہا تھا۔ جب اوبرن وہاں پہنچا تو اس نے دیکھا کہ ایک بوڑھا شخص کھڑکی کا شٹر اوپر اٹھا رہا تھا۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد وہ تیزی سے اندر چلا گیا۔ اسے دیکھ کر وہ واپس آ گیا اور خوش دلی سے بولا۔ ''شام بخیر! میرا نام ویلی ہے۔ تم کیا پسند کرو گے جاز، بلوز یا ریگ ٹائم؟ تم مجھے باذوق آدمی لگتے ہو۔''

''زیادہ تر کلاسیکل جاز۔'' اوبرن نے کاؤنٹر پر کھڑے ہو کر اندر کی طرف جھانکتے ہوئے کہا۔ اندر سیکڑوں بلکہ ہزاروں کی تعداد میں فرش سے چھت تک خانوں میں ڈسک رکھی ہوئی تھیں۔ ''کیا تمہارے پاس ستر اور اسی کی دہائی کے ریکارڈز ہیں؟''

''مل جائیں گے۔ تمہیں کسی خاص ریکارڈ کی تلاش ہے؟''

''میں بڈری مین اور کول مین ہاکنز کے ریکارڈز جمع کر رہا ہوں۔''

''دیکھتا ہوں۔ شاید تمہارے مطلب کی چیز مل جائے۔'' یہ کہہ کر اس نے ایک رجسٹر کھولا اور اسے غور سے دیکھنے لگا پھر وہ وین کے عقبی حصے میں چلا گیا۔ جب واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک ریکارڈ تھا جس کے پلاسٹک کور پر تفصیلات درج تھیں۔ کول مین ہاکنز کا یہ گانا 1934ء میں ریلیز ہوا تھا اور اس کی قیمت اتنی تھی کہ ویلی کی وین میں تین چار مرتبہ گیس بھری جا سکتی تھی۔

''مجھے اس پر کچھ نشانات نظر آ رہے ہیں۔ کیا میں اسے سُن سکتا ہوں۔''

''میں نہیں جانتا کہ یہ کیسے ممکن ہے۔ میرا مطلب ہے کہ میرے پاس اسے بجانے کا کوئی انتظام نہیں ہے۔''

اوبرن چند قدم پیچھے ہٹا اور وین کی چھت پر لگے ہوئے اسپیکر کو دیکھنے لگا جہاں سے بینی گڈمین کے گانے کی آواز آ رہی تھی۔

''یہ میری گاڑی میں لگا ہوا سی ڈی پلیئر ہے۔ جو تم سن رہے ہو۔ گاہکوں کو متوجہ کرنے کے لیے مجھے اس کی آواز اونچی رکھنی پڑتی ہے۔''

''اگر تمہارے پاس سنوانے کا کوئی انتظام نہیں ہے تو گاہک کو کیسے معلوم ہوگا کہ وہ کیا خرید رہا ہے اور تم کیسے جان سکو گے کہ کس چیز کا کاروبار کر رہے ہو؟''

ویلی نے اسے ناراضی سے دیکھا اور بولا۔ ''تم مجھے ایسے چوزے کے مانند لگ رہے ہو جو تین دن پہلے انڈے سے باہر آیا ہو۔ اب تم مجھے بتاؤ گے کہ کاروبار کس طرح کیا جاتا ہے۔''

یہ کہہ کر اس نے ایک باکس میں ہاتھ ڈال کر کارڈ نکالا اور اوبرن کو پکڑا دیا۔ اس پر اس کا پورا نام والٹر بروس اور سیل نمبر لکھا ہوا تھا لیکن اس کا کوئی پتا درج نہیں تھا۔

''میں شاید مزید تین چار دن اس شہر میں رہوں گا۔ اگر کسی وقت تمہارا ذہن تبدیل ہو جائے تو اس نمبر پر مجھے فون کر لینا۔''

یہ کہہ کر وہ ایک نوجوان جوڑے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ گویا ایک طرح سے اس نے اوبرن کو جتا دیا کہ وہ اپنی بات ختم کر چکا ہے۔

☆☆☆

''ڈپارٹمنٹ آف پبلک سیفٹی! میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟''

''میں نے ابھی ابھی ایک لاش دیکھی ہے۔''

''کیا تم اپنی شناخت کروانا پسند کرو گے؟''

''رسل ویڈبرن۔''

''اور اس وقت تم کہاں پر ہو؟''

''کچھ یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ میں نے میرکل پارک سے شمال کی جانب چلنا شروع کیا تھا......''

''یہ پارک ہیرون ٹاؤن شپ میں ہے؟''

''ہاں، اور اب میں ایک جنگل کے بیچ میں ہوں۔''

''کیا تمہارے علاوہ وہاں کوئی اور نہیں ہے؟''

''ہاں، صرف اس ایک لاش کے سوا کوئی اور نہیں۔''

''کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ شخص مر چکا ہے؟''

''ہاں، اس کے چلنے اور بولنے کے دن یقیناً ختم ہو گئے ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔ تم لاش کو ہاتھ مت لگانا اور نہ ہی جائے وقوعہ پر کسی چیز کو چھیڑنا۔ تم وہیں ٹھہرو۔ میں تمہارا رابطہ دوسرے ڈسپیچر سے کروا رہا ہوں۔ ہم تمہارے سیل فون پر ٹریسر لگا دیں گے۔''

چند ماہ قبل لیفٹیننٹ کے عہدے پر ترقی ملنے کے بعد سراغ رساں سارجنٹ سائرس اوبرن کے فرائض کی نوعیت بھی بدل گئی تھی اور اسے باہر جانے کے بجائے میز کرسی پر بیٹھ کر کام کرنا پڑ رہا تھا جو ہر پبلک سیفٹی آفیسر کی خواہش ہوتی ہے۔ اب اسے اچھی تنخواہ کے علاوہ عزت بھی مل رہی تھی اور فرائض کی انجام دہی کے دوران مارے جانے کا خطرہ بھی کم ہو گیا تھا۔ اس کے باوجود اوبرن کبھی کبھی محسوس کرتا کہ حالات کے جبر نے اسے پولیس ڈپارٹمنٹ میں اس کی خواہش کے برعکس دھکیل دیا ہے جس میں اس کی ماں کی غلطی بھی شامل تھی۔

دورانِ تعلیم اس کی ماں نے جو خود بھی ایک اسکول ٹیچر تھی، اس کی تحریر و تقریر پر خاص توجہ دی۔ اس طرح نہ صرف اس کی گرامر کی غلطیاں دور ہو گئیں بلکہ اس کی تحریر میں بھی نکھار آ گیا۔ ایسی صلاحیتیں اس ماحول میں بھی نہیں چھپی رہتیں جہاں ہر چیز تحریری شکل میں موجود ہو۔ اسی لیے اوبرن کے فرائض میں کوئی تبدیلی کیے بغیر اسے رفتہ رفتہ سیکنڈ ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹرز میں مختلف دستاویزات کی ایڈیٹنگ اور پروف ریڈنگ کا کام دیا جانے لگا۔

اس وقت بھی وہ ایک ایسی ہی رپورٹ لکھ رہا تھا جو دو جونیئر آفیسرز کے بارے میں تھی۔ انہوں نے مقامی ایلیمنٹری اسکول میں ٹریننگ پروگرام کے دوران غیر ضروری مذاق کیا تھا جس پر ایک چوتھے سال کا طالب علم مشتعل ہو گیا اور اسکول انتظامیہ نے اسے زبردستی گھر بھیج دیا۔ اوبرن کو اس رپورٹ کی تیاری میں خاصی اکتاہٹ محسوس ہو رہی تھی۔ اسی لیے جب فون کی گھنٹی بجی تو اس نے لپک کر فون اٹھا لیا۔ دوسری طرف سے سارجنٹ ڈولنگر بول رہا تھا۔

''صبح بخیر...... ایک شخص کو جو واک کے لیے نکلا تھا، نیگل روڈ کے جنوب میں واقع جنگل میں کسی بوڑھے کی لاش ملی ہے۔''

اوبرن نے کاغذات پر سے نظریں ہٹائیں اور بولا۔ ''کیا اسے قتل کیا گیا ہے؟''

''ہاں، کسی نے اسے چھوٹے ہتھیار سے نشانہ بنایا ہے۔ تین گولیاں جسم کے اوپری اور دو نچلے حصے پر لگی ہیں۔''

''کون سا ہتھیار استعمال کیا گیا؟''

''وہاں کوئی ہتھیار نہیں ملا اور نہ ہی ابھی تک گولیوں کے خول ملے ہیں کیونکہ اس جگہ درختوں کے نیچے کافی جھاڑیاں ہیں۔''

''تمہارے علاوہ اور کون یہ خول تلاش کر رہا ہے؟''

''کرونی اور بینی جس نے یہ کال وصول کی تھی۔''

''کیا اسے لوٹا گیا ہے؟''

بڑے لوگوں کی باتیں

☆ دل سمندر کی طرح ہے۔ بظاہر خاموش مگر گہرائیوں میں طوفان موجزن ہے۔ (ارسطو)

☆ دل کی طرح سخت اور اس کی طرح ملائم دنیا میں کوئی چیز نہیں۔ (زہادی)

☆ اس خوشی سے دور ہو جو کل تم کو کانٹا بن کر دکھ دے۔ (خلیل جبران)

اچھی باتیں

☆ بولنے میں ایسی تاثیر پیدا کرو جو دل میں اُتر جائے ورنہ چپ رہو۔

☆ مسکراہٹ، خوب صورتی کی علامت ہے اور خوب صورتی زندگی کی۔

☆ پھول بننے کی تمنا کبھی نہ کرو کیونکہ مرجھانا ہر پھول کی قسمت میں ہوتا ہے۔

☆ کسی کو اپنی مجبوریاں مت بتاؤ ورنہ مجبوریوں کی زنجیر میں بندھ جاؤ گے۔

فتح پور لیہ سے سید محی الدین اشفاق کا تعاون

''اس کا والٹ دس قدم کے فاصلے پر جھاڑیوں میں پڑا ہوا تھا اور اس میں کوئی رقم نہیں تھی۔''

''کوئی شناخت؟''

''اس کے پاس سے پانچ ڈرائیونگ لائسنس برآمد ہوئے ہیں۔ ان سب پر مختلف نام اور پتے درج ہیں لیکن تصویر ایک ہی شخص کی ہے۔ اس کے علاوہ کچھ کاروباری کارڈز بھی ملے ہیں جن پر آل سیلز وینائل ''خرید وفروخت'' لکھا ہوا ہے۔''

''میں اس شخص کو جانتا ہوں۔ اس کی عمر ساٹھ ستر برس ہے۔ دبلا پتلا پستہ قد اور چھوٹی سی داڑھی۔ کیا تمہیں اس کے پاس سے والٹر بروس کا شناختی کارڈ ملا ہے؟''

''ہاں، لیفٹیننٹ! تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو؟''

''کیا تم نے وہاں کوئی گاڑی دیکھی؟''

''نہیں، ہم نے آدھ میل کا علاقہ دیکھ ڈالا۔''

''میں آرہا ہوں۔ اگر تمہیں وہاں کوئی سڑک نظر آئے تو اس کی وین تلاش کر سکتے ہو۔ اس پر سرخ اور زرد رنگ ہوا ہے اور وہ ایک سرکس ویگن جیسی لگتی ہے۔ اس پر میری لینڈ کی نمبر پلیٹ لگی ہوئی ہے۔ کیا تم نے کورونر کے دفتر اطلاع کر دی؟''

''ہاں اور انہوں نے ایک لیبارٹری کا بندہ بھیج دیا ہے۔''

''گڈ، وہ شخص جس نے لاش دیکھی تھی، کیا اب بھی وہیں ہے؟''

''ہاں، اس کا نام رسل ویڈبرن ہے۔''

گیارہ بجے کے قریب اوبرن نے اپنی گاڑی نیگل روڈ کے اختتام پر کھڑی کی۔ وہاں پہلے سے ڈولنگر کی کار، پولیس وین اور کورونر آفس کی وین موجود تھیں۔ ڈولنگر کی بتائی ہوئی سمت میں جنگل کی طرف چلنا شروع کر دیا۔ اس راستے کے دونوں جانب درخت تھے اور ان کی شاخیں اتنی زیادہ جھکی ہوئی تھیں کہ اس راستے پر کسی گاڑی کا آنا ممکن نہیں تھا۔ تقریباً سات منٹ چلنے کے بعد وہ اس جگہ پہنچ گیا جہاں لاش پڑی ہوئی تھی اور اس کے قریب چار افراد کھڑے تھے اگر اوبرن کو تھوڑا بہت شبہ تھا تو لاش دیکھنے کے بعد وہ بھی دور ہو گیا۔ وہ والٹر بروس ہی تھا۔

اس نے وہی سبز رنگ کا سویٹر پہن رکھا تھا جس میں اس نے اسے پانچ دن پہلے دیکھا تھا۔ اس کی قمیص کا سامنے والا حصہ اور سویٹر خون میں بھیگے ہوئے تھے۔ ڈولنگر کورونر آفس کے فک اسٹیمی سے باتیں کر رہا تھا جبکہ پولیس ٹیکنیشن کارل جائے وقوعہ کے گرد زرد رنگ کا ٹیپ باندھ رہا تھا اور کچھ ہی فاصلے پر وہ شخص بیٹھا ہوا تھا جس نے سب سے پہلے لاش دیکھی تھی۔ ڈولنگر نے اوبرن کو ابتدائی رپورٹ پکڑائی جو اس نے گشت پر موجود پولیس والوں کرونی اور برونی کے ساتھ مل کر تیار کی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ویڈبرن کا بیان بھی منسلک تھا۔

''مسٹر ویڈبرن، انتظار کرنے کا شکریہ۔'' اوبرن نے اس کے قریب جا کر کہا۔

ویڈبرن اپنی جگہ پر کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ ''کوئی بات نہیں۔''

''مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم انکم ٹیکس کے دفتر میں کام کرتے ہو؟''

اس نے نیم دلی سے اثبات میں سر ہلایا تو اوبرن نے پوچھا۔ ''آج تم چھٹی پر ہو؟''

''میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ مجھے ہیپاٹائٹس سی ہو گیا ہے۔''

اوبرن نے ایک نظر اس کے بیان پر ڈالی اور بولا۔ ''تم نے اپنی گاڑی میرکل پارک پر کھڑی کی اور وہاں سے جنگل کی طرف پیدل چل دیے۔ جب تم اس مقام پر پہنچے تو تمہیں یہ لاش ملی اور تم نے دس بج کر سات منٹ پر نائن الیون کو فون کر دیا۔''

ویڈبرن نے ایک بار پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔

''تم اس شخص کو نہیں جانتے۔ تم نے لاش کو ہاتھ نہیں لگایا۔ کسی دوسرے شخص کو یہاں نہیں دیکھا اور نہ ہی کوئی غیر معمولی آواز سنی؟''

اوبرن کی ہر بات کا جواب وہ سر ہلا کر دے رہا تھا۔

اوبرن کے تجربہ کار اور تربیت یافتہ ماتحت جو کچھ اس سے معلوم کر چکے تھے، اوبرن نے اس سے زیادہ جاننے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور بولا۔ ''ٹھیک ہے مسٹر ویڈبرن ایک بار پھر تمہارا شکریہ۔ یہ میرا کارڈ رکھ لو۔ اس میں دیے ہوئے نمبروں پر تم مجھ سے چوبیس گھنٹے میں کسی بھی وقت رابطہ کر سکتے ہو۔ ہمارے پاس تمہارا پتا اور فون نمبر ہے لیکن ہم تمہیں بلاوجہ زحمت نہیں دیں گے۔''

کیسٹرل اور اسٹیمی لاش اور اس کے آس پاس کی تصویریں بنا رہے تھے۔ اسٹیمی نے پانچ دس تصویریں بنانے پر ہی اکتفا کیا۔ ویسے بھی اس لاش کو کیس ختم ہونے تک کورونر کی تحویل میں رہنا تھا۔ اس کے برعکس کیسٹرل نے مختلف زاویوں اور فاصلے سے کئی تصویریں کھینچیں۔ تھوڑی

دیر بعد ہی ڈولنگر کو اس کے سیل فون پر ایک پیغام موصول ہوا۔ اس نے ایک نظر موبائل اسکرین پر ڈالی اور سیل فون اوبرن کو دیتے ہوئے بولا۔ ”یہ ان پانچ لوگوں کا ریکارڈ ہے جن کے شناختی کارڈ وہ لیے پھر رہا تھا۔“

اوبرن کافی دیر تک اس پیغام کو پڑھتا رہا پھر بولا۔ ”ان میں سے چار فرضی نام ہیں۔ ان کی شناخت چرائی گئی ہے، ان میں سے دو ریاست سے باہر رہ رہے ہیں۔“

اس نے بروس کے والٹ سے پانچ کارڈ نکالے۔ ان میں سے تین ڈرائیونگ لائسنس اور دو شناختی کارڈز تھے۔ ان سب پر 1940ء کی تاریخ پیدائش درج تھی اور اسی شخص کی تصویر چسپاں تھی جس کی لاش ان کے قدموں میں پڑی ہوئی تھی۔

”میں حیران ہوں کہ یہ شخص کس چکر میں پڑ گیا تھا اور اس کی وین کہاں ہے؟ اس کی جیب سے کوئی چابی ملی؟“

”چابی، گھڑی، سیل فون کچھ نہیں ملا۔“

اوبرن نے اس کے بزنس کارڈ کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کیا تم نے اس فون نمبر پر بات کرنے کی کوشش کی؟“

”کوئی جواب نہیں ملا۔“

اوبرن نے قرب و جوار کا بغور جائزہ لیا۔ یہ ایک نامعلوم جگہ تھی اور یہاں ڈاکا زنی کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ والٹر بروس اپنے کسی حریف یا پرانے ساتھی کی انتقامی کارروائی کا نشانہ بنا ہے جس کے ساتھ اس نے کبھی بُرا برتاؤ کیا ہوگا اور وہی اس کی وین بھی لے گیا ہے۔ کیسٹرل اب بروس کے جوتوں کے نشانات کی تصویریں لے رہا تھا۔ جب وہ فارغ ہوگیا تو اوبرن نے اسٹیمی سے پوچھا

”اسے مرے ہوئے کتنی دیر ہوگئی؟“

”اس کی موت نصف شب کے قریب واقع ہوئی ہے۔ اس کی لاش ماربل کی طرح سخت ہوگئی ہے اور اس کے جسم سے بہنے والا خون سیاہ اور خشک ہو چکا ہے۔ تمہارا کہنا ہے کہ اسے جانتے ہو؟“

”کچھ زیادہ نہیں۔ میری اس سے گزشتہ جمعرات کی شب بات ہوئی تھی جب اس نے اپنی وین میرے گھر کے باہر والی سڑک پر پارک کی تھی اور وہ ریکارڈ بیچ رہا تھا۔“

”یہ کوئی خانہ بدوش ٹائپ تھا جو بالٹی مور سے یہاں ریکارڈ بیچنے آیا۔“

”جس شخص کے پاس چار جعلی شناختی کارڈز ہوں۔ اس کے لیے خانہ بدوش کے بجائے کوئی اور لفظ مناسب رہے گا اور اس کی وین ملنے کے بعد ہم جان سکیں گے کہ وہ ریکارڈ کے علاوہ بھی کوئی چیز پھیری لگا کر فروخت کر رہا تھا۔“

ڈولنگر اپنے بھاری بھرکم جسم سے زمین پر گرے ہوئے پتوں کو روندتا ہوا آیا اور اس نے اطلاع دی کہ بروس کی وین مل گئی ہے۔ کروتی اور برونی معمول کے گشت کے لیے واپس جا رہے تھے کہ انہوں نے جنوب میں آدھے میل کے فاصلے پر وین دیکھی۔ اس کے تمام دروازے مقفل تھے۔

”ان سے کہہ دو کہ ہمارے پہنچنے تک وہ وہیں موجود رہیں اور اس وین پر نظر رکھیں۔“

”یہ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں۔“ ڈولنگر نے جواب دیا۔

”اگر قاتل کے پاس چابیاں ہیں تو وہ بھی وین کے اندر ہی ہوگا۔“

”میں یہ بھی انہیں بتا چکا ہوں۔“

وہ وین مرنے والے کی ملکیت تھی۔ اس لیے وہ بھی اسٹیمی کے دائرۂ کار میں آتی تھی لیکن وہ مردہ خانے کے عملے کے آنے تک جنگل سے نہیں جاسکتا تھا۔ اسی طرح کیسٹرل کو بھی انگلیوں کے نشانات اور دیگر ثبوت دیکھنے کے لیے وین کا معائنہ کرنا تھا لیکن اس کا کام ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ اس لیے اوبرن اور ڈولنگر ان دونوں کو وہیں چھوڑ کر لنچ کے لیے چلے گئے۔ کار کی طرف جاتے ہوئے ڈولنگر نے ریکارڈ آفس کو فون کر کے کہا کہ انہیں والٹر بروس اور مسٹر ویڈبرن کے مکمل پس منظر سے آگاہ کیا جائے۔

ایک گھنٹے کے بعد وہ دونوں اس جگہ پہنچ گئے جہاں وہ وین کھڑی ہوئی تھی۔ اس وقت تک کیسٹرل اور اسٹیمی وہاں نہیں آئے تھے۔ وہ جگہ میرکل پارک سے زیادہ دور نہیں تھی۔ جیسا کہ گشت کرنے والے سپاہیوں نے بتایا تھا۔ وین کے دونوں دروازے مقفل تھے جبکہ پچھلے دروازوں پر تالے لگا دیے گئے تھے۔ کچھ ہی فاصلے پر کھدائی کرنے والے مزدور کھانے کے بعد سستا رہے تھے۔ ان کا ٹرک کچھ فاصلے پر کھڑا ہوا تھا اور کھدائی کا دوسرا سامان ایک بند مکان کے صحن میں رکھا ہوا تھا۔

”کوئی گڑبڑ لگتی ہے۔“ ان میں سے ایک نے کہا۔

”شاید وہ کسی مشکل میں ہے۔“

اوبرن نے اس کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”تم نے ایسا کیوں سوچا؟“

وہ شخص اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا اور بولا۔ ”اس گاڑی

کی نمبر پلیٹ دوسری ریاست کی ہے اور پولیس والے اس کی نگرانی کر رہے ہیں۔''
''تم کب سے یہاں کام کر رہے ہو؟'' اوبرن نے پوچھا۔
''پیر کی صبح سے۔ گزشتہ شام جب ہم کام ختم کر کے جانے والے تھے تو ایک شخص یہ گاڑی لے کر آیا اور یہاں کھڑی کر دی۔ میں نے اس سے کہا کہ اگر ہمیں آگے تک کھدائی کرنا پڑ گئی تو شاید وہ دو دن تک اپنی گاڑی یہاں سے نہیں لے جا سکے گا۔ اس نے جواب دیا کہ کوئی بات نہیں۔ وہ کچھ عرصے یہاں ٹھہرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔''
اس نے جو حلیہ بتایا وہ بروس سے ملتا جلتا تھا۔ اوبرن نے پوچھا۔ ''یہ کس وقت کی بات ہے؟''
''پانچ بجے۔ اس نے گاڑی کی لائٹس اور میوزک آن کر دیا اور کاروبار کے لیے تیار ہو گیا لیکن جب ہم یہاں سے روانہ ہوئے، اس وقت تک کوئی گاہک نہیں آیا تھا۔''
اسی دوران کیسٹرل اور اسٹیمی بھی آ گئے۔ کیسٹرل نے پلک جھپکتے میں گاڑی کا دروازہ کھول دیا۔ البتہ عقبی دروازوں کے تالے کھولنے میں کچھ دیر لگ گئی۔ انہوں نے دو گھنٹے تک وین کے اندرونی حصے کا معائنہ کیا۔ گلو باکس میں کئی نقشے اور ٹارچ رکھی ہوئی تھی۔ پسنجر سیٹ پر ایک بیگ رکھا ہوا تھا جس میں پمفلٹ بھرے ہوئے تھے، ایسا ہی ایک پمفلٹ دو ہفتے پہلے اوبرن کو بھی ڈاک کے ذریعے ملا تھا۔ اسی بیگ میں تین مختلف قسم کی لوہے کی پٹیاں بھی تھیں۔
سامان والے حصے میں ریکارڈز کی الماریوں کے درمیان بروس نے اپنے رہنے کا انتظام کر رکھا تھا اور وہاں کھانے کی میز کے ساتھ ٹائلٹ کی سہولت بھی موجود تھی۔ اندرونی حصے میں انہوں نے ایک ورک شاپ دیکھی جس میں کمپیوٹر، پلاسٹک کوٹنگ مشین اور ایک خاص ہارڈ ویئر موجود تھا جس کے ذریعے بروس نے دوسرے لوگوں کے نام سے جعلی شناختی کارڈز بنائے تھے۔ کیسٹرل کی تیز انگلیوں نے اس جگہ کا بھی پتا لگا لیا جہاں پیسے رکھے ہوئے تھے اور وہ الماری بھی دیکھ لی جس میں شراب رکھی جاتی تھی۔ وہسکی کے پیچھے پانچ پلاسٹک کی بوتلیں ملیں جن میں تین مختلف قسم کی خواب آور دوائیں موجود تھیں اور ان بوتلوں پر والٹر بروس کے بجائے کسی اور کے نام کے لیبل لگے ہوئے تھے۔ ان سب چیزوں کے درمیان بڑے بڑے کارٹن رکھے ہوئے تھے جن پر لکھا ہوا تھا۔ 'فوٹو گراف ریکارڈز' احتیاط سے اٹھائیں اور ان میں سے کئی ایک پر بوسٹن کے رہائشی پریسٹن ہاروے کا پتا درج تھا۔
اوبرن باہر آیا اور اس نے ہیڈ کوارٹر فون کر کے ڈسپیچر سے کہا کہ وہ ہاروے سے اس کی بات کروائے۔ چند لمحوں بعد اس کا ہاروے سے رابطہ ہو گیا۔ اوبرن نے اپنا تعارف کروانے کے بعد کہا۔ ''ہم والٹر بروس کے بارے میں معلومات اکٹھا کر رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ تم اسے جانتے ہو۔''
''میرا خیال ہے کہ گزشتہ تین چار سالوں میں اس سے ایک درجن سے زائد مرتبہ بات ہوئی ہے لیکن میں اس سے کبھی نہیں ملا۔''
''کیا تم بتانا پسند کرو گے کہ اس کے ساتھ تمہارے کس نوعیت کے تعلقات تھے؟''
''میں پرانے گانوں کا کاروبار کرتا ہوں اور موسیقی کے آلات بھی اپنے پاس رکھتا ہوں۔ اس نے میرے ہاتھ ایک بہت عمدہ پرانی ڈسک بیچی تھی۔ کیا وہ کسی مشکل میں ہے؟''
''اسے آج صبح گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔''
ہاروے نے ایک گہری سانس لی اور صدمے کا اظہار کرنے لگا۔
''ہمارے پاس اس کا بالٹی مور کا پتا ہے۔ کیا تم اس کے خاندان کے بارے میں جانتے ہو؟''
ہاروے تھوڑا سا ہچکچایا پھر گہری سانس لیتے ہوئے بولا۔ ''نہیں، میرا خیال ہے کہ اس کی بیوی کسی نرسنگ ہوم میں ہے اور والٹر کا زیادہ تر وقت سڑکوں پر ہی گزرتا تھا۔''
جب اوبرن وین میں واپس آیا، اس وقت تک ڈولنگر اور اسٹیمی دوسری بار بروس کے پیسے گن چکے تھے۔ انہوں نے اس رقم کو ایک لفافے میں بند کر کے سیل کیا۔ لفافے پر رقم لکھی اور دونوں نے اس پر اپنے دستخط کر دیے۔ اب یہ پیسے مقدمے کا فیصلہ ہونے تک کورونر آفس کی تحویل میں رہتے۔
سورج غروب ہونے سے کچھ دیر پہلے انہوں نے اپنی تفتیش ختم کی۔ کیسٹرل نے وین کو دوبارہ مقفل کیا اور سیل کر دیا تاکہ پولیس گیراج لے جانے تک وہ محفوظ رہے۔ کیونکہ سڑک پر ہونے والی کھدائی کی وجہ سے اسے چند روز تک وہاں سے ہٹانا ممکن نہیں تھا۔
اوبرن اور ڈولنگر نے فیصلہ کیا کہ وہ کچھ معاملات حل کرنے کے لیے سیکنڈ ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر میں ملاقات کریں گے۔ ڈولنگر نے اپنے سیل فون سے ان آدمیوں کے بارے

میں معلومات اپنے کمپیوٹر پر منتقل کردیں جن کے ناموں کے جعلی شناختی کارڈ بروس کے والٹ سے برآمد ہوئے تھے اور یہ کمپیوٹر اوبرن کے کمپیوٹر سے نیٹ ورک کے ذریعے منسلک تھا۔ ان آدمیوں میں سے ایک مائیکل فراسٹ ہی مقامی تھا۔ اوبرن نے پہلے اسی سے بات کرنے کا سوچا۔ اس نے بتایا کہ وہ بروس کو نہیں جانتا لیکن حال ہی میں اسے ایک مشکل ضرور پیش آئی ہے۔

''میرا گزشتہ سوشل سیکیورٹی چیک سات اکتوبر کو ملنے والا تھا۔'' اس نے شکایتی انداز میں کہا۔ ''لیکن وہ مجھے ابھی تک نہیں ملا۔ پہلے یہ چیک براہِ راست میرے اکاؤنٹ میں جاتے تھے لیکن کئی مرتبہ بینک والوں کی بے پروائی کی وجہ سے مجھے مشکل کا سامنا کرنا پڑا چنانچہ میں نے ڈاک سے چیک منگوانا شروع کردیے اور اب میں سوچ رہا ہوں کہ یہ بینک کی نہیں بلکہ سوشل سیکیورٹی والوں کی بے پروائی تھی۔''

''کیا تم نے انہیں اس کی اطلاع دی؟''

''ہاں، ان کا کہنا ہے کہ انہوں نے مہینے کی پہلی تاریخ کو ڈاک سے بھیج دیا ہے اور وہ اس کا پتا لگائیں گے لیکن شاید وہ یہ سوچ رہے ہیں کہ میں ان سے مذاق کررہا ہوں۔ تم خود سوچو کہ اگر میں نے وہ چیک کیش کروایا ہوتا تو اس کی اطلاع انہیں نہ ملتی۔''

جس وقت اوبرن فون پر بات کررہا تھا تو ڈولنگر نے اصلی والٹر بروس اور اس کی وین کی تصویریں اخبارات اور ٹی وی کو بھیج دیں اور ساتھ ہی یہ بھی درخواست کی کہ اگر کوئی شخص اسے جانتا ہو یا اس کے ساتھ کوئی واسطہ رہا ہو تو پولیس کو اس بارے میں ضرور مطلع کیا جائے۔ اوبرن نے بھی ریکارڈ آفس سے درخواست کی کہ اسے پریسٹن ہاروے کے ماضی کے بارے میں معلومات فراہم کی جائیں۔

اگلے روز جو معلومات ملیں، ان کے مطابق پچہتر سالہ والٹر بروس دس سال پہلے ریاست میری لینڈ کی ملازمت سے ریٹائر ہوچکا تھا۔ وہ الیکٹریشن اور مکینک کے طور پر کام کرتا تھا۔ اسے واشنگ مشین سے لے کر ڈرائیونگ لائسنس بنانے کے آلات کی مرمت اور دیکھ بھال میں خصوصی مہارت حاصل تھی۔ اس کا سابقہ ریکارڈ بالکل صاف تھا البتہ اس کے موجودہ پتے کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہو سکا اور نہ ہی اس کی شادی شدہ زندگی یا وارث کے بارے میں کوئی اطلاع ملی۔

رسل ویڈبرن کا ماضی بھی داغ دار تھا۔ چھ سال قبل اس کا وکالت کا لائسنس منسوخ ہوگیا تھا کیونکہ اس پر اپنی گرل فرینڈ کو شدید طور پر زدوکوب کرنے کا الزام ثابت ہو گیا تھا۔ وہ لڑکی بری طرح زخمی ہوگئی تھی اور اس کے چہرے پر کئی ٹانکے آئے تھے۔ اس کے علاوہ دانتوں کو بھی نقصان پہنچا تھا۔ اس جرم کے پاداش میں ویڈبرن کو اٹھارہ ماہ جیل کاٹنا پڑی۔

ساڑھے دس بجے کے قریب اسٹیمی نے بروس کی ابتدائی پوسٹ مارٹم رپورٹ ای میل کے ذریعے بھیج دی۔ اس کے جسم کے مختلف حصوں میں اعشاریہ بتیس کے پانچ خول ملے جو سب ایک ہی ہینڈ گن سے چلائے گئے تھے۔ خون کے تجزیے سے یہ بات بھی سامنے آئی کہ بروس کو گولی مارنے سے پہلے بے ہوش کردیا گیا تھا۔ اس رپورٹ کو دیکھنے کے بعد اوبرن ایک میٹنگ میں چلا گیا جبکہ ڈولنگر کو بھوک ستانے لگی۔ وہ کچھ کھانے کا پروگرام بنا رہا تھا کہ استقبالیہ کلرک نے کسی ملاقاتی کے آنے کی اطلاع دی۔

ایک دبلی پتلی عورت جس نے گھٹنوں سے اونچا اسکرٹ پہن رکھا تھا، دفتر میں داخل ہوئی اور اس نے اپنا تعارف اولیپیا وین رائٹ کے طور پر کروایا۔ وہ میوچل فیڈرل سیونگ بینک کی نارتھ ویسٹ برانچ میں ہیڈ کیشیئر تھی اور اس نے گلے میں بینک کا شناختی کارڈ بھی ڈالا ہوا تھا۔

اس نے اپنے شولڈر بیگ سے اخبار نکالا جس میں والٹر بروس کی تصویر شائع ہوئی تھی اور بولی۔ ''ایک ہفتہ قبل ہم نے رپورٹ کی تھی کہ ایک شخص نے جعلی ڈرائیونگ لائسنس دکھا کر ایک چیک کیش کرانے کی کوشش کی۔ وہ یہی شخص ہے۔''

ڈولنگر نے اپنا پیڈ سنبھالا اور بولا۔ ''میڈم، تم نے کس کو رپورٹ کی تھی؟''

''ہم نے پولیس کو مطلع کیا تھا اور دو پولیس آفیسرز بینک آئے تھے۔''

''کیا تمہیں ان کے نام یاد ہیں؟''

''سارجنٹ وین ٹریس نے ہی زیادہ بات کی تھی۔ وہ دراز قد سرخ بالوں والی لڑکی ہے۔''

''تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ اس شخص کا ڈرائیونگ لائسنس جعلی ہے؟''

''یہ محض اتفاق ہی ہے۔ دراصل وہ چیک رینڈل بورس کے نام پر تھا جو اسٹل ویل میں رہتا ہے اور ہم اسے اس لیے جانتے ہیں کہ اس کا اکاؤنٹ ہماری برانچ میں ہے۔ وہ اور اس کی بیوی مہینے میں ایک دن اس قصبے میں

گزارتے ہیں جب انہیں پنشن کا چیک ملتا ہے۔ وہ اس میں سے چار سو ڈالر نکلواتے اور باقی رقم اپنے اکاؤنٹ میں جمع کروادیتے ہیں۔''

''کیا وہ درست چیک تھا؟''

''تم خود دیکھ لو۔'' یہ کہہ کر اس نے ڈولنگر کو چیک کی فوٹو کاپی پکڑا دی۔ یہ دو ہزار ڈالر کا چیک رینڈل جے بورس کے نام ہی تھا اور اس کے اسٹل ویل والے پتے پر بھیجا گیا تھا۔ چیک کی پشت پر بورس کے دستخط بھی تھے۔

''کیا یہ مسٹر بورس کے ہی دستخط ہیں؟''

''یقیناً نہیں۔''

''تم مجھے پوری بات بتاؤ۔ یہ سب کیسے ہوا؟''

''بروس نامی اس شخص نے چیک کی پوری رقم نکلوانے کی کوشش کی۔ اس نے کیشیئر کو بورس کے نام کا ڈرائیونگ لائسنس دکھایا جس پر خود اس کی تصویر چسپاں تھی۔ کیشیئر نے فوراً ہی بھانپ لیا اور اسے انتظار کرنے کے لیے کہا پھر اس نے وہ چیک مجھے تھما دیا۔ میں سیدھی برانچ منیجر کے کمرے تک گئی اور پولیس کو فون کیا لیکن ان کے آنے تک وہ شخص غائب ہو چکا تھا۔''

''کیا تم نے وہ جعلی ڈرائیونگ لائسنس پولیس کو دکھایا؟''

''وہ ہمارے پاس نہیں تھا۔ اس شخص نے وہ لائسنس اپنے والٹ سے نہیں نکالا تھا۔''

''کیا تم اس شخص کا حلیہ بتا سکتی ہو؟''

''ہمارے پاس اس کی چار منٹ کی ویڈیو کلپ ہے۔ تم وہ دیکھ سکتے ہو۔''

اس عورت کے واپس جانے سے پہلے ڈولنگر نے سارجنٹ وین ٹریس سے مختصر گفتگو کی۔ اس نے بتایا کہ اس وقت یہ کیس ہیڈ کوارٹر میں کسی کے پاس ہے۔ اس وقت تک اوبرن بھی میٹنگ سے واپس آچکا تھا۔ ڈولنگر نے پتا لگا لیا کہ اس کیس کی تحقیقات امریکی پوسٹل انسپکشن سروس کے سپرد کر دی گئی ہے۔

''یہ دوسرا کیس ہے۔'' اوبرن نے کہا۔ ''جس میں والٹر بروس نے غیر قانونی طور پر ایسے پنشن چیک اپنے پاس رکھے جو وصول کنندہ کو ڈاک سے بھیجے گئے تھے۔ وہ ریکارڈ بیچنے کی آڑ میں لوگوں کی ڈاک چوری کرتا تھا اور اس کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا کہ جب وہ گھروں میں اپنا پمفلٹ ڈالنے جاتا تو میل باکس سے سرکاری اور پنشن چیک نکال لیتا۔''

لنچ کے بعد انہوں نے پوسٹل انسپکشن سروس کے دفتر میں ایڈم گراہم سے ملاقات کی۔ اس نے انہیں ایک نقشہ دکھایا جن میں اس طرح کی چوریوں کی سرخ اور نیلے نقطوں سے نشاندہی کی گئی۔ ایسے کئی چیک مقررہ وقت پر وصول کنندہ کو نہیں پہنچ سکے اور انہیں مقررہ تاریخ سے دو تین دن کے اندر ایسے بینکوں سے کیش کروایا گیا جو پچاس یا سو میل کے فاصلے پر تھے۔ یہ سب کرنے والا ایک معمر شخص تھا جو جعلی ڈرائیونگ لائسنس یا شناختی کارڈ دکھا کر یہ چیک کیش کرواتا تھا۔ ایک درجن بینکوں کی ویڈیوز سے اس شخص کی جو تصویر سامنے آئی وہ والٹر بروس ہی کی تھی۔

گراہم کی بیان کردہ کہانی نے انہیں حیرت میں ڈال دیا۔ اس نقشے پر سرخ نقطے چوری ہونے والے چیکوں کی نشاندہی کر رہے تھے جبکہ نیلے نقطوں کے ذریعے ان دواؤں کی چوری ظاہر کی گئی تھی جو ہیلتھ انشورنس پروگرام کے تحت متعلقہ لوگوں کو ڈاک کے ذریعے بھیجی گئی تھیں۔

''یہ دوائیں کارڈ بورڈ کے باکس یا پلاسٹک بیگ میں رکھ کر ڈاک سے بھیجی جاتی ہیں۔ ان میں عام طور پر نوے دن کی گولیوں کا ذخیرہ ہوتا ہے۔ اس لیے یہ میل باکس میں نہیں ڈالی جاتیں اور انہیں باہر ہی رکھ دیا جاتا ہے۔'' گراہم نے تفصیل سے ان دواؤں کی سپلائی کے بارے میں بتایا۔

''ہمیں اس کی وین سے صرف نیند کی گولیاں ملی تھیں۔'' ڈولنگر نے کہا۔

''ممکن ہے کہ وہ اس کے ذاتی استعمال میں ہوں۔'' گراہم نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''بقیہ دوائیں وہ کسی اور جگہ رکھتا ہوگا۔ یہ بہت برا ہوا کہ وہ شناخت ہونے سے قبل ہی مارا گیا۔''

ڈولنگر نے اپنے بریف کیس سے وہ تین لوہے کی پتیاں نکالیں جو انہیں بروس کے تھیلے سے ملی تھیں۔ انہیں دیکھتے ہی گراہم چونک پڑا جیسے اس کے سامنے کوئی عجیب چیز رکھ دی گئی ہو۔ پھر اس نے ایک ایک کر کے انہیں اٹھایا اور ان کا معائنہ کرنے کے بعد بولا۔ ''شوہارن۔''

''کیا مطلب؟''

''انہیں جوتے پہننے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔'' گراہم نے اپنی کرسی پر پیچھے کی جانب جھکتے ہوئے کہا۔

''زیادہ تر میل باکس میں تالے نہیں ہوتے لیکن مقفل باکس بھی مکمل طور پر محفوظ نہیں ہیں اور انہیں کھولنا کچھ زیادہ مشکل نہیں۔ اس شخص نے بڑی مہارت سے شوہارن

''بہرحال جس کے پاس بھی چابیاں ہیں، وہ کم از کم دو دن تک وین کو وہاں سے نہیں لے جاسکتا کیونکہ سڑک کی کھدائی کا کام ہو رہا ہے۔''

اس شام اوبرن اپنی بہن کے گھر کھانے پر مدعو تھا۔ وہ آٹھ بجے کے بعد وہاں سے نکلا۔ راستے میں میرکل پارک کے قریب پہنچ کر اسے خیال آیا کہ وہ ایک نظر بروس کی وین کو دیکھ لے جسے کیسٹرل نے تالے لگانے کے بعد سیل کر دیا تھا۔ وہ دیکھنا چاہ رہا تھا کہ کسی نے وہ سیل کھولنے کی کوشش تو نہیں کی۔ اس کام میں زیادہ سے زیادہ دس منٹ لگتے۔

جب وہ گرینڈا اسٹریٹ پہنچا تو وہاں مکمل تاریکی چھائی ہوئی تھی اور فٹ پاتھ سنسان تھی۔ صرف دو گھروں میں روشنی ہو رہی تھی۔ غالباً دوسرے مکان خالی پڑے ہوئے تھے۔ اس نے اپنی گاڑی کھدائی کرنے والے مزدوروں کے ٹرک کے پیچھے کھڑی کر دی اور باہر آ گیا۔ اب کھدی ہوئی سڑک پر لکڑی کا تختہ لگا دیا گیا تھا۔ وہ اسے پھلانگ کر وین کے قریب پہنچ گیا اور جیب سے ٹارچ نکال لی۔ وین کے عقبی دروازے کی سیل ٹوٹی ہوئی تھی اور وہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔ اس کے کناروں سے مدھم روشنی باہر آ رہی تھی۔

وہ وین کے عقبی حصے سے دس فٹ کے فاصلے پر تین چار منٹ تک خاموش کھڑا رہا لیکن اس کے کان کوئی آواز سننے کے منتظر تھے۔ کیا کوئی شخص آواز پیدا کیے بغیر وین کے اندر اپنی کارروائی میں مصروف تھا۔ اس کے کان صرف سرد ہوا کی سرسراہٹ یا دور سے گزرنے والے ٹریفک کی دھیمی آواز سن سکتے تھے۔ کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد اس نے دبے پاؤں وین کے گرد ایک چکر لگایا۔ اسے بغلی دروازے کے کنارے سے روشنی کی ایک اور لکیر آتی دکھائی دی۔

قاعدے کے مطابق اسے پسپائی اختیار کر کے کسی کو اپنی مدد کے لیے بلانا چاہیے تھا لیکن اس کی اپنی پوزیشن غیر واضح تھی۔ وہ جانتا تھا کہ گراہم اور اس کے ساتھی اپنے طور پر بروس کے ٹھکانے پر حملہ کرنے کا فیصلہ کر چکے ہوں گے۔ وہ وین کی طرف بڑھا اور اس نے عقبی دروازے پر دستک دیتے ہوئے کہا۔ ''دروازہ کھولو، پولیس۔''

عین اسی لمحے اسے خیال آیا کہ اس کا ریوالور کار کے گلو باکس میں رکھا ہوا ہے جسے اس نے بہن کے مکان میں جاتے ہوئے مقفل کر دیا تھا۔ وین کے اندر کی روشنیاں بجھ گئی تھیں۔ اس سے پہلے کہ اوبرن دوبارہ دستک دیتا، اچانک وین کا دروازہ کھلا اور اندر سے ایک ہٹا کٹا شخص

کے ذریعے مطلوبہ لفافے نکال لیے۔''

انہوں نے گراہم سے کچھ مزید معلومات کا تبادلہ کیا اور اس سے رابطہ میں رہنے پر متفق ہو گئے۔ اب یہ معلوم کرنا باقی تھا کہ ان جرائم میں بروس کے ساتھی کون تھے بالخصوص کون لوگ اس سے چرائی ہوئی ادویات خرید رہے تھے۔ اس وقت ان کی نظر میں پریسٹن ہاروے ہی ایسا شخص تھا جس پر توجہ مرکوز کی جاسکتی تھی۔

انہیں جیسے ہی ہاروے کے بارے میں رپورٹ ملی۔ اسے فوراً ہی گراہم کو بھیج دیا۔ پریسٹن ہاروے چھیالیس سالہ شادی شدہ اور دو بچوں کا باپ تھا۔ وہ کسی کا نا دہندہ نہیں تھا اور نہ ہی اس سے ماضی میں کوئی جرم سرزد ہوا تھا۔ اس کی بیکن ہلز میں میوزیکا اینٹیکا کے نام سے پرانی موسیقی کی دکان تھی۔ اس کے علاوہ ہارووڈ اسکوائر کے نزدیک اس کا ڈرگ اسٹور بھی تھا جبکہ وہ خود بھی ایک رجسٹرڈ فارماسسٹ تھا۔

اوبرن اور ڈولنگر نے اس معاملے کی مزید تحقیقات گراہم اور وفاقی اداروں کے لیے چھوڑ دی اور خود بروس کے قاتل کی تلاش میں لگ گئے۔ ریکارڈز سے دلچسپی رکھنے والے شخص نے والٹر بروس کے بارے میں ایک فیچر لکھا تھا دس ہفتے قبل شائع ہوا۔ اس کے مطابق بروس کی بیوی مر چکی تھی اور اس کا کوئی خاندان نہیں تھا۔ اس نے ایک غیر استعمال شدہ وین خریدی اور گلی گلی پھر کر ریکارڈ بیچنے لگا۔ اس کا کوئی مستقل ٹھکانا نہیں تھا اور وہ ایک شہر سے دوسرے شہر سفر کرتا رہتا۔ اس کے مجرمانہ ماضی کے باوجود ڈولنگر محسوس کر رہا تھا کہ اس کا قتل ڈاکا زنی کا شاخسانہ ہے اور لگتا یہی ہے کہ دو تین اجنبیوں نے اسے جنگل میں اکیلا دیکھ کر لوٹنے کی کوشش کی اور مزاحمت کے نتیجے میں اسے قتل کر دیا لیکن اوبرن اس خیال سے متفق نہیں تھا۔

''اس کے قتل میں صرف ایک گن استعمال ہوئی ہے۔'' اس نے ڈولنگر کو یاد دلایا۔ ''محض اس کا والٹ چھیننے کے لیے کوئی اس کے جسم میں پانچ گولیاں اتارے گا اور اس کی چابیاں...... مت بھولو کہ وہ بھی غائب ہیں۔''

''ممکن ہے کہ ڈاکو وہ چابیاں اپنے ساتھ لے گئے ہوں تاکہ اس کی وین تلاش کر کے اسے بھی لے جاسکیں۔''

''یہ بھی ہوسکتا ہے۔'' اوبرن نے کہا۔ ''لیکن جنگل سے گزرنے والا وہ راستہ شارٹ کٹ کے طور پر استعمال ہوتا ہے اور کوئی بھی شخص اس کی لاش کی تلاشی لے کر نقد رقم اور چابیاں لے جاسکتا ہے۔''

برآمد ہوا۔ اسے دیکھ کر پہلے تو ڈولنگر کا گمان ہوا کہ کہیں وہ خود ہی اپنے طور پر مشن کی تکمیل کے لیے نہ آگیا ہو لیکن جب ٹارچ کی روشنی اس کی کلائی میں پڑے تانبے کے بریسلیٹ پر گئی تو اوبرن کو اسے پہچاننے میں دیر نہیں لگی۔ وہ کینٹ ویل تھا۔ کھدائی کرنے والے مزدوروں کا سربراہ جس سے اوبرن پہلے بھی مل چکا تھا۔ وہ اس سے عمر میں دس پندرہ برس ہی زیادہ ہوگا لیکن اس کا وزن اوبرن سے کم از کم پچاس پونڈ زیادہ تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک ریوالور تھا جس کا رخ اس نے اوبرن کی جانب کر دیا۔ اوبرن ایک لمحہ ضائع کیے بغیر تھوڑا سا جھکا۔ اس نے لوہے کے بھاری دروازے کا کنارہ پکڑا اور اسے زور سے بند کر دیا۔ شاید وہ ایسا نہ کرتا اگر اسے معلوم ہوتا کہ کینٹ ویل کے ہاتھ میں خالی ریوالور تھا۔ وہ بھاری بوری کی طرح گر پڑا۔ جب تک اس کے حواس بحال ہوئے، اوبرن نے اس کا ہتھیار چھین لیا پھر اس کے کپڑوں کی تلاشی لے کر نوٹوں کی بھاری مقدار برآمد کی اور پولیس کی گاڑی کے ساتھ ساتھ ایمبولینس بلانے کے لیے فون کر دیے۔ جب تک وہ لوگ پہنچتے، اوبرن نے ہیڈ کوارٹر فون کر کے ڈسپیچر سے کینٹ ویل کا ریکارڈ نکالنے کے لیے کہا جس سے معلوم ہوا کہ وہ عادی مجرم تھا اور اس کے جرائم کی فہرست کافی طویل تھی۔ اوبرن نے برآمد شدہ رقم متعلقہ پولیس افسران کے حوالے کی اور خود کینٹ ویل کو لے کر اسپتال چلا گیا۔ بھاری دروازے کی ضرب سے اس کا سر زخمی ہو گیا تھا اور کلائی پر بھی چوٹ آئی تھی۔

کینٹ ویل نے اپنے اعترافی بیان میں کہا۔ ''میں نے اس شخص کے پاس ایک بڑی رقم دیکھی تو دل میں لالچ آگیا۔ اس نے بہت زیادہ پی رکھی تھی اور نشے کی وجہ سے وہ لڑکھڑا کر چل رہا تھا۔ میں نے اندازہ لگا لیا کہ اسے بہ آسانی قابو کیا جا سکتا ہے۔ مجھے اس کے کاروبار کا اندازہ ہو گیا تھا چنانچہ میں نے اسے بتایا کہ میرے پاس قدیم اور نایاب ریکارڈز کا ذخیرہ ہے جو میں اسے سستے داموں فروخت کر سکتا ہوں۔ یہ سن کر وہ لالچ میں آکر میرے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہو گیا۔ اس نے اپنی وین کو تالا لگایا اور میں اسے لے کر جنگل کی طرف چل دیا۔

ایک سنسان مقام پر پہنچ کر میں نے اسے گرانے کی کوشش کی تو اس نے مجھ پر پستول تان لیا اور میرے چہرے کا نشانہ لے کر گولی چلا دی لیکن اس کا نشانہ خطا گیا اور دھماکے کی وجہ سے پستول اس کے ہاتھ سے گر گیا جسے میں نے فوراً اٹھا لیا لیکن پھر وہ ایک جنگلی بھینسے کے مانند میری طرف جھپٹا، اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ میں کیا کرتا۔ صرف ایک ہی راستہ تھا کہ اس پستول سے اپنا دفاع کروں۔''

''اور تم نے اسے پانچ گولیاں ماردیں؟''

''پہلی گولی اس کا راستہ نہیں روک سکی چنانچہ میں نے اپنا دفاع کرنے کے لیے پانچوں گولیاں اس کے جسم میں اتار دیں۔''

اوبرن نے اسے بتا دیا کہ کسی مجرمانہ فعل کے دوران ہلاک کرنا پہلے درجے کے قتل میں شمار ہوتا ہے، اب یہ اس کے وکیل پر منحصر تھا کہ وہ کس طرح اس الزام کو عدالت میں غلط ثابت کرتا ہے۔

دوسرے روز گراہم نے اوبرن کو فون کر کے بتایا کہ بوسٹن میں ایف بی آئی کی ٹیم نے چھاپا مار کر ہاروے کو گرفتار کر لیا ہے، اس پر چوری شدہ اشیا رکھنے اور ممنوعہ اشیا کی غیر قانونی نقل وحرکت کا الزام تھا۔

کینٹ ویل پر ایک اور الزام بھی لگایا جا رہا تھا کہ وہ شراب کی بوتلیں چوری کرنے کی غرض سے بروس کی وین میں داخل ہوا تھا لیکن اوبرن کی مداخلت کی وجہ سے اس کا مشن ادھورا رہ گیا کیونکہ وہ ان بوتلوں کو وین سے باہر لانے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ اس لیے سرکاری وکیل نے اس پر زور نہیں دیا۔

اوبرن کا کام ختم ہو چکا تھا اور وہ ایک بار پھر میز پر بیٹھ کر دفتری امور نمٹانے لگا۔ کھانے کے وقفے کے دوران اس نے ڈولنگر سے کہا۔ ''آج کل کے مجرم ایسی احمقانہ حرکتیں کرنے لگے ہیں جن کی وجہ سے وہ بہ آسانی پکڑ میں آجاتے ہیں۔ اگر یہی حال رہا تو ایک دن ہم دونوں فارغ ہو کر گھر بیٹھے ہوں گے۔ اب اسی شخص کو دیکھ لو۔ یہ جانتے ہوئے کہ پولیس نے بروس کی وین کو سیل کر دیا ہے۔ وہ جیب میں چابیاں ڈال کر وہاں تک گیا۔ وہاں سے نقد رقم نکالی اور جس پستول سے قتل کیا تھا، وہی ہاتھ میں لے کر باہر آگیا اور جب میں نے وین کا دروازہ کھٹکھٹایا تو بڑی بے خوفی سے میرے قدموں میں گر گیا۔ شاید اسے اپنی طاقت پر کچھ زیادہ ہی بھروسا تھا۔''

ڈولنگر نے تائید میں سر ہلا دیا۔ وہ کیا کہتا کہ سارے سراغ رسان اوبرن کی طرح بہادر اور بے چین نہیں ہوتے۔ اگر اس روز وہ بہن کے گھر سے واپس آتے ہوئے بروس کی وین دیکھنے نہ جاتا تو مجرم ہاتھ سے نکل گیا تھا۔

یہ موسم گرما کا ایک تکلیف دہ دن تھا۔ اس قدر گرم کہ جب آپ کے کپڑے آپ کے بدن سے چپکنے لگتے ہیں اور آپ کے یخ سوڈا کین پر بخارات ابھرنے لگتے ہیں۔ بدقسمتی سے آگ برساتی گرمی بھی اس سرد لہر کو روکنے میں ناکام رہی تھی جو میری ریڑھ کی ہڈی میں سنسنا رہی تھی۔

میں اس نامعلوم فون کال کے بارے میں سوچ رہا تھا جس کے نتیجے میں مجھے یہاں سراغ رساں فاؤلر کے گھر آنا پڑ گیا۔

''جیمز فٹ مر گیا ہے۔'' یہ وہ مختصر سا پیغام تھا جو ایک بھرائی ہوئی آواز نے مجھے فون پر دیا تھا۔

جیمز فٹ، سراغ رساں فاؤلر کی وہ عرفیت تھی جسے وہ اپنے تازہ ترین درپردہ اسائنمنٹ کے لیے استعمال کر رہا تھا۔ ایک ایسا درپردہ کام جو بظاہر ایک مجھوتا تھا۔

جیمز فاؤلر اور میں بہت پرانے دوست تھے۔ اسی بنا پر میں اس کے مکان میں داخل ہونے سے خاصا ہچکچا رہا تھا کیونکہ میں اپنے خوف کی تصدیق کرنے سے گریزاں تھا۔

میں نے اپنے اعصاب پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے ڈورناب پر ہاتھ رکھا اور اسے گھما دیا۔ دروازے کا تالا کھلا ہوا تھا لیکن اس سے پیشتر کہ میں دروازہ کھولتا، اپنے عقب میں پتھریلے ڈرائیو وے پر کسی کار کے رکنے کی آواز پر میری توجہ اس جانب مبذول ہو گئی۔

قانون کے محافظوں کا کام ہی محافظت ہے... اور ایمان دار اپنی ذمے داری کا ادراک رکھتے ہیں... مگر یہاں قانون و انصاف کی آبرو اپنے ہی رکھوالوں کے ہاتھوں خطرے میں پڑ گئی تھی... اور بے ضمیر اپنی دست درازیوں کے لیے آزاد گھوم رہے تھے...

لاحاصل

بابر نعیم

قانونی شقوں کی نذر ہو جانے والی جرم کی تلخ حقیقت کا احوال

میں نے پلٹ کر دیکھا تو ایک اور اسکوڈا کار میری کار کے برابر میں آکر رک چکی تھی۔ اس اسکوڈا کار سے ایک جانی پہچانی شخصیت باہر نکلی اور پورچ میں میرے پاس آگئی۔

وہ میری افسرِ اعلیٰ کیپٹن ڈورتھی تھی اور وہ خوش نظر نہیں آرہی تھی۔ وہ ابتدا ہی سے اس بات کی مخالف رہی تھی کہ اس کے اسٹار سراغ رساں کو اس قسم کے خطرناک درپردہ اسائنمنٹ پر مامور کیا جائے لیکن چیف نے اس کے اعتراض کو مسترد کردیا تھا۔

اگر فون پر موصول ہونے والا پیغام صحیح تھا تو میں تصور کر سکتا تھا کہ ایک بار پولیس اسٹیشن واپس پہنچنے پر چیف کے لیے اس کے منتخب کردہ الفاظ کیا ہوں گے۔

ڈورتھی نے تیوریاں چڑھاتے ہوئے میری طرف دیکھا اور بولی۔ ”تم یہاں کھڑے کیا کررہے ہو؟“

پھر میرے جواب کا انتظار کیے بغیر اس نے اپنی گن نکال لی اور دوسرے ہاتھ سے دروازہ کھول دیا۔ وہ محتاط انداز میں قدم اٹھاتی ہوئی اندر داخل ہوئی تو اس شخص کی لاش سے الجھ کر گرتے گرتے بچی جو پیٹ کے بل ہمارے سامنے فرش پر پڑی ہوئی تھی۔

وہ جیمز فاؤلر ہی تھا اور خون کے جس ڈھیر میں پڑا ہوا تھا اس سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ فون پر موصول ہونے والی اطلاع غلط نہیں تھی۔

جیمز فاؤلر مر چکا تھا۔

بظاہر یہی لگ رہا تھا کہ جب اسے گولی ماری گئی تو اس وقت وہ دروازے سے صرف چند فٹ کے فاصلے پر تھا اور یا تو اپنے قاتل کی جانب بڑھ رہا تھا یا پھر مدد کی پکار کے لیے داخلی دروازے کو کھولنا چاہتا تھا لیکن پھر اس کی موت واقع ہوگئی اور وہ وہیں پڑا رہ گیا۔

ہم نے سب سے پہلے یہ یقین دہانی کرلی کہ مکان محفوظ ہے اور کسی قسم کا مزید کوئی خطرہ موجود نہیں ہے۔ پھر ہم اس کیس پر گفتگو کرنے لگے۔ میرا ذہن یہ کہہ رہا تھا کہ اس کیس کی مکمل طور پر تحقیقات ہونی چاہیے۔ لیکن کیپٹن ڈورتھی کا کہنا تھا کہ یہ ایک 'اوپن، شٹ' کیس ہے۔ اس کا نتیجہ سامنے ہے اور اس میں مزید کسی قسم کی تحقیقات کی ضرورت نہیں۔

”جیمز فاؤلر گرسالڈ آرگنائزیشن میں درپردہ کام کررہا تھا۔“ کیپٹن ڈورتھی نے کہا۔ ”انہیں ظاہر ہے کہ پتا چل گیا کہ یہ ایک پولیس مین ہے اور انہوں نے اس کو ٹھکانے لگا دیا... کہانی اختتام پذیر ہوئی۔“

یہ کہہ کر کیپٹن ڈورتھی نے اس پیپسی کے کین سے لمبا گھونٹ بھرا جو اس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا۔ پھر ایک آہ بھرتے ہوئے بولی۔ ”دیکھو، میں جانتی ہوں تم دونوں ایک دوسرے کے قریب تھے اور تمہارا دوستی کا رشتہ مضبوط تھا، وہ واقعی ایک عمدہ سراغ رساں تھا لیکن ہم کبھی بھی گرسالڈ آرگنائزیشن پر کوئی کاری ضرب لگانے میں کامیاب نہیں ہو سکے ہیں اور اس مرتبہ بھی میں کسی قسم کی خوش فہمی میں مبتلا نہیں رہنا چاہتی...“

کیپٹن ڈورتھی کے الفاظ کسی دھند کے مانند میرے کانوں سے گزرنے لگے۔ مجھے کوئی چیز ذہنی طور پر کچوکے لگا رہی تھی۔ یہ بات گرسالڈ کے مخصوص انداز پر فٹ نہیں بیٹھ رہی تھی کہ وہ لاش کو پیچھے چھوڑ جائے۔ نہ ہی یہ اس کے رویے میں شامل تھا کہ نامعلوم فون کے ذریعے کوئی ٹپ مہیا کردے۔

کیپٹن ڈورتھی کا اپنے طور پر معمول کی کارروائی کو بے ساختہ رد کرنا میرے لیے ناقابلِ قبول تھا اور اس کے انکار نے میرے انصاف کی خواہش کو مزید بھڑکا دیا تھا۔

میں بس یونہی ہار ماننا نہیں چاہتا تھا۔ ”میں اس بارے میں غور کرتا رہا ہوں، کیپٹن۔“ میں نے کہا۔ ”اور میرے خیال میں ہم گرسالڈ کو اس کی کسی بھی کارروائی پر نشانہ بنانے میں اس لیے ناکام رہے ہیں کہ وہ لوگ کمیشن دیتے ہیں اور ہمیں یہ بات معلوم ہے۔ اس لیے ہم تمام معاملات سے ان کا ناتا جوڑنے میں کامیاب نہیں رہتے۔ ان کا کوئی آدمی ہمارے درمیان موجود ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ میں اس بارے میں جتنا سوچتا ہوں، اتنی ہی بات زیادہ سمجھ میں آتی ہے... جیمز فاؤلر نے یقینی طور پر یہ پتا چلالیا تھا کہ ہم میں سے کون رشوت لے رہا ہے...“

”لغو باتیں مت کرو... میری کمانڈ کے نیچے کوئی بھی رشوت نہیں لیتا۔“ اس نے پیپسی کا ایک اور بڑا گھونٹ بھرا اور مجھے گھورنے لگی۔

میں اس معاملے کو یونہی جانے نہیں دینا چاہتا تھا لیکن ڈورتھی کی پیپسی نے میری توجہ بٹادی۔ مجھے یاد آیا کہ یہ جگہ ایک گرم حمام کی طرح محسوس ہورہی تھی۔ میرا خیال ہے کہ جیمز فاؤلر ائرکنڈیشنگ پر یقین نہیں رکھتا تھا۔ میں نے سوچا کہ اب ایک کولڈ ڈرنک ہی میرے دماغ کو ٹھنڈک پہنچانے میں مدد کر سکتی ہے۔

میں نے کیپٹن ڈورتھی سے کہا کہ میں کولڈ ڈرنک لینے کے لیے کچن میں جارہا ہوں۔ میں نے ریفریجریٹر کھولا تو فوراً ہی یاد آگیا کہ جیمز فاؤلر بے حد ڈائٹ کوک پینے کا عادی تھا۔ ریفریجریٹر ڈائٹ کوک سے بھرا ہوا تھا۔ لیکن حقیقت میں صرف یہی ایک بیوریج موجود تھی۔

میں نے یہ جاننے کے بعد کہ فریزر میں برف موجود

ہے، گرم مشروب کے لیے نعمت خانے کو چیک کیا تو پتا چلا کہ اس میں بھی صرف ڈائٹ کوک کے بہت سے پیک رکھے ہوئے ہیں۔ جیمز فاؤلر کو ڈائٹ کوک سے پیار تھا۔

اگر مجھ سے پوچھیں تو یہ کوئی مردانہ پسندیدہ مشروب نہیں تھا، لیکن میں اس بارے میں کیا کہہ سکتا تھا؟ میری کمر میں ایک اسپیئر ٹائر آسکتا تھا جبکہ جیمز فاؤلر کا پیٹ دھوبی پٹڑے کے مانند تھا۔

حقیقت میں کولا کی فراوانی نے مجھے کیپٹن ڈورتھی کی پیپسی کی لت یاد دلادی۔ لوگ کثرت سے سگریٹ پینے والوں کو 'چین اسموکر' کہتے ہیں۔ اسی طرح میں ڈورتھی کے بارے میں سوچتا تھا کہ وہ ایک 'چین کولا ڈرنکر' ہے۔ میں اس کے ساتھ اتنا عرصہ گزار چکا تھا کہ مجھے معلوم تھا وہ روزانہ پیپسی کے کم از کم چھ کین ضرور پیتی تھی۔ سچی بات تو یہ تھی کہ میرا اپنا پیپسی کا خرچ کبھی کبھار اس کی برابری کر جاتا تھا۔

کہنے کو ہم دونوں ہی 'پیپسی کے خبطی' تھے۔ اس وقت میری پیاس کی جو کیفیت تھی تو میں شاید کوک پینے کے بارے میں سوچ سکتا تھا لیکن ایک ڈائٹ کوک؟

ڈائٹ کوک کے بارے میں میری اپنی رائے یہ تھی کہ اس میں پرانے موزوں کی سی بو آتی ہے اور اس کا ذائقہ اس کی بُو سے بھی بدتر ہوتا ہے۔ یہ کہنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ میں نے ٹھنڈے پانی کا ایک گلاس پینے کو ہی ترجیح دی۔

جب میں واپس بیرونی کمرے میں پہنچا تو کیپٹن ڈورتھی نے تیوریاں چڑھاتے ہوئے مجھے گھورا اور بولی۔ ''میں یہ گرمی اب مزید برداشت نہیں کر سکتی۔ ہم واپس اسٹیشن پہنچ کر اپنی گفتگو جاری رکھیں گے۔''

ڈورتھی نے جیکٹ نہیں پہنی ہوئی تھی۔ میں دیکھ سکتا تھا کہ اس کی بغلوں کے نیچے پسینے کے دھبے پھیلتے جارہے تھے۔ یہ کوئی دلکش منظر نہیں تھا۔ لیکن جس چیز نے میری توجہ اپنی جانب مبذول کرائی، وہ اس کی پتلون کی جیبیں تھیں جو بالکل کسی ہوئی تھیں۔ اور ان میں کوئی چیز سما نہیں سکتی تھی۔

اور پھر مجھ پر سب کچھ اچانک عیاں ہو گیا۔

''کیپٹن۔'' میں نے کہا۔ ''تم نے یہ پیپسی کہاں سے لی تھی؟''

ڈورتھی کے چہرے کی رنگت پھیکی سی پڑ گئی۔ ''یہ میں اپنے ساتھ لائی تھی۔'' اس نے غراتے ہوئے کہا۔

''نہیں، یہ کین تم اپنے ساتھ نہیں لائی تھیں... تم یقیناً اسے یہاں پیچھے چھوڑ گئی تھیں۔ جب تم پہلے یہاں آئی تھیں اس لیے کہ اس وقت تمہارے ہاتھ میں صرف تمہاری گن تھی جب تم میرے ساتھ اس گھر میں داخل ہوئی تھیں...''

جیسے ہی میں نے اس کی گن کا تذکرہ کیا تو اسے اپنی گن کا وجود یاد آگیا۔ اس نے اچانک اپنا ہاتھ اپنے ہولسٹر کی جانب بڑھایا۔

لیکن میں اس کے لیے پہلے ہی تیار اور ہوشیار تھا۔ ''اس کی زحمت مت کرو۔'' میں نے اپنے ریوالور کا رخ براہِ راست اس کے ہولسٹر کی جانب کرتے ہوئے کہا۔

''یہ صرف میرے لفظوں کے خلاف تمہارے الفاظ ہوں گے۔'' اس نے تنبیہی لہجے میں کہا۔

اس دوران میں اس کی دبلی پتلی کلائیوں میں ہتھکڑی پہنا چکا تھا۔ ساتھ ہی میں نے اس کے حقوق پڑھ کر سنانا شروع کر دیے جن سے وہ پہلے سے بخوبی واقف تھی۔

میں اسے گھسیٹتا ہوا پولیس اسٹیشن لے گیا۔

اس موقع پر یہ کہنا نہایت مناسب رہتا کہ انصاف کے تقاضے پورے ہو گئے اور کہانی ختم۔

بدقسمتی سے میں یہ کہہ نہیں سکا اس لیے کہ اس کیس میں انصاف کے تقاضے پورے نہیں ہوئے تھے۔ کیپٹن ڈورتھی کے خلاف مقدمہ دائر کرنے کے لیے ثبوت ناکافی تھے۔ جیسا کہ اس نے کہا تھا اس کے خلاف ثبوت اس کے الفاظ کے خلاف صرف میرے الفاظ ہی تھے۔ بات یہیں ختم ہو رہی تھی۔

انٹرنل افیئرز کے حکام صرف میری ہنسی اڑا کر رہ گئے جب میں نے انہیں بتایا کہ میرا واحد ثبوت پیپسی کا ایک کین ہے۔

بے شک معاملہ کا منفی پہلو یہ بھی رہا کہ کیپٹن ڈورتھی اور میں ایک دوسرے کے سابقہ محبوب تھے اور مزید یہ کہ ہم دونوں نے پولیس اسکواڈ ایک ساتھ جوائن کیا تھا اور کیپٹن کے عہدے پر ترقی کے لیے ٹاپ کے دو امیدوار تھے۔

انٹرنل افیئرز والوں نے میرا الزام یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ یہ ایک سابقہ بوائے فرینڈ کی حاسدانہ ہرزہ گوئی ہے جو اپنی سابقہ گرل فرینڈ سے انتقام لینا چاہتا ہے۔

اس سارے معاملے کا حاصل یہ رہا کہ ایک بے گناہ شخص فضول میں مارا گیا اور ایک بے ایمان پولیس افسر قتل کرنے کے باوجود بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئی۔

دوسری طرف میری ساکھ متاثر ہوئی اور میری بدنامی ہو گئی۔ میرا تبادلہ ایک ایسے ضلع میں کر دیا گیا جہاں جرائم کی بھرمار تھی۔

لیکن سب سے بدتر یہ حقیقت رہی کہ اب میں پیپسی کا کین پینا تو کجا اس کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتا۔

اب میں ڈیو (Dew) پیتا ہوں اور do the Dew کرتا ہوں۔

آوارہ گرد

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

قسط 22

مندر، کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور اناتھ آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھناؤنے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہورہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابل نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پتلا نہیں تھا جو ان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگا رنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

تحیر... سنسنی اور ایکشن میں ابھرتا ڈوبتا دلچسپ سلسلہ...

ایک پھانس سی تھی جو میرے گلے میں اٹک کر رہ گئی تھی، اس سوئے دار پر لٹکے مجرم کی طرح جس کے پیروں تلے سے جلاد نے تختہ کھینچ لیا ہو مگر جان تھی کہ نکل ہی نہ رہی ہو اور یہی اذیت مجھے بھی ادھ موا کیے دے رہی تھی۔

میری اس جاں کش تکلیف کو فزوں تر کرتی وہ مسکراہٹ تھی جو میں اس وقت زہرہ بانو کے لبوں پر مچلتی ہوئی دیکھ رہا تھا۔

''کیا واقعی یہ سب کچھ ہو چکا تھا؟ جو نہیں ہونا چاہیے تھا؟''

مجھے اپنا حلق خشک محسوس ہو رہا تھا، اس قدر کہ منہ سے کوئی الفاظ ہی نہیں نکل رہے تھے۔ بس! اک یک ٹک نگاہ تھی جو زہرہ بانو کے چہرے پہ جم کے رہ گئی تھی۔ جیسے ہی وہ چند قدم اُٹھاتی مسہری کے قریب آئی، میں مسہری سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ ایسے میں مجھے ہلکا سا چکر بھی آ گیا، یہ شاید نیند سے بیداری کے فوراً بعد اُٹھ کھڑے ہونے کی وجہ سے ہوا تھا یا پھر کوئی اور وجہ تھی۔

''کک... کیا، کیا ہے تم نے میرے ساتھ؟ کیوں کیا ایسا میرے ساتھ؟'' میرا لہجہ اور الفاظ کا بکھراپن صاف عیاں تھا۔ میں نے دیکھا زہرہ بانو کے چہرے کی مسکراہٹ یک دم حیرت میں بدل گئی... اور وہ بہ دستور میری طرف سوالیہ نگاہوں سے تکتے ہوئے بولی۔

''کیا ہوا؟ میں نے ایسا کیا کر دیا تمہارے ساتھ؟ میں کچھ سمجھی نہیں؟''

اس کے ان الفاظ نے جیسے میرے اندر تک سکون آور لہریں سی دوڑا دیں۔ میں نے بے اختیار ایک گہری سانس خارج کر کے خود کو پُرسکون کیا اور دوبارہ مسہری پر بیٹھ گیا۔

''شش... شاید، میں نے کوئی بھیانک خواب دیکھا تھا۔'' کہتے ہوئے میں نے اپنا سر جھکا لیا۔ شکر ہے کہ بات بن گئی، زہرہ بانو کچھ نہیں سمجھی تھی۔ وہ میرے بالکل قریب آ گئی تھی، اور پھر بہت دھیرے سے اس نے اپنا نرم و نازک ہاتھ میرے کاندھے پر رکھ دیا۔

''ہاں! تم نے یقیناً کوئی خواب ہی دیکھا ہوگا۔ اس میں تمہارا نہیں، تمہارے حالات، تمہاری پریشانیوں کا ہی دخل ہے۔''

مجھے زہرہ بانو کی بات سے ہی نہیں لہجے نے بھی صاف لگتا تھا کہ ایسا کچھ بھی نہیں ہوا تھا جیسا میں سمجھ رہا تھا۔ میں ایک بار پہلے بھی زہرہ بانو کی ذات پر شبہ کر چکا تھا، جب ماں جی نے شادی والی بات کہی تھی اور اول خیر کے سمجھانے پر مجھے اس کا قلق بھی ہوا تھا، اگرچہ زہرہ بانو نے بھی جواب میں سرکشی کا مظاہرہ کیا تھا جو شاید اس کے فطری ردِعمل کا غماز تھا، لیکن بعد میں وہ اس بات کو ایسے فراموش کر گئی تھی جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا، بلاشبہ یہ اس کا بڑا پن تھا، اور مجھے بھی اسی رویے کا مظاہرہ کرنا چاہیے تھا۔

میں واقعی اس کے سامنے شرمساری سی محسوس کرنے لگا اور دل میں خیال آیا کہ یہی وقت ہے، ایک اُلجھن کو پوری طرح رفع کرنے اور معذرت کرنے کا۔ غلطی تسلیم کرنا بہ ذات خود ایک بڑا پن ہے، لہٰذا میں نے زہرہ بانو کا اپنے شانے پر رکھا ہوا مرمریں ہاتھ آہستگی سے تھام لیا۔ وہ میرے قریب ہی مسہری پر بیٹھ گئی اور میرے چہرے کی جانب دیکھنے لگی۔ میں بھی اسی طرح بہ غور اس کا چہرہ تکتا رہا۔ پھر ہولے سے بولا۔

''زہرہ! تم جانتی ہو کہ میں تم سے کوئی بھی بات نہیں چھپاتا ہوں۔ اپنے دُکھ درد، اپنی تکلیفیں، سب تم سے شیئر کرتا ہوں۔ ایسے میں شاید نادانستہ طور پر میرے منہ سے کبھی تمہارے لیے کچھ ایسا نکل جاتا ہے جس سے تمہیں دکھ بھی ہوتا ہو۔ میں اُس روز ماں جی والی بات پر جذباتی ہو گیا تھا اور تمہیں غلط سمجھ بیٹھا تھا، میں اس کی تم سے معافی چاہتا ہوں۔'' میں اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔ میں نے اس بار بات کو اپنائیت کا رنگ دیتے ہوئے آپ کا صیغہ استعمال نہیں کیا تھا۔

''بس! کہہ چکے؟'' زہرہ نے مسکراتے ہوئے نہایت ملائمت آمیزی سے کہا تو میں دوبارہ بولا۔

''نہیں۔ اور بھی کہنا ہے مجھے۔'' یہ کہتے ہوئے بے اختیار میرے ہونٹوں پہ بھی دھیمی سی مسکراہٹ اُبھر آئی۔ اس کی نگاہیں بڑی محبت سے میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ جیسے وہ ہمیشہ کی طرح مجھے نگاہوں ہی نگاہوں میں کہیں دور لے چلی ہو۔

''زہرہ! آج پھر مجھ پر وہی جذباتی کیفیت طاری ہونے لگی تھی۔ آج پھر میں تمہیں ایک الزام دینے لگا تھا۔ میں... سمجھا تھا کہ شش... شاید... کل رات...'' میری آواز حلق میں اٹکنے لگی۔ مجھ سے جملہ پورا نہیں ہو پایا تھا کہ زہرہ نے نرم آواز میں کہا۔

''میں جان گئی تھی کہ تم کیا سمجھنے لگے تھے۔ اور تم مجھے جیسا سمجھتے ہو اس میں تمہارا کبھی تو کوئی قصور نہیں ہوتا۔ اسی لیے... میں بھی اپنا غصہ اپنی ناراضی بھول جاتی ہوں۔ مگر

شہزی! آج ایک بات تم بھی سن لو۔ زہرہ بانو صرف ایک عورت کا نام نہیں ہے۔ آگاہ ہو ناں تم اچھی طرح میری زندگی سے، میرے ماضی سے۔ میں کیا ہوں، کون ہوں۔ میں خود اپنی ذات میں ایک چٹان ہوں، پختہ ارادوں اور پُرعزم و حوصلے کی مالک عورت ہوں میں۔ کبھی بھی ایسی کوئی حرکت کرنے کا میں سوچ بھی نہیں سکتی جو میری شخصیت اور میرے کردار کے حوالے سے خود میرے لیے شرمندگی کا باعث بنے۔ رہے تم، تو میں تمہیں جانتی ہوں، اور عابدہ کو بھی، میں نے کبھی بھی اس بات کو سوچا تو کیا تصور بھی نہیں کیا کہ کبھی میں اس کی جگہ لے لوں۔ ہرگز نہیں۔ میں یہ تمہید بھی بھی نہیں باندھتی نہ ہی میں نے اس کی ضرورت محسوس کی کیونکہ میں اپنے ضمیر سے مطمئن ہوں۔ لیکن آج تمہاری معذرت ...... نے مجھے یہ سب کہنے پر مجبور کر دیا۔'' وہ پورے اعتماد، پورے وقار سے یہ سب کہہ کر خاموش ہوگئی۔

لیکن میں نے اس کے صبیح چہرے کی ملاحت میں گھلی ہوئی ایک غم آگیں کسک کو بھی واضح طور پر محسوس کیا تھا۔ اس کی آنکھوں کے کشادہ گوشے، کناروں تک یادِ رفتگاں کے پُرآزار لمحوں کے بوجھ تلے بھیگنے لگے تھے۔

اُس نے بڑے پُروقار انداز میں اپنی صفائی پیش کردی تھی۔ اگرچہ میرا دل پہلے ہی اس کی طرف سے صاف ہوگیا تھا۔ لیکن آج خود اس کی زبانی یہ سب سن لینے کے بعد میری تمام غلط فہمی دور ہوگئی تھی۔

دل کی کدورتیں اس طرح ڈھل جانے کے بعد ہم دونوں چند ثانیے ایک دوسرے کو گہری نظروں اور وسعتِ دل کے ساتھ دیکھ کر ہولے ہولے مسکرانے لگے، ایسے میں زہرہ نے میری ناک کی پھنگی کو ہولے سے چھوتے ہوئے مسکرا کے کہا۔

''تم مجھے کبھی کبھی کسی شریر بچے کی طرح ستاتے بھی ہو اور منا بھی جاتے ہو۔ مجھے تمہاری یہ ادا اچھی لگی۔ لیکن شہزی! مجھے مت ستایا کرو۔ جانتے ہو نا، میں اندر سے کس قدر دُکھوں اور غموں کا بوجھ اُٹھائے ہوئے ہوں؟'' اس کا لہجہ بھر رقتی ہونے لگا۔ میں نے دھیرے سے اور کچھ اپنائیت سے اس کا ہاتھ تھام لیا اور اس کی نرماہٹ سے کھیلتے ہوئے بولا۔

''بھلا میں آپ کا غم نہیں جانوں گا تو کون جانے گا؟ لیکن اس سچ کو تو آپ بھی جھٹلا نہ پائیں گی کہ آپ کا غم وقت کی گرد میں ایک دفن شدہ غم ہے۔ جس کی قبر ہمیشہ آپ کی آنکھوں کے سامنے رہتی ہے۔ لیکن میں اپنے دُکھ کو کیا نام دوں زہرہ؟ جو نہ مدفن ہے نہ ہی اس کی کوئی قبر ہے کہ جس پر میں آنسو بہا کر اپنے دُکھ کا بوجھ ہلکا کرسکوں۔ بلکہ میرا غم تو میرے لیے اک عذابِ مسلسل ہے۔ ایک غم ناتمام ہے۔ جس کا کوئی انت ہی نہیں۔

یہ ایک کربیہ حقیقت صحیح، لیکن دستورِ دنیا یہی ہے کہ مرنے والے پر صبر آ ہی جاتا ہے۔ لیکن...... میں کیا کروں۔ کہاں اپنا سر پٹخوں۔ کدھر جاؤں میں۔ کہاں روؤں میں کہ میری عابدہ تو میری آنکھوں کے سامنے دور کردی گئی۔ بہت دور...... اتنی دور کہ سمندروں پار چلی گئی۔ ایک ایسے دیسِ اغیار میں جہاں وہ معصوم بھوکے کرگسوں کے غول میں جا پھنسی ہے، جہاں اس کے پاس سوائے خدا کے کوئی نہیں۔ اور میں یہاں بے بسی سے ہاتھ مل رہا ہوں۔ یوں جیسے اس غریب کی بے بسی کا تماشا دیکھ رہا ہوں۔''

یہ کہتے کہتے میرا اپنا لہجہ بھی رُندھ گیا۔ ایک غبار سا تھا جس سے میرا سینہ بھر گیا تھا۔ مجھے گھٹن سی ہونے لگی۔ اور میں جیسے ہچکیاں لینے کے انداز میں لمبے لمبے سانس لینے لگا تو بے اختیار زہرہ بانو نے میری جھکی ہوئی گردن کے گرد اپنے مرمریں اور مہربان بازوؤں کا حصار بنا کر خود سے لگالیا۔

''ماں جی کی طبیعت کیسی ہے؟ میں تو ابھی تک ان سے مل بھی نہیں سکا۔'' میں نے دھیرے سے خود کو اس سے علیحدہ کرتے ہوئے کہا۔

''وہ ٹھیک ہی ہیں۔ ابھی میں نے اُنہیں تمہارے بارے میں نہیں بتایا ہے کہ تم آئے ہوئے ہو۔''

''کیا وقت ہو رہا ہے؟''

''رات کے بارہ بج رہے ہیں۔'' اس نے جواب دیا اور بے اختیار میں ہڑبڑا سا گیا۔ مجھے اول خیر کا خیال آیا، وہ بھی میرے ساتھ ہی آیا تھا۔ اس وقت شام جھکنے لگی تھی۔ اب رات کے بارہ بج رہے تھے۔ میں نے اندازہ لگایا۔ مجھے اس طرح لیٹے ہوئے شاید پانچ چھ گھنٹے بیت ہی چکے تھے۔

''وہ...... اول خیر بھی میرے ساتھ تھا۔''

''وہ بھی ادھر ہی ہے۔ جاگ رہا ہے۔'' زہرہ بانو نے جواب دیا۔ ''تم منہ ہاتھ دھو کر ذرا فریش ہو جاؤ۔ پھر اکٹھے کھانا کھاتے ہیں۔''

''ماں جی جاگ رہی ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ سوگئی ہیں۔''

''اول خیر نے کھانا کھالیا؟''

''میں نے پوچھا تھا۔ کہہ رہا تھا، تمہارے ساتھ

کھاؤں گا۔''

''مجھے کھانے کی کوئی خاص طلب نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''میں پہلے ہی سو کر بہت سا وقت ضائع کر چکا ہوں۔ .... ابھی مجھے... کئی معاملات پر تبادلۂ خیال کرنا تھا، مگر میں تو یہاں آ کر کہیں اور ہی کھو گیا۔ بے چارہ اول خیر بھی اکیلا بور ہو رہا ہو گا۔''

''لگتا ہے پریشانی کے باعث کافی دنوں سے تم نیند نہیں کر سکے شاید اسی لیے تھوڑا آرام ملتے ہی بے سُدھ ہو کر سو گئے۔'' وہ مسکرا کر بولی۔

''ہاں! یہی بات ہے۔'' میں نے کہا اور مسہری سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

''ہمیں کسی ایسے کمرے میں بیٹھنا چاہیے جہاں میں اول خیر کو بھی اپنے ساتھ بٹھا سکوں۔''

''ٹھیک ہے۔ تم واش روم سے ہو آؤ۔ پھر نشست گاہ میں آ جانا۔ کبیل دادا بھی وہیں آئے گا۔'' یہ کہہ کر وہ مسہری سے اُٹھی اور دروازے کی طرف بڑھنے لگی تو میں نے آواز دی۔

''زہرہ!'' میری آواز پر اس کے بڑھتے ہوئے قدم یک دم تھم گئے۔ وہ پلٹی اور مسکرا کر میری جانب دیکھنے لگی۔

''ہوں... کہو۔'' اس کے عنابی لبوں سے مجھے شگفتگی سی ٹپکتی محسوس ہوئی۔

میں اس کی طرف بڑھا۔ اور اس کے بالکل قریب پہنچ کر رک گیا اور بڑے غور سے اس کے چہرے کا جائزہ لیتا رہا۔ وہ بھی منہ سے کچھ نہ بولی، جیسے وہ دانستہ ان لمحات کو طول دینا چاہا رہی ہو، جیسے وہ چاہا رہی ہو کہ میں اُسے اسی طرح گہری نظروں سے دیکھتا رہوں اور وہ میری طرف۔

میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''تم نے ماں جی سے بات کی تھی؟''

''کون سی بات؟'' وہ سوالیہ نگاہوں سے تکتے ہوئے بولی۔ جانے کیوں مجھے لگا جیسے وہ دانستہ انجان بننے کی کوشش کر رہی ہو۔

''وہی، ماں جی کو قائل کرنے والی بات۔'' بالآخر میں نے یاد دلایا تو اس کے چہرے پہ ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ کچھ دیر پہلے میرے بہ غور اس طرح تکتے رہنے پر اس کے چہرے اور آنکھوں سے جو لطافت انگیز کشش سی مترشح تھی وہ ہوا ہونے لگی تھی۔ وہ میری بات کا مطلب سمجھتے ہوئے.... دھیرے سے بولی۔

''ہاں! لیکن ابھی میں پوری طرح ان سے بات نہیں کر سکی ہوں۔''

''وجہ؟'' میں نے مختصراً پوچھا۔ لمحے بھر کو اس نے میری طرف قدرے گہری نگاہ سے دیکھا تھا، پھر اپنا چہرہ داہنی جانب موڑ کر پھیکے پھیکے سے لہجے میں بولی۔

''یہ ایسی بات نہیں ہے کہ ایک دم اور ایک ہی وقت میں ماں جی سے کہہ ڈالوں، اس طرح وہ یہ بات اپنے دل میں بھی لے سکتی ہیں، موزوں وقت میں انہیں سمجھا دوں گی، تم اس کی فکر نہ کرو۔'' یہ کہہ کر وہ نہیں رکی اور دروازے سے باہر نکلتی چلی گئی۔ میں وہیں کھڑا، دروازے کی خالی چوکھٹ کو تکتا رہ گیا۔ ایک بار پھر میرا ذہن شکوک و شبہات کا شکار ہونے لگا تھا۔ کیا ایسا وہ دانستہ کر رہی تھی یا پھر واقعی اُس کی بات ٹھیک تھی۔

میرے پاس یہ سب سوچنے کا وقت نہ تھا لیکن میں اب ماں جی کے سامنے جانے سے بھی کترانے لگا تھا کہ وہ مجھ سے میرا ''جواب'' پوچھ سکتی تھیں۔ جس کے لیے میں نے انہیں اب تک مصلحتاً ٹالا ہوا تھا، تاکہ تب تک زہرہ بانو انہیں اپنے طور پر قائل کرنے کی کوشش کرتی رہی۔

کچھ دیر گزری۔ میں اور اول خیر نشست گاہ میں موجود تھے۔ اول خیر میرے چہرے کی طرف بھانپتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا۔ پھر عجیب سے لہجے میں بولا۔

''خیر ہے کاکے، تو سو گیا تھا؟'' اس نے شاید میری آنکھوں اور چہرے کی اُلساہٹ سے یہ اندازہ قائم کیا تھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا اور بولا۔

''ہاں! پتا نہیں کیوں یہاں آتے ہی مجھے گہری نیند سی آ گئی تھی۔''

''او خیر۔'' بہت ہولے سے اس کے منہ سے یہ برآمد ہوا تھا۔ جانے کیوں میں بھی اس کی طرف قدرے چونک کر دیکھنے لگا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ مجھ سے شاکی ہو رہا ہو۔

''کیا مطلب؟'' میں نے گھور کر اس کی طرف دیکھا تو وہ جھینپی سی مسکراہٹ سے بولا۔

''میں تو سمجھا تھا کہ تو اندر بیٹھا بیگم صاحبہ سے مسئلے مسائل پر تفصیلی گفتگو کر رہا ہو گا۔ مگر تو تو ایسا اندر گیا کہ سوتا ہی رہ گیا۔'' اس نے ابھی اپنی بات ختم ہی کی تھی کہ زہرہ بانو اندر داخل ہوئی، اس کے ہمراہ کبیل دادا بھی تھا۔

زہرہ بانو کو دیکھ کر اول خیر احتراماً کھڑا ہو گیا تھا، پھر ان کے بیٹھتے ہی وہ بھی بیٹھ گیا۔ اگرچہ اب اس کا بیگم صاحبہ کے گروپ سے کوئی تعلق نہ رہا تھا، مگر وہ آج بھی اس کا

احترام اسی طرح کرتا تھا، جیسے پہلے کیا کرتا تھا۔

کبیل دادا نے ایک نگاہ میرے قریب بیٹھے اول خیر پر ڈالی تھی، پھر میرے چہرے پر نظریں جما دیں۔ کمرے میں ہم چاروں کے سوا اور کوئی نہیں تھا اور میں نے اول خیر کے مشورے کے مطابق زہرہ بانو کو سارے حالات سے آگاہ کر دیا۔ عارفہ اور سیٹھ نوید سانچے والا کے خفیہ گٹھ جوڑ سے لے کر اس کی گواہی کی ضرورت سے لے کر ممتاز خان کی گرفتاری اور اس کی بیٹی نوشابہ کے میرے خلاف میدان میں اُترنے تک اور بلوچستان کے کرنل سی جی بھوانی سے متعلق میرے باپ کی مشروط حوالگی۔ سب کچھ اس کے گوش گزار کر دیا۔

اگرچہ ان میں سے کچھ باتیں اس کے علم میں بھی تھیں، مگر یہ ساری باتیں پوری صراحت سے سننے کے بعد اس کا چہرہ بھی گہری سوچ میں ڈوب گیا، قریب بیٹھے کبیل دادا نے بھی یہ سب غور سے سنا تھا۔ وہ تھوڑی دیر تک شاید زہرہ بانو کے بولنے کا انتظار کرتا رہا، پھر اسے پُرسوچ خاموشی میں پا کر مجھ سے بولا۔

''تم نے اپنی غلط منصوبہ بندی اور ہم سے دور رہنے کی وجہ سے خود کو ان گنت مسئلوں میں پھنسا لیا ہے۔ جس کے باعث خود ہمیں بھی سمجھ نہیں آ رہا ہے کہ ہمیں پہلے کون سا قدم اُٹھانا چاہیے؟''

نجانے یہ بات کبیل دادا نے کیا جتانے کے لیے مجھ سے کہی تھی۔ اس طرح کی ''کراس ٹاکنگ'' میں وہ زہرہ بانو کو بھی مجھ سے اختلاف کرنے پر مجبور کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ میں نے اس کی طرف سرد نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''مجھے آج تک اپنے کسی فیصلے پر کوئی پچھتاوا نہیں ہوا ہے۔ ہاں! کہیں کوئی نہ کوئی غلطی ضرور ہو جاتی ہو گی، تو میں بعد میں اس کی تلافی یا درستگی کی کوشش ضرور کرتا ہوں۔''

''اس میں شہزی کا کوئی قصور نہیں کبیل دادا!'' بالآخر زہرہ بانو نے اس سے مخاطب ہو کر گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''جو شخص ایسے گوناگوں حالات کا شکار رہا ہو، اس میں اچھے بھلے آدمی سے بھی غلطی ہو جاتی ہے۔ لیکن اب ایسی گفتگو پر بحث کرنا وقت کے زیاں کے سوا کچھ نہیں، بہتر یہی ہو گا کہ ان مسائل کے حل کی طرف توجہ دینا چاہیے ہمیں۔'' زہرہ بانو کے ٹوکنے پر کبیل دادا نے چپ سادھ لی تھی۔

''شہزی! بہ ظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے مسائل آپس میں اُلجھ کر گڈمڈ ہو گئے ہوں۔ لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ ان کے سرے بھی آپس میں کہیں نہ کہیں سے جڑے ہوئے ہیں۔ اب میری سمجھ میں تو یہی آتا ہے کہ ان میں کسی ایک مسئلے کو حل کرنے کے لیے ہاتھ ڈالا جائے تو باقی کا حل بھی از خود سامنے آ جائے گا۔ اس لیے پہلے مرحلہ وار اسی مسئلے پر ہاتھ ڈالا جائے جو پہلے حل کرنے کا متقاضی ہے، ورنہ تو مسائل سارے ہی اہم ہیں۔''

زہرہ بانو نے بھی وہی بات کہی تھی جس کا اظہار شکیلہ ہم سے کر چکی تھی۔ زہرہ نے سامنے لگے وال کلاک پر ایک نگاہ ڈالی اور پھر خود کلامیہ انداز میں بولی۔

''میرا خیال ہے اب تو رات ہو گئی ہے۔ ورنہ میں ابھی اپنے وکیل سے بات کر کے مشورہ کر لیتی، خیر، میں کل صبح خود اس سے ملنے نکل جاؤں گی اور سب سے پہلے تمہارے خلاف کٹی ایف آئی آر کو کالعدم قرار دلوانے کی کوشش کروں گی۔ مجھے اُمید ہے پوری کہ فاروقی کوئی نہ کوئی ایسی قانونی شق ڈھونڈ لے گا۔ ساتھ ہی تمہاری ضمانت قبل از گرفتاری بھی کروانا ہو گی۔ رہی بات بابا جان کی رہائی کی تو میں سمجھتی ہوں، انہیں کرنل سی جی کے چنگل سے چھڑانے کا یہ اچھا موقع تمہارے ہاتھ لگا ہے۔ اور اس سلسلے میں تم میجر صاحب کو بھی اپنے اعتماد میں لے چکے ہو مگر یہ کام تم صرف اپنے بل بوتے پر کرنے کا رسک مت لو۔''

''اگر آپ کا خیال ہے کہ مجھے پاور والوں یا کسی بھی ایسے ادارے سے مدد لینی چاہیے تو یہ ناممکن ہے۔'' میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ اور اسے پی ایس ایف (پاور سیکریٹ سروس) کے ڈراپ آف کیے جانے کی بات دہرا دی تو وہ فوراً نفی میں اپنا سر ہلاتے ہوئے بولی۔

''ایسی غلطی کرنا بھی نہیں شہزی! یہ کام تمہیں خالصتاً اپنے بل بوتے پر کرنا ہو گا، جس کی کوئی پلاننگ یا لائحہ عمل یقیناً پہلے سے ہی تمہارے ذہن میں ہو گا۔''

میں نے اس کی بات پر اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ کی بات صحیح ہے۔ ورنہ میجر ریاض باجوہ بھی بہت پہلے مجھے یہ مشورہ دے چکے ہوتے۔''

''تم کب تک اس مشن کو کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟''

''کرنل سی جی یا اس کا کوئی آدمی مجھ سے رابطہ کرنے والا ہے.... اس ڈیل کے سلسلے میں مجھے خود حامی بھرنا ہو گی۔''

''جب تم نے حتمی فیصلہ کر لیا ہے تو تم خود ہی کرنل سی جی سے رابطہ کر کے اُنہیں بتا کیوں نہیں دیتے؟''

''سی جی نے خود مجھ سے کہا تھا کہ وہ مجھے دوبارہ اس

نمبر پر نہیں ملے گا البتہ بہت جلد وہ یا اس کا کوئی آدمی خود ہی مجھ سے رابطہ کرے گا۔''

''ٹھیک ہے۔ تمہارے ساتھ اس مشن میں کون کون ہوگا؟'' کسی خیال کے تحت اس نے پوچھا۔

''میں، اول خیر اور شکیلہ ہوں گے۔''

''کبیل دادا بھی تمہارے ساتھ ہوگا۔'' زہرہ نے فوراً کہا۔ میں نے بے اختیار زہرہ بانو کے قریب بیٹھے کبیل دادا کے چہرے کی طرف دیکھا تھا۔ آفرین ہے اس شخص پر کہ مجھ سے لاکھ جذبۂ رقابت رکھنے کے باوجود وہ ''بیگم صاحبہ'' کے کسی بھی حکم پر ناک بھوں نہیں چڑھاتا تھا۔ اس نے فوراً ان کے حکم کی تعمیل میں اپنا سر دھیرے سے خم کیا تھا۔ میں نے کن انکھیوں سے اول خیر کی طرف دیکھا تھا۔ زہرہ بانو کے حکم اور کبیل دادا کا اس حکم کے سامنے فوراً تعمیل پر اس کے چہرے پر بھی گہری طمانیت کے آثار پھیل گئے تھے۔

''میں کبیل دادا کو تمہاری تحویل میں دیتی ہوں۔ اس خطرناک مگر اہم اور رسک فل مہم میں اس کا بھی ہونا ضروری ہے۔'' زہرہ نے آخر میں مجھ سے مخاطب ہو کر کہا تو میں نے بھی ہولے سے اپنے سر کو اثباتی جنبش دے ڈالی۔ مجھے خود بھی اس مہم کی حساسیت اور اہمیت کا ادراک تھا اور مجھ سے زیادہ شاید اول خیر کو کیونکہ یہ اسی کا مشورہ تھا کہ ہمارے ان گنت مسائل میں بیگم صاحبہ کے گروہ کا ساتھ ضروری تھا، اور پاور کے متوقع طور پر ڈراپ ہونے کے بعد تو یہ اور بھی ضروری ہو گیا تھا۔

☆☆☆

اگلے دن صبح زہرہ بانو اپنے کسی ساتھی کے ہمراہ فاروقی نامی وکیل سے ملنے چلی گئی جبکہ ہم بیگم ولا میں ہی موجود رہے۔ مجھے کرنل سی جی یا اس کے کسی آدمی کے فون کا بے چینی سے انتظار تھا۔

میجر ریاض باجوہ کے وعدے کے بعد میں جلد سے جلد اس مشن کو پورا کرنا چاہتا تھا، نجانے بعد میں کیا اور کیسے حالات ہوتے، کسے پتا تھا۔ میجر صاحب کا حامی بھرنا مشکل ضرور مگر ناممکن نہ تھا۔ یہ بھی انہوں نے بلاشبہ ایک بہت بڑا رسک مول لے کر ہی کیا تھا۔ اسی لیے میں چاہتا تھا کہ جلد سے جلد یہ مہم اپنی تکمیل کو پہنچ جائے۔

اول خیر نے میرے کہنے پر شکیلہ کو فون کر کے اب تک کے حالات کے بارے میں آگاہ کر دیا تھا۔ کبیل دادا ہمارے ساتھ کافی دیر بیٹھا، مجھ سے اس نئے مشن کے سلسلے میں تبادلۂ خیال کرتا رہا، وہ اول خیر سے بالکل بھی مخاطب نہیں ہو رہا تھا۔ بلکہ وہ اُس غریب کو یوں نظر انداز کیے ہوئے تھا جیسے وہ اُسے جانتا ہی نہ ہو۔

مجھ سے زیادہ اول خیر کا کبیل دادا سے ساتھ رہا تھا۔ دونوں میں ''بڑے اُستاد'' اور ''چھوٹے اُستاد'' کی حیثیت سے ایک دوسرے کے ساتھ دوستانہ تعلق تو ضرور ہی رہا تھا۔ اب ماضی کے ایک پرانے ساتھی کے ایسے بے تعلق رویے کو دیکھ کر اول خیر کا اندر سے دُکھی ہونا فطری تھا۔

میرے جی میں آئی کہ میں اسی وقت ان دونوں کے بیچ صلاح کروانے کی کوشش کروں، اور کبیل دادا کو سمجھاؤں، مگر پھر مجھے یاد آیا کہ میں اس سلسلے میں زہرہ بانو سے بہت پہلے بات کر کے یہ کوشش کر چکا تھا، مگر مجھے ناکامی ہوئی تھی، حالانکہ مجھے اس بات کا زعم بھی تھا کہ وہ میری بات نہیں ٹالے گی، لیکن اس نے بھی مجھے اپنی تنظیم کے کچھ اُصولوں کے حوالے سے خاموش ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔

میں نے کبیل دادا کو بتایا کہ میرے ذہن میں کیا لائحۂ عمل تھا نیز اس مشن کی ابتدا اٹاری کے کسی قریبی علاقے میں ہونا تھی۔ میری طرح اس نے بھی یہ شُبہ ظاہر کیا تھا کہ کرنل سی جی ہمارے ساتھ کسی قسم کا دھوکا کر سکتا تھا۔ لیکن ہم نے مہم کی ابتدا میں کون سے ضروری اقدامات اُٹھانے تھے، اس پر ہم کافی دیر تک گفتگو کرتے رہے۔

ایک موقع پر میں کبیل دادا سے تھوڑی دیر کے لیے معذرت کر کے اُٹھ کھڑا ہوا اور ماں جی کے کمرے کا رخ کیا۔

ہم نے ابھی ماں جی کو یہ سب بتانے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی، کیونکہ یوں بھی ابھی ماں جی کو یہ سب بتانا قبل از وقت ہی ہوتا۔ جس دُکھ کو وہ عرصہ دراز سے وقت کی گرد میں دبائے ہوئے تھیں، میں ابھی اُسے دبا ہی رہنے دینا چاہتا تھا، جب تک میں اپنے باپ اور ایک دُکھیاری ماں کے سر کا تاج ان کی آنکھوں کے روبرو نہ پیش کرتا، اس سے ابھی ماں جی کو آگاہ کرنا مناسب نہ تھا۔ لیکن میں یہ ضروری سمجھتا تھا کہ اس اہم مشن کی کامیابی کے لیے ماں جی کی دعائیں ضرور لوں۔

میں ان کے کمرے میں گیا اور مجھے دیکھتے ہی اُنہوں نے دفورِ جذبات سے اپنی بوڑھی بانہیں پھیلا دیں اور کپکپاتے لہجے میں بولیں۔

''شہزی پتر، تُو۔'' میں آگے بڑھ کر ان کے ممتا بھرے دامن میں سر جھکا کے بیٹھ گیا۔ وہ بڑی محبت اور

شفقت سے میرے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے دعائیہ لہجے میں بولیں۔ ''اللہ تجھے سلامت رکھے پتر! کیسا ہے تُو؟''

''میں ٹھیک ہوں ماں! تُو بتا، یہاں تجھے کوئی تکلیف تو نہیں۔'' میں نے یونہی پوچھا تھا، ورنہ میں جانتا تھا، بھلا ماں جی کو یہاں کیا تکلیف ہوسکتی تھی۔ وہ بولیں۔

''بالکل نہیں پتر! یہ میری اپنی دھی کا گھر ہے۔ بھلا یہاں مجھے کیا تکلیف ہوسکتی ہے۔ زہرہ بے چاری تو سگی بیٹیوں کی طرح میری خدمت کرتی ہے۔ سچ تو یہ ہے پتر! مجھے اس پر بڑا ترس آتا ہے۔ دیکھا جائے تو اَب کیا لگتی ہے وہ ہماری؟ کہنے کو تو بہو ہے، مگر ایک بہو کا بھی ساتھ تب ہی جانا جاتا ہے جب تک اس کے سر کا تاج سلامت رہے۔ لیکن وہ تو بیوہ ہونے کے بعد بھی ہمارے ساتھ خون سے بھی بڑھ کر رشتہ قائم کیے ہوئے ہے۔ یہ اس کی ہمارے ساتھ محبت ہے، اور پھر بیوگی کا داغ بھی تو دیکھو۔ عین رخصتی کے وقت۔ وہ کنواری بیوہ ہوگئی۔ یہ محبت اور عقیدت کی انتہا ہے پتر! اس سے بڑھ کر کسی کے خلوص کی اور کیا مثال ہوسکتی ہے بھلا۔ اسی لیے تو میں چاہتی ہوں کہ...''

ماں جی فرطِ جذبات تلے سسک پڑیں۔ ان کی بوڑھی آنکھوں سے آنسو رواں ہوگئے۔ وہ اپنا جملہ بھی پورا نہیں کرسکی تھیں، ان کے ضعیف لب کپکپا رہے تھے۔ آج ماں جی نے جس طرح زہرہ بانو کے کردار اور اوصاف کا میرے سامنے نقشہ کھینچا تھا، اس نے مجھے بھی یہ ادراک بخشا تھا کہ زہرہ بانو واقعی ایک بلند کردار اور اعلیٰ ظرف کی حامل خاتون تھی۔ ماں جی کی بات غلط نہ تھی۔ زہرہ بانو ہماری کیا لگتی تھی؟ بس! اپنے محبوب اور مرحوم شوہر کی محبت کی نشانی کے طور پر ہی وہ ماں جی سے، مجھ سے اپنا ایک ایسا رشتہ قائم کیے ہوئے تھی، جس کی مثال تو خون کے رشتوں میں بھی ملنا مشکل ہوگی۔

''آفرین ہے پتر! اس کُڑی زہرہ بانو پر جس نے محض پتر لئیق شاہ کے حوالے سے ہمارے ساتھ اپنے تعلق کو مضبوط بنا رکھا ہے۔'' ایک ذرا توقف کے بعد ماں جی نے اپنی چادر سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

''ہاں ماں جی! تُو ٹھیک ہی کہتی ہے۔ بھابی زہرہ واقعی بھائی لئیق شاہ کے ساتھ اپنی محبت کو نہیں بھولی ہیں۔ ہمارے ساتھ ان کا پُرخلوص اور محبت بھرا رویہ اس کی زندہ مثال ہے۔''

''لیکن... شہزی پتر! سوچنے کی بات تو یہ ہے کہ وہ تو اپنی محبت نبھا رہی ہے ہمارے ساتھ۔ مگر ہم اس کے لیے کیا کررہے ہیں؟ کیا یہ خودغرضی نہیں ہماری کہ ہم اس کا دُکھ درد جانتے ہوئے بھی انجان بنے بیٹھے ہیں؟''

ماں جی کی اس بات پر میں محتاط سا ہونے لگا۔ گفتگو اسی نہج پر آرہی تھی شاید، جس سے میں کتراتے ہوئے تھا۔ میں چپ رہا۔ کمرے میں چند ثانیے کے لیے دبیز خاموشی چھائی رہی، پھر اس سکوت کو ماں جی کی مرتعش آواز نے ہی توڑا۔

''پتر! ہم اس غریب کا دُکھ تو بانٹ سکتے ہیں ناں۔ جو ہمارے اختیار میں ہے وہ تو ہم کرسکتے ہیں ناں اس کے لیے۔ اس کا میں نے تجھے راستہ بھی دکھایا مگر تُو نے ابھی تک مجھے کوئی جواب نہیں دیا۔ دیکھ پتر! زہرہ کے لیے تُو بھی لئیق شاہ بن سکتا ہے۔ میں ایک عورت ہوں ناں۔ اسی لیے مجھے پتا ہے وہ تجھے لئیق شاہ کے ہی روپ میں دیکھ رہی ہے۔''

ماں جی کی اس بات نے ایک بار پھر میرے اندر رہی دھکڑ پکڑ سی مچادی۔ میرا دماغ ایک بار پھر گرم ہونے لگا۔ لیکن میں ماں جی سے سخت لہجے میں بات کرنا تو کجا ایسا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ میں خود اُلجھا ہوا تھا کہ آخر ابھی تک زہرہ بانو نے کیوں نہیں ماں جی کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ جو ماں جی سوچ رہی تھیں، وہ میرے لیے ناممکن تھا۔

بہرحال میں نے پہلے کی طرح نہایت تحمل اور میانہ روی اختیار کرتے ہوئے اس بار خود ہی ماں جی کو دوسرے طریقے سے سمجھانے کی کوشش چاہی کہ انہیں دُکھ بھی نہ پہنچے۔ لہٰذا اشاروں کنائیوں سے کام لیتے ہوئے بولا۔

''ماں جی! آپ کا حکم سرآنکھوں پر۔ لیکن آپ جیسا سوچ رہی ہوں، کیا خبر ویسا نہ ہو۔ میں تو اس روز بھی ڈر گیا تھا جب آپ نے زہرہ بھابی کے سامنے اتنی بڑی بات کہہ ڈالی تھی۔ کہیں اُنہیں دُکھ نہ پہنچا ہو آپ کی بات سے۔ حالانکہ آپ کو اچھی طرح اس بات کا اندازہ بھی ہوگیا ہے کہ وہ بھائی لئیق شاہ سے کتنی شدید محبت کرتی تھیں بلکہ کرتی ہیں۔ پھر بھلا وہ اس کی جگہ کسی اور کو کیسے دے سکتی ہیں؟''

میں نے اپنے تئیں بہت جچے تلے انداز میں ماں جی کو ایک منطقی پوائنٹ آف ویو سے سمجھانے اور اُنہیں ان کی ضد سے ہٹانے کی کوشش کی تھی، لیکن اس کے برعکس ماں جی پورے اطمینان اور قدرے اسرار بھرے انداز میں میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولیں۔

''شہزی پتر! مائیں حکم نہیں دیا کرتیں، ان کی بات ہی سعادت مند اولاد کے لیے حکم کا درجہ ہوتی ہے، میں تیری ماں کے علاوہ ایک عورت بھی ہوں۔ اور ایک عورت دوسری عورت کی نگاہوں اور اس کے انداز و اطوار سے بہت کچھ جان اور سمجھ لیتی ہے، مجھے زہرہ بیٹی کی آنکھوں میں لئیق شاہ

☆ عورت اور روپے کے سامنے کبھی کبھی قانون اور انصاف بھی بے بس ہوجاتے ہیں۔
☆ بہت سی عورتیں اپنے جسم سے زیادہ اپنے غموں کا میک اپ کرتی ہیں۔
☆ ہر لڑکی اشین گن ہے۔ غلط باتوں میں۔
☆ مور میں ایک بڑی خوبی ہے۔ وہ عورتوں کی طرح کسی دوسرے کی دم پر رشک نہیں کرتا۔
☆ ہر خرگوش فیملی پلاننگ پر بہترین تقریر کرسکتا ہے۔

''یہ لمبی کہانی ہے ماں جی! پھر کبھی ..... سنادوں گا۔ تم اُس بے چاری کے لیے دعا کرسکتی ہو تو کرلینا۔ اس نے میری خاطر بڑی قربانی دی ہے۔'' عابدہ کے بارے میں بتاتے ہوئے میرا لہجہ میرا آپ اندر سے جھیروں جھیر ہونے لگا تھا اور ماں جی بڑے غور سے میری باتیں، میرے چہرے اور میری کیفیات کا بھی جائزہ لیتی جارہی تھیں۔ بولیں۔

''تو پھر تُو نے اس بے چاری کو کلا (اکیلا) چھوڑ دیا؟ اس کی اب تک مدد کیوں نہیں کرسکا؟''

''اسی غم نے تو مجھے ادھ مُوا کرر کھا ہے ماں جی! میں کتنا بے بس اور مجبور ہوں کہ اب تک اُس کے لیے کچھ بھی نہیں کرسکا۔'' میں نے کہا تو ماں جی خاموش ہوگئیں۔

میں نے دیکھا ان کا چہرہ کچھ بجھا بجھا سا ہو گیا تھا۔ میں جانتا تھا ان کو زہرہ بانو کا غم تھا۔ وہ اس سے محبت کرتی تھیں اور ایک ماں کی طرح وہ اس کی فکر بھی کیے ہوئے تھیں۔ وہ ابھی تک اُسے اپنی بہو کے درجے پر رکھے ہوئے تھیں، نہ صرف یہ بلکہ ایک ماں کی طرح اس کے لیے پریشان بھی رہتی تھیں۔

ماں کی پریشانی میرے لیے سوہانِ روح تھی۔ اس کا حل مجھے ہی تلاش کرنا تھا اور ایک اور بات بھی اچانک میرے ذہن میں اُبھری تھی، جس کا مجھے خود بھی افسوس تھا کہ میرا پہلے کیوں نہیں اس طرف دھیان گیا تھا۔ وہ یہ کہ ماں جی نے جس طرح آج زہرہ بانو کے دردناک دکھوں کی تصویر کھینچی تھی اس نے میرے اندر بھی اس کے لیے ایک ہمدردی کا جذبہ بھر دیا تھا، کیا غلط کہا تھا ماں نے کہ زہرہ واقعی کیا لگتی تھی ہماری؟ مگر ماں جی کی خدمت وہ بالکل اسی طرح ہی کرتی تھی جیسے وہ ان کی بیٹی ہو۔ کیا ایسے بھی دنیا میں بے لوث اور پر خلوص رشتے ہوتے ہیں۔ جو بلا کسی غرض کے یا کسی خاندانی نسبت کے اس قدر محبت بھرے ہوتے ہیں۔ یقیناً ہوتے ہیں۔ زہرہ بانو کے علاوہ بھی اول خیر اس کی مثال تھا۔ وہ بھائیوں سے بڑھ کر مجھے چاہتا تھا اور میں

کی تصویر تو ضرور دکھائی دیتی ہے۔ لیکن اس کے عکس میں درپردہ مجھے تیری شبیہ بھی نظر آتی ہے۔ اُس روز میں نے بہت سوچ سمجھ کے اپنے منہ سے یہ بات نکالی تھی، اور میری نگاہوں نے زہرہ بیٹی کے چہرے سے تو نہیں البتہ تیری صورت سے جھلکتا صاف انکار بھانپ لیا تھا۔ تُو مجھے ٹالنے کی کوشش نہ کر۔ میں سب سمجھتی ہوں، مجھے یہ بات نہیں پسند تو نہ سہی۔ مگر اس طرح میں زہرہ بیٹی کے سامنے خود کو چھوٹا ہی محسوس کرتی رہوں گی۔ خیر! تیری مرضی پتر!''

ماں جی کا لہجہ دُکھی ہونے لگا۔ میں اندر سے کٹ کر رہ گیا۔ ماں جی کی بات نے مجھے شرمندہ بھی کیا تھا۔ ایک طرح سے میں ان کا دھیان بٹانا چاہ رہا تھا، مگر اُنہوں نے تو مجھے چکرا کر رکھ دیا، جھوٹ میں بھی ماں سے نہیں بول سکتا تھا۔

ایسے میں زہرہ بانو کی وہ گفتگو میری سماعت میں گونجنے لگی۔ جو ابھی تھوڑی دیر قبل اس نے مجھ سے اپنے متعلق کہی تھی۔ اس کا اس میں کوئی قصور نہیں تھا، یہ بات اب میرے سامنے طے شدہ تھی۔ بات صرف ماں جی کے محسوسات کی تھی اور میری رضامندی کی۔ وہ ماں جی بھی سمجھ چکی تھیں، اب میں مزید ان سے پہلوتہی نہیں کرسکتا تھا۔ جس کڑے امتحان پر میں پورا اُترنے کے لیے انہیں ٹالنے کی کوشش کرتا رہا تھا وہ اب جیسے لٹکتی ہوئی تلوار کی طرح میرے سر پہ معلق ہوگیا تھا۔ میں نے اپنا سر جھکا لیا اور میں خاموش ہوگیا تھا۔ اچانک میں نے ماں جی کے ممتا بھرے ہاتھ کا لمس محسوس کیا۔ وہ بڑی محبت سے میرے سر پر اپنا ہاتھ پھیرنے لگیں، میں نے نگاہ اُٹھا کر ان کی طرف دیکھا تو وہ قدرے چونک کر بولیں۔

''تو رو رہا ہے۔ میرا پتر؟ میرا لعل!'' میری بھیگی ہوئی آنکھیں دیکھ کر ماں جی نے تڑپ کر کہا۔ ''لگتا ہے میری بات سے تیرا دل دُکھا ہے۔ تو شش شاید کسی اور کو پسند کرتا ہے۔ تو اس میں اتنا دُکھی ہونے کی کیا بات ہے میرے لعل! ہاں۔ یاد تو آرہا ہے مجھے، تیرے ساتھ میں نے ایک لڑکی کا نام تو سنا تھا۔ شش شکیلہ نہیں... عا... عابدہ۔''

''ہاں ماں جی! عابدہ ہی نام ہے اس لڑکی کا۔ جسے میں بہت چاہتا ہوں۔ اور وہ مجھے۔''

''وہ کہاں ہے؟ میں نے تو کبھی دیکھا ہی نہیں اُسے۔'' ماں جی نے پوچھا تو میں بے اختیار ایک دُکھ بھری ہمکاری خارج کر کے رہ گیا بولا۔

''وہ بے چاری ایک بڑی مصیبت کا شکار ہوگئی ہے ماں جی!''

''کیسی مصیبت؟''

اُسے۔

یہی وہ وقت تھا جب اچانک ہی زہرہ بانو کی تنہائیوں اور اندر کی آباد ویران دنیا کی گھٹی گھٹی آہوں کو میں نے صحیح معنوں میں محسوس کیا تھا اور اس کا درد میرے دل میں بھی جاگا تھا۔ میرے ذہن میں اس کا ایک حل ایکا ایکی ہی عود کر آیا تھا۔ بس! تھوڑی کوشش کی دیر تھی، اس سے زہرہ بانو کی تنہائیوں کا بھی کسی حد تک ازالہ ہو جاتا اور ماں جی بھی اُسے خوش اور ''آباد'' دیکھ مطمئن و مسرور ہو جاتیں۔ میں نے ایک گہری سانس خارج کر کے ماں جی سے تشفی آمیز لہجے میں کہا۔

''ماں جی! میرے ذہن میں اس کا ایک حل ہے۔ آپ زہرہ بانو کو خوش دیکھنا چاہتی ہیں ناں۔ بس یہ کام اب آپ مجھ پر چھوڑ دیں اور تھوڑا انتظار کر لیں۔ میرا آپ سے وعدہ ہے کہ میں زہرہ بانو کے دُکھوں کا مداوا کر کے رہوں گا۔''

''تو نے ایسا کیا سوچا ہے پتر؟'' ماں کے چہرے پر بھی خوش اُمیدی کے تاثرات لرزنے لگے تھے۔ میں نے اُنہیں بڑی محبت کے ساتھ دونوں بازوؤں میں سنبھالا اور مسکرا کر بولا۔

''یہ آپ کو جلد ان کے چہرے سے معلوم ہو جائے گا۔ بس دعا کیجیے گا کہ میں اس نیک کوشش میں کامیاب رہوں۔ ابھی میں کچھ اپنی پریشانی میں ہوں جو انشاءاللہ جلد دور ہو جائے گی اور میرے لیے بھی دعا کیجیے گا بلکہ عابدہ کے لیے بھی کہ وہ جس مصیبت کا شکار ہے بہت جلد اس سے نجات پالے۔''

''انشاءاللہ میرے پُتر انشاءاللہ۔ میرا رب سوہنا ضرور عابدہ بیٹی کی مصیبت بھی دور کرے گا اور تیری بھی۔''

''آمین ماں جی آمین، اللہ تعالیٰ آپ کی زبان مبارک کرے۔ آپ نے دعا دے دی مجھے تسلی ہو گئی۔'' میں اطمینان بھرے لہجے میں بولا اور پھر ماں جی پیشانی چومی۔ اُنہوں نے ممتا بھرے انداز میں میرے سر پہ ہاتھ پھیرا اور زیرلب کوئی دعا پڑھ کر مجھ پر پھونک ماری۔ میں کمرے سے نکل آیا۔

نشست گاہ میں پہنچا تو میرا رواں رواں مسرور اور مطمئن تھا۔

ماں جی کی دعاؤں نے میرے اندر حوصلے اور عزم کی ایک نئی روح پھونک دی تھی۔

میں نے زہرہ بانو کے لیے جو کچھ سوچ رکھا تھا، میں اس پر غور کرتا رہا اور مجھے یقین تھا کہ اگر وہ میری بات مان جاتی ہے تو یقیناً یہ اس کے لیے بھی اچھا ہی ہوگا۔

البتہ میں نے زہرہ بانو سے اس بات کا ذکر کرنے سے پہلے اول خیر اور شکیلہ سے بھی مشورہ کرنا ضروری سمجھا تھا۔

کافی دیر بعد زہرہ بانو کی واپسی ہوئی تو اس نے خوش خبری سنائی کہ نوشابہ میرے خلاف ایف آئی آر نہیں بلکہ ''این سی'' کٹوا سکی تھی۔ اگرچہ اس نے ایف آئی آر کٹوانے کی پوری کوشش کی تھی لیکن چونکہ ایک تو اس کے بھائی فرخ کے قتل کو کئی سال بیت چکے تھے اور پھر یہ مقدمہ بھی کسی کے خلاف قائم نہیں کیا جا سکا تھا۔ اگرچہ پولیس اس سلسلے میں اپنے بیانات بھی مکمل کر چکی تھی اور بعد کی تفتیش سے یہ کیس ثابت ہو گیا تھا کہ نوشابہ کے پستول سے ہی گولی چلی تھی جو اس کے بھائی فرخ کو چاٹ گئی تھی۔ وقوعے کے بعد سے نوشابہ اپنے حواس کھو بیٹھی تھی یا پھر اسے اس کے باپ چوہدری ممتاز نے ہی کیس کو دبانے کے لیے ایسا کہا تھا کہ وہ خود براہِ راست اپنے بیٹے کا مجھے اور زہرہ بانو کو قاتل سمجھے ہوئے تھا اور ہم سے انتقام لینا چاہتا تھا۔

جیسا کہ پھر بعد میں میجر باجوہ .... نے مجھ سے حقیقت گوش گزار کی تھی کہ اب باپ کی گرفتاری کے بعد اس کی انتقامی ''گدی'' اس کی بیٹی نوشابہ نے سنبھال لی تھی اور وزیر جان اس کی بھرپور سپورٹ کر رہا تھا۔

بہرطور اس کا کیس کمزور ہی ثابت ہوا تھا اور پولیس، جو ''فرخ مرڈر کیس'' کو داخلِ دفتر کر چکی تھی، ری اوپن کرنے کے موڈ میں نہیں تھی نہ ہی اس کیس کی اب کوئی قانونی پوزیشن ... رہی تھی۔ بلکہ اسے ری اوپن کرنے کی صورت میں اُلٹا یہ کیس نوشابہ کے ہی گلے میں فٹ ہونے لگا تھا۔ مگر پھر بھی پولیس انتظامیہ پر دباؤ ڈالنے پر وہ صرف این سی ہی کٹوا سکی تھی۔ اسی لیے فاروقی صاحب نے اطمینان دلایا تھا کہ اس کیس کی کوئی حیثیت نہیں، بلکہ اگر ہم چاہیں تو اُلٹا نوشابہ پر ہتکِ عزت کا دعویٰ کر کے اس کے گلے میں یہ کیس ڈال سکتے تھے۔

البتہ فاروقی صاحب میری قبل از گرفتاری ضمانت کا بندوبست کرنے کے لیے کوشاں تھے۔ اور میرا ہر طرح سے قانونی تحفظ کا پورا انتظام رکھے ہوئے تھے۔

دیکھا جاتا تو زہرہ بانو نے مجھے ایک فالتو کی پڑنے والی مصیبت سے بچا لیا تھا۔

ابھی ہم نوشابہ اور وزیر جان وغیرہ کے گٹھ جوڑ سے

متعلق گفتگو کر ہی رہے تھے کہ اچانک میرے سیل کی بیل گنگنا اٹھی۔ میں یہی سمجھا کہ شکیلہ کی کال ہوگی، لیکن اسکرین پر ایک اجنبی نمبر دیکھ کر میں چونکا اور دھڑکتے دل سے فون کان سے لگا کر 'ہیلو' کہا تو دوسری طرف سے شناسا آواز اُبھری۔

''کیا فیصلہ ہوا؟'' دوسری جانب سے گمبھیر لہجے میں پوچھا گیا، انداز نخوت بھرا اور رعونت آمیز تھا۔ یہ بلیو ٹلسی کا چیف کرنل سی جی بھجوانی تھا۔ اس خبیث کی آواز سن کر یکدم میرے اعصاب تن گئے۔ اس نے خود ہی فون کر دیا تھا۔

مجھے... اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کی غرض سے اُسے لیا جواب دینا تھا وہ میں پہلے ہی طے کر چکا تھا، اسی لیے بلا تاخیر اور اپنے لہجے میں ذرا جھول لاتے ہوئے بولا۔

''میں تمہارے ہی فون کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ سنو، غور سے سنو میں... میں نے بڑی مشکلوں سے اور اپنے آپ پر بڑا خطرناک رسک لے کر ہاٹ کسٹڈی سے نکال کر اپنے قبضے میں کر رکھا ہے، اور میں زیادہ دیر اُسے اپنی ذاتی کسٹڈی میں نہیں رکھ سکتا۔ ڈیل مکمل کرو اور اپنا آدمی لے جاؤ۔'' میں نے دانستہ اپنے لہجے کو حواس باختہ سا بنانے کی کوشش کی تھی۔

''گڈ! ہمیں تم سے یہی آشا تھی۔'' دوسری جانب سے کرنل سی جی بھجوانی کی کھرکھراتی آواز اُبھری۔ ''رسک تو تمہیں لینا ہی تھا۔ آخر کو تمہارے باپ کی رہائی کا معاملہ ہے۔ تمہارا نروس ہونا ایک فطری عمل ہے، خیر! اب کام کی بات ہو جائے۔'' وہ رکا تو میں بول پڑا۔

''دیکھو، تم جس مقام پر یہ ڈیل کرنا چاہتے ہو، میں اس سے مطمئن نہیں ہوں۔ کیا اچھا ہوتا اگر یہ سب پاکستانی حدود کے اندر رہتے ہوئے ہو جاتا۔ تم جانتے ہو اس میں ہم دونوں کو ہی دو طرفہ بی ایس فورسز والوں سے خطرہ ہوگا۔ جبکہ میرے ساتھ ایک خطرناک قیدی بھی ہوگا، ملتان سے لاہور تک ہی اُسے لے کر پہنچنا میرے لیے خطرے سے کم نہ ہوگا، اور اگر میں اپنے ہی پی ایس ایف والوں کے ہاتھوں پکڑا گیا تو مجھ پر غداری کا مقدمہ...''

''دھیرج، دھیرج۔ ذرا شانت ہو کے بات کرو۔ اور پہلے غور سے میری بات پوری سن لو۔'' دوسری طرف سے سی جی نے میری بات کاٹتے ہوئے گمبھیر لہجے میں کہا۔ ''تمہیں قیدی کو لے کر ملتان سے لاہور تک کا سفر تو کرنا ہی پڑے گا۔ جس طرح تمہارے کچھ خدشات ہیں اسی طرح ہم بھی اسی طرح کے تحفظات رکھتے ہیں۔ تمہیں تو صرف

اپنے ہی ملک میں ملتان سے لاہور تک کے ایک سرحدی علاقے تک کا سفر کرنا پڑے گا۔ جبکہ ہمیں تو سرحد پار کرنا پڑے گی۔ معاملہ ایک قیدی کا نہ ہوتا تو ہم اُسے قانونی طرح سے بھارت لے جاتے، مگر اب تمہیں ہی نہیں بلکہ ہمیں بھی چور راستہ اختیار کرنا پڑے گا۔ اور یہی ضروری ہے۔''

''لل... لیکن سرحد پار۔'' میں کہتے کہتے دانستہ رکا تو میری توقع کے عین مطابق وہ بولا۔

''تمہیں سرحد پار نہیں کرنا پڑے گی۔ کسی طرح تم پہلے لاہور پہنچو اور جی ٹی روڈ پر آجاؤ۔''

''اس روڈ پر میں ایک خطرناک قیدی کو لے کر سفر نہیں کر سکتا۔ یہاں چیکنگ سخت ہے اور جگہ جگہ چیک پوسٹ ہیں۔'' میں نے کہا۔

''تو پھر تم سی بی (کینال بینک) روڈ پر آجانا۔ یہ روڈ قدرے مضافاتی ہے۔ وہاں سے پنڈ کرباٹ سنگھ جانے والی ایک ذیلی سڑک پر آکر کہیں رک جانا اور ہماری بعد کی ہدایات کا انتظار کرنا۔ پھر ہم بتائیں گے کہ تمہیں آگے کہاں نکلنا ہے، ڈن؟'' اس نے اپنی بات ختم کی اور میں نے سوچنے کا ایک قلیل وقفہ اختیار کرتے ہوئے بالآخر ہامی بھر لی تاہم آخر میں پوچھ لیا۔

''کیا مجھے اسی نمبر پر تم سے رابطہ کرنا پڑے گا؟''

''نہیں، یہ نمبر اب تمہیں ڈیڈ ملے گا۔ میں کسی اور نمبر سے تم سے وقفے وقفے سے خود ہی رابطہ کر کے پوچھتا رہوں گا۔'' اس نے کہا اور میں اس کی چالاکی پر اندر ہی اندر کھول گیا۔ وہ شاطر ہر بار ایک نئے نمبر سے مجھ سے رابطہ کرتا تھا اور سابقہ نمبر اس کا مجھے بند ہی ملتا تھا۔ میرا اثبات میں جواب ملتے ہی وہ آخر میں سرسراتے لہجے میں بولا۔

''ایک بات کا دھیان رہے۔ کسی بھی قسم کی چالاکی تمہارے لیے نقصان کا باعث بنے گی، میں تم سے کہہ چکا ہوں کہ تمہارے علاوہ ہمارے پاس اور بھی کئی آپشن ہیں، اسی لیے بہتر ہوگا کہ تم اس سے فائدہ اٹھاؤ تاکہ ہمارے درمیان ہونے والی ڈیل کامیاب رہے۔ قیدی تمہارے ساتھ ہونا چاہیے، ڈمی کی صورت میں ہمیں اپنے خفیہ ذرائع سے ترنت معلوم ہو جائے گا کہ تمہارے ساتھ کون ہے۔ سمجھ گئے؟ اور ہاں! ایک بات کا اور خاص خیال رہے۔ تمہارے ہمراہ صرف ایک آدمی ہونا چاہیے، تیسرا ہمارا آدمی ہوگا۔ یعنی قیدی سندر داس۔''

''اور تمہارے ساتھ بھی اتنے ہی آدمی ہونے

چاہئیں۔ یہ ایک ڈیل ہے اسی لیے معاملہ برابری کی بنیاد پر طے ہونا چاہیے۔ دوسری بات یہ کہ تم تو یہاں اپنے کسی جاسوس کے ذریعے ہماری ریکی کروالو گے کہ ہمارے ساتھ تمہارا مطلوبہ آدمی موجود ہے یا نہیں لیکن مجھے کیسے پتا چلے کہ...''

''اس کے لیے تم بھی وہی طریقہ اختیار کرسکتے ہو۔'' وہ میری بات کاٹ کر شاطرانہ لہجے میں بولا اور میں اندر ہی اندر اس کی مکاری پر کھول اُٹھا۔

میرا اثبات میں جواب پاتے ہی اس نے رابطہ منقطع کردیا۔ میں اس کی آخری تہدیدی گفتگو پر چونکے بنا نہ رہا تھا... میری پاور آف آبزرویشن صرف نظروں سے دیکھنے تک ہی محدود نہ تھی، بلکہ میں مدِ مقابل کی گفتگو سے بھی بہت سی باتوں کا اندازہ لگالیا کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ بلوتکسی کے اس گھاگ سربراہ اور شیوسینا کے سابقہ لیڈر کرنل سی جی بھوانی کی آخری بات سے میں نے اندازہ لگایا تھا کہ ان کا ایک آدمی یا جاسوس آل ریڈی یہاں یا ہمارے آس پاس کہیں موجود تھا۔

مجھے اس بات پر حیرت ہوئی تھی بلکہ میں کچھ اُلجھ سا بھی گیا تھا کہ کرنل سی جی نے اپنے جاسوس کے بارے میں مطلع کرنا مجھے کیوں ضروری سمجھا تھا؟ بے شک اس کے نزدیک یقیناً یہی وجہ رہی ہوگی کہ وہ مجھ پر اس طرح اپنا ''پراثر'' دباؤ ڈالنا چاہتا تھا، تاکہ میں اس کے ساتھ کسی قسم کا بلف یا ٹریپ ٹریکنگ کرنے کی کوشش نہ کروں اور بالکل سیدھے سبھاؤ یہ معاملہ یا ڈیل طے پا جائے۔ مگر شاید اس کے وہم وگمان میں بھی یہ بات نہ ہوگی کہ اسی بات نے خود مجھے نہ صرف محتاط کردیا تھا بلکہ اپنے زرخیز منصوبے کو خاطر خواہ حد تک مؤثر اور کامیابی سے ہمکنار کرنے کے لیے ضروری ترمیم کرنے کا بھی موقع مل گیا تھا۔ ابھی میں نے اپنا منصوبہ کسی کے ساتھ بھی شیئر نہیں کیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مجھے کرنل سی جی یا اس کے آدمی کے فون کا انتظار تھا۔ تاکہ حتمی طور پر یہ معلوم ہوجاتا کہ اب کرنا کیا ہے اور کیسے کرنا ہے۔

میں نے سی جی سے اپنے جن متوقع خدشات کا اظہار کیا تھا وہ اپنی جگہ درست بھی تھے۔ اور مجھے اس سلسلے میں غیر معمولی احتیاط کا مظاہرہ بھی کرنا تھا۔ بہ صورتِ دیگر میں ہی نہیں میرے ساتھ میجر باجوہ بھی پھنس سکتے تھے۔ اب مجھے میجر باجوہ ...... سے، سندر داس کو میرے حوالے کرنے کے سلسلے میں فائنل بات کرنا تھی۔ اور یہ بات فون پر نہیں ہوسکتی تھی۔

اس ''ہاٹ ناٹ اینڈ ونچر'' کے سلسلے میں میرے ذہن میں جو پہلے سے منصوبہ پرورش پا رہا تھا، کرنل سی جی سے تازہ ترین گفتگو کرنے کے بعد میں اس مہم کو زیادہ سے زیادہ محفوظ کرنے کے لیے تھوڑی ترمیم کرنا چاہتا تھا۔ میں اس جاسوس کو ٹریپ کرنا چاہتا تھا۔

کرنل سی جی کے سلسلے میں میرے ذہن میں دو باتیں آتی تھیں۔ ایک تو یہ کہ وہ مجھ سے کسی قسم کا دھوکا کرنا چاہتا تھا۔ یعنی دغابازی کے ذریعے وہ اپنا آدمی تو لے اُڑتا مگر ہمارا آدمی ہمارے حوالے پھر بھی نہیں کرتا، جیسا کہ میں اس کے ساتھ کرنے کا ارادہ رکھے ہوئے تھا۔ دوسری بات یہ میرے ذہن میں آتی تھی کہ بہ قول اس کے اب میرا باپ (تاج دین) ان کے کسی ''کام'' کا نہیں رہا تھا اور وہ اس کے بدلے میں مجھے کوئی چارہ ڈالے بغیر اپنا آدمی (سندرداس) لے کر میرے باپ کو میرے حوالے کردیتا۔

بالآخر تھوڑی دیر بعد ہی میں نے اول خیر، کبیل دادا اور زہرہ بانو کے ساتھ اپنا منصوبہ شیئر کردیا۔ چونکہ یہ ایک پورا ٹیم ورک تھا، بے شک اس کی ''پری پلاننگ'' میرے ہاتھ میں تھی۔ لیکن میرا یہ شیوہ نہیں تھا کہ کسی سے تبادلۂ خیال اور مشورے کیے بغیر منصوبے پر عمل کر ڈالوں۔ میرے نزدیک ایسا کرنا ناکامی کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔

تھوڑی سی ردوقدح کے بعد بھی ساتھیوں نے میرے اس منصوبے کی توثیق کر ڈالی۔ البتہ کبیل دادا تھوڑا اڑ رہا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ ہمیں سرے سے ہی سندرداس کو ساتھ رکھنے کا رسک لینا ہی نہیں چاہیے۔ اس کی جگہ ڈمی کو استعمال کرنا زیادہ بہتر تھا، دوسرا یہ کہ ہمیں بلوتکسی کے جاسوس کو اپنی گرفت میں لے کر اسے اپنی مرضی کے احکامات پر عمل کرنے پر مجبور کرتے رہیں، کیونکہ اُس کے علم میں یہ ساری رام کتھا پہلے سے ہی ہوگی کہ ہمارا مطلوبہ آدمی کہاں اور اس وقت کس کے قبضۂ گرفت میں ہے۔ وغیرہ۔

مجھے اس سلسلے میں کبیل دادا کو قائل کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی تھی، کیونکہ زہرہ بانو میری بات سمجھ چکی تھی اور اسی نے کبیل دادا کو سمجھا بھی دیا تھا۔ اس نے خاموشی تو اختیار کرلی تھی لیکن مجھے وہ کوئی خاص مطمئن نظر نہیں آرہا تھا۔

بہرکیف مجھے اول خیر اور زہرہ بانو کی تائید حاصل ہو چکی تھی۔ ہم نے اپنے منصوبے پر عمل کرنے کی ابتدا کردی۔

میرے اور کرنل سی جی کے درمیان ہونے والی گفتگو میں اس معاملے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا وقت رات کا مقرر کیا گیا تھا۔

اس دوران میں نے امریکا فون کر کے آنسہ خالدہ سے بھی رابطہ کیا اور اُسے اپنی اور عارفہ سے ہونے والی ملاقات کے بارے میں بھی بتا دیا۔ وہ گوگو سے لہجے میں بولی۔

''مسٹر شہزی! عارفہ کو تم کس طرح مناتے ہو، یہ مجھ سے زیادہ تم ہی بہتر جانتے ہوگے۔ لیکن اس میں دیر نہیں ہونی چاہیے۔ عابدہ کے لائر کے مطابق عارفہ کی گواہی عابدہ کے لیے انتہائی ضروری اور مفید ثابت ہوسکتی ہے۔'' اس کی بات سن کر مجھے تقدیر کی اس بوالعجبی پر تاسف انگیز اور دُکھ بھری سی حیرت ہوئی کہ ایک اہم مسئلے کے سلسلے میں جس شخص کی گواہی کی ضرورت پڑی بھی تھی تو وہ کسی دوست کی نہیں بلکہ اسی دُشمن کی تھی جس کی وجہ سے عابدہ آج اس حال کو پہنچی تھی۔ میں نے اپنے حلق میں اُترنے والی اس دُکھ آمیز رقت کو نگلا اور بولا۔

''میں عارفہ کو منا لوں گا۔ تم اس کی فکر نہ کرو۔'' آنسہ خالدہ سے یہ کہتے ہوئے خود مجھے اپنے لہجے کا کھوکھلا پن محسوس ہوا تھا اور آواز جیسے میرا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔

''آر یو شیور؟'' دوسری جانب سے آنسہ خالدہ کی آواز اُبھری۔

''یس مس خالدہ! آئم شیور۔ یہاں کا معاملہ میں سنبھال لوں گا۔ آپ بس عابدہ کے کیس کو مضبوط بنانے کی اپنی سی کوششیں جاری رکھیں۔''

''آف کورس۔ اینڈ ڈونٹ وری۔ مسٹر شہزاد! اور ہاں، ڈیتھ سرٹیفکیٹ کا کیا بنا؟'' اس نے آخر میں اچانک پوچھا تو میں نے فوراً جواب میں کہا۔

''میں نے یہی پوچھنے کے لیے آپ کو فون کیا تھا۔ کچھ مجبوری کی بنا پر اصل ڈیتھ سرٹیفکیٹ میں ابھی حاصل نہیں کر پایا ہوں۔ لیکن متعلقہ ہاسپٹل سے میں نے ایک ڈپلی کیٹ ڈیتھ سرٹیفکیٹ نکلوالیا ہے۔ کہیں تو...''

''چلے گا۔ وہی بھجوا دو۔ ایک ہی بات ہے۔'' وہ بولی۔

''آپ ذرا لائر سے اس سلسلے میں مشورہ کرلیتیں تو زیادہ بہتر ہوتا۔''

''فکر نہیں کرو شہزی! اصل ڈپلی کیٹ میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہوتا اور یہ تو ایک فارملٹی ہے۔ تم وہی سرٹیفکیٹ مجھے جلد ہی کسی تیز رفتار کوریئر سروس سے روانہ کردو۔''

''اوکے۔ میں آج ہی یہ کام کرتا ہوں۔''

''اوکے بائے۔''

''بائے۔''

☆☆☆

اُس روز کا سارا دن مختلف نوعیت کی اہم مصروفیات میں گزرا۔ سب سے پہلے تو میں نے ڈیتھ سرٹیفکیٹ ایک تیز رفتار کوریئر سروس کے ذریعے ''رش ڈلیوری'' کروا کے آنسہ خالدہ کو امریکا روانہ کردیا۔ پھر میجر باجوہ صاحب سے خفیہ اور اہم نوعیت کی ملاقات سے لے کر سندر داس کو اپنی تحویل میں لینے کے سلسلے میں کچھ ضروری اقدام کے اُمور پر گفتگو میں وہ دن بیتا چلا گیا۔ اور رات کو دس بجے کے قریب سندر داس کو ہمارے حوالے کیا گیا۔

اس وقت میجر باجوہ ...... کا چہرہ اور ان کی حالت دیکھنے کے لائق تھی۔ وہ میری خاطر ہی نہیں بلکہ وطن کے ایک گمنام سپاہی کی رہائی کے لیے بلاشبہ اپنے اُوپر ایک بہت بڑا رسک لینے کو تیار ہو گئے تھے۔ صرف میرے بھروسے اور اس وعدے پر کہ میں ان کا شکار بہ خیریت اور مقررہ وقت کے اندر اندر واپس ان کی تحویل میں دے دوں گا۔ انشاء اللہ!

اس وقت میرا اپنا چہرہ بھی جوش و جذبات سے تمتما رہا تھا۔ میں خود بھی ایک بہت بڑی اور حساس نوعیت کی ذمے داری اپنے سر لے رہا تھا۔ خدانہ خواستہ ناکامی کی صورت میں ایک بھونچال آسکتا تھا۔ سندر داس معمولی آدمی نہ تھا۔ بلیوٹیکس کا ایک کلیدی مہرہ تھا اور اس کے گرفت سے نکل جانے کے نتائج بہت بھیانک بھی نکل سکتے تھے، اور اس کا سارا ملبا میجر باجوہ ...... پر ہی گرتا۔ ان کا کورٹ مارشل بھی ہوسکتا تھا اور غدار کا مقدمہ بھی ان کے خلاف قائم ہو سکتا تھا۔

میرا جو حال ہوتا وہ تو بعد کی بات تھی۔ مجھے جو بھی کرنا تھا خالصتاً اپنی اور اپنے ساتھیوں کی صوابدید پر کرنا تھا، یعنی اس مہم میں ہم رینجرز یا کسی پاور ایجنٹ کو شامل کرنے کے یوں بھی مجاز نہ تھے۔

سچی بات تو یہ تھی کہ جب سندر داس کو انتہائی رازداری کے ساتھ اور رسن بستہ حالت میں میرے حوالے کیا گیا تو خود میری اپنی کیفیات عجیب سی ہونے لگی تھیں۔ اور جب میں اُسے اپنے ساتھ لے کر روانہ ہوا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں اپنے ہمراہ کسی قیدی یا انسان کو نہیں بلکہ

ایک ایٹم بم کو لے جارہا ہوں۔ اور ایٹم بم بھی ایسا کہ جس کی ''کاؤنٹ ڈاؤن'' شروع ہو چکی تھی اور وہ اب پھٹا کہ تب پھٹا والی حالت میں ہو۔

میں نے اللہ کا نام لیا اور روانہ ہو گیا۔ روانگی سے قبل موسم کے بدلتے تیور کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم نے اسی مناسبت سے تیاری کر رکھی تھی۔ ممکن تھا ہمیں اس معرکہ خیز ایڈونچر میں بی آر بی نہر میں بھی اُترنا پڑتا، اس لیے احتیاط کے پیش نظر واٹر پروف بیگز کے علاوہ پیراکی کے لباس بھی اپنے سامان میں شامل کرلیے گئے تھے۔

ڈیل کے مطابق مجھ سمیت ''قیدی'' کے علاوہ صرف ایک ساتھی ہمراہ رہنے کا پابند تھا۔ میرا ارادہ اول خیر کو ساتھ رکھنے کا تھا، مگر اول خیر نے اسے رد کرتے ہوئے کبیل دادا کو ساتھ رکھنے کا مشورہ دیا تھا۔ یوں اب کبیل دادا کار کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھالے ہوئے تھا، جبکہ میں عقبی سیٹ پر نہایت محتاط ہو کر سندر داس کے برابر بیٹھا تھا۔

ہمارے روانہ ہونے سے ایک گھنٹا پہلے ہی اول خیر اور شکیلہ ایک دوسری کار میں روانہ کر دیے گئے تھے۔

کوئی بعید نہ تھا کہ ہم اب تک بلیوٹکسی کے کسی جاسوس یا ایجنٹ کی نظروں میں بھی آچکے ہوں۔ اور خود میں بھی یہی چاہتا تھا کہ وہ مجھے قیدی اور کبیل دادا سمیت روانہ ہوتے ہوئے دیکھ بھی لیں جانتا تھا کہ اس وقت ان کی ساری توجہ صرف مجھ پر ہی مرکوز ہو سکتی تھی۔ اسی لیے میں نے اول خیر اور شکیلہ کو اپنے پیچھے یا تعاقب میں چلے آنے کے بجائے اُنہیں ایک گھنٹے پہلے ہی روانہ کر دیا تھا اور وہ بھی اس طرح کہ بیگم ولا سے میرے اور کبیل دادا کے روانہ ہونے سے پہلے ہی میں نے شکیلہ کو فون کر کے کوارٹر سے سیدھا نواں چوک پر پہنچنے کا کہا تھا اور وہاں تک پہنچنے کے لیے میں نے اُسے کسی بس یا رکشا میں پہنچنے کا حکم دیا تھا۔ اس کے کوارٹر سے نکلتے ہی میں نے بیگم ولا سے اول خیر کو بھی اسی طرح نواں چوک پہنچ کر شکیلہ کو ٹریس کرنے کی ہدایت کی۔ مگر ان دونوں کو آپس میں ملنے یا بات کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ وہیں پبلک پلیس کے کسی واش روم میں باری باری گھس کر اپنا اصلی چہرہ چھپانے اور اس پر ریڈی میڈ میک اَپ چڑھانے کی ہدایت دی تھی۔ تاکہ اگر کوئی ان کے پیچھے تھا بھی تو وہ دونوں پبلک پلیس کے واش روم میں دیگر لوگوں کے ساتھ رل مل کر اپنا بہروپ بدل کر باہر نکلیں۔ یہ احتیاط کے پیشِ نظر تھا۔ ممکن تھا کہ بلیوٹکسی کا کوئی ایجنٹ ان کی بھی کوارٹر یا بیگم ولا سے ریکی کر رہا ہو۔ وہاں سے اسی طرح الگ الگ ایک مسافر کوچ کے ذریعے ان دونوں کو خانیوال پہنچنا تھا اور وہاں سے چند کلومیٹر چک چراسی کے ایک روڈ سائڈ ہوٹل ماہی کے اسٹاپ پر اُتر کر ساتھ مل جانا تھا۔ شکیلہ نے ایک مرد کا بھیس بھرا تھا۔ اسی ہوٹل میں پہنچنے کے بعد اول خیر نے بیگم ولا فون کر کے زہرہ بانو کو اپنے پہنچنے کی اطلاع دینا تھی جہاں ان کے آدمی کا ایک ساتھی وہاں پہلے سے موجود تھا اور اس نے انہیں ایک کار کا بندوبست کر کے دینا تھا۔ ادھر تب تک ہم بھی اسی علاقے سے گزرنے والے ہوں گے مگر ہمارے اس مذکورہ علاقے کو کراس کرنے سے ٹھیک گھنٹا پہلے اول خیر اور شکیلہ کو روانہ ہونا تھا اور پھر مسلسل ہمارے رابطے میں رہتے ہوئے اسی مدت کے فاصلے سے ہم سے آگے ہی رہتے ہوئے آگے کا سفر جاری رکھنا تھا۔ اس دوران میں اور کبیل دادا اپنے متوقع تعاقب کو ٹریس کرنے کی بھی کوشش کے ساتھ ساتھ اول خیر کو بھی اس سے آگاہ کرتے رہتے اور یوں ان متوقع مشکوک افراد کے تعاقب میں اول خیر اور شکیلہ کہیں رک کر ان کے تعاقب میں لگ جاتے۔ یوں یہ سلسلہ مقررہ مقام تک جاری رہتا، جب تک متعاقبین سے ہمیں کوئی خطرہ نہ ہوتا۔

ملتان روڈ پر آتے ہی کبیل دادا نے کار کی رفتار بڑھا دی تھی۔ قیدی کے کانوں میں، میں نے دو عدد ڈاٹس گھسیڑ دیے تھے، تاکہ وہ ہماری کسی قسم کی کوئی گفتگو سننے سے معذور ہی رہے۔

ابھی ہم نے چند ہی کلومیٹر کا فاصلہ طے کیا ہوگا کہ کرنل سی جی کی کال آگئی۔ یہ ایک تیسرا نمبر تھا۔ میں نے ہونٹ بھینچ لیے۔ اور بار بار کرنل سی جی کے خود ہی رابطہ کرنے پر مجھے بھی سندر داس کی اہمیت کا صحیح طرح اندازہ ہونے لگا تھا کہ یہ ان کا کس قدر خاص الخاص مہرہ تھا، حالانکہ پہلی ہونے والی گفتگو میں کرنل سی جی نے مجھ سے یہی کہا تھا کہ اب اس کے بجائے اس کا کوئی آدمی مسلسل میرے ساتھ رابطے میں رہے گا۔

میں نے کال اٹینڈ کی اور وہ خبیث خوش ہو کر بولا۔ ''بہت اچھے جا رہے ہو۔ ذرا میری بات کروا دو سندر داس سے۔'' میں اس شاطر آدمی کی بات پر چونکے بغیر نہ رہ سکا تھا۔ اس کا اس قدر یقین سے یہ کہنا کہ ''بہت اچھے جا رہے ہو۔'' خالی از علت نہ تھا۔ گویا اُسے ایک ایک بات کی درست ''رپورٹنگ'' مل رہی تھی۔ حالانکہ میں نے روانہ... ہوتے ہی محتاط نظریں بھی دوڑانی شروع کر دی تھیں، لیکن مجھے

ایسا کوئی مشکوک شخص یا گاڑی دکھائی نہیں دی تھی۔ جبکہ میں اپنے ساتھ بیٹھے قیدی سندر داس پر بھی نگاہ رکھے ہوئے تھا۔ وہ ایک ٹاپ کلاس اور انتہائی تربیت یافتہ ایجنٹ تھا۔ کوئی بھی ٹرک یا بائی مینوئل سائینٹیفک طریقہ استعمال کرکے ہماری آنکھوں میں دھول جھونک سکتا تھا۔ جس کا میں بھی تجربہ رکھتا تھا۔ ایک اور خیال بھی میرے ذہن میں آیا تھا۔ کہیں یہ شاطر آدمی مجھ پر اپنی خفتہ رسائی کا رعب جھاڑ کر نفسیاتی دباؤ تو نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔

میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ''جب تمہاری خفیہ ذرائع سے تسلی ہو ہی گئی ہے تو پھر کیا ضرورت ہے بات کرنے کی؟''

''دھیرج، دھیرج، شانت رہو مسٹر نیڈی ایجنٹ!'' اس کے استہزائیہ لہجے پر میں اندر سے کھول اٹھا تھا۔ مگر اس وقت اس کے کھانچے میں میری گوٹ پھنسی ہوئی تھی اس لیے اپنے طیش کو پی گیا اور خاموش رہا۔ وہ آگے بولا۔

''مجھے بات کر لینے دو۔ یہ ڈیل کا حصہ ہے۔''

''تو ٹھیک ہے پھر۔ پہلے میری بات کراؤ میرے باپ سے۔'' یہ کہتے ہوئے میرے گلے میں رقت سی اترنے لگی۔ وہ سنگدلانہ بے حسی سے بولا۔

''ایک زندہ مردہ کے مثل شخص، بھلا تم سے کیا اور کیسے بات کرسکتا ہے؟ کہا ناں میں نے کہ وہ تو بولنے سے بھی قاصر ہے، سنتا بھی اتنا ہی ہے کہ جب کوئی اس کے کان کے قریب منہ لے جاکر بولے۔ اور وہ بھی چلا کر۔''

یہی وہ وقت تھا جب میرے اعصاب بس سے باہر ہونے لگے اور جی چاہا کہ اس مردود کو بتادوں کہ اگر تیرا میرے ساتھ سامنا ہوگیا تو میں تجھ سے اپنے باپ پر کیے جانے والے ایک ایک ظلم کا بدلہ لوں گا۔ مگر میرا حلق اس مردود کی اپنے باپ سے متعلق گفتگو پر رقت زدہ ہونے لگا تھا۔ میں چپ رہا تو اس نے اپنا مطالبہ دہرا دیا۔

میں نے دانت پیس کر سندر داس کے ایک کان سے ڈاٹ نکالا اور سیل اس کے کان کے قریب کردیا۔ بات بہت مختصراً ہوئی تھی اور صرف اسی حد تک کہ چند کوڈز سندر داس نے دہرائے اور دوسری جانب سے اس نے اپنے چیف کی ہدایات سنیں اور پھر بس۔

میں نے سیل اپنی بلیو جینز کی جیکٹ کی جیب میں رکھا اور دوبارہ سندر داس کے کان میں ڈاٹس ٹھونس دیا۔ میری نگاہ ونڈ اسکرین کے اوپر لگے مرر پر پڑی۔ اسٹیئرنگ سنبھالے ہوئے کبیل دادا کی نظریں میرے چہرے کا جائزہ لے رہی تھیں۔ اس نے بھی ٹائیٹ جینز اور آدھی بازوؤں والی شرٹ پر سیاہ رنگ کی لیدر جیکٹ پہن رکھی تھی، اس نے اپنی نگاہیں سامنے ونڈ اسکرین پر رکھتے ہوئے مجھ سے مختصراً پوچھا۔

''کیا باتیں ہو رہی تھیں؟''

میں نے اسے بتادیا۔ پھر اس سے اُلجھے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ''سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ اسے اتنی دور بیٹھے کس طرح اس کی خبر ہو رہی ہے کہ ہم اس وقت ہم کہاں کہاں سے گزر رہے ہیں اور مزید یہ کہ اُسے بڑی تسلی تھی کہ ان کا مطلوبہ آدمی ہمارے ساتھ ہے۔'' کہتے ہوئے میں نے بیک ویو مرر میں اس کے چہرے کو دیکھا تو ٹھٹکا۔ کبیل دادا کے موٹے موٹے سیاہ رو ہونٹوں پر بڑی معنی خیز مسکراہٹ تھی۔ بولا۔

''قیدی کے کان بند کردیے؟''

''ہاں! بات ختم ہوتے ہی میں نے سب سے پہلا کام یہی کیا تھا۔'' میں نے جواب دیا تو وہ بولا۔

''تم نے اب تک اپنے اردگرد کیا محسوس کیا؟ کوئی مشکوک نقل وحرکت؟''

''نہیں۔ ماسوائے ٹریفک کی آوک جاوک کے۔'' میں نے جواب دیا۔

''پھر تو تم کار میں بیٹھے صرف جھک مار رہے ہو۔'' وہ طنزیہ انداز میں بولا۔ اس بے وقت.... کی رقابت بھری عداوت نے مجھے اندر سے سُلگا کر رکھ دیا تھا، جسے میں تحمل سے پی گیا .... تاہم دانت پیس کر بولا۔

''میری اس وقت ساری اٹینشن اس مردود کی طرف ہے، کہیں یہ یہاں بیٹھے بیٹھے کوئی گل نہ کھلا دے۔''

''یہ چھل پہاں چھوڑو اور اب غیر محسوس طریقے سے جس ہاتھ پر تمہارے قیدی بیٹھا ہے، اسی رخ پر سڑک کے کنارے عقب میں دیکھو۔ کار کا رنگ تو لائٹ گرے ہے، مگر اس وقت تمہیں اس کی صرف ہیڈ لائٹس ہی دکھائی دیں گی۔ یہ پرانے ماڈل کی سوک سیڈان ہے۔ جو اس وقت سے ہمارے تعاقب میں لگی ہوئی ہے جب میں نے معصوم شاہ روڈ سے خانیوال جانے والی سڑک کی طرف کٹ مارا تھا تو یہ اُس وقت سے ہی ہمارے پیچھے لگ گئی تھی... بلکہ جس گیس اسٹیشن پر ہم نے ٹنکی فل کروائی تھی اس کار پر میری

اچانک نگاہ پڑی تھی۔ یہ اس وقت گیس اسٹیشن کے واش روم ایریا کی طرف کھڑی تھی اور اس کے اندر دو افراد سوار تھے۔ میں نے اس کار کا نمبر بھی نوٹ کر لیا تھا۔"

کبیل داد نے بڑے آرام سے بتایا اور میں نے اسی سمت کو گردن موڑنے کے بہانے عقبی اسکرین سے دیکھا تو رات کے اندھیاروں میں آتی جاتی ٹریفک کی لائٹس میں اس ہیڈ لائٹ کو تاڑ گیا تھا جو یکساں رفتار کے ساتھ سڑک کا درمیان چھوڑے کنارے کنارے ہمارے تعاقب میں چلی آرہی تھی اور ان کا انداز ایسا ہی تھا کہ خبر ہونے سے پہلے یہ بھانپنا مشکل تھا کہ کوئی گاڑی ہمارے تعاقب میں بھی ہو سکتی ہے۔

مجھے خوشی ہوئی کہ وہ اپنا "کام" بہ احسن طریق و خوبی نبھا رہا تھا، اس کی حوصلہ افزائی نہ کرنا، بخل کرنے کے مترادف ہوتا، لہٰذا میں بے اختیار توصیفی انداز میں مسکراتے ہوئے بولا۔

"بہت خوب یار کبیل! تم نے تو واقعی کمال کر دیا۔ حالانکہ میں خود بھی سارے راستے محتاط رہا ہوں، لیکن میں بھی چوک گیا۔"

اس سے اس طرح دوستانہ انداز میں گفتگو کرتے ہوئے اچانک ہی نجانے کیوں میرا دھیان ماں جی والے "مسئلے" کی طرف چلا گیا اور جو کچھ اس مسئلے کے "حل" کے لیے میرے ذہن میں موجود تھا وہ تازہ ہونے لگا۔ تاہم مجھے مناسب وقت کا انتظار تھا۔

"اب ایسی بات بھی نہیں ہے، تمہارا اس وقت سارا دھیان اس قیدی اور اس کے پس منظر میں ہونے والی ڈیل پر مرکوز ہے، جبکہ میری پوری توجہ متوقع تعاقب پر مرکوز رہی تھی۔ خیر..." پھر موضوع پلٹتے ہوئے اس بار گہری متانت سے بولا۔ "اول خیر اور شکیلہ کو اس کار کے بارے میں خبردار کر دو، اور کار کا نمبر بھی بتا دو تاکہ اسے تلاشنے میں اُنہیں زیادہ وقت کا سامنا نہ کرنا پڑے وہ آگے کہیں رک جائیں اور منصوبے کے مطابق ہمارے اور متعاقب کار کے کراس کر جانے کے بعد وہ ان کے تعاقب میں لگ جائیں"۔

کبیل دادا نے اس بات کا بڑے کھلے دل سے اعتراف کیا تھا جو میرے ذہن میں بھی تھا۔ مگر میں نے کسرِ نفسی سے کام لیتے ہوئے اس کا کچھ خاص اظہار نہیں کیا تھا۔ کبیل دادا کی یہی اعلیٰ ظرفی اس کے بلند کردار کی نشانی تھی۔ مگر اس کی میرے ساتھ بلاوجہ کی رقابت میری سمجھ سے باہر تھی۔ حالانکہ جانتا بھی تھا کہ میں کس سے پیار کرتا تھا۔ بس کبھی کبھی اچھے بھلے آدمی کی کوئی کل ڈھیلی ضرور ہو جاتی ہے، یہی حال کبیل دادا کا تھا۔ یوں بھی جب سے اُسے اس حقیقت کا پتا چلا تھا کہ لئیق شاہ میرا بھائی تھا، اور زہر بانو اس کی بیوہ ہونے کے ناتے میری اب کیا لگتی تھی، تب سے میرے ساتھ اس کے اکھڑ اور روکھے پھیکے رویے میں کچھ تبدیلی تو ہوئی تھی مگر رقابت کی آگ ویسی ہی تھی۔ اس میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

میں نے اسی وقت فون کر کے اول خیر کو اس لائٹ گرے کلر کی متعاقب کار کے بارے میں مطلع کر دیا اور نمبر بھی بتا دیا اور تاکید کی کہ اس وقت چونکہ متعاقبین کو خود اپنے تعاقب کا دھیان بھی نہیں ہوگا اسی لیے محتاط رہ کر تعاقب کیا جائے، کیونکہ کسی بھی ممکنہ خطرے کی صورت میں اول خیر اور شکیلہ ہی کے ہاتھ میں یہ ساری "گیم" جا سکتی تھی۔

موقع کی مناسبت سے اس نے بھی کوئی فاضل گفتگو کرنے سے احتراض ہی برتا تھا۔ تاہم اس سے بات کرنے کے دوران مجھے پس منظر میں شکیلہ کے ہولے سے بڑبڑانے کی آواز آئی تھی، شاید دونوں کے بیچ کسی بات پر بحث چھڑی ہوئی تھی یا اول خیر اُسے ستانے پر تلا ہوا تھا۔ اس نے جلد رابطہ منقطع کر دیا۔

رات کے بارہ بجنے والے تھے۔ سفر جاری تھا۔ اول خیر نے مجھے بتایا تھا کہ وہ دونوں خانیوال کراس کر چکے تھے۔

میں نے اول خیر کو یہ بھی ہدایت کر دی تھی کہ وہ جیسے ہی اپنی نئی پوزیشن میں آئے، مجھے فوراً مطلع کر دے۔ کمالیہ جانے والی سڑک سے تھوڑا آگے اور ساہیوال کے ذرا نزدیک پہنچے تو اول خیر نے مجھے فون پر مطلع کر دیا کہ وہ اپنی ہدایت کردہ پوزیشن میں آچکا تھا۔

میں نے کبیل داد کو بھی آگاہ کر دیا۔ وہ چند ثانیے پر سوچ خاموشی کے بعد مجھ سے مستفسر ہوا۔ "کیا یہ سب ایسے ہی چلتا رہے گا یا۔ انہیں ٹریپ کرنا ہے؟"

"میرا تو خیال یہی ہے کہ ابھی ان پر صرف نظر رکھنی چاہیے۔ لیکن ان سے کسی قسم کا خطرہ محسوس ہوتے ہی ان پر اٹیک کرنا لازمی ہو جائے گا۔" میں نے جواب دیا تاہم اس سے بھی رائے لینے کے انداز میں پوچھ لیا۔ "تم کیا کہتے ہو کبیل؟"

"سرِ دست تو مجھے بھی یہی بہتر لگتا ہے۔ لیکن لاہور پہنچ کر کرنل سی جی کو ہمیں زیادہ دیر اندھیرے میں نہیں رکھنا چاہیے۔ اُسے بتانا ہوگا کہ ہمیں کہاں اور کس مقام پر پہنچنا

ہے؟''

''ہاں! لاہور پہنچنے کے بعد ہی اس نے کہا تھا کہ بتا دوں گا۔''

''صحیح۔ لیکن ابھی جو ہمارے تعاقب میں آرہے ہیں، ان سے بھی ہمیں ازحد محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔'' وہ پُرغور متانت سے بولا۔ ''کیونکہ ان کا آدمی ہمارے ساتھ ہے اور ان کی نظروں میں بھی ہے۔ جبکہ ہمارے مطلوبہ آدمی (میرے باپ) کی ہمیں جھلک بھی نہیں دکھائی گئی ہے۔ یہ ہم سے کسی مطلوبہ مقام تک پہنچنے سے پہلے ہی اپنے گرو گھنٹال سی جی بھجوانی کے اشارے پر ہم سے شکار چھیننے کی کوشش کرسکتے ہیں۔''

اس کی بات سن کر میں نے اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔ اس کے اس خدشے کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ممکن تھا کہ کرنل سی جی جیسے فریبی اور شاطر آدمی نے یہی کچھ سوچ رکھا ہو۔ میں نے اس کی بات کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

''دادا! تمہاری بات تو ٹھیک ہے۔ لیکن بہ قول تمہارے تعاقب میں آنے والے صرف دو افراد ہیں۔ کیا صرف یہ دو افراد ہم سے اتنا اہم شکار چھیننے کے لیے روانہ کیے گئے ہیں؟''

''تو ہم پھر کتنے ہیں؟'' کبیل دادا بولا۔

''ہم چار ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

''غلط۔'' وہ بولا۔ ''ہم دو ہیں۔ ان کی نظر میں۔ انہیں کیا پتا کہ ہمارے دو اور ساتھی ان کے بھی تعاقب میں ہیں۔''

''ہاں! اس خطرے کو دیکھتے ہوئے ہی میں نے اس طرح کی منصوبہ بندی کی ہے۔'' میں نے کہا۔

مجھے اپنی وہ سابقہ مہم یاد تھی جب میں اسی طرح وزیر جان کے قبضے سے اپنی ماں کو چھڑانے نکلا تھا اور وزیر جان نے راستے میں ایسی ہی چال چلتے ہوئے مجھ سے اپنا شکار چھیننے کی کوشش کی تھی۔

''تمہاری پلاننگ تو ٹھیک ہے۔ لیکن یہ غلط ہے کہ ہم دشمن کو کوئی چال چلنے کا موقع فراہم کریں۔ اور منتظر بیٹھے رہیں کہ وہ ہم پر حملہ آور ہوں۔ جبکہ ہمارے ساتھ انتہائی مطلوب اور خطرناک دشمن قیدی بھی ہو جو بذاتِ خود بھی ایک چھلاوا ہو۔''

''تم کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہو پھر؟'' میں نے اس سے پوچھ ہی لیا تو بیک ویو مرر پر مجھے اس کے چہرے پہ ایک معنی خیز مسکراہٹ سی دکھائی دی۔ وہ بولا۔

''بلی کو تھیلے سے برآمد کرنے کے لیے میں ایک چال چلنا چاہتا ہوں۔''
''کیسی چال؟'' میں نے سوالیہ کہا۔
''ہمیں ایک ذرا دیر کے لیے رکنا ہوگا۔ اس دوران متعاقبین کیا گل کھلاتے ہیں وہ وقت سے پہلے ظاہر ہوجائے گا۔ وہ یقیناً کرنل سی جی سے رابطہ کرکے اس کے بارے میں بتائیں گے۔ یا تو وہ انہیں ایکشن کی ہدایت دے گا یا پھر اسی طرح انتظار کا کھیل کھیلنے کا کہے گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ ہم سے بھی رابطہ کرلے۔ اس کے بعد ہم مطمئن ہو کے آگے روانہ ہوجائیں گے۔''

میں نے تھوڑی دیر اس کی بات پر غور کیا اور وقت دیکھا، رات نصف سے زیادہ بیت چکی تھی، میں نے سوچا کہ اگر متعاقبین نے کوئی گل کھلانا بھی چاہا تو وہ یوں دورانِ سفر بھی کھلا سکتے ہیں، جس سے نمٹنے کا میں اول خیر اور شکیلہ کو ان کے تعاقب میں لگا کر بندوبست کرچکا تھا۔ اس لیے کہیں بھی ذرا دیر کے لیے رُکنا، خود خطرے کو دعوت دینے کے مترادف ہوتا، وقت کا بھی زیاں ہوتا۔ لہٰذا میں نے کمیل دادا کو سفر جاری رکھنے کا کہا۔ وہ خاموش رہا۔

شاید معاملے کی حساسیت کو دیکھتے ہوئے وہ خود بھی مجھ سے کسی بات پر اختلاف نہیں کرنا چاہتا تھا تاکہ اس کی ساری ذمے داری میرے ہی کاندھوں پر رہے اور یہ ٹھیک بھی تھا، کیونکہ کئی ایسی باتیں تھیں جن کا ادراک صرف مجھے ہی تھا۔

ابھی تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ حیرت انگیز طور پر میری بات درست ثابت ہوئی۔ یہ وہ وقت تھا جب ہم ساہیوال اور اوکاڑہ کراس کرکے پھول نگر کے قریب ہی پہنچنے والے تھے کہ مجھے اچانک اول خیر کی کال موصول ہوئی۔

''او خیر کا کے! جس کار کے ہم تعاقب میں لگے ہوئے ہیں، اس کے ساتھ ایک لمبی سی گاڑی اور ایک کار ساتھ آن ملی ہیں۔ لگتا ایسا ہی ہے کہ یہ انہی کے ساتھی ہیں اور کسی بھی وقت تمہاری گاڑی پر ہلا بولا جاسکتا ہے۔''

اس کی بات پر یک بیک میرے اعصاب تن گئے اور میں نے فوراً کہا۔ ''اول خیر! یقیناً ایسا ہوسکتا ہے۔ معمولی سے شبہے کو بھی تمہیں نظر انداز نہیں کرنا ہوگا، اس وقت خطرے کی ہر گھڑی میں تمہارا اور شکیلہ کا کردار اہم ہوسکتا ہے۔ مگر تم بھی محتاط رہو۔ اور ہمارے عقب میں جو بھی خطرہ محسوس کرو، مجھے پل کے پل آگاہ کرتے رہنا۔'' اس کے بعد میں نے سیل اپنے ہاتھ میں ہی تھامے ہوئے ایک نظر عقب میں ڈالی۔ مجھے تین گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس آگے پیچھے ہوتی دکھائی دیں۔

اول خیر کی کار ابھی مجھے نظر نہیں آئی تھی۔ مجھے بھی ایسا لگ رہا تھا کہ کسی بھی وقت خونی معرکہ آرائی ہونے والی تھی۔

''کیا ہوا؟'' کمیل دادا نے گمبھیر لہجے میں پوچھا تو میں نے اُسے اول خیر کی کال اور تازہ خطرے سے آگاہ کردیا اور بولا۔

''تم کار کی رفتار تھوڑی بڑھادو۔''

''نہیں'' اس نے اختلاف کیا۔ ''یہی رفتار ٹھیک ہے۔ اس طرح انہیں اس بات کا شک ہوجائے گا کہ ہمیں ان پر شُبہ ہوگیا ہے۔ جو ہونا ہے وہ تو اب ہو کے ہی رہے گا۔ اس صورتِ حال کے لیے ہمیں اپنی تیاری کرنا ہوگی۔''

''ہم۔'' میں نے پرسوچ ہمکاری خارج کی۔ اور اپنی جیکٹ کے اندر سے تلے اُوپر نال والا فل آٹو اسنیک سلیئر پسٹل نکال کر گود میں رکھ لیا یہ روسی ساختہ لوگر بانڈ آرم کی نئی شکل تھی جسے امریکا نے بھی بنایا تھا۔ مگر اس جدید شکل کے لوگر کو ہینڈل کرنا آسان نہ تھا، اسے کوئی ہتھیار باز ہی چلا سکتا تھا، اور وہ بھی جس کا نشانہ طاق و مشاق ہو، اس کی نائن ایم ایم کی گولی انسان کی کھوپڑی کے پرخچے اُڑا دیتی تھی، اس ہتھیار کی اتنی دہشت تھی کہ اسے سنبھالنے والا خود بھی ایک لمحے کے لیے مبہوت سا ہوجاتا تھا، مگر یہ اس وقت میرے ہاتھ میں کھلونے کی طرح تھرک رہا تھا، اور اسی وقت کمیل داد نے بھی اپنی لیدر کی سیاہ جیکٹ میں ہاتھ ڈالا تھا، اب اس کے برابر والی سیٹ پر ایک لمبی نال والا نیلگوں مائل رنگ کا سیاہ جرمن ساختہ میگا رور رکھا نظر آنے لگا تھا۔

اسی وقت سندرداس کچھ بے چین سا دکھائی دینے لگا۔ اس کے صرف کان بند تھے، مگر آنکھیں تو کھلی تھیں، اچانک سے یہ ساری ''تیاری'' دیکھ کر اس نے گردن موڑ کر میری طرف دیکھا اور بولا۔

''یہ سب کیا ہے؟'' وہ سُن نہیں سکتا تھا اسی لیے میں نے اس کی طرف کرخت نظروں سے گھورتے ہوئے اپنے ہونٹوں پہ اُنگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کی تاکید کی۔

اس کے دونوں ہاتھ پشت کی سمت بندھے ہوئے تھے اور پیروں میں بھی ایسی ہی آہنی کڑی ڈالی گئی تھی۔ میں نے اپنا دھیان پیچھے لگایا ہوا تھا، کمیل دادا سے کہا۔ ''کمیل!

تم ذرا سائڈ مرر سے ان پر نگاہ رکھو اور بتاؤ کہ کیا متعاقبین کا فاصلہ کم ہو رہا ہے یا...''

''میں یہی کر رہا ہوں۔'' کبیل دادا سپاٹ اور خشک لہجے میں بولا۔

میں جانتا تھا وہ صرف زہرہ بانو کی وجہ سے میری ہدایات پر بلا چون وچرا عمل کر رہا ہے، ورنہ یہ سب اس کی طبیعت اور مزاج کا حصہ نہ تھا۔ کم از کم میرے سلسلے میں تو بالکل بھی نہیں۔ کیونکہ وہ خود اپنی جگہ ایک اُستاد تھا۔ زہرہ بانو کے گروہ میں اس کی حیثیت دوسرے نمبر پر تھی بلکہ ایک لحاظ سے اس سے بھی کچھ آگے کی تھی۔ ''بیگم ولا'' کا کرتا دھرتا وہی تھا اور زہرہ بانو کے ماضی کا سچا اور جاں نثار غم گسار ساتھی ہونے کا بھی اعزاز رکھتا تھا وہ۔ زہرہ بانو کو اس پر اندھا اعتماد تھا اور خود کبیل اس کے صرف ایک اشارۂ ابرو پر ہر دم کٹ مرنے کو بھی تیار رہتا تھا۔

''تو پھر کیا پتا چلا؟ وہ حملے کے موڈ میں ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''فی الحال کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ تینوں گاڑیاں یکساں پوزیشن میں ہیں۔ فقط دھیان بٹانے کے لیے ایک دوسرے سے آگے پیچھے ہو رہی ہیں۔''

''ہم۔'' میرے منہ سے نکلا۔ پھر بولا۔ ''لیکن ہمیں پہلے سے زیادہ محتاط...'' ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک کبیل دادا کے منہ سے چونکنے کے انداز میں ''اَرے'' خارج ہوا۔ میں بھی ٹھٹک گیا۔

''ہوشیار! ان میں سے ایک گاڑی نے اچانک رفتار پکڑ لی ہے۔'' اس نے اپنا جملہ مکمل کیا اور یکدم میرے اعصاب تن گئے۔ میں یک دم اَلرٹ ہو گیا اور عقبی منظر پیش کرنے والے مرر میں دیکھا تو واقعی ایک گاڑی کی تیز ہیڈ لائٹس مجھے تیزی کے ساتھ اپنی کار کے قریب آتی دکھائی دیں۔ کسی ممکنہ خطرے سے میرا پورا وجود سنسنانے لگا تھا۔ اسی وقت میں نے کبیل سے کہا کہ وہ کار کی رفتار مقابلتاً ہرگز نہ بڑھائے۔

جواب میں اس نے اپنے سر کو اثبات میں جنبش دینے پر اکتفا کیا تھا۔ میں نے اپنا مہیب ساسنیک سلیٹڈ دائیں ہاتھ میں پکڑ لیا تھا اور بائیں ہاتھ میں سیل تھا کہ کسی بھی غیر معمولی صورتِ حال کے پیشِ نظر اول خیر سے بھی فوری طور پر رابطہ کر سکوں۔

وہ گاڑی، ٹویوٹا پروبوکس تھی، جو ایک تیز رفتار زنانٹے سے ہماری کار سے آگے نکلتی چلی گئی۔ اس وقت میری ساری

پاگل

''وہ سامنے گم صم بیٹھا ہوا شخص پاگل معلوم ہوتا ہے!''

''یہ کیسے کہہ دیا تم نے... ہوسکتا ہے کہ وہ بیوی کا ستایا ہوا کوئی مظلوم شوہر ہو!''

قصۂ جدید و قدیم

لڑکے نے اپنی دوست کو فون کیا۔ روایتی باتوں کے بعد اس نے پوچھا۔ ''تم واٹس ایپ پر ہو؟''

''نہیں... میں تو گھر پر ہوں۔''

''میرا مطلب تھا کہ تم واٹس ایپ استعمال کرتی ہو؟''

''نہیں... میرے ماموں نے امریکا سے گورا کرنے کی کریم بھیجی تھی... میں تو وہی استعمال کرتی ہوں۔''

''ارے بھئی...!'' لڑکا زچ ہو کر بولا۔ ''میں یہ پوچھ رہا ہوں کہ تمہیں واٹس ایپ چلانا آتا ہے؟''

''نہیں... میں نے تو ڈرائیونگ ہی نہیں سیکھی۔ تم چلا لینا، میں پیچھے بیٹھ جاؤں گی۔''

حسن ابدال سے نور العین کی معصومیت

اٹینشن اسی طرف تھی۔ سندر داس کی طرف سے میری توجہ ہٹی تھی، یوں بھی وہ رسن بستہ حالت میں تھا گاڑی سفید رنگ کی تھی جس کی کھڑکیوں کے شیشے ٹنٹڈ تھے اور میں دیکھ نہیں پایا کہ اندر کتنے افراد موجود ہو سکتے تھے؟

پروبوکس ہماری کار سے چند گز آگے نکل گئی تھی اور ٹھیک اسی وقت وہ ہماری کار کے سامنے آ گئی اور بتدریج اس کی رفتار دھیمی پڑنے لگی۔ میں یہی سمجھا تھا کہ وہ ایک دم بریک لگا کر ہمارا راستہ روکنے کی کوشش کریں گے۔ مگر ایسا کچھ نہیں ہوا۔

وہ ہماری کار کی رفتار کے برابر آ کر اب یکساں اسپیڈ سے سڑک پر رواں دواں تھی۔ میں اُلجھ گیا اور کچھ سمجھ نہ پایا کہ آخر یہ معاملہ کیا ہے؟ دُشمن کیا کرنا چاہ رہا ہے اور آیا ان کا تعلق دُشمنوں سے ہے بھی یا ہمیں کسی قسم کی غلط فہمی ہوئی ہے۔ ایسے میں مجھے کبیل دادا کی خود کلامیہ بڑبڑاہٹ سنائی دی۔

''یہ کوئی چال چلنے کی کوشش کر رہے ہیں؟''

''یہی میں بھی سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔'' میں نے

کہا۔ اسی وقت میں نے محسوس کیا کہ کبیل دادا نے کار کی رفتار مقابلتاً کم کر دی تھی۔ میری طرح وہ بھی محتاط نظروں سے سامنے اور عقب میں گاہے بہ گاہے نگاہ رکھے ہوئے تھا۔ باقی دو گاڑیاں بھی عقب میں اپنی یکساں رفتار پر تھیں۔

''کیا کرنا چاہ رہے ہیں یہ لوگ آخر۔'' بالآخر کبیل دادا کی جھنجلائی ہوئی آواز ابھری۔ ''پروبوکس کی رفتار بہت غیر محسوس طریقے سے کم ہو رہی ہے۔''

''تم کار آگے نکال لے جاؤ۔'' میں نے اس سے کہا۔

''یہی کرنے لگا ہوں میں۔'' اس نے جواب دیا اور کار کو ڈبل ٹاپ گیئر ڈالا اور جیسے ہی وہ وین کو کراس کر کے آگے نکلنے کی کوشش کرنے لگا پروبوکس آگے آگئی، کبیل دادا کو فوراً بریک پر پاؤں رکھنا پڑا۔ ساتھ ہی اس کے حلق سے پُرغیظ سی غراہٹ برآمد ہوئی تھی، اس نے کار کو سنبھالا، رفتار آہستہ ہوئی، اسی دوران کار سڑک کے کنارے، کچے میں اُترتے اُترتے بچی، اور پھر وہی ہوا جس کا ہمارے گمان میں بھی نہ تھا۔

سیٹ پر بہ ظاہر خاموش بیٹھے سندر داس نے نجانے کیا کارروائی کر ڈالی تھی یا پھر میرے دھیان کا بٹنا اس کی خفیہ مگر قلیل کارروائی کو نہ بھانپ سکا تھا کہ اس نے اس کشاکشی کے دوران اپنے دونوں رسن بستہ ہاتھوں کو اس انداز میں بروئے کار لاتے ہوئے کار کا دروازہ کھول ڈالا کہ مجھے اس وقت پتا چلا جب وہ بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ چلتی کار سے باہر کود چکا تھا۔ یہ سب اتنی تیزی سے ہوا تھا کہ ایک لمحے کو میں سناٹے میں آگیا کہ یہ ہو کیا گیا تھا۔

کار کا دروازہ کھلا پڑا میرا منہ چڑھا رہا تھا۔ میں حلق کے بل چیخا۔ ''کار روکو۔ کار روکو۔''

تب تک کبیل دادا کو بھی صورتِ حال کی سنگینی کا احساس ہو چکا تھا۔ اس نے یک دم بریک لگائے، تاریک سڑک پر کار کے ٹائر زور سے چرچرائے، مجھے ایک جھٹکا لگا، مگر فوراً ہی خود کو سنبھالا دیا۔ کار بیچ سڑک پر گھومتے گھومتے رکی، مگر اس سے پہلے ہی میں نے بھی کھلے دروازے سے باہر جست لگا دی، پسٹل میں اس دوران جیکٹ میں ٹھونس چکا تھا۔ انہی لمحات میں مجھے یک بیک ایک سے زائد گاڑیوں کے ٹائروں کی سمع خراش چرچراہٹ سنائی دی تھی۔ میرا وجود زمین سے رگڑا، چکرایا، اور دوسرے ہی لمحے میں نے ہاتھوں پیروں کو ماہرانہ انداز میں حرکت دی اور پختہ سڑک پر رگڑ کھانے سے خود کو بچاتے ہوئے اپنے ہاتھ پاؤں سکیڑ کر جسم گول کر دیا اور اسی طرح لڑھکتا ہوا، کسی سنگی شے سے ٹکرایا، جو سنگِ میل کا زمین پر گڑا تھا۔

چند... دیگر گاڑیوں کے رکنے سے ان کی ہیڈ لائٹس نے سڑک... اور اطراف کا کافی دور تک کا علاقہ روشن کر دیا تھا اور میں نے سنبھلتے ہی اسی روشنی میں تلاشِ غنیم میں بڑی تیزی کے ساتھ اپنی متلاشی نظروں کو گردش دی تھی۔ اور تب ہی میں نے ایک سنسناتا ہوا منظر دیکھا، میرے جبڑوں سے گرا ہوا شکار کوئی اور شکاری اُچکنے لگا تھا۔

یہ پہلی والی متعاقب گاڑی تھی، جو زمین پہ گٹھڑی بنے سندر داس کے بالکل قریب آرکی تھی، اور اسی وقت مجھے گولیوں کی تڑتڑاہٹ سنائی دی تھی، یہ پروبوکس سے کی گئی تھی جس نے ہماری کار کا راستہ روکا تھا اور سڑک کے درمیان ترچھی کھڑی تھی، ان کا نشانہ ہماری کار تھی، جس میں اب صرف کبیل دادا سوار تھا جو شاید خود بھی خطرے کو بھانپ گیا تھا، میری چمکتی نظروں کے لحاتی منظر نے کبیل دادا کی کار کی باڈی میں سیکڑوں سوراخ بنتے دیکھے... ٹھیک اسی وقت میں نے کبیل دادا کو کار کے دوسری طرف کے دروازے سے باہر سڑک پر رینگتے ہوئے نکلتے دیکھا اور میں اپنے شکار کی طرف متوجہ ہو گیا۔ جسے مذکورہ کار سے دو افراد اُتر کر سنبھالا دیے، اپنی کار کی طرف لے جانے کی سعی میں مصروف تھے، مجھے بیک وقت دو کام ترنت نمٹانے تھے، اپنا شکار چھیننا اور کبیل دادا کی مدد کرنا۔

میں نے پل کے پل پوزیشن سنبھالی اور اپنا اسنیک سلیٹز سیدھا کر کے تلے اُوپر دو فائر داغ ڈالے، میرا پسٹل آگ اُگلنے والے ڈریگون کی طرح گرجا تھا، میں نے گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس میں شکار چھیننے والے اُن دونوں کے کاندھوں پر کھوپڑیوں کے بجائے خون اور چیتھڑے اُچھلتے دیکھے۔ لحہ بھر میں ہی ان کی گردنیں کسی ٹوٹے ہوئے پائپ کی طرح دکھائی دینے لگی تھیں۔

میرے ہتھیار کی خطرناکی اور مہیب کاری کو بھانپ کر کار میں بیٹھے نظر آنے والے فقط ایک آدمی پر اپنے ساتھیوں کے حشرناک انجام کی ایسی دہشت بیٹھی کہ اُسے اپنی کار سے باہر آنے کی جرأت نہ ہو سکی لیکن دوسری کار جو پہلے سے ہمارے تعاقب میں تھی اس میں دو افراد سوار تھے۔ وہ اسی کار کے عقب میں کھڑی تھی۔ مجھے اول خیر اور شکیلہ کی کار کی جھلک بھی نظر آگئی تھی۔ میں نے اسی وقت اول الذکر کار کی ونڈ اسکرین کا نشانہ لیا اور ٹریگر دبا دیا، اُوپری نال سے شعلہ

پھوٹا اور کار کی اسکرین کے پرخچے اُڑ گئے اور ساتھ ہی خون سے رنگین بھی نظر آنے لگی۔ میں نے اپنے شکار کی راہ مسدود کر دی تھی، وہ رن بستہ حالت میں بے یار و مددگار اب ٹامک ٹوئیاں مارنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا یا پھر کسی مدد کا منتظر رہتا۔ میں نے اسی وقت اول خیر کو فون کر کے چند ہدایت دیں اور پلٹا۔

مجھے یقین تھا کہ اول خیر اور شکیلہ اب باقی ماندہ صورت حال کو ہینڈل کر لیں گے، میرے لیے اب اصل خطرہ ان وین سواروں کا تھا۔ وہ خاصی تعداد میں ہو سکتے تھے اور دوسرے یہ کہ کبیل دادا ان کے نشانے یا نرغے میں تھا، میں تیزی سے پلٹا اور وین والے دشمنوں کی تعداد کو دیکھتے ہوئے اپنے اسنیک سلیٹر کو ڈبل شاٹ پر ایڈجسٹ کر دیا۔ میں نے دیکھا پروبوکس کے دروازے کھلے تھے اور اس کے اندر سے تقریباً چار افراد چست سیاہ لباس میں... کبیل دادا پر تابڑ توڑ گولیاں برسا رہے تھے۔ جبکہ کبیل دادا بھی تنہا ہونے کے باوجود اپنی سی مقدور بھر کوشش میں ان پر جوابی کارروائی کے دوران خود کو اپنی ''چھلنی شدہ'' کار سے دور کرنے کی تگ و دو میں تھا، مگر اُسے خاطر خواہ موقع نہیں مل پا رہا تھا۔

دشمنوں کی طرف سے متوقع خدشے اور کسی چال میں آنے کے حصار کو میری بروقت اور خاطر خواہ کارروائی کو پروبوکس سوار دشمنوں نے بھی تاڑ لیا تھا، یہی نہیں اُنہوں نے ایک چوتھی کار جس میں اول خیر اور شکیلہ سوار تھے اور اپنی کارروائی بہ احسن خوبی سر انجام دے رہے تھے، کو بھی تاڑ گئے تھے، اسی وقت میں پروبوکس حرکت میں آئی، غالباً ڈرائیور نے اپنی سیٹ نہیں چھوڑی تھی، پروبوکس کا رخ پہلے کبیل دادا کی کار کی جانب ہوا اور اس سے پہلے وہ چاروں مسلح چست لباس والے کدکڑے مار کے نیچے اُتر چکے تھے، میں نے اپنے اسنیک سلیٹر سے ان پر ڈبل شاٹ کھیلا۔ تلے اُوپر نال والی میرے پسٹل کی دونوں نالیں بھیانک انداز میں بیک وقت گرجی تھیں۔ اس طرح کی نال والے پسٹل سے اگر ڈبل شاٹ کھیلا جائے اور دور رس نتائج متوقع ہوں تو فائر کرتے وقت اسے مخصوص انداز میں ہولے سے ''جرک'' دیا جاتا ہے، میں نے ایسا ہی کیا تھا، یہی سبب تھا کہ اُن چار میں سے دو دشمن چت سے گرے تھے، باقی... دونوں کو فوراً اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑا کہ میری ہتھیلی میں دبا ہوا ہتھیار ہاتھی کا مقابلہ کرنے کی سکت رکھتا تھا، یہی وجہ تھی کہ اُن کو کبیل دادا یا مجھ پر جوابی فائر کرنے کے بجائے اپنی پڑ گئی، تب ہی کبیل دادا کو ان پر اپنا جرمن ساختہ میگا رو آزمانے کا موقع ملا، اس نے فائر داغا، ایک دشمن چیخ مار کر گرا، میں نے دوسرے کو کبیل دادا کے رحم و کرم پر چھوڑا اور ٹرن کرتی پروبوکس کے ٹائروں کا نشانہ لیا۔ اس کا رخ کبیل دادا کی چیتھڑا اپنی کار کی جانب تھا، لیکن تب تک چونکہ میں کبیل داد کو نکلنے کا موقع دے چکا تھا، وہ ایک شکار... گرانے کے بعد وہاں سے چیتے جیسی سرعت کے ساتھ کھسک گیا۔

ادھر میرے سنگل شاٹ نے پروبوکس کا عقبی ٹائر فلیٹ کر دیا، وین کا بیلنس بگڑا، ڈرائیور کو اُسے سنبھالنے کی پڑ گئی، میرے عقب میں اول خیر اور شکیلہ اپنے اکلوتے دشمن کو ڈھیر کرنے کی سر توڑ کوشش میں لگے ہوئے تھے، میرا دھیان اس طرف بھی تھا۔ میں نے شکیلہ کو شکار پر پستول تانے اُسے اپنی جگہ ساکت رکھنے پر مجبور کیے ہوئے دیکھا اور اسی جانب لپکا۔

میں نے اول خیر کو اس کار پر بے تحاشا فائرنگ کرتے دیکھا جو اپنے آخری ایک سوار کو لیے واپس بیک کی طرف اُڑی جا رہی تھی۔ میں نے اول خیر کو آواز دی۔ وہ ہاتھ ملتا ہوا میری طرف آیا۔ میں نے شکیلہ کو شکار سمیت دشمنوں کی دوسری کار سنبھالنے کا کہا اور اول خیر کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ... کیا، میں اس طرف متوجہ ہوا تو دیکھا کبیل داد کا شکار پروبوکس کا ٹائر برسٹ ہونے کے بعد ڈرائیور سمیت کہیں تاریکی میں غائب ہو چکا تھا۔ سڑک پر ٹریفک جام ہونے لگا تھا، ہم نے شکار سمیت نکلنے کی ٹھان لی اور دشمن کی کار میں آگے نکل گئے۔

کار اب اول خیر ڈرائیو کر رہا تھا، میں اس کے برابر میں بیٹھا تھا، عقبی سیٹ پر سندر داس شکیلہ اور کبیل دادا کے بیچ ٹھنسا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر بارہ بج رہے تھے، ہم نے دشمن کی چال بری طرح ناکام بنا دی تھی۔

''مبارک ہو شہزی! تمہاری پلاننگ کامیاب گئی، ورنہ آج شکار ہاتھ سے گیا تھا۔''

کبیل دادا نے کھلے دل سے میری تعریف کی۔ میں نے مختصراً شکریہ کہا۔ میں اس وقت غصے سے بھرا بیٹھا تھا، کرنل سی جی نے حسب توقع میرے ساتھ دھوکا کیا تھا۔ میں نے اس سے باری باری ان نمبروں پر رابطہ کرنے کی کوشش چاہی، جن سے وہ اب تک میرے ساتھ رابطہ کر چکا تھا، مگر سب بند ملے۔

میری اس حرکت کو دیکھتے ہوئے میرے برابر میں

کار کا اسٹیئرنگ سنبھالے ہوئے اول خیر نے کہا۔ ”فکر نہ کر کاکے! اس مردود دھوکے باز کرنل کی کال خود ہی آجائے گی، جب اس کے حواری اپنی ناکامی کی اسے اطلاع دیں گے۔“

”میں تو پہلے ہی کہہ رہا تھا کہ کرنل سی جی کی نیت ٹھیک نہیں، اس نے شہزی کی جذباتی کمزوری سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کی تھی۔ اور اپنا شہزی بھی بے چارہ اپنے باپ کو اس کے چنگل سے چھڑانے کے لیے، اتنا بڑا رسک لے بیٹھا۔“

عقبی سیٹ پر بیٹھے کبیل دادا نے تبصرہ کیا۔ میں اندازہ نہ کرسکا کہ یہ بات اس نے طنز میں کہی تھی یا یونہی۔ تاہم اول خیر چپ نہ رہ سکا، بولا۔

”دادا! ماں پیو کی خاطر شہزی کیا کوئی بھی بڑے سے بڑا آدمی اپنی جان تک کا بھی رسک اُٹھا لینے میں دیر نہیں کرے گا۔ یہ تو پھر سندر داس تھا۔“ اول خیر کی بات صحیح تھی۔ اس نے پہلی بار آج کبیل دادا کو ”استاد“ یا ”بڑا استاد“ کہہ کر مخاطب نہیں کیا تھا۔ اس کی وجہ کبیل دادا کی اس بے چارے کے ساتھ مستقل رُکھائی کا انداز تھا۔ میں چپ رہا کہ کہیں اول خیر کی حمایت میں بولنے پر کبیل دادا اسے میری جانبداری پر محمول نہ کرے، کیونکہ اس وقت وہ بھی بہرحال ہمارا ساتھی تھا اور ہمارے کاز میں شامل بھی۔

”میں نے تم سے بات نہیں کی ہے۔ تم اپنی چونچ بند رکھو۔“ کبیل دادا نے اُسے جھڑک دیا۔ ٹھیک اسی وقت اول خیر نے کار کے بریک لگا دیے۔

رات کے پہر سناٹے میں کار کے ٹائر زور سے چرچرائے... اور وہ ایک جھٹکے سے رک گئی۔ ہم سب اول خیر کی اس حرکت پر چونک گئے۔ اس نے اپنی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے بیٹھے گردن موڑ کر کبیل دادا کو سخت نظروں سے گھورا اور بولا۔

”بس دادا! اب تک میں نے تمہاری جتنی عزت کرنی تھی کرلی۔ تمہیں اگر مجھ سے بات کرنا پسند نہیں ہے تو شہزی کاکے کے کاموں میں کیڑے بھی مت نکالو۔ شہزی کاکے کو تم سے زیادہ میں جانتا ہوں۔ یہ جذباتی فطرت کا آدمی ضرور ہے لیکن اپنے بچاؤ کی سُدھ بھی رکھتا ہے۔ اس کا ثبوت ہم سب کے سامنے ہے۔“

کار کے محدود ماحول کو یک بیک گمبھیر تا سی چپ کھا گئی۔ خود میں بھی اول خیر کا کبیل دادا کو آج پہلی بار اس طرح کے انداز میں مخاطب ہوتے دیکھ کر دم بہ خود سا رہ گیا تھا۔

ظاہر ہے آدمی کب تک اپنی بے عزتی برداشت کرسکتا ہے۔ اول خیر نے بھی ایک حد تک صرف پرانے تعلقات کی وجہ سے برداشت کیا تھا۔ مگر اب وہ میرا ساتھی تھا۔ ”بیگم ولا“ اور ”بیگم صاحبہ“ کے گروہ سے راندۂ درگاہ ہونے کے بعد بھی اس کے دل میں کبیل دادا کے لیے عزت تھی مگر...

”تم اپنی اوقات میں رہ کر بات کیا کرو اول خیر! ورنہ...“ کبیل دادا نے ایک بار پھر اُسے لتاڑا اور دھمکی دی تو اول خیر نے اس کی طرف بڑی خوں ریز نظروں سے گھورا اور اسی لہجے میں اس کا جملہ لوٹایا۔

”میری اوقات سننا چاہتے ہو ناں تو سن لو آج تم بھی دادا! حقیقت یہی ہے کہ اس سے پہلے میں خود کو ایک غلام ہی تصور کرتا تھا، مگر شہزی کاکے کی یاری میں آنے کے بعد مجھے اپنی اصل حیثیت اور حقیقت کا اندازہ ہوا ہے۔ جہاں جذبات اور دوستی کے رشتوں کی قدر کی جاتی ہے۔ کیا قصور تھا میرا جو میری اتنی قربانیوں کو بیگم ولا میں نظرانداز کر دیا گیا۔ بیگم صاحبہ کی ایک حکم عدولی ہی کی تھی ناں میں نے۔ وہ بھی اپنے کسی ذاتی مقصد کے لیے نہیں۔ اپنے ہی گروہ کے ساتھی چھیتے کی خاطر۔ کیا کرتا میں؟ وہ دو چھوٹے معصوم بچوں کا باپ اور ایک بیوی کا شوہر تھا، کنبے کا واحد کفیل۔ محض ایک ذرا سی غلطی پر میں اُسے گولی کیسے مار سکتا تھا؟ اُسے معاف کیا جاسکتا تھا...“ یہ کہتے ہوئے اول خیر کا لہجہ رقت زدہ سا ہونے لگا۔

”اگر یہ بات تھی تو تمہیں بیگم صاحبہ کو بتانا چاہیے تھا۔“ کبیل دادا اس سے درشت لہجے میں بولا۔

”مجھے ڈر تھا کہ وہ یہ کام کسی اور کے ذمے لگا دیتیں۔ چھیتے نے کئی مواقع پر میری جان بچائی تھی۔ میں اسے مرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا تھا۔“

”کچھ بھی تھا۔ یہ بات چھپا کر اور غلط بیانی کرکے کہ تم نے چھیتے کو بیگم صاحبہ کے حکم پر گولی مار دی ہے، یہ جھوٹ اس سے بڑا جرم بن گیا تھا تمہارا۔ بیگم صاحبہ اتنی ظالم ہوتیں تو بعد میں بھی چھیتے کو مروا سکتی تھیں، لیکن اُنہوں نے ایسا نہیں کیا۔“ کبیل بولا تو اسی وقت شکیلہ نے بیزاری سے کہا۔

”یہ تم لوگ ایسے نازک وقت میں کس غیر متعلقہ بحث میں لگ گئے ہو؟ دشمن سر پہ سوار ہے۔ آگے کی سوچو۔“

”گاڑی چلاؤ، یار تم!“ میں نے بھی بیزار سا ہو کے اول خیر سے کہا اور اس نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ پھر بولا۔

"اب آگے بڑھنے کا کیا فائدہ ہے شہزی کا کے! اس مردود بھارتی کرنل کی نیت کا فتور تو آشکارا ہو چکا ہے۔ وہ اس ڈیل سے مخلص نہیں ہے۔" ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ حسب معمول کرنل سی جی کی نئے نمبر سے کال موصول ہو گئی۔ میں نے دانت پیس کر ہیلو کہا تھا تو دوسری طرف سے اس بدبخت کی آواز اُبھری۔

"کہاں تک پہنچے؟" اس کے لہجے کا تاثر ایسا ہی تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں... وہ ایک دم انجان بن گیا تھا۔ پل کے پل میرے ذہن میں ایک خیال اُبھرا۔ جھوٹے کو گھر تک پہنچانا چاہیے، کوئی شکوہ کیے بغیر میں بھی اسی لہجے میں بولا۔

"بس! پہنچنے ہی والے ہیں۔ اب آگے کی صورت حال بتا دو۔" دوسری جانب یک دم خاموشی سی چھا گئی۔ یقیناً میرے بھی اس طرح انجان بن جانے پر وہ کچھ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ تاہم اس بار جب بولا تو اس کی آواز میں پہلے جیسا اعتماد نہیں رہا تھا۔

"ٹھیک ہے۔ لاہور پہنچ کر تم مقررہ مقام پر پہنچو، اس کے بعد اسی نمبر پر مجھ سے رابطہ کرنا۔ وہاں پہنچ کر ہماری آخری بات ہوگی اور ڈیل بھی۔ اس کے بعد تم اپنا راستہ لینا اور ہم اپنا اور یاد رکھنا۔ صرف تم ہو گے اور تمہارا ایک ساتھی ہمارے آدمی کے ساتھ۔ چوتھا نہ ہو۔"

"ایسا ہی ہو گا۔ مجھے یاد ہے۔ بار بار یہ کہنے کی ضرورت ہی نہیں۔" میں نے سرد اور سپاٹ لہجے میں کہا تو اس خبیث نے گڈ کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا۔

ہم دونوں ایک دوسرے سے چال چل رہے تھے، کامیابی کسے ملنے والی تھی؟ یہ سوائے اللہ کے کوئی نہیں جانتا تھا۔ مگر جانے کیا بات تھی کہ مجھے مایوسی سی ہونے لگی تھی۔

کرنل سی جی اپنی ڈیل سے مخلص نظر نہیں آ رہا تھا ورنہ یہ چال کیوں چلتا؟ ایک خیال یہ بھی میرے سوچتے ہوئے ذہن میں اُبھرا تھا کہ کیا خبر یہ کسی اور لوگوں کا حملہ ہو، مگر جلد ہی میں نے خود ہی اپنے خیال کی نفی کر دی۔ اگر یہ چال کرنل سی جی نے نہیں چلی تھی تو پھر اُسے اب تک کی ہمارے بارے میں "کرنٹ" رپورٹنگ کون کر رہا تھا؟ حالانکہ اس وقت تو میرے ساتھ اور بھی ساتھی کار میں موجود تھے۔ اس کا اسے کیوں نہیں پتا لگ سکا تھا؟ سمجھ میں آنے والی بات تھی کہ اب اس کے بیشتر متعاقب حواریوں کو ہم نے واصل جہنم جو کر ڈالا تھا۔ اب کوئی ہمارے تعاقب میں نہ تھا۔ لیکن یہ بات کرنل ہم سے نہیں پوچھ سکتا تھا، ورنہ اس کا بھانڈا

سکون

بیوی روٹھ کر میکے گئی اور اپنی ماں کے گھر بیٹھ گئی۔ شوہر نے پہلے روز فون کیا تو ساس نے نرمی سے بات کی۔ پھر یہ سلسلہ دراز ہو گیا۔ وہ روز فون کرتا اور اپنی شکایات دہراتا، ساس ہی فون اٹھاتی۔ زمین جنبد نہ جنبد گل محمد والا معاملہ دیکھ کر اس نے بھی تلخی اختیار کر لی اور داماد کو بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا۔

چالیسویں دن داماد نے فون کیا تو وہ بھپر کر بولی۔ "میں تم سے کتنی بار کہہ چکی ہوں کہ اب وہ تمہارے لیے مر چکی ہے... تم بار بار فون کر کے تنگ کیوں کرتے ہو؟"

"مر چکی ہے!" داماد کی آسودہ آواز آئی۔ "یہ سُن کر کتنا سکون ملتا ہے... یہی سننے کے لیے تو روز فون کرتا ہوں!"

کوہاٹ سے ارجمند خان کی سرگوشی

پھوٹ جاتا۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے بھی اسی کی "انجان" بننے کی ایکٹنگ جاری رکھی تھی۔ اندازہ تو اب اُسے بھی اچھی طرح ہو گیا ہو گا کہ میں اتنی آسانی سے قیدی سندر داس کو اس کے حوالے نہیں کرنے والا۔ اس لیے اُسے اب یہ ڈیل حقیقی بنیادوں پر کرنا پڑے گی۔

یہ سوچ کر مجھے کچھ اُمید ہوئی کہ اب کرنل سی جی بھجوانی کی باری تھی کہ وہ میری چال میں آتا۔

"حیرت ہے، تم نے کرنل سی جی کو ٹانڑا نہیں؟" کبیل دادا نے کہا۔

"اس نے مجھ سے ایسی کوئی بات ہی نہیں کی تھی کہ یہ ظاہر ہوتا کہ یہ حرکت اسی ملعون کی تھی۔" میں نے جواب دیا۔

"اس منحوس کے علاوہ اور بھلا کس کی یہ حرکت ہو سکتی ہے۔ اب بھلا وہ یہ بات اپنے منہ سے کہہ سکتا تھا؟"

"اسی لیے تو میں نے بھی کچھ نہیں کہا۔ جس طرح اس نے مجھ پر ظاہر نہیں ہونے دیا، اسی طرح میں نے بھی اس سے انجان بنے رہنے کا کھیل کھیلا۔"

"لیکن اس سے یہ تو ظاہر ہو گیا ہے کہ وہ محض تمہیں بے وقوف بنا رہا ہے، وہ اپنا شکار ہم سے چھین لینا چاہتا ہے اور ہمیں ہمارا مطلوبہ آدمی دینے کا قطعاً کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔"

''اب نکل پڑے ہیں تو دیکھنا ہی پڑے گا کہ آخر وہ چاہتا کیا ہے۔ اتنا تو اُسے بھی اندازہ ہوگیا ہوگا کہ ہم اتنی آسانی سے اس کے نرغے میں آنے والے نہیں ہیں۔ ہوسکتا ہے اس نے یہ حرکت ایک جوئے کے طور پر کھیلی ہو۔ اب شکست کے بعد وہ اصل سودے پر مجبور ہو جائے۔'' میں نے کہا تو کبیل دادا چپ ہو رہا۔ وہ شاید اب میری بات سمجھا تھا۔

اول خیر نے ہولے سے ''او خیر۔'' کہا تھا۔ ہمارا سفر ایک مختصری جنگ ریز ہلچل کے بعد دوبارہ شروع ہو گیا تھا۔

کبیل دادا مجھے بے دلی کا شکار نظر آرہا تھا، اس کا خیال تھا کہ کرنل سی جی میرے ساتھ ایک ''ایموشنل گیم'' کھیل کر اپنا مقصد حاصل کرنے کے درپے ہے اور میں اس کے ہاتھوں جذباتی بلیک میلنگ کا شکار ہو رہا تھا۔ میں کبیل دادا کی اس سطحی سوچ کو اس کی کج روی پر ہی محمول کرسکتا تھا۔ بات تو ویسے اس کی بھی ٹھیک ہی تھی، اور ہو بھی سب کچھ ویسے ہی رہا تھا، جیسا کہ وہ سمجھے ہوئے تھا۔

کیمبر کینٹ کراس کرتے ہوئے ہم اوکاڑہ پہنچے۔ اس وقت دور مشرقی اُفق کسی نئی نویلی دلہن کے رُخساروں کے مانند دہکنے لگا تھا۔ ہمارا سفر اب لاہور روڈ پر جاری تھا۔ آگے سڑک کے کنارے ایک پیٹرول پمپ نظر آیا۔ اول خیر نے کار اسی طرف موڑ لی۔

کار میں پیٹرول ڈلوانے کے بعد ہم آگے روانہ ہونے لگے تو کبیل دادا گمبھیر آواز میں بولا۔ ''شہزی! کرنل بھجوانی سے رابطہ کرکے اُسے۔ بتا دو کہ ہم اس کے مقررہ مقام تک پہنچ چکے ہیں۔''

اگرچہ ابھی ہم مطلوبہ مقام سے کافی دور تھے، تاہم مجھے اس کا مشورہ معقول لگا۔ چونکہ مجھے اس بار کرنل بھجوانی نے خود ہی مذکورہ نمبر پر رابطہ کرنے کا کہا تھا اسی لیے میں نے وہی نمبر کھڑکا دیا۔

''ہم مطلوبہ مقام پر پہنچ چکے ہیں۔'' رابطہ ہوتے ہی میں نے سرد و سپاٹ لہجے میں کہا تو وہ چند ثانیے کی پُرسوچ خاموشی کے بعد بولا۔

''تمہارا مطلب ہے تم کرباٹ سنگھ پہنچ چکے ہو؟''

''میں نے فارسی نہیں بولی، کیا اُردو اور ہندی میں کوئی فرق ہے؟'' میرا لہجہ اُکھڑا ہوا تھا۔

''اپنا لہجہ درست کرو۔ جانتے نہیں میں کون ہوں۔ تم اس وقت فوجی رینک کے ایک بڑے اور افسرِ اعلیٰ سے بات کر رہے ہو۔ سمجھے تم؟'' وہ پُرغرور لہجے میں بولا۔

''افسرِ اعلیٰ......! میں یہی پوچھ رہا ہوں۔ آگے کی کیا ہدایت ہے؟'' میں نے زہریلے طنز سے کہا۔

''مت بھولنا یہ کہ میں کسی وقت بھی تمہارے آپشن کو اگنور کرسکتا ہوں۔'' اس کی بھی غراتی ہوئی آواز اُبھری۔ ''اسی لیے آئندہ اپنا لہجہ درست رکھنا۔''

اس کا خار کھایا ہوا لہجہ بتا رہا تھا کہ اسے اب تک آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو چکا تھا۔ یقینی بات تھی کہ اس کے شکست خوردہ ایجنٹ نے اُسے اب تک اپنی ناکام ''مہم جوئی'' کے بارے میں آگاہ کردیا ہوگا کہ وہ جسے تر نوالہ سمجھے ہوئے تھے وہ گلے کا چھچھوندر ثابت ہوا تھا۔ وہ بھی ایسا کہ تقریباً سب کے گلے چیر ڈالے تھے۔ وہ نفسیاتی طور پر میرے دباؤ میں تھا۔ جس نے اسے جھلاہٹ آمیز غصے اور غرور میں مبتلا کردیا تھا۔

یہ بات وہ مجھے شاید کوئی دوسری یا تیسری بار جتا چکا تھا کہ اس کے پاس مجھ سے ڈیل کے علاوہ بھی اور بہت سے آپشن تھے اور میں اس کی یہ بکواس کسی مصلحت کے تحت سنتا اور برداشت کرتا آرہا تھا۔ لیکن اس بار نہ کرپایا اور ترنت بول اٹھا۔

''مسٹر افسرِ اعلیٰ ......! اگر تمہارے پاس اور بھی آپشنز ہیں تو وہ تمہیں مبارک ہوں، آپشنز تو میں بھی بہت سے رکھتا ہوں، بس، بات آسانی کی ہے، جہاں طے ہو جائے، اسی لیے مجھے اب تم بار بار یہ جتانے کی کوشش نہ کرو، اور وقت ضائع کرنے کے بجائے صرف کام کی باتیں کی جائیں تو یہ ہم دونوں کے لیے بہتر ہوگا۔''

اس بار وہ کسی فالتو بکواس کرنے کے بجائے کام کی بات کی طرف آتے ہوئے بولا۔ ''ہم بھی یہی چاہتے ہیں، مجھے اب یہ بتاؤ کہ پنڈ کرباٹ سنگھ میں تم کون سے مقام پر موجود ہو اس وقت؟''

''ہم پنڈ کرباٹ سنگھ کی نیو کالونی والی جگہ پر کہیں ٹھہرے ہوئے ہیں۔'' میں نے ایک اور جھوٹ بولا۔

''کہاں؟ کس کے پاس اور کون ہے تمہارے ساتھ؟'' اس نے بڑی بے چینی سے استفسار کیا تو بے اختیار میرے ہونٹوں پہ زہریلی مسکراہٹ رقصاں ہوگئی اور میں تیز لہجے میں بولا۔

''زیادہ چالاک بننے کی کوشش مت کرو کرنل بھجوانی! اور اب اس ہاتھ دو اور اس ہاتھ لو والی بات ہوگی۔'' میں جانتا تھا وہ ہماری لوکیشن ٹریس کر کے ایک بار پھر اپنے مسلح

گرگوں کے ذریعے ہم پر ہلا بولنے کی کوشش کر سکتا تھا۔

''تمہاری نیت میں مجھے فتور محسوس ہو رہا ہے مسٹر شہزی! ایسے غیر یقینی ماحول اور بد اعتمادی کی فضا میں ہمارے درمیان اتنی اہم ڈیل کس طرح ممکن ہو سکتی ہے؟''

وہ شاطرانہ لہجے میں بولا اور مجھے اس کی مکاری پر بے تحاشا غصہ آنے لگا۔ میں نے سوچا کہ یہی وقت ہے اس مردود اور دھوکے باز انسان کو آئینہ دکھا دیا جائے، لہٰذا بولا۔

''خاطر جمع رکھو بھجوانی! نہ تم اتنے بے خبر ہو اور نہ ہی ہم اتنے نادان، تم ہم پر ایک حملہ کروا چکے ہو اور اب تک اس کے انجام سے بھی... واقف ہو چکے ہو گے۔ اگر اب تم دوبارہ یہی بے وقوفی دہرانے کا ارادہ کیے ہوئے ہو تو اس سے نہ صرف ڈیل متاثر ہو گی بلکہ بار بار یہ جنگ ہم دونوں کے لیے بھی نقصان کا سبب بن سکتی ہے، اور کم از کم یہاں تو... بالکل بھی نہیں کہ سرحدی علاقہ قریب ہے۔ اور ہماری آپس کی جنگ میں بی ایس ایف یا ایسا ہی کوئی حساس ادارہ کود پڑا تو پھر کچھ بھی نہیں بچے گا۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ اس ڈیل کو شفاف رکھو۔ ورنہ ہم ادھر سے ہی واپس لوٹ جاتے ہیں۔''

اس بار میں نے بھی اس سے دوٹوک لہجے میں بات کر لی، جس پر وہ بھی کچھ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کیونکہ دوسری جانب کچھ لمحات کے لیے خاموشی سی طاری ہو گئی تھی، پھر اس کی آواز ابھری۔

''پتا نہیں تم کس حملے کی بات کر رہے ہو؟ او کے۔ تم لوگ بی آر بی پار کر کے دوسرے کنارے پہ آجاؤ۔ ہم وہاں ایک مڑھی میں تمہارے منتظر ہیں۔''

یہ کہتے ہوئے اس نے لوکیشن مجھے بتا دی۔ اور کچھ سنے بغیر رابطہ منقطع کر ڈالا۔

میں نے پرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔

''او خیر کا کے! اب تم نے اس دغاباز آدمی کو صحیح جواب دیا۔ ورنہ تو یہ مردود ہمیں اب تک اپنے آگے لگائے ہوئے تھا۔'' اول خیر اپنے مخصوص لہجے میں بولا تو کبیل دادا نے مجھ سے مخاطب ہو کر سنجیدگی سے کہا۔

''اب بھی ہم اس کے کہنے پر ہی تو لگ رہے ہیں۔ جو یہ کہہ رہا ہے وہ ہم بلا چون وچرا کیے جا رہے ہیں۔ بی آر بی پار کرنا آسان نہیں، اور اس سے زیادہ مشکل اُس مقام پر پہنچنا ہے، جو انڈیا کے بارڈر کے قریب ہے، گویا وہ ہم سے اپنا شکار چھین کر بہ آسانی پلٹنے کا ارادہ اور راستہ بھی محفوظ رکھے ہوئے ہے۔''

''میرا خیال ہے ہم شہزی! کبیل دادا کی بات غلط نہیں ہے۔'' شکیلہ نے پہلی بار کبیل دادا کی کسی بات کی تائید کی تھی۔ میں نے بھی اس کی بات پر غور کرنے کے انداز میں ایک ذرا اپنی گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا، پھر بولا۔

''تو کیا ہمیں بھجوانی کو اس بات پر مجبور کرنا چاہیے کہ وہ خود بی آر بی پار کر کے ہمارے طے کردہ مقام پر ملے؟''

''بالکل۔'' کبیل دادا نے فوراً اپنے سر کو جنبش دی تھی۔

''وہ نہیں مانے گا۔''

''تم اس سے ذرا یہ بات کہہ کر تو دیکھو کہ وہ جواب کیا دیتا ہے؟ پھر اس کا بھی حل سوچ لیتے ہیں۔'' اول خیر نے کہا۔ وہ بھی مجھے کبیل دادا کے مشورے سے متفق نظر آیا، اگرچہ بات غلط بھی نہیں تھی، مگر میں اپنے بدنصیب باپ کو ہر قیمت پر اس سفاک اور ظالم ہندو کرنل کے چنگل سے چھڑانا چاہتا تھا۔ چاہے مجھے اس کے لیے سرحد پار ہی کیوں نہ جانا پڑتا.... لیکن میں نے ساتھیوں کی بات پر سرِدست اتفاق کرتے ہوئے اسی وقت کرنل بھجوانی سے رابطہ کر لیا اور اپنی بات اس کے سامنے رکھی مگر وہ خبیث نہیں مانا اور رابطہ منقطع کر دیا۔ اس رذیل کی ہٹ دھرمی پر میں.... بری طرح کھول اٹھا تھا۔ بالآخر میں نے کوچ کا حکم دے دیا۔

لاہور کی سمت جاتی ہوئی اس روڈ پر خاصی ٹریفک نظر آتی تھی۔ بہرحال ہم بھائی پھیرو، سرائے چھیما اور دینا ناتھ کراس کرتے ہوئے تقریباً ڈیڑھ گھنٹے میں سندر اڈا پہنچ گئے۔ آگے ٹھوکر نیاز بیگ پہنچنے میں ہمیں بہ مشکل پندرہ بیس منٹ لگے ہوں گے۔

ٹھوکر نیاز بیگ کینال بینک روڈ پر نہر کے کنارے کنارے کار دوڑاتے ہوئے ہم پینتیس، چالیس منٹ بعد بھٹہ چوک پہنچے تو ہمیں ناشتے وغیرہ کی طلب ہوئی۔ ایک روڈ سائڈ ہوٹل کے وسیع احاطے میں اول خیر نے کار روک دی۔

یہاں رُکنے سے پہلے ہم نے اس بات کی اچھی طرح سے تسلی کر لی تھی کہ کوئی پولیس چوکی یا حساس ادارے کے اہلکار سے ہماری مڈبھیڑ نہ ہونے پائے، اگرچہ میرے پاس رینجرز فورس کا کارڈ تھا، لیکن حالات ایسے نہیں رہے تھے کہ میں وہ کارڈ شو کرتا۔ چہ جائیکہ اس کی اشد ضرورت نہ پڑتی۔

ہم سب کار سے نیچے اُتر آئے۔ آسمان پر بادل چھانے لگے تھے، ٹھنڈی لہر بڑھنے لگی تھی، موسم کے تیور بوندا باندی کا پتا دے رہے تھے۔ سڑک پر ٹریفک کی شائیں

شائیں جاری تھی۔ اول خیر ناشتے کا آرڈر دینے کے لیے کاؤنٹر کی طرف بڑھ گیا جبکہ ہم نے سندر داس کو باہر نکالنے کے بجائے عقبی سیٹ پر لٹا دیا اور شکیلہ کار کی اگلی سیٹ پر موجود رہی۔ میں اور کبیل دادا سڑک کے کنارے احاطے میں بچھے ہوئے بان کے پلنگ پر بیٹھ گئے۔ اسی وقت ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہو گئی۔ ہم نے اپنا پلنگ ایک بڑے سے بانس کے چھپر...... تلے کھسکا لیا۔

ہمیں آگے روانگی کی عجلت تھی اسی لیے اول خیر خود ہی ناشتے کی ٹرے اُٹھا لایا تھا۔ پہلے اس نے کار میں بیٹھی شکیلہ کو ناشتا پہنچایا اس نے خود بھی ناشتا کیا اور تھوڑا بہت سندر داس کے منہ میں بھی ٹھونسا۔ ہم تینوں بان والے پلنگ پر بیٹھ کر ناشتا کرنے لگے۔ پراٹھے گرما گرم، مزیدار اور خستہ تھے، آملیٹ کے ساتھ اول خیر ایک باؤل دہی سے بھر کے بھی لے آیا تھا، وہ ناشتے میں دہی کھانے کا عادی تھا۔ اس پر کبیل دادا نے اس سے کہا۔

''دہی ذرا کم ہی کھانا۔ صبح دہی کھانے سے واہی تباہی ہونے لگتی ہے، ٹھنڈ اور بارش الگ پڑ رہی ہے اور تم ڈرائیونگ سیٹ سنبھالے ہوئے ہو۔'' اس کی بات پر میں ہولے سے مسکرایا تھا اور ترچھی نظروں سے اول خیر کی طرف دیکھا تھا۔ مجھے کبیل دادا کا اول خیر سے پہلی بار اس طرح مخاطب ہونا اچھا لگا تھا۔ یہ اس کا ایک طرح سے دوستانہ انداز تھا جبکہ رہی سہی کسر اول خیر نے بھی پوری کر دی، وہ اس کی طرف مسکرا کے دیکھتے ہوئے اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔

''او خیر وڈے اُستاد جی! جو اس شے کا عادی ہو اُسے کچھ نہیں ہوتا، پہلی دفعہ کھانے والے کو ضرور سستی اور آلکسی دیتا ہے دہی۔''

اول خیر کا کبیل دادا کو پرانے لقب ''بڑے اُستاد جی'' کہنا بھی مجھے اچھا لگا۔ ان دونوں کے بیچ دوستانہ ماحول دیکھ کر مجھے دلی خوشی ہوئی تھی۔ درحقیقت میں خود بھی یہی چاہتا تھا کہ ان دونوں کے درمیان صلح ہو جائے اور جانتا تھا میں کہ کبیل دادا سے اول خیر کی صلح ہونے کا مطلب ''بیگم صاحبہ'' سے صلح ہونا تھا۔ اس بات کا تو مجھے بھی اعتراف تھا کہ کبیل دادا اور اول خیر دونوں ایک دوسرے کے پرانے ساتھی اور یار بیلی تھے۔

بہرحال ہمارے بیچ اس دوران مزید کوئی خاص بات چیت نہ ہو سکی۔ شکر تھا کہ کبیل دادا نے اس مہم میں دوبارہ کوئی مین میخ نکالنے کی کوشش نہیں کی تھی، شاید اُسے اندازہ ہو گیا تھا کہ میں اس وقت کرنل بھوانی کی باتیں ماننے پر مجبور تھا۔ اور کیا کرنے کا ارادہ رکھے ہوئے تھا، اس کا بھی وہ ادراک رکھتا تھا۔

''جمع خرچ'' کے ساتھ ہمیں کوئی بیس سے پچیس منٹ لگے ہوں گے اس کے بعد ہم آگے روانہ ہو گئے۔ ہم اپنے متوقع تعاقب پر بھی نگاہ رکھے ہوئے تھے۔ جس کے ابھی ہم میں سے کسی کو بھی ایسے کوئی آثار نظر نہیں آرہے تھے۔ شاید کرنل بھوانی کے پاس اب افرادی ایجنٹوں کی قلت ہو گئی تھی، یا پھر ان کا ایک گروپ نہر پار اس مڑھی کے پاس موجود تھا، جہاں ہمیں پہنچنا تھا اور اس ڈیل کو آخری صورت دینا تھی۔

ہلکی بارش شاید کڑکڑاتی سردی کا پتا دینے کے بعد معدوم ہو گئی تھی۔ مگر موسم کھل گیا تھا۔ سردی جوں کی توں تھی۔

دس پندرہ منٹ بعد ہم روہی والا پُل پر آ گئے۔ یہاں سے ہم نے بڑی سڑک چھوڑ دی اور نالے کے دائیں کنارے پہ ہم آگے کی طرف بڑھتے چلے گئے۔ اردگرد کھیت کھلیان، صبح کی عطر بیز فضا میں لہلہاتے نظر آرہے تھے، انہی کے بیچ کہیں کہیں بھٹوں کی چمنیاں دھواں اُگل رہی تھیں، نالے کے کنارے سرکنڈے اُگے ہوئے تھے۔ آگے نیو کالونی کی دیوار نظر آرہی تھی۔ جو تقریباً پانچ منٹ دس منٹ کے سفر کے بعد اختتام پذیر ہوئی۔ اور ہم پنڈ کربات سنگھ میں تھے۔

ایک نسبتاً ویران مقام پر پہنچ کر اول خیر نے کار روک دی۔ یہاں آس پاس خاصے اُونچے ٹیلے بے نظر آرہے تھے۔ اب مسئلہ نہر پار کرنے کا تھا۔ نہر کے دونوں طرف کے کراڑے بہت اُونچے تھے۔ جبکہ نہر کا چوڑا پاٹ خاصی گہرائی میں بہہ رہا تھا۔

پل کی طرف سے چوکیوں کی بتیاں صبح کاذب کی روشنی میں بھی چمکتی دکھائی دے رہی تھیں۔ اسی وقت کرنل بھوانی کی کال آ گئی، وہ چھوٹتے ہی بولا۔

''تم لوگ ابھی تک نہیں پہنچے؟ کدھر رہ گئے ہو؟''

''پہنچ تو ہم کب کے گئے ہیں، مگر نہر پار کرنے کے لیے ہمیں کچھ اسپیشل ایفرٹس لینا پڑ رہے ہیں۔'' میں نے جواز گھڑا۔

''پل سے ہم لوگ نہیں آ سکتے کہ وہاں سخت پہرا ہے اور چوکیاں بنی ہوئی ہیں، نہر پار کر کے آنا پڑے گا۔ اور ہم ایسی کسی تیاری سے نہیں آئے ہیں، تم پہلے بتا دیتے کہ نہر بھی

پار کرنی ہے تو ہم اپنے ساتھ پیراکی کا لباس لے آتے۔'' میں نے دروغ گوئی سے کام لیتے ہوئے جواب دیا۔

''تو اب کیا سوچا ہے؟ کچھ بندوبست کیا تم نے نہر پار کرنے کا؟'' وہ بولا۔

بسا اوقات انسان کا ذہن وقت اور حالات کے مطابق بالکل ٹھیک کام کر جاتا ہے، ایسے ہی وقت میں میرے ذہن میں بھی ایک خیال کلک ہوا۔ میں نے کہا۔

''نہر پار کرنا مشکل ہی نظر آرہا ہے۔ اگر ہم ڈھیٹ بن کر اپنی سی کوشش کر بھی لیتے ہیں تو تمہارے آدمی کے ڈوب مرنے کا خطرہ ہوگا، کیونکہ اُس کے ہاتھ پیر ہم نے باندھے ہوئے ہیں اور تیرنا صرف مجھے آتا ہے، میرے ساتھی کو نہیں، جبکہ میں اکیلا تمہارے آدمی کو سنبھالے ہوئے دوسرے کنارے نہیں آسکتا۔''

لمحے بھر کی خاموشی کے بعد کرنل بجوانی بولا۔ ''ہمارے ساتھی سندرداس کو تیرنا آتا ہے۔ تم اس کی مشکیں کھول دو۔''

''یہ میرے لیے ممکن نہ ہوگا کرنل!'' میں نے مسکت جواب دے ڈالا۔ ''اس سے تو زیادہ بہتر ہوگا کہ میں واپس ہی لوٹ جاؤں۔''

''تم ایسا نہیں کر سکتے۔ اپنے باپ کو لیے بغیر تم کیسے خالی ہاتھ...''

''میں واقعی ایسا نہیں کرتا۔'' میں نے اس کی بات کاٹی۔ ''لیکن ایک تو میں تمہاری طرف سے اب بددلی کا شکار ہونے لگا ہوں... دوسرے یہ کہ مجھے نہر پار کرنے کی کوئی سبیل بھی نظر نہیں آرہی۔ اب ایک ہی صورت نظر آتی ہے کہ تم ہماری طرف پیش قدمی کرو۔''

''یہ نہیں ہوسکتا۔ نہر تمہیں ہی پار کرنا ہوگی۔''

وہ حتمی لہجے میں بولا تو میں نے بھی بلاتامل کہا۔ ''تمہاری مرضی پھر، میں اپنے دل پر پتھر رکھ کر واپس لوٹ جاؤں گا، یوں بھی مجھے تمہاری نیت پر کامل شبہ ہونے لگا ہے۔ ہم بھی تو آخر ملتان سے اتنا طویل سفر کر کے یہاں تک پہنچے ہیں، کیا تم نہر بھی نہیں پار کر سکتے؟''

مجھے اس بار سخت رویہ اختیار کرنا پڑا تھا۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ میں نہیں جانتا تھا کہ نہر کے پار اور سرحد کے قریب اس کے کتنے آدمی ہمارے منتظر ہو سکتے تھے؟ اور کتنے گھات لگائے بیٹھے ہم پر دوسرا حملہ کرنے کو تیار تھے؟

چند سیکنڈوں کی خاموشی کے بعد کرنل بجوانی بولا۔ ''میری کال کا انتظار کرو۔'' کہہ کر وہ رابطہ منقطع کرنے لگا تو میں نے بلا تاخیر کہا۔ ''کال جلدی کرنا، ہم یہاں ایک خطرناک قیدی کے ساتھ زیادہ دیر نہیں رک سکتے۔''

اس نے اثبات میں جواب دیا اور میں نے اپنے حلق سے ایک گہری ہمکاری خارج کی تو کبیل دادا بولا۔ ''اب تم نے اس دغاباز کرنل کو ٹھیک جواب دیا۔ کوشش یہی کرو کہ کرنل تمہاری بات مان لے، کیونکہ نہر پار کرنے میں بہت رسک ہے، نجانے دوسری طرف اس مردود کے کتنے آدمی ہماری تاک میں بیٹھے ہوں گے؟''

''تو کیا ان لوگوں نے اتنی آسانی سے سرحد پار کر لی ہوگی اور سب ایک جگہ جمع ہو گئے؟ یہ کیسے ممکن ہے؟'' شکیلہ نے قدرے حیرت سے کہا تو اول خیر نے جواب دیا۔

''ہم اس وقت جس جگہ پر کھڑے ہیں وہ سرحد کا ایک دورافتادہ علاقہ ہے، ممکن ہے ان کے چند ایجنٹوں نے کسی بھیس میں سرحد پار کر لی ہو۔''

''یہ ضروری نہیں کہ اُن لوگوں کو سرحد پار کرنا پڑے، بلیوٹلسی کے ایجنٹ پہلے ہی سے یہاں موجود ہوں۔'' میں نے بھی اپنا خیال ظاہر کرتے ہوئے پُرغور لہجے میں کہا۔ ''کرنل سی جی بجوانی کی باتوں اور دیگر عوامل سے مجھے اندازہ ہوتا ہے کہ بلیوٹلسی کے ایجنٹ اپنے گرو گھنٹال کی ایک ایک ہدایت کے ساتھ کھڑے ہیں۔ ایک گروپ کو تو ہم نے راستے میں ہی ڈھیر کر دیا تھا، دوسرا گروپ ہماری گھات میں نہر کے کنارے موجود ہو سکتا ہے۔'' اسی وقت کبیل دادا نے لقمہ دیا۔

''اور کوئی بعید نہیں کہ اُن کا کوئی ایجنٹ ہمارے کہیں ارد گرد قریب بھی موجود ہو۔'' کبیل دادا کے اس خدشے نے میرے پورے وجود میں سنسنی کی لہری دوڑا دی۔ اس کا خیال غلط نہیں ہو سکتا تھا، یہ ممکن تھا۔ میں نے غیرارادی طور پر اپنے گردوپیش کا جائزہ لیا۔

ہم کار سے اُتر کر باہر آن کھڑے ہوئے تھے۔ ہمارے اطراف میں دور و نزدیک ویرانے کے سوا کچھ نہ تھا۔ نہ کسی آبادی کے آثار اور نہ ہی کوئی روئیدگی تھی۔ ماسوائے ٹیلوں ٹبوں کے۔ بہرطور ہم اپنے گردوپیش سے محتاط تو تھے ہی۔ اول خیر نے کہا۔ ''پتھر اپنی جگہ بھاری ہوتا ہے۔ ہم نے جتنی پیش قدمی کرنا تھی کر لی، اب کرنل بجوانی کی باری ہے۔ وہ ہماری طرف بڑھے۔ مزید رسک لینا خطرے سے خالی نہ ہوگا۔'' اس کی بات صحیح تھی۔ سندرداس جیسا ایٹم بم ہمارے ساتھ تھا، وہ اگر ہاتھ سے نکل جاتا تو اس کے بعد کے اثرات کسی قیامت سے کیا کم ہوتے۔

"سوال وہی پیدا ہوتا ہے کہ اگر ان لوگوں کے ساتھی پہلے ہی سے یہاں موجود ہیں تو پھر ہمارا مطلوبہ آدمی کہاں اور کس کے قبضے میں ہوسکتا ہے؟" شکیلہ نے خیال ظاہر کیا۔

"صحیح۔" کبیل دادا نے شکیلہ کی تائید میں مختصراً کہا تو وہ آگے بولی۔

"اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اگر سی جی اس ڈیل کے ساتھ مخلص ہے تو اس نے اپنے کسی آدمی کے ساتھ بہت پہلے ہی ہمارا مطلوبہ آدمی یہاں پہنچا دیا ہوگا۔ یا پھر وہ ہماری طرح ہمیں بلف کرنے کا ارادہ کیے ہوئے ہے۔ یعنی چٹ بھی ہماری اور پٹ بھی ہماری۔ اپنا شکار بھی لے اُڑے اور ہمیں ہمارے مطلوبہ آدمی کی گرد تک بھی نہ پہنچنے دے۔"

"اگر ایسا ہے تو پھر میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی ہے کہ کرنل بھجوانی کی یہ چال اسی کے اُوپر اُلٹ دی جائے۔" کبیل دادا ایک دم پُرسوچ لہجے میں بولا تو ہم سب بیک وقت چونک کر اس کا چہرہ تکنے لگے۔

"تمہارے ذہن میں کیا ترکیب آرہی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"پہلے کرنل کا جواب آجائے۔ پھر بتاتا ہوں۔" وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔ میں دوسری طرف دیکھنے لگا۔ اسی وقت میرے سیل کی بیل گنگنائی۔ خیال یہی تھا کہ کال کرنل بھجوانی کی ہوگی، مگر ڈسپلے پر میں نے نگاہ ڈالی تو بری طرح چونک پڑا۔

وہ کال امریکا سے آنسہ خالدہ کی تھی۔ میرا دل یکدم دھک دھک کرنے لگا۔ میں اپنے ساتھیوں سے ذرا چند قدموں کے فاصلے پر چلا گیا۔

"ہیلو مس خالدہ! خیریت ہے؟ عا... عابدہ تو ٹھیک ہے ناں؟" میں نے بے چینی سے کہا تو دوسری جانب سے اس کی آواز اُبھری۔

"خیریت یہی ہے کہ پاسکل ہولارڈ کو ہمارے خلاف ایک محاذ پر فتح حاصل ہوگئی ہے۔" اس نے بتایا اور میرا دھک دھک کرتا دل جیسے رک گیا۔ میرے منہ سے پھنسی پھنسی آواز بہ مشکل ہی برآمد ہوئی تھی۔

"کیا... مم... میں سمجھا نہیں؟"

"تم یقیناً سب سمجھ رہے ہو۔" وہ بولی۔ "میری کوششوں کے باوجود پاسکل ہولارڈ، عابدہ کا کیس نیویارک سٹی کی لبرل اینڈ اوورسیز سوسائٹیز کی عدالت سے سی آئی اے کی اینٹی ٹیررنر کورٹ بینچ میں لے جانے میں کامیاب ہو چکا ہے۔"

اس نے ایک بھیانک اور لرزہ دینے والا انکشاف کیا۔ میرا حلق سوکھنے لگا اور آواز ہی برآمد نہ ہو پائی۔ اس کی بات سن کر میرے وجود کا رواں رواں تھرانے لگا۔ بہ مشکل ہی الفاظ میرے منہ سے برآمد ہوئے تھے۔

"تت... تو... پھر... اب کیا ہوگا؟ کیا یہ خطرناک ہوگا۔ عا... عابدہ کے لیے؟"

"تم شاید کہیں باہر ہو۔ شائیں شائیں کی آوازیں آرہی ہیں۔ آواز کٹ رہی ہے۔" وہ اُلجھے ہوئے لہجے میں بولی۔ جبکہ مجھے اس کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ میں بے چین سا ہوگیا تھا۔ اپنے خشک ہونٹوں پہ زبان پھیرتے ہوئے بولا۔

"ہاں۔ میں آؤٹ آف باؤنڈری وال ہوں۔ لل... لیکن..."

"تم ایسا کرو گھر پہنچ جاؤ۔ پھر میں کال کرتی ہوں۔"

میں نے تشویش آمیز بے قراری سے کہا۔ "نن... نہیں۔ مجھے گھر لوٹتے ہوئے دیر ہوجائے گی۔ میں کسی جگہ ایک ضروری کام کے سلسلے میں پھنسا ہوا ہوں۔ پلیز، بات جاری رکھو۔ میں سن رہا ہوں۔ پلیز۔" میں نے ملتجی لہجے میں کہا تو وہ ملائمت آمیزی سے بولی۔

"اوکے، اوکے۔ ٹیک اٹ ایزی۔ کیا تم نے سن لی میری بات؟"

"ج... جی ہاں۔ مجھے آپ کی آواز بالکل صاف سنائی دے رہی ہے۔ میں نے پوچھا تھا کہ کیا یہ بات عابدہ کے لیے زیادہ خطرناک ثابت ہوسکتی ہے؟"

"ابھی تو کچھ کہنا قبل از وقت ہی ہوگا۔ لیکن ظاہر ہے کہ پاسکل ہولارڈ کیس کی مخالفت میں کامیابی کے ساتھ ایک اسٹیپ آگے اُٹھا چکا ہے۔ جیسا کہ وہ چاہتا تھا۔" وہ بتانے لگی۔ "کیونکہ نیویارک سٹی کی لبرل اینڈ اوورسیز سوسائٹیز کی عدالت سے اس کیس کا سی آئی اے کی اینٹی ٹیررنر کورٹ میں ٹرانسفر ہونا بہرحال عابدہ کے حق میں اچھا تو نہیں ہے لیکن ہمیں اس کیس کا جم کر مقابلہ کرنا ہوگا۔ اس لحاظ سے اب کم از کم عارفہ کی گواہی اشد ضروری ہوگئی ہے۔ خیر، تم نے ڈیتھ سرٹیفکیٹ کا کیا کیا؟" آنسہ خالدہ نے آخر میں پوچھا۔ مجھے اس کی باتوں سے ہول آرہا تھا۔

میں نے کہا۔ "وہ میں آپ کو بھیج چکا ہوں۔"

"گڈ۔ اور عارفہ کو راضی کیا تم نے؟ وہ کب تک آرہی ہے؟ کیونکہ کیس اب خصوصی عدالت میں ٹرانسفر کر دیا گیا ہے۔ اور وہاں تاخیر اسے مزید کمزور کرنے کا باعث بن

سکتی ہے اور نہ ہی زیادہ مہلت ملنے کی اُمید ہے۔'' اس کی بات نے مجھے پریشان کر دیا۔ بولا۔

''میں نے اُسے تقریباً رضامند کر لیا ہے۔ بس دو ایک دن میں اس کی طرف سے حتمی جواب مجھے مل جائے گا تو میں آپ کو بتا دوں گا۔''

''ایک بات ذہن میں ضرور رکھنا مسٹر شہزاد! کہ اب ان خاتون کی گواہی بہت ضروری ہو گئی ہے۔ آگے تم خود سمجھدار ہو۔ او کے؟''

''جی میں سمجھ گیا۔ آئی نو۔ بٹ آپ عابدہ سے ملتی رہتی ہیں ناں؟ وہ کیسی ہے؟ ٹھیک تو ہے ناں؟ میرے بارے میں آپ اُسے پلیز بتاتی رہیے گا کہ میں مسلسل آپ سے رابطے میں ہوں اور اسے تسلی بھی...''

میں اپنا جملہ مکمل نہ کر سکا۔ عابدہ وہاں کس حال میں ہو سکتی تھی۔ یہ بھلا مجھ سے بہتر اور کون جان سکتا تھا۔ میرا جی بھر آیا تھا۔ گلے میں رقت اُترنے کے باعث میری آواز لڑکھڑا گئی تھی اور میں آگے نہ بول سکا تھا۔ دوسری جانب بھی لمحہ بھر کے لیے خاموشی طاری ہو گئی تھی۔ پھر آنسہ خالدہ کی تشفی آمیز آواز سنائی دی۔

''شہزاد! پلیز، مضبوط بنو اور اللہ پر بھروسا رکھو۔ مجھ سے عابدہ اور تمہارے لیے جو ہو سکا وہ میں ضرور کروں گی۔ لیکن جہاں تک تمہارے کرنے کا کام ہے وہ تمہیں ضرور انجام دینا ہوگا۔''

''کیا میری عابدہ سے بات ہو سکتی ہے؟''

''نہیں۔ اب تو مجھے بھی ملنے نہیں دیا جاتا۔ مگر میں کوئی نہ کوئی سورس استعمال کر کے مل ہی لیتی ہوں۔ لیکن اب تو یہ بھی ممکن ہوتا نہیں نظر آ رہا۔ ہاں ایک بات پوچھنا تھی تم سے؟'' وہ آخر میں اچانک بولی میں نے فوراً اثباتی جواب دیا تو اس نے پُرسوچ لہجے اور مشورہ دینے والے انداز میں کہا۔

''شہزاد! عابدہ کی رہائی کے سلسلے میں مجھے ایک راہ اور بھی سجھائی دیتی ہے۔ لیکن پھر تمہارے ملک کے حالات اور مسخ شدہ سیاسی فضا دیکھتی ہوں تو چپ ہو جاتی ہوں''۔ وہ رُکی تو میں نے تیزی سے کہا۔

''جی جی بولیں۔ میں سُن رہا ہوں۔''

''شہزاد! ان حالات میں جبکہ عابدہ کا کیس خصوصی عدالت میں ٹرانسفر کر دیا گیا ہے تو میں سمجھتی ہوں کہ ہمیں کچھ مزید اسپیشل قسم کے ایفرٹس بھی لینا چاہئیں۔''

''مثلاً'' میں نے فوراً کہا۔

''یہ کہ تم عابدہ کا معاملہ ہاٹ ایشو پر اپنے ملک کے معتبر حلقوں میں ہائی لائٹ کرو۔ تاکہ اُسے سیاسی اور ریاستی سپورٹ حاصل ہو۔ انسانی حقوق کی تنظیمیں بھی وہاں کارفرما ہوں گی۔ ملکی سطح پر اس ایشو کو اُٹھانے سے ہو سکتا ہے دباؤ بڑھے اور عابدہ کے سلسلے میں کچھ نرمی کی جائے۔'' آنسہ خالدہ ..... نے کہا تو اس کی بات سن کر میں بے اختیار ایک گہری سانس خارج کر کے رہ گیا اور پھیکے لہجے میں بولا۔

''آنسہ خالدہ! آپ کا مشورہ اپنی جگہ۔ لیکن جیسا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے آپ نے میرے ملک کے داخلی حالات اور یہاں کی مسخ شدہ سیاسی فضا کا ذکر کیا تو وہ اتنا کچھ غلط بھی نہیں، ظاہر ہے آپ ایک بین الاقوامی سطح کی رپورٹر اور سیاسی مبصر بھی ہیں اور دنیائے عالم کے بعض سیاسی اور سماجی حالات و واقعات پر آپ گہری نظر رکھتی ہوں گی، کہنے کا مطلب یہ کہ جس آپشن کا اب ذکر کر رہی ہیں اس پر میں اور میرے ساتھی بہت پہلے سے غور کر چکے ہیں بلکہ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے کہ آپ کے ساتھ بھی مختصراً ابھی اس پر تبادلۂ خیال ہو چکا ہے، لیکن میں کہتا چلوں کہ یہ خوامخواہ خود کو پرومیننٹ کرنے والی بات ہو گی، اس کا نتیجہ کچھ نہیں نکلے گا۔ ہاں، عابدہ کی رہائی کی آڑ میں بعض ابن الوقت قسم کے لوگ اپنی سیاسی دُکان ضرور چمکا لیں گے، کچھ معتبر حلقے اور سماجی تنظیمیں اس سلسلے میں واویلا مچا کر اور خود کو ریٹنگ کی بھیڑ چال میں کچھ آگے لے آئیں گی۔ لیکن پھر وہی خاموشی چھا جائے گی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ عابدہ کو درپردہ اپنے خفیہ اور مذموم مقاصد میں استعمال کرنے والی استعماری اور طاغوتی قوتیں مزید مستحکم اور طاقت پکڑ لیں گی۔ اس لیے میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ آپ سے کیا ہو سکتا ہے۔ اس کے بعد میں خود حرکت میں آؤں گا اور پھر خالصتاً اپنی صوابدید پر اس کام کا بیڑا اُٹھاؤں گا۔''

آنسہ خالدہ سے یہ سب کہتے ہوئے میری آواز میں جوش کی سی کیفیات عود کر آنے لگی تھیں۔ ایک پختہ عزم کی جھلک میرے لفظ لفظ سے عیاں ہوتی محسوس کر کے آنسہ خالدہ نے بڑے حوصلہ افزا اور توصیفی انداز میں مجھ سے کہا۔

''شہزاد! تمہارے اس عزم کو میں بھی سلام پیش کرتی ہوں۔ اگر ایسی بات ہے تو پھر تم ابھی سے خود کو ذہنی طور پر تیار کر لو۔ اور نہ کبھی خود کو اکیلا نہ سمجھنا۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ پھر اس آپشن کو محفوظ سمجھو۔ گڈ لک۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے رابطہ منقطع کر دیا اور میں ایک لمبی ہمکاری خارج کر کے دوبارہ اپنے ساتھیوں سے آن ملا۔ میرے چہرے

پر شدید مدوجزر کی سی کیفیات تھیں۔ وہ سب میری طرف ہی تکے جا رہے تھے۔

ایسے نازک وقت میں آنسہ خالدہ کی کال نے مجھے ایک طرح سے دہری پریشانی میں مبتلا کر دیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ آنسہ خالدہ کو میں نے عارفہ کے سلسلے میں جو تسلی دی تھی وہ کھوکھلی تھی۔ کیونکہ ابھی تک اس حرافہ نے مجھے کوئی تسلی بخش جواب نہیں دیا تھا۔ حالانکہ میں نے اس کی دُکھتی رگ کو بھی چھیڑنے کی کوشش کی تھی۔ یعنی اڈیسہ کمپنی کے شیئرز، عابدہ کے حق میں گواہی دینے کے بدلے میں اس کے حوالے کرنے کا وعدہ کر چکا تھا۔

''او خیر کا کے! کس کی کال تھی؟'' اول خیر میرے چہرے کو بہ غور تکتا ہوا بولا۔ میں نے اس موقع پر آنسہ خالدہ کی کال کا ذکر کرنا مناسب نہ سمجھا اور ٹال گیا۔ اول خیر بھی کچھ بھانپ کر چپ ہو رہا۔

ہم آئندہ کی صورتِ حالات پر تبادلۂ خیال کر چکے تھے۔ اب ہمیں کرنل بھجوانی کے فون کا انتظار تھا۔ جب تھوڑی دیر مزید بیتی تو میں نے خود ہی اس خبیث سے رابطہ کر لیا۔

''کیا تم ہمیں بیچ منجدھار میں پھنسا کر بھول گئے ہو یا اپنا ارادہ بدل کر کسی دوسرے آپشن پر غور کرنے لگے ہو؟'' میں نے سلگتے ہوئے لہجے میں کہا۔ مجھ پر بیزار کن سی چڑچڑاہٹ سوار ہونے لگی تھی۔ وہ بولا۔

''دھیرج، مہاشے جی! میں تمہارا کام آسان کرنے کی تگ و دو میں تھا۔ تم لوگوں کو نہر پار کرنے کی زحمت سے بچانے کے لیے ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ یہ معاملہ نہر کے دونوں کناروں پر ہی بھگتا دیا جائے۔''

''کیا مطلب؟ میں سمجھا نہیں۔ ذرا کھل کر بات کرو۔'' میں نے اُلجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔

''تم اور ہم نہر کے دونوں کناروں پر آ کھڑے ہوں گے۔ اس طرح تم اپنا آدمی دیکھ لینا اور ہم اپنا آدمی دیکھ لیں گے۔ اس کے بعد تمہارا دوسرا آدمی وہیں کنارے پر کھڑا رہے گا اور چونکہ تمہیں تیرنا آتا ہے۔ اس لیے تم ہمارے آدمی کو اپنے ساتھ لے کر نہر میں اُتر جاؤ گے۔ اُدھر یہ عین ہمارا بھی آدمی اسی طرح تمہارے آدمی کو نہر میں لے کر اُتر جائے گا۔ پھر جب دونوں طرف کا یہ تبادلہ اپنے اختتام کو پہنچے گا تو پھر ادھر سے تم لوٹ جاؤ گے اور اُدھر سے ہمارا آدمی، کلیئر؟''

میں نے پل کے پل اس مردود اور مکار آدمی کی بات پر غور کیا تو ایک جھما کا میرے ذہن میں ہوا۔ اس نے ملتان روڈ پر ہمارے ساتھ ایک ناکام جوا کھیلنے کے بعد شاید اب اپنی حکمتِ عملی بدل لی تھی، ممکن ہے کہ اس کی اس بات میں حقیقت رہی ہو کہ میرا باپ اب ان کے کام کا نہیں رہا تھا۔ (بلکہ بہ قول اسی بے رحم آدمی کے، وہ کسی کے بھی کام کا نہیں رہا تھا۔ لیکن یہ تو میرا دل ہی جانتا تھا کہ میرا باپ میرے لیے کیا اہمیت رکھتا تھا۔) اسی لیے وہ اب سنجیدہ بھی ہو رہا ہو کہ چلو ایک ''بے کار'' (اس کی نظر میں) کے بدلے میں اپنا ''کارآمد سپر ایجنٹ سندر داس سکینہ کو حاصل کر لے۔ لیکن بات اتنی بھی نہیں تھی، یہ بھی عین ممکن تھا کہ کرنل بھجوانی کے آدمی مجھے بھی کنارے پر پہنچتے ہی سندر داس سمیت دبوچ لیتے۔ اور اپنے کسی ''غیر اہم'' آدمی کو میرے بدلے میں چارے کے طور پر استعمال کر کے مجھے اپنے ساتھ سرحد پار لے جاتے۔ آگے سوچنے کے لیے اور بھی بہت کچھ تھا۔

''کیا سوچنے لگے مہاشے! فیصلہ کرو جلدی۔ تمہاری طرح ہم بھی اپنے آدمیوں کو داؤ پہ لگائے ہوئے ہیں۔'' میری طرف سے پُرسوچ خاموشی کا طویل وقفہ ہوتے محسوس کر کے دوسری جانب سے اس مردود و ملعون کی کھرکھراتی ہوئی آواز اُبھری تھی۔

میں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے، مجھے قبول ہے۔ کب تک کرنا ہے یہ سب؟''

''میرے خیال میں یہ خفیہ ری پلیس منٹ شام کی ملگجی تاریکی میں ہی مناسب رہے گی۔ کچھ وقت ہمیں ادھر ہی کہیں چھپ کے بتانا ہوگا۔''

اس شاطر انسان کی بات پر میرے سوچتے ذہن میں ایک پُرخیال روشنی کا جھماکا ہوا اور میں نے بھی فوراً سے پیشتر اس کی تائید میں ہامی بھر لی۔ اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔

سیل فون کا وائیڈ اسپیکر آن ہونے کی وجہ سے وہاں موجود میرے تینوں ساتھیوں (اول خیر، شکیلہ اور کبیل دادا) نے بھی یہ دوطرفہ گفتگو پوری صراحت کے ساتھ سُن لی تھی۔

''او خیر کا کے! یہ دغا باز آدمی ایک پنتھ دو کاج کے مصداق، تمہیں بھی ٹریپ کرنا چاہتا ہے۔ اس کے اس جھانسے میں مت آنا!'' اول خیر نے چھوٹتے ہی مجھ سے کہا تو شکیلہ نے بھی میری طرف دیکھتے ہوئے اپنے سر کو تائیدی انداز میں جنبش دی، البتہ کبیل دادا نے خلافِ توقع اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ میں نے دُزدیدہ نظروں سے اس کی

طرف دیکھا تو مجھے اس کا چہرہ کسی گہری سوچ کا غماز نظر آیا۔ میں لمحے بھر کو دانستہ خاموشی اختیار کیے اس کے بولنے کا منتظر رہا تھا اور وہی ہوا۔

''میرا تجربہ ہے کہ دُشمن چالاک ہونے کے ساتھ اگر بلا کا دغاباز بھی ہو تو اپنی اسی فطرت کے باعث وہ کہیں نہ کہیں دھوکا ضرور کھا جاتا ہے۔ عرفِ عام میں اسے سیانا کوّا کہتے ہیں جو بیٹ کو دانہ سمجھ کر اس پر آن بیٹھتا ہے۔ اب کرنل سی جی بھجوانی بھی ہم سے ایک ہاتھ کھانے والا ہے۔ پہلے اس نے ہم پر ہلا بول کر ایک جوا کھیلا تھا اس بار ہم اس پر شب خون مار کے یہ بازی سود کے ساتھ جیتنے کی کوشش کریں گے۔''

کمبیل دادا کی اسرار بھری گفتگو پر اول خیر اور شکیلہ ہونقوں کے انداز میں اس کا منہ تکنے لگے تھے۔ جبکہ میری باریک مونچھوں تلے ہونٹوں پہ معنی خیز مسکراہٹ رقصاں ہو گئی۔ جو خیال کرنل سی جی کی گفتگو کے فوراً بعد میرے ذہن طباع میں کلک ہوا تھا، یہ عین وہی کمبیل دادا کے بھی ذہن رسا میں اُبھرا تھا تو اس کا مطلب تھا وہ غلط نہیں ہو سکتا تھا۔ جب شکیلہ اور اول خیر کوئی تبصرہ کیے بغیر اسی طرح کمبیل دادا کے مزید بولنے کے منتظر رہے تو میں نے بھی اسی طرح معنی خیز مسکراہٹ سے کہا۔

''دادا! میں شاید تمہاری بات کا مطلب سمجھ رہا ہوں۔'' میں دانستہ مبہم لہجے میں بولا تھا، جس پر اس نے میری طرف بے تاثر نظروں سے دیکھا تھا۔ میں نے توثیق چاہی اور بولا۔ ''اس نے ہمارے ساتھ ایک نیا جوا کھیلنے کی غرض سے جو مہلت لی ہے، ہم بھی اسی مہلت سے فائدہ اُٹھانے کا موقع ہاتھ سے جانے نہ دیں۔''

''تم ٹھیک سمجھے۔'' وہ بولا۔ ''یہ تو اپنی جگہ حقیقت ہے کہ جو گیم ہم اس کے ساتھ کھیلنا چاہ رہے ہیں وہی وہ بھی ہمارے ساتھ کھیل رہا ہے، یہ الگ بات ہے کہ اُسے ہم سے پہلے اس پر عمل کرنے کا موقع ملا، مگر اس کی بدقسمتی اور ہماری خوش قسمتی کہ وہ ناکام رہا، اب وہ آخری وار اور آخری چال آزمانے کے لیے پَر تولے ہوئے ہے۔ جبکہ ہمیں ابھی موقع ملا ہے۔ دیکھنا صرف یہ ہے کہ اب وقت کس کا ساتھ دیتا ہے؟''

''یہ تم دونوں آخر آپس میں کیا پہیلیاں بُجھوا رہے ہو۔ ہمیں بھی بتاؤ گے کچھ یا نہیں؟'' شکیلہ، جو کافی دیر سے خاموش کھڑی میرے اور کمبیل دادا کے درمیان ہونے والی ذومعنی گفتگو کو ایک ''بے چین'' سی خاموشی کے ساتھ سُنے جا رہی تھی، بالآخر بول ہی پڑی۔

شکیلہ کی بات پر کمبیل دادا نے ذرا گردن موڑ کے اس کے سراپا پر ایک گہری نظر ڈالی، پھر نہر کی طرف اپنا منہ پھیر کر سپاٹ لہجے میں مختصراً بولا۔ ''اپنے آپ کو حملے کے لیے ذہنی طور پر تیار کرلو۔''

''ہم تیار ہی ہیں۔'' شکیلہ نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

میں نے اول خیر اور شکیلہ کو اپنے اور کمبیل دادا کے متوقع پلان سے آگاہ کر دیا۔ دُشمن پر آخری اور فیصلہ کن ضرب لگانے کا وقت آ گیا ہے۔

ہمارے پاس بہت وقت تھا۔ ایک تجربے کے مطابق زیادہ وقت میں احتیاط ملحوظ رکھنے کے بھی مواقع زیادہ ہوتے ہیں اور مشن بغیر کسی بھاری نقصان کے پایۂ تکمیل تک پہنچنے کی اُمید ہوتی ہے۔ اسی لیے ہم نے ایک بار پھر اس پر ایک دوسرے سے تبادلۂ خیال کیا اور اپنی اس پیش قدمی کو بالآخر حتمی شکل دے ڈالی۔ اس کے مطابق اول خیر اور شکیلہ کو قیدی سندر داس کے پاس ہی موجود رہنا تھا۔

اول خیر اور شکیلہ کو میرے بجائے کمبیل دادا نے کچھ ضروری ہدایات دیں۔ میں نے دانستہ کمبیل دادا کو آگے کر رکھا تھا، تاکہ اس کے اندر اس مہم سے متعلق جو بددلی پیدا ہونے لگی تھی وہ دور ہوتی رہے اور اس کے اندر اعتماد پیدا ہو۔ پھر اول خیر کے ساتھ بھی اس کی بات چیت کا ناتا جڑا رہے۔ کرنل سی جی کے اگلے فون اور اس کی بدنیتی محسوس کرتے ہی کمبیل دادا ابھی جوش میں آ گیا تھا۔

ہمیں اس خطرے کا بھی پوری طرح احساس تھا کہ ممکن ہے بلیوٹکسی کے ایجنٹ نہر پار کے کنارے کے علاوہ اس کنارے پر بھی کہیں موجود ہو سکتے تھے۔ اسی لیے کمبیل دادا کے علاوہ میں نے بھی اول خیر اور شکیلہ کو سختی سے اس بات کی ہدایت کر دی تھی کہ بغیر آپس میں اُلجھے، اپنے گرد و پیش سے ازحد محتاط رہیں۔ بلیوٹکسی کے ایجنٹ یہاں ان کے ساتھ کوئی خفیہ کارروائی کر سکتے تھے۔ یہ مقام ایسا تھا کہ ہم یا ہمارے دُشمن یک دم ایک دوسرے پر ہلا بولنے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ یہ سرحدی علاقہ تھا اور یہاں بارود کے دھماکے بارڈر سیکیورٹی فورسز والوں کو اس طرف متوجہ کر سکتے تھے۔ آخری ہدایت میری ان دونوں کے لیے یہی تھی کہ وہ جیسے ہی اپنے اردگرد کوئی خطرہ محسوس کریں، سیل فون پر ہمیں ضرور آگاہ کریں۔

چنانچہ سندر داس کو ہم نے کار کی ڈگی میں اسی طرح

رسن بستہ حالت میں ہی ٹھونس دیا تھا۔ البتہ اول خیر کو کہہ دیا تھا کہ وہ کچھ وقفے سے ڈگی کھول کر اس کی خیریت معلوم کرتا رہے، کہیں حبس دم کا شکار نہ ہو بیٹھے۔

اس کے بعد میں اور کبیل دادا۔ نہر کے بلند کراڑے کی طرف بڑھنے لگے۔ ہم نے اپنے پیراکی کے لباس بھی سنبھال لیے تھے۔

کھلی تازہ ہوا کی سبک خرامی کافی فرحت بخش محسوس ہو رہی تھی۔ ہلکی بارش کے بعد فضا دھلی نکھری نظر آرہی تھی اُوپر کھلا نیلا آسمان تھا اور اس فضائے بسیط پر پھیلی نیلی چھتری تلے، سفید سفید بادلوں کے ٹکڑے راج ہنسوں کے جوڑوں کی طرح تیرتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ فضا میں نہر کے پانی کی نمی میں خودرو پودوں کی باس نتھنوں سے ٹکرا رہی تھی اور اس کی خوشبو بڑی بھلی معلوم ہوتی تھی۔

کراڑے کی بلندی پر پہنچتے ہی ہم سینے کے بل لیٹ گئے اور گردوپیش کے علاوہ سامنے نظریں جما دیں۔ یہ بات ایک خدشے کی صورت ہمارے ذہن میں بھی تھی کہ جو ہم کرنے جا رہے تھے، بہ عین ایسا ہی ہمارے دُشمن بھی کر سکتے تھے، یہ ایک دوسرے کو اندھیرے میں رکھ کر تیر چلانے جیسی صورت حال تھی۔

ہمارے سامنے بی آر بی کی نہر کا چوڑا پاٹ سبک روی کے ساتھ بہہ رہا تھا۔ زندہ دلان لاہور نے یہ نہر اس وقت کھودی، جب یہ اعلان ہوا کہ اس مقام پر نہر کھودنے سے پاکستان کو بھارتی افواج کی طرف سے ممکنہ شر انگیزی سے نجات حاصل ہو جائے گی۔ ان کی اپیل پر شہریوں نے آٹھ کلومیٹر فاصلے پر محیط یہ نہر محض چند دنوں میں بلا معاوضہ ہی کھود ڈالی تھی۔

ہماری پیش قدمی کا رخ اسی سمت تھا جس طرف کرنل بھجوانی نے ہمیں پہلے نہر عبور کر کے آنے کا کہا تھا اور بعد میں ہم نے اس کا یہ مطالبہ رد کر دیا تھا۔ لہٰذا اس سے ہم نے یہی اندازہ قائم کیا تھا کہ یقیناً نہر پار اسی طرف ہی اس کے حواریوں کا کوئی ٹھکانا ہو سکتا تھا۔ ایک اُمید یہ بھی بندھی تھی، جیسا کہ میں پہلے ہی کرنل بھجوانی کی باتوں سے اندازہ لگا چکا تھا کہ میرے باپ کو بہت پہلے ہی سے سرحد پار پہنچا دیا گیا ہوگا اور اب وہ ان کے حوالے تھا۔ اس بات پر بھی مجھے ایک گونہ مسرت کا احساس ہوا تھا۔

سندر داس جیسا آدمی بھی ان کے لیے معمولی حیثیت کا نہیں تھا۔ جسے کرنل بھجوانی ہر قیمت پر حاصل کرنا چاہتا تھا۔

کراڑے کی بلندی سے گردوپیش پر ایک نگاہ ڈالنے

ایک خوب صورت بات

ایک جوکر نے لوگوں کو ایک جوک سنایا۔

لوگ بہت زیادہ ہنسے۔ اس نے وہ جوک پھر سے سنایا۔ تو کم لوگ ہنسے۔ اس نے وہی جوک تیسری دفعہ سنایا تو کوئی بھی نہ ہنسا۔ تو پھر اس جوکر نے بہت خوب صورت بات کہی کہ ”اگر تم ایک خوشی کو لے کر بار بار خوش نہیں ہو سکتے تو پھر ایک غم کو لے کر بار بار روتے کیوں ہو؟ زندگی زخموں سے بھری ہے، وقت کو مرہم بنانا سیکھو۔ اے دوست موت سے ہارنا ہی ہے۔ زندگی سے تو جینا سیکھو۔“

لاہور سے عبدالجبار رومی انصاری کی خوب صورت بات

کے بعد ہم نیچے کی طرف اُترنے لگے اور ایک دوسرے کے سہارے بلندی سے نیچے کنارے پر اُتر آئے۔ سامنے نہر کے بہتے پانیوں پہ ایک نگاہ ڈالنے کے بعد میں نے کبیل دادا کی طرف دیکھا۔ وہ میرا اشارہ بھانپتے ہی پیراکی کا لباس پہننے لگا، میں نے بھی چند سیکنڈ میں یہ کام نمٹا لیا، ہتھیاروں کو ہم نے واٹر پروف کر کے اپنی جیکٹوں کے اندر رکھ لیا اور اُوپر زپ کر دی۔

تھوڑی دیر بعد کبیل دادا نے مجھے اشارہ کیا اور ہم نہر کے پانی میں اُتر گئے۔ اچانک اُمڈتی سردی میں نہر کے پانی کی برودت سے ایک لمحے کو جسم ٹھٹھر سا گیا۔ شکر تھا کہ ہمارا پیراکی کا لباس بھی واٹر پروف تھا اور اسی لیے کچھ زیادہ ٹھنڈ کا احساس نہیں ہوا۔ پانی میں اُترتے ہی ہم نے غوطہ لگا لیا تھا۔ اب چند سیکنڈوں کے بعد سطح آب پر اُبھرتے، اور پھر ڈبکی لگا کر غائب ہو جاتے، اسی طرح کچھ دیر بعد ہم دوسرے کنارے کے قریب ہلکے چھپاکے سے اُبھرے۔ پانی کی سطح سے ایک نظر اطراف میں ڈال کر ہم کنارے پر آگئے۔ یہ پُل اور آبادی سے خاصا دور کا علاقہ تھا۔

کنارے پہ آتے ہی ہم نے بہ سرعت حرکت کی اور پیراکی کا لباس اُتار کر کینوس بیگ میں ٹھونس دیا اس کے بعد کراڑے پر چڑھنے کے لیے قدم بڑھایا ہی تھا کہ اچانک میں ٹھٹکا اور فوراً کبیل دادا کے کاندھے پر ہاتھ دھرا۔ اس نے چونک کر گردن گھما کر میری طرف دیکھا، پھر میری ایک طرف جمی دم بہ خودی نظروں کے تعاقب میں دیکھا تو وہ بھی چونک گیا۔ میرے بائیں ہاتھ کی طرف اُوپر کراڑے سے دو افراد تیزی سے نیچے کنارے پر آرہے تھے اور ان کی

وضع قطع اور نظر آتی مخصوص ''تیاری'' سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ بھی ہماری طرح کسی ''اسپیشل مہم'' پر تھے۔ یہی وجہ تھی کہ میرا خیال لامحالہ کرنل بھوانی کے آدمیوں کی طرف چلا گیا۔

''ہُوں! تو گویا ان لوگوں نے بھی وہی ٹرک آزما ڈالی... یعنی انتظار کے کھیل کی آڑ میں خفیہ طور پر اپنے مقصد کے حصول کے لیے گوریلا کارروائی۔'' کبیل دادا زہرخند لہجے میں بڑبڑایا تو میں بولا۔

''دادا! ان دونوں کو دوسرے کنارے تک نہیں پہنچنا چاہیے۔''

''ان دونوں کو اُوپر پہنچانے سے پہلے ہمیں ان کے بارے میں تسلی کرلینی چاہیے۔ ہوسکتا ہے ان کا تعلق بی ایس ایف والوں سے ہو۔'' وہ گمبھیر لہجے میں بولا۔ مجھے کبیل دادا کی بات سے پورا اتفاق تھا، کیونکہ جوان دونوں مُشتبہ لوگوں کی وضع قطع تھی وہ کسی عام مقامی لوگوں جیسی نہیں نظر آتی تھی۔ چُست لباس اور پشت کے ساتھ بندھے مخصوص بیگ، صرف دو ہی قسم کے آدمیوں کی علامت کو ظاہر کرتے تھے، ایک سرحد پر تعینات افراد کی اور دوسرے ہمارے دُشمن۔ جو اس وقت یقیناً پوری تیاری کے ساتھ تھے۔

ہم دونوں تیزی کے ساتھ اسی سمت بڑھ گئے۔ گاچنی مٹی اور ریتیلے کراڑے کی ڈھلوانی سطح یہاں غیر ہموار سی تھی، اسی لیے میں اور کبیل دادا جھکے جھکے انداز میں ان دونوں مُشتبہ افراد کی طرف بڑھنے لگے۔ ابھی ہم نے کوئی ہتھیار نہیں نکالا تھا۔ چند سوگز کا یہ فاصلہ کچھ منٹوں میں تیزی سے پاٹنے کے بعد جب ہم ان دونوں مُشتبہ افراد کے ذرا نزدیک پہنچے تو وہ دونوں تب تک کنارے پر پہنچ کر پیراکی کا لباس پہننے میں مصروف تھے۔ میں نے دیکھا کبیل دادا کے... ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ عود کر آئی پھر وہ سرگوشی میں بولا۔

''شہزی! صیاد خود ہی آگیا دام میں۔ کیا اب بھی کسی شک وشبہے کی کوئی گنجائش باقی ہے تمہارے دل میں؟''

''بالکل بھی نہیں۔'' میں نے بھی بہ یک ترنت کہا۔

''کیونکہ سرکاری اہلکاروں کو کبھی بھی اس طرح یہ نہر پار کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ دونوں بلیو تکسی کے ایجنٹ ہی ہیں۔''

''باوجود اس کے ہمیں ان کو زندہ چھاپنا ہے۔'' وہ بولا اور میں نے اثبات میں اپنے سر کو جنبش دی تھی۔ اب ان کی نظروں میں آئے بغیر انہیں چھاپنا ناممکن ہی تھا، کیونکہ اب آس پاس ایسی کوئی آڑ نہ تھی اور کنارہ سپاٹ تھا جہاں وہ دونوں اپنا اپنا پیراکی کا لباس تقریباً پہن ہی چکے تھے۔ میں اور کبیل دادا ایک دوسرے کو آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کرتے ہوئے پستول تھامے، ایک دم ہی ان کی جانب لپکے، ہم پر ان کی نظر پڑی تو وہ بری طرح بدکے۔ پھر دونوں ہی نے بیک وقت اپنے لباس کے اندر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی تھی کہ کبیل دادا نے بھاری اور رعب دار آواز میں انہیں جامد رہنے کا حکم دے ڈالا۔

''خبردار! تم دونوں نشانے پر ہو۔ کوئی غلط حرکت تمہیں مہنگی پڑسکتی ہے۔''

''تم دونوں کون ہو؟ ہم سیکیورٹی فورسز کے آدمی ہیں۔'' ان میں سے ایک نے ہماری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس نے اپنا لہجہ بارعب بنانے کی کوشش کی تھی، لیکن میں اس کے لہجے اور آواز کی تہ میں چھپی پریشانی کے عنصر کو بھانپ گیا تھا۔ لہٰذا اس بار میں اپنے ڈبل نال والے اسپنگ سلیٹر کا رخ اسی کی جانب کرتے ہوئے زہریلے لہجے میں بولا۔

''سیکیورٹی فورسز والے تو ہم ہیں۔ اور جانتے ہیں اچھی طرح کہ ایسے کسی بھی موقع پر وہ اتنی جلدی اپنی شناخت اپنے منہ سے نہیں کیا کرتے۔''

میری اس جوابی لفاظی نے بولنے والے کا ہی نہیں بلکہ اس کے ساتھی کا بھی اعتماد یکلخت متزلزل کرکے رکھ دیا اور اب ان کے بشروں کی پریشانی اور تشویش بھی واضح ہونے لگی تھی...... کبیل دادا نے تحکمانہ دُرشتی سے کہا۔

''اب تم دونوں اپنے ہاتھ بلند کرکے گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ جاؤ، جلدی۔''

دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر اپنے ہاتھ بلند کرکے کھڑے کھڑے ریتیلی سی زمین پر جھکے۔ انداز ایسا ہی تھا کہ وہ حکم کی تعمیل کرنے لگے تھے مگر اچانک ایک نے کمال پُھرتی سے اُلٹی جست بھری اور غڑاپ سے نہر کے پانی میں جا کودا۔ میں یا کبیل دادا اس پر فائر جھونک سکتے تھے۔ لیکن ہم ابھی ایسا نہیں کرسکتے تھے۔ میں نے چلا کر کبیل دادا سے کہا۔

''تم اسے قابو کرو۔'' اور پھر آگے بڑھ کر میں نے بھی نہر میں چھلانگ لگا دی۔ میری یہ جارحانہ پیش قدمی خود میرے لیے بھی جان لیوا ثابت ہوسکتی تھی۔ نہر میں کودنے والا شخص اپنی گن نکال کر مجھ پر گولی چلاسکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میری حتی الامکان کوشش تھی کہ اُسے سرے سے سنبھلنے ہی نہ دوں اور جالوں۔

جس جگہ وہ کودا تھا، وہیں میں نے بھی اپنی جگہ سے اُچھل کر غوطہ لگایا تھا۔ اور ٹھیک اُسی پر جا پڑا۔ اُس کا وجود چھوتے ہی میں نے اپنی سی پہلی کوشش اسے دبوچنے کی کی تھی۔ وہ ڈیل ڈول میں مجھ سے دبتا ہوا تھا۔ اس سے لپٹتے ہی مجھے فوراً اس کے پاس آتشی اسلحے کی موجودگی کا احساس ہوا، وہ بھی مجھ پر جھپٹنے کی کوشش کر رہا تھا۔...... پھر وہ

جیسے ہی سانس لینے کے لیے سطحِ آب پر اُبھرا میں نے اس کے چہرے پر گھونسا جڑ دیا۔ اس کے حلق سے چیخ خارج ہوئی، لیکن اگلا وار اس نے مجھے اپنے سر کی ٹکر مار کے کیا جو میری ناک پہ لگا، ٹکر خاصی تڑک سے اور زوردار ماری گئی تھی، اسی لیے چند لمحوں کے لیے میرا دماغ جھنجھنا گیا۔ پانی کی سطح پر بری طرح ہلچل مچ گئی۔ وہ گول ہو گیا اور اندر ڈبکی لگائی تب ہی میں نے خود کو سنبھالا دیا اور پانی کے اندر ہی اسے دوبارہ دبوچنے کی کوشش چاہی تو میرا ایک ہاتھ کسی فولادی نال سے ٹکرا گیا۔ میری تو جیسے روح فنا ہو گئی، اس کمبخت نے پانی کے اندر بھی غیر معمولی پھرتی کا مظاہرہ کیا تھا، جس سے مجھے یہ اندازہ لگانے میں مطلق دیر نہیں لگی تھی کہ میرا مقابلہ کسی عام آدمی سے نہیں تھا، وہ مجھ پر پانی کے اندر کسی وقت بھی گولی چلا سکتا تھا اور یہ..... تصور کرتے ہی میں پانی کے اندر جتنی تیز پھرتی کا مظاہرہ کر سکتا تھا، کرتے ہوئے اس کی نال کا رخ موڑ دیا۔ اسی وقت پانی کے اندر ایسی آواز اُبھری تھی جیسے کوئی پانی سے بھری ٹیوب پھٹی ہو۔ پانی مزید گدلا سا ہوتا محسوس ہوا، میری بروقت حاضر دماغی اور پھرتی نے مجھے گولی کے گھاؤ سے بال بال بچا لیا تھا۔ میں نے اس کی گن کی نال نہیں چھوڑی تھی اور اسی طرح اگلے ثانیے میں اس کی کلائی بھی میرے قابو میں آگئی۔ جبس دم کی مشق کو یہاں کام میں لاتے ہوئے میں نے پوری طاقت سے اس کی کلائی موڑ ڈالی۔ پانی کے اندر ''بڑ بڑ'' کرتے بلبلے چھوٹنے کا مطلب مدِمقابل کے حلق سے اُگلتی چیخ کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ گن اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر تہہ آب ہو چکی تھی۔ لیکن ممکن تھا اس کے جسم کے ساتھ کوئی اور ہتھیار بھی چپکا ہو۔ اسی لیے میں حریف کو سنبھلنے کا موقع ہی نہیں دینا چاہتا تھا، اُسے گھائل کرنے کے بعد میں نے اپنے دائیں بازو کے حلقے میں اس کی گردن دبوچنے کی کوشش چاہی تو اندر پانی کے ذرا کم ہوتے گدلے پن میں، میں نے اسے دوسرے ہاتھ سے پنڈلی کی جانب لمبے پھل والا تیز دھار چاقو نکالتے دیکھا۔ اور اسی وقت اس کی گردن میرے

مشاہدہ

''اجی! کیا کر رہے ہو؟'' بیوی نے شوہر سے پوچھا۔

''مکھیاں مار رہا ہوں۔''

''اب تک کتنی مار لیں؟''

''تین نر اور دو مادہ۔''

بیوی کی اکتاہٹ یکایک کافور ہو گئی۔ اس نے چونک کر سوال کیا۔ ''تمہیں نر اور مادہ کا کیسے پتا چلا؟''

''آسان سی بات ہے۔ دو فون پر دیر سے بیٹھی ہوئی تھیں، تین ان کے گرد منڈلا کر بار بار شربت کی بوتل پر جا بیٹھتی تھیں۔''

(خرم اختر، یو اے ای)

بازو کے حلقے میں آتے ہی میں نے اپنی توجہ اس کے چاقو والے ہاتھ سے ہٹا کر اپنے اسی مہلک داؤ پر مرکوز کر دی، کیونکہ جانتا تھا میں، اس داؤ کی کامیابی حریف کے ساتھ کیا گل کھلاتی تھی۔

اگلے ہی لمحے پانی کی ہلچل میں سکون ٹھہر نے لگا۔ میں نے ایک جھٹکے سے اپنے مدِمقابل کی گردن توڑ ڈالی تھی۔

پانی کے اندر اس کا مچلتا ہوا جسم ایک دم ڈھیلا پڑتے ہی میں نے اسے چھوڑ دیا اور سطحِ آب پر اُبھر کر رُکی ہوئی سانس خارج کرتے ہوئے ایک زوردار ہنکارا بھرا۔ میں اب گبیل دادا کی مدد کے لیے کنارے پر جانا چاہتا تھا۔ کیونکہ اگر تو یہ دونوں واقعی بلیو ٹکسی کے ایجنٹ تھے (جس کا کم از کم مجھے تو پورا یقین تھا) تو میرے خیال کے مطابق گبیل دادا کا اس پر جلدی قابو پانا آسان نہیں تھا، لیکن جب میں نے کنارے پر دیکھا تو چونک پڑا۔ گبیل دادا بڑے اطمینان سے کھڑا اپنی ٹھوڑی کھجاتے ہوئے میری ہی سمت دیکھ رہا تھا، جبکہ اس کا مدِمقابل اس کے قدموں کے قریب ہی ڈھیر پڑا ہوا تھا۔ اور پاس ہی ایک قرولی ٹائپ کا کمانڈو چھرا اور ایک پستول ریت پر پڑا نظر آیا۔ میں کنارے پہ آ گیا۔

''وہی ہوا، تم نے اسے مار ڈالا۔'' میرے قریب پہنچنے پر گبیل دادا نے میرے عقب میں دیکھتے ہوئے کہا تو میں نے بھی اپنی گردن موڑ کر نہر کی طرف دیکھا جہاں پانی کی سطح پر میرے حریف کی لاش اُبھر آئی تھی۔

''میں اسے مارنا نہیں چاہتا تھا، لیکن وہ پے در پے مجھ پر قاتلانہ حملے کیے جا رہا تھا، ایک موقع پر اُسے مجھ پر گولی چلانے کا بھی موقع مل گیا تھا، قسمت اچھی تھی بچ گیا۔'' میں نے کہا اور پھر اس کے زمین پر بے سدھ پڑے حریف پر ایک نگاہ ڈال کر مستفسر ہوا۔

''کیا یہ بھی؟''

''نہیں، بے ہوش ہو گیا ہے۔'' اس نے کہا۔ ''ہماری مجبوری یہ تھی کہ ہم اپنے ہتھیار استعمال نہیں کر سکتے تھے، ویسے یہ لڑائی بھڑائی کا ماہر معلوم ہوتا تھا۔''

''تم واقعی داد کے مستحق ہو کہ ایک تربیت یافتہ شخص کو اتنی آسانی سے ڈھیر کر کے رکھ دیا۔'' میں نے مسکرا کر کہا تو وہ مجھے قدرے تیز سی نظروں سے گھورتے ہوئے بولا۔

''تمہارا کیا مطلب ہے، میں گھاس چرا ہوا ہوں؟''

''نہیں تم تو ہو ہی بڑے اُستاد۔ میں ٹیکنیکل لڑائی کی بات کر رہا تھا، جبکہ تم دیسی۔''

''لڑائی، لڑائی ہوتی ہے، ٹیکنیکل ہو یا دیسی ساختہ۔ بس! موقع ملنے کی بات ہوتی ہے۔ اس نے بھی میری کم ڈھلائی نہیں کی تھی، لیکن ایک موقع پر میں نے اس کی ناک اور ٹھوڑی پر ڈبل پنچ رسید کر دیا تھا، شاید یہی ضرب کاری ثابت ہوئی تھی۔''

میں آگے بڑھا اور حریف کا معائنہ کیا۔ وہ اوندھا گا .... زمین پر دھرا پڑا تھا۔

میں نے جھک کر اسے سیدھا کیا تو اس کا چہرہ بری طرح مسخ نظر آیا۔ بلکہ اس کا منہ بھی خون آلودہ تھا، وہاں سے ابھی تک خون بہے جا رہا تھا۔ میں نے اس کی جامع تلاشی لی، ایک سیل فون اور کچھ غیر اہم چھوٹی موٹی اشیا برآمد ہوئی تھیں۔ مگر کسی قسم کی کوئی ایسی شے نہیں ملی جس سے اس کی شناخت ہونا ممکن ہوتی۔

''یہ بلیو ٹلسی کا ایجنٹ ہی ہے، یا ان کا کوئی ساتھی۔'' میں نے سیدھے ہو کر کبیل دادا سے کہا۔'' اسے ہوش میں لانا پڑے گا۔ یہ ہمیں بہت کچھ بتا سکتا ہے۔''

''میں نے اسی لیے تو اسے صرف انٹا غفیل کیا تھا۔'' کبیل دادا نے مختصراً کہا اور ایک نگاہ اطراف میں دور تک ڈالنے کے بعد وہ آگے بڑھا اور پھر بے ہوش حریف کو ٹانگوں سے پکڑ کر نہر کی طرف لے گیا۔ کنارہ قدرے اُونچا تھا۔ کبیل دادا نے اسے اسی طرح ٹانگوں سے پکڑ کر اُلٹا کر کے پانی کی سطح پر یوں لٹکا دیا کہ اب بے ہوش حریف کا فقط سر پانی میں تھا، میں خاموشی سے اس کی یہ حرکت دیکھ رہا تھا۔ اور تب ہی میں نے کبیل دادا کے دونوں ہاتھوں میں پکڑی ہوئی حریف کی ٹانگوں میں تھرتھلی مچتے دیکھی تو اس نے فوراً حریف کو اسی طرح اُوپر کھینچ لیا، اور واپس گیلی ریت پر پٹخ دیا۔

وہ اب بری طرح کھانسے جا رہا تھا۔ کبیل دادا اس کے قریب اکڑوں بیٹھ گیا اور اس کا چہرہ تھپتھپانے لگا، حریف ہوش میں آ کر بری طرح کراہنے لگا تو کبیل دادا اس کا مضحکہ اُڑانے والے انداز میں بولا۔

''اب یہ ایکٹنگ چھوڑو اور ہمارے سوالوں کا جواب دو، ورنہ تمہارا حشر بھی تمہارے دوسرے ساتھی جیسا ہوگا۔ کیونکہ تم دونوں کی اصلیت کھل چکی ہے۔''

''پپ... پانی۔ مجھے پانی پلاؤ۔'' وہ کراہا تو کبیل دادا نے اپنے ہونٹ بھینچ لیے اور اس کے مضروب چہرے پہ اپنے بھاری ہاتھ کا ایک گھونسا جڑ دیا۔ وہ چیخ پڑا۔

''تمہارا ساتھی تو جلدی میں آسان موت مر گیا، لیکن تمہاری تو ہم موت بھی مشکل کر دیں گے۔ بہتر یہی ہے ہمارے سوالوں کے ٹھیک ٹھیک جواب دیتے جاؤ۔'' کبیل دادا نے خوں ریز غراہٹ سے کہا۔

''پپ... پوپوچھو۔''

''ہمارے آدمی کو تم نے یہاں کس مقام پر رکھا ہوا ہے۔''

''کک... کون سا آدمی؟'' وہ پھر باز نہ آیا تو میں نے غصے سے دانت پیستے ہوئے آگے بڑھ کر اس کے چہرے پر اپنا بوٹ رکھ دیا، اس کا چہرہ دوسری طرف کو مڑ گیا، اور خاک چاٹنے لگا۔

''تم بلیو ٹلسی کے ایجنٹ اور بھارتی جاسوس ہو۔ بولو تو تمہاری شلوار ---- اُتاریں، اور تم اچھی طرح سمجھ رہے ہو کہ ہم کیا پوچھنا چاہ رہے ہیں، اب اگر تم نے ذرا بھی چالاکی یا ناٹک کرنے کی کوشش کی تو نہر میں غوطے دے کر تمہارا کام تمام کر ڈالیں گے اور آگے بڑھ جائیں گے، کیونکہ ہماری منزل دور نہیں۔ اب بولو، مگر صرف سچ۔''

وہ پھر بھی مان کے نہ دیا اور بدستور انجان بننے کی اداکاری کرتا رہا تو میں نے وہی کبیل دادا والی ٹیکنک آزما ڈالی، اسے ٹانگوں سے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا نہر کی طرف لے گیا اور اُلٹا جھلا دیا، ایک بار پھر اس کا سر پانی کے اندر تھا اور وہ بری طرح تڑپنے لگا۔ چند سیکنڈوں تک میں نے اس کا سر پانی کے اندر ہی رہنے دیا اس کے بعد اُوپر کھینچ لیا۔ وہ بری

طرح کھانسنے لگا، لیکن میں نے دو تین بار اس کے ساتھ یہ عمل کیا تو اس کی حالت بالکل ہی غیر ہونے لگی اس کے بعد میں نے اسے گیلی زمین پر پٹخ دیا اور اسے سنانے کے لیے کبیل دادا سے بولا۔

”ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ اب اگر اس نے اپنا منہ نہ کھولا تو اسے بھی ختم کر کے اس کی لاش نہر میں پھینک دینا۔“

کبیل دادا آگے بڑھا اور ایک بار پھر اس کے چہرے کے قریب جھک گیا۔ ”ہاں! اب کیا کہتے ہو؟ پانی کی موت بڑی اذیت ناک ہوتی ہے۔ سچ بولو گے تو کم از کم اس اذیت سے بچ جاؤ گے۔ تعاون کرنے پر ہو سکتا ہے کہ تمہارے ساتھ نرمی کی جائے۔“

”کک... کیا مجھے جانے دیا جائے گا؟“ اس نے پوچھا۔

”یہ بعد کی بات ہے۔ لیکن کم از کم اس طرح اذیت دے کر نہیں ماریں گے اور قانونی رویہ اختیار کریں گے تمہارے ساتھ۔“ کبیل دادا نے جواب دیا، تو وہ اپنے ہونٹوں پہ زبان پھیرتے ہوئے بولا۔

”یہاں ہمارے تین ساتھی اور بھی موجود ہیں۔ اور تمہارا آدمی بھی۔“ اتنا بتا کر وہ ہانپنے لگا اور میں اس کی بات پر مسرت سے کھل اُٹھا۔ میرا باپ وطن عزیز کی سرحد پر پہنچایا جا چکا تھا۔ یعنی میرا مشن ٹھیک سمت میں تھی۔

”ہمارے آدمی کا نام بتاؤ؟“ کبیل دادا نے مزید تسلی کی خاطر پوچھا تو وہ جواباً بولا۔

”تت... تاج دین شاہ۔“

اپنے باپ کا نام سن کر ایک بار پھر میرا دل و دماغ مسرت سے بھر گیا۔ میرا اندر عجیب و غریب کیفیات کا شکار ہونے لگا۔ فرط جذبات اور عقیدت و احترام سے میری آنکھوں کے گوشے نمناک ہونے لگے تھے۔ میں رقت زدہ سا ہونے لگا تھا۔

”کرنل سی جی بھوانی بھی ان تینوں کے ساتھ ہے؟“ کبیل نے پوچھا۔

”نہیں۔ وہ سرحد پار اٹاری کے ایک انٹروگیشن سیل سینٹر میں موجود ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

”لیکن ہم کیسے تمہاری بات پر بھروسا کر لیں، جبکہ تمہارے کرنل بھوانی نے تو سندر داس کے بدلے میں ڈیل کرنے کے باوجود ہم سے دھوکا کیا تھا اور ہم پر اپنے ایجنٹوں کے ذریعے حملہ بھی کروایا تھا اور تم دونوں بھی اسی نیت سے نہر پار کر رہے تھے کہ اپنا شکار لے اُڑو؟“

”ہاں! یہ بات صحیح ہے۔“ اس نے اعتراف کیا۔

”لیکن جب کرنل نے دیکھا کہ وہ تم پر اس طرح قابو پانے میں ناکام ہو گیا ہے اور اس بات کا بھی اُسے یقین ہونے لگا کہ تم واقعی اپنے باپ کو اس کی قید سے آزاد کرانے کے لیے اتنا بڑا رسک اُٹھائے ہوئے ہو تو اس نے بھی یہ والا آپشن محفوظ رکھا تھا کہ تمہارے ساتھ سیدھے سجاؤ ڈیلنگ کر کے تمہارے آدمی کے عوض اپنا آدمی لے کر اپنا راستہ لیا جائے۔“

’’لیکن پھر تم دونوں کو کیوں نہر کی دوسری طرف روانہ نہ کیا گیا؟‘‘ میں نے سوال کیا۔

’’کرنل اس آخری وقت میں بھی ایک اور جوا کھیلنا... چاہتا تھا۔ اس کی ناکامی کے بعد مقررہ وقت، یعنی شام تک اس ڈیل کو سیدھے انداز میں اپنے منطقی انجام تک پہنچا دیتا۔‘‘

اس نے سب کچھ وہی بتایا تھا جس کا میں وقت اور حالات کے مطابق تجزیہ کرتا رہا تھا۔

’’یعنی تمہارا مطلب ہے کہ بلیو ٹکلسی کے تین ایجنٹ وہاں ہمارے مطلوبہ آدمی کے ساتھ موجود ہیں؟‘‘ کبیل دادا نے پوچھا تو اثبات میں جواب ملتے ہی میں نے اس سے اُس مقام کا حدود اربع دریافت کیا۔ اس پر وہ خاصا متذبذب سا نظر آنے لگا پھر کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

’’میں خود یہاں پہلی بار آیا ہوں۔ میں اس مقام کی طرف تمہاری زبانی کلامی رہنمائی نہیں کرسکتا، بہتر ہوگا، میں بھی وہاں تک تم لوگوں کے ساتھ چلوں۔‘‘

’’کیا تمہیں غیر قانونی طور پر سرحد پار کرایا گیا ہے؟‘‘

’’نہیں، میں قانونی طور پر واہگہ بارڈر سے لایا گیا تھا۔ میرے ساتھ دو اور ساتھی بھی تھے۔‘‘

’’اور باقی وہ تین ساتھی، جو ہمارے مطلوبہ آدمی کو لے کر یہاں پہنچے ہیں۔‘‘

’’وہ غیر قانونی طور پر تکواڑ کے راستے اندر بھیجیں گئے ہیں، ان کی مجبوری یہ تھی کہ وہ ابھی تاج دین شاہ کو ظاہر کرنا نہیں چاہتے تھے۔‘‘ اس نے جواب دیا۔

’’چلو اُٹھو اب، ہمارے ساتھ چلو۔ اور بتاؤ کہ وہ کدھر ہیں تمہارے ساتھی۔‘‘

بالآخر میں نے اس کا بازو پکڑ کر اسے سہارا دینے کی غرض سے اُٹھایا اور اسی وقت اس نے اپنا داؤ کھیلتے ہوئے مجھے ایک زوردار ٹھوکر رسید کر ڈالی، میں اس کے اس اچانک حملے کے لیے تیار نہ تھا، لڑکھڑاتا ہوا قریب کھڑے کبیل دادا سے ٹکرا گیا، ہم دونوں تقریباً ایک ہی ڈیل ڈول کے لحیم شحیم... تھے، نتیجتاً میرے ٹکرانے سے لمحے بھر کو وہ بھی اپنا توازن قائم... نہ رکھ سکا اور چند قدم پیچھے کو لڑکھڑایا، مگر میری طرح وہ فوراً سنبھلا بھی تھا، لیکن اتنا ہی موقع بلیو ٹکلسی کے اس گھاگ ایجنٹ کے لیے کافی تھا۔ اس نے فوراً نہر میں چھلانگ لگا دی۔ ایک زوردار چھپاکے سے وہ سطحِ آب پر گرا اور یک دم ایک غوطہ مار کے غائب ہوگیا، میں نے اس کے پیچھے نہر میں چھلانگ لگانے کا ارادہ کیا مگر کبیل دادا نے مجھے روک دیا۔

’’جانے دو اسے۔ ہمارا پہلے ہی بہت سا وقت ضائع ہو چکا ہے۔‘‘

’’مگر...‘‘ میں نے کہنا چاہا تو وہ میری بات کاٹ کر بولا۔

’’اول خیر کو فون کر کے اس کے بارے میں مطلع کر دو، وہ اور شکیلہ اسے بہ آسانی گرفت میں لے لیں گے۔ یہ اکیلا ان دونوں کا کچھ نہیں بگاڑ پائے گا۔‘‘

میں پُرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچے اس طرف چند ثانیے تکتا رہا جہاں ہمارا شکار ڈبکی لگا کر غائب ہوا تھا، اس کے بعد اپنا سیل نکال کر میں نے اول خیر کو مختصراً اس مفرور دشمن کے بارے میں خبردار کر دیا۔

اس کے بعد میں نے کبیل دادا کی طرف اُلجھی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ مگر وہ زمین پر جُھک کر کچھ دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا، اس کے بعد ایک گہری سانس خارج کر کے سیدھا ہوا اور ایک جانب دیکھتے ہوئے بولا۔

’’آؤ میرے ساتھ۔ میں نے ان کا کھرا پا لیا ہے۔‘‘ یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا، میں اپنا سر دھنتا ہوا اس کے پیچھے ہولیا۔ میں کبیل دادا کی بات پر مطمئن تھا، وہ خالصتاً دیہاتی ماحول کا پروردہ تھا اور کھوجیوں والی صلاحیت کا اس میں پایا جانا عام بات تھی۔

’’میرا خیال ہے یہ دونوں بھی اسی ٹھکانے سے چلے ہوں گے جہاں ہم پہنچنا چاہتے ہیں۔‘‘ میں نے اس کے شانہ بشانہ چلتے ہوئے کہا تو وہ اثبات میں اپنا سر ہلاتے ہوئے بولا۔

’’ہاں! اسی لیے میں نے ان کا کھرا تلاشنے کی کوشش کی تھی۔ چلتے رہو تیز تیز۔‘‘

دن چڑھنے لگا تھا۔ سردی کم ہونے لگی تھی۔ ہم دونوں ٹیلوں ٹبوں کے درمیان سے ہوتے ہوئے تیز تیز مگر محتاط روی کے ساتھ آگے بڑھتے رہے۔ سرحدی علاقہ شروع ہوگیا تھا، اور سامنے ہمیں کبھی کبھی کسی ٹیلے کی آڑ سے خاردار باڑ بھی نظر آجاتی تھی۔ ایک مقام پر کبیل دادا رک گیا اور بہ ظاہر خاموش کھڑا اطراف کی سُن گُن لیتا رہا اس کے بعد بولا۔

’’کھرا یہاں سے دائیں جانب کو مڑ رہا ہے، ہوشیار رہنا شہزی! ہم اپنی منزل کے قریب پہنچ چکے ہیں۔‘‘ اسی وقت گولی چلنے کی آواز اُبھری تھی۔

خونی رشتوں کی خودغرضی اور پرائے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

میرا سایہ

منظر امام

زندگی میں بعض ایسے لمحے انسان کو جکڑ لیتے ہیں کہ جب قوتِ فیصلہ کا امتحان درپیش ہوتا ہے... انہی لمحوں کے طفیل زندگی کے راستے بدل جاتے ہیں... یا پھر سنور جاتے ہیں... ایک ایسی ہی تکون کا احاطہ کرتی تحریر... ہر فریق کو ہر دور میں کسی نہ کسی لمحۂ امتحان کا سامنا تھا..

مصیبت کی گھڑی میں سایہ بن کے ساتھ رہنے والے ایک انجان کی رنگ بدلتی کہانی...

زندگی عذاب ہو کر رہ گئی تھی۔ یا عذاب کر دی گئی تھی۔ چند بدمعاشوں کے ہاتھوں۔ اس دن تو اس شخص نے انتہا ہی کر دی تھی۔ اس نے اپنی گاڑی میرے برابر لا کر روک دی اور کھڑکی سے جھانک کر بولا۔ ''اکیلے کہاں جارہی ہو۔ چلو پہنچا دیتا ہوں تمہیں۔''

سچ تو یہ ہے کہ میں کانپ کر رہ گئی تھی۔ وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ دو اور بھی تھے جو پچھلی سیٹ پر بیٹھے کھا جانے والی نظروں سے مجھے گھور رہے تھے۔

میں اس وقت کالج سے واپس آرہی تھی۔ عام طور پر ڈرائیور لینے کے لیے آجایا کرتا ہے لیکن اس دن وہ بیمار تھا۔ اسی لیے مجھے اپنی ایک دوست کے ساتھ کالج آنا پڑا تھا۔

کالج کی چھٹی ہو چکی تھی۔ میری وہ دوست اپنی ٹیچر سے کچھ باتیں کررہی تھی۔ مجھے یاد آیا کہ مجھے روڈ کراس کر کے کتابوں کی دکان سے ایک کتاب لینی تھی۔ میں نے اپنی دوست سے کہا کہ میں دس منٹ میں کتاب لے کر واپس آرہی ہوں۔ میں نے ابھی سڑک کراس ہی کی تھی کہ وہ غنڈا اپنی گاڑی لے کر آگیا تھا اور مجھے اپنے ساتھ بیٹھنے کی آفر کررہا تھا۔ یہ تیسرا موقع تھا جب وہ کمینہ شخص اس طرح میرے سامنے آیا ہوگا۔ اس سے پہلے بھی دوبار مجھے تنگ کر چکا تھا۔ میرا راستہ روک چکا تھا۔

''ارے، میری بات کا جواب تو دو۔'' اس نے پھر کہا۔

''اوہ یو سن آف بچ۔'' میں نے اسے موٹی سی گالی دی۔

اس سے پہلے کہ وہ کچھ بول سکتا یا اس کی طرف سے کوئی حرکت سامنے آتی، کالج کی کچھ لڑکیاں میرے پاس آگئیں۔ انہیں دیکھ کر اس نے اپنی گاڑی آگے بڑھادی تھی اور میں غصے میں کھڑی رہ گئی تھی۔

''کیا ہوا شرمین۔'' ایک لڑکی نے پوچھا۔

''کچھ نہیں، وہی جو لڑکیوں کے ساتھ ہوا کرتا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''قدم قدم پر دو کوڑی کے غنڈے راستہ روکنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ بھی ان میں سے ایک تھا۔''

''ایسے کمینوں کو تو گولی ماردینی چاہیے۔''

''کس کس کو گولی مارتے رہیں گے۔ پورا شہر خالی ہو جائے گا۔ کیونکہ ایسے کمینے پورے شہر میں ہیں۔''

اس شام کالج سے گھر واپس آکر میں نے ماما سے کہا۔

''ماما! مجھے تو اس غنڈے نے پریشان کرکے رکھ دیا ہے۔''

ماما بھی یہ سن کر سوچنے لگی تھیں۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ انہیں یہ سب بتا کر پریشان کیا جائے۔ لیکن پانی سر سے اونچا ہوتا جارہا تھا۔ اس غنڈے کی ہمت بڑھنے لگی تھی۔

''ماما! میں یہ سوچ رہی ہوں کہ اس معاشرے میں کوئی لڑکی آخر کس طرح اپنی حفاظت کرسکتی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''میں ایک شاندار گھر میں رہتی ہوں۔ ایک شاندار گاڑی میں کالج جاتی ہوں۔ ڈرائیور میرے ساتھ ہوتا ہے۔ اس کے باوجود غنڈوں کی اتنی ہمت ہوجاتی ہے۔ میں تو یہ سوچ رہی ہوں کہ جس بے چاری کے پاس یہ سب نہیں ہوتا ہوگا، غریب گھر سے تعلق رکھتی ہوگی، آنے جانے کے لیے بس یا رکشے وغیرہ کا بندوبست کرتی ہوگی۔ اس کے لیے زندگی کتنی دشوار ہوتی ہوگی۔''

''ہاں بیٹا۔'' ماما نے ایک گہری سانس لی۔ ''یہ المیہ تو ہے۔''

''میں بابا سے بات کروں گی۔'' میں نے کہا۔

''کیوں، بابا کیا کرلیں گے؟''

''بہت کچھ کر سکتے ہیں، وہ ایک طاقتور اور بااثر انسان ہیں۔ زمیندار ہیں۔ پیسے والے ہیں۔ ان کے رسوخ بھی بہت زیادہ ہیں۔ وہ اور ان کے آدمی ایسے غنڈوں کو لگام دے سکتے ہیں۔''

''تم رہنے دو، ان سے میں بات کرلوں گی۔ اس کے بعد جب تم سے پوچھیں تو بتا دینا۔'' ماما نے کہا۔

میں اپنے کمرے میں آگئی۔ قدِ آدم آئینہ دیوار پر لگا ہوا تھا اور اس آئینے میں ایک خوب صورت سراپا دکھائی دے رہا تھا۔

وہ میں تھی۔ لڑکیاں مجھے بیوٹی کوئن کہا کرتیں۔ قدرت نے بہت کچھ دے رکھا تھا۔ اچھا گھر، دولت، زندگی کی ہر آسائش اور اس کے ساتھ خوب صورتی۔ کسی ٹاپ ماڈل جیسا سراپا۔ شاید اسی لیے لوگ مجھے دیکھ کر دنگ رہ جاتے تھے۔

وہ غنڈا شاید اسی لیے میرے پیچھے پڑا ہوا تھا لیکن اسے اندازہ نہیں تھا کہ میرا باپ کیسا آدمی ہے۔ بابا اس غنڈے کو کہاں برداشت کرسکتے تھے۔

ماما نے کہہ تو دیا کہ وہ بابا سے بات کرلیں گی لیکن مجھے یقین نہیں تھا کہ وہ بات کریں گی۔ ماما، بابا کے سامنے کچھ بول نہیں پاتی تھیں، گھبرائی گھبرائی رہتی تھیں۔

اسی لیے میں نے تہیہ کرلیا کہ میں خود بات کروں گی۔ ایسے معاملات میں خاموشی اچھی نہیں ہوا کرتی۔ لیکن اس سے پہلے کہ میں بابا سے اس موضوع پر بات کرپاتی، ایک عجیب بات ہوگئی۔

اس شام میرے پاس فون آگیا۔ یہ فون لینڈ لائن پر آیا تھا۔ میرے موبائل پر نہیں آیا تھا۔ میں اس وقت ٹی وی لاؤنج میں تھی جب فون کی گھنٹی بجی اور ملازمہ نے فون ریسیو کرنے کے بعد کہا۔ ''بی بی جی آپ کا فون ہے۔''

''کس کا ہے؟''

''مجھے نہیں معلوم جی، آپ کو پوچھ رہا ہے۔''

میں نے ریسیور اٹھالیا۔ ملازمہ باہر چلی گئی تھی۔

''ہیلو، کون صاحب؟''

''تم شرمین بول رہی ہونا؟'' دوسری طرف سے کسی نے پوچھا۔ آواز مردانہ تھی۔

''جی ہاں، میں شرمین بول رہی ہوں۔''
''آج کسی غنڈے نے تمہیں تنگ کرنے کی کوشش کی تھی نا؟''
''وہ تو ٹھیک ہے لیکن آپ کون ہیں، اور کیا کہنا چاہتے ہیں؟''
''اس غنڈے کا حشر دیکھنا ہو تو پرنسٹن شاپنگ مال کے سامنے پہنچ جاؤ۔'' دوسری طرف سے کہا گیا۔ ''دیر لگاؤ گی تو اسے اسپتال بھیج دیا جائے گا۔''
یہ کہہ کر فون بند کر دیا گیا۔ میں سوچتی رہ گئی۔ یہ کیسا فون تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ اس غنڈے کا حشر دیکھنا ہے تو پرنسٹن مال کے سامنے پہنچ جاؤں، لیکن کیوں؟ کیا واقعی اس غنڈے کے ساتھ کچھ ہوا تھا یا یہ فون کال اس غنڈے کی کوئی چال تھی کہ کسی طرح مجھے گھر سے باہر نکالا جائے۔
اسی دوران ماما میرے پاس آگئیں۔ ''کیا ہوا شرمین، خیریت تو ہے۔ اس طرح گم صم کھڑی ہوئی کیا سوچ رہی ہو؟''
''ماما! ایک عجیب بات ہوئی ہے۔''
''وہ کیا؟''
''میں نے جس غنڈے کے بارے میں بتایا تھا نا، اسی کے حوالے سے ایک فون آیا تھا میرے پاس۔'' پھر میں نے ماما کو بتا دیا کہ وہ کیسا فون تھا۔
''عجیب بات ہے۔ کیا تم نے فون کرنے والے کی آواز نہیں پہچانی؟''
''بالکل نہیں ماما، میرے لیے وہ کوئی اجنبی تھا۔''
''میرا خیال ہے کہ تمہیں نہیں جانا چاہیے۔'' ماما نے کہا۔ ''ہوسکتا ہے کہ تمہیں وہاں بلانے کے لیے کوئی جال بچھایا گیا ہو۔''
''ماما! میں بھی یہی سوچ رہی ہوں۔ ورنہ کسی کو کیا پڑی ہے کہ میرے لیے کسی غنڈے کو سبق سکھائے۔''
''شرمین میرا خیال ہے کہ میں پرنسٹن مال کے منیجر سے بات کرتی ہوں۔'' ماما نے کہا۔ ''وہ ہمیں اچھی طرح جانتا ہے۔ میں کسی بہانے اس سے پوچھ لوں گی کہ آج اس کے مال کے آس پاس کوئی مسئلہ تو نہیں ہوا تھا۔''
''ہاں، یہ ٹھیک رہے گا۔ دیکھیں وہ کیا بتاتا ہے۔''
ماما نے شاپنگ مال کا نمبر ملا کر منیجر سے بات کی۔
''قاضی صاحب، خیریت تو ہے نا، ہم لوگ آج شاپنگ کے لیے آرہے تھے لیکن ایسا لگا جیسے شاید کوئی گڑبڑ ہو، پھر ہم واپس چلے گئے۔ کیا؟...... اچھا! کس کا بیٹا تھا؟ اوہو! پتا نہیں چلا؟ چلیں ٹھیک ہے، شاید صبح ہم لوگ آئیں۔''
فون رکھ کر ماما نے میری طرف دیکھا۔ ''ہاں بیٹا، یہ خبر سچ نکلی۔''
''کیا ہوا؟ کیا بتایا منیجر نے؟''
''پولیس کے کسی بڑے آفیسر کا بیٹا ہے شاہ رخ۔ شاپنگ مال کے سامنے کچھ لوگوں نے اسے اور اس کے ساتھیوں کو گھیر کر اتنا مارا ہے کہ وہ بے ہوش ہو گئے۔ مار پیٹ کرنے والے فرار ہو گئے جبکہ شاہ رخ اور اس کے ساتھیوں کو اسپتال پہنچا دیا گیا ہے۔''
''مائی گاڈ!'' میں کانپ کر رہ گئی۔ ''ماما! یہ تو بہت خطرناک نیوز ہے۔''
''ہاں لیکن یہ کیسے پتا چلے کہ جس کے ساتھ یہ سب کچھ ہوا ہے یہ وہی غنڈا ہے جو تمہیں تنگ کرتا ہے۔''
اس کی بھی تصدیق کچھ دیر بعد ٹی وی سے ہو گئی۔ تقریباً ہر چینل نے یہ خبر لگائی تھی۔ کیونکہ شاہ رخ ایک بڑے پولیس آفیسر کا بیٹا تھا۔ اسے بہت بری طرح مارا گیا تھا، اس کی دونوں ٹانگیں فریکچر ہو گئی تھیں۔ چینلز نے اس کی تصویر بھی دکھائی تھی۔
''ماما! یہ وہی ہے۔'' میں نے تصویر دیکھ کر تصدیق کی۔ ''لیکن اس کو کن لوگوں نے مارا ہے؟''
''بیٹا، یہی بات تو الجھی ہوئی ہے۔'' ماما نے کہا۔
''اس کو مارنے والے کون ہو سکتے ہیں اور انہیں تم سے کیا ہمدردی ہوگئی ہے کہ تمہارے لیے کسی کو اس طرح ماریں۔''
''ماما، میرا خیال ہے کہ میں اب بابا کو کچھ نہیں بتاؤں گی۔'' میں نے کہا۔ ''ورنہ اور طرح طرح کے سوالات شروع ہو جائیں گے۔''
''ہاں بیٹا، بہتر یہی ہے کہ خاموش ہو جاؤ۔ جب قدرت نے خود ہی اس بدمعاش کا بندوبست کر دیا تو ہم کیوں بات کو آگے بڑھائیں۔''
''لیکن ماما، وہ کون ہے۔ اس نے میرے ساتھ اتنی ہمدردی کیوں کی؟''
''بیٹا وہ جو بھی ہو، تم بالکل خاموش رہنا۔ کسی کو پتا نہ چلے کہ یہ کیا کہانی تھی۔''
''ظاہر ہے ورنہ اس طرح تو میں خود پھنس جاؤں گی۔''
اس کے بعد بابا سے اس موضوع پر بات کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔ ایک الجھن تو دور ہو گئی تھی لیکن اب ایک دوسری الجھن سامنے آتی جا رہی تھی۔
یہ بہت بھیانک اور تکلیف دہ الجھن تھی۔ ایسا تو شاید

کبھی نہ ہوا ہوگا۔

کچھ دنوں سے بابا کا رویہ بہت عجیب ہوتا جا رہا تھا۔ اتنا عجیب کہ کوئی بیٹی اپنے باپ کے حوالے سے ایسی بات کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔

بابا کی نگاہیں بدلی ہوئی تھیں۔ یہ وہ نگاہیں تھیں جو ایک مرد کسی عورت پر ڈالتا ہے۔ انتہائی شرمناک بات تھی۔

خدا نے عورت کو اس خوبی سے تو ضرور نوازا ہے کہ وہ نگاہوں کے تیور بھانپ لیتی ہے۔ تو بابا کی نگاہیں یہ بتانے لگی تھیں کہ وہ مجھے دیکھتے نہیں ہیں، ٹٹولتے ہیں۔ اپنی تیز نگاہوں سے۔

میں نے ماما سے اپنے اس احساس کے حوالے سے کوئی بات نہیں کی۔ میں جانتی تھی کہ اگر ماما کو یہ معلوم ہوگیا تو ان کا کیا ردِعمل ہوگا۔ وہ کیا سوچیں گی؟ اور بڑی بات یہ ہے کہ کیا وہ میرا یقین کریں گی؟ لہٰذا میرے سامنے یہی راستہ تھا کہ میں بابا کے سامنے جانے سے پرہیز کروں۔ کیسی عجیب بات تھی کہ ایک بیٹی اپنے باپ سے چھپ رہی تھی۔

لیکن ایک گھر میں رہتے ہوئے ایک بیٹی اپنے باپ سے کس طرح چھپ کر رہ سکتی تھی۔

ایک شام ماما شاید کہیں گئی ہوئی تھیں۔ مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ بابا ہی وہ لاؤنج میں ہوں گے۔ میں لاؤنج میں آئی تو بابا صوفے پر بیٹھے ہوئے تھے۔

میں نے ان کو دیکھ کر کترا کر نکل جانا چاہا لیکن انہوں نے آواز دے دی۔ ''شرمین، ادھر آؤ، میرے پاس۔''

میں ہچکچاتی ہوئی ان کے پاس چلی گئی۔ ''کیا بات ہے، تم آج کل میرے سامنے نہیں آتی ہو؟'' بابا نے کہا۔

''نہیں تو بابا، ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔'' میں جلدی سے بولی۔ ''ذرا پڑھائی میں مصروف رہتی ہوں نا اسی لیے کمرے سے کم ہی نکلتی ہوں۔''

''پڑھائی میں تو پہلے بھی مصروف رہتی تھیں۔'' بابا نے کہا، پھر اچانک میرا ہاتھ تھام لیا۔

میں سن ہو کر رہ گئی۔ بابا کے ہاتھ کی گرفت کسی باپ کے ہاتھ کی گرفت نہیں تھی۔ بلکہ یہ لمس تو کچھ اور تھا۔ انتہائی بے باکانہ، شدتِ جذبات سے دہکتا ہوا ہاتھ۔

''بیٹھ جاؤ میرے پاس۔'' بابا نے مجھے اپنے ساتھ بٹھانے کی کوشش کی۔

''بابا...'' میری آواز اس وقت بھیگی ہوئی تھی۔ ''بابا، مجھے یاد آیا، میں اپنے کمرے میں استری جلتی ہوئی چھوڑ کر آگئی ہوں، ابھی آتی ہوں واپس۔''

اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہہ سکتے یا مجھے روک سکتے میں اپنے کمرے میں آگئی۔ میں نے دروازہ اندر سے بند کرلیا تھا۔ جو کچھ بھی تھا۔ وہ بہت حیرت انگیز اور شرمناک تھا۔ ایک باپ ہی جب ایسا کرنے لگے تو پھر کس رشتے پر بھروسا کیا جاسکتا ہے۔ سارے ویلیوز تو ختم ہوتے جارہے تھے۔

میں رو رہی تھی۔ اپنے بستر پر گر کر میں بری طرح رو رہی تھی۔ اس وقت اٹھی جب دروازے پر دستک کے ساتھ ماما کی آواز آئی۔ ''شرمین! شرمین بیٹا دروازہ کھولو، کیا ہوا ہے؟''

میں نے دروازہ کھول دیا۔ ماما پریشان سی کھڑی تھیں۔ مجھے دیکھ کر وہ اور بھی بدحواس ہوگئیں۔ ''ارے کیا ہوا، کیا حال بنا ہوا ہے تمہارا؟''

میں ان سے لپٹ کر رونے لگی۔

ماما مجھے سہارا دے کر اندر لے آئیں۔ بستر پر بٹھا کر انہوں نے مجھے ایک گلاس پانی پلایا۔ پھر میرے پاس بیٹھ گئیں۔ ''ہاں، اب بتاؤ بیٹا، کیا ہوا ہے؟''

''ماما! ویسے تو کچھ بھی نہیں ہوا ہے لیکن شاید بہت کچھ ہوگیا ہے۔''

کھل کر بتاؤ بیٹا، کیا ہوا ہے؟''

''ماما، میری طرف ایک طوفان آرہا ہے۔ بہت بھیانک طوفان۔''

''اس غنڈے کی بات کررہی ہو نا، لیکن اس کو تو سبق مل چکا ہے۔''

''نہیں ماما، میں کچھ اور کہہ رہی ہوں۔'' پھر میں نے دھیرے دھیرے روتے ہوئے ماما کو اپنے اندیشوں اور بابا کے بارے میں سب کچھ بتاتے ہوئے کہا۔ ''ماما، خود سوچیں، کیا کسی باپ کی نگاہیں بھی ایسی ہوسکتی ہیں۔''

''ہاں ہوسکتی ہیں بیٹا۔'' ماما نے ایک گہری سانس لی۔ ''کیونکہ یہ تمہارے سگے باپ نہیں ہیں۔''

''کیا؟'' مجھے جیسے ایک جھٹکا سا لگا تھا۔ ''یہ میرے باپ نہیں ہیں؟ تو پھر......''

''یہ بہت طویل کہانی ہے بیٹا۔'' ماما نے کہا۔ ''میں نے یہ سوچا تھا کہ یہ کہانی وقت کے ساتھ فراموش ہی کردی جائے تو بہتر ہوگا لیکن ایسا لگتا ہے کہ تمہیں بتانا ہی پڑے گا۔''

''بتائیں ماما بتائیں، ورنہ میں پاگل ہوجاؤں گی۔''

''بیٹا! یہ اب سے بہت برس پہلے کی بات ہے، تیرے وجود میں آنے سے پہلے کی کہانی ہے۔''

☆☆☆

میں نے اسے دیکھا تو بس دیکھتی رہ گئی۔

عجیب بے نیازی تھی اس میں۔ ماتھے پر بکھرے ہوئے بال، روشن آنکھیں اور کتاب جیسا چہرہ۔ وہ ایک ذہین طالب علم تھا لیکن یہاں تو حسن کی نعمت بھی ہے، دولت کی پروردہ۔

وہ سب کچھ ہونے کے باوجود ایک غریب شخص تھا۔ اوسط گھرانے سے تعلق رکھنے والا۔ میرا خیال ہے کہ اس نے بہت مشکلوں سے علم کا اتنا سفر طے کیا ہوگا۔

اب میری مثال لیں، میں ایک طاقت ور اور دولت مند گھرانے کی لڑکی تھی۔ کیا نہیں تھا میرے پاس۔ رہنے کو شاندار مکان۔ آنے جانے کے لیے قیمتی گاڑی مع ڈرائیور۔ میرا باپ ایک بہت بڑا صنعت کار اور زمیندار تھا۔ اس کے علاوہ جب انسان کے پاس دولت آجاتی ہے تو پھر اسے ایک اور شوق گھیر لیتا ہے اور وہ ہے سیاست۔

تو میرے باپ کو بھی سیاست کا چسکا تھا اور یہاں کی سیاست کا دوسرا نام ہے اقتدار۔ تو اس کے پاس اقتدار بھی تھا۔

اپنے باپ کے بارے میں یہ سب اس لیے بتا رہی ہوں کہ میرا باپ کیا تھا اور اس کے دل میں اس روشن آنکھوں والے اور بکھرے بالوں والے انجم کی کیا حیثیت ہو سکتی تھی۔

بہر حال ہزاروں قصے کہانیوں کی طرح میں نے اسے دیکھا اور پسند کر لیا۔ ابتدا میں وہ کچھ ہچکچاتا رہا تھا جس کے بارے میں اس نے بعد میں بتایا تھا کہ وہ میرے باپ کی پوزیشن سے واقف تھا۔ اسی لیے اس کی ہمت نہیں ہوتی تھی کہ میری توجہ کا جواب دے۔ حالانکہ وہ خود بھی دل سے یہی چاہتا تھا۔

بہر حال آہستہ آہستہ ہم ایک دوسرے کے قریب آتے گئے۔

اس کی قربت کے بعد مجھ پر اس کے جوہر کچھ اور بھی کھلے تھے۔ وہ انتہائی مہذب بھی تھا، اس نے کبھی کوئی ایسی بات یا حرکت نہیں کی جو عزتِ نفس کے خلاف ہوتی۔

بیٹا! محبت کا تو ایک درجہ ہوا کرتا ہے۔ میں اس کا احترام بھی کرنے لگی تھی۔ احترام کا رتبہ بہت مشکلوں سے ملا کرتا ہے۔

پھر وہی ہوا جو اس قسم کی فلموں اور کہانیوں میں ہوا کرتا ہے۔ یہ ایک طویل داستان ہے۔ مختصر یہ کہ میرے باپ یعنی تمہارے نانا کو ہماری اس محبت کا پتا چل گیا۔ اس کے بعد ظاہر ہے کہ جو ہنگامہ ہونا تھا وہ ہو کر رہا۔

بابا نے انجم کے بارے میں ساری معلومات حاصل کروالی تھیں۔ کون ہے، کیا ہے، اور سب سے بڑھ کر اس کی مالی حیثیت کیا ہے اور جب پتا چلا کہ اس بے چارے کے پاس کچھ نہیں ہے تو مجھ پر چڑھ دوڑے۔

''کیا تم پاگل ہو گئی ہو؟ کیا رکھا ہے اس کنگلے کے پاس۔''

محبت چونکہ ہمت بھی دے دیتی ہے اس لیے مجھ میں اتنی ہمت پیدا ہو گئی تھی کہ میں بابا کا سامنا کر سکوں۔ بابا نے جب یہ کہا کہ کیا رکھا ہے اس کنگلے کے پاس تو میں نے کہا۔ ''بابا! انجم کے پاس چاہے کچھ بھی نہ ہو لیکن اس کے پاس محبت ضرور ہے۔''

''بکواس ہے یہ سب۔'' بابا غصے سے بولے۔ ''صرف ڈھونگ ہے۔ وہ تمہیں سیڑھی بنا کر اوپر تک پہنچنا چاہتا ہے۔ وہ تم میں اس لیے دلچسپی لے رہا ہے کہ تم ایک دولت مند باپ کی بیٹی ہو۔''

''نہیں بابا، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''انجم اس مزاج کا آدمی ہے کہ اسے آپ کی حیثیت اور دولت وغیرہ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔''

اگر ایسی بات ہے تو اسے آزما کر دیکھ لو۔ اس سے کہہ دو کہ بابا نے مجھے اپنی جائداد اور دولت سے محروم کر دیا ہے۔ پھر دیکھتا ہوں اس کی محبت کا کیا رنگ ہوتا ہے۔''

میں نے اسی طرح انجم سے یہ بات دہرا دی۔ میں نے کہا۔ ''انجم! بابا کو ہمارے بارے میں پتا چل گیا ہے۔''

''چلو، یہ تو کسی نہ کسی دن ہونا ہی تھا۔''

''بابا نے مجھے اپنی دولت اور جائداد وغیرہ سے مکمل محروم کر دیا ہے۔'' میں نے بتایا۔ ''یہ سمجھو کہ انہوں نے مجھے عاق کر دیا ہے۔''

''تو پھر اس سے کیا ہوتا ہے۔ کیا تمہاری محبت میں کمی آ گئی ہے؟''

''میری محبت میں تو کمی نہیں آئی، لیکن تم اپنے بارے میں بتاؤ۔''

''کیا پاگل ہو گئی ہو؟ کیا تم مجھ جیسے انسان سے توقع رکھتی ہو کہ اسے تمہاری دولت اور تمہارے باپ کی حیثیت سے کوئی دلچسپی ہو گی؟ جو کچھ بھی ہے ہمیں ہر قسم کی صورتِ حال کا سامنا کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ اگر تم ساتھ دو تو ہم غربت میں بھی زندگی گزار سکتے ہیں۔''

میں نے واپس جا کر جب بابا کو بتایا تو وہ اور بھڑک اٹھے۔ ''وہ ایک مکار شخص ہے اور اگر مان بھی لیں کہ وہ ایسا ہی فرشتہ ہے تو اس کے باوجود میں تمہیں اس سے شادی کی اجازت نہیں دے سکتا۔''

مختصر یہ کہ ہمارے پاس اب دو راستے تھے۔ ایک راستہ تو وہی تھا کہ میں اپنے باپ کی بات مان کر انجم سے الگ ہو جاؤں اور دوسرا راستہ یہ تھا کہ ایک دفعہ غرور اور دولت کی اس زنجیر کو توڑ کر محبت کو حاصل کرلوں۔ اس کے بعد جو ہوگا وہ دیکھا جائے گا۔

بیٹا، ہم نے یہی کیا یعنی چھپ کر شادی کرلی۔ میں نے اپنے گھر فون کر کے خبر دے دی کہ میں انجم کی ہو چکی ہوں۔ اس کے بعد جو ہنگامہ ہونا تھا وہ ہو کر رہا۔

میرے باپ یعنی تمہارے نانا نے ہماری زندگی اجیرن کر کے رکھ دی۔ ہم ان کے خوف سے بھاگتے رہے۔ ایک محلے سے دوسرے محلے۔ ایک شہر سے دوسرے شہر۔ لیکن وہ ایک طاقتور اور بااثر انسان تھے۔ اس لیے ہم جہاں بھی جاتے ان کے آدمی سائے کی طرح ہمارے ساتھ ہوتے۔

یہ پریشانیاں اپنی جگہ تھیں بیٹا لیکن تمہارے باپ کی بے پناہ محبت اپنی جگہ تھی۔ میں نے اپنی زندگی کے خوب صورت ترین دن بس وہی گزارے ہیں جو ان کے ساتھ گزرے۔ ان کے بعد تو اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ پریشانیاں ہی پریشانیاں ہیں۔''

''لیکن ماما، بابا کی موت کیسے ہوئی؟''

''وہی بتا رہی ہوں۔'' ماما نے کہا۔ ''پھر تم پیدا ہوئیں۔ گڑیا سی، نازک سی، تمہارے باپ کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ تم ان کی جان تھیں۔ زندگی تھیں ان کی۔ تمہیں پا کر ہم اپنی پریشانیاں بھول گئے تھے۔ تمہارے بابا نے ایک فرم میں ملازمت کرلی تھی۔ اس وقت تم دو برس کی ہو چکی تھیں۔ میٹھی میٹھی باتیں کرنے والی۔ بابا دفتر گئے ہوئے تھے۔ دوپہر کے وقت ان ہی کے موبائل سے کسی کا فون آیا کہ تمہارے بابا کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے اور وہ فلاں اسپتال میں ہیں۔''

''خود سوچو، اس وقت میرا کیا حال ہو رہا ہوگا۔ میں تو گھر میں اکیلی تھی۔ صرف تم تھیں میرے ساتھ۔ دو برس کی ننھی سی گڑیا۔ بہر حال میں کسی نہ کسی طرح روتی ہوئی پریشان حال اسپتال تک پہنچ گئی لیکن اندر جانے کی نوبت ہی نہیں آئی۔''

''وہ کیوں ماما؟'' میں نے پوچھا۔

''مجھے گیٹ پر ہی سے اغوا کرلیا گیا تھا۔'' ماما نے ایک گہری سانس لی۔

''کیا؟''

''ہاں بیٹا، اغوا ہو گئی تھی میں۔ ایک گاڑی اچانک آ کر رکی۔ اس میں سے دو آدمی اترے۔ وہ دونوں مسلح تھے۔ انہوں نے مجھے اور تمہیں گاڑی میں ڈالا اور روانہ ہو گئے۔ میں تو دہشت سے گنگ ہو کر رہ گئی۔ درجنوں تھے لیکن کسی نے آگے بڑھ کر مدد کرنے کی کوشش نہیں کی۔''

''ہاں ماما، ایسا ہی ہوتا ہے۔'' میرے لہجے میں تلخی تھی۔

''میں راستے بھر تمہیں اپنے سینے سے لگائے روتی رہی۔ خود سوچو کیسی بے بسی ہوگی۔ ایک طرف تمہارے بابا کا خیال کہ وہ نہ جانے کیسے ہوں گے۔ کس حال میں ہوں گے۔ انہیں کتنی چوٹیں آئی ہوں گی۔ دوسری طرف اپنے اغوا ہونے کی دہشت۔ کون لوگ تھے یہ۔ کیوں اغوا کر کے لے جا رہے تھے۔ میں نے ان کا کیا بگاڑا تھا۔ پھر تم ساتھ تھیں۔ تمہاری حفاظت کا خیال۔ ان سبھوں نے مل کر اس وقت سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ختم کر دی تھی۔''

''وہ کون لوگ تھے ماما؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ مجھے ایک بڑے سے خالی مکان میں لے گئے تھے اور وہاں ایک بڑے کمرے میں تمہارے بابا موجود تھے۔'' ماما نے بتایا۔

''کیا؟'' میں نے حیران ہو کر پوچھا۔ ''وہاں بابا تھے؟''

''ہاں بیٹا، تمہارے بابا تھے۔ لیکن بہت مجبور، انہیں کرسی سے باندھ کر رکھا گیا تھا۔ وہ تڑپ رہے تھے۔ چیخ رہے تھے۔ خود کو آزاد کرانے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیکن دو تین غنڈے ان کے سر پر بھی سوار تھے۔ وہ بہت زخمی تھے۔ شاید ان پر تشدد بھی ہوا تھا۔

''میں دوڑ کر ان سے لپٹ گئی۔ تم بھی جا کر لپٹ گئی تھیں۔ ہم تینوں رو رہے تھے۔ یہ تو ظاہر ہو گیا تھا کہ تمہارے بابا کے ایکسیڈنٹ کی جھوٹی خبر اس لیے دی گئی تھی کہ میں گھر سے نکل کر باہر تک آؤں اور مجھے اغوا کرلیا جائے۔ الجھن یہ تھی کہ آخر کیوں، ان غنڈوں کو ہم سے کیا دشمنی ہو سکتی تھی۔

''یہ الجھن اس وقت دور ہو گئی جب میرے بابا یعنی تمہارے نانا دوسرے کمرے سے نکل کر سامنے آ گئے۔ یہ سارا کھیل، یہ ساری سازش ان کے کہنے پر کی گئی تھی۔ یہ سب ان ہی کے غنڈے تھے اور اس کا مقصد اس وقت سمجھ میں آیا جب بابا کے اشارے پر ایک غنڈے نے تمہاری کنپٹی پر پستول رکھ دیا۔

''چلو، اب تم میری بیٹی کو طلاق دو۔'' بابا نے بریف کیس سے کچھ کاغذات نکال کر انجم کی طرف بڑھا دیے۔ ''اگر تم نے بات نہیں مانی تو پھر یہ تمہاری بچی زندہ نہیں رہے گی۔''

"شرم کریں بابا، خدا کا خوف کریں۔ یہ آپ کی نواسی ہے، جسے آپ مارنے کی بات کر رہے ہیں۔"

"خاموش، یہ میری نواسی اس وقت ہوتی جب تو میری مرضی سے شادی کرتی۔ تو نے میری مرضی کے بغیر ایک کنگلے شخص سے شادی کی ہے اسی لیے اب یہ میری نواسی نہیں ہے۔ غیر ہے میرے لیے۔"

"تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ اس کی جان لے لیں گے۔"

"ہاں، جان لے لوں گا اس کی۔" بابا نے کہا۔ پھر اس آدمی کو کچھ اشارہ کیا جو پستول تانے کھڑا تھا۔

"خدا کے لیے رحم کریں۔ اس کے بدلے میری جان لے لیں۔" تمہارے بابا رونے لگے تھے۔

"تو پھر طلاق دے اس کو۔" میرے بابا نے کہا۔ "پھر چھوڑ دوں گا اس کو۔ اور تو بھی آزاد ہے۔ جہاں چاہے دفع ہو جا لیکن پھر کبھی ہمارے سامنے نہیں آنا۔ میری بیٹی پر تیرا سایہ بھی گوارا نہیں ہے مجھے۔"

"بہرحال تمہارے بابا نے کس طرح مجھے طلاق دی ہوگی، کس طرح کاغذات پر دستخط کیے ہوں گے، یہ ان کا دل ہی جانتا ہوگا۔"

"لعنت ہے اس پر۔" میں بپھر اٹھی۔ "ماما، کیا نانا اتنے بے رحم انسان تھے؟"

"ہاں بیٹا، وہ اتنے ہی بے رحم تھے۔" ماما نے کہا۔ "جب انسان کے پاس دولت اور طاقت آجاتی ہے تو پھر اس کا یہی حال ہو جاتا ہے۔ وہ بھی ایسے ہی ہو گئے تھے۔ وہ اس وقت میرا باپ تو ہرگز نہیں تھا۔ وہ تو ایک جلاد تھا۔ ایک خونی تھا۔ چنگیز خان اور نہ جانے کیا کیا تھا۔"

"تو بابا نے طلاق دے دی؟"

"ہاں بیٹا، طلاق دے دی۔ میرے اور اپنے لیے نہیں۔ صرف تمہارے لیے۔" ماما بہت دکھ سے بتا رہی تھیں۔ "صرف تمہاری سلامتی کے لیے۔ کیونکہ انہیں تم سے بے پناہ پیار تھا اور اپنے پیار کو زندہ رکھنے کے لیے انہوں نے مجھے طلاق دے دی۔"

ماما یہاں تک کہانی سنا کر رونے لگیں۔ ان کے ساتھ میں بھی رو رہی تھی۔ بابا کے لیے۔ ان کے پیار کے لیے۔ اور سب کی مجبوریوں کے لیے۔ احساس ہو گیا تھا کہ کچھ لوگ اتنے بے بس کس طرح ہو جاتے ہیں۔ انسان اپنے ہی جیسے کسی دوسرے انسان کے سامنے اتنا حقیر اور اتنا کمزور کیوں ہو جاتا ہے۔

ماما بتا رہی تھیں۔ "جانتی ہو بیٹا اس کے بعد کیا ہوا۔ اس کے بعد بھی ظلم کا یہ سلسلہ ختم نہیں ہوا۔ اس شخص نے جس کو باپ کہتے ہوئے شرم محسوس ہوتی ہے، میرے انجم کو قتل کروا دیا۔"

"کیا؟" میں اچھل پڑی۔ "قتل کروا دیا؟"

"ہاں بیٹا، انہیں گولی مار کر ان کی لاش سمندر میں پھینک دی گئی تھی۔" ماما نے بتایا۔

"میرے خدا۔" میں نے اپنا سر تھام لیا۔ "تو میرا نانا اتنا بے رحم انسان تھا۔"

"ہاں بیٹا، اتنا ہی بے رحم تھا میرا باپ۔ اس کے نزدیک اہمیت صرف اس کی اپنی انا کی تھی۔ اپنی ضد، اپنا غصہ اس کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں۔"

"میں طلاق یافتہ بھی تھی اور بیوہ بھی۔" ماما بتا رہی تھیں۔ "تم اس وقت صرف ڈھائی تین سال کی تھیں اور تمہیں زبردستی یتیم کر دیا گیا۔ تمہارے سر سے مہربان باپ کا سایہ چھین لیا گیا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ ایک ظلم اور ہوا۔ اس شخص یعنی خرم خان سے زبردستی میری شادی کروا دی گئی۔ صرف اس لیے کہ وہ بھی میرے باپ کی طرح ایک دولت مند اور طاقت ور انسان ہے۔"

"اب سمجھی۔۔ تو اس طرح یہ شخص میرا باپ بن گیا۔" میں نے کہا۔

"ہاں، اس طرح۔ میں اس کی فطرت سے واقف تھی۔ اسی لیے تم نے محسوس کیا ہوگا کہ میں نے کبھی اسے تم سے زیادہ گھلنے ملنے نہیں دیا۔ ہمیشہ ایک فاصلہ برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے۔"

"ہاں ماما، میں بھی اس بات کو محسوس کرتی تھی اور کبھی کبھی غصہ بھی آجاتا کہ آپ ایسا کیوں کرتی ہیں۔ آج سمجھ میں آگیا کہ ایسا کیوں ہے۔ اس شخص کی آنکھوں کے تاثرات نے بھی مجھے بہت کچھ بتا دیا ہے۔"

ہم دونوں ماں بیٹی اپنی قسمت پر روتے رہیں۔ کاش، میرا وہ بے رحم نانا زندہ ہوتا تو میں خود جا کر اسے گولی مار دیتی۔ لیکن اس کا انتقال ہو چکا تھا۔ صرف تین برس پہلے ایک ایکسیڈنٹ میں اس کا انتقال ہوا تھا۔ اسی لیے میں اب اس کے خلاف کچھ نہیں کر سکتی تھی۔

"ماما، اب آپ بتائیں میں کیا کروں؟" میں نے پوچھا۔

"بس یہی بیٹا کہ اپنے آپ کو اس شخص سے دور رکھو۔" ماما نے کہا۔ "ویسے تو خود میں بھی دھیان رکھتی ہوں۔ لیکن اب تم کچھ اور محتاط ہو جاؤ۔"

☆☆☆

اس کے بعد میں اور محتاط ہوگئی۔

ویسے بھی نہ جانے کیوں وہ شخص مجھے کبھی اچھا نہیں لگا۔ میں نے اس کے اندر کی خباثت کو بہت پہلے ہی محسوس کرلیا تھا۔ کیونکہ ہر عورت فطری طور پر اتنی ہی حساس ہوتی ہے۔

پہلے تو کبھی کبھی اس کے سامنے آ بھی جایا کرتی تھی لیکن جب سے یہ پتا چلا کہ وہ میرا سگا باپ نہیں ہے اور میرے ظالم نانا نے اپنے مفاد کے لیے اس شخص سے زبردستی ماما کی شادی کروادی تھی تو اور بھی نفرت ہوگئی۔

اس قسم کے واقعات ہوتے رہتے ہیں۔

ایک باپ کی موت کے بعد دوسرا باپ سامنے آجاتا ہے اور وہ اس بچے کو اپنے سینے سے لگا کر رکھتا ہے۔ اس کو اپنی اولاد کی طرح سمجھتا ہے، سگے باپ کی طرح پیار بھی دیتا ہے۔

لیکن کچھ ایسے بدبخت بھی ہوتے ہیں جن کی آنکھوں میں سوتیلی اولاد کے لیے خون اتر آتا ہے اور اگر بدقسمتی سے وہ لڑکی ہو تو ہوس ناچنے لگتی ہے۔

ایک بار میں لاؤنج میں اکیلی بیٹھی تھی کہ وہ میرے سامنے آکر کھڑا ہوگیا۔ ماما اس وقت نہ جانے کہاں تھیں۔ اپنے کمرے میں، یا واش روم میں۔

میں اسے اپنے سامنے دیکھ کر خوف زدہ ہوکر اٹھنے لگی تھی کہ اس نے بے تکلفی سے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ''ارے بیٹھو بھی، کہاں بھاگی جارہی ہو۔ تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے، بیٹھ جاؤ۔''

میں اس سے کچھ فاصلے پر بیٹھ گئی۔ ''جی فرمائیں۔''

''مجھے تم سے یہ معلوم کرنا تھا کہ تم آج کل مجھ سے دور دور کیوں رہتی ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''بابا...'' میں نے کچھ کہنا چاہا کہ اس نے میری بات کاٹ دی۔

''اوہو، تم مجھے بابا مت کہا کرو۔''

''کیوں نہ کہوں، آپ میرے بابا ہی تو ہیں۔''

''میرا خیال ہے کہ تمہیں یہ راز بتادینا چاہیے۔'' اس نے کہا۔ ''میں تمہارا سگا باپ نہیں ہوں۔''

''کیا؟'' میں نے حیران ہونے کی اداکاری کی۔

''ہاں، میں تمہارا سگا باپ نہیں ہوں۔ تم کسی اور کی اولاد ہو۔ تمہارا باپ بہت پہلے مرچکا ہے۔ اس کی موت کے بعد تمہاری ماں کی شادی مجھ سے ہوگئی تھی۔''

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔'' میں نے دل کڑا کر کے کہا۔ ''میں تو آپ ہی کو اپنا باپ سمجھتی ہوں۔ میرے لیے تو آپ ہی سب کچھ ہیں۔''

''یہ سب بے وقوفی کی باتیں ہیں۔'' وہ بھڑک اٹھا۔ ''میرا تم سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔ اس کے باوجود میں تم پر مہربان ہوں اور تمہارے لیے بہت کچھ کرسکتا ہوں، جانتی ہو کیوں؟''

''ہاں سمجھ رہی ہوں میں۔'' میرا لہجہ تلخ ہوگیا تھا۔ ''کیونکہ میں جوان اور خوب صورت ہوں اور امی کی عمر زیادہ ہوچکی ہے اور آپ جیسے ہوس زدہ شخص کے لیے اتنا ہی بہت ہے کہ کوئی جوان لڑکی آپ کے آس پاس ہو، چاہے وہ آپ کی حقیقی اولاد ہی کیوں نہ ہو۔''

''ارے بات تو سنو۔'' اس نے میرا ہاتھ تھامنا چاہا۔

لیکن میں اس کے ہاتھ کو جھٹک کر تقریباً دوڑتی ہوئی اپنے کمرے میں آگئی۔ میں اس وقت غصے اور دکھ سے کانپ رہی تھی۔ اس شخص سے بے انتہا کراہیت محسوس ہونے لگی تھی۔ اس کے ارادے تو پہلے ہی میری سمجھ میں آنے لگے تھے لیکن آج وہ اپنی خباثتوں کے ساتھ میرے سامنے آگیا تھا۔

سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں۔ ماما کو بتاؤں یا نہیں۔ ماما کو تو اس کی فطرت معلوم تھی۔ انہوں نے کہا بھی تھا کہ میں اس سے دور رہنے کی کوشش کروں۔ وہ ایک بھیڑیا ہے جو کسی بھی وقت اپنی اصلی صورت میں سامنے آجائے گا اور آج وہ سامنے آگیا تھا۔

پھر میں نے یہی سوچا کہ ماما کو کچھ نہ بتاؤں۔ فی الحال خود ہی اس سے نمٹنے اور بچنے کی کوشش کرتی رہوں۔ اگر معاملہ مزید بڑھا تو پھر دیکھا جائے گا۔

اس دن کے بعد سے میں اور زیادہ محتاط ہوگئی۔ میں نے اس کے سامنے جانا ہی چھوڑ دیا۔ حالانکہ اس کی نگاہیں میرا تعاقب کیا کرتیں۔ لیکن اسے کچھ کہنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔

پھر وہ شام آگئی۔ جو اپنے ساتھ میری کہانی کا کلائمکس لے کر آئی تھی۔

میں پارکیٹ چلی گئی تھی۔ چونکہ میں خود ہی ڈرائیونگ کرلیا کرتی تھی اس لیے اکثر اپنی ضرورت کی چیزیں لینے اکیلے چلی جایا کرتی۔

اس شام بھی میں اکیلی ہی گئی تھی۔ وہ خبیث آدمی گھر پر نہیں تھا۔

میں نے جلدی جلدی اپنی ضرورت کی چیزیں خریدیں اور شاپر اٹھائے پارکنگ کی طرف چل پڑی جہاں میں نے اپنی گاری کھڑی کی تھی۔

لطیفہ

پولیس والے نے سردار جی کو پکڑا اور پوچھا۔
''تم نے 30 بندوں کا قتل کیسے کیا؟''
سردار جی۔ ''بس میں گاڑی تیز چلا رہا تھا مگر جب میں نے بریک لگائی تو بریک فیل نکلی۔ پھر میں نے سامنے دیکھا، ایک طرف 2 بندے تھے اور دوسری طرف ایک برات جارہی تھی۔ اب آپ خود بتائیں میں گاڑی کہاں مارتا؟''
پولیس والا۔ ''ظاہری بات ہے جس طرف دو آدمی تھے۔''
سردار جی۔ ''بس میں نے یہی سوچا تھا مگر جیسے ہی میں نے گاڑی موڑی وہ سالے بھاگ کر برات میں گھس گئے۔''

☆☆☆

ایک کالی عورت نے اپنے شوہر سے کہا۔ ''کھڑکی پر پردے لگوادو پڑوسی روز مجھے دیکھتا ہے۔''
شوہر بولا۔ ''ایک بار اسے اپنا چہرہ دکھادو پھر وہ کھڑکی کے پردے خود ہی لگوالے گا۔''

سرگودھا سے اسد عباس کا تعاون

اچانک ایسا محسوس ہوا جیسے مجھے گھیرا جارہا ہو۔
وہ دو آدمی تھے جو بڑی بے تکلفی سے میرے پہلو بہ پہلو چلنے لگے تھے۔
''کیا بدتمیزی ہے۔ ہٹو ایک طرف۔'' میں غرائی۔
''بی بی، زیادہ ٹارزن بننے کی کوشش مت کرو۔'' ان میں سے ایک نے کہا۔ ''میرے ہاتھ میں پستول ہے۔ یہ دیکھو۔'' اس نے پستول کی ایک جھلک دکھادی۔
میرے خدا، میں کانپ کر رہ گئی تھی۔
کون تھے یہ لوگ، کیا چاہتے تھے؟ ایسا تو میرے ساتھ کبھی نہیں ہوا تھا۔ ایسی بات نہیں تھی کہ وہاں بالکل سناٹا ہو۔ بہت سے لوگ تھے وہاں لیکن کس کو پڑی تھی کہ میری طرف دھیان دیتا جبکہ وہ دونوں پیشہ ور اور اپنے کام کے ماہر معلوم ہوتے تھے۔
ان کا اطمینان بتا رہا تھا کہ وہ بے خوف قسم کے لوگ ہیں۔
''اپنی گاڑی کی طرف نہیں۔'' ان میں سے ایک نے کہا۔ ''وہ سامنے جو سفید ہائی روف ہے اس کی طرف چلو۔''
''نہیں، میں نہیں جاؤں گی۔''
''ضد مت کرو۔ ہم تمہیں مار کر بھی ڈال دیں گے تو کوئی پوچھنے والا نہیں ہوگا۔''
اس دوران بائیں طرف چلنے والا میرے اتنے قریب آگیا جیسے وہ مجھ سے چپک گیا ہو۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اپنی کمر پر کسی چیز کا دباؤ محسوس کیا اور ساتھ ہی وہ بول بھی اٹھا۔ ''بی بی، یہ پستول ہے۔ ہم جو کہتے ہیں وہ کر کے بھی دکھاتے ہیں۔ بیٹھ جاؤ ہائی روف میں۔''
اور میں ہائی روف میں بیٹھ گئی۔ میرا پورا جسم کانپ رہا تھا۔ ایسا خوف تھا کہ بیان سے باہر ہے۔ اس کیفیت کا ادراک ان ہی کو ہوسکتا ہے جو خود اس قسم کے مرحلوں سے گزرے ہوں۔
ہائی روف میں ایک ڈرائیور پہلے سے موجود تھا۔ ہمارے بیٹھتے ہی گاڑی آگے بڑھا دی گئی۔ میں کہاں جارہی تھی۔ کیوں جارہی تھی؟ یہ کون لوگ تھے؟ مجھے کہاں لے جارہے تھے؟ کسی بات کا ہوش نہیں رہا تھا کیونکہ میں نیم بے ہوشی کی کیفیت میں تھی۔
آنکھوں کے آگے اندھیرے تھے۔ راستوں کا بھی ہوش نہیں رہا تھا۔ یہ بھی نہیں معلوم کہ مجھے جس مکان میں لے جایا گیا تھا وہ مکان کس علاقے میں تھا۔
مجھے ایک کمرے میں پہنچا دیا گیا تھا اور اس کمرے میں پہلے سے ایک آدمی موجود تھا اور وہ وہی تھا۔ میرا سوتیلا باپ۔ خرم خان۔ جو مجھے دیکھ کر مکروہ انداز سے ہنسے جارہا تھا۔ ''آگئیں نا۔'' وہ خبیث بول پڑا۔ ''بہت بچ رہی تھیں مجھ سے۔''
''بابا! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں مجھ سے؟ میں بیٹی ہوں آپ کی۔'' میں پھٹ پڑی۔
''بکواس بند کرو۔'' وہ دہاڑا۔ ''میں تمہارا باپ نہیں ہوں۔ عاشق ہوں تمہارا۔ بچپن ہی سے میری نظر تم پر تھی۔''
''شرم کریں، شرم۔''
''شرم تو اب تمہیں اپنے آپ سے آئے گی۔'' وہ میری طرف بڑھنے لگا۔
اس وقت کمرے میں صرف وہ تھا اور میں تھی۔ میرے خدا کیا کروں۔ کہاں جاؤں۔ پھر اچانک کچھ ہوا۔ دروازے پر زوردار دستک ہونے لگی۔
''کون ہے؟'' وہ دہاڑتا ہوا دروازے کی طرف گیا۔
اس نے غصے سے دروازہ کھولا اور دو آدمی کمرے میں داخل ہوگئے۔ ان میں سے ایک تو اسی کا آدمی تھا اور

دوسرا کوئی اجنبی تھا جس نے خرم خان کے آدمی کی کنپٹی سے پستول لگا رکھا تھا۔

خرم خان کا آدمی پریشان ہو رہا تھا۔ خوف سے اس کی بُری حالت ہو رہی تھی۔ خرم خان نے لپک کر میز کی طرف جانے کی کوشش کی جس پر اس کا پستول رکھا تھا۔ لیکن اجنبی نے گولی چلا دی تھی۔ خرم خان ایک مکروہ چیخ کے ساتھ ایک طرف گر پڑا تھا۔

میرے تو ہوش ہی اڑ گئے تھے، خون دیکھ کر میرا سر چکرانے لگا تھا۔ پھر بے ہوش ہو کر گر پڑی۔ اس کے بعد میں نہیں جانتی کتنی دیر بعد ہوش آیا ہوگا۔

☆☆☆

ہوش آیا تو ایک خوب صورت مہربان صورت والا شخص میرے سامنے تھا۔ اس کی عمر پچاس کے لگ بھگ ہو گی جو بہت تشویش سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

میں اسے دیکھ کر اٹھ بیٹھی۔ اس وقت میں ایک بیڈ پر تھی اور وہ آدمی میرے سامنے کرسی پر بیٹھا تھا۔ خدا جانے وہ کون تھا۔

''اب کیسی ہو تم؟'' اس نے پوچھا۔

میں جواب دینے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔ اس نے میز پر رکھا ہوا ایک گلاس اٹھا کر میری طرف بڑھا دیا۔ ''یہ پی لو۔ یہ سیب کا جوس ہے۔ طاقت آجائے گی، شاباش۔''

اس کا لہجہ ایسا تھا کہ میں انکار نہیں کر سکی۔ میں نے گلاس خالی کر دیا تھا۔

''بہت کمزور دل کی ہو۔ خون دیکھ کر بے ہوش ہو گئی تھیں۔''

''میں کہاں ہوں؟'' میں نے پوچھا۔ ''آپ کون ہیں؟''

''میں، بیٹی۔۔۔ میں تمہارا سایہ ہوں۔''

''کیا؟''

''ہاں بیٹی، میں تمہارا سایہ ہوں۔ جب سے تم نے گھر سے نکلنا شروع کیا ہے، میں نے سائے کی طرح تمہاری نگہبانی کی ہے۔''

''ہاں، اب یاد آ گیا۔ آپ کی آواز میں نے فون پر سنی تھی۔''

''ہاں بیٹی، میں وہی ہوں۔ جس نے اس لوفر لڑکے کو تمہارے لیے سبق سکھایا تھا اور آج اس بدمعاش خرم خان کا قصہ ختم کر دیا ہے، صرف تمہارے لیے۔''

''لیکن کیوں؟''

''اس لیے بیٹی کہ میں تمہارا باپ ہوں۔'' اس نے بتایا۔

''کیا؟''

''ہاں بیٹی، یہ دیکھو۔'' اس نے اپنی جیب سے ایک والٹ نکال کر اس میں سے ایک تصویر نکال کر میری طرف بڑھا دی۔ ''یہ تصویر ہمیشہ میرے پاس رہتی ہے۔''

میں نے وہ تصویر پہچان لی۔ وہ تصویر ماما کے پاس بھی تھی۔ میں، دو سال کی بچی۔ ماما اور بابا۔ تینوں ہی اس تصویر میں تھے۔

''بیٹی، یہ تصویر ان دنوں کی ہے جب ہم پر نحوست کا سایہ نہیں پڑا تھا۔ پھر تمہارے نانا نے ہمیں زبردستی ایک دوسرے سے الگ کر دیا۔ اس نے تمہیں مار دینے کی دھمکی دی تھی بس میرے ہاتھ پاؤں کٹ گئے۔ تمہاری جان بچانے کی خاطر میں نے تمہاری ماں کو طلاق دے دی۔''

''لیکن ماما نے بتایا تھا کہ پھر آپ کو قتل کروا دیا تھا۔''

''ہاں تمہارے نانا کا ارادہ تو یہی تھا۔ لیکن خدا نے شاید اسی دن کے لیے مجھے زندہ رکھا تھا کہ تمہاری حفاظت کر سکوں۔ جس کو میری موت کی سپاری دی گئی تھی اس نے میرا خون نہیں کیا۔ میں کسی طرح بچ نکلا۔ اس کے بعد میں نے طاقت حاصل کر لی۔ میں بہت شریف آدمی تھا بیٹا۔ رومان پسند۔ شاعر۔ ادب سے دلچسپی رکھنے والا۔ لیکن تنگ آ کر میں نے طاقت حاصل کرنی شروع کر دی۔ اپنا ایک گروہ بنا لیا۔ تمہارے نانا کو برباد کر دیا۔ کیونکہ وہ شخص اسی قابل تھا۔ اس کے بعد الٹے سیدھے کام کرتا رہا۔ لیکن تمہاری طرف سے بھی غافل نہیں رہا۔ کیونکہ تم تو میری جان ہو۔ زندگی ہو میری۔ اور اب میں بے فکر ہو گیا ہوں کیونکہ خرم خان جیسا خبیث آدمی اب کبھی تمہاری زندگی میں نہیں آئے گا۔''

میں رونے لگی۔ یہ ہوتی ہے باپ کی محبت۔

''نہیں بیٹا، نہیں روتے۔'' بابا نے مجھے سینے سے لگا لیا تھا۔ ''بیٹا! اب میں خود کو پولیس کے حوالے کرنے جا رہا ہوں۔''

''نہیں بابا نہیں۔ اتنے برسوں کے بعد تو آپ ملے ہیں۔''

''نہیں بیٹا، یہ ضروری ہے۔ میں بُرا آدمی نہ پہلے تھا اور نہ آج ہوں۔ جس مقصد کے لیے میں یہ سب کرتا رہا ہوں۔ وہ مقصد حاصل ہو چکا ہے۔ لیکن یہ مت سمجھنا بیٹا کہ میں تمہیں یونہی اس خبیث معاشرے کے رحم و کرم پر چھوڑ رہا ہوں۔ نہیں، میرے آدمی تمہارا سایہ بنے رہیں گے۔ مجھے ان پر پورا بھروسا ہے۔ بس میں نہیں رہوں گا۔ پہلے بھی نہیں تھا۔ بھول جانا مجھے۔''

ہم دونوں رو رہے تھے۔ میرا سایہ جو میرے بچپن سے میرے ساتھ تھا، مجھ سے جدا ہونے جا رہا تھا۔ کاش ایسا مضبوط سایہ باپ کی صورت میں ہر لڑکی کو مل سکے۔

فرار

امجد رئیس

شہ مات دینے کے لیے صبر... تحمل... حاضر دماغی اور مقابل کی چال پر گہری نظر لازمی ہتھیار ہیں... ان کے بنا شطرنج کا کھیل ادھورا اور یقینی ہار کا نام ہے...

جیت اور مات کا سنسنی اور سسپنس فل کھیل دلچسپ و حیران کن انجام کے ساتھ...

میں دو گھنٹے سے گاڑی سڑک پر دوڑا رہا تھا۔ سیڈان کو اپنی ہمت کے مطابق حتی الامکان تیزی سے بھگا رہا تھا۔ بالآخر میں پہاڑی علاقے سے نکل آیا۔ سانتا التا (Santa Alta) کی روشنیاں نظر آنے لگی تھیں۔ ہائی وے کی بل کھاتی سیاہ چوڑی پٹی یہاں سیدھی ہوگئی تھی۔ ایکسلریٹر پر میرے پاؤں کا دباؤ مزید بڑھ گیا۔ گاڑی برق رفتاری سے بھاگ رہی تھی۔ رات ٹھنڈی اور خاموش تھی۔

میں نے ڈیش بورڈ میں موجود گھڑی پر نگاہ ڈالی۔

گیارہ بج کر پندرہ منٹ...... میں سانتاالنا کے گرد و نواح میں پہنچ چکا تھا۔ ریڈیو پر موسیقی میں خلل آیا اور خبریں نشر ہونے لگیں۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر آواز میں اضافہ کر دیا۔

''ڈکیتی بینک ورنن قتل کے بعد رات کے اندھیرے میں فرار ہو گیا ہے۔ پوری ریاست میں شد و مد سے اس کی تلاش جاری ہے۔'' اناؤنسر کی آواز واضح سنائی دینے لگی۔ ''ورنن، انٹراسٹیٹ بینک ڈکیتی میں مطلوب ہے۔ آج دوپہر ڈکیتی کے دوران میں اس نے ایک فیڈرل ایجنٹ کو بھی ہلاک کر دیا ہے۔ وہ چرائی گئی گاڑی میں بھاگ نکلا ہے۔ پولیس کے مطابق، اس کا رخ سانتاالنا کی جانب ہے۔ سانتاالنا میں اس کی بیوی میرین موجود ہے۔

''مسز ورنن (میرین) اپنا بینک اکاؤنٹ خالی کر کے نکل گئی ہے۔ پولیس ذرائع اور اندازوں کے مطابق ورنن نے اسے فون کیا تھا۔ عوام کو خبردار کیا جاتا ہے کہ ورنن مسلح اور خطرناک ملزم ہے۔ سانتاالنا کے مکینوں کے لیے مشورہ ہے کہ......''

میں نے ریڈیو بند کر دیا۔ میرے ہاتھ سختی سے اسٹیئرنگ وھیل پر جمے ہوئے تھے۔ مضبوط گرفت کے باعث انگلیوں کے جوڑ سفید پڑ گئے...... گن میری بغل سے قریب تھی۔

شہر میں داخل ہوتے ہی میں نے رفتار کم کر دی، سڑکوں پر سناٹا تھا۔ میں دریا کے ساتھ صنعتی علاقے سے گزر رہا تھا۔ کاؤنٹی ہائی وے پکڑ کر میں سانتاالنا کی عقبی سمت جا رہا تھا۔ طے کردہ مقام کے قریب میں نے سڑک چھوڑ دی۔ مخصوص مقام پر پائن کے جھنڈ میں گاڑی روپوش ہو گئی۔ انجن اور ہیڈ لائٹس بند کر کے میں نے گاڑی سے باہر قدم رکھا۔ جسم اکڑ سا گیا تھا۔ انگڑائی لے کر میں نے ہاتھ پیر چلائے اور گہری گہری سانسیں لے کر آسمان کی طرف دیکھا۔ چاند کی روشنی، بادلوں کی کثرت کے باعث بار بار مدھم پڑ جاتی......

میں بہ عجلت سڑک کی جانب آیا۔ سڑک پار کر کے چھوٹے سے میدان میں آ گیا۔ میدان کے دوسرے سرے پر 45 ڈگری کی گھنی ڈھلوان تھی۔ اس کے بعد درختوں میں میرین کی موجودگی یقینی تھی۔

میدان کے دوسرے سرے پر رک کر میں نے احتیاط سے جائزہ لیا اور ڈھلوان طے کرنے لگا۔ نیچے پہنچ کر میں نے جھاڑیوں میں چھپ کر سامنے تاڑنا شروع کیا۔ پھر پیٹ کے بل لیٹ کر کچھوے کی چال سے آگے کھسکنا شروع کیا۔ مجھے نہایت احتیاط سے کام لینا تھا۔

معاً مجھے میرین کی گاڑی نظر آ گئی۔ گاڑی کے دوسری طرف کچھ فاصلے پر سڑک کی سنسان سیاہ لکیر دکھائی دے رہی تھی۔

میں نے آنکھیں سکیڑ کر دیکھا۔ گاڑی کے اندر اسٹیئرنگ وھیل کے ساتھ ایک سایہ سا نظر آ رہا تھا۔ فاصلے اور تاریکی کے باعث میرین کو شناخت کرنا دشوار تھا۔ میری دھڑکنوں میں اضطراب کی آمیزش تھی۔ میں نے گن ہاتھ میں لے لی اور رینگتا ہوا نہایت محتاط انداز میں آگے کھسکنا شروع کیا۔

ابھی میں پندرہ بیس فٹ دور تھا کہ میں نے میرین کو پہچان لیا۔ لیٹے لیٹے میں نے سماعت اور بصارت کو استعمال کیا۔ کوئی خطرہ نہیں تھا۔ حشرات الارض کی آوازیں تھیں اور گاڑی کے آس پاس کوئی غیر معمولی سرگرمی نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں نے صرف سر اٹھایا اور دھیمی آواز میں میرین کو پکارا۔ وہ ساکت بیٹھی رہی۔ دوسری بار میں نے آواز کو ذرا بلند کیا۔ میرین کو جھٹکا لگا۔ اس نے گردن گھمائی۔ وہ میری آواز پہچان گئی تھی۔

''ڈارلنگ۔'' اس نے تیز سرگوشی کی۔ ''اوہ گاڈ، میں سمجھی تم کبھی نہیں آؤ گے اور میں یہاں انتظار کرتی رہ جاؤں گی۔''

''اوہ، ڈیئر، ایسا کیوں سوچا تم نے؟ سب ٹھیک ہے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' میں نے جواب دیا اور اٹھتے اٹھتے پھر دبک گیا۔

''شش...... ش...... خاموش۔''

''کیا ہوا؟'' میرین گھبرا گئی۔

''سنو، آواز آ رہی ہے۔'' میں نے سرگوشی کی۔

آواز کچھ نمایاں ہو گئی تھی۔ یہ کسی گاڑی کے انجن کی آواز تھی۔ جو قریب آتی جا رہی تھی۔ میرین نے آواز سن لی تھی۔ چاند بادل کی اوٹ سے نکل کر پھر چھپ گیا۔ تاہم میں میرین کے چہرے پر بدحواسی دیکھ چکا تھا۔ اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں اور چہرے پر خوف کا سایہ بہت گہرا تھا۔

''میرین۔'' میں نے آہستہ سے اسے آواز دی۔ ''خود کو سنبھالو، ہوش میں رہو۔ سیدھی بیٹھو اور خاموشی سے سامنے کی طرف دیکھتی رہو۔ سمجھ گئیں؟''

وقفے سے اس کا جواب آیا۔ ''ہاں۔''

گاڑی کے انجن کی آواز بہت قریب آ گئی تھی۔ کار کی

''وہیں رک جاؤ۔ حرکت مت کرنا۔''

وہ گڑبڑا کر ذرا سا گھوما اور فائر کر دیا۔ میں بھانپ گیا تھا۔ پہلو کے بل گرتے ہوئے میں نے اوپر تلے دو گولیاں چلائیں۔ اس کی چلائی ہوئی اندھی گولی میرے قریب زمین سے ٹکرائی تھی۔ دوسرے فائر کا اسے موقع ہی نہیں ملا۔ میری دونوں گولیاں اس کے جسم میں اُتر گئی تھیں۔ وہ گرتے ہی ساکت ہوگیا۔ فوراً ہی میرین کی چیخ بلند ہوئی۔ میں کھڑا ہو گیا تھا۔

اس کے قریب جاکر میں نے سینے پر ہاتھ رکھا۔ سانس اور دھڑکن دونوں معدوم تھیں۔ دونوں سے ایک گولی نے یقیناً اس کے دل کو چھولیا تھا۔ میں نے گہری سانس لی اور میرین کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ کار کا دروازہ کھول کر دوڑی تھی اور سیدھی میری بانہوں میں سماگئی۔

''کک...... کیا وہ......؟''

''ہاں، وہ ختم ہوگیا۔''

اس نے مجھے جکڑ لیا۔ وہ اضطراری طور پر رو پڑی۔ اس کا گداز بدن لرز رہا تھا۔

''مجھے نہیں پتا، آخر میں نے تمہیں پہلے کیوں کال نہیں کی۔ مجھ سے تاخیر ہوگئی تھی۔'' میرین نے سسکی لی۔

''میرین، کوئی بات نہیں...... سب ٹھیک ہے، ہنی۔'' میں نے اس کی سنہری زلفوں پر ہاتھ پھیرا۔ ''اہم بات یہ ہے کہ میں بروقت پہنچ گیا۔''

''جب اس نے مجھے فون کیا تو میں گھبرا گئی تھی۔ میں اس کی ہدایت کے مطابق چلتی رہی...... وہ مجھے مار ڈالتا۔ بینک سے پیسے نکال کر میں یہاں آگئی۔''

''ایزی ہنی، ایزی۔'' میں نے اس کے یاقوتی ہونٹوں کو چھوا۔ ''معاملہ نمٹ گیا ہے۔''

''اوہ پال، مجھے نہیں پتا میرا کیا بنتا اگر میں چند ماہ قبل تم سے نہ ملی ہوتی۔''

''آؤ چلیں۔'' میں نے اس کا ہاتھ دبایا اور اسے لے کر اپنی پوشیدہ کار کی جانب چل پڑا...... کچھ دیر بعد میں میرین کے ساتھ اپنی کار میں بیٹھا تھا۔

شارٹ ویو ریڈیو کے نیچے سے میں نے مائیکروفون نکالا اور پولیس ہیڈ کوارٹر سے رابطہ کیا۔

''میں اسپیشل ایجنٹ آف ایف بی آئی، پال برو بول رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''فرینک ورٹن کی تلاش بند کر دی جائے۔ وہ مر چکا ہے۔'' میں نے نہایت سکون سے اپنا جملہ پورا کیا۔

اُلّو

ایک گاہک ہوٹل میں ویٹر کو مسلسل تنگ کیے جا رہا تھا۔ کبھی کہتا کہ اسے بہت گرمی لگ رہی ہے۔ ائرکنڈیشنر چلایا جائے۔ چند منٹ بعد کہتا اسے سردی لگ رہی ہے۔ مشین کو بند کیا جائے۔ ویٹر بہت تحمل سے اس کی شکایات سنتا اور سر جھکا کر تعمیل کے لیے چلا جاتا۔ یہ کھیل بار بار ہو رہا تھا۔

بار بار یہ تماشا دیکھ کر ایک اور گاہک سے نہ رہا گیا۔ اس نے ویٹر کو بلا کر کہا۔ ''وہ آدمی تمہیں بار بار تنگ کر رہا ہے۔ اس الو کے چرخے کو باہر کیوں نہیں نکال دیتے۔''

''نہیں سر۔'' ویٹر نے پُرسکون لہجے میں کہا۔ ''آخر وہ بھی ہمارا گاہک ہے... میں اسے الو بنا رہا ہوں۔ ہمارے ہوٹل میں سرے سے کوئی ائرکنڈیشنر ہی نہیں ہے۔''

کراچی سے ولید بلال کی خامہ فرسائی

روشنیاں بند تھیں۔ قریب آکر اچانک انجن کی آواز بھی بند ہوگئی۔ میں نے گن تیار حالت میں رکھی ہوئی تھی اور نیم تاریکی میں بصارت پر زور دے رہا تھا۔

گردشِ دوراں جیسے تھم گئی۔ میں منتظر تھا۔ پیٹ میں گرہیں پڑ گئیں۔ آنکھیں اندھیرے میں کسی حرکت کو کھوج رہی تھیں۔ لیکن کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔

دفعتاً سوکھے پتوں کی چرمراہٹ سنائی دی۔ آواز میرین کی گاڑی کی جانب سے آئی تھی۔ گاڑی کا ہیولہ مجھے نظر آرہا تھا۔ میں نے نگاہ کو مرکوز کیا اور گاڑی کے عقب میں موجود سائے کو تاڑ لیا۔ گن پر میری گرفت سخت ہوگئی۔ اسی وقت چاند نے بادلوں سے جھانکا۔

وہ کوئی آدمی تھا جو بے حس و حرکت کھڑا تھا۔ اس کا ایک بازو سامنے کی طرف پھیلا ہوا تھا۔ اس نے رخ بدل کر ڈرائیونگ سیٹ کی طرف حرکت کی۔ چاند کی روشنی میں، میں نے اس کا چہرہ دیکھ لیا۔ اس کے پھیلے ہوئے ہاتھ میں پسٹل صاف دکھائی دیا۔ میں نے سانس تک روک لی تھی۔ وہ محتاط انداز میں حرکت پذیر تھا۔ اب وہ گاڑی کے عقبی دروازے کے قریب تھا۔ میں تیزی سے گھٹنوں کے بل اٹھا اور چیختے ہوئے وارننگ دی۔

ناخلف

ایس... انور

قسمت میں دھن دولت لکھا ہو تو بنا کسی تردد کے بھی مل ہی جاتا ہے... اگر نہ لکھا ہو تو ہر ممکن کوششوں... جدوجہد اور تگ ودو کے بعد بھی دامن خالی ہی رہتا ہے... باپ اور بیٹے کے درمیان وجۂ تنازع دولت ہی تھی... اور تعلقات کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ کی طرح حائل تھی... دونوں اس کو عبور کر کے اپنا مقصد حاصل کرنا چاہتے تھے...

قتل کی ایسی واردات کی تفتیش جو خودکشی کی سند پا چکی تھی...

جیرالڈ نے کار مہمانوں کی پارکنگ کی مخصوص جگہ میں تھما دی اور اگنیشن آف کر دیا۔ پھر گلو و کمپارٹمنٹ میں رکھا ہوا ریوالور نکال لیا۔ اسٹریٹ لیمپ کی روشنی میں اس نے ریوالور کا چیمبر چیک کیا۔ چیمبر لوڈ تھا۔

رات کے گیارہ بج چکے تھے اور لوگ سونے کے لیے اپنے اپنے بستروں پر جا چکے تھے۔ کنڈومینیم کی بیشتر کھڑکیوں میں اندھیرا دکھائی دے رہا تھا۔ نیچے پارکنگ لاٹ سے جیرالڈ اپنے باپ کے اپارٹمنٹ کو نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن اسے اندازہ تھا اس اپارٹمنٹ کی روشنیاں ابھی گل نہیں ہوئی ہوں گی۔ اس کا باپ رات کو دیر سے سونے کا عادی تھا۔

اس نے ریوالور کو اپنی جیب میں منتقل کرنے سے پیشتر سیفٹی کیچ کو چیک کرنا ضروری سمجھا۔ سیفٹی کیچ آن تھا۔ خود کو گولی مارنا اس کے پلان میں شامل نہیں تھا۔ اس کے پاس ایک اور منصوبہ تھا۔ اس کے ارادے ہمیشہ ہی مبہم خیالات پر مبنی ہوتے تھے۔ اگر اسے کچھ کرنا ہوتا تھا تو وہ اسی وقت اس عمل کے بارے میں فیصلہ کر لیا کرتا تھا۔ کسی منصوبے کی تفصیلات پہلے سے طے کرنا اس کے لیے مشکل اور الجھن کا باعث ہوتا تھا اور اس کے سر میں درد ہونے لگتا تھا۔

لیکن اس مرتبہ معاملہ دوسرا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے، کن چیزوں کو ساتھ لانے کی ضرورت ہے اور یہ کام کون سے وقت کرنا ہے۔ شاید اسے اپنے منصوبے پر عمل کرنے کی ضرورت ہی پیش نہ آئے۔ شاید اس کا بوڑھا باپ سمجھ داری کا مظاہرہ کرے اور اس کی سُن لے۔ اگر نہیں تو...

اس کی اپنے باپ سے ملاقات کے لیے آمد خوش گوار نہیں کہی جا سکتی تھی۔ جیرالڈ کو رقم کی ضرورت تھی۔ اگر اس نے کل تک قرض کی رقم ادا نہیں کی تو شائیورز کے شارک نما غنڈے جوش میں آ کر نہ جانے اس کا کیا حشر کریں گے... وہ یا تو اسپتال میں ہوگا یا پھر مر چکا ہوگا۔

آخری مرتبہ جب اس نے اپنے باپ سے رقم مانگی تھی تو اس نے صاف صاف کہہ دیا تھا۔ ”یہ میں آخری مرتبہ تمہیں رقم دے رہا ہوں۔ میں تمہاری قمار بازی اور منشیات کے لیے اب مزید کوئی رقم فراہم نہیں کروں گا۔ تمہیں خود کو سدھارنے، کوئی عمدہ ملازمت تلاش کرنے اور اپنی ذات پر دھیان دینے کی ضرورت ہے۔ یہ بینک اب بند ہو چکا ہے اور اس وقت تک بند رہے گا جب تک وہ لوگ میری وصیت پڑھ کر نہیں سنا دیتے۔“

کیا بوڑھا واقعی سنجیدہ ہے؟ کیا جیرالڈ اسے اپنا ذہن تبدیل کرنے پر رضامند کر سکتا ہے؟ مشکل ہے! وہ اپنے باپ کے چہرے پر اس قسم کا عزم پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ یہ عزم عارضی نہیں تھا۔ وہ جب کسی بات کی ٹھان لیتا تھا تو اس پر ڈٹا رہتا تھا۔

اس کے باوجود بھی اسے کوشش تو کرنی چاہیے، جیرالڈ نے سوچا۔ اگر بوڑھا نہیں مانا تو پھر اسے اپنے متبادل پلان

پرعمل کرنا پڑے گا۔ اور اسی متبادل پلان کو ذہن میں رکھتے ہوئے وہ ریوالور اپنے ساتھ لایا تھا۔ اگر وہ بوڑھے کو کچھ رقم حوالے کرنے کے لیے قائل نہ کرسکا تو پھر وہ زبردستی بھی کر سکتا ہے اور اگر اس کا مطلب یہ ہوا کہ بوڑھے کی وصیت پڑھنے کے بعد جب کوئی وکیل رقم اس کے حوالے کرے گا تو یہ بھی اس کا حق ہوگا جو بالآخر اسے مل جائے گا۔

اس نے بیس بال کی ٹوپی اپنے چہرے پر نیچے کھسکالی اور اس کوٹ کو اپنے بدن پر کس لیا جو ایک ریسٹورنٹ کے ریک سے چوری کیا تھا۔ کنڈومینیم کے سیکیورٹی کیمرے کی وڈیو داخلی دروازے پر ایک ناقابلِ شناخت اجنبی کو دکھائے گی جس کی جیرالڈ کو قطعی پروا نہیں تھی۔

وہ اس چابی کی مدد سے کنڈومینیم میں داخل ہوگیا جو اس کے باپ نے اپنے اکلوتے بیٹے سے گاہے گاہے ملاقات کے لیے اسے دے رکھی تھی۔

لفٹ میں وڈیو کیمرا لگا ہوا تھا لیکن سیڑھیوں پر کوئی کیمرا نہیں تھا۔ وہ سیڑھیوں کے راستے تیسری منزل پر پہنچ گیا۔ اس نے راستے میں ہی ہانپنا شروع کردیا تھا۔ ”لعنت ہو“ وہ خود سے بڑبڑایا۔ ”مجھے اپنے آپ کو شیپ میں رکھنا ہوگا۔“ وہ ہال وے میں داخل ہوگیا اور اپنے باپ کے اپارٹمنٹ کے دروازے پر پہنچ گیا۔

اس نے دروازے کا تالا کھولا اور اندر داخل ہونے کے بعد آہستگی سے دروازہ بند کردیا۔ اسے بیڈ روم سے موسیقی کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ اس کے باپ کو بکواس کلاسیکل میوزک پسند تھی اور وہ اس وقت اس سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

جیرالڈ قالین پر دبے پاؤں چلتا ہوا بیڈ روم کے دروازے تک جا پہنچا۔ اسے خود۔۔۔ یقین نہیں تھا کہ وہ یہ سب کچھ چپکے چپکے کیوں کررہا ہے۔ اس کے باپ نے کبھی بھی اس کی آمد پر ناپسندیدگی کا اظہار نہیں کیا تھا۔ شاید اس کی جیب میں موجود ریوالور کے بوجھ نے اس کی نسبی آمد کو خفیہ مداخلتِ بے جا میں تبدیل کردیا تھا۔

اس نے بیڈ روم کے دروازے کے ہینڈل کو گھمایا۔ وہ لاک تھا۔ اسے یاد آیا کہ اس کا بوڑھا باپ اکثر چوروں اور لٹیروں سے خوف کا اظہار کرتا رہتا تھا۔ جیسے کہ لاک کیے ہوئے دروازے ان کی راہ میں مزاحم ہوں گے۔

جیرالڈ نے دروازے پر دستک دی اور پکارا۔ ”ڈیڈ؟“

موسیقی کی آواز تھم گئی اور پھر سرسراہٹ اور بولٹ کے

کھٹکانے کی آواز سنائی دی۔ پھر دروازہ کھل گیا۔ اس کے باپ نے ہاؤس کوٹ پہنا ہوا تھا۔ اس کا جسم قدرے خمیدہ تھا اور سر پر رہے سہے بال گرے رنگ کے تھے۔

''بیٹے، تمہاری آمد متوقع نہیں تھی، اندر آجاؤ۔''

وہ اپنے باپ کے پیچھے کمرے میں آگیا۔ اس کا باپ ایک آرام کرسی پر بیٹھ گیا جبکہ جیرالڈ کھڑا رہا۔

''بیٹھ جاؤ۔ اگر تم کچھ پینا چاہتے ہو تو فریج میں لیمونیڈ موجود ہے۔''

''نہیں، شکریہ۔''

اس کے باپ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ جیرالڈ کے آنے پر وہ ہمیشہ اسی طرح خوش ہوا کرتا تھا۔

''ڈیڈ، مجھے مصیبت سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے آپ کی مدد درکار ہے۔ میں بہت بڑی مشکل میں پھنس گیا ہوں۔''

جیرالڈ کو کبھی بھی اس بات کا خیال نہیں آتا تھا کہ وہ اپنے باپ سے یہ پوچھ لے۔ ''آپ کیسے ہیں؟ آپ صحت مند دکھائی نہیں دے رہے؟ کیا آپ ٹھیک سے کھا پی رہے ہیں؟''

خیر و عافیت دریافت کرنا بوڑھے باپ کے لیے دلچسپی کا باعث ہوتا لیکن جیرالڈ تو سوائے رقم کا تقاضا کرنے کے اور کوئی بات ہی نہیں کرتا تھا۔

''جیرالڈ، تم ہمیشہ ہی بڑی مشکل میں گرفتار رہتے ہو۔ دیکھو، ہم اس بارے میں اس وقت بات کر چکے ہیں جب میں نے آخری مرتبہ تمہیں رقم دی تھی اور میں نے یہ بھی کہا تھا کہ آئندہ میں تمہیں کوئی رقم نہیں دوں گا۔ تمہاری عمر تیس سال ہونے کو ہے۔ تمہیں اپنی ذمے داری خود محسوس کرنی چاہیے۔ جب تک میں تمہیں رقم دیتا رہوں گا تم کبھی بھی زندگی میں کچھ نہ سیکھ سکو گے نہ کر سکو گے۔ آئی ایم سوری۔ یہ کنواں اب خشک ہو چکا ہے۔''

''ڈیڈ، آپ سمجھتے کیوں نہیں۔ اگر میں نے قرضہ نہیں چکایا تو میں زخمی بھی ہو سکتا ہوں اور ہلاک بھی۔''

''میں یہ جملہ پہلے بھی سن چکا ہوں۔ اگر میں نے پہلے کبھی اس پر یقین کر لیا تھا تو اب یقین نہیں کروں گا، سوری!''

جیرالڈ کی پیشانی پر بل پڑ گئے اور اس کی آواز بلند ہو گئی۔ ''آپ کو میری قطعی کوئی پروا نہیں ہے۔ آپ کو بس دلچسپی ہے کہ آپ کی قیمتی سرمایہ کاری آپ کے قبضے میں رہے اور آپ کا اپنا خون جہنم میں جائے۔''

''بیٹا، میں تمہارا خیال رکھتا ہوں۔ تم میری اکلوتی اولاد ہو اور میں تمہاری بہتری چاہتا ہوں۔ لیکن جب تک تم اپنا رویہ تبدیل نہیں کرتے اور اپنی زندگی نہیں سنوارتے، ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔ اور میں نے یہ نتیجہ دیکھ لیا ہے کہ جب بھی تم مجھ سے رقم کا مطالبہ کرتے ہو اور میں تمہیں رقم دے دیتا ہوں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ تمہیں اس بات کی اجازت دی جا رہی ہے کہ جس قسم کی گندگی میں تم لڑھک چکے ہو تو اسی میں لوٹنیاں کھاتے رہو۔ لیکن اب مزید ایسا نہیں ہوگا۔ میں تمہیں مزید استعداد نہیں بخش سکتا۔ اگر تم کسی تربیت گاہ میں جانا چاہتے ہو تو میں بہ خوشی اس کے اخراجات اٹھانے کے لیے تیار ہوں۔ اگر تم ملازمت کرنا چاہتے ہو تو میرے روابط ہیں۔ اگر تم ہنرمندی کی تربیت لینا چاہتے ہو تو میں اس کا بل ادا کر دوں گا۔ مجھ سے جس حد تک ممکن ہو سکے گا میں تمہاری مدد کروں گا۔ لیکن میں تمہارے ذاتی اے ٹی ایم کے طور پر مزید عمل نہیں کر سکتا۔''

جیرالڈ کا جسم تن گیا اور چہرہ کرخت ہو گیا۔ اس نے اپنی جیب سے میڈیکل دستانوں کا ایک سیٹ نکالا اور انہیں اپنے ہاتھوں پر چڑھا لیا۔ پھر ایک جھٹکے سے کوٹ کے اندر رکھا ہوا ریوالور کھینچ نکالا اور دھمکی آمیز انداز میں اپنے باپ کی جانب لہراتے ہوئے بولا۔ ''میں اس بارے میں بالکل سنجیدہ ہوں۔ مجھے رقم چاہیے۔ مجھے رقم دے دیں یا پھر میں اس وقت وصول کر لوں گا جب آپ کی وصیت پڑھی جائے گی۔''

بوڑھا ایک لمبا سانس لے کر رہ گیا۔ ''جیرالڈ! تم مجھے شوٹ نہیں کرنا چاہو گے۔ تمہارے اندر اتنی ہمت نہیں ہے۔ اب ڈرامائی حرکات ختم کرو اور اس گھناؤنی شے کو پرے رکھ دو۔ پھر بیٹھ کر بات کرتے ہیں کہ تمہیں رقم دیے بغیر میں تمہاری مدد کس طرح کر سکتا ہوں۔''

جیرالڈ کو تاؤ آگیا۔ بوڑھے کو اسے دھتکارنے کی ہمت کیسے ہوئی؟ اس نے اس طرح اسے بے عزت کرنے کی جرأت کیسے کی؟ اس کی اتنی ہمت کہ خوف کا اظہار بھی نہیں کر رہا؟ تمہارا کہنا ہے مجھ میں ہمت نہیں ہے؟ تمہارا کہنا ہے کہ تم مجھے بہ خوبی جانتے ہو؟ تمہارا خیال ہے کہ مجھے بس یونہی دھتکار دو گے؟ ویل، تو پھر یہ تمہارے لیے کچھ حقیقت ہے۔

پھر وہ اپنے باپ پر جھپٹ پڑا۔ اس نے بوڑھے باپ کے دونوں شانوں کو اپنی گرفت میں لے لیا اور ریوالور کی نال بوڑھے کے منہ میں ٹھونس دی۔ جب اس نے

ریوالور کی نال منہ سے باہر نکالی تو بوڑھے پر لرزہ طاری ہو گیا۔

پھر اس سے قبل کہ بوڑھے کی حالت سنبھلتی، جیراللہ نے اس کے داہنے ہاتھ کو دبوچ لیا، ریوالور زبردستی ہاتھ میں تھماتے ہوئے اس کی نال ایک بار پھر بوڑھے کے منہ میں گھسیڑ دی اور ٹریگر دبا دیا۔

اس کے باپ کا جسم ڈھیلا پڑ گیا، ہاتھ لٹک گئے اور ریوالور ہاتھ سے پھسل کر فرش پر گر گیا۔ جیراللہ نے اپنی جیب میں سے ایک رومال نکالا اور خون کے ان چھینٹوں کو صاف کرنے لگا جو اس کے چہرے کو لت پت کر چکے تھے۔ پھر وہ تقریباً دوڑتا ہوا بیڈ روم سے داخلی دروازے تک گیا اور کان لگا کر سننے کی کوشش کرنے لگا۔

باہر لوگوں کے چلنے پھرنے یا فائر کی آواز پر کسی قسم کی تشویش کی کوئی علامات سنائی نہیں دے رہی تھیں۔

وہ بیڈ روم میں پلٹ آیا۔ اس نے ریوالور اٹھا لیا اور اس کے چیمبر سے تمام گولیاں نکال لیں۔ پھر ہر گولی کو اپنے باپ کی مردہ انگلیوں میں دبا کر اسے دوبارہ ریوالور میں ڈالتا چلا گیا۔ گڈ! اب تمام گولیوں کی کیسنگ پر اس کے باپ کی انگلیوں کے نشانات ثبت ہو چکے تھے۔ وہ یہ سب کچھ ایک ٹیلی ویژن فارنسکس شو میں دیکھ چکا تھا۔

پھر وہ اپنے باپ کی اس میز کی جانب بڑھ گیا جہاں کمپیوٹر آن تھا۔ اس نے ورڈ پروسیسر کھولا اور ٹائپ کرنے لگا:

پیارے بیٹے!

پلیز مجھے معاف کر دینا۔ میرے پاس زندہ رہنے کے لیے اب کچھ باقی نہیں رہا۔ میں جانتا ہوں کہ تمہاری زندگی اچھی نہیں گزر رہی۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس کا دوش کسے دیا جائے۔ لیکن اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ مجھے سچے دل سے یہ توقع ہے کہ حالات تمہارے لیے بہتر ہو جائیں گے۔
الوداع

البرٹ

پھر جیراللہ بیڈ روم کے دروازے کے پاس چلا گیا۔
اس دروازے میں سلائیڈ لاک لگا ہوا تھا جو بوڑھے نے اس کے اندر آنے کے لیے کھولا تھا۔ اس نے اپنے بیک پیک سے دھات کی بنی ہوئی چکنے والی گول پتری نکالی اور اسے دروازے کے فریم پر تالے کے برابر میں چپکا دیا۔ اس نے ایک لمبے سے دھاگے کی مدد سے سلائیڈ بولٹ پر ایک کھسکنے والی گرہ باندھ دی اور دھاگے کا ایک سرا پتری میں سے گزار کر گرہ کے دونوں سرے فرش تک لٹکا دیے۔

مکڑی

قمر لبے کو خواتین بلکہ لڑکیوں سے بات کرنے کا پیدائشی شوق ہے۔ گفتگو کا آغاز کرنے کے لیے ہر وقت حیلے بہانے سوچتے رہتے ہیں۔ ایک بار ٹرین میں سفر کر رہے تھے۔ سامنے ایک شرمیلی خاتون براجمان تھیں۔ قمر لبے عادت سے مجبور تھے۔ اچانک بولے۔ ”آپ کے شانے پر مکڑی۔“

وہ بے چاری گھبرا گئی۔ اس کی جھرجھری پر قمر لبے نے تسلی دی اور اچک کر اس کے شانے سے وہ نادیدہ مکڑی پکڑ کر مسلی اور دور اچھال دی۔ وہ ممنونیت سے ان کی گرویدہ ہو گئی۔ انہوں نے یہ ترکیب کافی عرصے استعمال کی پھر خوشبو میں بسا ہوا ایک زنانہ رومال ہر وقت ان کی جیب میں نظر آنے لگا۔ بازار میں جاتے جاتے وہ لپک کر کسی خوش جمال خاتون کے برابر میں پہنچ کر اسے بتاتے کہ اس کا رومال گر گیا تھا جو وہ اٹھا لائے ہیں۔ رومال ہمیشہ اتنا نفیس ہوتا کہ اکثر خواتین مسکرا کر اسے قبول کر لیتیں اور یہ ساتھ چلنا شروع کر دیتے۔ مگر برا ہو ٹشو پیپر کا۔ جب سے اس کا رواج ہوا ہے، قمر لبے نے زنانہ رومال رکھنے کی ترکیب کو خیرباد کہہ کر کچھ اور سوچنا شروع کر دیا ہے۔

بنگلادیش سے خرم علیم کی یادیں

جو تیرا دل چاہے

حضرت علیؓ کے پاس ایک شخص حاضر ہوا اور عرض کی۔ ”میرا ایک دوست تھا۔ اس کے دس ہزار دینار میرے پاس امانت تھے۔ مرتے وقت اس نے وصیت کی کہ اس رقم میں سے جو تیرا دل چاہے وہ میرے بیٹے کو دینا اور باقی خود رکھ لینا۔ اب میرا خیال ہے کہ ایک ہزار اس کے بیٹے کو دے دوں اور دل چاہتا ہے کہ باقی میں خود رکھ لوں۔“

حضرت علیؓ مسکرائے اور فرمایا۔ ”تمہارا دل نو ہزار رکھنے کو چاہتا ہے تو بس تم یہ اس کے بیٹے کو دے دو اور ایک ہزار... خود رکھ لو کیونکہ اس کی وصیت ہے کہ جو تیرا دل چاہے وہ تو میرے بیٹے کو دینا۔“ سبحان اللہ کیسا فیصلہ کیا۔

عبدالجبار رومی انصاری، لاہور

پھر دروازے کے ہینڈل کو لاک کرنے کے لیے اس کا بٹن دبا دیا اور بیڈروم سے باہر نکل آیا۔ اس نے بیڈروم کا دروازہ آہستگی سے بند کر دیا۔ اس سے قبل اس نے دھاگے کے دونوں لٹکے ہوئے سرے دروازے کی نچلی جھری سے باہر کھینچ لیے تھے۔ اس نے دھاگے کا وہ سرا کھینچ لیا جو اس نے پتری میں سے گزارا تھا۔

سلائڈنگ بولٹ کی اپنی جگہ کھسکنے کی آواز سنائی دی۔

جیراللڈ نے اب دھاگے کا دوسرا سرا کھینچ لیا جس سے وہ گرہ کھل گئی جو اس نے سلائڈنگ بونٹ کے اطراف میں باندھی تھی۔ اب دھاگا پتری میں اٹکا رہ گیا تھا۔ اس نے دھاگے کے دونوں سروں کو جھٹکا دیا تو چپکنے والی پتری اکھڑ کر اندر نیچے فرش پر گر پڑی۔ اس نے دروازے کے نیچے سے پتری کو باہر کھینچ لیا اور پتری کے ساتھ دھاگا بھی اپنی جیب میں منتقل کر دیا۔

پھر وہ اپارٹمنٹ سے نکل آیا۔ باہر آتے ہوئے اس نے داخلی دروازے کو لاک کر دیا تھا۔ اب اسے شائیورز کے ساتھ گفت و شنید کر کے اس وقت تک کے لیے مزید مہلت لینا باقی رہ گئی تھی جب تک اس کے باپ کا وصیت نامہ پڑھ کر سنا نہ دیا جاتا۔ پھر اس کے پاس اتنی رقم آجائے گی کہ وہ اس لون شارک کو کئی سو گنا زیادہ ادا کرنے کے قابل ہو جائے گا۔

اس نے عمارت سے نیچے آنے کے لیے اس بار بھی لفٹ کے بجائے زینے کو ترجیح دی۔ وہ اطمینان سے چلتا ہوا پارکنگ لاٹ تک آ گیا جہاں اس کی کار کھڑی تھی۔ اس دوران کسی کے ساتھ اس کی مڈبھیڑ نہیں ہوئی۔

اس نے اپنی کار اسٹارٹ کی اور وہاں سے روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

سراغ رساں ناروود داخلی حصے کے سامنے بندھے ہوئے پیلے رنگ کے ٹیپ کے نیچے سے جھک کر اپارٹمنٹ میں داخل ہوا تو اس کی نگاہ ایک بوڑھے شخص پر پڑی جو لیونگ روم میں ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔

ناروود سیدھا بیڈروم تک چلا گیا جہاں ایک شخص نوٹس لینے کے ساتھ ہدایات بھی دے رہا تھا۔ فارنسک کا ایک فوٹوگرافر تصویریں اتار رہا تھا۔ وہ کمرے کی چند اور اس بوڑھے کی تصویریں زیادہ کھینچ رہا تھا جو ایک کرسی پر ڈھیر پڑا تھا۔ اس کرسی کے برابر میں فرش پر ایک ریوالور دکھائی دے رہا تھا اور کرسی کی عقبی دیوار پر خون کی چھینٹیں نمایاں نظر آ رہی تھیں۔

''کیا معاملہ ہے؟'' سراغ رساں ناروود نے اس شخص سے پوچھا جو نوٹس بنا رہا تھا۔

''آہ، ڈیٹیکٹو۔ تمہاری آمد کا شکریہ۔''

''نو پرابلم۔ میرا متبادل آج صبح سے منشیات فروشوں کے ایک کیس میں الجھا ہوا ہے اس لیے مجھے آنا پڑا۔ یہ کیا معاملہ ہے؟''

''بظاہر تو یہ ایک خودکشی لگ رہی ہے۔''

''رک جاؤ۔ تم کورونر ہو۔ موت کے اسباب کی تفتیش کرنے والے افسر۔ اگر یہ خودکشی کا کیس ہے تو یہ تمہارے بیلف کی عملداری میں ہے۔ ہومی سائڈ سے اس کا کوئی تعلق نہیں بنتا کیونکہ یہ قتل کا کیس نہیں ہے۔'' سراغ رساں ناروود نے کہا۔

کورونر نے ایک لمبا سانس کھینچا۔ ''میں نے کہا کہ یہ خودکشی لگ رہی ہے لیکن کچھ باتیں قابلِ توجہ ہیں اور تمہیں تو قانون پتا ہے۔ اگر شبے کی کوئی بات ہوتی ہے تو ہم تم لوگوں کو طلب کر لیتے ہیں۔''

''اوکے، مجھے پوری معلومات سے آگاہ کرو۔ سب سے پہلے تو یہ کہ یہ خودکشی کیوں لگ رہی ہے؟''

''دروازے کو اندر سے تالا لگا ہوا تھا اور سلائڈ بولٹ بھی لگا ہوا تھا۔ کھڑکیاں اتنی چوڑی نہیں ہیں کہ کوئی ان کے اندر سے گزر سکے۔ لہٰذا شوٹنگ کے بعد کوئی بھی کمرے سے باہر نہیں جا سکتا تھا پھر لاش کی پوزیشن اس بات کا اشارہ دے رہی ہے کہ اس شخص نے اپنی گن خود منہ میں ڈالی تھی جو وہاں فرش پر گری ہوئی ہے۔''

''ریوالور کے فائر کے ذرات؟''

''ہم نے فوری ٹیسٹ کر لیا تھا۔ ذرات لاش کے داہنے ہاتھ اور نائٹ گاؤن کے کف پر موجود ہیں۔''

''خودکشی کا پیغام؟''

''وہ کمپیوٹر پر تھا۔ ہم نے اس کا پرنٹ لے لیا ہے۔''

کورونر نے ایک کاغذ سراغ رساں ناروود کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

''لاش کس نے دریافت کی تھی؟''

''اس کے دوست نے جو لیونگ روم میں موجود ہے۔ جب یہ شخص کافی پینے کے لیے وہاں نہیں پہنچا تو اس کے دوست کو تشویش ہوئی۔ اس نے نائن ون ون پر فون کر دیا۔ جواب میں دو پولیس مین یہاں پہنچ گئے۔ وہ بوڑھا دوست انہیں کنڈومینیم کے اندر لے گیا۔ اس کے پاس

کنڈومینیم کی چابی تھی۔ انہیں بیڈ روم کا دروازہ لاک ملا۔ جب انہوں نے دروازہ زور زور سے کھٹکھٹایا تو انہیں کوئی جواب نہیں ملا۔ انہوں نے قانونی طور پر دروازہ توڑ ڈالا۔ جب انہیں کمرے کے اندر لاش ملی اور انہوں نے ایک خودکشی کے کیس کی حیثیت سے شناخت کیا تو مجھے طلب کر لیا۔"

"ٹھیک ہے، ایسا کوئی راستہ نظر نہیں آرہا جس سے قاتل کمرے سے نکل کر گیا ہوگا۔ پھر یہ پیغام مجھے بتا رہا ہے کہ اسے خودکشی قرار دینا بالکل ٹھیک ہے۔ اب مجھے یہ بتاؤ کہ ایسی کیا مشتبہ بات ہے جس کی بنا پر تم نے مجھے اپنے کاغذی کام کاج کے لطف سے اتنی دور طلب کیا ہے؟ لیکن میں یہ بات شکایت کے طور پر نہیں کر رہا ہوں۔"

"جب ہم نے بیڈ روم کا دروازہ کھولنے کی کوشش کی تھی تو دروازے کا ہینڈل لاک نہیں تھا۔ صرف سلائیڈ بولٹ لاک تھا۔ بھلا کوئی سلائیڈ بولٹ کھسکا دے اور دروازے کو لاک نہ کرے، ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟"

"وہ بوڑھا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ غائب دماغ ہو۔"

"ہوسکتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود بھی یہ بات قابلِ توجہ ہے۔"

سراغ رساں ناروڈ نے ایک لمبا سانس کھینچا۔ "اوکے، میں جائزہ لیتا ہوں۔ لیکن پہلے میں اس کے دوست سے گپ شپ کرنا چاہوں گا۔"

وہ شخص دیکھنے میں مرنے والے کا ہم عمر لگ رہا تھا۔ اس کی نظریں بیڈ روم کے دروازے پر جمی ہوئی تھیں جیسے وہ لپک کر مداخلت کرنا چاہتا ہو۔ لیکن ساتھ ہی خوف سے اپنے جسم کو اس طرح سمیٹے ہوئے ادھر دیکھ رہا تھا جیسے اسے ابکائی آنے والی ہو۔ ناروڈ نے اندازہ لگایا کہ جیسے اس شخص نے پہلے کبھی کوئی لاش نہیں دیکھی یا کم از کم کرائم سین کے وسط میں جمے ہوئے خشک خون میں کسی لاش کو دیکھنے کا اتفاق نہ ہوا ہو۔

سراغ رساں چلتا ہوا اس شخص کے پاس پہنچا، اپنا تعارف کرایا اور اپنا کارڈ اسے پیش کر دیا۔

"شکریہ۔" اس بوڑھے نے کہا۔ "میرا نام ولیم ڈروج ہے۔ دیکھو سراغ رساں، کورونر اسے خودکشی کہہ رہا ہے لیکن میں جانتا ہوں کہ البرٹ نے کسی طور پر خود کو ہلاک نہیں کیا ہوگا۔ کسی طور نہیں۔ اسے کسی اور نے قتل کیا ہے اور میں چاہوں گا کہ تم اس بات کو سنجیدگی سے لو۔ یہ مسخرے سنجیدہ نہیں ہیں۔ ان کا یہی اصرار ہے کہ البرٹ نے خود

فریبی

ایک حسین و جمیل سیکریٹری غصے سے بھری باس کے کمرے سے باہر نکلی۔ ساتھی ورکر نے پوچھا۔ "جب تم اندر گئی تھیں تو بڑے خوش گوار موڈ میں تھیں۔ اب غصے سے بھری واپس آئی ہو۔ کیا بات ہے؟"

سیکریٹری نے ناک سکیڑتے ہوئے جواب دیا۔ "اس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا اب مجھے فرصت ہے، میں نے کہا فرصت ہی فرصت ہے۔ میرا جواب سن کر اس نے مجھے چالیس صفحے ٹائپ کرنے کے لیے دے دیے۔ فریبی کہیں کا۔"

اقوالِ زرین

یہ سراسر لاعلمی اور غلط فہمی ہے کہ ایسے سارے اقوال مس زرین کے ہوتے ہیں۔ اس کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں ہوتی اور لوگ من گھڑت باتیں اس بے چاری سے منسوب کر دیتے ہیں۔

یہ دراصل ایسے اقوال ہوتے ہیں جو پڑھنے اور سننے میں بہت حسین، دل آویز، ولولہ انگیز اور تاثر آمیز ہوتے ہیں لیکن ان پر کسی نے کبھی عمل نہیں کیا ہوتا۔ یہ خوش خطی میں لکھوا کر گھروں، دفاتر، مطالعہ گاہوں اور خانقاہوں میں دیواروں پر آویزاں کرنے کے کام آتے ہیں۔ بعض جرائد اور رسائل میں یہ خالی جگہیں پُر کرنے کے لیے بہت کارآمد ثابت ہوتے ہیں۔

کمال کی ایک بات یہ ہوتی ہے کہ آپ اپنی مرضی کا کوئی بھی فقرہ لکھ کر کسی بھی بڑے نام سے منسوب کر دیں، آپ کی کوئی گرفت نہیں ہوگی۔ بڑے لوگ عموماً آنجہانی ہوتے ہیں۔ وہ عالم بالا سے کوئی احتجاج کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوتے۔ ادب کے ٹھیکے دار اور نقاد ایسی سطروں کو حقیر اور ناقابلِ توجہ گردانتے ہیں۔ رہا ایڈیٹر... تو وہ خوش ہوتا ہے کہ آڑے وقت میں صفحہ یا کالم پورا کرنے کے لیے مفت کا مال دستیاب ہوتا ہے۔ اپنا نام چھپا ہوا دیکھ کر اقوال نویس بھی شدید خوشی سے دوچار ہوجاتے ہیں۔ قلم کاری میں یہ واحد سودا ایسا ہوتا ہے جس میں ہر فریق تنقید اور تنقیص سے بے نیاز ہو کر خوشی سے نہال رہتا ہے۔

امریکا سے جاوید کاظمی کا مکالمہ

اپنے آپ کو ہلاک کیا ہے۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ایسا ہرگز نہیں ہوا ہوگا۔''

''او کے مسٹر ولیم! اطمینان رکھو اور پُرسکون ہو جاؤ۔ میں ایک ہومی سائیڈ ڈیٹیکٹیو ہوں اگر ہم اس معاملے کو سنجیدگی سے نہیں لے رہے ہوتے تو میں یہاں موجود نہ ہوتا۔ اگر یہ خودکشی نہیں ہے تو میں پتا چلا لوں گا۔'' نارووڈ نے ایک کرسی گھسیٹی اور بوڑھے ولیم کے برابر میں بیٹھ گیا۔

''او کے، اپنی سانسیں درست کر لو۔ میں سمجھ رہا ہوں کہ لاش تم نے دریافت کی ہے۔ مجھے بتاؤ کہ کیا ہوا تھا؟''

''ہم دونوں ہر روز صبح سڑک پر آگے واقع کافی شاپ میں ملاقات کیا کرتے تھے۔ آج صبح جب البرٹ نہیں آیا تو مجھے فکر لاحق ہوگئی۔ اس نے یہ نہیں بتایا تھا کہ اسے کہیں جانا ہے۔ سو میں اس کے اپارٹمنٹ چلا آیا اور اندر داخل ہو گیا۔''

''تمہارے پاس اس کے اپارٹمنٹ کی چابی کیوں تھی؟''

''البرٹ اور میں دونوں ہی بوڑھے تھے اور دونوں ہی تنہا رہتے تھے۔ میرے پاس اس کے فلیٹ کی چابی تھی اور اس کے پاس میرے فلیٹ کی۔ صرف اس لیے کہ کبھی ضرورت پڑ سکتی تھی۔''

''او کے، تو تم اپارٹمنٹ میں داخل ہو گئے۔ پھر کیا ہوا؟''

''میں اس کا نام لے کر پکارتا رہا لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔ میں نے بیڈروم میں داخل ہونے کی کوشش کی لیکن دروازہ لاک تھا۔ سلائڈ بولٹ بھی لگا ہوا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں۔ سو میں نے نائن ون ون پر فون کر دیا۔ وہ لوگ آ گئے اور انہوں نے دروازہ توڑ دیا۔''

''جب تم نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی تھی تو دروازے کا لٹو گھوم رہا تھا یا وہ بھی لاک تھا؟''

ولیم ایک منٹ تک سوچتا رہا، پھر بولا۔ ''اب جبکہ تم نے تذکرہ کیا ہے تو مجھے یاد آیا کہ وہ گھوم رہا تھا۔ کیا یہ عجیب سی بات نہیں؟''

''ہاں، عجیب سی تو ہے۔'' نارووڈ یہ کہہ کر اٹھا اور کھلے ہوئے دروازے کے پاس چلا گیا۔ اس نے ایک پین کی مدد سے دروازے کو پیچھے کی طرف دھکیلا اور ناب کا جائزہ لینے لگا۔

باہر کی ناب میں ایک باریک سا سوراخ تھا جبکہ ناب کے اندرونی حصے میں ایک پش بٹن لگا ہوا تھا۔ بٹن باہر نکلا ہوا تھا اور لاک نہیں تھا۔ پھر نارووڈ نے دروازے کے فریم کا معائنہ کیا۔ سلائڈ بولٹ کی اسٹرائک پلیٹ اور دروازے کی ناب اس وقت ٹوٹ کر ڈھیلی پڑ چکی تھیں جب دروازے کو توڑا گیا تھا۔

نارووڈ نے اپنے ہاتھوں میں دستانے پہننے کے بعد لاک کا بٹن پش کر دیا اور پھر چٹخنی بھی کھسکا دی۔ بٹن باہر نکل آیا۔ ''یہ تالا کھل جاتا ہے جب کوئی دروازہ بند کرتا ہے۔''

''ہاں، ہم نے اس قسم کا تالا اس لیے چنا تھا کہ اس طرح ہمارے لیے یہ بے حد آسانی ہو جاتی تھی کہ ہم کمرے سے باہر سے خود کو لاک کر لیا کرتے تھے۔''

''ہم؟''

''میرے بیڈروم کے دروازے پر بھی اسی قسم کا لاک لگا ہوا ہے۔'' بوڑھے ولیم نے بتایا۔

نارووڈ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ پھر اپنی جیب سے خودکشی کے پیغام والا کاغذ نکالا اور بولا۔ ''مسٹر البرٹ کے دوست ہونے کی حیثیت سے تم اس کا کیا مطلب نکالو گے؟''

بوڑھے ولیم نے اس پیغام کا غور سے جائزہ لیا، پھر بولا۔ ''سراغ رساں، یہ پیغام البرٹ کا تحریر کردہ نہیں ہے۔ یہ سوچ کر اسے دلی اذیت پہنچتی کہ اس قسم کا پیغام اس سے منسوب کیا جائے گا۔''

''کیوں؟''

''البرٹ ایک ہائی اسکول انگلش ٹیچر ہوا کرتا تھا۔ وہ ایک رائٹر بھی تھا۔ وہ مشہور تو نہیں تھا لیکن اسے لکھنے لکھانے سے عشق تھا۔ وہ کہانیاں، آرٹیکلز، بلاگس تحریر کیا کرتا تھا۔ قواعد زبان کے معاملے میں وہ بے حد محتاط تھا۔ وہ آج کل کے دور کی تحریروں میں گرامر کی غلطیوں کی خاص طور پر نشاندہی کیا کرتا تھا اور ہر روز اسی کام میں جتا رہتا تھا۔ بعض اوقات یہ بڑا تھکا دینے والا کام ہوتا تھا لیکن یہ اس کی انگریزی گرامر سے شدید رغبت تھی جو وہ کسی غلطی کو برداشت نہیں کرتا تھا۔ اس لیے اس بات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ کبھی ایسی خلافِ قواعد تحریر لکھ سکتا ہے۔''

نارووڈ نے یہ سن کر اس پیغام کو بار بار پڑھا پھر بولا۔ ''میں شاید انگریزی گرامر سے اپنی لاعلمی کا راز افشا کر رہا ہوں، لیکن اس تحریر میں کیا غلط ہے؟''

''او کے، یہاں پیغام میں لکھا ہے۔ 'مجھے نہیں معلوم کہ اس کا دوش کسے دیا جائے' (I don't know whc to blame)۔ یہ غلط ہے۔ ہونا یہ چاہیے۔ (I

میں (don't know whom to blame۔
جانتا ہوں کہ یہ دقیانوسی لگ رہا ہے۔ لیکن درست گرامر یہی
ہے۔ درحقیقت البرٹ کو اس طرح کا جملہ لکھنا چاہیے تھا۔ (I
یہ (don't know who's to blame بھی
درست ہے۔ لیکن اس سے بدتر یہ ہے۔ البرٹ کبھی بھی
"alright" استعمال نہیں کرسکتا۔ مجھے یاد ہے ایک مرتبہ
اخبار کے ایک آرٹیکل میں یہ لفظ شائع ہونے پر وہ بہت گرجا
برسا تھا۔ یہ دو الفاظ ہونے چاہئیں "all right"۔

''ٹھیک ہے، اگر اس نے خود کو ہلاک کیا ہے تو وہ ذہنی دباؤ میں تھا۔ اس کے سبب لوگ زیادہ اضطراری رویے کی جانب پلٹ آتے ہیں۔''

''البرٹ کے لیے اضطراری کا مطلب گرامر کے لحاظ سے درست ہونا ہے۔'' ولیم نے کاغذ پر درج پیغام کی جانب اشارہ کیا۔ ''یہ البرٹ کی تحریر ہرگز نہیں ہے۔''

سراغ رساں ناروڈ اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔ ''او کے، مسٹر ولیم۔ تمہارا حقائق کو بھانپنے کا شکریہ۔ اب تم جا سکتے ہو۔ ہمیں جو کچھ بھی پتا چلے گا ہم تمہیں باخبر کردیں گے۔''

ناروڈ نے علاقے کے پولیس اسٹیشن میں فون کرکے موت کے سبب کو مشتبہ قرار دے دیا اور ایک مکمل فارنسک ٹیم بھیجنے کی درخواست کی۔

جب وہ ان لوگوں کی آمد کا انتظار کررہا تھا تو اس نے سوچا کہ بیڈ روم کے دروازے کا جائزہ لے لیا جائے۔ جائزہ کے دوران ایک دھبے نے اس کی توجہ مبذول کرالی۔ دروازے کے پہلو میں رنگ کا ایک حصہ اکھڑا ہوا تھا جیسے کہ اس پر کوئی چیز چپکائی گئی تھی۔ وہ جو کوئی بھی شے تھی وہ سلائڈنگ بولٹ کے لیول میں چسپاں کی گئی تھی۔

وہ فرش پر جھک گیا۔ رنگ کے چند ننھی ذرات فرش پر بکھرے ہوئے تھے۔ یقیناً کوئی چیز دیوار پر چپکائی گئی تھی جس کے اکھاڑنے سے رنگ بھی اتر گیا تھا۔ یہ تصور کرنے میں کوئی زیادہ محنت کرنے کی ضرورت نہیں تھی کہ وہ کیا چیز ہو سکتی تھی۔

فارنسک کی ٹیم پہنچ گئی اور ابھی انہوں نے اپنا کام شروع کیا ہی تھا کہ 'آہا' کی ایک بلند آواز نے ناروڈ کو نوید سنادی کہ انہیں کوئی نہ کوئی کامیابی حاصل ہوگئی ہے۔ وہ اس فرد کی جانب بڑھ گیا جس نے حیرت کا نعرہ بلند کیا تھا۔ ''کیا معاملہ ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''میں نے ریوالور میں سے تمام گولیاں باہر نکال لی تھیں تاکہ ان پر سے انگلیوں کے نشانات حاصل کرنے

یاد

ایک مرتبہ جوش ملیح آبادی اپنے گھر میں چند بے تکلف دوستوں سے اپنی محبوباؤں کا تذکرہ کررہے تھے۔ یہ ذکر کرتے ہوئے وہ اتنے جذباتی ہوئے کہ ان کی آنکھیں نمناک ہوگئیں۔

اسی عالم میں اچانک ان کی بیگم کمرے میں داخل ہوئیں اور جوش صاحب کو روتے دیکھ کر اس کا سبب پوچھا۔

جوش صاحب گھبرا کر بولے۔ ''وہ... وہ کچھ نہیں بس ذرا اماں یاد آگئی تھیں۔''

مرغ کا انڈا

1474ء میں سوئٹزرلینڈ کے شہر بال میں لوگوں نے ایک مرغے کو پکڑ کر عدالت میں پیش کردیا۔ اس کا جرم یہ تھا کہ اس نے انڈا دے دیا ہے۔ بال کے لوگوں میں یہ روایت مشہور تھی کہ مرغ کے انڈے کی تلاش میں جادوگر مارے مارے پھرتے رہتے ہیں اگر یہ انڈا کسی جادوگر کے ہاتھ لگ جاتا تو وہ یقیناً کوئی جادو کرگزرتا اور اس زمانے میں جادو قانوناً جرم تھا۔

عدالت نے مدعیان سے پوچھا۔ ''اس بات کا کوئی ثبوت کہ یہ انڈا اسی مرغ کا ہے؟''

مدعیان نے جواب دیا۔ ''یہ انڈا اسی مرغ کے نیچے سے نکلا ہے جو ظاہر ہے اس کے سوا کسی اور کا نہیں ہوسکتا۔''

یہاں بھی مرغ کی طرف سے ایک وکیل کھڑا ہوگیا۔ اس نے مرغے کی طرف سے صفائی پیش کی۔ ''حضور والا! اگر یہ واقعہ ہے کہ مرغے نے انڈا دیا ہے تو اسے اس معاملے میں مجبور سمجھا جائے کیونکہ اگر وہ وسائل مرغے کے بس میں ہوتے جن سے یہ اس جرم سے بچ سکتا تو قطعی بچ جاتا۔ اس لیے اسے رہا کردیا جائے۔''

مگر عدالت نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ ''چونکہ یہ بات طے شدہ ہے کہ جادوگر مرغ کے انڈے کی تلاش میں رہتے ہیں اور اسے وہ اپنے شیطانی اغراض کی خاطر جادوگری کے کام میں استعمال کرتے ہیں اس لیے عدالت وکیلِ صفائی کے بیان کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھتی اور مرغے کو سزائے موت دیے جانے کا حکم صادر کرتی ہے اور عدالت کو یقین ہے کہ یہ سزا دوسرے مرغوں کے لیے نمونۂ عبرت ثابت ہوگی۔''

لنڈی کوتل سے عجب خان کی داستان

کے لیے ان پر پوڈر چھڑک دوں۔ لیکن مجھے ان پر سے زیادہ اہمیت کی کوئی چیز مل گئی۔ ان گولیوں پر فائر کی گھمٹ کے تختی سے ذرات کے ساتھ خون کے نشانات بھی موجود ہیں۔''

''کیا تم مجھے یہ بتا سکتے ہو کہ خون کتنا پرانا ہے؟''

''اس کے لیے لیبارٹری کے نتائج کا انتظار کرنا ہوگا، لیکن دیکھنے میں یہ تازہ لگ رہا ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ یہ نشانات پچھلے چند گھنٹوں کے دوران لگائے گئے ہیں۔''

''سو اس بوڑھے نے خود کو شوٹ کرنے کے بعد اپنا ریوالور لوڈ کیا تھا؟ یہ ایک عمدہ چال ہے۔ او کے۔ یہ اب ہومی سائیڈ کا کیس ہے۔''

☆☆☆

سراغ رساں نارووڈ نے انٹروگیشن روم میں داخل ہونے کے بعد دروازہ بند کر دیا اور فائل فولڈر میز پر رکھ کر جیرالڈ کے مقابل کرسی پر بیٹھ گیا۔ ''مسٹر جیرالڈ، تمہارے باپ کی ناگہانی موت پر میری تعزیت قبول ہو۔''

''شکریہ۔'' جواب سرسری انداز میں دیا گیا۔

''پلیز، میرے سوالات کا بُرا مت منانا، لیکن یہ سوالات پوچھنا ضروری ہیں۔ تم جانتے ہو گے کہ یہی طریقہ کار ہے۔''

''او کے۔''

''صرف ریکارڈ کے لیے، گزشتہ شب دس اور دو بجے کے درمیان تم کہاں تھے؟''

''میں... میں گھر پر تھا۔''

''کیا کوئی تمہاری اس بات کی تصدیق کر سکتا ہے؟''

''نہیں، میں تنہا تھا۔ لیکن یہ سب کیا ہے؟ میرے باپ نے خود اپنے آپ کو ہلاک کیا ہے۔''

''مسٹر جیرالڈ، مجھے افسوس ہے ہمارے پاس ثبوت ہے کہ انہیں قتل کیا گیا ہے۔ کوئی رات کو وہاں گھسا اور انہیں مار ڈالا۔''

جیرالڈ کی آنکھیں پھٹ پڑیں اور منہ لٹک گیا۔ ''قتل؟ نہیں۔ انہوں نے اپنے آپ کو خود مارا ہے۔ وہ اپنے کمرے میں لاک تھے۔''

''کیا وہ رات کو ہمیشہ اپنا کمرا لاک کر کے رکھتے تھے؟''

''ہاں، ان کا کہنا تھا کہ انہیں ڈر لگتا ہے کہ کوئی گھر میں نہ گھس آئے۔ چند ماہ قبل ان کے ایک دوست کو لوٹنے کے بعد مارا پیٹا بھی گیا تھا۔ کیا تمہارے خیال میں ڈیڈی کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا ہوگا؟''

''ہم ابھی تحقیقات کر رہے ہیں۔ لیکن ایک فرد ایسا ہے جو شاملِ تفتیش نہیں ہو سکا ہے۔ ہمارے پاس وڈیو ہے جس میں ایک مشتبہ فرد رات گیارہ بجے کے فوراً بعد کنڈومینیم میں داخل ہوا ہے۔''

''تمہارے خیال میں یہ اسی نے کیا ہے؟''

نارووڈ نے شانے اچکا دیے۔ ''ہم یقینی طور پر اس سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ کیا تمہیں یقین ہے کہ گزشتہ شب تم اپنے باپ سے ملنے نہیں گئے تھے؟''

''میں وثوق سے کہہ رہا ہوں۔ تم یہ کیوں سوچ رہے ہو کہ وہ میں تھا؟''

''مسٹر جیرالڈ، میں تمہیں کسی چیز کا الزام نہیں دے رہا ہوں۔ میں صرف سوالات پوچھ رہا ہوں۔ جو فرد وڈیو میں ہے اس کے پاس کنڈومینیم کی چابی تھی۔ ہم نے یہ دریافت کر لیا ہے کہ وہ کنڈومینیم کے رہائشیوں میں سے کوئی بھی نہیں تھا اور ہم نے یہ تصدیق بھی کر لی ہے کہ کنڈومینیم کی اسپیئر چابی صرف چار افراد کے پاس ہے۔ تم ان میں سے ایک ہو۔''

''ایک منٹ رک جاؤ۔ کیا تم یہ کہہ رہے ہو کہ میں کنڈومینیم گیا تھا اور میں نے اپنے بوڑھے باپ کو قتل کر دیا؟''

نارووڈ نے قدرے توقف کیا، پھر بولا۔ ''مسٹر جیرالڈ، کیا تمہیں اپنے باپ کے وصیت نامے کی تفصیل معلوم ہے۔''

''کیوں نہیں۔ انہوں نے سب کچھ میرے لیے چھوڑا ہے۔ بیس لاکھ ڈالرز سے زیادہ کی رقم۔ اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ میں نے اسے کس طرح خرچ کرنا ہے۔ کیسینوز میں قمار بازی میں، پارٹیوں سے لطف اندوزی میں، عورتوں کے ساتھ رنگ رلیاں منانے میں۔''

''اور اس میں سے کچھ حصہ تم شائیورز کو ادا کرنے میں استعمال کر سکو گے۔'' سراغ رساں نے کہا۔

''کسے؟''

''کم آن مسٹر جیرالڈ! احمق مت بنو۔ ہم نے تمہارے بیک گراؤنڈ کو بھی کھنگالا ہے۔ تم شائیورز کے بیس ہزار ڈالرز کے مقروض ہو۔''

''اس وقت تک جب تک اپنے بوڑھے باپ کی رقم میرے ہاتھ نہیں آجاتی۔''

''میرا مشورہ ہے کہ تم مسٹر شائیورز کے ساتھ معاملات طے کرنے کے لیے کہیں اور سے کچھ حاصل کرنے

کی کوشش کرو۔ اس لیے کہ تمہیں اپنے ورثے کی رقم اتنی جلدی نہیں ملے گی۔''

''کیا؟ کیوں نہیں؟''

''کیا تم سلیئرز قانون سے شناسا ہو؟''

''اوں، نہیں۔''

''سلیئرز قانون ایک قانونی ہدایت نامہ ہے جو قاتلوں کو ان کے شکار کی جائداد سے وراثت ملنے پر بندش عائد کرتا ہے۔ یہ ہر جگہ تسلیم نہیں کیا جاتا لیکن یہاں مانا جاتا ہے۔''

''لیکن میں نے اپنے باپ کو قتل نہیں کیا ہے۔ تم پہلے ہی کہہ چکے ہو کہ تم مجھ پر اس کا الزام عائد نہیں کر رہے ہو۔''

''نہیں مسٹر جیرالڈ۔ لیکن کسی نہ کسی نے تو انہیں قتل کیا ہے اور جب تک ہم اندازہ نہیں لگا لیتے کہ وہ کون ہے یا تمہیں شبہے سے خارج ازامکان قرار نہیں دے دیتے، تمہارے باپ کی جائداد منجمد رہے گی۔ آخر کو ہم اسے کسی قاتل کے سپرد تو نہیں کر سکتے۔''

جیرالڈ کا منہ کھلا رہ گیا اور آنکھیں پھٹ گئیں۔

''تمہارا مطلب ہے کہ رقم مجھے نہیں ملے گی؟''

''اوہ، ایک بار ہم یہ کیس حل کر لیں تو پھر رقم تمہاری ہے... بشرطیکہ جرم تم نے نہ کیا ہو۔ لیکن اس میں وقت لگے گا۔''

''کتنا وقت لگے گا؟''

''یہ ایک سیدھا سادہ کیس ہے اور اس میں کوئی پیچیدگی نہیں ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ دو تین سال میں اس کا فیصلہ ہو جائے گا۔''

''دو تین سال؟ میں اس تمام عرصے کیا کروں گا؟'' جیرالڈ نے دُہائی دی۔

''میرا اس سے کوئی سروکار نہیں۔ جیسا کہ میں نے کہا شائیورز سے سمجھوتا کر لو۔''

''یہ کوئی آپشن نہیں ہے۔ تم بخوبی جانتے ہو۔''

''مسٹر جیرالڈ، میری واحد دلچسپی تمہارے باپ کے قاتل کو گرفتار کرنا ہے اور اس بات کو یقینی بنانا ہے کہ وہ اپنے انجام کو پہنچ جائے۔ اس کے سوا کچھ نہیں۔''

جیرالڈ نے تیوریاں چڑھالیں۔ ''یہ محض ایک چال ہے۔ تم مجھے شائیورز سے اس حد تک خوف زدہ کرنا چاہتے ہو کہ میں اعترافِ جرم کر لوں۔''

''میرا ایسا کوئی خیال نہیں ہے۔ بہر طور اعترافِ جرم تمہارا بدترین آپشن ہوگا۔ تمہیں رقم کا ایک دھیلا بھی نہیں ملے گا اور اعترافِ جرم تمہیں شائیورز سے بچنے میں کوئی مدد نہیں دے گا۔''

جیرالڈ کے چہرے کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ ''نہیں، تم مجھے حفاظتی تحویل میں ڈال دو۔''

''کس لیے؟ سرکاری طور پر تم نے کوئی غلط کام نہیں کیا ہے۔ ہمارے پاس تمہیں حراست میں لینے کا کوئی جواز نہیں ہے۔'' نارووڈ نے کہا۔

''میرے پاس ایسا کوئی راستہ نہیں ہے کہ میں شائیورز کا قرض کبھی لوٹا سکوں گا۔ وہ مجھے مار ڈالے گا۔''

''اگر اس نے ایسا کیا تو میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ ہم اس کی بھرپور تحقیقات کریں گے۔'' نارووڈ نے فائل فولڈر بند کرتے ہوئے کہا پھر اٹھ کھڑا ہوا اور دروازے کی جانب بڑھنے لگا۔

پھر وہ رکا، واپس پلٹا اور بولا۔ ''تمہیں معلوم ہے مسٹر جیرالڈ، جس کسی نے بھی تمہارے باپ کو قتل کیا ہے اس نے ایک بڑی غلطی کی ہے جو بدقسمتی سے تمہاری زندگی کو پیچیدہ بنانے والی ہے۔''

''غلطی؟''

''اس نے بے انتہا کوشش کی کہ یہ ایک خودکشی ظاہر ہو۔ چپکنے والا ہک، نصف خواندہ خودکشی کا پیغام، گولیوں کے وہ خول جن پر تمہارے باپ کی انگلیوں کے نشانات ہیں، دروازے کے ہینڈل کا تالا کھلا ہوتا۔ ان تمام چیزوں نے ہم پر واضح کر دیا کہ یہ ایک قتل کی واردات ہے۔ اگر قاتل نے ریوالور تمہارے باپ کے ہاتھوں میں پکڑا دیا تھا پھر اسے شوٹ کر دیا جیسے اس نے خود کو شوٹ کیا ہو اور اطمینان سے باہر نکل گیا تو امکانات اس بات کے تھے کہ کورونر اسے خودکشی قرار دے دیتا اور تمہیں اب تک تمہاری رقم مل چکی ہوتی۔ تاہم، لیکن فکر نہ کرو، مسٹر جیرالڈ، یہ سب کچھ چند برسوں میں طے ہو جائے گا اور یہ فرض کرتے ہوئے کہ قاتل تم نہیں ہو، تب تمہاری رقم تمہیں مل جائے گی... یا پھر یہ تمہارے ترکے کا حصہ بن جائے گی۔''

جیرالڈ پر سکتے کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔

سراغ رساں نارووڈ نے تیکھی نظروں سے جیرالڈ کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''کیا تمہارا وصیت نامہ تیار ہے؟''

زیروزبر

حسام بٹ

سمندر کبھی پُرسکون ہوتا ہے... کبھی مہربان... کبھی ناراض اور کبھی اس قدر ناراض کے غصے میں دیوانہ ہو جاتا ہے... بالکل اسی طرح انسانی کردار میں بھی اسی طرح کی خصوصیات اکٹھی ہو جاتی ہیں۔ وقت اور حالات کے پیشِ نظر ان کی عادتیں... خصلتیں اور ان کے چہرے کے زاویے بھی بدلتے جاتے ہیں... مگر یہ بھی سچ ہے کہ فطرت کبھی نہیں بدلتی... جو غصہ ور ہے... وہ ہمیشہ ایسے ہی آگ میں جھلستا رہتا ہے... اور کچھ لوگوں کی فطرت میں جھوٹ... فریب... ریاکاری اور دھوکا دہی گویا کے ان کے خمیر میں شامل رہتی ہے... ایسے ہی خاندان پر گزرنے والی بپتا کا احوال... ایک بھلائی ان کے لیے برائی بن گئی اور مصیبت کو دعوت دے بیٹھے... اور اعتماد کر کے مزید الجھنوں کا شکار ہو گئے...

ہمارے معاشرے میں بکھرے کرداروں کی پل، پل رنگ بدلتی فطرت کے حیرت انگیز انداز...

اسکول کی چھٹی ہونے میں چند منٹ باقی تھے۔ فوزیہ اپنی وہائٹ وٹز میں بیٹھی ونڈ اسکرین کے پار اسکول کے گیٹ کو دیکھ رہی تھی۔ اس کا دس سالہ اکلوتا بیٹا نومی اسی اسکول میں پڑھتا تھا۔ یہ شہر کا ایک مہنگا پرائیویٹ اسکول تھا۔ فوزیہ خود ہی نومی کو پک اینڈ ڈراپ دیا کرتی تھی۔

گیٹ کھلا اور اسکول کے اندر سے بچوں کا ایک سیلِ آب سامنے آیا۔ بچے چھٹی کے وقت جس رویّے کا مظاہرہ کرتے ہیں اسے دیکھ کر تو یہی محسوس ہوتا ہے کہ اسکول ان کے لیے کسی جیل سے کم نہیں۔ جلد ہی فوزیہ کو نومی کی صورت نظر آگئی۔ وہ بیگ اٹھائے تیزی سے گاڑی کی جانب بڑھ رہا تھا۔

فوزیہ نے پسنجرز سائڈ کا دروازہ کھول دیا۔ نومی نے بیگ اتارا اور گردن جھکا کر اسے گاڑی کی عقبی نشست پر پھینک دیا پھر پسنجر سیٹ پر براجمان ہو کر دروازہ بند کر دیا۔

فوزیہ نے گاڑی اسٹارٹ کی اور آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔ ''جانو کا آج کا دن کیسا رہا؟''

''بہت عمدہ مما۔''

''بدتمیز بچے نے پھر کوئی حرکت تو نہیں کی؟''

''نہیں مما۔'' نومی نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''جب سے آپ نے پرنسپل سے اس کی شکایت کی ہے، وہ ایک دم سدھر گیا ہے۔''

''گڈ!'' فوزیہ ڈرائیونگ پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے بولی۔ ''ایسے ہی لوگوں کے لیے ''لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے'' والا محاورہ ایجاد کیا گیا تھا۔ ہر کلاس میں ایک نہ ایک ایسا شرانگیز بچہ ضرور ہوتا ہے جو اپنی حرکتوں سے دوسروں کا ناک میں دم کیے رکھتا ہے۔ ایسے کمینے بچے باتوں سے یا نصیحتوں سے قابو نہیں آتے۔ ان کے خلاف کمانڈو ایکشن لینا ہی پڑتا ہے۔''

''آپ ٹھیک کہتی ہیں مما۔'' نومی تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''اس خبیث نے مجھ سے پہلے اور بھی کئی لڑکوں کو تنگ کر رکھا تھا لیکن کسی نے اس کا ہاتھ روکنے کی کوشش نہیں کی اور وہ شیر ہو گیا۔ آپ نے پرنسپل سے اس کی شکایت کر کے بہت اچھا کیا ہے۔ دوسرے بچے بھی بہت خوش ہیں۔''

''اب اگر وہ کسی کے ساتھ بدتمیزی کرے گا تو اسکول سے باہر جائے گا۔'' فوزیہ نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''جانو! میری ایک بات ذہن میں نقش کر لو۔ کسی بھی برائی کو یا تو پہلے ہی قدم پر روکا جا سکتا ہے یا پھر کبھی نہیں روکا جا سکتا!''

''وہ اپنے ڈیڈی کا نام لے کر ہم سب پر بہت رعب

جمایا کرتا تھا۔'' نومی نے کہا۔ ''اس کا ڈیڈی کوئی سیاست داں ہے اور سنا ہے، اس کی بہت چلتی ہے۔''

''جانو! آپ اِن فضول باتوں پر دھیان نہیں دیا کرو۔'' فوزیہ نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''آپ کا فوکس صرف اور صرف پڑھائی پر ہونا چاہیے۔''

''جی مما...'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ پھر قدرے سہمے ہوئے لہجے میں مستفسر ہوا۔ ''اس کے ڈیڈی ہمارے خلاف کوئی کارروائی تو نہیں کریں گے؟''

''مثلاً؟'' فوزیہ نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''ایک لڑکا بتا رہا تھا کہ اس کے سیاست داں ڈیڈی نے بہت سارے غنڈے بھی پال رکھے ہیں۔'' نومی نے بدتمیز بچے کے حوالے سے بتایا۔ ''یہ لوگ کوئی ایسی ویسی حرکت تو کر سکتے ہیں نا۔''

''کچھ نہیں ہوگا جانو۔'' وہ مضبوطی سے بولی۔ ''اول تو مجھے یقین ہے کہ وہ بچہ اپنے ڈیڈی کو اس بارے میں کچھ بتائے گا ہی نہیں۔ دوم، اگر وہ ایسا کرتا بھی ہے تو یہ بہت معمولی سا ایشو ہے۔ اس کے ڈیڈی اس پر کوئی سخت ایکشن لینے کے بارے میں نہیں سوچ سکتے اور پھر آپ کے مما پاپا ہیں نا... ہم آپ پر بھی کوئی آنچ نہیں آنے دیں گے۔ بی ریلیکس جانو۔''

''مما... کیا پاپا مجھ سے ناراض ہیں؟'' اس نے معصومیت سے پوچھا۔

''نہیں۔'' فوزیہ نے حیرت سے نومی کی طرف دیکھا۔ ''آپ ایسا کیوں سمجھ رہے ہو؟''

''دو تین دن سے وہ ٹھیک طرح مجھ سے بات نہیں کر رہے۔'' اس نے بتایا۔ ''مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ کسی بات پر مجھ سے خفا ہوں۔''

''ایسی کوئی بات نہیں ہے جانو۔'' فوزیہ جلدی سے بولی۔ ''آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ پاپا کبھی آپ سے ناراض نہیں ہو سکتے۔ ہاں، ایک بات ہے...'' لمحاتی توقف کے بعد اس نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔

''پچھلے دو تین دن سے میں بھی انہیں خاصا الجھا ہوا محسوس کر رہی ہوں۔ پتا نہیں، یہ کام کا دباؤ ہے یا کچھ اور... ایک کام کرتے ہیں جانو۔''

''کون سا کام مما؟'' نومی نے پوچھا۔

''آج جمعہ ہے۔ کل اور پرسوں آپ کی چھٹی ہے۔'' فوزیہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''اس لیے آپ رات دیر تک جاگ سکتے ہو۔ آج رات کو جب آپ کے پاپا گھر آئیں تو ہم انہیں گھیر کر بیٹھ جائیں گے اور جب تک وہ اپنی

الجھن کی وجہ نہیں بتائیں گے، ہم انہیں چھوڑیں گے نہیں۔''
''یہ ٹھیک ہے۔'' نومی خوش ہوتے ہوئے بولا۔
''میں ان سے سیکیورٹی گارڈ کی بھی ضد کروں گا۔ آپ کو پتا ہے نا، پچھلی رات کیا ہوا تھا...!''
گزشتہ رات، نصف شب کے قریب نامعلوم افراد ان کے بنگلے کے گیٹ پر گولیاں برسا کر تاریکی میں غائب ہو گئے تھے۔ اس فائرنگ کا سبب کسی کی بھی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ نومی کا اشارہ اسی واقعے کی جانب تھا۔
''آپ ٹھیک کہتے ہو جانو۔'' فوزیہ نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اب تو وہ وقت آگیا ہے کہ اگر آپ کی کسی سے بھی دشمنی نہیں جب بھی آپ کو سیکیورٹی گارڈ کی ضرورت ہے۔ میں سمجھتی ہوں، رات والی بے مقصد فائرنگ کا ہم لوگوں سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ اس شہر میں بہت سارے کام بے مقصد ہی ہو رہے ہیں تاہم میں بھی آپ کے پاپا پر زور دوں گی کہ وہ سیکیورٹی گارڈ ضرور رکھیں۔ سیکیورٹی گارڈ والا معاملہ ایسا ہی ضروری ہو گیا ہے جیسا کہ مہینے بھر کا سودا سلف۔''
ان ماں بیٹے کے درمیان گفتگو کا سلسلہ جاری تھا۔ فوزیہ کی گاڑی اب گنجان علاقے سے نکل کر مضافات کی جانب بڑھ رہی تھی۔ پہلے وہ شہر کے مرکزی حصے میں رہتے تھے لیکن پچھلے دو سال میں انہوں نے شہر سے باہر ایک پُرسکون علاقے میں بنگلا بنالیا تھا۔ یہ بہت عمدہ رہائشی منصوبہ تھا لیکن ابھی یہ پوری طرح آباد نہیں ہوا تھا۔ اس پروجیکٹ کے پچیس فیصد حصے پر ابھی تعمیراتی کام جاری تھا۔
''مما! رائیڈ والی روڈ آگئی۔'' نومی نے دلچسپ نظر سے ونڈ اسکرین کے پار دیکھتے ہوئے کہا۔
نومی نے اس سڑک کو ''رائیڈ والی روڈ'' یعنی جھولا دلانے والی سڑک کا نام دے رکھا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ اس روڈ کا کچھ حصہ بری طرح ٹوٹا ہوا تھا، لگ بھگ دو سو گز سڑک پر چھوٹے بڑے ہر سائز کے گڑھے موجود تھے اور گندے پانی کے جوہڑ بھی جگہ جگہ بہتے نظر آتے تھے۔ یہ واٹر بورڈ، کے ڈی اے اور کے ایم سی کی مشترکہ کوششوں کے ''ثمرات'' تھے کہ روڈ کے اس حصے پر پہنچ کر آپ کو اپنی گاڑی کو جوں کی رفتار پر لانا پڑتا تھا تاکہ آپ اپنی گاڑی کے اندر بیٹھ کر کسی رائیڈ کے ہچکولوں کا مزہ لے سکیں۔
فوزیہ نے سڑک کے اس متاثرہ حصے پر پہنچ کر گاڑی کی رفتار بالکل کم کر دی گویا ہچکولے بھرے سفر کا آغاز ہو گیا۔ یہاں سے ان کی رہائش صرف آدھے کلومیٹر کے فاصلے پر تھی۔ لہٰذا وہ لوگ اس اطمینان کے ساتھ یہ لحاتی

اذیت برداشت کر لیتے تھے کہ اس کے بعد گھر پہنچ جانا تھا۔
ابھی فوزیہ کی گاڑی سڑک کے متاثرہ حصے کے وسط ہی میں پہنچی تھی کہ فضا دھماکے کی آواز سے گونج اٹھی۔ انہیں ایسا ہی محسوس ہوا تھا کہ یہ دھماکا گاڑی کے اندر ہوا ہے لیکن جلد ہی فوزیہ سمجھ گئی کہ دھماکے کی وہ آواز گاڑی کے باہر سے آئی تھی۔
دھماکے کے ساتھ ہی گاڑی اپنا توازن کھو بیٹھی تھی۔ رفتار تو اس کی پہلے ہی بہت کم تھی لہٰذا چند جھٹکے کھانے کے بعد گاڑی رک گئی۔ نومی نے سراسیمہ نظر سے فوزیہ کو دیکھا اور پوچھا۔
''مما! کیا ہوا؟''
''پریشانی والی کوئی بات نہیں جانو۔'' وہ بیٹے کو تسلی دیتے ہوئے بولی۔ ''میرے خیال میں گاڑی کا ٹائر پھٹ گیا ہے۔''
''تو کیا گاڑی یہاں سے آگے نہیں جاسکے گی؟''
''میں نیچے اتر کر چیک کرتی ہوں۔'' فوزیہ نے کہا۔ ''اگر گاڑی ڈرائیونگ کے قابل نہیں بھی رہی تو کوئی مسئلہ نہیں۔ ہم گاڑی کو یہیں چھوڑ دیں گے اور ٹہلتے ہوئے پندرہ بیس منٹ میں گھر پہنچ جائیں گی۔''
''اوکے مما! آپ گاڑی کا ٹائر چیک کریں۔'' نومی نے اطمینان کی سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔
فوزیہ ڈرائیونگ سائڈ کا دروازہ کھول کر گاڑی سے باہر آگئی۔ سامنے والے دونوں ٹائر سلامت تھے۔ وہ گھوم کر گاڑی کی عقبی سمت میں پہنچ گئی اور جبھی اس کی نظر ایک فلیٹ ٹائر پر پڑی۔ مذکورہ ٹائر بری طرح پھٹ کر گراؤنڈ ہو چکا تھا۔ وہ جھک کر متاثرہ ٹائر کا جائزہ لینے لگی لیکن فوزیہ کی یہ کوشش کامیاب نہ ہو سکی۔
اگلے ہی لمحے عقب سے ایک مضبوط ہاتھ اس کے منہ پر آیا اور پھر وہیں جم کر رہ گیا۔ اس ہاتھ کے مالک کو فوزیہ دیکھ نہیں سکی تھی۔ مذکورہ ہاتھ میں کوئی رومال نما چیز دبی ہوئی تھی اور اسی رومال کی مدد سے اس شخص نے فوزیہ کی ناک اور منہ کو بڑی مضبوطی سے دبا رکھا تھا۔ رومال کے اندر سے اسپرٹ جیسے کسی کیمیکل کی تیز بو خارج ہو رہی تھی۔ فوزیہ کو یہ سمجھنے میں کوئی دقت پیش نہ آئی کہ وہ کلوروفارم میں بسا ہوا رومال تھا۔ جس کی مدد سے اسے بے ہوش کرنے کی کوشش کی جارہی تھی۔
اس کے بعد وہ کچھ سوچنے کے قابل نہ رہی۔ اس کا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔ آخری آواز جو اس کی سماعت سے ٹکرائی، وہ اس کے بیٹے نعمان کی تشویش بھری آواز تھی۔ وہ بڑے دہشت ناک انداز میں چلایا تھا۔
''مم... مما...!''

☆☆☆

پیشہ ورانہ زندگی بہت مصروف ہوتی ہے اور اگر پیشہ ڈاکٹری کا ہو تو پھر سمجھو سر کھجانے کی فرصت نہیں۔ ایک قابل ڈاکٹر گھر، کلینک اور اسپتال کے بیچ پنگ پونگ بنا رہتا ہے۔ ڈاکٹر جامی بھی ایک قابل ڈاکٹر تھا۔

جمال الدین عرف جامی ای این ٹی اسپیشلسٹ تھا۔ صبح نو بجے سے دوپہر دو بجے تک وہ ایک معروف پرائیویٹ اسپتال میں بیٹھتا تھا۔ پھر وہ گھر چلا جاتا۔ لنچ اور تھوڑے ریسٹ کے بعد وہ اپنے کلینک کی جانب روانہ ہو جاتا۔ اس کا کلینک شام چھ سے رات گیارہ بجے تک کا تھا تاہم آخری مریض کو نمٹاتے ہوئے بارہ بج ہی جایا کرتے تھے۔ ڈاکٹر جامی کے پاس اللہ کا دیا سب کچھ تھا۔ زندگی امن و آشتی سے بسر ہو رہی تھی۔ وہ اپنی مختصر سی فیملی کے ساتھ بہت خوش تھا۔ عزت، دولت، شہرت، صحت... سب اسے میسر تھا لیکن گزشتہ چند روز سے اس کی جمی جمائی زندگی میں اچانک تلاطم آ گیا تھا۔ اس انتشار کا آغاز ڈاکٹر سکندر والے واقعے سے ہوا تھا۔

ڈاکٹر سکندر جنرل فزیشن تھا اور ڈاکٹر جامی سے اس کی گہری دوستی تھی۔ ڈاکٹر سکندر بہت ہی تجربہ کار اور قابل ڈاکٹر تھا۔ وہ ہر دو تین ماہ کے بعد کسی نہ کسی میڈیکل سیمینار میں یورپ یا امریکا، آسٹریلیا یا کینیڈا مدعو رہتا تھا۔ سال میں آٹھ دس مرتبہ غیر ملکی دورہ لازمی تھا۔ وہ اکثر اپنی بیوی اور بچوں کو بھی ساتھ لے جایا کرتا تھا۔ سب کے پاسپورٹس پر لاتعداد ویزے اسٹمپ ہو چکے تھے اور کوئی نہ کوئی ویزا ویلڈ بھی رہتا تھا۔

ڈاکٹر سکندر کو ایک کروڑ کی پرچی آئی تو وہ پریشان ہو گیا۔ پرچی بھیجنے والوں نے اس کے حوالے سے مکمل ریکی کر رکھی تھی۔ اس پرچی کے ساتھ ایک سطری پیغام بھی درج تھا۔

''تمہارے پاس صرف چوبیس گھنٹے ہیں۔ ایک کروڑ کیش کا بندوبست کر لو اور وہ بھی ایک ہزار والے نوٹوں کی شکل میں۔ نوٹ استعمال شدہ ہونا چاہئیں اور... اگر پولیس سے رابطہ کیا تو نتائج کی ذمے داری تمہارے سر ہو گی۔ ہم حوالات اور ہتھکڑی سے ڈرنے والے نہیں ہیں۔''

ڈاکٹر سکندر نے ڈاکٹر جامی کو صورتِ حال سے آگاہ کیا کیونکہ وہ جامی کو اپنا سب سے زیادہ مخلص اور ہمدرد دوست سمجھتا تھا۔ پوری بات سننے کے بعد جامی نے کہا۔

''اس شہر میں قانون نام کی کوئی چیز نہیں رہی۔ اس بدمعاشی، بھتا خوری، ٹارگٹ کلنگ اور کڈنیپنگ نے جینا دشوار کر دیا ہے۔ پرچی میں پولیس سے رابطہ کرنے سے سختی سے منع کیا گیا ہے۔ ویسے میرا خیال ہے، اس کا کوئی فائدہ بھی نہیں...''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں جامی۔'' ڈاکٹر سکندر نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی۔ ''میں ایسے بہت سے افراد کو جانتا ہوں جنہوں نے پولیس سے مدد لینے کی کوشش کی اور پھر بری طرح مارے گئے۔ مجھے تو لگتا ہے...'' لمحاتی توقف کر کے اس نے گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''پولیس بھی اِن جرائم پیشہ افراد کے ساتھ ملی ہوئی ہے۔ ایک دو واقعات ایسے بھی ہوئے ہیں کہ پرچی حاصل کرنے والے شخص اور پولیس کے درمیان جو گفتگو ہوئی، وہ پرچی بھیجنے والے تک من و عن پہنچ گئی لہٰذا جامی! میں پولیس کے پاس جانے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔''

''اس کا مطلب ہے، آپ نے پرچی بھیجنے والے کا مطالبہ پورا کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے؟'' ڈاکٹر جامی نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''ایک کروڑ کیش... وہ بھی استعمال شدہ ایک ہزار والے نوٹوں کی شکل میں۔'' وہ الجھن زدہ انداز میں بولا۔ ''چوبیس گھنٹے کے اندر اتنی بڑی رقم کا بندوبست کرنا کوئی آسان کام نہیں اور سچی بات تو یہ ہے کہ میرے پاس اتنی رقم ہے ہی نہیں۔''

''پھر...؟'' ڈاکٹر جامی نے پوچھا۔

''میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔'' ڈاکٹر سکندر مایوسی سے گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''اسی لیے تو آپ کے پاس آیا ہوں۔ مجھے یقین ہے، آپ جو آئیڈیا دیں گے، اس سے میرا مسئلہ حل ہو جائے گا۔''

''مجھ پر اعتماد کرنے کا بہت شکریہ۔'' ڈاکٹر جامی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میرے ذہن میں ایک آئیڈیا ہے۔ اگر آپ نے اس پر عمل کیا تو اس مصیبت سے نجات مل جائے گی۔''

''میں عمل کروں گا، آپ بتائیں۔'' وہ فرماں برداری سے بولا۔

''لیکن اس کے لیے میری ایک شرط ہے۔'' ڈاکٹر جامی نے سنجیدگی سے کہا۔

''کیسی شرط؟'' ڈاکٹر سکندر نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

جامی نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''ڈاکٹر سکندر! آئندہ چوبیس گھنٹے تک آپ اپنے دماغ کا استعمال نہیں کریں۔''

''پھر کس کے دماغ کا استعمال کروں گا؟'' وہ الجھن زدہ لہجے میں مستفسر ہوا۔

''میں آپ کو جو ہدایات دوں گا، آپ اس پر عمل کریں گے... منظور؟''

''ڈن!'' ڈاکٹر سکندر نے اثبات میں گردن ہلائی۔

''یہ چوبیس گھنٹے ابھی سے شروع ہوتے ہیں۔'' ڈاکٹر جامی نے کہا پھر پوچھا۔ ''آپ کے پاس پرچی بھیجنے والے کا ٹیلیفون نمبر ہے؟''

''نہیں... وہ اپنی مرضی سے جب اس کا دل چاہتا ہے، رابطہ کرتا ہے۔ وہ ہر مرتبہ نئے نمبر سے فون کرتا ہے، میں اسے کال نہیں کرسکتا۔'' ڈاکٹر سکندر نے بتایا۔

''یہ بتائیں کہ اس وقت آپ لوگوں کے پاسپورٹس پر کسی ملک کے ویزے لگے ہوئے ہیں؟''

''جی، یورپ کے دو تین ملکوں میں ہم بہ آسانی جا سکتے ہیں۔''

''گڈ...!'' ڈاکٹر جامی نے اطمینان کی سانس خارج کی پھر پوچھا۔ ''کیا یہ ممکن ہے کہ آپ آج رات کی کسی فلائٹ سے یورپ روانہ ہوجائیں؟''

''بالکل ممکن ہے۔'' ڈاکٹر سکندر نے جواب دیا۔ ''میں ابھی اپنے ٹریول ایجنٹ کو فون کر کے معلومات حاصل کرتا ہوں۔''

آئندہ دس منٹ میں ٹریول ایجنٹ نے ڈاکٹر سکندر کو بتایا کہ لیٹ نائٹ کی ایک فلائٹ میں وہ چار ٹکٹ بک کرسکتا ہے۔ ڈاکٹر سکندر کی فیملی میں کل چار افراد تھے یعنی ڈاکٹر سکندر، اس کی بیوی اور دو بچے۔

''اب کیا کرنا ہے؟'' ڈاکٹر سکندر نے پوچھا۔

''آپ ٹکٹ بک کروالیں۔'' ڈاکٹر جامی نے کہا۔ ''لیکن ٹکٹ لینے آپ اپنے ایجنٹ کے پاس نہیں جائیں گے۔''

''اس کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔'' ڈاکٹر سکندر نے بتایا۔ ''میرا ٹریول ایجنٹ بکنگ کے بعد مخصوص کوڈ مجھے دے دے گا۔ جب ہم ائرپورٹ پہنچیں گے تو وہاں ٹکٹ تیار رکھے ہوں گے۔''

''او کے۔'' ڈاکٹر جامی نے کہا پھر پوچھا۔ ''کیا بھابی اور بچوں کو اس پرچی والے معاملے کا علم ہے؟''

''نہیں... یہ راز صرف ہم دونوں کے بیچ ہے۔''

''گڈ!'' ڈاکٹر جامی نے کہا۔ ''جب تک طیارہ ٹیک آف نہیں کرجاتا، آپ نے بھابی کو کچھ نہیں بتانا۔''

''ٹھیک ہے۔ میں آپ کی ہدایت پر عمل کروں گا۔'' ڈاکٹر سکندر نے کہا۔ ''اگر آپ کی اجازت ہو تو میں اپنے ٹریول ایجنٹ کو کنفرم کردوں؟''

''شیور۔'' ڈاکٹر جامی نے کہا۔

تھوڑی ہی دیر میں ڈاکٹر سکندر اور اس کی فیملی کے لیے ایک غیر ملکی ائرلائن میں جرمنی کے لیے چار ٹکٹ کنفرم ہو گئے اور ان کا نمبر بھی آگیا۔ PNR نمبر ائرپورٹ پر دکھانے کے بعد ان کے ٹکٹ مل جاتے۔

''شکر ہے، ایک مرحلہ تو طے ہوگیا۔'' ڈاکٹر سکندر نے ایک اطمینان بخش سانس خارج کی۔

اسی لمحے پرچی بھیجنے والے کی کال آگئی۔ ڈاکٹر سکندر نے کہا۔ ''وہی کال کررہا ہے۔''

''آپ کال اٹینڈ کریں اور اس سے کہیں کہ آپ رقم کا بندوبست کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔'' ڈاکٹر جامی نے صلاح دی۔ ''گھبرانے کی ضرورت نہیں۔''

ڈاکٹر سکندر نے کال ریسیو کی اور فون کا اسپیکر آن کر دیا۔ ''ہیلو...!''

''فون اٹینڈ کرنے میں اتنی دیر کیوں لگی؟'' دوسری جانب سے غصیلے لہجے میں پوچھا گیا۔

''وہ... میں واش روم میں تھا۔'' سکندر نے کہا۔

''واش روم میں زیادہ دیر نہ لگایا کرو۔'' تحکمانہ انداز میں کہا گیا۔ ''ورنہ تمہاری تشریف پر اتنی گولیاں ماروں گا کہ واش روم جانے کے قابل ہی نہیں رہوگے۔''

''جی، میں اب زیادہ دیر نہیں لگاؤں گا۔'' ڈاکٹر سکندر نے کسی معمول کے مانند کہا۔

''کل دوپہر دو بجے چوبیس گھنٹے کی مدت پوری ہو جائے گی۔'' دوسری جانب سے بولنے والے نے کہا۔ ''کیا تم نے رقم کا بندوبست کرلیا؟''

''ابھی نہیں لیکن مجھے یقین ہے کہ میں انتظام کرلوں گا۔'' ڈاکٹر سکندر نے کہا۔ ''اپنے ایک دوست کے سامنے ہاتھ پھیلا رہا ہوں۔ میرے اپنے پاس تو دس پندرہ لاکھ سے زیادہ نہیں تھے۔ اسی طرح مانگ تانگ کر ہی جمع کروں گا نا...''

''تم جن جن کے سامنے ہاتھ پھیلا رہے ہو، انہیں اپنی ضرورت کی نوعیت کے بارے میں تو کچھ نہیں بتایا؟'' دوسری طرف بولنے والے کے سوال میں کرید تھی۔

''نن... نہیں... بالکل نہیں۔''

''شاباش۔'' سرا ہنے والے انداز میں کہا گیا۔ ''اور پولیس کے پاس جانے کا بھی خیال نہیں آیا نا؟''

''نہیں، میں تم سے وعدہ کر چکا ہوں کہ پولیس سے رابطہ نہیں کروں گا۔'' ڈاکٹر سکندر نے ٹھوس انداز میں کہا۔

''ٹھیک ہے۔ اب میں کل صبح تم سے رابطہ کروں گا۔'' اس شخص نے بات ختم کرنے والے انداز میں کہا۔ ''کوشش کرنا، کل دوپہر تک پیسوں کا بندوبست ہو جائے۔ میں زیادہ وقت نہیں دے سکتا۔''

''آپ بے فکر رہو۔ رقم کا بندوبست ہو جائے گا۔'' سکندر نے یقین دلانے والے انداز میں کہا۔ ''یہ میرا وعدہ ہے کہ کل کا سورج غروب ہونے سے پہلے میں ایک کروڑ روپے آپ کے حوالے کر دوں گا۔''

''شاباش... اور کوئی ہوشیاری دکھانے کی کوشش نہیں کرنا۔'' اس شخص نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔ ''میرا ایک آدمی مسلسل تمہاری نگرانی کر رہا ہے۔ ادھر تم نے کچھ گڑبڑ کی، ادھر تمہارے بیوی بچوں کی لاشیں گریں گی۔''

اس سے پہلے کہ ڈاکٹر سکندر جواب میں کچھ کہتا، دوسری جانب سے رابطہ منقطع کر دیا گیا۔ ڈاکٹر جامی نے کہا۔

''یہ اچھی بات ہے کہ یہ خبیث انسان کل صبح سے پہلے آپ کو فون نہیں کرے گا اور اس وقت تک آپ اپنی فیملی کے ساتھ کم از کم ایشیا کی حدود سے باہر نکل چکے ہوں گے۔''

''ہاں، یہ تو ہے لیکن اس نے اپنا ایک بندہ میری نگرانی پر مامور کر رکھا ہے۔'' سکندر نے ایک امکانی خدشے کا اظہار کیا۔ ''کہیں اس بندے کو ہمارے منصوبے کی خبر تو نہیں ہو جائے گی؟''

''آپ نے اگر عقل مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے من و عن میری ہدایت پر عمل کیا تو اس نگرانی کرنے والے بندے کو جل دینا کچھ مشکل نہیں ہوگا۔'' ڈاکٹر جامی نے کہا۔ ''ویسے مجھے شک ہے کہ اس نے آپ کو اپنے دباؤ میں رکھنے کے لیے اس نگراں بندے کی بات کی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ اس بندے کا کوئی وجود نہیں، بہرحال...'' وہ تھوڑی دیر کے لیے رکا پھر جملہ مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''ہم کوئی رسک نہیں لیں گے۔''

''اب مجھے کیا کرنا ہے؟'' ڈاکٹر سکندر نے پوچھا۔

''بینک بند ہونے میں ابھی ایک گھنٹا باقی ہے۔'' ڈاکٹر جامی نے کہا۔ ''اور یہ ایک گھنٹا آپ کم از کم چار پانچ مختلف بینکوں کے وزٹ میں گزاریں گے۔ ہر بینک میں آپ دس، پندرہ منٹ گزارنے کے بعد کسی دوسرے بینک کا رخ کریں گے۔ آپ کی اس سرگرمی سے یہ تاثر ابھرے گا کہ آپ بڑی شدومد سے رقم کا بندوبست کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ اگر کوئی بندہ واقعتاً آپ کی نگرانی کر رہا ہے تو اس کی رپورٹ آپ کے حق میں جائے گی۔ پرچی بھیجنے والا یہ دیکھ کر مطمئن ہو جائے گا کہ آپ اس کی ہدایت کے مطابق رقم کا انتظام کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں۔'' ڈاکٹر سکندر نے تشکرانہ انداز میں کہا۔

''اور اب اس منصوبے کا سب سے نازک مرحلہ۔'' ڈاکٹر جامی نے اپنے دوست کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں آپ کے اپارٹمنٹ پر کئی مرتبہ گیا ہوں۔ ماشاء اللہ، بہت ہی لگژری اور محفوظ بلڈنگ ہے جس میں آمد و رفت کے لیے دو طرفہ راستہ ہے۔ ایک طرف بڑا گیٹ ہے جس میں سے گاڑی سمیت اندر آ جا سکتے ہیں جبکہ دوسری سائڈ والا راستہ صرف پیدل آنے جانے کے لیے ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ بھابی روزانہ بچوں کے ساتھ شام میں پارک بھی جاتی ہیں جو اپارٹمنٹ بلڈنگ کے نزدیک ہی ہے اور مذکورہ پارک کے سامنے ایک چین ڈپارٹمنٹل اسٹور بھی ہے جس کے دروازے آگے پیچھے دو سڑکوں پر کھلتے ہیں۔ ایم آئی رائٹ ڈاکٹر سکندر؟''

''ایبسولیوٹلی رائٹ۔'' ڈاکٹر سکندر نے جواب دیا۔ ''لگتا ہے، آپ نے میرے گھر کے بیرونی ماحول پر پی ایچ ڈی کر رکھا ہے۔''

''اب کرنا یہ ہے کہ...'' ڈاکٹر جامی اس کے تبصرے کو نظرانداز کرتے ہوئے بولا۔ ''آپ تھکے ہارے اس وقت گھر پہنچیں گے جس وقت بھابی اور بچے پارک میں ہوں گے۔ آپ حسبِ معمول اپنی گاڑی اس کی مخصوص جگہ پر پارک کر کے گھر جائیں گے۔ گھر میں موجود تمام نقدی اور اپنا اور بچوں بیوی کے پاسپورٹس اور زیورات کو کسی شاپنگ بیگ میں بھریں گے اور بڑے اعتماد سے پیدل چلتے ہوئے سائڈ گیٹ سے باہر نکل آئیں گے پھر بلڈنگ کے عقبی حصے سے کوئی رکشا ٹیکسی پکڑ کر ائرپورٹ کی جانب روانہ ہو جائیں گے۔ راستے میں کہیں آپ تھوڑی دیر رک کر ایک سفری بیگ بھی خرید لیں گے اور گھر سے نکلتے وقت آپ بکلی کے

تمام سوئچ آف کر دیں گے جیسا کہ آپ طویل چھٹیوں پر جانے سے پہلے کرتے ہیں۔ گھر کو مکمل لاک ہونا چاہیے۔ ایسا کرنے میں آپ کو کوئی دشواری تو پیش نہیں آئے گی؟''

''نہیں۔ میرے پاس گھر کی چابیوں کا ایک سیٹ موجود رہتا ہے۔ میں یہ کام بڑی آسانی سے کرلوں گا۔'' ڈاکٹر سکندر نے گہری سنجیدگی سے جواب دیا۔ ''میں تو ائرپورٹ پہنچ گیا۔ میری بیوی اور بچوں کا کیا ہوگا؟''

''بھابی اور بچے مغرب کی اذان کے وقت پارک سے نکلتے ہیں۔'' ڈاکٹر جامی نے کہا۔ ''آپ ائرپورٹ جاتے ہوئے راستے میں بھابی کو فون کر کے ڈپارٹمنٹل اسٹور کی کافی شاپ میں آنے کو کہیں گے۔ چاہے کوئی بھی بہانہ کرنا پڑے، آپ انہیں ڈپارٹمنٹل اسٹور میں بلائیں گے۔''

''یہ میں کرلوں گا۔'' ڈاکٹر سکندر نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''پھر... ؟''

''پھر یہ کہ ڈپارٹمنٹل اسٹور میں پہنچ کر بھابی آپ کو فون کریں گی کہ آپ کہاں ہیں؟ وہ فون نہ بھی کریں تو آپ انہیں فون کر کے بتائیں گے کہ آپ اسٹور سے تھوڑے فاصلے پر ہیں۔ وہ بچوں کو لے کر اسٹور کے عقبی دروازے سے باہر نکلیں جہاں ڈاکٹر جامی اپنی گاڑی میں موجود ہوگا۔ آپ بھابی سے کہیں گے کہ وہ ڈاکٹر جامی کی گاڑی میں بیٹھ کر آپ کے پاس پہنچ جائیں۔ بھابی ایک عورت ہیں۔ یقیناً وہ آپ سے بہت سارے سوالات کریں گی۔ آپ کو انہیں کچھ بھی کہہ کر ٹال دینا ہے۔ گاڑی میں ائرپورٹ کی طرف جاتے ہوئے میں خود انہیں حقیقت سے آگاہ کر دوں گا۔ پہلے میں نے یہی سوچا تھا کہ بھابی کو طیارے کی پرواز کے بعد صورتِ حال سے آشنا کیا جائے لیکن میرا خیال ہے کہ وہ... خصوصاً اس سچویشن میں اتنی دیر تک صبر نہیں کرسکیں گی۔''

''گڈ پلان۔'' ڈاکٹر سکندر نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ ''لیکن یہ وقت تو آپ کے کلینک کا ہوگا؟''

''میں ایک دن کلینک نہیں جاؤں گا تو کوئی قیامت نہیں آجائے گی۔'' ڈاکٹر جامی نے دوستانہ انداز میں کہا۔

ڈاکٹر سکندر نے فرطِ جذبات سے مغلوب ہو کر ڈاکٹر جامی کو گلے لگالیا۔ مزید تھوڑی دیر تک ان کے درمیان گفتگو ہوتی رہی پھر ڈاکٹر سکندر اپنے مشن پر روانہ ہوگیا۔

سب کچھ سوچے سمجھے منصوبے کے تحت بہ خیر و خوبی انجام پا گیا۔ اس رات ڈاکٹر سکندر اپنی فیملی کے ہمراہ بحفاظت جرمنی کی جانب پرواز کر گیا۔

اس واقعے کے تین روز بعد ڈاکٹر جامی کے سیل فون پر ایک ان جانے نمبر سے کال آئی۔ دوسری جانب بولنے والے نے پوچھا۔

''ہیلو... آپ ڈاکٹر جامی ہو؟''

''ہاں، میں ڈاکٹر جامی بات کر رہا ہوں۔'' اس نے جواب دیا پھر سوال کیا۔ ''تم کون ہو؟''

''میں جو کوئی بھی ہوں، بہت جلد تمہیں پتا چل جائے گا۔'' وہ غراہٹ آمیز لہجے میں بولا۔ ''کیونکہ تم نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ مجھ سے دشمنی تمہیں بہت مہنگی پڑے گی۔''

''میں تمہیں جب جانتا ہی نہیں پھر دشمنی کیسے کروں گا؟'' ڈاکٹر جامی نے بیزاری سے کہا۔

''تم مجھے نہیں جانتے مگر ڈاکٹر سکندر کو تو جانتے ہو نا...!''

''ڈاکٹر سکندر...'' ڈاکٹر جامی نے چونکتے ہوئے لہجے میں دہرایا۔ ''کیا ہوا ڈاکٹر سکندر کو؟''

''زیادہ سیانا بننے کی کوشش نہیں کرو ڈاکٹر۔'' وہ خوں خوار لہجے میں بولا۔ ''تمہاری پلاننگ سے ڈاکٹر سکندر ملک سے فرار ہوا ہے۔ میں نہیں جانتا وہ اس وقت کہاں ہے لیکن یہ میں نے پتا چلالیا ہے کہ اس کے فرار میں تمہارے شیطانی دماغ کا ہاتھ ہے۔''

''تم خوامخواہ ہی مجھ پر الزام لگائے جا رہے ہو۔'' ڈاکٹر جامی نے سخت لہجے میں کہا۔ ''کیا ثبوت ہے تمہارے پاس اِن باتوں کا؟''

''ڈاکٹر! ہم لوگ تمہاری طرح پڑھے لکھے نہیں ہیں لیکن ہمارا نیٹ ورک بہت مضبوط ہے۔'' اس نے سنسناتے لہجے میں کہا۔ ''ہمیں کسی بات کا شک نہیں ہوتا بلکہ یقین ہوتا ہے۔ بات آئی سمجھ میں؟''

''اچھا تو تم وہی شخص ہو جس نے ڈاکٹر سکندر کو ایک کروڑ کی پرچی بھیجی تھی؟''

''شاباش! لگتا ہے تمہاری یادداشت واپس آگئی ہے۔'' دوسری جانب بولنے والے نے استہزائیہ انداز میں کہا۔

ڈاکٹر سکندر کے سیل فون پر جامی نے اس شخص کی گفتگو سنی تھی جس نے ڈاکٹر سکندر کو ایک کروڑ کی پرچی بھیجی تھی۔ اُس شخص کی آواز اِس شخص سے کافی مختلف تھی۔ جامی یہ سوچ کر مطمئن ہوگیا کہ اس قسم کے مجرم اکیلے کام نہیں کرتے۔ ممکن ہے، یہ شخص بھی اسی گروہ سے تعلق رکھتا ہو۔

وہم

''باباجی! بیوی دراز قامت ہو، گوری ہو، سبک اندام ہو، حیادار ہو، سعادت مند ہو اور ہر وقت اپنے شوہر کی ہر خدمت کے لیے کمربستہ نظر آئے تو اسے ہم کیا کہیں گے؟''

''کچھ نہیں میرے بچے....اسے صرف وہم کہیں گے!''

☆☆☆

ڈر

''اجی، سنتے ہیں.... مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ آج میری طرف کروٹ لے کر سوجائیں۔''

''ہاں.... تاکہ میری نیند برباد ہوجائے اور تمہارا منہ دیکھ دیکھ کر صبح تک میرا دم ہی نکل جائے۔''

بولا۔

دوسری جانب سے ریسیور رکھ دیا گیا تھا۔ ڈاکٹر ''ہیلو ہیلو'' کرتا رہ گیا۔

بیٹھے بٹھائے ایک نئی مصیبت نے ڈاکٹر جامی کا در دیکھ لیا تھا۔ ڈاکٹر سکندر والا واقعہ اس نے صرف اپنی بیوی کے ساتھ شیئر کیا تھا اور اسے اپنی بیوی پر بہت بھروسا تھا۔ اس نے یہ بات آگے نہیں بڑھائی ہوگی۔ ڈاکٹر جامی کا ایک ہی ایسا دوست تھا جس کے ساتھ وہ یہ نازک معاملہ ڈسکس کر سکتا تھا اور وہ تھا ڈاکٹر سکندر جو اس وقت اپنے بیوی بچوں کے ساتھ جرمنی میں بیٹھا تھا۔

ڈاکٹر جامی کے جی میں آئی کہ وہ اس صورتِ حال سے اپنی بیوی کو آگاہ کردے لیکن یہ سوچ کر وہ خاموش رہا کہ یہ سب سن کر بیوی پریشان ہوجائے گی۔ وہ اپنی فیملی سے بہت محبت کرتا تھا۔ وہ انہیں کسی تکلیف، کسی دکھ میں نہیں دیکھ سکتا تھا لہٰذا چپ چاپ یہ اذیت سہہ رہا تھا۔ ہر روز اس شخص کا فون آتا اور وہ ڈاکٹر کو یاد دلاتا کہ ایک دن کم ہوگیا ہے۔ گزشتہ روز تین دن کی مدت پوری ہوگئی تھی اور اس بندے کا فون بھی نہیں آیا تھا۔ ڈاکٹر نے سکھ کی سانس لی کہ مصیبت ٹل گئی۔

یہ سکھ کی سانس دیرپا ثابت نہ ہوئی۔ آج دوپہر دو بجے اس نے اسپتال سے آف کیا اور اپنی گاڑی میں بیٹھ کر گھر کی جانب روانہ ہوا تو اس منحوس کی کال آگئی۔

''تم نے مجھے کیوں فون کیا ہے؟'' ڈاکٹر جامی نے مضبوط لہجے میں استفسار کیا۔ ''کیا چاہتے ہو تم؟''

''تم نے مجھے ایک کروڑ کا نقصان پہنچایا ہے۔'' اس شخص نے کہا۔ ''سیدھی سی بات ہے، میں چاہتا ہوں، تم میرا نقصان پورا کردو۔''

''میں نے تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔'' ڈاکٹر جامی نے قدرے کمزور آواز میں کہا۔ ''پلیز اب مجھے فون نہیں کرنا۔''

''ورنہ تم کیا کرلوگے؟'' وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔ ''پولیس کے پاس جاؤ گے یا ڈاکٹر سکندر کی طرح ملک سے فرار ہونے کی کوشش کروگے لیکن یاد رکھو کہ تم یہ دونوں کام نہیں کرسکوگے۔ میں نے تمہارے بارے میں بہت اچھی طرح چھان بین کرلی ہے۔ تم فی الفور ملک سے باہر جانے کی اہلیت اور صلاحیت نہیں رکھتے اور جیسے ہی تم نے پولیس سے رابطہ کرنے کی کوشش کی، مجھے پتا چل جائے گا اور پھر تمہارے بیوی بچے بڑی بیدردی سے قتل کردیے جائیں گے۔ وہ لوگ مکمل طور پر میری نگرانی میں ہیں۔ میں نے اپنے تین مستعد مسلح آدمیوں کو ان کی ایک ایک جنبش نوٹ کرنے پر متعین کررکھا ہے۔ یقین نہ ہو تو کوئی چالاکی کرکے دیکھ لو۔ میں نے جو کہا ہے، وہ کرکے بھی دکھادوں گا۔''

''آخر تم چاہتے کیا ہو؟'' ڈاکٹر جامی زچ ہوکر بولا۔

''بتایا تو ہے، تم میرا نقصان پورا کردو۔ میں تمہاری جان چھوڑ دوں گا۔'' اس شخص نے کہا۔ ''اس کے بعد تمہارا اور میرا راستہ الگ الگ۔''

''میں ایک کروڑ کہاں سے لاؤں۔ میری اتنی حیثیت نہیں ہے۔'' ڈاکٹر جامی نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں میرے بارے میں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔''

''کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی۔'' دوسری جانب بولنے والے نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ''اور میں کوئی ظالم انسان نہیں ہوں۔ تمہاری حیثیت کے مطابق ہی مطالبہ کررہا ہوں۔ مجھے تم سے صرف پچاس لاکھ چاہئیں اور وہ بھی تین دن میں...''

''پچاس لاکھ روپے... یہ بہت بڑی رقم ہے۔'' ڈاکٹر جامی نے کہا۔

''مگر تمہارے بیوی بچوں کی جان سے زیادہ بڑی رقم نہیں ہے۔'' وہ سفاکی سے بولا۔

''میری بات سنو...'' ڈاکٹر جامی اضطراری لہجے میں

''ہیلو ڈاکٹر! کیسے ہو؟'' اس نے چہکتی ہوئی آواز میں پوچھا۔
''میں کوشش کر رہا ہوں مگر ابھی تک رقم کا بندوبست نہیں ہو سکا۔'' ڈاکٹر نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔
''تمہارا یہ راگ میں پچھلے تین دن سے سن رہا ہوں۔'' اس کے لہجے کی چہک مفقود ہو گئی۔ اب وہاں درندگی جھلک رہی تھی۔ ''تمہیں سنانے کے لیے ایک راگ میرے پاس بھی ہے۔ ذرا گاڑی کو سائڈ پر روکو۔''
''گاڑی کو روک دوں مگر کیوں...؟'' ڈاکٹر جامی نے الجھن زدہ لہجے میں کہا۔
''ڈاکٹر! میں تمہارا پیشنٹ نہیں ہوں جو تمہارے ہر سوال کا جواب دوں۔'' وہ درشتی سے بولا۔ ''میں تمہیں جو راگ سنانے والا ہوں' اسے سن کر تمہارے ہاتھ پاؤں کانپ اٹھیں گے اور میں نہیں چاہتا کہ تم کسی حادثے کے نتیجے میں موت کے منہ میں چلے جاؤ۔ اگر تم مر گئے تو مجھے پچاس لاکھ کون دے گا؟''
ڈاکٹر جامی نے گاڑی سڑک کے کنارے روک دی اور کہا۔ ''ہاں بولو...''
اگلے ہی لمحے اس کی سماعت سے نومی کی آواز ٹکرائی۔
''پاپا! یہ بہت ظالم لوگ ہیں۔ انہوں نے مما کو بے ہوش کر کے سڑک پر پھینک دیا اور مجھے اغوا کر کے یہاں لے آئے ہیں۔''
''تم فکر نہ کرو بیٹا، میں سب سے نمٹ لوں گا۔'' جامی نے تسلی بھرے لہجے میں کہا۔ ''بتاؤ، تمہاری مما کہاں ہیں؟''
''رائیڈ والی روڈ پر۔'' نومی نے بتایا۔ ''پہلے ان لوگوں نے گولی مار کر ہماری گاڑی کا ٹائر پھاڑا۔ پھر جب مما ٹائر چیک کرنے گاڑی سے باہر گئیں تو انہوں نے مما کو بے ہوش کر دیا اور مجھے...''
نومی کی آواز منقطع ہو گئی۔ ڈاکٹر جامی تڑپ کر رہ گیا۔
''تم نے اب تک پچاس لاکھ کا بندوبست کرنے کے سلسلے میں جو بھی کوششیں کیں وہ سب بیکار گئیں۔'' اس شخص نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ''لیکن آج کے بعد تمہاری ہر کوشش اصلی اور خالص ہو گی اور مجھے یقین ہے، اگلے دو دن میں تم اس رقم کا انتظام کر لو گے۔''
''دیکھو... میرے بیٹے کو کچھ نہیں ہونا چاہیے۔'' ڈاکٹر کی آواز میں رعشہ در آیا۔
''وہ میرے پاس محفوظ ہے اور اس وقت تک محفوظ رہے گا جب تک تم میری ہدایت پر عمل کرتے رہو گے۔'' اغوا کار نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ''اب تم گھر جاؤ اور اپنی بیوی کو سنبھالو۔ باقی باتیں رات میں ہوں گی۔''
اپنی بات مکمل کرنے کے بعد اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔

☆☆☆

فوزیہ آرام دہ بیڈ پر لیٹی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر جامی اسے راستے میں، اپنی گاڑی میں بٹھا کر گھر لایا تھا۔ گھر پہنچتے ہی ڈاکٹر نے اسے فوری طبی امداد دے دی تھی جس سے اس کی طبیعت بحال ہو گئی تھی۔ اب وہ مکمل ہوش و حواس میں تھی۔ اس نے گلوگیر آواز میں اپنے شوہر کو ساری کہانی سنائی اور آخر میں کہا۔
''جامی! ہمیں فوراً پولیس کو اس واقعے کی اطلاع دینی چاہیے۔''
''ہرگز نہیں۔'' جامی نے قطعیت سے کہا۔ ''پولیس کو اس معاملے میں ملوث کرنا ٹھیک نہیں۔ اس سے نومی کی جان کو خطرہ ہو سکتا ہے۔''
''لیکن کچھ پتا تو چلے، وہ لوگ ہمارے نومی کو کہاں لے گئے ہیں؟'' فوزیہ روہانسی ہو گئی۔
''سب پتا چل چکا ہے فوزیہ۔'' وہ اپنی بیوی کا ہاتھ دباتے ہوئے بولا۔ وہ اس کے بیڈ کے نزدیک ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔
''کیا پتا چلا ہے، کچھ مجھے بھی بتائیں۔'' وہ اضطراری لہجے میں بولی۔
''یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے ڈاکٹر سکندر کو ایک کروڑ کی پرچی بھیجی تھی۔'' ڈاکٹر جامی نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ ''انہیں کسی طرح یہ پتا چل گیا تھا کہ میں نے چالاکی سے کام لے کر ڈاکٹر سکندر کو ملک سے فرار کرایا ہے۔ اب یہ اپنا نقصان مجھ سے پورا کرنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے کمالِ مہربانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مجھ سے پچاس لاکھ روپے کا مطالبہ کیا تھا۔''
''مطالبہ کیا تھا کا کیا مطلب؟'' فوزیہ نے سوالیہ نظر سے شوہر کی طرف دیکھا۔
جامی نے اب تک کی رُوداد فوزیہ کو سنا دی۔
''تو آپ نے مجھ سے اتنی بڑی بات چھپائے رکھی۔'' وہ شکایت بھری نظر سے اپنے شوہر کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ''آپ تین دن سے الجھے ہوئے اور چپ چپ تھے۔ میں یہ تو سمجھ گئی تھی کہ آپ کے ساتھ کوئی پریشانی ہے لیکن یہ پتا نہیں چل رہا تھا کہ پریشانی کی نوعیت کیا ہے۔''

''میں آپ لوگوں کو پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔'' جامی نے بتایا۔ ''اس لیے خاموش رہ کر اس مسئلے کا کوئی حل نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔''

''راستے میں نومی اور میں نے پروگرام بنایا تھا کہ آج رات جب آپ کلینک سے گھر آئیں گے تو ہم آپ کو گھیر کر بیٹھ جائیں گے۔'' فوزیہ نے ایک ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''تاکہ پتا تو چلے کہ آپ کی پریشانی کا سبب کیا ہے لیکن...'' اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ ''نومی پتا نہیں کس حال میں ہوگا۔''

''وہ ٹھیک ہے۔'' جامی نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ''تھوڑی دیر پہلے اغواکار نے نومی سے میری بات کرائی تھی۔''

''اوہ... میرا جانو رو تو نہیں رہا تھا؟'' فوزیہ جذباتی ہوگئی۔

''بالکل نہیں۔ وہ ایک بہادر بچہ ہے۔'' جامی نے کہا۔ ''میں نے اسے یقین دلایا ہے کہ بہت جلد میں اغواکار کو رقم ادا کر کے اسے چھڑا لوں گا۔''

''مگر پچاس لاکھ روپے آئیں گے کہاں سے...؟'' فوزیہ نے دونوں ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

''ایک بات کا بہت سوچ سمجھ کر جواب دیں۔'' ڈاکٹر جامی نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''میں اس مسئلے پر بہت الجھا ہوا ہوں۔''

''کون سی بات جامی؟'' فوزیہ نے پوچھا۔

''ڈاکٹر سکندر والی، ایک کروڑ کی پرچی والی بات میں نے صرف آپ سے شیئر کی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ یہ بات اغواکار تک کیسے پہنچ گئی...''

''تو کیا آپ سمجھ رہے ہیں کہ میں نے اغواکار کو بتایا ہوگا کہ... ڈاکٹر سکندر آپ کے آئیڈیا پر عمل کر کے فرار ہونے میں کامیاب ہوا تھا؟'' فوزیہ نے عجیب سے لہجے میں استفسار کیا۔

''میں ہرگز ایسا نہیں سمجھ رہا۔'' ڈاکٹر جامی نے قطعی لہجے میں کہا۔ ''مجھے آپ پر مکمل اعتماد ہے۔ میں تو صرف یہ جاننا چاہ رہا ہوں کہ کہیں آپ نے یہ معاملہ کسی اور سے تو ڈسکس نہیں کیا...''

''بالکل نہیں۔'' فوزیہ نے سادہ سے لہجے میں جواب دیا۔

''او کے...'' جامی اٹھتے ہوئے بولا۔ ''جلدی سے تیار ہو جاؤ۔''

''کیا ہم نومی سے ملنے جارہے ہیں؟'' بے ساختہ فوزیہ کے منہ سے نکلا۔

''نومی سے ملنے کا بندوبست کرنے۔'' ڈاکٹر نے بہ دستور سنجیدہ لہجے میں جواب دیا۔ ''آج جمعہ ہے۔ اس کے بعد ہفتہ اور اتوار بینک بند رہیں گے۔ میں دیکھتا ہوں، میرے اکاؤنٹس میں کتنی رقم ہے۔ میں آپ کو گھر میں اکیلا چھوڑ کر نہیں جاسکتا۔ اس لیے آپ بھی میرے ساتھ بینک چلیں۔''

''ٹھیک ہے...'' وہ بستر سے اٹھتے ہوئے بولی۔

اسی لمحے فوزیہ کے سیل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ فوزیہ نے سیل کے ڈائل (اسکرین) پر نگاہ ڈالی اور کہا۔ ''سندر کا فون ہے۔''

''مختصر بات کریں یا ٹال دیں۔'' جامی نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔ ''میرے پاس زیادہ ٹائم نہیں ہے۔''

سندر کا اصل نام جمشید علی تھا تاہم وہ سندر کے نام سے مشہور تھا۔ وہ ایک دراز قامت دبلا پتلا شخص تھا جس نے خاصی صحت مند مونچھیں پال رکھی تھیں۔ سندر، فوزیہ کا چھوٹا بھائی تھا۔ وہ فوزیہ سے پانچ سال چھوٹا تھا۔ اس کی ابھی تک شادی نہیں ہوئی تھی۔ سندر بہت ہی باتونی قسم کا شخص تھا۔ وہ ہر وقت اپنا کوئی نہ کوئی منصوبہ بیان کرتا رہتا تھا۔ ڈاکٹر جامی اپنے اکلوتے سالے کو سخت ناپسند کرتا تھا اور یہ بات فوزیہ کے علم میں بھی تھی۔

''ہاں سندر...'' فوزیہ نے کال ریسیو کرنے کے بعد کہا۔ ''میں اس وقت ذرا بزی ہوں۔ تم بعد میں فون کرنا۔''

''ٹھیک ہے آپا! میں رات کو کال کروں گا۔'' سندر نے کہا۔ ''کال کیا کروں گا بلکہ میں آپ سے ملنے ہی آرہا ہوں۔ رات کا کھانا میں آپ لوگوں کے ساتھ ہی کھاؤں گا۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔ خدا حافظ۔'' فوزیہ نے جلدی سے کہا اور فون بند کر دیا۔

سندر کی کال کا سنتے ہی ڈاکٹر جامی بیڈروم سے نکل گیا تھا۔ وہ سندر کے نام سے بھی چڑتا تھا بس فوزیہ کا بھائی ہونے کے ناتے وہ سندر کو برداشت کر لیتا تھا ورنہ اگر اس کے بس میں ہوتا تو وہ سندر کی شکل نہ دیکھتا۔

ایک گھنٹے کی کوشش کے بعد ڈاکٹر جامی اپنے تین اکاؤنٹس میں سے دس لاکھ روپے نکلوانے میں کامیاب ہو گیا۔ واپسی کے سفر کے دوران میں اس نے اپنے کمپاؤنڈر کو فون کر کے بتا دیا کہ وہ آج کلینک نہیں آسکے گا۔

"ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحب۔" کمپاؤنڈر نے کہا۔ "میں پرانے پیشنٹس کو دوواری پیٹ کروادوں گا۔"

"گڈ...!" ڈاکٹر نے کہا۔ "اور ہاں، میں بہت بزی ہوں اس لیے فون پر کسی کی بات کروانے کی کوشش نہیں کرنا۔"

"میں سمجھ گیا ڈاکٹر صاحب۔" کمپاؤنڈر نے جلدی سے کہا۔

وہ گھر پہنچے تو ڈاکٹر جامی کے فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ نمبر انجان تھا۔ اس کا دھیان فوراً اغواکار کی طرف چلا گیا۔ ڈاکٹر نے فوزیہ کو بھی اپنے پاس بلالیا اور کال ریسیو کر لی پھر اسپیکر آن کر دیا۔

"ہیلو..." ڈاکٹر نے معتدل انداز میں کہا۔

"خوب بینکوں کی سیر کر کے آئے ہو ڈاکٹر۔" دوسری جانب وہی اغواکار تھا۔ "دیکھ لو... میں نے تم پر کتنی گہری نظر رکھی ہوئی ہے۔"

"ہاں، یہ تو ہے۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "تم بہت ہوشیار آدمی ہو۔"

"تم بھی کچھ کم نہیں ہو۔" وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ "تم نے جس طرح میرے شکار کو اس ملک سے فرار کرایا ہے، اس سے تمہاری ہوشیاری کا مجھے اندازہ ہوگیا ہے۔ بس، یہ بات ذہن میں رکھنا کہ... ہوشیار کو کسی ہوشیار سے کبھی ہوشیاری نہیں کرنا چاہیے۔"

"میں سمجھ رہا ہوں۔" ڈاکٹر نے جلدی سے کہا۔ "تم فکر نہ کرو۔ میں تمہیں دھوکا نہیں دوں گا۔"

"تم دھوکا دینے کی پوزیشن ہی میں نہیں ہو ڈاکٹر۔" وہ بڑے بھونڈے انداز میں ہنسا۔ "تمہاری سب سے قیمتی چیز اس وقت میرے قبضے میں ہے۔"

"سنو..." جامی نے جلدی سے کہا۔ "نومی کی ماں کا بہت برا حال ہے۔ ذرا نومی کی اس سے بات کرادو۔"

"ضرور بات کراؤں گا لیکن پہلے بتاؤ، بینک یاترا سے کتنی رقم جمع ہوئی ہے؟"

"دس لاکھ روپے۔" ڈاکٹر جامی نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بتایا۔

"اوہ... اس سے کیا ہوگا؟" وہ مایوسی سے بولا۔ "باقی چالیس لاکھ کا بندوبست کہاں سے کرو گے؟"

"تم جانتے ہو، کل اور پرسوں بینک بند ہوں گے۔" جامی نے کہا۔ "تمہیں ٹائم میں تھوڑی گنجائش پیدا کرنا ہوگی۔"

"کوئی گنجائش پیدا نہیں ہوسکتی۔" وہ دوٹوک لہجے میں بولا۔ "تمہارے پاس اتوار دوپہر تک کا وقت ہے بس... تم زیور بیچو، گاڑیاں بیچو، گھر بیچو، خود کو بیچ ڈالو یا بھیک مانگو، میں کچھ نہیں جانتا۔ مجھے ہر حال میں اتوار کی دوپہر تک پورے پچاس لاکھ روپے چاہئیں۔ ایک ہزار والے استعمال شدہ کرنسی نوٹوں کی شکل میں..." لمحے بھر کو توقف کر کے اس نے گہری سانس لی پھر تحکمانہ انداز میں بولا۔

"لو... بچے سے بات کرو۔"

اگلے ہی لمحے سیل فون کے اسپیکر پر نومی کی آواز ابھری۔ "ہیلو مما... ہیلو پاپا..."

"جانو! کیسے ہو؟" فوزیہ نے ممتا بھرے انداز میں کہا۔ "ان لوگوں نے تمہارے ساتھ کوئی بدتمیزی تو نہیں کی؟"

"نہیں مما۔" نومی نے کہا پھر پوچھا۔ "مما! آپ تو ٹھیک ہیں نا؟"

"میں ٹھیک ہوں میرے لال۔" فوزیہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "آپ نے کھانا کھالیا؟"

"جی مما... تھوڑا سا کھایا ہے۔ باقی آپ کے ساتھ کھاؤں گا۔"

"آپ فکر نہیں کرو جان۔" فوزیہ نے تسلی بھرے انداز میں کہا۔ "آپ کے پاپا کوشش کر رہے ہیں۔ ہم بہت جلد آپ کو آزاد کرالیں گے۔"

دوسری جانب سے نومی کا جواب نہیں آیا۔ اس کی جگہ اغواکار کی آواز سنائی دی۔ وہ ڈاکٹر جامی سے مخاطب تھا۔

"ڈاکٹر! میں اپنے وعدے پر قائم ہوں۔ تمہارا بچہ صحیح سلامت ہے۔ اب تم بھی اپنا وعدہ جلد از جلد پورا کرنے کی کوشش کرو۔"

"میں کوشش میں لگا ہوا ہوں۔" ڈاکٹر نے اسے یقین دلانے کی کوشش کی۔

"اوکے... بعد میں فون کروں گا۔" یہ کہہ کر اغواکار نے رابطہ منقطع کر دیا۔

"اللہ کا شکر ہے، میرا جانو زندہ سلامت ہے۔" فوزیہ نے اضطراری لہجے میں کہا۔

نومی کی آواز سن کر اور اس سے بات کر کے فوزیہ کو کافی حد تک تسلی ہوگئی تھی تاہم نومی کی غیر حاضری نے ماں باپ کا دل خون کر رکھا تھا۔ یہ خالی گھر اور اس کے در و دیوار انہیں کاٹنے کو دوڑ رہے تھے۔ جامی مرد تھا۔ اس میں فوزیہ

کی نسبت قوتِ برداشت زیادہ تھی۔ وہ اپنے دکھ کا کھل کر اظہار نہیں کر پا رہا تھا لیکن اس کے دل پر کیا بیت رہی تھی، یہ وہی جانتا تھا۔

''ہمارا جانو ہمیشہ سلامت ہی رہے گا۔'' جامی نے پُروثوق انداز میں کہا۔ ''انشاء اللہ! سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''آپ نے کیا پلان کیا ہے؟'' فوزیہ نے پوچھا۔

''دس لاکھ کیش کا تو بندوبست ہوگیا۔ باقی چالیس لاکھ کہاں سے آئیں گے؟''

''میرے خیال میں فوری طور پر تو یہی ہوسکتا ہے کہ ہم دونوں گاڑیاں فروخت کردیں۔'' ڈاکٹر جامی نے کہا۔ ''اگر پھر بھی رقم پوری نہ ہوئی تو تمہارے زیورات بھی فروخت کردیں گے۔''

''دونوں گاڑیاں کتنے میں چلی جائیں گی؟'' فوزیہ نے پوچھا۔

''وٹز کی جو کنڈیشن ہے اس کے مطابق، وہ بارہ لاکھ میں جانا چاہیے اور سوک اٹھارہ لاکھ سے کم میں نہیں جانا چاہیے۔'' جامی نے کہا۔ ''یہ کل ملا کر تیس لاکھ ہو جائیں گے۔''

''دس ہمارے پاس ہیں۔ یہ ہوگئے چالیس لاکھ۔'' فوزیہ نے کہا۔ ''دس لاکھ کا فرق باقی ہے۔''

''یہ فرق زیور بیچ کر پورا کیا جاسکتا ہے۔'' جامی نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اور میں نے گاڑیوں کی جو قیمت لگائی ہے ضروری نہیں وہ ہمیں مل بھی جائے...''

''سندر آرہا ہے۔ میں اس سے بات کرتی ہوں۔'' فوزیہ نے جلدی سے کہا۔ ''کئی کار ڈیلر اس کے جاننے والے ہیں۔ وہ ہمیں گاڑیوں کی اچھی قیمت دلوادے گا۔''

''وہ کیوں آرہا ہے؟'' ڈاکٹر نے چونکتے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔

''جب ہم بینک کے لیے نکل رہے تھے تو اس کا فون آیا تھا۔'' فوزیہ نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''میں جلدی میں تھی اس لیے اس سے بات نہیں کرسکی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا، رات میں آئے گا اور کھانا ہمارے ساتھ ہی کھائے گا۔''

''یہاں ہماری جان پر بنی ہوئی ہے اور آپ کے سندر بھائی صاحب ڈنر اڑانے آرہے ہیں۔'' ڈاکٹر جامی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''اور صرف کار ڈیلرز پر ہی کیا موقوف، دنیا میں ایسا کون سا شخص ہے جس سے اس کی جان پہچان نہیں؟''

''جامی! اس بے چارے کو کیا معلوم کہ ہم اس وقت کن حالات سے گزر رہے ہیں، وہ ڈنر اڑانے نہیں، ہم سے ملنے آرہا ہے۔'' فوزیہ نے سندر کی حمایت کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ نے کبھی سندر کی کسی بات کو اہمیت نہیں دی جبکہ وہ آپ کا بہت احترام کرتا ہے۔''

''میں اس کا یہ احسان زندگی بھر یاد رکھوں گا کہ وہ میرا احترام کرتا ہے۔'' ڈاکٹر نے تیکھے لہجے میں کہا۔ ''باقی جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ میں اس کی بات کو اہمیت نہیں دیتا تو اس کی ہزاروں لاکھوں باتوں میں ایک بات بھی قابلِ توجہ نہیں ہوتی، قابلِ اہمیت ہونا تو بہت دور کی بات ہے...''

''بس، آپ نے طے کرلیا ہے کہ سندر کی مخالفت ہی کرنا ہے۔'' فوزیہ نے خفگی آمیز لہجے میں کہا۔ ''آپ کو تو اس کے نام پر بھی سخت اعتراض ہے۔''

''اور اس اعتراض کا سبب بھی ہے۔'' جامی نے کہا۔ ''والدین نے اچھا خاصا اس کا نام جمشید علی رکھا تھا اور اس نے ہندوانہ نام سندر رکھ لیا۔''

''آپ کو پتا ہے، لیجنڈ دلیپ کمار بھی ایک مسلمان ہے۔'' فوزیہ نے کہا۔ ''اس نے بھی اپنا نام ہندوانہ رکھا ہوا تھا۔''

''جی ہاں، مجھے پتا ہے۔'' ڈاکٹر جامی نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''وہ سب کچھ ''نظریۂ ضرورت'' کے تحت تھے اور آپ اپنے سندر ویرا کو دلیپ کمار کے ساتھ ملا کر بہت زیادتی کررہی ہیں۔''

''آپ کو میرے بھائی میں کوئی اچھی بات بھی نظر آتی ہے؟'' فوزیہ نے خفگی آمیز لہجے میں پوچھا۔

''معاملہ اچھی اور بری بات کا نہیں ہے فوزیہ۔'' جامی نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''مجھے ان لوگوں سے سخت چڑ ہے جن کا کوئی لائن آف ایکشن کوئی مقصدِ حیات نہیں ہوتا اور آپ کے سندر ویرا ایسے ہی افراد میں سے ایک ہیں۔'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''سندر صاحب نے سب سے پہلے تو اپنا نام تبدیل کیا پھر انہیں احساس ہوا کہ ان کے اندر ایک قابل ڈاکٹر چھپا بیٹھا ہے لہٰذا میٹرک میں بمشکل پاس ہونے کے بعد کسی ایجنٹ کو پیسے کھلا کر انٹر سائنس پری میڈیکل میں داخلہ لے

لیا۔ ایف ایس سی میں بار بار فیل ہونے کے بعد انہیں پتا چلا کہ ان کی اصل لائن انجینئرنگ ہے مگر انجینئرنگ یونیورسٹی والی انجینئرنگ نہیں بلکہ موٹر مکینک والی انجینئرنگ۔ چنانچہ وہ کئی سال تک مختلف گیراج میں اپنے دن رات اور ہاتھ منہ کالے کرتے رہے۔ پھر اچانک ان پر انکشاف ہوا کہ انہیں بزنس کرنا چاہیے۔ پارٹی ڈیکوریشن اینڈ ٹینٹ سروس، شادی ہال کی کیٹرنگ، گھی تیل کی ایجنسی سے لے کر پراپرٹی ایجنٹ، جمعہ بازار، اتوار بازار کے ٹھیلے اور اسٹالز، اندرونِ سندھ سے اناج اور قربانی کے جانور لا کر کراچی میں بیچنا، پنجاب سے مختلف قسم کے کپڑے لا کر انہیں کراچی میں فروخت کرنا تک سب دھندے انہوں نے کر کے دیکھ لیے ہیں۔ پچھلے دنوں وہ پرائز بانڈ کے آنکڑے بیچ رہے تھے اور آج کل سنا ہے وہ کسی کار ڈیلر کے پاس بیٹھ رہے ہیں۔ کہنے کو وہ بہت کچھ ہیں لیکن میری نظر میں صرف آپ کے سندر ویرا ہیں۔''

''انشاء اللہ... میرا بھائی اگلے الیکشن میں کھڑا بھی ہو گا۔'' جامی کی طویل بات کے جواب میں فوزیہ نے کہا۔ ''اس کے اندر قائدانہ صلاحیتیں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہیں۔''

اس سے پہلے کہ ڈاکٹر جامی ''قائدانہ صلاحیتوں'' پر کوئی کرارا جواب دیتا، ڈور بیل بج اٹھی۔ فوزیہ یہ کہتے ہوئے باہر کی جانب لپکی۔ ''لگتا ہے، سندر آگیا۔''

''پلیز... آپ اسے اپنے ساتھ انگیج رکھنا۔'' جامی نے کہا۔ ''میں تھوڑا آرام کرنا چاہتا ہوں۔''

فوزیہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے آگے بڑھ گئی۔

گیٹ پر سندر ہی تھا۔ اس نے تین چار تھیلے اٹھا رکھے تھے جن میں مختلف نوعیت کے کھانے بھرے ہوئے تھے۔ سندر کی یہ عادت تھی کہ وہ بہن کے گھر کبھی خالی ہاتھ نہیں آتا تھا۔ خاص طور پر وہ نومی کا پسندیدہ پزا لانا کبھی نہیں بھولتا تھا۔ نومی، سندر کے ساتھ کافی گھلا ملا ہوا تھا۔

ڈاکٹر جامی اپنے اکلوتے سالے کے بارے میں جو بھی رائے رکھتا ہو لیکن یہ سچ ہے کہ فوزیہ اور جامی کے بیچ سندر کے موضوع پر تھوڑی دیر پہلے ہونے والی گفتگو نے نومی کی طرف سے ان کا دھیان وقتی طور پر ہٹا دیا تھا۔

فوزیہ نے سندر کو ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور کھانے والے تھیلے کچن میں پہنچانے کے بعد وہ اس کے پاس آگئی۔ سندر نے پوچھا۔

''آپا! نومی نظر نہیں آرہا۔ کیا کہیں گیا ہوا ہے؟''

''نومی کو کسی کی نظر لگ گئی ہے۔'' فوزیہ نے بھرائی ہوئی آواز میں بتایا۔

''کیا... مطلب ہے...'' وہ تشویش بھرے انداز میں فوزیہ کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ''آپا... آپ مجھ سے کچھ چھپا رہی ہیں۔ بتائیں، نومی کو کیا ہوا ہے؟''

فوزیہ کے ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے۔ اس نے گلوگیر آواز میں سندر کو نومی کے اغوا کی کہانی سنادی۔

پوری بات سنے کے بعد سندر نے پوچھا۔ ''کیا دولھا بھائی کلینک گئے ہوئے ہیں؟''

''نہیں... وہ اپنے کمرے میں لیٹے ہیں۔'' فوزیہ نے دوپٹے کے پلو سے اپنی آنکھیں صاف کرتے ہوئے بتایا۔ ''دس لاکھ ہم نے ارینج کر لیے ہیں۔ باقی چالیس لاکھ کا بندوبست کیسے ہوگا، یہ سمجھ میں نہیں آرہا۔''

''سب ہو جائے گا آپا۔'' سندر اٹھ کر کھڑا ہوتے ہوئے بولا۔ ''میرے ہوتے ہوئے میری آپا کی آنکھوں میں آنسو آئیں، یہ میں برداشت نہیں کرسکتا۔ دولھا بھائی سے میری بات کروائیں۔''

''تم یہاں بیٹھو، میں انہیں دیکھ کر آتی ہوں۔''

سندر دوبارہ صوفے پر بیٹھ گیا اور فوزیہ، جامی کے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔

ڈاکٹر جامی بیڈ پر دراز یہ سوچ رہا تھا کہ کسی کو مشورہ دینا کتنا آسان کام ہے اور خود عمل کرنا کتنا مشکل۔

چند روز پہلے ڈاکٹر سکندر ایسی ہی صورتِ حال میں پھنسا ہوا تھا اور جامی کے مشورے پر وہ اپنی فیملی کو بحفاظت ملک سے نکال لے جانے میں کامیاب ہو گیا تھا لیکن خود جامی کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے۔

ان دونوں سچویشن میں ایک فرق البتہ ضرور تھا اور وہ یہ کہ ڈاکٹر سکندر کے معاملے میں پرچی بھیجنے والے کے ہاتھ میں کچھ نہیں تھا جبکہ جامی کے معاملے میں اس کا لختِ جگر نومی اغوا کار کے قبضے میں تھا۔ ڈاکٹر جامی نومی کی واپسی کے لیے کچھ بھی کرسکتا تھا۔ وہ اگلے روز دونوں گاڑیوں کو فروخت کرنے کا مصمم ارادہ کر چکا تھا۔

دروازے پر قدموں کی آہٹ سن کر وہ چونکا۔ تھوڑی ہی دیر میں فوزیہ اس کے سامنے کھڑی تھی۔ اس نے ڈاکٹر جامی سے کہا۔

''سندر ڈرائنگ روم میں بیٹھا آپ کا انتظار کر رہا ہے۔''

''اسے یہیں لے آؤ۔'' جامی بیزاری سے بولا پھر پوچھا۔ ''کیا آپ نے سندر کو نومی والے معاملے کے بارے میں بتا دیا ہے؟''

''جی بتا دیا ہے۔'' فوزیہ نے اثبات میں جواب دیا۔ ''سندر ہمارا اپنا ہے۔ وہ نومی سے بہت محبت کرتا ہے اور اس نے مجھے تسلی دی ہے کہ... سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ تھوڑی دیر کے لیے اس کی نالائقیوں کو بھول جائیں اور اس سے بات کریں۔''

''اوکے... آپ اُسے یہاں بلا لیں۔'' جامی نے نیم رضامندانہ انداز میں کہا۔ ''بات کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔''

تھوڑی ہی دیر میں سندر، جامی کے بیڈروم میں تھا۔ سندر کو دیکھ کر جامی اٹھ کر کھڑا ہوا اور مصافحے کے لیے ہاتھ آگے بڑھا دیا لیکن سندر کسی اور ہی موڈ میں تھا۔ وہ دونوں بازو وا کرتے ہوئے جامی کی جانب بڑھا اور بڑا گرم جوش معانقہ کر ڈالا۔ وہ کافی دیر تک جامی کی پیٹھ تھپکتا رہا پھر شکایت بھرے لہجے میں بولا۔

''بھائی جان! آپ مجھے اپنا نہیں سمجھتے اور سچی کہہ رہا ہوں، مجھے اس بات کا بہت دکھ اور افسوس ہے۔ آپا نے بتایا ہے کہ آپ پچھلے تین چار دن سے اس عذاب میں مبتلا ہیں اور مجھے بتایا تک نہیں...''

''بس، یہ معاملہ ہی ایسا تھا کہ میں نے تمہاری آپا کو بھی کچھ نہیں بتایا تھا۔'' جامی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''میں فوزیہ کو پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔''

''اپنے آخر کس لیے ہوتے ہیں؟'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''یہ ٹھیک ہے بھائی جان کہ میں بہت نالائق ہوں اور مجھے یہ بات بھی اچھی طرح معلوم ہے کہ آپ مجھ سے بہت چڑتے ہیں لیکن آپ کو اندازہ نہیں کہ میں آپ لوگوں سے بہت محبت کرتا ہوں۔''

''مجھے اندازہ ہے سندر۔'' جامی نے مصلحت آمیز انداز میں کہا۔ ''اور یہ بھی تمہاری غلط فہمی ہے کہ میں تم سے چڑتا ہوں۔ اصل میں میرا پیشہ ہی ایسا ہے کہ اس میں انسان اپنی فیملی کے لیے زیادہ وقت نہیں نکال سکتا۔ آپ اپنی آپا سے پوچھ لو۔ کبھی کبھی میں ان لوگوں کے ساتھ بھی بہت چڑچڑا ہو جاتا ہوں۔''

''آپ لوگ باتیں کریں، میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔'' فوزیہ اٹھتے ہوئے بولی۔

''آپا! چائے کھانے کے بعد پئیں گے۔'' سندر نے جلدی سے کہا۔ ''میں اچھا خاصا کھانا لے آیا ہوں۔ میں ذرا بھائی جان سے بات کرلوں۔ اس کے بعد آپ کھانا گرم کر کے لگا دیجیے گا۔''

''میرا تو کھانے کو بالکل جی نہیں چاہ رہا۔'' فوزیہ نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''جب تک نومی گھر نہیں آجاتا، میرے حلق سے نوالہ نہیں اترے گا۔''

''نومی سے مجھے بھی بہت زیادہ محبت ہے آپا۔ اس کے بغیر یہ گھر سونا سونا سا لگ رہا ہے۔'' سندر نے اداس لہجے میں کہا۔ ''لیکن کھانا پینا بھی ضروری ہے۔ اگر جسم میں خوراک نہیں پہنچے گی تو توانائی حاصل نہیں ہوگی اور اگر بدن میں توانائی نہیں ہوگی تو ہم حالات کا مقابلہ کرنے کے قابل نہیں ہوں گے۔'' لمحے بھر کو توقف کر کے اس نے جامی کی طرف دیکھا اور مستفسر ہوا۔

''بھائی جان! آپ تو ڈاکٹر ہیں۔ بتائیں، کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

جامی کو آج پہلی مرتبہ محسوس ہوا کہ سندر میں عقل نام کی کوئی چیز بھی موجود ہے۔ سندر کا یہ روپ اس سے پہلے جامی نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی اور کہا۔

''میں سندر کی بات سے اتفاق کرتا ہوں۔ ہمیں کھانے کا بائیکاٹ ہرگز نہیں کرنا چاہیے۔''

فوزیہ کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ آج پہلی مرتبہ اس نے جامی کے منہ سے سندر کے لیے تائیدی کلمات سنے تھے۔ یہ سچ ہے کہ مصیبت اور پریشانی رشتوں میں حائل فاصلوں کو مٹا دیتی ہے یا کم کر دیتی ہے۔

''بھائی جان! آپا نے مجھے مختصراً اس پریشانی کے بارے میں بتایا ہے۔'' سندر، جامی سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''آپ نے دس لاکھ کا بندوبست کرلیا ہے، چالیس لاکھ مزید چاہئیں۔ اس سلسلے میں آپ کے ذہن میں کوئی آئیڈیا ہے؟''

''میں نقدی جو ارینج کرسکتا تھا، وہ کرلیا۔'' ڈاکٹر جامی صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔ ''اب میرے پاس دو گاڑیاں اور تمہاری آپا کے پاس زیورات ہیں۔ میں نے بھی سوچا ہے کہ کل ان چیزوں کو فروخت کردوں گا۔ میں کل شام سے پہلے نومی کو واپس لانا چاہتا ہوں۔''

''ہوں۔'' سندر نے سوچ میں ڈوبے لہجے میں کہا۔ ''بھائی جان! آپ نے نومی کے اغوا کا معاملہ کسی سے شیئر تو نہیں کیا؟''

''بالکل نہیں۔'' جامی نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔''میرے اور فوزیہ کے بعد تم تیسرے شخص ہو جو نومی کے اغوا کے بارے میں جانتے ہو۔''

''یہ آپ نے بہت اچھا کیا کہ اس معاملے کو پھیلایا نہیں۔'' سندر گہری سنجیدگی سے بولا۔''یقیناً آپ نے پولیس کو بھی اس واقعے کی اطلاع نہیں دی ہوگی؟''

ڈاکٹر جامی نے ایک مرتبہ پھر نفی میں گردن ہلا دی۔

''بھائی جان! سچی بات بتاؤں۔'' سندر نے رازدارانہ انداز میں کہا۔''میرے پاس پکی اطلاعات ہیں کہ شہر میں ہونے والے اکثر جرائم میں پولیس ملوث ہے لہٰذا ان کے پاس جانے کا مطلب یہی ہے کہ آپ اپنا کیس خراب کرلیں گے۔ پھر آپ اغوا کار کے رحم و کرم پر ہیں کہ وہ مغوی کے ساتھ جو بھی سلوک کرے۔ تین چار ایسے افراد کو میں ذاتی طور پر جانتا ہوں جنہوں نے پولیس سے رابطہ کیا اور پھر وہ اور ان کے مغوی بڑی بیدردی سے قتل کر دیے گئے۔''

''اس حقیقت کا مجھے بھی احساس ہے۔'' جامی نے کہا۔''پولیس کی بے بسی اور بے کسی صبح و شام دیکھنے کو ملتی ہے۔ یہی محسوس ہوتا ہے کہ پولیس جرائم پیشہ افراد کے ہاتھوں کا کھلونا بنی ہوئی ہے۔''

''اللہ کرے... ہمارا نومی صحیح سلامت واپس لوٹ آئے۔'' فوزیہ نے جذباتی لہجے میں کہا۔

''آپا! آپ پریشان نہ ہوں۔ نومی کو کچھ نہیں ہوگا۔'' سندر نے تسلی بھرے انداز میں کہا۔''ہم کوشش کر رہے ہیں نا... نومی کل اپنے گھر پر ہوگا... انشاء اللہ!''

''اللہ تمہاری زبان مبارک کرے سندر۔'' بے ساختہ فوزیہ کی زبان سے نکلا۔

''سندر! تمہاری آپا بتا رہی تھیں کہ آج کل تم کسی کار ڈیلر کے ساتھ بیٹھ رہے ہو۔'' جامی نے اپنے سالے کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔''ذرا اس کار ڈیلر سے پوچھ کر بتاؤ کہ میری دونوں گاڑیاں کتنے میں چلی جائیں گی؟''

''بھائی جان! میں آپ کی تسلی کے لیے ابھی اپنے دوست کو فون کر کے ساری معلومات لے لیتا ہوں۔'' سندر نے کہا۔''لیکن میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ گاڑیوں کو فروخت نہ کریں۔ یہ آپ لوگوں کی انتہائی ضرورت ہیں۔''

''ہماری سب سے اہم ترین ضرورت اس وقت نومی کی واپسی ہے۔'' جامی نے گمبھیر انداز میں کہا۔''گاڑیوں کا کیا ہے، یہ تو دوبارہ آ جائیں گی اور پھر...'' لمحاتی توقف کے بعد اس نے ایک بوجھل سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''پھر میرے پاس فوری طور پر اتنی بڑی رقم حاصل کرنے کا اور کوئی ذریعہ بھی تو نہیں ہے۔ یہ میرا آخری آپشن ہے۔''

''آپ اس وقت پریشان ہیں بھائی جان اس لیے ایسا سوچ رہے ہیں ورنہ میرا تو یہ ماننا ہے کہ کوئی آپشن، آخری آپشن نہیں ہوتا۔ انسان اگر کوشش کرے تو ہر ناکامی کے بعد اسے کوئی نہ کوئی کھلا دروازہ نظر آ ہی جاتا ہے۔ میرا تجربہ تو یہی ہے۔ بہرحال، میں کار ڈیلر سے معلوم کرتا ہوں۔''

بات ختم کر کے سندر اپنے سیل فون کے ساتھ مصروف ہوگیا اور جامی حیرانی سے یہ سوچنے لگا کہ کیا یہ وہی سندر ہے جسے وہ احمق، نالائق اور ناتجربہ کار سمجھتا تھا۔ وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکا کہ وہ پہلے غلط تھا یا اب وہ خوامخواہ چویشن کے زیر اثر سندر کی باتوں سے متاثر ہو رہا ہے۔

''میں نے اس بار ضمنی انتخابات میں ایک سیاسی پارٹی کے لیے اتنا کام کیا ہے کہ آئندہ الیکشن میں...'' وہ نمبر ملانے کے دوران میں بولتا بھی جا رہا تھا اور اسی بول چال کے بیچ نمبر لگ گیا۔

''ہاں ستار بھائی!'' وہ الیکشن والے قصے کو ادھورا چھوڑ کر فون پر مصروف ہوگیا۔''سندر بات کر رہا ہوں۔ مجھے اپنے بھائی کی دو گاڑیاں نکالنی ہیں لیکن کل دوپہر سے پہلے۔''

''ایسی کیا ایمرجنسی ہے سندر۔'' دوسری طرف سے پوچھا گیا۔''سب خیریت تو ہے نا؟''

''ہاں، ہاں سب خیریت ہے۔'' وہ جلدی سے بولا۔''پریشانی والی کوئی بات نہیں۔ بس اپنے بھائی کو فوری پیسوں کی ضرورت پڑ گئی ہے۔''

''گاڑیاں کون سی ہیں؟'' ستار بھائی نے پوچھا۔

''ایک ہونڈا سوک اور دوسری ٹویوٹا وٹز ہے۔''

''ماڈلز...؟''

سندر نے ڈاکٹر جامی سے پوچھنے کے بعد ستار بھائی کو دونوں گاڑیوں کے ماڈلز بھی بتا دیے۔

ستار بھائی نے سوال کیا۔''گاڑیوں کی کنڈیشن کیسی ہے؟''

''کنڈیشن اے ون ہے ستار بھائی۔'' سندر نے جواب دیا۔''ایک ہی ہاتھ کے استعمال میں ہیں۔ سوک

میرے بہنوئی کے پاس ہے اور وٹز آپا کے پاس۔‘‘
’’او کے سندر۔‘‘ ستار بھائی نے کہا۔ ’’تمہارے بہنوئی صاحب کی ڈیمانڈ کیا ہے؟‘‘
’’آپ ہولڈ کرو۔ میں ان سے پوچھ کر بتاتا ہوں۔‘‘ سندر نے سیل فون کے مائیک پر ہاتھ رکھا پھر جامی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔
’’ستار بھائی آپ کی ڈیمانڈ پوچھ رہے ہیں۔‘‘
’’یار سندر!‘‘ جامی قدرے بے تکلفی سے بولا۔ ’’میں تو یہی چاہوں گا کہ زیادہ سے زیادہ مل جائیں۔ میرے حساب سے سوک اٹھارہ لاکھ اور وٹز بارہ لاکھ سے کم میں نہیں جانا چاہیے۔‘‘
’’ستار بھائی سے بات کرتا ہوں اور یہ میں آپ کو بتا دوں کہ ستار بھائی سے زیادہ اچھے ریٹس پوری مارکیٹ میں آپ کو کوئی بھی نہیں دے گا۔‘‘ سندر نے کہا پھر پوچھا۔ ’’وہ جو وٹز کا ٹائر پھٹ گیا تھا، اس کی کیا پوزیشن ہے؟‘‘
’’ٹائر خود نہیں پھٹا تھا بلکہ اغوا کاروں نے اپنی پلاننگ کے مطابق، گاڑی کو روکنے کے لیے سڑک کے اس خراب حصے پر فائر کر کے گاڑی کا ٹائر برسٹ کر دیا تھا۔‘‘ جامی نے تیکھے لہجے میں کہا۔ ’’اینی ہاؤ... میں نے مکینک کو فون کر دیا ہے۔ تھوڑی ہی دیر میں وٹز تبدیل شدہ ٹائر کے ساتھ یہاں پہنچ جائے گی۔‘‘
’’گڈ...!‘‘ سندر فون کے مائیک پر سے ہاتھ ہٹاتے ہوئے ستار بھائی سے مخاطب ہوا۔ ’’میرے بہنوئی صاحب سوک کے اٹھارہ اور وٹز کے بارہ بتا رہے ہیں۔‘‘
’’سندر! آپ دونوں گاڑیاں صبح دکان پر لے آؤ۔‘‘ ستار بھائی نے کہا۔ ’’میں کوشش کروں گا کہ تمہارے بہنوئی کی ڈیمانڈ کے مطابق ریٹس مل جائیں لیکن ذاتی طور پر میرا یہ خیال ہے کہ سوک سولہ اور وٹز دس میں بہ آسانی چلی جائے گی۔‘‘
’’چلیں دیکھتے ہیں، کیا ہوتا ہے۔‘‘ سندر نے بات ختم کرنے والے انداز میں کہا۔ ’’میں صبح گاڑیاں لے کر آتا ہوں۔‘‘
’’ایک بات ذہن میں رکھنا سندر۔‘‘ ستار بھائی نے کہا۔ ’’کل ہفتہ ہے اور بینک کی چھٹی ہے۔ اگر کل گاڑیوں کی ڈیل فائنل ہو بھی جاتی ہے تو پے منٹ پیر ہی کو ہو سکے گی۔ تم نے بتایا ہے نا، کیش پے منٹ چاہیے۔‘‘
’’بالکل کیش پے منٹ۔‘‘ سندر نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ’’وہ بھی کل دوپہر سے پہلے۔‘‘
’’سوری سندر۔‘‘ ستار بھائی نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ ’’تمہیں تو پتا ہی ہے، شہر میں چوری اور ڈکیتی کی وارداتیں کس قدر ہو رہی ہیں۔ اتنا بڑا کیش اماؤنٹ کوئی بھی گھر میں نہیں رکھتا۔ میرے حساب سے تو یہ معاملہ پیر پر ہی جائے گا۔‘‘
’’ٹھیک ہے، ستار بھائی، میں بعد میں آپ کو فون کرتا ہوں۔‘‘
ستار بھائی سے گفتگو کرنے کے بعد سندر نے ڈاکٹر جامی کو صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ جامی سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔
’’اوہ... یہ تو بڑی گڑبڑ ہو گئی۔‘‘ جامی نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔ ’’ہم اپنی گاڑیاں ستار بھائی کو بیچیں یا کسی اور پارٹی کو، کیش پے منٹ کا ایشو تو موجود رہے گا۔ یہ ہفتے اور اتوار کو بھی اسی وقت آنا تھا۔‘‘
’’بھائی جان! ہفتہ اور اتوار ہر ہفتے اپنے وقت پر ہی آتے ہیں۔‘‘ سندر نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ’’آپ ریلیکس ہو جائیں۔ آپ کو ٹینشن لینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں کوئی راستہ نکالتا ہوں۔‘‘
’’آپ اس منحوس اغوا کار سے منڈے تک کا ٹائم لینے کی کوشش کریں۔‘‘ فوزیہ نے اپنے شوہر سے کہا۔
’’وہ خبیث نہیں مانے گا۔‘‘ جامی نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہا۔ ’’وہ انسان نہیں، کوئی شیطان ہے۔ میں اس سلسلے میں اس کی منت کر چکا ہوں۔ وہ اتوار دوپہر کے بعد ایک سیکنڈ کی مہلت بھی دینے کو تیار نہیں۔ میں اگر چاہوں تو...‘‘ ڈاکٹر کی آواز میں کرب در آیا۔ ’’اپنے آٹھ دس جاننے والے صاحبِ ثروت افراد سے کچھ رقم ادھار لے کر مجموعی طور پر چالیس لاکھ کا بندوبست کر سکتا ہوں لیکن ان میں سے اکثر پلٹ کر مجھ سے یہ ضرور پوچھیں گے... ڈاکٹر صاحب! آپ کو اچانک پیسوں کی کیا ضرورت پیش آگئی؟ ان کے اس سوال کا میرے پاس کوئی جواب نہیں ہوگا کیونکہ... میں کسی کو یہ نہیں بتا سکتا کہ میرا بیٹا اغوا ہو گیا ہے اور تاوان کی رقم ادا کرنے کے لیے مجھے پیسے چاہئیں۔‘‘
اس لمحے ڈاکٹر جامی کے سیل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ نومی کے اغوا کے بعد جب بھی جامی کے فون پر کوئی کال آتی، وہ یہی سمجھتا کہ اغوا کار نے فون کیا ہے۔ انسان جس کی سچویشن میں ہوتا ہے، اس کے دل کو اسی نوعیت کا دھڑکا لگا رہتا ہے۔ ایک زندہ انسان کسی بھی صورت اپنی نفسیات سے پیچھا نہیں چھڑا سکتا!
’’ہیلو...‘‘ جامی نے ایک آسودہ سانس خارج

کرتے ہوئے کال ریسیو کرلی۔ ’’وٹز کا کیا ہوا بھائی ؟‘‘

دوسری جانب موٹر مکینک تھا۔ اس نے کہا۔ ’’ڈاکٹر صاحب! میں نے آپ کی گاڑی کا ٹائر تبدیل کر دیا ہے اور اس وقت آپ کے گیٹ پر کھڑا ہوں... وٹز سمیت۔‘‘

’’اوکے۔‘‘ جامی نے کہا۔ ’’بل ابھی چاہیے یا...‘‘

’’ڈاکٹر صاحب! بل کی پروا نہ کریں۔‘‘ جامی کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی مکینک بول اٹھا۔ ’’آپ گاڑی اندر لگوالیں۔ پیسے بعد میں آجائیں گے۔ پہلی بار آپ کا کام تھوڑی کیا ہے ڈاکٹر صاحب۔‘‘

جامی نے فوزیہ سے کہا کہ وہ وٹز گھر کے اندر پارک کروالے۔ فوزیہ بیڈروم سے نکلی تو سندر اپنی جگہ سے اٹھ کر جامی کے قریب جا بیٹھا پھر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھامتے ہوئے بولا۔

’’بھائی جان! یہ ٹھیک ہے کہ آپ مجھے کسی قابل نہیں سمجھتے لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ کھوٹا سکہ آج ضرور آپ کے کام آئے گا۔‘‘

’’ہم... مگر کیسے سندر...؟‘‘ ڈاکٹر جامی ان لمحات میں خاصا جذباتی ہو رہا تھا۔ ’’ہم دونوں گاڑیاں بیچ بھی دیں تو بیر سے پہلے رقم ہمارے ہاتھ میں نہیں آسکتی۔ بس، تمہاری آپا کا زیور ہی ایک ایسی چیز ہے جس کی کیش پے منٹ ہمیں فوراً مل سکتی ہے لیکن آٹھ دس لاکھ سے مسئلہ حل نہیں ہوگا، یہ بات تم بھی سمجھ رہے ہو...‘‘

’’سمجھ رہا ہوں بھائی جان اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اگر کل دونوں گاڑیاں سیل بھی ہو جاتی ہیں تو فوری طور پر ان کی پے منٹ نہیں مل سکے گی۔‘‘ سندر نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ ’’لیکن میں کچھ اور ہی سوچ رہا ہوں۔‘‘

’’تم کیا سوچ رہے ہو سندر؟‘‘ سندر کے لہجے میں اتنی گہرائی تھی کہ جامی پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

’’میں چاہتا ہوں، آپا کا زیور بکے اور نہ ہی دونوں گاڑیاں۔‘‘ سندر نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ’’اور چالیس لاکھ کیش بھی حاصل ہو جائیں...‘‘

’’یہ کیسے ممکن ہے سندر؟‘‘ جامی نے بے یقینی سے اپنے اکلوتے سالے کی طرف دیکھا۔

’’یہ ممکن ہے، بھائی جان...!‘‘ وہ جامی کا ہاتھ دباتے ہوئے بولا۔ ’’آپ کو طریقہ کار سے اختلاف ہو سکتا ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ اگر آپ نے میری بات مان لی تو سمجھیں، کام ہو جائے گا۔‘‘

’’تفصیلات کیا ہیں؟‘‘ ڈاکٹر جامی سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

’’بھائی جان! یہ ٹھیک ہے کہ میں نے زندگی میں کوئی بڑی کامیابی حاصل نہیں کی لیکن یہ ضرور ہے کہ میں نے کام کے بندوں کے ساتھ اچھے تعلقات ضرور بنائے ہیں۔‘‘ سندر نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ’’ایسے ہی میرے ایک دوست ہیں ولی بھائی۔ چالیس لاکھ کیا، وہ کھڑے کھڑے دو چار کروڑ کیش بھی مہیا کر سکتے ہیں۔ آپ کہیں تو ہم ان کے پاس چلتے ہیں۔‘‘

’’مگر تمہارے وہ ولی بھائی کس بنیاد پر مجھے چالیس لاکھ کیش دے دیں گے؟‘‘ یہ بات جامی کی سمجھ میں ٹھیک طرح سے بیٹھ نہیں سکی تھی لہٰذا سوال لازمی بنتا تھا۔

’’یہ بنیاد ہی وہ طریقہ کار ہے تھوڑی دیر پہلے میں نے جس کا ذکر کیا ہے۔‘‘ سندر وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ’’ولی بھائی چیزوں کو گروی رکھ کر ادھار دیتے ہیں۔‘‘

’’تو میں چالیس لاکھ کے بدلے ان کے پاس کیا گروی رکھواؤں گا؟‘‘ جامی نے پوچھا۔

’’دو گاڑیاں۔‘‘ سندر نے جواب دیا۔ ’’گاڑیوں کو فروخت کرنے سے تو بہتر ہے انہیں گروی رکھوا کر اپنی مطلوبہ رقم حاصل کر لی جائے اور ویسے بھی گاڑیاں بیچ کر کون سی ہاتھ کے ہاتھ رقم مل رہی ہے ہمیں۔‘‘

’’آئیڈیا تو برا نہیں۔‘‘ جامی نے رضامندی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ ’’لیکن اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ تمہارے ولی بھائی دونوں گاڑیوں کو چالیس لاکھ کا مان بھی لیں۔‘‘

’’چل کر اُن سے بات کرتے ہیں۔‘‘ سندر نے کہا۔ ’’گھر بیٹھے بیٹھے تو کچھ بھی نہیں ہوگا۔‘‘

’’تم ولی بھائی کو فون کر کے معلوم کر دنا یار...‘‘ جامی نے چل کر کہا۔

’’ولی بھائی کاروباری معاملات رُوبرو بیٹھ کر ہی کرتے ہیں۔‘‘ سندر نے بتایا۔ ’’ویسے میں انہیں فون کر کے اتنا بتا دیتا ہوں کہ میں ایک پارٹی کو لے کر ان کے پاس آرہا ہوں۔ چالیس پچاس لاکھ کیش کا معاملہ ہے۔‘‘

’’ٹھیک ہے، تم انہیں فون کرو۔ ہم ابھی چلتے ہیں۔‘‘ جامی نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ’’کیا ہم گاڑیاں بھی ساتھ لے چلیں؟‘‘

’’ظاہر ہے، گاڑیاں ساتھ نہیں ہوں گی تو پھر ڈیل کیسے ہوگی۔‘‘ سندر نے کہا۔ ’’ایسا کرتے ہیں، ہم پہلے کھانا کھاتے ہیں پھر نکلتے ہیں۔ آپا کو بھی ساتھ لے چلیں گے

ورنہ یہ گھر میں اکیلی پڑی خوامخواہ پریشان ہوتی رہیں گی۔''
جامی نے تائیدی انداز میں گردن ہلادی۔

☆☆☆

وہ تینوں ساحلِ سمندر کے ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھے تھے۔ یہ ریسٹورنٹ رات گئے تک کھلا رہتا تھا اور ابھی صرف دس ہی بجے تھے۔ سندر وٹز میں اور جامی اور فوزیہ سوک میں بیٹھ کر وہاں پہنچے تھے۔ دونوں گاڑیاں نیچے پارکنگ لاٹ میں کھڑی تھیں۔ مذکورہ ریسٹورنٹ ایک شاپنگ مال کے تھرڈ فلور پر واقع تھا۔ وہ ولی بھائی کی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔

ولی بھائی وقت کا بہت پابند ثابت ہوا تھا۔ اس نے سوا دس بجے آنے کو کہا تھا اور ٹھیک سوا دس بجے ہی وہ ریسٹورنٹ میں نمودار ہوا تھا۔ وہ بھاری بھرکم جسم کا مالک ایک ادھیڑ عمر شخص تھا۔ اس کے پہناوے اور انداز سے سادگی جھلکتی تھی۔ اسے دیکھ کر کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ کروڑوں کی کیش کی ڈیل کرتا ہوگا۔

سندر نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ ''ولی بھائی! یہ میری آپا اور بہنوئی ہیں۔ انہیں اچانک ایک بھاری رقم کی ضرورت پیش آگئی ہے۔ یہ اپنی دو گاڑیاں آپ کے پاس رکھوا کر چالیس لاکھ ادھار لینا چاہتے ہیں۔''

''ہوں...'' ولی بھائی نے گمبھیر انداز میں کہا۔ ''وہ گاڑیاں اس وقت کہاں ہیں۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ آیا ان کی مالیت اتنی ہے کہ جس کے بدلے میں آپ کو چالیس لاکھ دے سکوں۔''

''دونوں گاڑیاں نیچے پارکنگ میں کھڑی ہیں۔'' جامی نے کہا۔ ''آپ چاہیں تو جا کر چیک کرلیں۔'' پھر اس نے گاڑی کی چابیاں سندر کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''سندر! تم جا کر ولی بھائی کو گاڑیاں چیک کروادو۔''

سندر، ولی بھائی کو لے کر ریسٹورنٹ سے نکل گیا۔

''مجھے تو نہیں لگتا کہ اس بندے کے پاس اتنے پیسے ہوں۔'' فوزیہ نے اپنے دل کی بات کہہ دی۔ ''یہ تو اپنی حالت سے کافی غریب لگتا ہے۔''

''آج کل شہر کے جو حالات ہیں ان میں ہر پیسے والے نے سادگی اختیار کر رکھی ہے تاکہ وہ بھتا مافیا اور پرچی مافیا کی نگاہوں میں نہ آجائیں۔'' ڈاکٹر جامی نے کہا۔ ''یہ تو ہم جیسے سفید پوش لوگوں کی مجبوری اور پیشے کا تقاضا ہے کہ اچھے لباس میں ملبوس رہنا پڑتا ہے۔''

''ذرا سوچ سمجھ کر ڈیل کیجیے گا۔'' فوزیہ نے کہا۔ ''یہ نہ ہو کہ کسی چکر میں پھنس کر ہماری گاڑیاں بھی ہاتھ سے نکل جائیں۔ ہم پہلے ہی نومی کی پریشانی میں گھرے ہوئے ہیں۔''

''ہم نومی والی پریشانی سے نکلنے کے لیے ہی تو گاڑیوں کو گروی رکھوانے پر مجبور ہوئے ہیں۔'' جامی نے کہا۔ ''اور جہاں تک سوچ سمجھ کر ڈیل کرنے کا معاملہ ہے تو یہاں میں اپنی عقل سے نہیں بلکہ آپ کے سندر ویرا کے مشورے سے آیا ہوں۔ اب جو بھی ہوگا، وہ سندر ہی کی مرضی سے ہوگا۔''

''میرا بھائی بہت سمجھ دار ہے۔'' فوزیہ فخریہ لہجے میں بولی۔ ''ان حالات میں جب ہمارے ہاتھ پاؤں پھولے ہوئے تھے، سندر نے اس مصیبت سے نجات کا ایک راستہ تو نکالا۔ مجھے یقین ہے، انشاءاللہ سب ٹھیک ہوگا۔''

''انشاءاللہ...!'' ڈاکٹر جامی نے کہا۔

ان میاں بیوی کے بیچ بات چیت کا سلسلہ جاری ہی تھا کہ سندر، ولی بھائی کو لے کر واپس آیا۔ تینوں مردوں میں ایک بار پھر ''میٹنگ'' کا آغاز ہوگیا۔ ولی بھائی نے جامی سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

''ڈاکٹر صاحب! میں معاملات کا بہت کھرا ہوں اس لیے بات دوٹوک کرتا ہوں لہٰذا بہت سے لوگوں کو میری بات بری لگ جاتی ہے۔''

''میں کھری بات کرنے والوں کو بہت پسند کرتا ہوں۔'' جامی نے کہا۔ ''آپ کو جو بھی کہنا ہے، کھل کر کہہ سکتے ہیں۔''

''میرے حساب سے آپ کی دونوں گاڑیاں زیادہ سے زیادہ تیس لاکھ کی ہیں۔'' ولی بھائی نے کہا۔ ''میں انہیں اپنے پاس رکھ کر آپ کو تیس لاکھ کیش دے سکتا ہوں۔''

''تیس لاکھ سے کام نہیں چلے گا ولی بھائی۔'' جامی نے الجھن زدہ لہجے میں کہا۔ ''ہماری ضرورت چالیس لاکھ کی ہے۔''

''تو آپ چالیس لاکھ لے لیں۔'' ولی بھائی نے کہا۔ ''تیس لاکھ دونوں گاڑیوں کی مد میں اور دس لاکھ دوسری مد میں۔''

''دوسری مد... میں سمجھا نہیں؟'' جامی نے سوالیہ نظر سے ولی بھائی کی طرف دیکھا۔

''سیدھی سی بات ہے ڈاکٹر صاحب!'' ولی بھائی وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''یہ میرا کاروبار ہے جس میں، میں اپنے مالی فائدے پر نظر رکھتا ہوں۔ آپ چونکہ سندر

چٹکلے

☆ اگر آپ اپنی زندگی میں دنیا کو بدلنا چاہتے ہیں تو شادی سے پہلے یہ کام کر گزریں۔ شادی کے بعد آپ اپنی مرضی سے ٹی وی کا چینل بھی نہیں بدل سکیں گے۔

☆ بیوی کے فرمودات کا سننا ایسا ہی ہے جیسے کسی بھی معاہدے کی پشت پر بہت باریک حروف میں چھپی ہوئی شرائط کا پڑھنا، آپ کچھ پڑھتے ہیں نہ خاک سمجھتے ہیں مگر پھر بھی ان سے متفق ہو جاتے ہیں۔

☆ شطرنج دنیا کا واحد کھیل ہے جو شوہر کی اوقات واضح کرتا ہے۔ شاہ ایک وقت میں ایک گھر سرک سکتا ہے۔ کوئین کو ترمستیوں کی آزادی ہوتی ہے۔

☆ اگر بیوی کا دخل نہ ہو تو انسان قوموں پر حکمرانی تک کر سکتا ہے۔ حوالے کے لیے پڑوس میں دیکھیے، اٹل بہاری واجپائی، عبدالکلام، مودی وغیرہ وغیرہ۔

کراچی سے عائشہ خرم کا تجزیہ

کے بہت ہی قریبی رشتے دار ہیں اس لیے میں آپ سے خصوصی رعایت کروں گا۔ دوسروں کو میں جو رقم دیتا ہوں اس پر ماہانہ دس فیصد منافع لیتا ہوں۔ آپ سے صرف دو فیصد لوں گا۔''

وہ سود کی جگہ لفظ ''منافع'' استعمال کر رہا تھا۔ ڈاکٹر نے کہا۔ ''آپ کا مطلب ہے، دس لاکھ کی رقم پر مجھے ماہانہ بیس ہزار روپے آپ کو ادا کرنا ہوں گے۔''

''آپ کا حساب بالکل درست ہے ڈاکٹر صاحب۔'' ولی بھائی اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''اور جب آپ دس لاکھ کی یہ رقم واپس کریں گے تو میں یہ منافع لینا بند کر دوں گا۔''

سودا برا نہیں تھا لہٰذا جامی نے ڈن کر لیا پھر پوچھا۔ ''اور گاڑیوں کو گروی رکھنے کے سلسلے میں آپ ان تیس لاکھ پر کیا وصول کریں گے؟''

''آپ سندر کے رشتے دار ہیں اس لیے میں ایک ماہ تک آپ سے ایک پیسا نہیں لوں گا۔'' ولی بھائی کمالِ مہربانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولے۔ ''ایک ماہ کے بعد اگر آپ تیس لاکھ واپس کر دیں گے تو میں آپ کی گاڑیاں لوٹا دوں گا۔ بصورت دیگر آپ کے پاس دو راستے ہوں گے۔''

''کون سے دو راستے ولی بھائی؟'' جامی نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔

''نمبر ایک، آپ ایک ماہ کے بعد ان گاڑیوں کو بھول جانا۔ میں انہیں بیچ کر اپنے تیس لاکھ پورے کر لوں گا۔ اس سودے میں مجھے نقصان بھی ہو سکتا ہے لیکن پروا نہیں ہے۔ ولی بھائی اپنے دوستوں کی خاطر چھوٹے موٹے نقصان برداشت کرتا ہی رہتا ہے۔'' ولی بھائی وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''نمبر دو، آپ ان تیس لاکھ پر بھی دو فیصد منافع دینا شروع کر دینا۔''

ڈاکٹر نے فوراً حساب لگایا۔ تیس لاکھ پر دو فیصد منافع ساٹھ ہزار روپے ماہانہ بنتا تھا گویا کل رقم چالیس لاکھ پر اسے اسی ہزار روپے ماہانہ ادا کرنا ہوں گے جو کہ ممکن نہیں تھا۔ اس صورت میں اصل رقم بھی اپنی جگہ موجود رہتی۔

''ولی بھائی! کیا ایسا ممکن ہے کہ گاڑیوں والا معاملہ ہم اس وقت فائنل کر لیں۔'' جامی نے ایک فیصلے پر پہنچنے کے بعد کہا۔ ''یہ دونوں گاڑیاں ابھی سے آپ کی ہو گئیں۔ ان کے بدلے آپ مجھے تیس لاکھ دے دیں۔ البتہ، وہ جو دس لاکھ آپ مجھے الگ سے دیں گے تو ان پر میں آپ کو دو فیصد منافع یعنی بیس ہزار روپے ماہانہ آپ کو اس وقت تک ادا کرتا رہوں گا جب تک آپ کے دس لاکھ واپس نہیں کر دیتا۔''

''اب میں کیا بولوں، آپ سندر کے ساتھ آئے ہو۔'' ولی بھائی نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے منظور ہے۔''

جامی نے دونوں گاڑیوں کی چابیاں ولی بھائی کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''یہ دونوں گاڑیاں اب آپ کی ہو گئیں۔ ہفتہ اتوار کی چھٹی ہے۔ پیر کو آپ گاڑیاں اپنے نام کروا لینا۔ میں ہر قسم کے تعاون کے لیے تیار ہوں۔ اب یہ بتا دیں کہ آپ مجھے چالیس لاکھ کب اور کیسے دیں گے؟''

ولی بھائی نے گاڑیوں کی چابیاں وصول کرتے ہوئے پوچھا۔ ''آپ کو رقم کب چاہیے؟ آپ چاہیں تو میں ابھی ایک گھنٹے میں ڈیلیوری دے سکتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے، آپ ابھی دے دیں۔'' جامی نے اضطراری لہجے میں کہا۔

''بھائی جان! میری مانیں تو رقم صبح لیں۔'' سندر نے سنجیدگی سے کہا۔ ''اتنی بڑی رقم کو گھر میں رکھنا ٹھیک نہیں ہے۔ آپ کو پتا ہے، آج کل چوری اور ڈکیتی کی کتنی وارداتیں ہو رہی ہیں۔ آپ نے پارٹی کو کل دوپہر میں پے منٹ کرنا ہے نا... تو ولی بھائی سے صبح رقم لیں تو مناسب رہے گا۔''

''سندر نے ایک معقول بات کی ہے۔'' ولی بھائی نے ڈاکٹر جامی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ صبح جتنے بجے کہو گے، میں رقم آپ کے گھر پہنچا دوں گا۔''

''بس تو پھر ٹھیک ہے۔'' ڈاکٹر نے ایک اطمینان بھری سانس خارج کی۔

ولی بھائی نے پوچھا۔ ''نوٹ کس مالیت کے چاہئیں؟''

''ایک ہزار والے مگر استعمال شدہ۔'' ڈاکٹر نے کہا۔

''او کے... میں بندوبست کر دوں گا۔'' ولی بھائی نے کہا پھر پوچھا۔ ''آپ لوگ یہاں سے گھر کیسے جائیں گے؟''

''یہ کوئی ایشو نہیں، ہم ٹیکسی لے لیں گے۔''

وہ لوگ ریسٹورنٹ سے اٹھ گئے۔ جب وہ لفٹ میں تھے تو اچانک ہی ریسٹورنٹ کے باہر فائرنگ کی آواز گونجی۔ اس کے ساتھ ہی پولیس موبائل کے سائرن کی آواز بھی سنائی دی۔

''اللہ خیر کرے...!'' بے ساختہ فوزیہ کے منہ سے نکلا۔

''اللہ تو خیر ہی کرتا ہے بی بی۔'' ولی بھائی نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ ''مگر انسان کو خیر راس نہیں آتی لہٰذا یہ شر انگیزی کے معاملات میں مصروف رہتا ہے۔''

جب وہ شاپنگ مال سے باہر آئے تو فائرنگ کا سبب بھی معلوم ہو گیا۔ ایک لٹیرا ساحلِ سمندر پر لیڈیز کے پرس چھیننے کی مذموم کارروائی میں مصروف تھا کہ قریب سے گزرتی پولیس موبائل کی نظر اس پر پڑ گئی۔ پولیس نے اس لٹیرے کا تعاقب کیا تو وہ شاپنگ مال کی پارکنگ میں گھس گیا۔ پولیس نے اسے روکنے کے لیے ہوائی فائرنگ کی تو ایک گولی کہیں سے ریباؤنڈ ہو کر جامی والی ہونڈا سوک کی سائڈ اسکرین میں جا لگی اور وہ شیشہ چکنا چور ہو گیا۔ الغرض، پولیس مذکورہ لٹیرے کو پکڑنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

''آپ کا تو بیٹھے بٹھائے نقصان ہو گیا ولی بھائی۔'' ڈاکٹر جامی نے سوک کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''ڈاکٹر صاحب! فائدہ نقصان کاروبار کا حصہ ہے اور ایک مرد صرف اپنی زبان کا پاس کرتا ہے، فائدے نقصان کو زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔'' ولی بھائی اپنے سیل فون پر ایک نمبر پنچ کرتے ہوئے بولا۔ ''یہ ڈاکٹری کا پیشہ نہیں ہے جس میں صرف فائدہ ہی فائدہ ہوتا ہے۔''

پھر اس نے فون پر کسی کو حکم دیا کہ وہ فوراً اس شاپنگ مال کے پارکنگ ایریا میں پہنچے۔ اس کے بعد وہ ڈاکٹر کی جانب متوجہ ہوا۔

''ڈاکٹر صاحب! آپ بے فکر ہو کر گھر جاؤ۔ میرا ایک آدمی صبح نو بجے چالیس لاکھ کی رقم آپ کے گھر پہنچا دے گا اور آپ سے ان دونوں گاڑیوں کے مکمل کاغذات لے جائے گا۔ میں سندر پر بھروسا کر کے کوئی لکھت پڑھت نہیں کر رہا ہوں۔ امید ہے، یہ پہلی ڈیل ہمارے درمیان خوش گوار تعلقات کی بنیاد رکھے گی۔''

''انشاء اللہ ضرور۔'' ڈاکٹر جامی نے جلدی سے کہا۔

وہ تینوں ولی بھائی کو وہیں چھوڑ کر بہ ذریعہ ٹیکسی گھر آ گئے۔ سندر نے وہ رات وہیں پر گزارنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

''جب تک نومی بہ خیر و عافیت واپس نہیں آ جاتا، میں اِدھر ہی رہوں گا۔''

پچھلے تین چار گھنٹوں میں سندر نے اپنی کارکردگی کی بہ دولت جامی کے دل و دماغ میں اچھی خاصی جگہ بنا لی تھی لہٰذا اب جامی کو اس سے کسی قسم کی چڑ محسوس نہیں ہو رہی تھی بلکہ گھر میں سندر کی موجودگی سے اسے اطمینان اور حوصلہ مل رہا تھا۔

''یار سندر! یہ تمہارا ولی بھائی تو بڑا عجیب آدمی ہے۔'' جامی نے کہا۔

''عجیب... کیا مطلب بھائی جان؟'' سندر نے سوالیہ نظر سے اپنے دولہا بھائی کی طرف دیکھا۔

''مطلب یہ کہ اس اللہ کے بندے نے بیٹھے بٹھائے ہمارا مسئلہ حل کر دیا۔'' جامی اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''ہمارے لیے تو یہ رحمت کا فرشتہ ثابت ہوا ہے۔''

''بس بھائی جان! ولی بھائی ایسا ہی ہے...'' سندر نے کہا۔ ''آپ نے دیکھا، پولیس کی فائرنگ سے آپ کی سوک جو ڈیمیج ہوئی اس پر ولی بھائی کے ماتھے پر ایک شکن

نہیں ابھری۔ اس نے وہ سارا نقصان چپ چاپ اپنے کھاتے میں ڈال لیا۔''

''ہاں بھئی کمال کا بندہ ہے۔'' ڈاکٹر جامی نے ستائشی لہجے میں کہا۔ ''ایک دم زبان کا پکا۔''

''بھائی جان! میں جانتا ہوں، زندگی میں کامیابیاں حاصل کرنا بہت ضروری ہے اور بدقسمتی سے میں ایسا نہیں کر سکا۔'' سندر نے خواب ناک لہجے میں کہا۔ ''لیکن میں نے زندگی میں تعلقات ضرور بنائے ہیں۔ ولی بھائی اس کی ایک زندہ مثال ہے۔''

''سندر! مجھے معاف کر دینا۔ میں آج تک تمہارے بارے میں غلط سوچتا رہا۔'' جامی نے سنجیدگی سے کہا۔ ''تمہارے اندر ایک عظیم انسان چھپا ہوا ہے۔ آج تم نے مجھ پر جو احسان کیا ہے، وہ میں زندگی بھر یاد رکھوں گا۔''

''بھائی جان! آپ مجھے شرمندہ کر رہے ہیں۔'' سندر بھی جذباتی ہو گیا۔ ''میں نے کسی پر کوئی احسان نہیں کیا۔ میں جو کچھ بھی کر رہا ہوں، اپنے بھانجے نومی کے لیے کر رہا ہوں اور... یہ میرا فرض ہے۔''

''سندر! تم میرے ساتھ آؤ۔'' فوزیہ نے زیرِلب مسکراتے ہوئے کہا اور اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ''ابھی تک تو تم اپنے دولھا بھائی کی نظر میں سندر ویرا ہو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہاری جذباتی باتوں کو سن کر یہ تمہیں ٹیٹو بنا دیں۔''

سندر اٹھا اور فوزیہ کے ساتھ دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد فوزیہ واپس جامی کے پاس آئی تو اس نے پوچھا۔

''سندر کو کہاں چھوڑ آئی ہیں؟''

''آپ کو پتا ہے، سندر رات کو دیر تک جاگنے کا عادی ہے۔'' فوزیہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''اور بعض اوقات فجر کی اذانیں بھی ہو جاتی ہیں۔ آپ کے پاس بیٹھا رہتا تو آپ کو بھی پوری رات جاگنا پڑتا۔ اسے ٹی وی والے کمرے میں چھوڑ آئی ہوں تاکہ آپ آرام کر سکیں۔ کل کا دن بہت معرکہ آرا ہے لہٰذا آج کی رات آپ کا آرام کرنا بہت ضروری ہے۔''

''صرف میرا ہی نہیں، آپ کا بھی۔'' ڈاکٹر جامی نے کہا۔ ''ہم دونوں کو ایک بھرپور نیند لینا چاہیے۔''

فوزیہ نے جامی کے سینے پر سر رکھ دیا۔ ''جامی! ہمارا نومی کل گھر آ جائے گا نا...؟'' اس نے امید بھرے لہجے میں پوچھا۔

''اللہ کے حکم سے نومی کل دوپہر میں ہماری نظروں کے سامنے اس گھر میں ہوگا۔'' ڈاکٹر نے پُرشوق انداز میں کہا۔

''بس، کل صبح ولی بھائی وقت پر پیسے پہنچا دیں۔'' فوزیہ کے لہجے میں خدشات کی جھلک تھی۔ ''نومی کی واپسی اسی رقم سے بندھی ہوئی ہے جو ولی بھائی ہمیں دیں گے۔''

''آپ تمام اندیشوں کو اپنے ذہن سے جھٹک دیں۔'' ڈاکٹر جامی نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''انشاء اللہ... سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''انشاء اللہ...!''

☆☆☆

ڈاکٹر جامی اور فوزیہ حسبِ معمول اپنے وقت پر بیدار ہوئے تھے۔ ناشتے کی میز پر وہ دونوں ساتھ تھے مگر سندر کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ جامی نے فوزیہ سے پوچھا۔

''سندر کہاں ہے؟''

''وہ سو رہا ہے۔'' فوزیہ نے بتایا۔

''اسے جگا دیتیں۔'' جامی نے اپنائیت بھرے لہجے میں کہا۔ ''وہ بھی ہمارے ساتھ ناشتا کرتا تو کتنا اچھا لگتا۔''

''وہ پتا نہیں کب سویا ہوگا۔'' فوزیہ نے کہا۔ ''اسے سونے دیں۔ جب اٹھے گا تو خود ہی ناشتا کر لے گا۔''

یہ ان کی زندگی کی پہلی صبح تھی جب نومی ان کے بیچ موجود نہیں تھا۔ نومی کے اندر ان دونوں کی جان تھی گویا اغوا کار نے نومی کو چھین کر انہیں بے جان کر دیا تھا۔ وہ زندہ لاشیں بن کر رہ گئے تھے۔ انسان کی زندگی میں ایسے لمحات بھی آتے ہیں جب وہ مکمل طور پر حالات کے رحم و کرم پر ہوتا ہے۔ ان دونوں پر بھی کچھ ایسا ہی وقت آن پڑا تھا۔

وہ ناشتے سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ اغوا کار کا فون آ گیا۔ جامی نے کال اٹینڈ کی۔ وہ ہر بار کسی نئے نمبر سے کال کرتا تھا جس سے اس کی چالاکی اور احتیاط پسندی جھلکتی تھی۔

''ہیلو ڈاکٹر! ناشتا کر لیا؟'' اس نے بڑے دوستانہ انداز میں پوچھا۔

''ہمارا نومی کیسا ہے؟'' جامی نے سیل کا اسپیکر آن کرتے ہوئے پوچھا۔

''ہمارا نومی...!'' اس نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ''اس کا مطلب ہے، نومی کی مما بھی تمہارے ساتھ ہی بیٹھی ہوئی ہے۔''

''ہاں... نومی سے ہماری بات کراؤ۔'' جامی نے مضبوط لہجے میں کہا۔

''اس وقت نومی نہ تمہارا ہے اور نہ تمہاری بیوی کا۔''
اغواکار نے مکروہ ہنسی کے ساتھ کہا۔ ''وہ صرف اور صرف میرا ہے اور اس وقت تک میرا ہی رہے گا جب تک تم پچاس لاکھ مجھ تک نہیں پہنچا دیتے۔'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔
''رقم کا انتظام ہو گیا؟''
''ہاں... ہو گیا۔'' ڈاکٹر نے اعتماد کے ساتھ جواب دیا۔
''گڈ... ویری گڈ...'' دوسری طرف سے کہا گیا۔
''کب تک رقم میرے حوالے کر سکتے ہو؟''
''آج دوپہر میں کسی وقت۔'' جامی نے کہا۔
''اس کا مطلب ہے، رقم ابھی تمہارے ہاتھ میں نہیں آئی؟'' وہ عیاری سے بولا۔ ''ورنہ تم کہتے... بتاؤ، کہاں رقم پہنچاؤں... میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟''
''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ رقم تھوڑی دیر میں میرے پاس پہنچ جائے گی۔'' جامی نے صاف گوئی کا ظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''بتاؤ، مجھے رقم کہاں پہنچانا ہوگی اور نومی مجھے کہاں ملے گا؟''
''اتنا تیز نہیں بھاگو ڈاکٹر!'' وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''اگر منہ کے بل گرے تو بتیسی لگوانا پڑ جائے گی... جب رقم تمہارے ہاتھ آجائے گی تو پھر بتا دوں گا، آگے کیا کرنا ہے۔''
''دیکھو، میں تمہاری ہر بات پر عمل کر رہا ہوں۔'' جامی نے وارننگ دینے والے انداز میں کہا۔ ''تم بھی اپنے وعدے کو پورا کرنا۔ میرے بیٹے کو کوئی تکلیف نہیں ہونا چاہیے اور ہاں... آج دوپہر میں مجھے میرا بیٹا چاہیے۔''
''میں اپنے وعدے کا پابند ہوں ڈاکٹر! تمہیں تمہارا بیٹا صحیح وسلامت مل جائے گا لیکن رقم وصول کرنے کے پندرہ منٹ بعد۔'' اس نے حتمی لہجے میں کہا۔ ''یہ پندرہ منٹ میں اپنے اطمینان کے لیے لے رہا ہوں تاکہ چیک کر سکوں کہ تم نے کوئی ہیرا پھیری تو نہیں کی۔''
''میں کسی قسم کی دغابازی کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔'' جامی نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''میرے لیے نومی کی سلامتی سب سے زیادہ اہم ہے۔''
''ایسا ہونا بھی چاہیے۔'' وہ سرسری لہجے میں بولا۔ پھر ایک برانڈڈ پارچہ فروش اسٹور کا نام لے کر اس نے پوچھا۔ ''تمہارے گھر کا مہینے بھر کا سودا اسی اسٹور سے آتا ہے نا؟''
''ہاں... مگر یہ بات کیوں پوچھ رہے ہو؟'' ڈاکٹر نے سوال کیا۔
''سوال نہیں، صرف جواب دو ڈاکٹر۔ میں تمہارا پیشنٹ نہیں بلکہ اس وقت تمہارا ماسٹر ہوں۔'' وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''اپنی بیوی سے پوچھ کر بتاؤ، اس اسٹور کے پرنٹڈ شاپنگ بیگز تو کچن میں ضرور رکھے ہوں گے...!''
سیل فون کا اسپیکر آن تھا لہٰذا یہ تمام ترگفتگو فوزیہ بھی سن رہی تھی۔ جامی نے سوالیہ نظروں سے فوزیہ کی طرف دیکھا تو اس نے اثبات میں گردن ہلا دی۔
''ہاں، شاپنگ بیگز رکھے ہیں۔'' جامی نے کہا۔ ''کیا کرنا ہے، ان بیگز کا؟''
''فی الحال دو تین بیگ الگ سنبھال کر رکھ لو۔'' اس نے کہا۔ ''ان کا کرنا کیا ہے، یہ میں بعد میں بتاؤں گا۔''
''پلیز... نومی سے ہماری بات کرا دو۔'' جامی نے منت ریز لہجے میں کہا۔ ''اس سے دوری ہم سے برداشت نہیں ہو رہی۔''
وہ ڈاکٹر کی درخواست کو نظرانداز کرتے ہوئے بولا۔
''میں نے تمہیں بتایا تھا ناکہ میرے تین مستعد مسلح بندے تم لوگوں کی مسلسل نگرانی کر رہے ہیں؟''
''ہاں بتایا تھا۔'' ڈاکٹر نے تائیدی انداز میں کہا۔
''کیوں... کیا ہوا؟''
''ابھی تک تو کچھ بھی نہیں ہوا اور کچھ ہونا بھی نہیں چاہیے۔'' وہ معنی خیز انداز میں بولا۔ ''میرے بندوں نے مجھے بتایا ہے کہ کل رات سے تمہارے گھر میں ایک دبلا پتلا اور گھنی مونچھوں والا دراز قامت آدمی ٹھہرا ہوا ہے۔ تم لوگ اس کے ساتھ ساحلِ سمندر کے کسی ریسٹورنٹ میں بھی گئے تھے۔ کون ہے یہ شخص؟''
''وہ میرا سالا سندر ہے۔'' جامی نے بتایا۔ ''ہماری وجہ سے وہ بھی سخت پریشان ہے۔ اسی کی کوششوں سے میں تمہارے لیے رقم کا بندوبست کرنے میں کامیاب ہوا ہوں۔''
''اوہ...'' اس نے ایک گہری سانس خارج کی۔ ''تو اس کا مطلب ہے، تمہارا وہ جھلّی سالا سندر بھی اس معاملے سے واقف ہو چکا ہے۔''
''سندر ہمارا اپنا ہے۔ ہمیں اس پر بھروسا ہے۔'' ڈاکٹر نے جلدی سے کہا۔
''سندر تمہارا اپنا ہے یا پرایا مگر میں کسی بھی اجنبی پر بھروسا نہیں کر سکتا۔'' وہ حتمی لہجے میں بولا۔ ''جب تک میری رقم مجھے نہیں مل جاتی، سندر تمہارے گھر سے باہر قدم

بھی نہیں نکالے گا۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا۔۔۔؟''

''ہاں ہاں۔۔۔ میں سمجھ رہا ہوں۔'' جامی نے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے کہا۔''میں سندر کو ہدایت کر دوں گا کہ وہ نومی کی واپسی تک گھر کے اندر ہی رہے۔''

''تمہارے اس لبو سالے کے حق میں یہی بہتر ہے کہ وہ تمہاری ہدایت پر عمل کرے۔'' اس شخص نے خطرناک انداز میں کہا۔''اگر اس نے گھر سے باہر قدم نکالا تو میرے بندوں کی چلائی ہوئی ایک اندھی گولی اس کی زندگی کا چراغ گل کردے گی۔''

''نہیں نہیں۔۔۔ تم اس انداز میں مت سوچو۔'' جامی نے اضطراری لہجے میں کہا۔''میں سندر کو اچھی طرح سمجھا دوں گا۔''

''اگر وہ تمہاری بات کو سمجھ جائے تو اچھا ہے۔'' اغوا کار نے کہا۔''میں اس مرحلے پر کوئی رسک نہیں لے سکتا۔ بندہ پکڑ کا نا ہمارے لیے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔''

''وہ نومی سے ہماری بات۔۔۔'' جامی نے کچھ کہنا چاہا۔

وہ قطع کلامی کرتے ہوئے بولا۔''نومی سے اس وقت تمہاری بات کراؤں گا جب رقم تمہارے ہاتھ میں آجائے گی۔ میں دو گھنٹے کے بعد دوبارہ فون کروں گا۔''

اپنی بات مکمل کرنے کے بعد اس نے لائن کاٹ دی۔

''اس کمینے نے تو ہمارے اٹھنے، چلنے پھرنے پر نگاہ رکھی ہوئی ہے۔'' فوزیہ نے برہمی سے کہا۔

''بڑی چوکس اور مسلح نگاہ ہے۔'' ڈاکٹر نے کہا۔

''میری وجہ سے ڈاکٹر سکندر اس کے ہاتھ سے نکل گیا، گویا اس کے ایک کروڑ ڈوب گئے۔ لہٰذا وہ کچھ زیادہ ہی احتیاط سے کام لے رہا ہے۔ میں سمجھتا ہوں ہمیں بھی کوئی رسک نہیں لینا چاہیے۔ ہماری جانب سے کوئی ایسا عمل سامنے نہیں آنا چاہیے جس سے وہ بھڑک اٹھے اور۔۔۔ نومی کو کوئی نقصان پہنچے۔''

''میں سندر کو اچھی طرح سمجھا دوں گی کہ جب تک نومی صحیح سلامت گھر واپس نہیں آجاتا، وہ بنگلے سے باہر نکلنا تو رہا ایک طرف، وہ گیٹ کی طرف بھی نہ جائے۔'' فوزیہ نے تشویش بھرے انداز میں کہا۔''پتا نہیں، اس مردود کے مسلح افراد کیا سمجھیں اور کسی غلط فہمی میں آکر وہ سندر پر فائر نہ کھول دیں۔''

''نو بجنے میں تھوڑا سا وقت رہ گیا ہے۔'' جامی نے دیوار گیر کلاک کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔''اب آپ سندر کو جگا دیں۔۔۔ ولی بھائی کا بندہ آنے ہی والا ہوگا۔''

''ہاں، ٹھیک ہے، میں سندر کو جگاتی ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے فوزیہ وہاں سے اٹھ گئی۔

ٹھیک نو بجے بیرونی گیٹ والی گھنٹی بج اٹھی۔ ڈاکٹر جامی خود گیٹ پر پہنچا۔ جب اس نے گیٹ کھولا تو سامنے ایک اجنبی شخص کھڑا تھا۔ اس شخص کے ہاتھ میں ایک سیاہ بیگ بھی نظر آرہا تھا۔ اس نے جامی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''مجھے ولی بھائی نے بھیجا ہے۔ کیا آپ ڈاکٹر جامی ہیں؟''

''ہاں، میں ہی ڈاکٹر جامی ہوں۔'' جامی نے اثبات میں جواب دیا۔''آپ اندر آجائیں۔''

تھوڑی دیر کے بعد جامی اور وہ بیگ بردار شخص ڈرائنگ روم کے صوفوں پر آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ جامی نے فوزیہ سے چائے ناشتا لانے کے لیے کہا تو اس شخص نے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا۔

''میں ناشتا کر چکا ہوں۔'' وہ سپاٹ آواز میں بولا۔ ''میں یہاں زیادہ دیر نہیں رک سکتا۔ آپ دونوں گاڑیوں کے کاغذات مجھے دیں تو میں آپ کی امانت آپ کے حوالے کر کے یہاں سے چلا جاؤں گا۔''

''اوکے۔۔۔ میں گاڑیوں کے کاغذات والی فائلیں لے کر آتا ہوں۔'' ڈاکٹر نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''مجھے بتایا گیا تھا کہ یہاں پر سندر صاحب بھی ہوں گے۔'' اس شخص نے کہا۔''وہ مجھے کہیں نظر نہیں آرہے۔ ولی بھائی کی ہدایت ہے کہ کاغذات اور رقم کا تبادلہ سندر صاحب کی موجودگی میں ہونا چاہیے۔''

''سندر واش روم میں ہے۔'' فوزیہ نے کہا۔ ''تھوڑی ہی دیر میں وہ یہاں ہوگا۔''

اس شخص نے اطمینان بھرے انداز میں گردن ہلا دی۔

ٹھیک دس منٹ کے بعد وہ چاروں ڈرائنگ روم میں موجود تھے۔ جامی نے گاڑیوں کے کاغذات والی فائلیں اس بندے کو تھما دیں۔ اس نے مختلف کاغذات کو الٹ پلٹ کر دیکھا پھر مطمئن ہو کر وہ فائلیں سینٹر ٹیبل پر رکھ دیں پھر اپنے ساتھ لائے ہوئے کالے بیگ کو جامی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''ڈاکٹر صاحب! اس بیگ کے اندر پورے چالیس

لاکھ روپے ہیں۔ ہزار روپے والے استعمال شدہ نوٹوں کے چالیس پیکٹ۔ آپ گن کر اپنا اطمینان کر لیں تو میں جاؤں۔''

جامی نے وہ بیگ سندر کی سمت کھسکا دیا اور کہا۔ ''تم گن لو سندر۔''

سندر نے اس کالے بیگ کو سینٹر ٹیبل پر ڈھیر کر دیا پھر ایک ایک گڈی کو گھما پھرا کر دیکھنے کے بعد وہ بیگ میں رکھنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی وہ کاؤنٹنگ بھی کرتا جا رہا تھا۔ جب چالیس کے چالیس پیکٹ دوبارہ بیگ کے اندر پہنچ گئے تو اس نے کہا۔

''بھائی جان! رقم پوری ہے۔''

وہ بندہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور بولا۔ ''اب میں چلوں گا۔''

سندر نے کہا۔ ''چلیں، میں آپ کو گیٹ تک چھوڑ آتا ہوں۔''

''نہیں سندر، تم اِدھر ہی بیٹھو۔'' ڈاکٹر نے جلدی سے کہا۔ ''انہیں میں ہی آف کر دیتا ہوں۔''

سندر نے الجھن زدہ نظر سے اپنے دولھا بھائی کو دیکھا تاہم خاموش رہا۔ جامی کے جانے کے بعد اس نے فوزیہ سے پوچھا۔

''آپا! دولھا بھائی نے مجھے گیٹ کی طرف جانے سے کیوں منع کر دیا؟''

فوزیہ نے مختصر مگر جامع الفاظ میں سندر کو اغواکار کی صبح والی کال کے بارے میں بتایا پھر کہا۔ ''اس کمینے کو شک ہے کہ تم کہیں کوئی گڑبڑ نہ کر دو اس لیے جب تک نومی واپس نہیں آ جاتا، تمہیں گھر کے اندرونی حصے ہی میں رہنا ہوگا۔''

''ٹھیک ہے، میں سمجھ گیا۔'' سندر اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

اسی وقت جامی بھی ان کے پاس پہنچ گیا۔ سندر نے کہا۔ ''بھائی جان! جو دس لاکھ آپ بینک میں سے نکلوا کر لائے تھے۔ وہ بھی اسی بیگ میں رکھ دیں۔ ساری رقم ایک ہی جگہ رہے تو اچھی بات ہے۔''

''گڈ آئیڈیا۔'' جامی نے سراہنے والی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''بھائی جان! میری بڑی خواہش تھی کہ جب آپ اغواکار کو رقم دینے جائیں تو میں مورل سپورٹ کے لیے آپ کے ساتھ ہوں۔'' سندر نے حسرت ناک لہجے میں کہا۔

''لیکن اس بدبخت نے تو میری گھر میں نظر بندی کے احکام صادر کر دیے ہیں۔''

''یہ جرائم پیشہ لوگ دماغ کے خاصے ٹیڑھے ہوتے ہیں۔'' جامی نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''انہیں ان کی سوچ کے خلاف کوئی بات سمجھانا ممکن نہیں ہوتا لہٰذا ہمیں احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ جب تک نومی بحفاظت واپس نہیں آ جاتا، ہمیں اس کی ہدایات پر عمل کرنا ہوگا۔''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں بھائی جان۔'' سندر نے خیال افروز لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ ''وہ بندہ دوبارہ کب فون کرے گا؟''

''اس کی کال لگ بھگ آٹھ بجے آئی تھی۔'' جامی نے بتایا۔ ''اور اس نے کہا تھا کہ دو گھنٹے کے بعد دوبارہ فون کرے گا۔ کم و بیش دس بجے اس کا فون آ سکتا ہے۔''

''دس بجنے میں پندرہ بیس منٹ باقی ہیں۔'' فوزیہ نے کہا۔ ''سندر! جب تک تم ناشتا کر لو۔''

''جی آپا... یہ ٹھیک ہے۔'' وہ فرماں برداری سے بولا۔

دس بج کر دس منٹ پر اغواکار کی کال آ گئی۔ وہ تینوں اس وقت فوزیہ والے بیڈ روم میں بیٹھے تھے۔ انجانے نمبر دیکھ کر جامی چونک جاتا تھا۔ اس نے کال ریسیو کرتے ہوئے سیل فون کا اسپیکر آن کر دیا۔ اگلے ہی لمحے اسپیکر سے اغواکار کی آواز سنائی دی۔

''ہیلو ڈاکٹر! کیسے ہو۔ پہلے تم اپنے بچے سے بات کر لو۔ باقی باتیں بعد میں...''

''مما... پاپا...'' نومی کی آواز ابھری۔ ''آپ لوگ ٹھیک ہیں نا؟''

''جانو! ہم لوگ بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں۔'' فوزیہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''آپ سناؤ، رات کیسی گزری؟''

''اچھی گزری ہے مما۔ میں نے ناشتا بھی کر لیا ہے۔'' نومی نے بتایا۔ ''یہ انکل کہہ رہے تھے کہ آج کا لنچ میں آپ لوگوں کے ساتھ کروں گا۔''

''انشاء اللہ... ایسا ہی ہوگا میرے بچے۔'' جامی نے جذبات سے مغلوب لہجے میں کہا۔ ''میں نے اس بندے کا مطالبہ پورا کرنے کا بندوبست کر لیا ہے۔ آپ فکر نہیں کرو۔ میں آپ کو لینے آ رہا ہوں۔''

''نومی! میں آپ کا ماموں سندر۔'' سندر نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔ ''آپ گھبرانا نہیں۔ سب ٹھیک ہو

جائے گا۔"

"تھینک یو ماموں۔" نومی نے کہا۔

"میں تمہارے لیے بہت سارے گفٹ لے کر آؤں گا۔" سندر نے کہا۔ "بس، ایک بار تم گھر آجاؤ..."

"اس زرافے کی نسل کو چپ کراؤ ڈاکٹر۔" اغواکار کی آواز سے برہمی ٹپک رہی تھی۔ "اگر یہ لم ڈھینگ پچھل دوبارہ ہماری گفتگو کے بیچ بولا تو میں فون بند کر دوں گا۔"

"نہیں... اب سندر ایک لفظ نہیں بولے گا۔" جامی نے اغواکار سے کہا۔ ساتھ ہی اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر سندر کو خاموش رہنے کا اشارہ بھی کر دیا۔

"تو تم نے رقم کا بندوبست کر لیا؟" اغواکار نے پوچھا۔

"ہاں رقم کا انتظام ہو گیا ہے۔"

"پورے پچاس لاکھ ہیں نا؟"

"پورے ہیں۔ تم بے فکر رہو۔" جامی نے کہا۔ "میں فیئر کام کرتا ہوں۔"

"ایک ہزار والے استعمال شدہ نوٹوں کے پچاس پیکٹ ہیں نا؟" اغواکار نے تصدیق طلب انداز میں سوال کیا۔

"بالکل..." جامی نے جواب دیا۔ "میں نے تمہارے مطالبے کے عین مطابق رقم کا بندوبست کیا ہے۔"

"شاباش!" وہ ستائشی انداز میں بولا۔

"دیکھو، میں تمہارا مطالبہ پورا کر رہا ہوں۔" جامی نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "لہٰذا تم بھی اپنے معاملے میں دیانت دار رہنا۔"

"فکر نہ کرو ڈاکٹر۔" وہ تسلی آمیز لہجے میں بولا۔ "میں زبان کا پکا ہوں۔ جب تم پچاس لاکھ میرے حوالے کرو گے، اس کے ٹھیک دس منٹ کے بعد بچہ تمہارے پاس ہوگا۔"

"ایک وعدہ اور بھی کرو..." جامی نے ایک فوری خیال کے تحت کہا۔

"کیسا وعدہ؟" اس نے چونکے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"آج کے بعد تم مجھے یا میری فیملی کو کبھی تنگ نہیں کرو گے۔" جامی نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔

"فکر نہ کرو۔ میں آج کے بعد تمہیں اور اور تمہاری فیملی کو بھول جاؤں گا۔" وہ ٹھوس لہجے میں بولا۔ "تمہارے لیے بھی یہی بہتر ہوگا کہ مجھے اور اس واقعے کو فراموش کر دو اور کبھی غلطی سے بھی کسی سے اس کا ذکر نہیں کرنا۔"

"میں ایسا ہی کروں گا۔" ڈاکٹر جامی نے کسی معمول کے مانند کہا۔

"اب میری بات غور سے سنو۔" اغواکار نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ "میں نے تمہیں تین چار شاپنگ بیگز سنبھالنے کو کہا تھا؟"

"ہاں، وہ بیگ محفوظ ہیں۔" جامی نے جاب دیا۔

"بتاؤ، ان کا کیا کرنا ہے؟"

"تمہارے پاس جو نوٹوں کی پچاس گڈیاں ہیں، ان کی دو ڈھیریاں بنالو۔" اس نے کہا۔ "ہر ڈھیری کو اچھی طرح کسی کپڑے (چادر یا دوپٹا) میں لپیٹ کر ایک شاپنگ بیگ میں رکھ لو اور پھر اس بیگ کو ڈبل کر لو۔ اس طرح تمہارے پاس ڈبل بیگ والی دو تھیلیاں بن جائیں گی جو دور سے ایسی ہی دکھائی دیں گی جیسے تم کوئی سودا سلف لے کر جا رہے ہو۔ میری بات سمجھ گئے ہو نا...؟"

"بالکل سمجھ گیا ہوں۔" جامی نے جواب دیا۔ "بیگ کو تم نے ڈبل اس لیے کرایا ہے کہ ان کی گرفت مضبوط رہے اور باہر سے یہ بھی اندازہ نہ ہو کہ ان بیگز کے اندر کس نوعیت کا سودا بھرا ہوا ہے۔"

"ہاں... میرا یہی مقصد ہے۔" اس نے سرسری انداز میں کہا۔ "اور اپنا موبائل اچھی طرح چارج کر لو۔ تمہیں ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے گھر سے نکلنا ہے... ان دو بیگز کے ساتھ۔"

"اوکے، ٹھیک ہے۔" جامی نے کہا۔

"اب میں ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے فون کر کے تمہیں مزید ہدایات دوں گا۔" اس نے بات ختم کرنے والے انداز میں کہا۔ "اور اپنے اس پچھل سالے آدھے گھر والے کو اچھی طرح سمجھا دینا کہ گھر کے اندر چپ چاپ تمیز کے ساتھ بیٹھا رہے۔ اگر اس نے میرا سالا بننے کی کوشش کی تو تم لوگوں کے ساتھ اچھا نہیں ہوگا۔"

اس سے پہلے کہ جامی اس کی بات کے جواب میں کچھ کہتا، اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔

جامی نے سیل فون کو چارجنگ پر لگایا اور سندر کی مدد سے اغواکار کی ہدایت کے مطابق، پچیس پچیس لاکھ مالیت کے دو بیگ تیار کرنے میں مصروف ہو گیا۔ دس پندرہ منٹ کی کوشش کے بعد مطلوبہ بیگ تیار تھے۔ ان بیگز کو باہر سے دیکھ کر کوئی یہ اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ ان کے اندر بھاری مالیت کی کرنسی بھری ہوئی ہے۔ وہ دکھنے میں واقعتاً سودے

سے بھرے ہوئے شاپنگ بیگز ہی نظر آتے تھے۔

ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے اغوا کار کا فون آ گیا۔ اس نے پوچھا۔ ''ڈاکٹر! آپ ریڈی ہو؟''

''جی... میں بالکل ریڈی ہوں۔'' وہ جلدی سے بولا۔

''ٹھیک ہے، تم رقم والے دونوں بیگز اٹھا کر گھر سے نکل جاؤ۔'' اس نے ہدایات دیں۔ ''تمہاری گلی کے اختتام پر رکشا کھڑے رہتے ہیں۔ کبھی کبھی کوئی ٹیکسی بھی نظر آ جاتی ہے لیکن تم رکشے ہی میں بیٹھو گے۔ ٹھیک ہے؟''

''جی سمجھ گیا۔'' جامی نے کہا۔ ''رکشے والے کو کہاں جانے کے لیے کہنا ہے؟''

''نیٹی جیٹی...''

''سمجھو، میں نیٹی جیٹی پہنچ گیا۔'' جامی نے کہا۔ ''اس کے بعد کیا کرنا ہے؟''

''میں ایسے نہیں سمجھ سکتا ڈاکٹر۔'' وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''جب تم نیٹی جیٹی پہنچ کر رکشا کو چھوڑ دو گے تب میں سمجھوں گا کہ تم پہنچ گئے ہو۔ اس کے بعد کیا کرنا ہے، یہ میں جبھی بتاؤں گا۔''

''اوکے... میں گھر سے نکل رہا ہوں۔'' جامی نے کہا۔

پھر اس نے فوزیہ اور سندر کو ''خدا حافظ'' کہا اور نوٹوں سے بھرے وہ دونوں شاپنگ بیگز اٹھا کر نومی کی بازیابی کے سفر پر روانہ ہو گیا۔

جامی کو اس بات میں کوئی شک نہیں تھا کہ اغوا کار کا کوئی خاص بندہ اس کی نگرانی کر رہا تھا اور وہ ایسا سوچنے میں حق بجانب بھی تھا کیونکہ پچھلے چوبیس گھنٹے میں اغوا کار نے قدم قدم پر یہ ثابت کیا تھا کہ اس کے مستعد مسلح بندے اس کے گھر کی کڑی نگرانی کر رہے تھے۔ جامی کو یہ بھی یقین تھا کہ اس وقت بھی اغوا کار کا کوئی بندہ اس کے تعاقب میں ہوگا۔

وہ گلی کے نکڑ پر پہنچا تو وہاں صرف ایک ہی رکشا کھڑا تھا۔ وہ رکشے کے قریب پہنچا اور رکشا والے سے پوچھا۔

''نیٹی جیٹی چلو گے؟''

''بیٹھیں صاحب... ضرور چلوں گا۔'' رکشا والے نے بڑی شائستگی سے جواب دیا۔

جامی کرائے کی بات کیے بغیر رکشا کے اندر بیٹھ گیا اور رکشا اسٹارٹ ہو کر نیٹی جیٹی کی جانب روانہ ہو گیا۔

جامی گھر سے روانہ ہوتے وقت سندر اور فوزیہ کو سختی سے تاکید کر آیا تھا کہ اس دوران میں کوئی اسے کال نہیں کرے گا۔ جو بھی سچویشن ہوگی وہ خود انہیں آگاہ کرے گا۔ یہ احتیاط جامی نے اس لیے بھی اختیار کی تھی کہ وہ اپنے سیل فون کو بالکل فری رکھنا چاہتا تھا۔ اغوا کار کی کال کسی بھی وقت آ سکتی تھی اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ اغوا کار کو اس کا فون بزی ملے۔

وہ گھر سے نیٹی جیٹی پہنچنے تک مسلسل نومی کے بارے ہی میں سوچتا رہا تھا۔ نومی اس کی توجہ اور محبت کا مرکز تھا۔ اس کے اغوا نے ڈاکٹر جامی کو اندر باہر سے توڑ کر رکھ دیا تھا۔ یہ ساری مصیبت ڈاکٹر پر اس لیے آئی تھی کہ اس نے ڈاکٹر سکندر اور اس کی فیملی کو اس ملک سے فرار کروا کر...... اپنی دانست میں ایک نیک کام کیا تھا اور... عملِ صالح پر انسان کو بھی پچھتاوا نہیں ہوتا۔

نیٹی جیٹی کے پل پر پہنچ کر اس نے رکشے والے کو منہ مانگا کرایہ دے کر فارغ کر دیا اور پل کی ریلنگ کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔

اگلے ہی لمحے اس کے سیل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ نمبر اس مرتبہ بھی انجانا ہی تھا۔ اس نے فوراً کال ریسیو کر لی اور اضطراری لہجے میں کہا۔

''ہیلو... میں نیٹی جیٹی پہنچ گیا ہوں۔''

''مجھے بھی نظر آ رہا ہے کہ تم پہنچ گئے ہو۔'' اس شخص نے انکشاف انگیز لہجے میں کہا۔

جامی نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔ ''کیا تم کہیں میرے قریب ہی ہو؟''

''میں تمہارا سایہ بنا ہوا ہوں۔'' اغوا کار نے ڈرامائی انداز میں کہا۔ ''اور ہر لمحہ میری تم پر نظر ہے۔''

مرغی

''اے... کائی کو روتا رے؟''

''ٹیچر ماری میرے کو!''

''کائی کو ماری رے او پگلی؟''

''مائیں اوس کو مرغی بولا نا۔''

''کائی کو ایسے بولا رے کم بخت؟''

''او میرے کو ہر ایگزام میں انڈا دے رئی تھی... میں اوس کو اور کیا بولتا؟''

کورنگی سے محمد ارسلان کا احتجاج

''میں تمہاری مطلوبہ رقم لے آیا ہوں۔'' جامی نے کہا۔ ''اپنے پیسے لو اور میرا بیٹا میرے حوالے کرو۔''

''ٹرکوں کے اڈے کے ساتھ ہی ایک نشیبی راستہ اسٹیڈیم کی طرف آرہا ہے۔'' اس نے کہا۔ ''جہاں بہت سارے گودام بنے ہوئے ہیں۔''

''ہاں... میں نے یہ سارا علاقہ دیکھا ہوا ہے۔'' جامی نے کہا۔

''بس اسی راستے پر چلتے ہوئے اسٹیڈیم سے تھوڑا آگے نکل آؤ'' اغواکار نے ہدایات دیں۔ ''بس جب تم وہاں پہنچو گے تو تمہیں سامنے سے موٹر سائیکل پر دو افراد آتے نظر آئیں گے۔ ان دونوں نے ہیلمٹ پہن رکھے ہوں گے۔ وہ موٹر سائیکل تمہارے قریب رکے گی۔ پیچھے بیٹھا ہوا شخص ہیلمٹ اتار کر تم سے کہے گا۔ ''ڈاکٹر! میں بہت بیمار ہوں۔ آپ جو دوائیاں لائے ہیں وہ میرے حوالے کر دیں'' ... بس تم یہ دونوں رقم والے بیگز میرے اس بندے کے حوالے کر دینا۔''

''اور میرا بیٹا...؟'' جامی نے جذبات سے مغلوب آواز میں پوچھا۔

''میرے دونوں بندے وہ بیگ لے کر تمہاری نظروں سے اوجھل ہو جائیں گے۔'' اغواکار نے بتایا۔ ''زیادہ سے زیادہ وہ دس منٹ میں نوٹوں کی گنتی کر لیں گے۔ بس اس کے بعد تمہارا بیٹا تمہارے سپرد کر دیا جائے گا۔''

''تو کیا میں وہیں کھڑے ہو کر اپنے بیٹے کا انتظار کروں؟'' جامی نے پوچھا۔

''بالکل تمہیں دس منٹ تک ادھر ہی رکنا ہوگا۔'' اغواکار نے حتمی لہجے میں کہا۔ ''چلو، اب ٹارگٹ کی جانب بڑھنا شروع کرو...!''

جامی کے پاس اغواکار کی ہدایات پر عمل کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ گردن جھکا کر بوجھل قدموں کے ساتھ اس سمت چل پڑا جہاں اغواکار نے جانے کو کہا تھا۔

وہ اس علاقے میں پہلے بھی کئی مرتبہ آچکا تھا۔ کسی زمانے میں اس کا ایک دوست امپورٹ ایکسپورٹ کا کام کرتا تھا۔ اس کا گودام بھی اسٹیڈیم کے بالکل قریب ہی تھا۔ جامی کبھی کبھار اپنے اس بزنس مین دوست سے ملنے چلا آتا تھا۔ اب کافی عرصے سے ان کی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔

جامی جیسے ہی اسٹیڈیم سے آگے نکلا، سامنے سے دو ہیلمٹ بردار موٹر سائیکل سوار آتے دکھائی دیے پھر سب کچھ ویسا ہی ہوا جیسا اغواکار نے بیان کیا تھا۔

موٹر سائیکل جامی کے قریب آکر رکی۔ پیچھے بیٹھے ہوئے شخص نے ہیلمٹ اتارا اور ڈاکٹر کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''ڈاکٹر! میں بہت بیمار ہوں۔ آپ جو دوائیاں لائے ہیں وہ میرے حوالے کر دیں۔''

ڈاکٹر جامی نے بلاچون چرا وہ دونوں بیگز اس شخص کو تھما دیے۔ اس نے دوبارہ ہیلمٹ پہنا اور موٹر سائیکل حرکت میں آگئی پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ بائیک اس کی نگاہ سے اوجھل ہوگئی۔ جامی بت بنا وہیں کھڑا رہ گیا۔ وہ اس کے سوا اور کچھ کر بھی نہیں سکتا تھا۔

موٹر سائیکل سواروں کو گئے ایک یا دو منٹ ہوئے ہوں گے کہ جامی کے سیل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اسکرین پر اس کے گھر کا لینڈ لائن نمبر تھا۔ یقیناً یہ فون فوزیہ نے کیا ہوگا۔ اسے فوزیہ پر غصہ بھی آیا کہ جب وہ سختی سے منع کر کے آیا تھا کہ اسے فون نہیں کرنا تو فوزیہ ایسی کوشش کیوں کر رہی تھی۔

اس نے لائن کاٹ دی۔ اسے اغواکار کی کال کا انتظار تھا اور اس کے لیے فون کو فری رکھنا بہت ضروری تھا۔

اگلے ہی لمحے فوزیہ کی کال دوبارہ آنے لگی۔ اس نے جھنجلا کر لائن کاٹ دی۔ پھر سندر کے نمبر سے کال آنے لگی۔

اب جامی کو تشویش نے آگھیرا۔ وہ دونوں جس تواتر سے اسے کال کر رہے تھے اس کا مطلب یہی تھا کہ گھر میں کوئی گڑبڑ ہوگئی ہے۔

اس نے فوزیہ کو فون کرنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ اغواکار کی کال آگئی۔ جامی نے فوراً اس کی کال اٹینڈ کر لی اور اضطراری لہجے میں استفسار کیا۔

''میرا بیٹا کہاں ہے؟''

''کمال ہے...'' وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔ ''تمہارا بیٹا تم تک پہنچا نہیں۔''

''نن... نہیں...'' جامی کی آواز حلق میں اٹک گئی۔

''اپنے گھر فون کرو... فوراً'' اغواکار نے تیز لہجے میں کہا اور فون بند کر دیا۔

اسی لمحے گھر سے فوزیہ کی کال آنے لگی۔ اس مرتبہ اس نے فون اٹینڈ کر لیا اور خفگی آمیز لہجے میں بولا ''میں نے منع بھی کیا تھا کہ مجھے فون نہیں کرنا...''

''جامی! آپ اس وقت کہاں ہیں؟'' وہ اس کی سنی ان سنی کرتے ہوئے بولی۔

''میں نیٹی جیٹی کے پل پر کھڑا ہوں...''

''آپ فوراً گھر آجائیں۔'' فوزیہ کی آواز خوشی کے

جذبات سے مغلوب تھی۔ ''نومی گھر پہنچ گیا ہے۔۔۔!''

''کیا۔۔۔؟'' جامی کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔

''میں سچ کہہ رہی ہوں جامی۔'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی۔ ''ابھی چند منٹ پہلے ایک گاڑی اسے گھر کے دروازے پر اتار گئی ہے۔ اگر میری بات کا یقین نہیں آ رہا تو لیں۔۔۔ نومی سے بات کر لیں۔''

''ہیلو پاپا۔۔۔'' نومی کی مانوس آواز جامی کی سماعت سے ٹکرائی۔

''نومی۔۔۔ آپ ٹھیک ہونا؟'' بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

''جی پاپا۔ میں گھر آ گیا ہوں۔'' نومی نے بتایا۔ ''اب آپ بھی فوراً گھر پہنچ جائیں۔ ہم سب لوگ لنچ پر آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ آپ نے جیسے ہی گندے انکل کا مطالبہ پورا کیا، ان لوگوں نے مجھے چھوڑ دیا۔''

''میں آ رہا ہوں میری جان۔۔۔'' وہ بس اتنا ہی کہہ سکا۔

فرطِ جذبات سے اس کا برا حال تھا۔ اس نے ایک ٹیکسی پکڑی اور گھر کی جانب روانہ ہو گیا۔ واپسی کے سفر میں وہ مسلسل اپنے رب کا شکر ادا کر رہا تھا جس کی کرم نوازی سے اس کا لختِ جگر صحیح سلامت واپس آ گیا تھا۔ نومی کی واپسی کے سامنے اسے پچاس لاکھ کے جانے کا ذرا بھی ملال نہیں تھا۔

☆☆☆

اس واقعے کے لگ بھگ ایک ماہ بعد دو پولیس والے ڈاکٹر جامی کے گھر اس سے ملنے آئے۔ ان میں ایک سب انسپکٹر اور دوسرا انسپکٹر لیول کا پولیس اہلکار تھا۔ جامی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ پولیس والوں کی اس کے گھر میں آمد کا مقصد کیا تھا تاہم اس نے دونوں پولیس والوں کو عزت واحترام کے ساتھ ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ فوزیہ بھی وہیں موجود تھی۔

انسپکٹر نے جامی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ڈاکٹر صاحب! اگر میں چاہتا تو آپ دونوں میاں بیوی کو پوچھ تاچھ کے لیے تھانے بھی بلا سکتا تھا لیکن آپ اس معاشرے کے معزز شعبے سے تعلق رکھتے ہیں اس کا خیال کرتے ہوئے میں خود چل کر آپ کے گھر آ گیا ہوں۔''

''آپ کی بہت مہربانی ہے جناب۔'' جامی نے الجھن زدہ لہجے میں کہا۔ ''لیکن یہ سمجھ نہیں آیا کہ آپ کس سلسلے میں ہم سے پوچھ کچھ کرنا چاہتے ہیں۔۔۔!''

''نومی آپ ہی کا بیٹا ہے نا؟'' انسپکٹر نے پوچھا۔

''جی بالکل۔'' جامی نے جواب دیا۔

''کم وبیش ایک ماہ پہلے آپ کا بیٹا اغوا ہو گیا تھا۔۔۔'' انسپکٹر نے باری باری دونوں کے چہروں کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے سوال کیا۔

جامی نے اپنی بیوی کی طرف ایسی نظر سے دیکھا جیسے پوچھ رہا ہو کہ کیا جواب دوں۔۔۔!

جامی کے گریز کو دیکھتے ہوئے انسپکٹر نے کہا۔ ''ڈاکٹر صاحب! امید ہے، آپ مجھے سختی پر مجبور نہیں کریں گے۔ تعاون کرنے میں آپ ہی کا بھلا ہے ورنہ قانون کی نظر سے حقائق کو چھپا کر آپ کسی بہت بڑی مصیبت میں پھنس جائیں گے۔''

ڈاکٹر نے سچ بولنے کا فیصلہ کیا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''جی۔۔۔ یہ درست ہے کہ نومی کو ایک ماہ پہلے اغوا کر لیا گیا تھا۔''

''اور آپ نے اغوا کار کو پچاس لاکھ کا تاوان ادا کر کے اپنے بیٹے کو چھڑایا تھا۔'' انسپکٹر بدستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔ ''جس کے لیے آپ کو اپنی دونوں گاڑیاں فروخت کرنا پڑی تھیں؟''

''جی، آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' جامی ندامت آمیز لہجے میں بولا۔ ''بالکل ایسا ہی ہوا تھا۔''

''آپ نے اپنے بیٹے کے اغوا کے بارے میں پولیس کو کیوں نہیں بتایا؟'' انسپکٹر نے تیکھے لہجے میں کہا۔ ''آپ جیسے ایک معزز پیشہ شخص سے پولیس ڈپارٹمنٹ کو ایسی غیر ذمے داری کی توقع نہیں تھی۔''

''غلطی ہو گئی انسپکٹر صاحب۔ پریشانی میں کچھ سمجھ نہیں آیا تھا۔'' جامی نے کہا۔ ''لیکن یہ تو بتائیں کہ گڑے مُردے اکھاڑنے کی ضرورت کیوں پیش آ گئی؟''

''آپ ایک شریف النفس انسان ہیں ڈاکٹر صاحب اسی لیے آپ نے فوراً اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا۔'' انسپکٹر نے ستائشی نظر سے جامی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''جہاں تک گڑے مُردے اکھاڑنے کا معاملہ ہے تو اس سوال کا جواب میں آپ کو بعد میں دوں گا۔ پہلے دو باتیں میڈم سے ہو جائیں۔''

پھر انسپکٹر فوزیہ کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔ ''میڈم! آپ کا ایک بھائی ہے، سندر۔ کیا وہ اس وقت گھر میں ہے؟''

''نہیں انسپکٹر صاحب۔'' فوزیہ نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''سندر تو پاکستان سے باہر گیا ہوا ہے۔''

''پاکستان سے باہر کہاں؟'' انسپکٹر نے پوچھا۔

''دبئی''فوزیہ نے بتایا۔
''وہ کب گیا ہے دبئی؟''
''کوئی ایک ماہ پہلے۔''
''نومی کے اغوا سے پہلے یا بعد میں؟''
''بعد میں... جب نومی واپس آیا، اس کے ایک دو دن بعد۔''فوزیہ نے جواب دیا۔
''کیا دبئی میں سندر کی کوئی جاب ہے؟''انسپکٹر کی کرید جاری تھی۔
''نہیں... وہ کھیپ کا کام کرتا ہے۔''فوزیہ نے بتایا۔''وہ اکثر دبئی، سنگاپور اور بینکاک جاتا رہتا ہے۔''
''گڈ...!''انسپکٹر نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا پھر پوچھا۔''اس مرتبہ سندر دبئی کیا لینے گیا ہے؟''
''لیپ ٹاپس...''فوزیہ نے جواب دیا۔''ایک لیپ ٹاپ وہ نومی کے لیے بھی لائے گا۔''
''آخری مرتبہ آپ کی سندر سے کب بات ہوئی تھی؟''
''دس بارہ دن پہلے۔''فوزیہ نے کہا۔''لیکن آپ سندر کے بارے میں اتنی چھان بین کیوں کررہے ہیں۔ وہ خیریت سے تو ہے نا...؟''
''انسپکٹر صاحب! سندر کہیں اسمگلنگ کے چکر میں تو نہیں پکڑا گیا؟''جامی نے سر میں اٹھنے والے خدشے کو الفاظ کا روپ دے ڈالا۔
''اس بات کا فیصلہ آپ لوگوں کو خود ہی کرنا ہوگا۔''انسپکٹر نے ذومعنی انداز میں کہا۔''میرے پاس ایک منفرد قسم کی ریکارڈنگ ہے۔ میں وہ آپ کو سنا رہا ہوں۔''
پھر انسپکٹر نے سب انسپکٹر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
''میڈم کو وہ ساؤنڈ بائٹس سناؤ...''
سب انسپکٹر نے اپنے موبائل کے ساتھ تھوڑی چھیڑ چھاڑ کی پھر والیوم فل کر کے سیل فون سینٹر ٹیبل پر رکھ دیا۔ اگلے ہی لمحے اس سیل فون کے اسپیکر سے سندر کی شکستہ آواز ابھری۔
''آپا... میں نے ڈاکٹر سکندر کے بارے میں آپ کی اور دولھا بھائی کی گفتگو سن لی تھی۔ وہیں سے میرے ذہن میں ایک آئیڈیا آیا۔ میں جانتا ہوں دولھا بھائی مجھے پسند نہیں کرتے۔ وہ مجھ سے نفرت کرتے ہیں... میں نے انہیں سبق سکھانے کے لیے نومی کے اغوا کا منصوبہ بنالیا... ولی بھائی میرا بہت پرانا دوست ہے اور... جو رقم ولی بھائی نے دی، وہ سب نقلی نوٹ تھے۔ بس، گڈی کے اوپر اور نیچے ایک ایک اصلی نوٹ لگا ہوا تھا... آپا، اگر ہوسکے تو... مجھے معاف کردینا...''
''یہ جھوٹ ہے، بکواس ہے۔''فوزیہ غصے سے بولی۔''کسی نے میرے سندرویرا کو پھنسانے کی کوشش کی ہے۔''
''میڈم! آپ نے آواز پہچانی۔''انسپکٹر نے پوچھا۔''یہ سندر ہی کی آواز ہے نا؟''
''آواز تو اسی کی ہے مگر مجھے یقین ہے، یہ کسی نے اس کے خلاف گہری سازش کی ہے۔''وہ طیش کے عالم میں بولی۔''میرا سندرویرا ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ اس نے تو نومی کی رہائی کے لیے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا تھا۔''
''میڈم! آپ چاہے کچھ بھی کہیں لیکن قانون کی نظر میں کسی بھی مرنے والے کا آخری بیان بہت اہم ہوتا ہے۔''انسپکٹر نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔''کیونکہ زندگی کی آخری سانسوں میں کوئی بھی شخص جھوٹ نہیں بولتا...''
''تو کیا سندر مرچکا ہے...؟''ڈاکٹر جامی نے سرسراتی ہوئی آواز میں پوچھا۔
''ہائے میرا سندرویرا...''فوزیہ غش کھا کر گرگئی۔
جامی جلدی سے اسے سنبھالنے کے لیے آگے بڑھا۔ اسی وقت نومی بھی وہاں آگیا۔ ماں کی حالت دیکھ کر وہ رونے لگا۔ انسپکٹر کی آواز جامی کی سماعت میں زہر گھول رہی تھی۔
''دو روز پہلے پولیس نے ایک جرائم پیشہ گروہ کے خلاف کریک ڈاؤن کیا۔ اس گروہ کے افراد اغوا برائے تاوان، چوری ڈکیتی اور بھتا خوری میں ملوث تھے۔ زبردست مارا ماری کے بعد تین جرائم پیشہ افراد موقع پر ہی ہلاک ہوگئے ایک کو زندہ پکڑ لیا گیا جبکہ پانچویں کو شدید زخمی حال میں اسپتال لایا گیا۔ جہاں اس نے اپنا آخری بیان، اعترافِ جرم ریکارڈ کرایا۔ یہ شخص سندرویرا تھا۔ زندہ گرفتار ہونے والے شخص کا نام ولی بھائی معلوم ہوا۔ ولی بھائی سے حاصل ہونے والی معلومات کی روشنی میں انسپکٹر اس وقت ڈاکٹر جامی کے گھر میں بیٹھا ہوا تھا۔
فوزیہ کو سنبھالنے کے دوران میں ڈاکٹر جامی مسلسل خودکلامی کیے جارہا تھا۔''میں غلط نہیں تھا۔ سندر کے بارے میں میرا اندازہ بالکل درست تھا۔ کتے کی دم کو چاہے سو سال تک شیشے کی نلکی میں ڈال کر رکھیں۔ جب بھی باہر نکالیں، وہ ٹیڑھی ہی ملے گی...''

اندھے راستے

کاشف زبیر

تنہائی کی ٹیس اور مسرت کی آرزو کا دکھ جھیلتے جھیلتے ایک ایسا پڑاؤ آہی جاتا ہے جہاں ٹھہرنا لازمی قرار پا جاتا ہے... وہ بھی عذابِ تنہائی میں مبتلا تھی... برسوں سے تنہا زندگی کی رنگینیوں سے دور سنگین و پُراسرار حالات و واقعات سے نبرد آزما تھی... بظاہر خاموش مگر گہرے سکوت میں طوفانوں کی شدت پوشیدہ تھی... وقت کی لہروں نے شامی اور تیمور کو اس طوفان سے ٹکرادیا... سرورق کے جانے پہچانے کرداروں سے مرصّع کہانی کا اتار چڑھاؤ...

گزرے ہوئے کل کی بازگشت میں گم ایسے انسانوں کا ماجرا جو جذبوں کی زنجیر سے بندھے تھے...

فولاد خان شامی سے کہہ رہا تھا۔ ”صیب ام نے آپ کا خدمت کیا؟“

شامی اس جملے کا مطلب سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ”کیا... مگر سود پورا لیا۔“

”وو دوسرا بات اے۔“ فولاد خان نے سود کو درمیان سے نکالتے ہوئے کہا۔ ”اور آپ نے پسینا بہایا۔ اور ام نے خون بہایا۔“

”تمہارا مطلب ہے کہ تم نے میرے پسینے کی جگہ اپنا

خون بہایا تو مجھے اعتراف ہے۔"

"اے نا۔" فولاد خان خوش ہو کر بولا۔ "تو صیب اب امارا ساتھ دو۔"

موسم شدید سرد تھا اور شامی کے خیال میں صرف برف باری کی کسر باقی رہ گئی تھی۔ دفتر سے آج کل وہ سیدھا واپس وقار ولا آتا تھا اور ہیٹر آن کر کے کمبل میں گھس کر ڈرائی فروٹ سے شغل کرتا اور ٹی وی سے دل بہلاتا تھا۔ تیمور کو نواب صاحب نے ایک کام سے لاہور بھیجا ہوا تھا۔ وہاں موسم نسبتاً بہتر تھا اور تیمور کو اپنے کچھ یونیورسٹی کولیگز بھی مل گئے تھے جن میں زیادہ تعداد صنفِ نازک کی تھی اس لیے اس کی واپسی میں تاخیر ہو رہی تھی۔ جوجی کے پیپرز قریب تھے۔ وہ پڑھنے میں مصروف تھا۔ نوشی حسبِ معمول خفا تھی اس لیے شامی یہاں اکیلا بور ہو رہا تھا۔ اس اتوار کی صبح اچانک ہی سورج خوب چمک کر نکلا اور تیز دھوپ کھڑکی کے ہٹے پردے سے گزر کر شامی کے منہ پر پڑی تو وہ خود کو باہر نکلنے سے باز نہ رکھ سکا۔ باہر فولاد خان گیٹ کے سامنے کرسی ڈالے اس دھوپ سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ شامی نوشی کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ اسے ہی منا لے۔ ٹہلتے ہوئے وہ فولاد خان کے پاس پہنچا تو اس نے شامی کو پکڑ لیا۔ ابتدا یوں ہوئی۔

"شامی صیب ام کئی دن سے سوچ را اے کہ آپ سے بات کرے۔"

"میں تمہارے تمام قرضے مع سود کے اتار چکا ہوں۔"

مگر فولاد خان قرض اور سود کی بات نہیں کر رہا تھا حالانکہ وہ اس کے سوا کوئی بات نہیں کرتا تھا جب تک مجبور نہ ہو جائے۔ جب اس نے ساتھ دینے کی بات کی تو شامی نے بادلِ ناخواستہ پوچھا۔ "کس معاملے میں؟"

اس پر فولاد خان یوں شرمایا کہ قندھاری انار بن گیا اور اس نے پچاس سال پہلے کی لڑکیوں کو مات دیتے ہوئے بہ مشکل شامی کو بتایا۔ "ام کو محوبت او گئی اے۔"

شامی حیران نہیں ہوا تھا کیونکہ آج کل کسی کو محبت نہ ہو تو حیرت کی بات ہوتی ہے۔ موبائل، انٹرنیٹ اور روشن خیالی نے اس کارِ خیر کو اتنا آسان کر دیا ہے کہ یہ پہلے بھی اتنا آسان نہیں تھا۔ شامی کو یاد تھا اس نے پہلا عشق نواب خاندان سے تعلق رکھتے ہوئے بھی بڑی مشکل سے کیا تھا اور معاملہ جیسے ہی نواب صاحب کے علم میں آیا وہیں اس نوخیز عشق کا دی اینڈ آ گیا تھا۔ اس کے بعد حالات اور ماحول ایسے بدلے کہ شامی بھی دنگ رہ گیا۔ بہرحال حیرت کا یہ دور گزر چکا تھا اور نئی نسل کی حرکتوں پر شامی کو غصہ نہیں آتا تھا۔ صرف افسوس ہوتا تھا کیونکہ وہ نئی نسل سے تقریباً خارج ہو چکا تھا۔ البتہ اسے فولاد خان کے شرمانے پر غصہ آیا تھا۔ اس نے کہا۔ "یار تم محبت کر رہے ہو یا کوئی شرم ناک کام جو اتنا شرما رہے ہو؟"

"ابا صیب فرماتے بندوق کے بعد حیا آدمی کا زیور اے۔"

فولاد خان ایک خالص مردانہ معاشرے سے تعلق رکھتا تھا اور اس کی بات سے لگ رہا تھا کہ وہاں عورتوں کا یہ زیور بھی مردوں کے لیے مخصوص کر دیا گیا تھا۔ شامی نے ٹھنڈی سانس لے کر تصحیح کرنا چاہی مگر پھر ارادہ ملتوی کر دیا۔ کیونکہ ناشتے کا وقت بھی قریب تھا۔ اس نے ٹو دی پوائنٹ بات کی۔ "کس سے محبت ہوئی ہے؟"

"گل نار سے۔" فولاد خان پھر شرما گیا مگر جب شامی نے اسے گھورا تو جلدی سے خود پر قابو پانے لگا۔

"یہ گل نار کہاں ہوتی ہے اور تمہیں محبت کیسے ہوئی؟"

"ادر پیچھے زوار صیب کا بنگلا اے۔ گل نار اُدر اوتا اے۔"

شامی نے سر ہلایا۔ "نام سے تو لگ رہا ہے کہ تمہاری ہم قوم ہے۔ عمر کیا ہے دیکھنے میں کیسی لگتی ہے؟"

فولاد خان نے نہایت اشتیاق سے اپنا موبائل فون نکالا جس میں کیمرا بھی تھا۔ "عمر بیس اور تیس کے بیچ اے۔ ام نے فوٹو لیا اے۔"

فولاد خان کے موبائل کے کیمرے کا رزلٹ جتنا خراب تھا موبائل کی اسکرین اس سے زیادہ خراب تھی اس لیے شامی کو جو تصویر نظر آ رہی تھی، وہ کسی ہارر مووی کے خوفناک زنانہ کردار سے ملتی ہوئی لگ رہی تھی۔ شامی نے کئی زاویوں سے دیکھا مگر نقوش سمجھ میں نہیں آئے۔ اس کی محویت دیکھ کر فولاد خان مشکوک ہو گیا۔ "شامی صیب دیک لیا؟"

شامی نے موبائل واپس اسے تھما دیا۔ "نہیں یار مجھے تو سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔ بہرحال تم نے پسند کیا ہے تو لڑکی اچھی ہو گی۔ زوار صاحب کی کوٹھی میں کیا کرتی ہے؟"

"ادر کام کرتی اے۔"

زوار صاحب کی نواب صاحب سے اچھی سلام دعا تھی۔ وہ سات سال پہلے دنیا سے گزر گئے تھے اور اب ایک صاحبِ فراش بیوہ تھی جس کی دیکھ بھال نوکر کرتے

تھے۔ ایک بیٹا تھا جو دس سال سے بیرونِ ملک تھا اور اسے باپ کے جنازے پر آنے کی توفیق بھی نہیں ہوئی تھی۔ زوار صاحب بہت کچھ چھوڑ کر گئے تھے۔ اس لیے ان کی بیوہ کو مالی مسئلہ نہیں تھا۔ بیوہ کی عمر زیادہ نہیں تھی مگر زوار صاحب کے بعد انہیں بیماریوں نے گھیر لیا تھا۔ شامی نے کہا۔ ''کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ دادا جان زوار صاحب کی بیوہ سے بات کریں گے اگر لڑکی والوں کی طرف سے مسئلہ نہیں ہوا تو تمہاری محبت، شادی میں بدل جائے گی۔''

''مسئلہ اے۔'' فولاد خان نے کراہ کر کہا۔ ''لڑکی کے گھر والے کا مسئلہ اے۔''

شامی دم بہ خود رہ گیا۔ جب اس نے رات تیمور سے فون پر بات کرتے ہوئے اسے بتایا تو وہ بھی دنگ رہ گیا۔

''تمہارا مطلب ہے کہ فولاد خان کو جس لڑکی سے محبت ہوئی ہے، وہ پہلے سے ایک عدد شوہر رکھتی ہے۔''

''بالکل اور تکنیکی طور پر وہ لڑکی نہیں بلکہ عورت ہے۔''

''تب فولاد خان نے کیا سوچ کر اس سے محبت کی ہے؟''

''میں نے بھی یہی پوچھا تھا تو اس نے مشہور زمانہ مقولہ دے مارا کہ محوبت کیا نئیں جاتا او جاتا اے۔'' شامی نے فولاد خان کے لہجے اور انداز میں کہا۔

''مگر اب ایسا بھی کیا آدمی کچھ نہ کچھ دیکھ کر تو محبت کرتا ہے۔'' تیمور نے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ ''ورنہ عورت تو ستر سال کی بھی ہو سکتی ہے اور شکل و صورت کے لحاظ سے گوریلا فیملی جیسی بھی ہو سکتی ہے۔ آخر ان سے کسی کو محبت کیوں نہیں ہوتی۔''

''یار تو بلا وجہ کی بحث کر رہا ہے آج کل محبت کے ہر دوسرے کیس میں کوئی ایک فریق نکاح شدہ ہوتا ہے۔''

''مگر فولاد خان...''

''وہ بھی آج کے دور کا انسان ہے۔''

''بے شک مگر وہ یہ نہ بھولے کہ وہ دادا جان کی ملازمت میں ہے۔ اگر انہیں فولاد خان کی محبت کی بھنک بھی پڑ گئی تو اس کی ملازمت جاتی رہے گی۔''

''خیر اب ایسا بھی نہیں ہے، دادا جان فولاد خان جیسے آدمی کو صرف اس لیے نہیں گنوا سکتے۔'' شامی نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''ہاں یہ بات تو ہم دونوں کے لیے کہہ سکتا ہے۔ اگر ہم نے ایسی حرکت کی تو شاید عاق کر دیے جائیں۔''

''ظاہر ہے ہم پوتے ہیں۔'' تیمور نے جوابی سرد آہ بھری۔ ''تو نے مزید تفتیش کی کہ خاتون دیکھنے میں اور چال چلن میں کیسی ہیں؟''

''تو کیوں مجھے ایک غیرت مند پٹھان کے ہاتھوں مروانا چاہتا ہے۔ میں تو موبائل پر اس کی تصویر دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا تو فولاد خان کے تیور خطرناک ہو گئے تھے۔''

''اگر دوسری طرف بھی کوئی پٹھان ہوا تو معاملہ خراب ہو جائے گا۔''

صبح شامی کی بھوک اس چہل قدمی سے کھل گئی تھی جو اس نے فولاد خان کی داستانِ محبت سنتے ہوئے کی تھی اس لیے وہ زیادہ تفتیش نہیں کر سکا اور ناشتے کے لیے روانہ ہو گیا۔ اس کے بعد نواب صاحب نے اسے چند کام پکڑا دیے اور سارا دن ان میں گزر گیا۔ سورج غروب ہونے کے بعد وہ باہر نکلنے کی ہمت نہیں کر سکا تھا اور اس نے ڈنر بھی بستر پر ہی کیا تھا۔ ڈسکوری چینل سے اس کا پسندیدہ پروگرام آنے والا تھا اس لیے اس نے تیمور سے پہلے بات کر لینا مناسب سمجھا۔ تیمور سے بات سے پہلے وہ فولاد خان کی بات کو نارمل لے رہا تھا مگر جب تیمور نے یہ نقطہ اٹھایا تو اس نے سوچا کہ اسے فولاد خان سے مزید پوچھ گچھ کر لینی چاہیے کیونکہ بات وقار ولا کی عزت کی تھی کوئی بات نکلتی تو ان کا نام بھی سامنے آتا اور نواب صاحب آج کل اس موڈ میں نہیں تھے کہ کوئی بات آسانی سے برداشت کر سکیں۔ بے شک محبت فولاد خان نے کی تھی مگر شامت ان ہی کی آنی تھی۔

اگلے دن سورج نہیں نکلا تھا مگر اسے دفتر جانے کے لیے بستر سے نکلنا پڑا۔ دو بجے وہ لنچ کے لیے اٹھا تو اس کے بعد دوبارہ دفتر نہیں گیا اور گھر کا رخ کیا۔ سورج اور گیس کی عدم موجودگی میں فولاد خان چوکی میں انگیٹھی جلائے بیٹھا تھا اور اس کے انگاروں کو یوں حسرت سے دیکھ رہا تھا جیسے وہ اس کے ارمانوں کی چتا ہو۔ شامی سوچے بغیر نہیں رہ سکا کہ جس محبت کا آغاز اتنا حسرت ناک ہو، اس کا انجام کتنا المناک ہوگا۔ فولاد خان اسے دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔ گیٹ اسی نے کھولا تھا اور اس کا خیال تھا کہ شامی واپس نہیں آئے گا اس لیے گیٹ بند کر کے وہ دوبارہ کوٹھری میں چلا گیا۔

''شامی صیب ام کو بلا لیا ہوتا۔''

''نہیں یار بات لمبی ہے اس لیے میں خود آ گیا۔'' شامی انگیٹھی کے سامنے کرسی پر براجمان ہو گیا۔ ''مجھے تم سے کچھ سوالات کرنے ہیں۔''

''گل نار کے بارے میں؟''

"ظاہر ہے تمہیں جس سے محبت ہوئی ہے اسی کے بارے میں پوچھوں گا۔" شامی نے کہا۔ "پہلا سوال یہ ہے کہ تمہاری گل نار سے ملاقات ہوئی ہے؟"

"بالکل شامی صیب، ورنہ محوبت کیسے اوتی؟"

"دوسرا سوال... گل نار بھی تم سے محبت کرتی ہے؟"

"بالکل شامی صیب، ورنہ ام اس کا محوبت میں پاگل کیوں اوتا؟"

"تم اس سے شادی کرنا چاہتے ہو؟"

"ام نکاح فرمانا چاتا اے۔"

"اس کا شوہر موجود ہے۔"

"گل نار اس سے طلاق لے گا اگر اس نے شرافت سے نہیں دیا تو امارے پاس اور طریقا بی اے۔" فولاد خان نے کن انکھیوں سے اپنی شاٹ گن کی طرف دیکھا۔

"اس کا شوہر بھی پٹھان ہے؟"

"نہیں اور کا رہنے والا اے۔" فولاد خان نے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔ "اس نے گل نار کو اس کا باپ سے خریدا اے۔"

فولاد خان کے توسط سے شامی بہت سے رسم و رواج سے واقف ہو گیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ جو لوگ اس طرح لڑکی بیچتے ہیں، وہ اس کے ذمّے دار بھی ہوتے ہیں کہ لڑکی اپنے شوہر کو چھوڑ کر کہیں نہ جائے۔ اگر لڑکی شوہر کو چھوڑ دے یا بھاگ جائے تو وہ اپنی رقم کی واپسی کا مطالبہ کر سکتا تھا۔ یعنی پھر جھگڑا دور تک جاتا۔ شامی نے کہا۔ "یہ تو بڑی خرابی والی صورت حال ہے۔"

"تب ای تو ام مایوس اے۔" فولاد خان نے دکھی لہجے میں کہا۔ "پر ام کیا کرے ام کو محوبت اوگیا اے۔ شامی صیب اماری مدد کرو۔ ام گل نار کے باگیر نہیں رے سکتا اے۔ ام خودکشی فرمالے گا۔"

"اگرچہ خودکشی حرام ہے مگر شادی کے مقابلے میں کم تکلیف دہ بھی ہوتی ہے۔"

فولاد خان خفا ہو گیا۔ "شامی صیب آپ امارا مدد کے باجائے خودکشی کا مشورا دیتا اے۔"

"ذرا سوچو کہ گل نار کے شوہر کو پتا چل گیا کہ اس کی بیوی کسی سے عشق کرنے لگی ہے تو وہ پہلے اس سے نمٹے گا پھر تمہاری باری آئے گی۔ اس کے بعد بات پولیس تک نہ بھی گئی تو دادا جان تک ضرور جائے گی۔ تم سمجھ سکتے ہو کہ ان تک جانے کی صورت میں کیا ہو سکتا ہے۔"

"شامی صیب تب ای ام نے آپ سے بولا۔ آپ کو اپنی خدمت کا واسطہ دیا۔ نواب صیب سے نہیں بول سکتا۔"

"لیکن بات تو دادا جان تک جائے گی نا۔"

"اسی واسطے آپ سے بولا اے۔" فولاد خان نے ہاتھ جوڑ دیے۔ "اللہ کے واسطے امارے لیے کچھ کرو۔"

فولاد خان کے تاثرات، اس کے جڑے ہاتھوں اور رقت آمیز لہجے نے شامی کا دل پسیج دیا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ "ٹھیک ہے میں سوچوں گا لیکن پہلے تم شروع سے لے کر اب تک ہونے والی ایک ایک بات تفصیل سے بتاؤ گے۔"

☆☆☆

فولاد خان نے گل نار کو پہلی بار اس وقت دیکھا جب وہ عین سڑک کے درمیان بکھرا ہوا اپنا سبزیوں و پھلوں کا ٹوکرا سمیٹ رہی تھی۔ یہ ٹوکرا یقیناً حادثاتی طور پر بکھر گیا تھا۔ فولاد خان نواب صاحب کی مرسڈیز کی سروس کرا کے واپس آ رہا تھا۔ اس نے سبزیوں اور پھلوں کے درمیان بیٹھی گل نار کو دیکھا تو دیکھتا رہ گیا۔ وہ خود بڑی سی گلاب کی کلی لگ رہی تھی۔ فولاد خان کار سے نیچے اتر آیا۔ اس نے بغیر کہے گل نار کی مدد شروع کر دی اور اس کی تمام سبزیاں اور پھلوں کو سمیٹ کر ٹوکرے میں ڈالا تو وہ اتنا بھر گیا کہ اٹھانے کی صورت میں سڑک دوبارہ سبزی منڈی کی صورت اختیار کر جاتی۔ اگر فولاد خان گل نار کے بارے میں نہ سوچ رہا ہوتا تو وہ یہ ضرور سوچتا کہ اتنا وزنی ٹوکرا گل نار نے اٹھایا کیسے؟ فولاد خان نے اسے پیشکش کی۔ "ام چوڑ آتا اے توم کدر رہتا اے۔"

"اور بنگلا سی پانچ تین میں۔" گل نار نے اس کے لہجے میں جواب دیا تو فولاد خان کے دل کی کلی مزید کھل اٹھی۔ اس نے خوش ہو کر اپنی زبان میں بات کی اور پشتو کے دریا بہا دیے اور گل نار نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیے۔ ذرا سی دیر میں اس نے اپنے بارے میں سب بتا دیا۔ مطلب کہ کس علاقے کے کس قبیلے کی کس شاخ سے ہے۔ مزید یہ کس باغ کا پھول ہے۔ البتہ قادر بخش کے بارے میں اس نے سب سے آخر میں بتایا تھا۔ اس وقت تک فولاد خان اسے لڑکی سمجھ رہا تھا۔ وہ تھی بھی چھریرے سے جسم کی اور صورت سے لڑکی نظر آنے والی۔ نقوش تیکھے اور رنگت سرخ تھی۔ آنکھوں اور بالوں کا رنگ گہرا تھا...... فولاد خان نے کوٹھی نمبری تریپن کے سامنے مرسڈیز روکی اور اتر کر ڈکی کھولی جس میں سبزیوں اور پھلوں کا ٹوکرا تھا۔

تب تک گل نار اندر سے تلوار نما مونچھوں والے ایک

شخص کو بلالائی۔ فولاد خان سمجھا کہ وہ کوٹھی کا ملازم ہے۔ وہ سرخی مائل رنگت اور کرخت نقوش والا شخص تھا۔ بے ترتیب بال اس کے گالوں تک آرہے تھے۔ مجموعی طور پر وہ اچھا آدمی نہیں لگتا تھا۔ ٹوکرا تھمانے پر وہ اسے ناپسندیدہ نظروں سے گھورتا ہوا ٹوکرے سمیت اندر چلا گیا۔ فولاد خان نے گل نار سے اس کے رویّے کی شکایت کی تو اس نے سادگی سے کہا۔ ''قادر بخش ایسا ای آدمی اے۔''

''اور نوکر اے؟''

''ہاں اور امارا شوہر اے۔''

فولاد خان پر یہ تعارف بجلی بن کر گرا تھا۔ ''تو مارا شوہر اے؟''

گل نار نے سرد آہ بھری۔ ''ہاں امارا قسمت، امارا باپ نے اس کو بیچ دیا۔ یہ ام کو نکاح کرا کر اور لے آیا۔''

یہ محسوس کر کے فولاد خان کا صدمہ ذرا کم ہوا تھا کہ گل نار کے لہجے میں قادر بخش کے لیے ناپسندیدگی تھی۔ اس نے گیٹ کی طرف دیکھا جہاں قادر بخش گیا تھا اور آہستہ سے بولا۔ ''توم اس کے سات خوش نہیں اے؟''

''کون عورت اپنا خوشی سے بکتا اے اور خرید نے والے کے سات خوش رہتا اے؟'' گل نار نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''بس امارا قسمت، اب ام کیا کرے۔''

''توم کر سکتا اے۔'' فولاد خان نے آواز مزید دھیمی کر لی۔ ''اسے چھوڑ دو۔''

گل نار نے سرد آہ بھری۔ ''نہیں چھوڑ سکتا، اگر ایسا کیا تو یہ امارا باپ سے اپنا پیسہ مانگے گا۔ امارا باپ پیسہ نہیں دے گا۔ قادر بخش اچھا آدمی نہیں اے۔''

''تو مارے سات کیسا اے؟''

''بس ٹھیک اے۔'' گل نار نے بے دلی سے جواب دیا۔ ''اب توم جاؤ ام زیادہ دیر بات نہیں کر سکتا۔''

فولاد خان بھی سمجھ رہا تھا۔ قادر بخش کو اعتراض ہو سکتا تھا کہ اس کی بیوی اتنی دیر سے کیا بات کر رہی ہے۔ فولاد خان وہاں سے روانہ ہوا تو گل نار اس کے دل و دماغ میں بس چکی تھی۔ اس سے دوسری ملاقات نہایت سنسنی خیز انداز اور ماحول میں ہوئی تھی۔ یہ ایک ہفتے پہلے کی بات تھی۔ رات کا وقت تھا اور بارش جاری تھی جس نے ماحول کو مزید سرد کر دیا تھا۔ فولاد خان گیٹ کی چوکی کا دروازہ بند کیے بیٹھا تھا کہ اسے گیٹ بجانے کی آواز آئی۔ اس کی چوکی میں بھی ایک چھوٹی کھڑکی تھی جس سے وہ باہر دیکھ سکتا تھا، اس نے کھڑکی کھول کر پوچھا۔ ''کون اے؟''

''ام... گل نار... گیٹ کھولو ام مشکل میں اے۔''

گل نار کی آواز سنتے ہی فولاد خان سردی اور بارش کی پروا کیے بغیر باہر نکلا اور گیٹ کا چھوٹا دروازہ کھول دیا۔ پانی میں شرابور گل نار تیزی سے اندر آئی۔ فولاد خان اسے چوکی میں لے آیا۔ سردی اور بھیگنے سے گل نار کی حالت بری تھی۔ اس نے اندر آ کر اپنی چادر اتار کر نچوڑی تو فولاد خان نظریں چرانے پر مجبور ہو گیا کیونکہ گل نار کا خاصا موٹا لباس بھی بھیگ کر اس کے بدن سے چپک گیا تھا۔ پھر اسے خیال آیا اور اس نے انگیٹھی میں مزید کوئلے ڈالے اور گل نار کو اس کے پاس بیٹھنے کو کہا۔ اس نے اپنا موٹا دیسی کمبل بھی اسے دے دیا تھا۔ گل نار کے لیے گیلا لباس بدلنا ممکن نہیں تھا اول تو وہاں فولاد خان کے پاس کوئی لباس نہیں تھا اور دوسرے اس کوٹھری میں کوئی ایسی جگہ نہیں تھی جہاں دوسرے کی نظروں میں آئے بغیر لباس تبدیل کیا جا سکتا۔ بہرحال گرم انگیٹھی، کمبل اور پھر فولاد خان کے تیار کیے خاص قہوے نے گل نار کو اس قابل بنایا کہ وہ فولاد خان کو خود پر آنے والی مشکل کے بارے میں بتا سکتی۔

گل نار کا کہنا تھا کہ قادر بخش نشہ کرتا ہے اور نشے کی حالت میں اس پر تشدد بھی کرتا ہے۔ گل نار نے فولاد خان کو اپنے بدن پر تشدد کے نشانات دکھانے کی پیشکش کی تھی جو اس نے بادل ناخواستہ مسترد کر دی۔ شام کو اس نے یہی بتایا تھا۔ گل نار نے بتایا کہ آج قادر بخش نے پھر اتنی پی کہ نشے میں دھت ہو گیا اور وہ گل نار سے فولاد خان کے بارے میں بات کرنے لگا۔ کچھ ہی دیر میں گفتگو اخلاق کے دائرے سے نکل گئی اور قادر بخش نے گل نار پر الزام لگایا کہ اس کے فولاد خان سے ناجائز تعلقات ہیں۔ وہ اتنا مشتعل ہوا کہ اسے مار ڈالنے پر تل گیا۔ اس نے اپنے پاس موجود خنجر نکال لیا تھا۔ گل نار بدحواس ہو کر بھاگی اور کوٹھی سے ہی نکل گئی۔ باہر شدید سردی اور بارش تھی اور اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کہاں جائے؟ تب اس کے قدم خود بخود وقار ولا کی طرف اٹھنے لگے اور وہ یہاں آگئی۔

گل نار بتاتے ہوئے سسکیوں کے ساتھ رو رہی تھی اور فولاد خان کا قبائلی خون کھول رہا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اسی وقت جا کر قادر بخش کے جسم پر لاتعداد سوراخ کر دے۔ جب اس نے گل نار سے کہا اور جانے لگا تو اس نے منت سماجت کر کے اور فولاد خان سے لپٹ کر اسے روک لیا۔ جیسے ہی بارش تھمی تو فولاد خان اسے چھوڑنے کوٹھی تک گیا اور اس وقت تک وہاں موجود رہا جب تک گل نار نے اندر

سے آکر اسے بتا نہیں دیا کہ اب حالات ٹھیک ہیں۔ قادر بخش نشے میں دھت ہو کر سو رہا ہے۔ تب فولاد خان کو اطمینان ہوا اور وہ واپس آیا تھا مگر اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ گل نار کو قادر بخش کے چنگل سے نکال کر رہے گا۔ رُوداد کے آخر میں اس نے شامی سے کہا۔ ''اب ام کو اپنا ملازمت کا پروا ہی نہیں اے اگر ام کو نواب صیب اور آپ سب سے جدائی اختیار کرنا پڑے تو ام کرے گا۔''

☆☆☆

تیمور بادلِ ناخواستہ واپس آیا تھا اور ائر پورٹ سے ولا آتے ہوئے اس کا موڈ خراب تھا۔ شامی دفتر سے اسے لینے پہنچا تھا۔ اس نے راستے میں اسے فولاد خان کی رُوداد مزید تفصیل اور نمک مرچ کے ساتھ سنائی تو اس نے خفگی سے کہا۔ ''یہ باتیں تو مجھے فون پر بھی بتا سکتا تھا۔ اس کے لیے دادا جان کو یاد دلانا ضروری نہیں تھا کہ میں خاصے دنوں سے لاہور میں ہوں۔''

شامی نے ہمدردی سے اسے دیکھا۔ ''لگتا ہے تیری کہیں سیٹنگ ہو گئی تھی۔''

''تجھے صبا یاد ہے؟''

''وہ بادِ صبا۔'' شامی نے یاد کیا۔ ''مگر یار وہ خاص نہیں تھی۔''

''اب ہو گئی ہے۔'' تیمور بولا۔ ''اس کی شادی ہو گئی ہے اور اس کا شوہر انگلینڈ گیا ہوا ہے۔ اسی نے مجھے زیادہ کمپنی دی۔''

''تو فولاد خان کو کہہ رہا تھا اور خود شادی شدہ کے ساتھ چہلیں کرتا پھر رہا تھا۔'' شامی نے ملامت سے کہا۔

''یار چہلیں ہی کر رہا تھا... میں کون سا اسے بیوہ کر کے اس سے شادی کرنے کا ارادہ کر رہا تھا۔'' تیمور نے کہا۔ ''تو جانتا ہے میں حد سے تجاوز کرنے والا آدمی نہیں ہوں۔''

''چل اب تو آ گیا ہے اس لیے فولاد خان کے مسئلے پر توجہ دے۔''

''وہ کس خوشی میں؟''

''یار ہم ساری دنیا کے پھڈوں میں ٹانگ اڑاتے پھرتے ہیں۔ فولاد خان ہمارا ملازم ہے اور کتنے مواقع پر وہ اپنی بساط سے بڑھ کر مدد کرتا رہا ہے۔'' شامی نے پھر ملامت سے کہا۔ ''اسے پہلی بار کام پڑا ہے تو ہم آنکھیں ماتھے پر رکھ لیں۔''

تیمور خاموش ہو گیا۔ وہ غور کر رہا تھا پھر اس نے کہا۔

''یار یہ مسئلہ آسان نہیں ہے۔ اول قادر بخش کوئی شریف آدمی نہیں ہے اس لیے وہ شرافت سے اپنی بیوی کو نہیں چھوڑے گا۔ دوسرے اگر اس نے گل نار کے باپ یا اس کے قبیلے کو ملوث کر لیا تو صورت حال سنگین ہو جائے گی۔ بات دادا حضور تک پہنچی تو وہ اسے ہرگز پسند نہیں فرمائیں گے۔ ان کا سارا عتاب ہم پر نازل ہو گا۔''

''یہ تو میں بھی جانتا ہوں۔'' شامی نے کہا۔ ''لیکن ہر مسئلے کا ایک حل ہوتا ہے اور اسے تلاش کرنا پڑتا ہے۔''

''اس کے لیے بھاگ دوڑ کرنا ہو گی۔''

''موسم بھاگ دوڑ کے لحاظ سے بہت اچھا ہے۔'' شامی نے ترغیب دی۔ اسی اثنا میں ولا آ گیا اور تیمور اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اس کی فلائٹ صبح چھ بجے کی تھی مگر موسم کی وجہ سے تاخیر کا شکار ہوتی رہی تھی اور وہ دوپہر دو بجے اسلام آباد پہنچا تھا۔ لنچ کے بعد وہ جو سویا تو ڈنر کے وقت جاگا تھا۔ ڈنر کی میز پر وہ نواب صاحب کو کام کی رپورٹ دیتا رہا۔ اچانک انہوں نے شامی سے کہا۔ ''کیا بات ہے برخوردار آج کل تم فولاد خان کے پاس زیادہ ہی پائے جا رہے ہو؟''

شامی کا دم خشک ہوا کہ شاید نواب صاحب کو اطلاع پہنچ گئی ہے، اس نے جلدی سے کہا۔ ''دادا جان فارغ ہوتا ہوں تو فولاد خان سے گپ شپ کر لیتا ہوں اس سے محلے اور علاقے کی تمام خبریں مل جاتی ہیں۔''

''یہ تو اچھی بات ہے۔'' نواب صاحب نے نیپکن سے منہ صاف کیا۔ ''آدمی کو اپنے آس پاس سے باخبر رہنا چاہیے۔ کوئی تازہ خبر ہے؟''

''نہیں دادا جان کوئی خاص نہیں ہے۔''

نواب صاحب نے مزید کچھ نہیں فرمایا تو شامی کی جان میں جان آئی۔ ڈنر کے بعد وہ تیمور کے سر پر سوار رہا کیونکہ وہ جمائیاں لے رہا تھا اور اس کا ارادہ پھر سے خوابِ خرگوش کے مزے لینے کا تھا۔ جب شامی اس کے بیڈ روم تک پہنچ گیا تو اس نے فریاد کی۔ ''یار لاہور میں سونے کا موقع کم ملتا تھا یہاں تو سونے دے۔''

''رات میں تو کیا کرتا تھا؟'' شامی نے مشکوک لہجے میں پوچھا۔ ''اور فکر مت کر میں زیادہ وقت نہیں لوں گا۔''

''دن میں دادا جان کے کام میں مصروف رہتا تھا اور رات میں دوستوں کے ساتھ ہوتا تھا۔ ایک دو بجے تک باہر ہی رہتے تھے۔ رات مشکل سے چار پانچ گھنٹے سونے کا موقع ملتا تھا۔ صبح آٹھ بجے پھر اٹھ جانا ہوتا تھا۔''

"چل یہاں سو لینا لیکن پہلے فولاد خان کے مسئلے کے بارے میں فیصلہ کر لے۔"

"فیصلہ کیا کرنا ہے۔" تیمور نے ٹھنڈی سانس لی۔ "جب تو اوکھلی میں سر دے گا تو مجھے بھی دینا ہی پڑے گا۔"

"اور وہ جو دادا جان کا ڈر ہے تو دادا جان تو ہوں گے۔" شامی نے خوش ہو کر کہا۔ اس نے کچن میں کال کر کے کافی کا کہا۔ "جہاں تک میرے علم میں ہے زوار صاحب کی بیوہ نے ان کے بعد بنگلے کے بیشتر ملازموں کو فارغ کر دیا تھا۔ وہاں سات آٹھ کے بجائے دو یا تین افراد باقی رہ گئے تھے۔"

تیمور نے سر ہلایا۔ "تو نے ٹھیک کہا، انہوں نے آس پاس سے میل ملاقات بھی چھوڑ دی۔ کسی تقریب میں بھی نہیں جاتیں۔"

شامی چونکا۔ "تجھے کیسے پتا چلا؟"

"تو بھول رہا ہے زوار صاحب کے بنگلے کے برابر والے بنگلے میں نازیہ رہتی ہے۔"

نازیہ بھی تیمور کی گرل فرینڈ رہی تھی۔ اب گرل فرینڈ نہیں تھی صرف فرینڈ رہ گئی تھی۔ تیمور کی عادت تھی جب وہ کسی لڑکی کو اپنی گرل فرینڈ کی لسٹ سے خارج کرتا تھا تب بھی اس سے رابطہ رکھتا تھا۔ یہ چیز کئی مواقع پر بہت کام آتی تھی۔ نازیہ کا سن کر شامی اچھل پڑا۔ "یاد آ گیا اور وہ بہت ہی جاسوس قسم کی لڑکی تھی۔ اس سے زوار صاحب کی بیوہ کے متعلق بہت کچھ معلوم ہو سکتا ہے۔"

"اس مسئلے میں زوار صاحب کی بیوہ کہاں سے آ گئیں؟"

"یار بنگلا اُن کا ہے اور وہاں موجود ہر فرد ان کا ملازم ہے اس لیے وہ متعلق تو ہو گئیں۔ سب سے پہلے قادر بخش کے بارے میں معلوم کرنا ہے۔ وہ گل نار کو خرید کر لایا ہے اور خود گل نار کا بیان ہے کہ وہ اچھا آدمی نہیں ہے۔"

"ظاہر ہے وہ اسے پسند نہیں کرتی ہے تو اچھا آدمی کیسے سمجھ سکتی ہے؟"

"تیرا مطلب ہے کہ وہ اس کے بارے میں غلط بیانی بھی کر سکتی ہے مگر فولاد خان کو اس کے بارے میں جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے۔"

اس بار تیمور نے سر پر ہاتھ مارا۔ "یار کس آدمی کو اپنا رقیب اچھا لگتا ہے؟"

شامی کھسیا گیا۔ "یہ خیال تو مجھے آیا ہی نہیں، اس کا مطلب ہے کہ قادر بخش سچ مچ شریف آدمی ہو سکتا ہے۔"

"بالکل، بہت سی عورتیں شریف آدمیوں کو پسند نہیں کرتی ہیں۔"

"شریف تو اپنا فولاد خان بھی کم نہیں ہے۔ گل نار اس کی طرف کیوں بڑھی؟"

"قادر بخش سے جان چھڑانے کے لیے۔" تیمور اب اس معاملے میں پوری دلچسپی لے رہا تھا۔ "دیکھ تو نے بتایا تھا کہ گل نار کو قبائلی رواج کے مطابق اس کے باپ نے قادر بخش کو بیچا ہے۔ یہاں سے اصل مسئلہ شروع ہوتا ہے۔ گل نار جانتی ہے کہ اگر اس نے قادر بخش کو چھوڑا یا فرار ہوئی تو معاملہ اس کے قبیلے تک جائے گا اور وہ بچ نہیں سکے گی۔ اس لیے اسے ایک کاٹھ کے اُلو کی ضرورت پڑی جو اسے ان لوگوں سے بچائے۔"

"وہ کاٹھ کا اُلو فولاد خان ہے؟" شامی نے غور کرتے ہوئے کہا۔

"بالکل اور اب فولاد خان کو ضرورت پڑ رہی ہے کہ مزید کاٹھ کے اُلو اس معاملے میں شامل ہوں۔ وہ خود قبائلی ہے اور اپنے ہاں کے رسم و رواج سے اچھی طرح واقف ہے۔"

کافی آ گئی اور دونوں کافی نوشی کرتے ہوئے مسئلے کے مزید پہلوؤں پر غور کرنے لگے۔ شامی نے کہا۔ "تصویر یوں بن رہی ہے کہ قادر بخش نے ایک رقم گل نار کے باپ کو دی اور اس نے بیٹی کی شادی قادر بخش سے کر دی۔ قادر بخش اسے یہاں لے آیا۔ گل نار اس کے ساتھ مطمئن نہیں ہے اس لیے وہ اس سے چھٹکارا چاہتی ہے۔ وہ اکیلے یہ کام نہیں کر سکتی ہے اس لیے اس نے فولاد خان کا سہارا لیا۔ لیکن ان کی پہلی ملاقات اتفاقیہ تھی۔"

"مجھے شک ہے کہ فولاد خان اس سے اتفاق سے ملا تھا۔" تیمور نے کہا۔ "وہ جتنی زیادہ سبزیاں پھیلا کر بیٹھی تھی، وہ ایک عورت نہیں اٹھا سکتی ہے۔ سوال یہ ہے وہ اتنی سبزیاں کہاں سے لائی تھی؟"

شامی نے غور کیا۔ "تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔"

"دوسرے اس کا بھی کوئی ثبوت نہیں ہے کہ آدھی رات کو گل نار قادر بخش سے بچنے کے لیے بھاگی تھی۔ جب فولاد خان اسے چھوڑنے گیا تو سب معمول کے مطابق تھا۔"

"گل نار نے بتایا تھا کہ قادر بخش نشے میں دھت ہو کر سو گیا ہے۔"

"یہ بھی گل نار کا بیان ہے۔" تیمور نے کہا۔ "اس لیے اب تجھے اس معاملے میں جو کرنا ہے، کھلی آنکھوں سے

کرنا ہے۔ فولاد خان اگر بے وقوف بن گیا ہے تو ضروری نہیں ہے کہ ہم بھی بنیں۔''

تیمور کی باتوں اور کافی نے شامی کی آنکھیں کھول دی تھیں اور وہ خود پر افسوس کر رہا تھا کہ ایسے دسیوں معاملات سے نمٹنے کے باوجود اس نے آنکھ بند کر کے اس بات پر یقین کیوں کر لیا کہ جیسا فولاد خان نے بتایا ہے ویسا ہی ہوگا۔ اس نے تیمور سے کہا۔ ''تب کیا کریں؟''

''کسی بھی مسئلے میں سب سے ضروری صورتِ حال کو مکمل طور پر سمجھنا ہے اس لیے ہمیں پہلے یہی کرنا ہوگا۔''

''تو نازیہ سے بات کر۔''

''بات تو کرلوں گا مگر وہ بہت ہوشیار ہے... مطلب محسوس کرتے ہی کسی ریستوران یا ہوٹل میں ملاقات کا کہہ دے گی۔ مہینے کی آخری تاریخیں ہیں اور میں چھ سات ہزار کا بل ادا کرنے کے موڈ میں نہیں ہوں۔''

''تو فکر مت کر، میں اسے سیٹ کرلوں گا۔'' شامی نے کہا۔ ''نوشی کی اس سے بات ہے۔''

''مگر نوشی کی تجھ سے بات نہیں ہے۔'' تیمور نے اسے یاد دلایا۔

شامی مسکرایا۔ ''نہیں ہے تو کرلوں گا۔''

☆☆☆

نوشی نے شامی کو دیکھتے ہی برا سا منہ بنایا تھا۔ وہ لاؤنج میں بیٹھی ہوئی ایک فیشن میگزین دیکھ رہی تھی۔ چند دن پہلے شامی نے زور و شور سے آنے والے سنڈے کو مری میں برف باری دیکھنے کا اعلان کیا۔ یہ بات اس نے جوجی کو بھی بتائی تھی اور اس نے فوراً اپنی باجی تک پہنچائی تھی۔ اب ہوا یہ کہ شامی صبح نکلا تو نوشی اس کے پیچھے تھی۔ ایک جگہ اس نے شامی کی گاڑی کا سراغ کھو دیا اور یہ سوچ کر مری پہنچ گئی کہ شامی وہیں ہوگا۔ مگر کئی گھنٹے.... کی ناکام تلاش کے بعد اس نے واپسی کا سفر کیا تو شامی اسے گیٹ کے سامنے ہی ملا تھا۔ وہ مالی سے بنگلے کے ساتھ گرین بیلٹ پر لگے درختوں کی صفائی کرا رہا تھا۔ جب نوشی نے اس سے پوچھا تو اس نے معصومیت سے بتایا کہ راستے میں اس کا ارادہ بدل گیا تھا اور وہ واپس لوٹ آیا۔ تب سے نوشی خفا تھی اور دونوں میں بات چیت بند تھی۔ شامی اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ ''ہیلو، کیا ہو رہا ہے؟''

''تم دیکھ رہے ہو؟'' نوشی نے سرد لہجے میں کہا۔ ''کہو کیسے آنا ہوا؟''

''تمہارے ہاں مہمانوں کو چائے پوچھنے کا رواج نہیں رہا ہے یا گردیزی صاحب کے حالات ٹائٹ ہو گئے ہیں۔ سنا ہے ان کی ریٹائرمنٹ قریب ہے۔''

''کریم چائے لاؤ۔'' نوشی نے بلند آواز سے کہا اور پھر دانت پیس کر بولی۔ ''ہم بھی جدی پشتی دولت مند ہیں اور پاپا کو نوابوں والا کوئی شوق نہیں ہے۔''

شامی ہنسا۔ ''وہ تو مجھے نواب زادہ ہوتے ہوئے بھی نہیں ہے۔ تم بہت دنوں سے نظر نہیں آئیں اس لیے میں نے سوچا...''

''تب تمہیں کسی آئی اسپیشلسٹ کے پاس جانا چاہیے تھا کل میں پارک میں تمہارے سامنے سے گزری تھی اور تم نے دیکھا نہیں۔''

شامی چونکا۔ ''شاید میرا دھیان کہیں اور تھا۔''

''جہاں تھا میں نے اسے بھی دیکھا تھا۔'' نوشی نے میگزین پنخا۔ شامی کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ وہ کل پارک میں نازیہ کو دیکھ رہا تھا اور اس سے بات کرنے کا موقع تلاش کر رہا تھا۔ وہ موبائل پر بات کرتی ہوئی پارک تک آئی تھی اور اسی طرح بات کرتی چلی گئی۔ شامی کو موقع ہی نہیں ملا تھا۔ بدقسمتی سے نوشی نے دیکھ لیا تھا۔ آنے والا ایک گھنٹا شامی پر خاصا بھاری گزرا تھا مگر اس نے کسی نہ کسی طرح نوشی کو رام کر ہی لیا۔ اس کے رام ہونے میں اصل کردار فولاد خان کی لو اسٹوری کا تھا۔ نوشی متجسس ہو گئی تھی، اس نے نارمل ہوتے ہوئے پوچھا۔ ''فولاد خان کو یہ کیا سوجھی؟''

''تم جانتی ہو ہم مردوں کو۔'' شامی نے سرد آہ بھری۔ ''اگر جنت میں حوریں نہ ہوتیں تو تم خواتین کے ساتھ خوشی خوشی جہنم جانے کو ترجیح دیتے۔''

نوشی سوچ میں پڑ گئی۔ ''تو تم اس لیے نازیہ کے پیچھے تھے۔''

''ہاں تم سے بات کرنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی اس لیے میں نے سوچا کہ براہِ راست اس سے بات کرلوں۔''

''میری اس سے ہیلو ہائے ہے لیکن وہ مجھے پسند نہیں ہے۔''

''پسند تو مجھے بھی نہیں ہے کیونکہ تیمور اسے پہلے ہی پسند کر چکا تھا۔'' شامی نے روانی میں کہا اور جب نوشی نے اسے کھا جانے والے انداز میں دیکھا تو اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ ''میرا مطلب ہے کہ تیمور جس ٹائپ کی لڑکیاں پسند کرتا ہے، وہ مجھے پسند نہیں آتی ہیں۔''

''تمہارا مطلب میں اچھی طرح جانتی ہوں۔'' نوشی

نے خفگی سے کہا۔ ''مجھ سے کیا چاہتے ہو؟''
''زوار صاحب کے گھر کی مکمل رپورٹ۔''
نوشی نے سر ہلایا۔ ''میں کوشش کروں گی لیکن مجھے بھی لگ رہا ہے کہ گل نار فولاد خان کو استعمال کر رہی ہے۔''
''اس صورت میں فولاد خان کو قائل کیا جا سکتا ہے ورنہ وہ سنکی سولجر ہے اپنی بات سے نہیں ہٹے گا۔''
''اوکے میں معلوم کر کے بتاؤں گی۔'' نوشی نے کہا۔
''تمہاری چائے اب تک نہیں آئی۔'' شامی نے یاد دلایا تو نوشی نے کریم کو آواز دی۔
''کریم اب چائے لے ہی آؤ۔''
اگلی شام نوشی، وقار ولا کے اوپر والے لاؤنج میں آتش دان کے سامنے شامی اور تیمور کے ساتھ بیٹھی انہیں اپنی اور نازیہ کی ملاقات کا احوال سنا رہی تھی۔ دو سال پہلے تک زوار صاحب کی بیوہ نے تین پرانے ملازموں کو رکھا ہوا تھا۔ اس سے پہلے وہ چار ملازم فارغ کر چکی تھیں۔ اچانک ہی انہوں نے ان تین ملازمین کو بھی نکال دیا۔ اس کے بعد انہوں نے قادر بخش کو رکھ لیا۔ وہ واحد ملازم تھا جو کھانا بنانے سے لے کر گھر کی دیکھ بھال تک تمام کام کرتا تھا۔ زوار صاحب کی بیوہ کا کسی سے ملنا جلنا ویسے بھی نہیں تھا۔ قادر بخش بھی بنگلے سے کم نکلتا تھا اس لیے آس پاس کے بنگلوں کے ملازموں سے اس کی سلام دعا بھی نہیں تھی۔ کسی کو نہیں معلوم کہ زوار صاحب کی بیوہ نے ایک اکیلے مرد کو کیوں ملازم رکھا ہوا ہے۔
شروع میں لوگوں کو شبہ ہوا کہ زوار صاحب کی بیوہ خیریت سے بھی ہیں یا نہیں۔ کیونکہ چند ایک جاننے والوں نے کال کر کے ان سے بات کرنی چاہی تو قادر بخش نے کال ریسیو کی اور کال کرنے والوں کو بتایا کہ بیگم صاحب کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اس لیے وہ بات نہیں کر سکتیں۔ لیکن اس سے پہلے لوگوں کے شبہات خطرناک حد تک پہنچتے اور بات پولیس تک جاتی، ایک شام زوار صاحب کی بیوہ چہل قدمی کرتی ہوئی قریبی پارک تک چلی آئیں۔ یوں سارا علاقہ واقف ہو گیا کہ وہ خیریت سے ہیں۔ لوگوں سے سلام دعا بھی ہوئی تھی۔ اس کے بعد مہینے میں ایک دو بار اسی طرح پارک تک آ جاتی تھیں مگر سال بھر سے انہوں نے نکلنا کم کر دیا تھا اب شاذ ہی باہر آتی تھیں۔ بہرحال اب کسی کو تجسس نہیں ہوتا تھا۔ اس دوران میں قادر بخش اکیلا ہی ملازم رہا تھا۔ پھر چھ مہینے پہلے وہ گل نار کو لے آیا۔ گل نار اندر کے کام دیکھنے لگی تھی اور قادر بخش نے گیٹ اور باہر کے کاموں کی ذمے داریاں سنبھال لی تھیں۔ تیمور نے کہا۔
''یہ حیرت انگیز ہے کہ زوار صاحب کی بیوہ نے برسوں پرانے ملازم نکال کر ایک اجنبی شخص کو ملازم رکھ لیا جبکہ وہ بالکل اکیلی ہوتی ہیں۔''
''وہ ساٹھ سال کی بوڑھی اور بیمار خاتون ہیں۔'' شامی نے اسے یاد دلایا۔
''یار عورت کو ایک ہی خطرہ تو نہیں ہوتا ہے۔'' تیمور نے کہا تو نوشی جھینپ گئی۔
''لینگویج پلیز۔''
''سوری، میرا مطلب ہے کہ وہ بہت دولت مند خاتون ہیں اور ان کے پاس قیمتی اشیا اور نقدی کی کمی نہیں ہوگی۔ اگر قادر بخش کچھ کرنے کی ٹھان لے تو وہ اسے روک نہیں سکتی ہیں۔''
''یہ تو ہے لیکن قادر بخش کو بھی دو سال ہو گئے ہیں۔ اگر اسے کچھ کرنا ہوتا تو اب تک کر چکا ہوتا۔'' شامی نے نقطہ اٹھایا۔
''ہاں یہ بھی ہے لیکن بعض لوگ طویل المدت منصوبے بناتے ہیں۔''
نوشی جو اَب تک خاموشی سے سن رہی تھی، اس نے کہا۔ ''اس سارے معاملے میں فولاد خان اور گل نار کی بات تو رہ ہی گئی۔''
شامی نے کہا۔ ''میں سوچ رہا ہوں کہ ایک بار زوار صاحب کی بیوہ سے ملاقات کر لی جائے۔''
''وہ کس لیے؟''
''یہ کہنا تو مشکل ہے۔'' شامی نے سر سہلایا۔ ''مگر کچھ باتیں اسی طرح کھلیں گی۔''
''ملاقات کیسے ہوگی۔ اگر انہوں نے ملنے سے انکار کر دیا؟''
''ہم دادا جان کے حوالے سے ملیں گے۔'' شامی نے آئیڈیا پیش کیا۔ ''کہ انہوں نے مزاج پرسی کے لیے بھیجا ہے۔''
''آئیڈیا تو برا نہیں ہے لیکن اگر انہوں نے ملنے سے انکار کیا تو یہ دادا جان کی بے عزتی ہوگی۔'' تیمور نے کہا۔ ''میں برداشت نہیں کروں گا۔''
شامی نے سوچا اور سر ہلایا۔ ''یہ تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔ تب کیا کریں؟''
''براہِ راست ملنا مناسب نہیں ہوگا۔'' تیمور نے کہا۔ ''اگر ہمیں اندر کی معلومات درکار ہیں تو سب سے مناسب

ذریعہ گل نار ہی ہے۔"

"اس سے کیسے رابطہ کیا جائے؟"

"یہ مجھ پر چھوڑ دو۔" تیمور نے کہا۔

"ایک سوال ہے کہ فرض کرو معاملہ سیٹ ہو جاتا ہے۔تب بھی فولاد خان اور گل نار کی شادی کے موقع پر بات تو کھلے گی۔" شامی نے خدشہ ظاہر کیا۔

"یار وہ دادا جان ہیں، کوئی ہٹلر نہیں ہیں۔ وہ صرف اسی وقت کسی معاملے میں دخل دیتے ہیں جب بات ان تک یا خاندان کے وقار تک آنے کا خدشہ ہو۔ ماضی میں جو ہو چکا ہو گا بلاوجہ اسے کیوں لے بیٹھیں گے۔" تیمور نے کہا۔

"اب مجھے فولاد خان سے ملاقات کرنی ہے کیونکہ گل نار سے ملاقات وہی کرا سکتا ہے۔"

فولاد خان، تیمور کی شمولیت سے خوش ہوا تھا۔ اس نے دانت نکالتے ہوئے کہا۔"تیمور صیب جب آپ اور شامی صیب کسی کام کو مل کر فرماتا اے تو وہ لازمی او جاتا اے۔"

"اب ایسا بھی نہیں ہے بہت سے کام ہم الگ الگ بھی کرتے ہیں اور وہ ہو بھی جاتے ہیں۔" تیمور نے تردید کی اور پھر گل نار سے ملاقات کا کہا۔

"تیمور صیب آپ اس سے مل کر کیا کرے گا؟" فولاد خان تردد کے ساتھ بولا۔

"یار میں کوٹھی کے حالات پوچھوں گا۔ قادر بخش مجھے مشکوک آدمی لگ رہا ہے۔ آخر زوار صاحب کی بیوہ نے اس پر اعتبار کیسے کر لیا کہ سارے ملازمین کو نکال کر اسے ملازم رکھا۔ گل نار چھ مہینے پہلے اس کی بیوی بنی ہے۔"

فولاد خان حیران ہوا۔"اتنا تو ام بی نہیں جانتا۔"

"تم میں اور ہم میں فرق ہے فولاد خان۔" شامی نے کہا۔"جب ہم کسی کام کے پیچھے پڑتے ہیں تو اسے کر کے رہتے ہیں۔"

"صیب آپ لوگ امارا شادی گل نار سے کرا دو۔" فولاد خان نے ملتجی لہجے میں کہا۔"امارا آنے والا نسل بی آپ کو دعا دے گا۔"

شامی ہنسا۔"اب تو اور ضروری ہو گیا ہے فولاد خان کی اگلی نسل شادی سے مشروط ہے اور ہمیں اس کی دعائیں لینی ہیں۔"

کیونکہ یہ فولاد خان کا ذاتی کام تھا اس لیے اس نے بھی دماغ لڑانا ضروری سمجھا اور بولا۔"صیب یہ قادر بخش اچا آدمی نہیں اے۔ تو اس نے کوچ برا کیا اوگا۔"

تیمور نے سر ہلایا۔"جیسے گل نار سے شادی۔"

"نہیں صیب ایسا کام جو پولیس کو اچا نہیں لگتا او۔"

"اگر پولیس کو کچھ کھلایا پلایا نہ جائے تو اسے بہت برا لگتا ہے۔" شامی نے کہا۔

"نہیں صیب امارا مطلب اے چوری موری، ڈاکا ماکا، قتل مقتل۔"

"یہ سارے کام اسے نہایت پسند ہیں کیونکہ انہیں سے ان کے گھر میں چولہے جلتے ہیں۔" شامی نے کہا مگر تیمور سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے شامی سے کہا۔

"یار فولاد خان کم ہی کرتا ہے مگر آج اس نے پتے کی بات کی ہے۔"

فولاد خان خفا نہیں ہوا۔"آپ ٹیک فرماتا، امارا دماغ رکشے کی طرا چلتا اے پر آج ٹرک کی طرا چل را اے۔"

"تیرا مطلب ہے کہ قادر بخش کسی نہ کسی قانون شکنی میں ملوث ہو سکتا ہے۔" شامی نے پوچھا تو تیمور نے سر ہلایا۔

"بالکل ہو سکتا ہے۔"

"تب یہ بات گل نار یعنی بیوی سے بہتر کون جان سکتا ہے۔"

"ہو سکتا ہے گل نار جانتی ہو یا ہو سکتا ہے وہ ناواقف ہو۔"

☆☆☆

گل نار نے نفی میں سر ہلایا۔"ام نہیں جانتا۔ قادر بخش ام کو اپنے بارے میں نہیں بتاتا۔ ام کو تو اس کا رشتے دار کا بی معلوم نہیں اے۔"

وہ سب تیمور کی کار میں تھے۔ فولاد خان نے گل نار سے رابطہ کر کے اسے تیمور اور شامی سے ملنے پر آمادہ کر لیا تھا۔ اس کارِ خیر کے لیے وہ فجر کے بعد زوار صاحب کے بنگلے پر جا پہنچا تھا۔ اس نے کہا کہ وہ صبح مارکیٹ جانے کا کہہ کر نکلے گی۔ انہوں نے پارک کے پاس سے اسے پک کیا تھا۔ تیمور ڈرائیو کر رہا تھا اور شامی اس کے ساتھ تھا جبکہ فولاد خان اور گل نار پچھلی سیٹ پر براجمان تھے۔ گل نار سہمی ہوئی تھی مگر فولاد خان کی وجہ سے اسے ڈھارس بھی تھی۔ اس کی جھجک نکالنے کے لیے پہلے تیمور نے پشتو کا استعمال کیا۔ اسے خاصی حد تک پشتو آتی تھی۔ اس کا اچھا اثر ہوا اور گل نار کھل کر بولنے لگی۔ کچھ سوالات کے بعد تیمور اصل بات پر آیا اور قادر بخش کی ذاتی زندگی کے بارے میں سوالات

کرنے لگا۔ گل نار اس کے بارے میں بہت کم جانتی تھی۔ اس نے بتایا کہ قادر بخش شراب پیتا ہے مگر یہ کام وہ صرف رات کو کرتا ہے، دن میں وہ نشے سے دور رہتا ہے۔

اس کے علاوہ بھی گل نار نے خاصے اہم انکشافات کیے تھے۔ قادر بخش کو بنگلے میں خاصا سجا ہوا اور بہترین کوارٹر ملا ہوا تھا جس میں ضرورت کی ہر چیز تھی۔ ذاتی استعمال کی اشیا قیمتی اور اعلیٰ درجے کی تھیں۔ مشروبات وہ غیر ملکی استعمال کرتا تھا۔ دوسری چیزوں کے لیے بھی اس کا ہاتھ بہت کھلا ہوا تھا۔ صرف خود پر ہی نہیں وہ گل نار پر بھی کھل کر خرچ کرتا تھا۔ اس وقت بھی گل نار نے جو سوٹ پہن رکھا تھا اس کی مالیت چار ہزار تھی۔ اس کے پاؤں میں دو ہزار والی چپل تھی اور اس کا برانڈڈ سوئیٹر ڈھائی ہزار سے کم نہیں تھا۔ اوپر سے اس نے پشمینے کی شال اوڑھ رکھی تھی اور کہیں سے بھی نوکرانی نظر نہیں آتی تھی۔ البتہ اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ قادر بخش کو تنخواہ کیا ملتی ہے۔ اس کا مزید کوئی ذریعہ آمدنی ہے یا نہیں۔ شامی نے اس سے کہا۔ ''تم نے سوچا کہ ایک نوکر اتنے ٹھاٹ سے کیسے رہ سکتا ہے اور اس کے پاس اتنا پیسہ کہاں سے آیا؟''

''ام نہیں سوچا۔'' گل نار نے سادگی سے کہا۔ ''وہ ام کو اچھا نہیں لگتا اور جو اچھا نہ لگے ام اس کے بارے میں نہیں سوچتا۔''

''اب سوچو۔'' شامی نے کہا۔ ''تمہیں قادر بخش سے چھٹکارا حاصل کرنا ہے اور اس کے لیے تمہیں اس کی جاسوسی کرنا ہوگی۔''

''ام کیا کرے گا؟'' گل نار جھجک کر بولی۔ ''ام سمجا نہیں۔''

شامی کی پشتو اتنی اچھی نہیں تھی اس لیے وہ اردو پشتو دونوں ملا کر کام چلا رہا تھا۔ فولاد خان نے اسے سمجھایا کہ شامی کیا کہہ رہا تھا۔ وہ سہم گئی۔ ''ام ایسا نہیں کرسکتا۔ ام نے ایسا کیا تو قادر بخش امارا گلا کاٹ دے گا۔''

''ام قادر بخش کا سر کاٹ دے گا اگر اس نے تو مارا گلا کاٹا۔'' فولاد خان نے فوراً جذباتی ہو کر کہا۔

شامی نے اسے سمجھانے کی کوشش کی مگر مسئلہ یہ تھا کہ وہ بالکل ان پڑھ اور سیدھی سی عورت تھی۔ اسے ان معاملات کا کچھ پتا نہیں تھا۔ اس کے پاس زیادہ وقت بھی نہیں تھا۔ گل نار کا کہنا تھا کہ جب سے فولاد خان نے اسے سبزی کے ٹوکرے سمیت بنگلے پر پہنچایا تھا تب سے قادر بخش مشکوک رہنے لگا تھا۔ وہ تو شکر ہے کہ اسے علم نہیں ہوا کہ بارش والی رات وہ اس سے بچنے کے لیے بھاگی تھی ورنہ اس کی شامت آجاتی۔ اب بھی وہ پندرہ بیس منٹ سے زیادہ دیر نہیں کرسکتی تھی ورنہ قادر بخش سوال کرتا اور مطمئن نہ ہوتا تو اس پر تشدد کرتا۔ انہوں نے اسے مارکیٹ کے پاس چھوڑ دیا۔ کچن کے لیے سامان لانا اسی کی ذمے داری تھی۔ پہلے قادر بخش یہ کام کرتا تھا مگر اب اندر کے ساتھ ساتھ اس نے باہر کے کام بھی گل نار کے سر مارنا شروع کردیے تھے۔ فولاد خان کو ولا کے گیٹ پر اتار کر تیمور نے کار کا رخ کلب کی طرف موڑ دیا۔ آج وہاں فنکشن تھا جس میں کچھ ابھرتے ہوئے پاپ بینڈ موسیقی کے نام پر ہنگامہ آرائی کرنے آرہے تھے۔ تیمور نے کہا۔

''یار لڑکی بہت ہی سادہ ہے۔''

''لڑکی نہیں، عورت۔'' شامی نے اسے ٹوکا۔ ''ویسے باقی مجھے اتفاق ہے۔ میرا خیال ہے فولاد خان اس کی سادگی پر مرمٹا ہے۔''

''قادر بخش کی جاسوسی آسان نہیں ہے۔ یہ جانتی ہی نہیں ہے جاسوسی کیسے کی جاتی ہے۔''

''حالانکہ ہر بیوی فطری طور پر جاسوس ہوتی ہے۔'' شامی نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ ''وہ جانتی ہے کہ شوہر کی جڑوں تک کیسے پہنچا جاتا ہے۔''

''گل نار کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ قادر بخش کو شوہر تسلیم ہی نہیں کرتی ہے۔ اگر کرے تو شوہر کے بارے میں تجسس بھی کرے۔''

''اس کا مطلب ہے کہ نوشی نے مجھے شوہر مان لیا ہے۔'' شامی نے سرد آہ بھری۔ ''ابھی مجھے شوہرانہ حقوق حاصل نہیں ہوئے ہیں اور وہ میری مکمل جاسوسی کرنے لگی ہے۔''

''بہرحال کہیں سے تو آغاز کرنا ہے۔'' تیمور نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''ایک کام کرو کسی طرح قادر بخش کی تصویر اور اس کے آئی ڈی کارڈ کی کاپی حاصل کرو۔''

''پولیس تفتیش؟''

''ہاں یار شاہنواز واپس اسلام آباد آگیا ہے اور اتفاق سے انویسٹی گیشن میں ہے۔ اس کے پاس تمام پولیس اسٹیشنز کا ریکارڈ موجود ہے۔''

شاہنواز ان کا دور کا کزن اور ایس ایس پی تھا۔ شامی نے کہا۔ ''سوچ لے اس صورت میں وہ دادا جان سے ذکر کرسکتا ہے۔''

''میں منع کردوں گا تو نہیں کرے گا۔''

"ٹھیک ہے، میں یہ کام فولاد خان کے ذمے لگاتا ہوں۔ اس عورت کو بار بار بلانا اور کار میں لیے گھومنا درست نہیں ہے آدھا شہر ہمیں جانتا ہے۔"

فنکشن اچھا رہا تھا اور انہیں کچھ خوب صورت لڑکیوں کا ساتھ مل گیا تھا اس لیے شام اچھی گزر گئی تھی۔ اتفاق سے آنے والے بینڈز میں سے ایک نے بہت اچھا پرفارم کیا اور ان کی تفریح دوبالا ہو گئی۔ اگلی صبح ناشتے سے ذرا پہلے نوشی نازل ہوئی تو شامی کا ماتھا ٹھنکا۔ "خیریت! آج صبح سویرے؟"

نوشی معنی خیز انداز میں مسکرائی۔ "کیوں اگر میں صبح آؤں تو خیریت نہیں ہوگی؟"

"نہیں، میرا مطلب ہے کہ تم کل کہیں گئی تھیں؟" شامی نے اندیشوں سے لرزتی آواز میں پوچھا۔

"ہاں۔" نوشی نے اطمینان سے کہا۔

"کہاں؟" شامی نے پوچھا۔

اس سے پہلے نوشی جواب دیتی، نواب صاحب لاؤنج میں داخل ہوئے۔ نوشی نے ادب سے سلام کیا تو انہوں نے جواب دے کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ "اب ہم سوچ رہے ہیں کہ تمہیں یہیں لے آئیں۔"

نوشی شرما گئی اور جلدی سے بولی۔ "انکل میں سامنے تو رہتی ہوں جب آپ حکم فرمائیں میں آجایا کروں گی۔"

"جیتی رہو۔" نواب صاحب نے شامی کی طرف دیکھا۔ "دراصل اب ہم بوڑھے ہو گئے ہیں، نگرانی کا فرض اچھی طرح انجام نہیں دے سکتے اس لیے چاہتے ہیں کہ کوئی مستقل نگرانی کرنے والی آجائے۔ بعض گھوڑوں کو بے لگام چھوڑا نہیں جاسکتا ہے۔"

شامی کا خون کھول رہا تھا، وہ اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ گفتگو اسی کے بارے میں ہے مگر وہ نواب صاحب کی موجودگی میں کچھ کہہ بھی نہیں سکتا تھا۔ نواب صاحب نے نوشی کو ناشتے کی دعوت دی جو اس نے فوراً قبول کر لی اور شامی سوچ رہا تھا کہ وہ ناشتے کی میز پر ہی گل کھلائے گی۔ تیمور کو جلدی تھی اس لیے وہ پہلے ہی دفتر جا چکا تھا۔ شامی پچھتا رہا تھا کہ اس نے تیمور کی پیروی کیوں نہیں کی۔ مگر اسے کیا معلوم تھا کہ یہ مصیبت صبح ناشتے سے پہلے نازل ہو جائے گی۔ شامی گھر کا اور بھرپور ناشتا کرنے کا عادی تھا۔ اسے باہر ناشتا کرنا اچھا نہیں لگتا تھا۔ نواب صاحب نے نوشی سے سرگرمیوں کا پوچھا تو اسے موقع مل گیا۔ اس نے بتایا کہ وہ کل ایک فنکشن میں گئی تھی۔ اس کی سہیلی نے بلایا تھا۔ اچھا فنکشن تھا مگر بعض لوگ وہاں آکر قابو سے باہر ہو گئے تھے۔ "انکل آج کی نسل کو نہ جانے کیا ہو گیا ہے۔ بس مغرب کی اندھادھند پیروی کرنی ہے۔"

نوشی نے ان کی تصاویر بھی لی تھیں اور اپنے موبائل پر وہ نواب صاحب کو تصاویر دکھانے لگی۔ ان کے تبصروں سے ظاہر تھا کہ تصویریں کس کی اور کس نوعیت کی تھیں۔ دراصل شامی نے فری ہو جانے والی لڑکیوں کے ساتھ ڈانس میں بھی حصہ لیا تھا۔ نوشی اور نواب صاحب ناشتے کے ساتھ ان تصویروں کو دیکھنے میں بھی مگن رہے۔ شامی چائے کے ساتھ خون کے گھونٹ بھی پیتا رہا۔ بالآخر اس کا ضبط جواب دے گیا، اس نے چائے کی پیالی رکھ کر نوشی سے کہا۔ "ٹھیک ہے، میں اور تیمور کل ایک فنکشن میں گئے تھے، وہاں ہم نے کچھ تفریح بھی کی تھی مگر یہ کتنی گھٹیا حرکت ہے کہ تم ہماری جاسوسی کرتی ہو اور پھر تصویریں لے کر دادا جان کو دکھاتی ہو۔"

"تمہاری جاسوسی۔" نوشی نے معصومیت سے کہا۔ "میں بھلا ایسی گھٹیا حرکت کیوں کروں گی۔ یہ تم سے کس نے کہا کہ میں نے تمہاری تصویریں لی ہیں؟"

"تب تم دادا جان کو کیا دکھا رہی ہو؟" شامی نے ڈوبتے دل کے ساتھ پوچھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ وہ نوشی کے جال میں پھنس گیا ہے اور اپنی گردن میں پھندا پھنسا بیٹھا ہے۔

"لو تم خود دیکھ لو۔" نوشی نے موبائل اسکرین اس کے سامنے کر دی اور تصویریں دکھانے لگی۔ اس کے انداز میں معنوی برہمی تھی۔ تصویریں دکھا کر وہ کھڑی ہو گئی اور ناشتے کے لیے نواب صاحب کا شکریہ ادا کر کے وہاں سے تنتناتی ہوئی چلی گئی۔ شامی کی حالت خراب ہونے لگی۔ اسے معلوم تھا کہ نوشی نواب صاحب کا غصہ بڑھانے کے لیے خفگی کی اداکاری کر رہی ہے۔ نوشی کے جاتے ہی نواب صاحب نے سرد لہجے میں کہا۔ "آپ پندرہ منٹ بعد مجھ سے اسٹڈی میں ملیے۔"

آدھے گھنٹے بعد شامی باہر آیا تو نوشی، فولاد خان سے ہنس کر بات کر رہی تھی۔ شامی کو دیکھ کر اس نے بلند آواز سے کہا۔ "آدمی کے لیے بہتر ہے وہ کسی کو اتنا ہی تنگ کرے جتنا کہ وہ خود برداشت کر سکتا ہے۔"

فولاد خان نے دانت نکالے۔ "ٹیک فرمایا بی بی صیب۔"

اس سے پہلے شامی اسے کچھ کہتا، وہ گیٹ سے نکل کر

جا چکی تھی۔ شامی گہری سانس لے کر رہ گیا۔ نوشی نے بدلہ لے لیا تھا۔ فولاد خان نسوار ڈبیا سے نسوار لگا کر اس کے آئینے میں اپنی مونچھیں دیکھ کر ان کو بل دے رہا تھا۔ شامی نزدیک آیا تو اس نے سلام کر کے کہا۔ ”آج کتنا اچا دن نکلا اے شامی صیب۔“

”تمہارے لیے ہے۔“ شامی نے سرد آہ بھری۔ ”میں نے تو صبح سویرے نوشی کو دیکھ لیا تھا۔“

”تب تو آپ کا دن اور اچا ہونا چائی اے۔“

شامی دانت پیس کر مسکرایا۔ ”اچھا ہو گیا ہے۔ ابھی داداجان کے پاس سے آ رہا ہوں۔ خیر چھوڑو تم ایک کام کرو، گل نار سے قادر بخش کے آئی ڈی کارڈ کی کاپی اور اس کی ایک تصویر لے لو۔“

”ام لے لے گا۔“ فولاد خان بولا۔ ”پر آپ ان چیزوں کا کیا کرے گا؟“

”قادر بخش کا پولیس ریکارڈ چیک کرانا ہے لیکن یہ بات گل نار کو مت بتانا۔ ہو سکتا ہے وہ ڈر جائے اور یہ چیزیں نہ دے۔“

”ام بالکل نئیں بتائے گا۔“ فولاد خان نے یقین دلایا۔

”تم ایک کام اور کر سکتے ہو۔“ شامی نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”گل نار نے اپنے قبیلے خاندان اور باپ کے حوالے سے جو بتایا ہے، تم اس کی تصدیق کر سکتے ہو؟“

فولاد خان کو یہ بات اچھی نہیں لگی۔ کیونکہ اس میں گل نار پر شبہ کیا جا رہا تھا۔ اس نے ہچکچا کر پوچھا۔ ”کیوں صیب، اس کا کیا ضرورت اے؟“

”یار معلوم کرنے میں کیا حرج ہے۔ بعض اوقات کوئی کام کی بات سامنے آ جاتی ہے جس سے آسانی ہو جائے۔“

فولاد خان نے اس بار بادلِ ناخواستہ اپنا بڑا سا سر ہلایا۔ ”ام معلوم کرے گا۔“

”لیکن تصویر اور آئی ڈی کارڈ والا کام پہلے کرنا ہے۔“ شامی نے پورچ کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ نواب صاحب نے کلاس زیادہ طویل تو نہیں لی تھی مگر مختصر مدت میں اس سے زیادہ انہوں نے کم ہی سنائی تھیں۔ تیمور تھا نہیں اس لیے اس کے حصے کی بھی اسے سننی پڑی تھیں۔ نواب صاحب کا کہنا تھا کہ اب وہ مجبور ہو گئے ہیں اور زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح تفریح میں بھی انہیں یہ بات ملحوظ خاطر رکھنی چاہیے۔ شامی کا موڈ اتنا خراب تھا کہ اگر تیمور فولاد خان والے معاملے میں شامل نہ ہوتا تو وہ اس پر بھی لعنت بھیج دیتا۔ اس کا فی الحال کچھ کرنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ دفتر جاتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا کہ اس نے بلاوجہ ہی انجینئرنگ کی ڈگری لی۔ ایم بی اے کرتا اور آفس جاب کرتا۔ اگرچہ وہ ابھی بھی آفس جاب ہی کر رہا تھا مگر یہ عارضی تھی۔

شام کو دفتر سے واپسی پر فولاد خان نے اسے گیٹ پر قادر بخش کے شناختی کارڈ کی کاپی اور پاسپورٹ سائز تصویر دی۔

”یہ ام گل نار سے لایا اے اور آج ام مرتے مارتے بچا اے۔“

ہوا یوں کہ فولاد خان گل نار کے لیے بنگلے کے آس پاس منڈلا رہا تھا کہ اندر سے قادر بخش نکل آیا۔ وہ فولاد خان کے گلے پڑ گیا کہ وہ یہاں کیوں منڈلا رہا ہے۔ اس پر فولاد خان نے جواز پیش کیا کہ وہ یہاں چہل قدمی کر رہا تھا۔ قادر بخش نے اسے مشورہ دیا کہ وہ اپنے بنگلے کے سامنے جا کر ٹہلے۔ اس نے جھگڑے کو بڑھانا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ جانے لگا تھا کہ ایک چھوٹا سا پتھر آ کر اسے لگا اور اس کے گرد ایک پرچہ تھا۔ یہ پرچہ دراصل ایک رسالے سے کاٹ کر نکالی ہوئی تصویر تھی اور اس میں ایک پارک دکھایا گیا تھا۔ فولاد خان پہلے نہیں سمجھا کہ اگر گل نار نے اسے یہ بھیجا ہے تو اس کا مطلب کیا ہے؟ پھر اسے خیال آیا کہ اس نے اسے پارک میں تو نہیں بلایا ہے۔

فولاد خان پارک جا پہنچا۔ اس کا خیال درست نکلا۔ کچھ دیر بعد گل نار آئی اور فولاد خان سے قادر بخش کے رویے کی معذرت کی۔ فولاد خان خوش ہوا اور اسے کہا کہ وہ قادر بخش کی ایک تصویر اور آئی ڈی کارڈ کی کاپی لا دے۔ گل نار نے اسے وہیں رکنے کو کہا اور واپس چلی گئی۔ آدھے گھنٹے بعد اس نے فولاد خان کو دونوں چیزیں لا دیں مگر اس بار وہ رکی نہیں تھی۔ اس نے فولاد خان سے کہا کہ قادر بخش کچھ دیر کے لیے بنگلے سے نکلا ہے اس لیے اسے موقع ملا ہے۔ اب اسے قادر بخش کی آمد سے پہلے واپس جانا ہے۔ فولاد خان دل مسوس کر واپس آ گیا۔ شامی نے دونوں چیزوں کا معائنہ کیا۔ قادر بخش کی تصویر تو واضح تھی مگر اس کے آئی ڈی کارڈ کی کاپی بہت گھسی ہوئی تھی۔ تصویر واضح نہیں تھی۔ صرف سیاہ اور سفید رنگوں کے دھبے تھے۔ نمبر بھی مشکل سے پڑھا جا رہا تھا۔ اس نے کہا۔

”کاپی صاف نہیں ہے۔“

”شامی صیب گل نار نے یہ بی بوت کیا اے۔“ فولاد خان نے جواب دیا۔ ”آپ سانچ سکتا اے وہ کیسا لڑکی

اے اے ایسا کام نہیں آتا اے۔ قادر بخش چالاک آدمی اے وہ اسے پکڑ لے گا۔''

''تم نے اس کے بارے میں اپنے علاقے سے معلوم کیا؟''

''ابی نئیں کیا رات کو کرے گا۔ ادر میرا ایک چاچا اے۔ وہ سب کا بارے میں جانتا اے۔ نام تو نادر خان اے پر سب نادرا خان بولتا اے۔''

شامی ہنسا۔''ٹھیک بولتا ہے ممکن ہے اس کی کارکردگی نادرا سے اچھی ہو۔''

''وہ بتادے گا۔'' فولاد خان نے یقین سے کہا۔

شامی اندر آیا تو تیمور آچکا تھا۔ وہ بستر پر دراز کانوں سے بڑے سائز کے ہیڈفون لگائے پاؤں ہلا رہا تھا۔ شامی نے پلیئر سے لگا ہوا ہیڈفون کا جیک کھینچ لیا۔ تیمور نے اسے گھورا تو اس نے قادر بخش کی تصویر اور آئی ڈی کارڈ کی کاپی اس کے سامنے ڈال دی۔''یہ فولاد خان لے آیا ہے۔''

تیمور نے آئی ڈی کارڈ کاپی دیکھی اور بولا۔''یہ غیر واضح ہے۔''

''ہاں مگر فولاد خان کا کہنا ہے کہ ہمیں اسی پر شکر ادا کرنا چاہیے کہ وہ لے آئی ہے۔''

تیمور نے اپنے آئی فون سے دونوں چیزوں کی تصویریں لیں اور پھر شاہنواز کو کال کی۔''کیا حال ہیں ایس ایس پی صاحب... بہت دن ہو گئے بات نہیں ہوئی... ایک کام تھا سوچا اس بہانے بات بھی ہو جائے گی... ہاں یار ایک بندے کی انکوائری کرانی ہے... نام قادر بخش ہے... میں اس کی این آئی سی کی کاپی اور تصویر واٹس ایپ کر رہا ہوں... کاپی واضح نہیں ہے لیکن نمبر واضح ہے، اس سے کام چل جائے گا... اوکے کب تک بتاؤ گے؟... نہیں یار اتنی جلدی بھی نہیں ہے... ایڈوانس تھینک... اور ہاں دادا جان سے ذکر کی ضرورت نہیں ہے... ہاہاہا... یار تم سمجھدار ہو گئے ہو... اس کا مطلب ہے جلد یا تو پولیس کی نوکری سے جاؤ گے یا پھر ڈی آئی جی بنو گے۔''

کال کاٹ کر اس نے دونوں چیزیں شاہنواز کو واٹس ایپ کر دیں۔ اس نے چند لمحے بعد اوکے کر دیا۔ اس دوران میں شامی ہیڈفون کان سے لگائے میوزک سن رہا تھا۔ کال کر کے تیمور نے جیک کھینچا تو شامی کے چلتے پاؤں رک گئے۔ اس نے ہیڈفون اتارا۔''کیا ہوا؟''

''ہو گیا ہے، شاہنواز کل شام تک بتائے گا۔'' تیمور نے ہیڈفون لے کر واپس کانوں پر چڑھا لیا مگر جیک لگانے کے بجائے شامی سے پوچھا۔''سنا ہے صبح سویرے نوشی آئی تھی اور اس کے جانے کے بعد تو کچھ دیر دادا جان کے ساتھ اسٹڈی میں رہا تھا؟''

شامی نے ٹھنڈی سانس لے کر سر ہلایا۔''اور بہت مشکل میں رہا۔''

شامی نے تیمور کو صبح والی نوشی کی جوابی کارروائی کے بارے میں بتایا تو وہ مسکرایا۔''نوشی نے ہاتھ بہت ہلکا رکھا۔''

شامی خفا ہو گیا۔''یہ ہاتھ ہلکا رکھا ہے؟''

''شکر کر اس نے اصل تصاویر نہیں پیش کر دیں جن میں تو دو لڑکیوں کے درمیان سینڈوچ بنا ڈانس کر رہا تھا۔''

شامی چونکا۔''کیا مطلب؟''

''یار وہ بھی وہاں تھی، میں نے دیکھ لیا تھا مگر اس نے اشارے سے منع کیا کہ تجھے نہ بتاؤں۔''

شامی بھنا گیا۔''اور تو نے نہیں بتایا۔ صبح میں کتنی آسانی سے اس کے جال میں پھنس گیا۔''

''شکر کر نہیں بتایا ورنہ اس کا پلان خراب ہوتا تو وہ اصل تصاویر بھی پیش کر سکتی تھی۔'' تیمور نے کہا تو شامی کچھ ٹھنڈا ہوا۔ واقعی اس صورت میں نوشی اصل تصاویر بھی پیش کر سکتی تھی اور اس کے بعد اس کی کلاس زیادہ طویل اور عبرتناک ہو جاتی۔ اس کلاس کا سوچ کر شامی کا غصہ پھر ابھرنے لگا۔

''میں اسے چھوڑوں گا۔''

''یار تو پہلے ہی کر چکا ہے۔ سارا دن وہ مری میں رہی تھی۔''

''تفریح کرتی رہی اور یہاں میں نے دادا جان کی جھاڑ کھائی ہیں۔''

''معاف کر دے یار۔''

''ہرگز نہیں۔'' شامی نے کہا۔''بس ذرا یہ فولاد خان والا معاملہ نمٹ جائے پھر دیکھنا میں اس کے ساتھ کیا کرتا ہوں۔''

تیمور نے پلیئر سے ہیڈفون لگاتے ہوئے کہا۔''بھائی مرضی ہے تیری۔''

اگلی صبح شامی دفتر جانے کے لیے نکلا تھا۔ اس کا راستہ زوار صاحب کی بیوہ کے بنگلے کے پاس سے گزرتا تھا۔ گزرتے ہوئے اس کی نظر بنگلے کی طرف گئی تو وہ چونکا۔ ایک عدد ایمبولینس بنگلے کے گیٹ میں داخل ہو رہی تھی۔ شامی اس دوران میں آگے نکل گیا تھا۔ اس نے سوچا اور پھر

کار ایک طرف روک لی۔ اس علاقے کی مین روڈ یہی تھی۔ اس کی توقع کے عین مطابق دس منٹ بعد ایمبولینس گزری اور اس نے کار اس کے پیچھے لگا دی۔ ایمبولینس ایک اچھے اسپتال کی تھی۔ اس کا نام ایمبولینس پر پرنٹ تھا۔ اگرچہ شامی کو علم نہیں تھا کہ ایمبولینس کس سلسلے میں آئی تھی۔ ممکن ہے وہ کسی کو چھوڑنے آئی ہو یا زوار صاحب کی بیوہ کے بجائے کسی اور کو لینے آئی ہو۔ مگر شامی کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ ایمبولینس میں زوار صاحب کی بیوہ ہی ہیں۔ پندرہ منٹ بعد ایمبولینس اسپتال میں تھی۔ شامی کے اندازے کی تصدیق ہو گئی جب عقبی حصے سے اسٹریچر کے ساتھ قادر بخش بھی اترا تھا اور اندر چلا گیا۔ شامی کار اسپتال کے باہر ہی چھوڑ کر اندر آیا اور اس نے ایمبولینس کے ڈرائیور سے پوچھا۔

''بیگم صاحبہ کو اندر لے گئے ہیں کیا؟''

ڈرائیور نے غور سے اسے دیکھا۔ ''آپ کون ہیں؟''

''یہاں جو بوڑھی خاتون لائی گئی ہیں، میں ان کا سیکریٹری ہوں۔''

''اچھا اچھا۔'' وہ مطمئن ہو گیا۔ ''انہیں ایمرجنسی میں لے گئے ہیں۔''

شامی اب اندر آیا اور اس نے استقبالیہ سے بیگم زوار کے بارے میں پوچھا تو اسے بتایا گیا کہ وہ سانس لینے میں مشکل کی وجہ سے یہاں آئی ہیں۔ شامی نے یہاں خود کو ایک رشتے دار بتایا تھا۔ اس نے پوچھا کہ علاج کے اخراجات کا مسئلہ تو نہیں ہے؟ اس پر استقبالیہ کلرک نے اسے بتایا کہ بیگم زوار کے ساتھ آنے والے ملازم نے پیشگی بیس ہزار جمع کرا دیے تھے۔ شامی ویٹنگ روم کی طرف چلا آیا اور اس نے وہاں رکھا ہوا ایک بڑے سائز کا ہفتہ وار میگزین اٹھا لیا۔ کچھ دیر بعد اسے قادر بخش ایک ڈاکٹر کے ساتھ آتا دکھائی دیا تو اس نے میگزین چہرہ پوشی کے لیے سامنے کر لیا۔ اس نے قادر بخش کو پہلی بار تصویر میں دیکھا تھا مگر اس کا بہت زیادہ امکان تھا کہ قادر بخش نے اسے دیکھ رکھا ہو۔ وہ ڈاکٹر سے کہہ رہا تھا۔ ''بیگم صاحبہ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، انہیں سانس لینے میں بہت دشواری پیش آ رہی ہے۔''

''فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''ان کے پھیپھڑے کمزور ہیں۔ اس موسم میں ایسی تکلیف ہو جاتی ہے۔ اب وہ ٹھیک ہیں آپ لے جا سکتے ہیں۔''

''کم سے کم ایک دن تو انہیں اسپتال میں رکھا جائے۔'' قادر بخش نے اصرار کیا۔

''اس کی ضرورت نہیں ہے اور ہمیں بنا ضرورت مریض رکھنے کی اجازت بھی نہیں ہے۔''

''میں سمجھ رہا ہوں ڈاکٹر صاحب، لیکن آج گھر میں کیڑے مار اسپرے ہوگا اور یہ ان کے لیے مضر ہے اس لیے ایک رات یہ اسپتال میں رہ جائیں تو کوئی حرج نہیں ہے میں ادائیگی کروں گا۔''

''بات ادائیگی کی نہیں، اصول کی ہے۔ اگر آپ انہیں بنگلے میں نہیں رکھ سکتے تو ایک رات کسی گیسٹ ہاؤس یا ہوٹل میں رکھ لیں۔'' ڈاکٹر نے کھردرے لہجے میں کہا۔

شامی نے میگزین کے کنارے سے دیکھا تو قادر بخش اسے دانت پیستا ہوا نظر آیا۔ ڈاکٹر چلا گیا تھا۔ قادر بخش بھی مڑ گیا۔ کچھ دیر بعد وہ اسے کاؤنٹر پر باقی رقم کا حساب لیتا ہوا نظر آیا۔ اس سے ایمبولینس کا پوچھا گیا مگر اس نے کہا۔ ''اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اپنی گاڑی لینے جا رہا ہوں۔''

قادر بخش بیگم زوار کو ایمبولینس میں نہیں لے جانا چاہتا تھا۔ اس کے جاتے ہی شامی دوبارہ استقبالیہ پر پہنچا اور اس نے بیگم زوار سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ کلرک نے ایک اٹینڈینٹ کو بلا کر بیگم زوار کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ انہیں وہیل چیئر پر ویٹنگ روم میں لایا جا رہا ہے۔ ملاقات وہیں ہوگی۔ شامی اٹینڈینٹ کے ساتھ نہیں گیا تھا، وہ اس وقت تک وہاں کھڑا رہا جب تک اٹینڈینٹ اندر نہیں چلا گیا۔ اس نے اس کے بعد بھی کوئی پانچ منٹ انتظار کیا اور پھر ویٹنگ روم میں آیا جہاں اس کی توقع کے مطابق بیگم زوار اکیلی تھیں۔ وہیل چیئر پر بیٹھی وہ بہت کمزور لگ رہی تھیں مگر اس وقت ان کی سانس ہموار تھی۔ شامی نے یوں ظاہر کیا جیسے وہ اتفاق سے آیا ہو۔ اس نے بیگم زوار سے کہا۔ ''آنٹی آپ یہاں... خیریت تو ہے؟''

بیگم زوار نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ ''تم شامیر ہو نا نواب...... وقار الملک کے پوتے؟''

''جی آنٹی آپ نے ٹھیک پہچانا۔'' شامی نے نشست پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''آپ کی طبیعت کیسی ہے؟''

''سانس میں کچھ مسئلہ تھا مگر میں ٹھیک تھی۔ میں نے منع کیا تھا مگر قادر پھر بھی یہاں لے آیا۔''

''قادر کون... آپ کا کوئی رشتے دار ہے؟'' شامی انجان بنا۔

''نہیں۔'' بیگم زوار ہچکچائیں۔ ''ملازم ہے۔''
''آپ کے صاحبزادے تو ملک سے باہر ہیں۔''
''ہاں۔'' بیگم زوار اب کسی قدر بے چین نظر آنے لگیں۔ ''پتا نہیں قادر مجھے چھوڑ کر کہاں چلا گیا ہے؟''
''اگر آپ کہیں تو میں آپ کو چھوڑ دوں۔''
''نہیں نہیں، قادر بخش لے جائے گا۔'' انہوں نے جلدی سے کہا۔ ''تمہارا شکریہ بیٹے۔''
بیگم زوار کا انداز ایسا تھا جیسے اب وہ شامی کے جانے کی توقع کر رہی ہوں مگر وہ اس موقع سے فائدہ اٹھا رہا تھا۔ اس نے بات جاری رکھی۔ ''جب انکل زندہ تھے تو اکثر دادا جان سے ملنے آتے تھے اور دادا جان بھی ان سے ملنے جاتے تھے۔''
''ہاں اُس وقت کی بات اور تھی۔'' بیگم زوار کا لہجہ بدل گیا۔
''مجھے یاد ہے آنٹی آپ اس وقت بالکل ینگ لگتی تھیں اور دادا جان کہتے تھے کہ آپ نے کس بوڑھے سے شادی کر لی ہے۔''
ینگ نظر آنا ہر عورت کی کمزوری ہوتی ہے۔ بیگم زوار کا موڈ بھی بدل گیا۔ انہوں نے مسکرا کر کہا۔ ''تمہارے انکل عمر میں مجھ سے بیس سال بڑے تھے۔ اب بھی میری عمر اتنی نہیں ہے یہ تو بیماریوں نے حال کر دیا ہے۔''
''اب بھی آپ اپنی عمر سے کم ہی لگتی ہیں۔'' شامی نے کہا۔ ''دادا جان نے کئی بار آپ کے بارے میں پوچھا اور جب ہم نے آپ کی خیریت سے مطلع کیا تو وہ مطمئن ہو گئے۔''
''نواب صاحب بہت وضع دار آدمی ہیں۔''
''ہاں جب انہیں پتا چلا کہ آپ نے تمام ملازم نکال کر ایک آدمی کو رکھ لیا ہے تو وہ کچھ فکر مند ہوئے تھے کہ آج کل حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ تو وہ ملازم یہی قادر ہے؟''
بیگم زوار ایک بار پھر محتاط ہو گئیں۔ ''ہاں یہی ہے۔''
''اب آپ یہاں سے گھر جائیں گی؟''
''ظاہر ہے۔''
''لیکن جب میں یہاں آ رہا تھا تو ایک ڈاکٹر کہہ رہا تھا کہ آپ کو لانے والا آپ کو ایک دن کے لیے اسپتال میں رکھنے کا کہہ رہا تھا۔ اس نے بیگم زوار کہا تو میں چونکا اور تبھی یہاں آیا۔''
شامی کی بات نے بیگم زوار کو چونکا دیا مگر انہوں نے جلدی سے کہا۔ ''قادر میرے خیال سے کہہ رہا ہوگا۔''

''ہو سکتا ہے۔'' شامی نے کہا۔ ''آنٹی آج کل کا دور ایسا ہے کہ انسان اپنوں پر بھی بھروسا نہیں کر سکتا..... آپ ایک ملازم کے ساتھ رہ رہی ہیں۔ اگر کوئی مسئلہ یا پریشانی لاحق ہو تو آپ مجھے کال کر سکتی ہیں۔'' شامی نے کہتے ہوئے اپنا کارڈ ان کے ہاتھ میں تھما دیا۔ ''پلیز انکار مت کریں اور اسے سنبھال کر رکھیے گا۔ اس پر میرا موبائل نمبر بھی ہے۔''
بیگم زوار نے کارڈ ہاتھ میں دبا لیا۔ اسی لمحے باہر سے قادر بخش کے زور سے بولنے کی آواز آئی۔ ''جب میں نے کہا تھا کہ میں کونین لینے جا رہا ہوں تو انہیں ویٹنگ روم میں کیوں شفٹ کیا؟''
''خدا حافظ۔'' شامی نے آہستہ سے کہا۔ ''میری بات یاد رکھیے گا۔''
وہ اسپتال سے نکلا اور کار میں بیٹھ کر تیمور کو کال کی۔ اس کا دفتر جانے کا ارادہ بدل گیا تھا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ قادر بخش بیگم زوار کو کہاں لے جاتا ہے؟ تیمور نے کال ریسیو کی تو شامی نے اسے سنسنی خیز رپورٹ سے آگاہ کیا۔ تیمور بھی بے چین ہو گیا۔ اس نے شامی سے کہا۔ ''یہ تو معاملہ کچھ اور ہی لگ رہا ہے۔''
''مجھے بھی اور ہی لگ رہا ہے۔'' شامی نے کہا۔ ''قادر بخش صرف گل نار کے معاملے میں ولن نہیں ہے بلکہ یہ بیگم زوار اور ان کے معاملات پر جس طرح حاوی ہے، اس سے لگ رہا ہے کہ یہ کوئی بڑا گیم کھیل رہا ہے۔ مجھے تو بیگم زوار بھی اس سے دبی نظر آئیں۔''
''سوچنے کی بات ہے کہ آخر اس نے کیوں ایک دن کے لیے بیگم زوار کو اسپتال میں رکھنے کی بات کی۔''
''ہاں اور ڈاکٹر کے ساتھ خود بیگم زوار کا کہنا ہے کہ انہیں سانس کا مسئلہ ہے مگر ایسا نہیں تھا کہ انہیں اسپتال لایا جاتا۔ دوسرے لفظوں میں قادر بخش انہیں مجبور کر کے اسپتال لایا اور پھر یہاں ڈاکٹر کی مرضی کے خلاف ایک دن کے لیے ایڈمٹ کرانا چاہ رہا تھا۔ ڈاکٹر نے سختی سے انکار کر دیا۔ دیکھو اب وہ کیا کرتا ہے۔''
''تو کہاں ہے؟''
''اسپتال کے باہر۔''
''بس اس کے پیچھے لگا رہ۔'' تیمور نے کہا۔ ''خاصے دنوں بعد کوئی سنسنی ہاتھ لگی ہے۔''
''میں تو کہہ رہا ہوں کہ تو بھی آ جا۔''
''اگر قادر بخش بیگم زوار کو کہیں اور لے گیا تو میں آ جاؤں گا۔''

”یعنی بنگلے لے گیا تو تُو نہیں آئے گا؟“
”اس صورت میں میرا آنا بیکار ہوگا۔“ تیمور نے کہا۔
اسی لمحے اندر سے قادر بخش برآمد ہوا۔ اس کے ساتھ وہیل چیئر پر بیگم زوار تھیں اور وہیل چیئر اٹینڈینٹ چلا رہا تھا۔ وہ سڑک کے کنارے کھڑی کار تک آئے۔ یہ نئے ماڈل کی ہلکے زرد رنگ کی کرولا تھی۔ بیگم زوار کو اس میں بٹھا کر قادر بخش نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ کرولا کے آگے بڑھتے ہی شامی نے اپنی کار اس کے پیچھے لگا دی اور چند منٹ بعد اسے اندازہ ہوگیا کہ وہ بنگلے کی طرف ہی جا رہا تھا۔ شامی کو کسی قدر مایوسی ہوئی۔ اس نے خود کو تسلی دی کہ ممکن ہے قادر بخش کو کوئی جگہ نہ ملی ہو اور وہ مجبوراً بیگم زوار کو واپس لے جا رہا تھا۔ جب وہ اپنی گلی میں داخل ہوئے تو شامی وہیں سے واپس ہوگیا۔ اس کا دفتر جانے کا ارادہ نہیں تھا۔ اس کے بجائے اس نے شاہنواز کے دفتر کا رخ کیا۔ اگر شاہنواز نے ابھی تک قادر بخش کے بارے میں انکوائری نہیں کرائی تھی تو وہ اس کی موجودگی میں کرا سکتا تھا۔ اردلی شامی کو پہچانتا تھا اس لیے روکا نہیں۔ شاہنواز اسے دیکھ کر چونکا۔
”ایمرجنسی ہے؟“
”نہیں یار دفتر جانے کا موڈ نہیں تھا۔ تیمور نے جو کام دیا تھا اس کا بھی پتا کرنا تھا۔ اس لیے تمہارے پاس چلا آیا۔“
”کیا پیو گے؟“ شاہنواز نے پوچھا اور پھر چائے کے ساتھ فنگر چپس لانے کو کہا۔ شامی چونکا۔
”فنگر چپس؟“
”میرا چپراسی بناتا ہے اور کیا لاجواب بناتا ہے۔ جو ایک بار کھا لیتا ہے اگلی بار لازمی فرمائش کرتا ہے۔“ شاہنواز نے کہا۔ ”تصویر اور آئی ڈی کارڈ نمبر میں نے کرمنلز کے ریکارڈ روم میں بھیج دیا ہے۔ سارا ریکارڈ کمپیوٹرائزڈ ہوگیا ہے مگر ابھی تک وہاں سے جواب نہیں آیا ہے۔“
”یار جیک لگاؤ۔ ریکارڈ کمپیوٹرائزڈ ہوا ہے پر بندے تو وہی پرانے ہیں۔“
شاہنواز نے کال کر کے اپنی انکوائری کا پوچھا۔ اس کا لہجہ ماتحتوں سے بات کرتے ہوئے خالص افسرانہ تھا۔ وہ سول سروس سے آیا تھا اس لیے نیچے والوں کے لیے زیادہ ہی سرد بنتا تھا۔ فون رکھ کر اس نے گالی دی۔ ”سب حرام خور ہیں اور بہانے دس ہزار ہیں۔ شاید آدھے گھنٹے میں آ جائے۔“
”کوئی مسئلہ نہیں ہے اگر دیر ہوئی تو لنچ بھی تمہارے ساتھ کروں گا۔“
شاہنواز نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ ”اس کے لیے تمہیں گھر چلنا ہوگا۔ آج بیگم نے اسپیشل لنچ تیار کرایا ہے۔“
”اگر بھابی نے خود بنایا ہے تو معذرت، تم کھا لینا میں یہیں کسی ہوٹل میں گزارا کر لوں گا۔“
شاہنواز نے اسے گھورا پھر ہنس کر بولا۔ ”نہیں یار صدف کا ایک بھائی کرنل ہے اس کا خانساماں بہت اعلیٰ درجے کا شیف ہے۔ وہی لنچ بنانے آیا ہے۔“
”شکر ہے۔“ شامی نے اطمینان کا سانس لیا۔ ”تب چلوں گا۔“
”صدف کو پتا چلے گا تو پھر دیکھنا۔“
”سوری کر لوں گا۔“ شامی نے ڈھٹائی سے کہا۔ کچھ دیر بعد چائے اور گرما گرم فنگر چپس آ گئے۔ شاہنواز کا کہنا درست ثابت ہوا۔ شامی نے فائیو اسٹار ہوٹلوں میں بھی اس ذائقے کی فنگر چپس نہیں کھائے تھے۔ چائے ختم ہونے تک ریکارڈ روم سے جواب آ گیا۔ شاہنواز کی پھٹکار کا اثر یہ ہوا کہ خود ریکارڈ روم انچارج چلا آیا، اس نے دونوں چیزوں کے پرنٹ سامنے رکھے اور بولا۔
”سر ہمارے ریکارڈ میں دونوں چیزوں کے حوالے سے کوئی میچنگ نہیں ہے۔“
اس کے جانے کے بعد شامی نے پوچھا۔ ”یہاں صرف دارالحکومت کا ریکارڈ ہے یا...؟“
”اس پورے ڈویژن کا۔“ شاہنواز نے کہا۔ ”بندہ کلیئر ہے اب اصل بات بتاؤ۔“
شاید شاہنواز بھی فارغ تھا اور شامی نے اسے اصل کہانی سنانے میں حرج نہیں سمجھا۔ شاہنواز ہنستا رہا۔ ”میرے خدا تم لوگ کیسی کیسی حماقتوں میں ٹانگ اڑاتے ہو۔ میں نے فولاد خان کو دیکھا ہے۔ اچھا آدمی ہے اُسے سمجھاؤ۔“
شامی نے اسے گھورا۔ ”تم بھول رہے ہو کتنے مجرم ہماری وجہ سے پکڑے گئے اور کتنے کیس ہم نے حل کیے جو تمہاری پولیس حل نہیں کر سکی تھی۔ بہت سے معاملات تو سرے سے منظر عام پر آئے ہی نہیں۔ اور فولاد خان کو سمجھانا مشکل ہے ویسے بھی اس نے مدد مانگی ہے، سمجھ نہیں۔“
”ہاں یہ بھی ہے۔“ شاہنواز نے گھڑی دیکھی۔ ”چل یار وقت ہوگیا ہے۔ میں تو کہہ رہا ہوں کہ تیمور کو بھی بلا لو بہت دن سے اس کی صورت بھی نہیں دیکھی۔“

وہ روانہ ہوئے تو شامی نے تیمور کو کال کر دی۔ لنچ مینو سن کر وہ بھی مان گیا۔ البتہ تیمور کو یہ سن کر مایوسی ہوئی تھی کہ قادر بخش کا کوئی پولیس ریکارڈ نہیں ہے۔ صدف کی کچھ سہیلیاں بھی لنچ پر مدعو تھیں اور اصل میں دعوت ان ہی کی تھی۔ ان کے لیے الگ میز لگائی گئی تھی۔ وہ تینوں ڈرائنگ روم کی میز پر تھے۔ شاہنواز نے کہا۔ ''بہت سے مجرم ایسے ہوتے ہیں جن کا کوئی ریکارڈ نہیں ہوتا ہے۔ وہ جو کرتے ہیں وہ پولیس یا معاشرے کی گرفت میں نہیں آتا ہے اور وہ روزِ حساب تک کے لیے بچ جاتے ہیں۔''

''قادر بخش مشکوک آدمی ہے۔'' شامی نے کہا۔

''آخر وہ بیگم زوار کو ایک دن کے لیے اسپتال داخل کیوں کرنا چاہ رہا تھا؟''

''ممکن ہے وہ درست کہہ رہا ہو۔ بنگلے میں اسپرے کرنا ہو۔''

تیمور نے سر ہلایا۔ ''اس کا پتا چل جائے گا۔ میری کل نازیہ سے بات ہوئی ہے۔''

''نازیہ کون ہے؟'' شاہنواز نے پوچھا۔

''تیمور کی ایکس جی ایف۔'' شامی نے جواب دیا۔

''اب صرف ایف رہ گئی ہے۔''

''مجھے یاد ہے ابھی یہ او لیول میں تھا اور لڑکیاں اس کے آگے پیچھے گھومتی تھیں۔'' شاہنواز نے یاد کیا۔ ان تینوں نے ایک ہی اسکول سے اے لیول کیا تھا۔ شاہنواز ان سے آگے تھا جبکہ شامی اور تیمور ایک ہی کلاس میں رہے تھے۔ شامی ہنسا۔

''جیسے میں لڑکیوں کے آگے پیچھے ہوتا تھا۔''

تیمور بولا۔ ''میں نے نازیہ کو اشارتاً قادر بخش کے بارے میں بتایا ہے کہ وہ ذرا مشکوک ہے اور ہم اس پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔''

''اس نے پوچھا نہیں کس حیثیت سے؟''

''وہ ہمارے بارے میں جانتی ہے کہ ہم پرائے معاملات میں ٹانگ اڑاتے رہتے ہیں۔'' تیمور کے بجائے شامی نے جواب دیا۔ ''وہ بتا سکے گی کہ وہاں اسپرے ہوا ہے یا نہیں، کیونکہ اس قسم کے اسپرے سے پہلے پڑوسیوں کو بھی بتایا جاتا ہے۔ نہ بھی بتایا جائے تو دوا کی بو تو آ ہی جاتی ہے۔''

شاہنواز کو گل نار کے بارے میں سن کر افسوس ہوا تھا۔ ''ہمارے ہاں ابھی بھی یہ جہالت ہے۔ عورت کی خرید و فروخت کی جاتی ہے۔''

''اسے یہ لوگ اپنے رواج کا نام دیتے ہیں۔'' شامی نے تلخی سے کہا۔ ''ان کے نزدیک ملک، مذہب، کسی اور قانون کی حیثیت رواج سے بڑھ کر نہیں ہے اور دیکھا جائے تو ہر علاقہ ایسی ہی جہالتوں میں گھرا ہوا ہے۔ پورے ملک کا یہی حال ہے۔''

''ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' شاہنواز نے سر ہلایا۔ ''یہ عورت گل نار درست کہہ رہی ہے اپنے شوہر کے بارے میں؟''

''ابھی تک تو ہمیں بھی نہیں معلوم کہ قادر بخش سچ مچ کوئی جرائم پیشہ ہے یا عام آدمی ہے۔ بہت سے لوگ شکل سے ڈاکو قاتل نظر آتے ہیں لیکن حقیقت میں وہ شریف انسان ہوتے ہیں۔'' تیمور نے کہا۔

لنچ سچ مچ لاجواب تھا اور انہوں نے زیادہ ہی کھا لیا تھا اس لیے کھانے کے بعد وہ قیلولہ کے لیے وہیں ڈرائنگ روم میں لیٹ گئے تھے۔ پردے کھینچ دیے گئے تھے اور شاہنواز نے ہیٹر آن کر دیا تھا۔ شامی صوفے پر سو گیا اور تیمور شاہنواز سے گپ شپ کرتا رہا پھر اس نے پانچ بجے شامی کو جھنجوڑ کر اٹھایا۔ ''گھر نہیں چلنا ہے کیا ڈنر بھی نہیں کرنا ہے؟''

''میں تو کہہ رہا ہوں رک جاؤ۔ صدف کو افسوس ہو رہا ہے کہ تمہیں کمپنی نہیں دے سکی۔''

''پھر سہی یار۔'' شامی نے کوٹ پہنتے ہوئے کہا۔

''چائے تو پلوا دو سردی لگ رہی ہے۔''

''گھر چل کر۔'' تیمور نے اسے بازو سے پکڑ کر کھینچا۔ وہ کچھ عجلت میں لگ رہا تھا۔ شامی بادلِ ناخواستہ اس کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ دونوں الگ گاڑیوں میں تھے اس لیے کچھ دیر بعد تیمور نے کال کی۔ ''یار مجھے فولاد خان کی کال آئی تھی۔ اسے گل نار کا پیغام ملا ہے کہ گھر میں گڑبڑ ہے۔''

اب شامی سمجھا کہ تیمور کیوں عجلت میں روانہ ہوا تھا۔

''تو کیا ہم بیگم زوار کے پاس جا رہے ہیں؟''

''نہیں یار فی الحال تو ولا جا رہے ہیں۔'' تیمور نے کہا اور کال کاٹ دی۔ کچھ دیر بعد وہ ولا میں تھے۔ فولاد خان متفکر تھا، اس نے کہا۔

''ام کو اجنبی نمبر سے کال آیا۔ ادر سے گل نار اوتا، وہ بولا ادر کوچ گڑبڑ اے، بس اتنا بولا اور کال کٹ گیا۔ ام کیا تو نمبر بند نکلا۔''

''تمہیں یقین ہے کہ وہ گل نار ہی تھی۔''

''ام اس کا آواز آنکھ بند کر کے بی پی چان سکتا

اے۔'' فولاد خان نے یقین سے کہا۔ شامی نے فولاد خان سے نمبر لے کر چیک کیا۔ وہ بند تھا۔ اس دوران میں تیمور، نازیہ کو کال کر رہا تھا۔ وہ کچھ دیر اس سے بات کرتا رہا اور پھر اس نے شامی سے کہا۔

''نازیہ کا کہنا ہے کہ وہاں نہ کوئی اسپرے ہوا ہے اور نہ ہی کوئی گڑبڑ نظر آرہی ہے۔ بیگم زوار صبح ایمبولینس میں گئی تھیں اور کچھ دیر بعد واپس آگئی تھیں، اس کے بعد سے گھر سے کوئی نہیں نکلا ہے۔ جب سے مجھ سے بات ہوئی اس نے اپنے گیٹ کیپر کی ڈیوٹی لگادی ہے کہ وہ برابر والے بنگلے پر بھی نظر رکھے۔ اس کا کہنا ہے کہ نہ تو اندر سے کوئی نکلا ہے اور نہ ہی کسی گڑبڑ کے آثار نظر آئے ہیں۔''

شامی نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''جس کے ساتھ گڑبڑ ہوسکتی ہے وہ ایک بوڑھی کمزور عورت ہے۔ دوسری بھی عورت ہے وہ کمزور ہی نہیں قادر بخش کی بیوی بھی ہے گویا زیادہ کمزور ہے۔ اس صورت میں باہر والوں کو کیا پتا چلے گا کہ اندر کوئی گڑبڑ ہوگئی ہے۔''

''گل نار کی کال آنے کے بعد تم نے کیا کیا؟'' تیمور نے فولاد خان سے پوچھا۔ اس نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

''امارا دل تو کرتا کہ بدر منیر کی طرح نعرہ مارے اور قادر بخش کے پاس پونچ جائے مگر آپ کا اجازت کے بنا کیسے جا سکتا اے۔''

تیمور نے اس کا شانہ تھپکا۔ ''تم نے اچھا کیا، اب اس معاملے کو ہم خود دیکھ لیں گے۔''

''آپ کیا کرو گے؟'' فولاد خان نے پوچھا۔

شامی اور تیمور نے آپس میں مشورہ کیا۔ شامی کا خیال تھا کہ انہیں جا کر بیگم زوار کی خیریت دریافت کرنی چاہیے۔ مگر تیمور متردد تھا۔ اس نے کہا۔ ''اگر کچھ نہ نکلا تو ہم مشکل میں پڑ جائیں گے۔''

''یار جب گل نار نے کہا ہے تو کچھ نہ کچھ گڑبڑ ہوگی اور ہم کسی گڑبڑ کے لیے تھوڑی جائیں گے ہم بیگم زوار سے ملنے جائیں گے۔''

''وہ منع کر دے گا۔''

''تب ہم اصرار کریں گے۔'' شامی نے کہا۔ ''امید ہے بات زیادہ خراب نہیں ہوگی۔ اگر قادر بخش نے اپنے طور پر منع کیا تو ہم اسے دیکھ لیں گے۔''

تیمور نے سوچا اور سر ہلایا۔ ''چل یار۔''

وہ دونوں بیگم زوار کے بنگلے تک پہنچے تو گیٹ پر ہی قادر بخش موجود تھا۔ شامی نے اپنا تعارف نوابزادہ شامیر کے طور پر کرایا اور بیگم زوار سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ حسب توقع قادر بخش نے اکھڑ لہجے میں کہا۔ ''ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے وہ کسی سے نہیں مل سکتیں۔''

تیمور نے اسے گھورا۔ ''تم شاید نئے آئے ہو اور تمہیں معلوم نہیں ہے کہ اس خاندان سے ہمارے خاندان کے کتنے گہرے تعلقات ہیں۔ تم جا کر بیگم زوار کو مطلع کرو۔''

''مجھے آئے ہوئے دو سال ہو چکے ہیں۔'' اس نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ''اتنے گہرے تعلقات ہیں کہ میں نے آپ کو پہلی بار دیکھا ہے۔''

''میل ملاقات میں وقفہ آنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہمارا تعلق ختم ہو گیا ہے۔'' شامی نے بگڑ کر کہا۔ ''تم کس قسم کے ملازم ہو جو تمہیں آنے والے مہمانوں سے بات کرنے کی تمیز نہیں ہے۔ میں بیگم زوار سے تمہاری شکایت کروں گا۔''

قادر بخش سنجیدہ ہو گیا۔ اس نے کہا۔ ''میں معافی چاہتا ہوں اگر میری بات بری لگی ہو لیکن باقی میں نے ٹھیک کہا ہے۔ بیگم صاحبہ اس وقت کسی سے نہیں مل سکتیں۔ انہیں سانس کی تکلیف ہے۔ بات کرنا بھی مشکل ہے۔''

قادر بخش جھوٹ بول رہا تھا کیونکہ صبح شامی نے بیگم زوار سے اسپتال میں ملاقات کی تو وہ ٹھیک سے بات کر رہی تھیں۔ ''اگر وہ زیادہ بیمار ہیں اور مل نہیں سکتی ہیں تو ہم ان کو ایک نظر دیکھنا چاہیں گے تاکہ ہمیں اطمینان ہو جائے کہ وہ ٹھیک ہیں۔''

اچانک تیمور نے کہا۔ ''تم کیا سمجھ رہے ہو ہم خود چلے آئے ہیں۔ ہمیں افسر نے بھیجا ہے۔''

افسر، زوار صاحب کے بیرونِ ملک جا کر بس جانے والے بیٹے کا نام تھا۔ قادر بخش چونکا۔ ''صاحب نے مگر کیوں؟''

''اسے اپنی ماں کی فکر ہے۔''

''تو وہ کال کر کے پوچھ سکتے ہیں، آپ سے کہنے کی کیا ضرورت ہے؟''

''کال پر بیگم زوار کی آواز آتی ہے وہ ان کی حالت نہیں دیکھ سکتا اس لیے ہمیں کہا ہے۔'' تیمور نے زور دے کر کہا۔ ''تم سمجھ سکتے ہو کہ وہ اپنی ماں کی طبیعت کے لیے کتنا فکر مند ہے۔''

قادر بخش کچھ دیر انہیں دیکھتا رہا۔ پھر اس نے کہا۔

''میں بیگم صاحب کو بتاتا ہوں اگرچہ ان کو یہ بات پسند نہیں آئے گی۔''

قادر بخش جانے لگا تو شامی نے اسے روکا۔ ''کیا ہم یہیں کھڑے رہیں گے؟''

''میں آپ کو نہیں جانتا ہوں۔'' اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''میری ذمے داری ہے میں کسی اجنبی کو اندر نہ آنے دوں۔''

وہ گیٹ بند کر کے چلا گیا۔ شامی نے آہستہ سے کہا۔ ''میری چھٹی حس کہہ رہی ہے کہ گڑبڑ زیادہ ہے۔ ہمیں کچھ کرنا ہوگا۔''

''ہم کیا کر سکتے ہیں؟''

تیمور نے پوچھا تو شامی نے گیٹ چیک کیا، وہ کھلا ہوا تھا۔ شامی نے تیمور کی طرف دیکھا تو اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''دن دہاڑے ٹریس پاس مروا دے گا۔''

''یار ڈرتا کیوں ہے۔'' شامی نے کہا اور اندر داخل ہو گیا۔ تیمور اس کے پیچھے تھا۔ اس نے پوچھا۔

''اندر آنے کا کیا جواز پیش کریں گے؟''

''کہہ دیں گے کہ اندر سے چیخ سنائی دی تھی۔'' شامی نے اطمینان سے کہا۔ طویل روش کے بعد کار پورچ تھا۔ وہ پورچ کے پاس پہنچے تھے کہ اندر سے قادر بخش نکل آیا۔ انہیں اندر دیکھ کر اس کا منہ کھلا رہ گیا پھر اس نے تیز لہجے میں کہا۔

''یہ کیا حرکت ہے، آپ اندر کیوں آئے؟''

''ہمیں اندر سے چیخ سنائی دی اس لیے اندر آئے۔'' شامی نے بدستور آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ ''ایسا لگا جیسے کوئی عورت چیخی ہو۔ اب ہمیں بیگم زوار کی خیریت کی زیادہ فکر ہے۔ تم ہمیں ان تک لے چلو۔''

قادر بخش نے بپھر کر کہا۔ ''آپ باہر جائیں ورنہ میں پولیس کو کال کرتا ہوں۔''

''تم کیا میں خود پولیس کو کال کرتا ہوں۔'' تیمور نے موبائل نکالتے ہوئے کہا۔ ''ہمیں شبہ ہے کہ بیگم زوار خیریت سے نہیں ہیں۔''

''تم لوگ زبردستی اندر آئے ہو۔'' قادر بخش کے لہجے میں تبدیلی نہیں آئی تھی ۔ ''جب پولیس آئے گی تو خود دیکھ لے گی کہ بیگم صاحبہ کیسی ہیں۔''

''پولیس ہمیں کچھ نہیں کہے گی کیونکہ ہم افسر کے کہنے پر آئے اور وہ اس گھر کا مالک ہے۔''

''اس گھر کی مالک بیگم صاحبہ ہیں۔'' قادر بخش کی اکڑ میں ذرا بھی کمی نہیں آئی۔ تیمور نے بلف کیا تھا مگر جب بات عزت پر آنے لگی تو اس نے مجبوراً موبائل پر شاہنواز کا نمبر ملانا چاہا تھا کہ دروازے کی طرف سے بیگم زوار کی آواز آئی۔

''قادر بخش یہ کیا ہو رہا ہے، کون شور کر رہا ہے۔'' وہ دروازے سے نکل کر آئیں تو ان دونوں کو دیکھ کر چونکیں۔ ''آپ؟''

شامی آگے بڑھا۔ ''آپ کی فکر تھی اور دیکھنے آئے تھے مگر یہ آنے نہیں دے رہا تھا۔'' اس نے قادر بخش کی طرف اشارہ کیا۔

''بیگم صاحبہ یہ میرے منع کرنے کے باوجود زبردستی گیٹ سے اندر چلے آئے اور اب اندر جانے پر اصرار کر رہے تھے۔''

''آپ دونوں نے ٹھیک نہیں کیا۔'' بیگم زوار نے ان کی طرف دیکھا تو وہ شرمندہ ہو گئے۔ انہیں اندازہ نہیں تھا کہ بیگم زوار ایک ملازم کے مقابلے میں انہیں قصور وار قرار دیں گی۔ شامی نے آہستہ سے کہا۔

''آنٹی میں نے کہا نا ہم آپ کی طرف سے فکرمند تھے۔''

''میرا خیال ہے آپ کی تسلی ہو گئی ہے۔'' بیگم زوار کا لہجہ کسی قدر روکھا ہو گیا۔ قادر بخش نے موقع سے فائدہ اٹھا کر کہا۔

''بیگم صاحبہ یہ افسر صاحب کا نام بھی لے رہے تھے کہ انہوں نے انہیں آپ کی خیریت پوچھنے بھیجا ہے۔''

''افسر۔'' بیگم زوار نے حیرت سے کہا۔ ''اسے برسوں سے خود ماں کی خیریت دریافت کرنے کی توفیق نہیں ہوئی ہے اور وہ تم سے کہہ رہا ہے کہ میری خیریت معلوم کرو۔''

شامی مزید شرمندہ ہو گیا۔ ''اس غلط بیانی کے لیے معذرت خواہ ہیں آنٹی، اصل مقصد آپ کے بارے میں اطمینان کرنا تھا۔ وہ ہو گیا ہے اب اجازت دیں۔''

تیمور کا خیال تھا کہ انہیں مزید بے عزتی کا سامنا کرنا پڑے گا مگر خلاف توقع بیگم زوار نے سر ہلایا۔ ''تم دونوں اچھے بچے ہو۔ ہمارے خاندانی تعلقات ہیں لیکن دوسروں کے معاملات میں ایک حد سے زیادہ دخل نہیں دینا چاہیے۔''

''ایک بار پھر معذرت چاہوں گا۔'' شامی بولا۔ ''یہ میری غلطی تھی۔''

اب بیگم زوار کو خیال آیا۔ ''میری طرف سے بھی

معذرت کہ طبیعت ٹھیک نہیں ہے ورنہ تمہیں اندر بلاتی۔ میری طرف سے نواب صاحب کی مزاج پرسی کرنا۔''

وہ قادر بخش کی نگرانی میں باہر آئے جس نے ان کے باہر نکلتے ہی گیٹ زور سے بند کیا تھا اور تیمور نے گنگنا کر کہا۔

''بہت بے آبرو ہو کر تیرے کوچے سے ہم نکلے۔''

''یار کون سا پہلی بار نکلے ہیں۔'' شامی نے اپنی خودی بلند رکھی۔ ''ہمارے ساتھ آئے دن ایسا ہوتا ہے۔ خاص طور سے جب ہم کسی معاملے میں دخل دیتے ہیں۔''

''اب مجھے بھی یقین ہو گیا ہے کہ قادر بخش گڑبڑ کر رہا ہے۔'' تیمور نے کار کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

''مجھے تو بیگم زوار کے رویے پر حیرت ہے۔ یہ بہت مہذب خاندان ہے اور ان کا ملازم آنے والوں سے یوں بدتمیزی کرے۔''

''دیکھا جائے تو غلطی ہماری بھی ہے مگر بیگم زوار نے واقعی قادر بخش کو کچھ نہیں کہا۔''

جب تک وہ بنگلے میں رہے انہیں گل نار یا کسی اور فرد کی جھلک بھی نظر نہیں آئی تھی۔ آخر گل نار نے کس حوالے سے کہا تھا کہ گڑبڑ ہے؟ جب وہ واپس آئے اور فولاد خان نے ان سے بے تابی سے پوچھا۔ ''اور سب ٹھیک اے گل نار ٹھیک اے؟''

''گل نار نظر نہیں آئی لیکن بیگم زوار ٹھیک ہیں۔''

فولاد خان کا چہرہ پریشانی کی آماجگاہ بن گیا۔ ''آپ فرماتے او سب ٹھیک اے تو گل نار کدرا اے؟''

اس بار شامی اور تیمور بھی چونکے تھے۔ واقعی گل نار کہاں تھی؟ اس نے کسی گڑبڑ کا کہنے کے لیے کال کی تھی اور اس کے بعد وہ نمبر بند ہو گیا جس سے کال کی تھی۔ شامی اور تیمور بیگم زوار کی خیریت دریافت کرنے میں الجھے ہوئے تھے اور ان کا ذہن اس طرف گیا ہی نہیں کہ گل نار کے ساتھ بھی گڑبڑ ہو سکتی ہے۔ مگر شامی نے یہ بات فولاد خان کو کہنے کے بجائے اسے تسلی دی۔ ''فکر مت کرو یار سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ہم قادر بخش کے پیچھے پڑ گئے ہیں اور جلد اسے کسی نہ کسی چکر میں پھانس لیں گے۔''

''پر گڑبڑ تو ابی اے۔''

''یار ہم اچھی طرح دیکھ کر آئے ہیں۔ گل نار کہیں اندر ہو گی۔'' تیمور نے بھی اسے تسلی دی اور وہ اندر آ گئے۔

.... فولاد خان انہیں مایوسی سے جاتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ آج بھی آسمان پر بادل تھے اور ایسا لگ رہا تھا کہ بارش ہو گی۔ سردی کی شدت میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ چھ بجتے ہی بارش شروع ہو گئی۔ شامی اپنا موبائل کار میں بھول آیا تھا، وہ لینے گیا تو اسے لگا جیسے آسمان سے پگھلی ہوئی برف گر رہی ہے۔ ایک منٹ میں اس کا حال ایسا برا ہوا تھا کہ وہ خاصی دیر فین ہیٹر کے سامنے بیٹھا تب کہیں جا کر اس کے حواس بحال ہوئے تھے۔ اس نے سوچ لیا کہ ڈنر کے بعد وہ بستر میں گھسے گا تو اگلی صبح سے پہلے نہیں نکلے گا۔ نواب صاحب کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اس لیے وہ ڈنر کی میز پر نہیں تھے۔ تیمور نے اسے اطلاع دی۔

''پھپھو اور شمی آ رہے ہیں۔''

شامی نے گھبرا کر کہا۔ ''آفت کی پرکالہ۔''

ثمیرا عرف شمی ان کی چھوٹی کزن تھی۔ تین سال پہلے پھپھو حمیرا بھائی کے پاس لندن چلی گئی تھیں۔ شمی اس وقت بارہ سال کی تھی۔ درمیان میں پھپھو تو آتی رہی تھیں مگر تعلیمی مجبوری کی وجہ سے شمی نہیں آئی تھی۔ ان کی اس سے فون اور اسکائپ پر ہیلو ہائے ہوتی رہی تھی۔ تیمور مسکرایا۔ ''آفت مستقل آ رہی ہے۔''

''اس کی تعلیم؟''

''اس نے وہاں اے لیول کر لیا ہے اب باقی تعلیم یہاں حاصل کرے گی۔'' تیمور نے بتایا۔ ''دراصل دادا جان کی طبیعت کی وجہ سے پھپھو واپس آ رہی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ دادا جان کی دیکھ بھال کے لیے کسی ایک اولاد کا یہاں رہنا ضروری ہے۔ میں تو کہتا ہوں کہ اچھی بات ہے گھر میں رونق ہو جائے گی۔''

''یار شمی کو جانتا نہیں ہے۔'' شامی کی فکر کم نہیں ہوئی تھی۔ ''اب تو بڑی ہو کر اور زیادہ خطرناک جاسوس ہو جائے گی۔''

''ہو سکتا ہے وہ چینج ہو گئی ہو اور بچپن والی حرکتیں چھوڑ دی ہوں۔''

''مشکل ہے، ایسی حرکتیں آسانی سے نہیں چھوٹتی ہیں۔'' شامی نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میرے لیے وہ دوسری نوشی سے کم نہیں ہو گی۔''

''نوشی تیری منگیتر ہے۔'' تیمور نے ملامت سے کہا۔ ''شمی کو اس سے کہاں ملا رہا ہے؟''

''میرا اشارہ اس کی جاسوس فطرت کی طرف ہے۔'' شامی کھسیا گیا۔

''خیر چھوڑ... یہ دیکھ کہ اب قادر بخش والے معاملے کا کیا کرنا ہے۔ پولیس میں اس کا کوئی ریکارڈ نہیں ہے۔''

''اسے شراب نوشی کے الزام میں پکڑا جا سکتا ہے۔''

''اس کے لیے ضروری ہے کہ اس کے پاس سے شراب برآمد ہوا اور وہ نشے میں ہو۔''

''یہ کام گل نار کرسکتی ہے۔'' شامی نے کہا۔ ''اس نے بتایا ہے کہ قادر بخش رات کو یہ شغل کرتا ہے۔''

تیمور کے انداز میں اب دلچسپی نہیں تھی۔ ''یار سچی بات ہے مجھے یہ بیل منڈے چڑھتی نظر نہیں آرہی ہے۔ گل نار کی جان قادر بخش سے چھوٹ گئی تو وہ فولاد خان کو بھی ڈبل کراس کرسکتی ہے۔ مجھے تو لگ رہا ہے اس نے قادر بخش سے جان چھڑانے کے لیے فولاد خان کو پھانسا ہے۔ ورنہ اس میں کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں۔''

''لگ تو ایسا ہی رہا ہے۔'' شامی نے اعتراف کیا۔ ''مگر یار فولاد خان نے زندگی میں پہلی بار ہم سے مدد چاہی ہے تو اسے مایوس نہیں کرسکتے۔ جہاں تک ہمارے بس میں ہوا ہم کریں گے۔ آخر وہ اس خاندان کا نمک خوار ہے۔''

''بس اسی وجہ سے میں تیرے ساتھ ہوں۔''

ڈنر کے بعد شامی اپنے کمرے میں آگیا تھا۔ وہ ہیٹر فین آن کر کے گیا تھا اس لیے کمرا معقول حد تک گرم تھا۔ اس نے باورچی سے کہہ دیا تھا کہ آدھے گھنٹے بعد اسے کافی پہنچا دے۔ رات کے نو بج رہے تھے۔ وہ ٹی وی دیکھتے ہوئے کافی پی رہا تھا کہ نوشی کی کال آگئی۔ شامی نے برا سامنہ بنایا۔ پہلے اس نے سوچا کہ ریسیو نہ کرے مگر پھر اس نے کال ریسیو کرلی اور خراب لہجے میں بولا۔ ''کیا بات ہے؟''

''ٹھیک سے بات کرو۔'' نوشی غرائی۔ ''میں تمہاری نوکر نہیں ہوں جو اس طرح سے بات کررہے ہو۔''

''نوکروں سے تو میں بہت تمیز سے بات کرتا ہوں۔'' شامی نے دانت بھینچ کر کہا۔ ''کہو کس لیے کال کی ہے؟''

''فولاد خان کو تم نے کہیں بھیجا ہے؟''

''میں نے؟'' شامی نے حیرت سے کہا۔ ''نہیں تو۔''

''وہ اس خوفناک برف جیسی بارش میں بغیر کسی چھتری کے کہیں جارہا تھا۔ میں واپس آرہی تھی کہ میں نے اسے جاتے دیکھا۔ یہ دومنٹ پہلے کی بات ہے۔''

''ایسا کیسے ہوسکتا ہے۔ فولاد خان کسی صورت اپنی ڈیوٹی چھوڑ کر نہیں جاسکتا ہے۔ تمہیں غلط فہمی ہوئی ہوگی؟''

''میں فولاد خان کو پہچانتی نہیں ہوں کیا؟'' نوشی نے خفگی سے کہا۔ ''وہ فولاد خان ہی تھا۔''

اس گفتگو کے دوران میں شامی اٹھ کر کھڑکی تک آیا اور اس نے پردہ سرکا کر دیکھا تو اسے چوکی میں روشنی نظر آئی۔ اگر فولاد خان ذرا دیر کے لیے بھی کہیں جاتا تھا تو لائٹ بند کر کے جاتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اگر وہ لائٹ کھلی چھوڑ کر جائے گا تو یہ نواب صاحب کی نمک حرامی ہوگی اور وہ نمک حرام نہیں تھا۔ شامی نے کہا۔ ''لائٹ آن ہے، وہ چوکی میں ہے۔''

''میرے خدا میں کیسے یقین دلاؤں وہ فولاد خان ہی تھا۔''

''معاف کرو بی بی۔'' شامی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''تم پہلے ہی مجھے بے وقوف بنا چکی ہو۔ وہی کافی ہے۔''

''جہنم میں جاؤ تم اور فولاد خان دونوں۔'' نوشی نے کہہ کر کال کاٹ دی۔ شامی اب تشویش محسوس کررہا تھا۔ اگر نوشی مذاق کررہی ہوتی تو ایسا ردعمل نہ دیتی۔ اس نے انٹرکام اٹھایا مگر اس سے ٹون نہیں آرہی تھی۔ وہ جھنجلا گیا۔ ابھی تو کام کررہا تھا اور اب ڈیڈ ہوگیا تھا۔ اس نے سوچا اور اپنی جیکٹ اور گرم شوز پہن کر باہر آیا۔ اسٹینڈ سے چھتری لے کر وہ باہر نکلا اور گیٹ کے ساتھ چوکی تک آیا۔ اس نے دروازہ کھولا تو چوکی خالی تھی۔ فولاد خان وہاں نہیں تھا۔ احتیاطاً اس نے چوکی کے ساتھ باتھ روم میں بھی جھانک لیا۔ فولاد خان وہاں بھی نہیں تھا۔ ولا کے عقب میں اس کا ایک کمرے کا کوارٹر تھا مگر وہ وہاں صرف نہانے دھونے اور کپڑے بدلنے کے لیے جاتا تھا ورنہ اس کا سارا ہی وقت اپنی چوکی میں گزرتا تھا جہاں اس کے لیے سونے اور کھانے پینے کا انتظام تھا۔ خاص بات یہ تھی کہ چھوٹے گیٹ کی کنڈی کھلی ہوئی تھی اور وہ خود بہ خود بند ہوجانے والے لاک سے بند تھا۔ فولاد خان کنڈی بھی لگا کر رکھتا تھا۔ احتیاطاً شامی اس کے کوارٹر تک چلا آیا اور اس پر تالا لگا ہوا تھا۔ تیمور اپنے موبائل پر کسی سے مصروفِ گفتگو تھا کہ شامی کو آتا دیکھ کر اس نے جلدی سے کہا۔

''اوکے میں پھر بات کروں گا بائے۔'' اس نے کال کاٹ کر شامی سے کہا۔ ''خیریت، کوئی بھوت دیکھ لیا ہے۔''

''فولاد خان گیٹ سے غائب ہے نوشی نے اسے کہیں جاتے دیکھا ہے اور اس کا کہنا ہے وہ بارش میں بھیگتا ہوا گیا ہے۔''

''یہ ناممکن ہے۔'' تیمور بھی مضطرب ہوگیا۔

''مگر اس وقت ہوگیا ہے میں ہر جگہ دیکھ آیا ہوں۔'' شامی نے کہا۔ ''مجھے لگ رہا ہے وہ۔۔۔''

''بیگم زوار کی کوٹھی کی طرف گیا ہے۔'' تیمور نے اس

کا جملہ مکمل کیا۔ ''مگر کیوں؟''

اس سوال کا جواب شامی کے ذہن میں الہام کی طرح آیا تھا۔ ''اگر تو فولاد خان ہوا اور تجھے گل نار کی ایمرجنسی کال موصول ہو تو کیا تو دوڑا نہیں جائے گا؟''

''بالکل دوڑا جاؤں گا۔'' تیمور نے تسلیم کیا۔

''تب یقین کر اسے گل نار کی کال ملی ہوگی اور وہ عقل اور موسم کو بالائے طاق رکھ کر دوڑا گیا ہوگا۔''

''یہ تو مسئلہ بن جائے گا۔'' تیمور نے کہا۔ ''اب کیا کریں؟''

''تیار ہو جا ہم اس کے پیچھے جاتے ہیں اور اس سے پہلے وہ کوئی حماقت کرے، اسے واپس لاتا ہے۔''

تیمور موسم کے خراب تیور کی وجہ سے تامل کر رہا تھا مگر جب شامی نے نواب صاحب کے خراب ترین تیوروں کا کہا تو وہ تیار ہو گیا۔ شامی نے جوتے پہنے اور برساتی اٹھالی۔ تیمور بھی پوری تیاری کے ساتھ آیا تھا۔ اس نے فولاد خان کو کال کی تھی۔ اس کے موبائل پر بیل جا رہی تھی مگر وہ ریسیو نہیں کر رہا تھا۔ جب وہ گاڑی لے کر گیٹ کے پاس پہنچے اور شامی اتر کر گیٹ کھول رہا تھا تو تیمور نے فولاد خان کے موبائل کی بیل چوکی سے سنی۔ اس نے شامی کو بتایا اور وہ اندر گیا تو اسے موبائل بستر کے کونے میں دیوار سے اٹکا ہوا ملا تھا ایسا لگ رہا تھا کہ فولاد خان نے اسے عجلت میں پھینکا تھا۔ شامی نے چیک کیا تو اسی نمبر سے کال آئی ہوئی تھی اور اسے پندرہ منٹ سے زیادہ نہیں گزرے تھے۔ شامی نے تیمور کو موبائل دکھایا۔ ''وہ اسے یہیں چھوڑ گیا ہے، اپنی عقل کے ساتھ۔ پندرہ منٹ پہلے اسی نمبر سے کال آئی تھی جسے گل نار نے پہلے بھی کال کے لیے استعمال کیا تھا۔''

''چل دیر نہ کر۔'' تیمور نے کہا۔ ''پندرہ منٹ بہت ہوتے ہیں۔''

گاڑی باہر نکلنے پر شامی نے گیٹ بند کیا۔ اسے نظام دین کی فکر بھی تھی کہ کہیں یہ کارروائی اس کے علم میں نہ آ جائے اور صبح سویرے ان کی کلاس ہو مگر بارش اور سردی کی وجہ سے امید تھی کہ نظام دین سمیت سب اپنے اپنے کمروں میں دبکے ہوں گے اور اس کا امکان کم ہی تھا کہ کوئی باہر نکلے۔ تیمور جھنجلا رہا تھا۔ ''اسے ہم سے بات کرنی چاہیے تھی اس طرح جذباتی ہو کر دوڑا کیوں گیا؟''

''یار جب عورت کا معاملہ ہو تو آدمی کی عقل یونہی گھاس چرنے چلی جاتی ہے۔ گھر کے بالکل سامنے مت روکنا۔''

تیمور نے کار بیگم زوار کے گھر سے کچھ فاصلے پر مخالف سمت والی طرف روکی تھی۔ شامی نے اس سے وہیں رکنے کو کہا اور خود کار سے اتر کر سائڈ سے ہوتے ہوئے گیٹ تک آیا۔ نزدیک جا کر اس نے اندر جھانکا تو اسے اندر کوئی نظر نہیں آیا۔ پورچ اور دوسری لائٹس آن تھیں اور سب کچھ صاف نظر آ رہا تھا۔ بڑا اور چھوٹا گیٹ دونوں اندر سے بند تھے۔ شامی سوچ رہا تھا کہ اگر فولاد خان یہاں آیا تھا تو اندر کیسے گیا؟ چار دیواری اونچی تھی مگر کوشش کی جاتی تو گیٹ کے اوپر سے اندر جا سکتے تھے۔ وہ واپس آیا اور تیمور سے کہا۔ ''آس پاس اور اندر کوئی نہیں ہے۔ فولاد خان بھی اگر اسی طرف آیا ہے تو وہ اندر ہی ہوگا۔''

''لعنت ہو۔'' تیمور نے کہا۔ ''بیل بجاؤ۔''

''میرے خیال میں یہ مناسب نہیں ہوگا۔'' شامی نے کہا۔ ''اگر فولاد خان اندر ہے اور اتنی خاموشی ہے تو اس کا مطلب ہے کہ گڑبڑ زیادہ ہے۔''

''پولیس؟''

''نہیں ہمیں خود جانا ہوگا۔'' شامی نے کہا۔ ''اگر فولاد خان کسی چکر میں آ گیا ہے تو پولیس کو بلانا عقل مندی نہیں ہوگی۔ ایسا نہ ہو کہ معاملہ الٹا گلے پڑ جائے۔ پولیس کی خیر ہے مگر دادا جان تک بات نہ جائے اس لیے جو کرنا ہے، ہمیں خود کرنا ہے۔''

تیمور نے سوچا اور ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ ''بعض اوقات انسان کو رواداری بھی مروا دیتی ہے۔''

''اسی کا نام زندگی ہے۔'' شامی نے فلسفیانہ انداز میں کہا اور کار کی ڈکی کھولنے کا کہا۔ تیمور نے ڈکی کھولی اور جب تک وہ نیچے اترا وہ ڈکی بند کر چکا تھا۔ تیمور نے پوچھا نہیں کہ اس نے ڈکی کیوں کھلوائی تھی۔ اس کا ذہن فولاد خان کی حرکت اور اب اس کی گم شدگی میں الجھا ہوا تھا۔ بارش اتنی تیز تھی کہ گلی میں آن تیز اسٹریٹ لائٹس بھی روشنی کرنے میں ناکام ہو رہی تھیں۔ وہ بیگم زوار کے بنگلے کے گیٹ تک آئے۔ شامی نے تیمور سے کہا۔ ''اندر جا کر چھوٹے گیٹ کی کنڈی کھول دے۔''

تیمور مجبوراً اندر گیا اور اس نے کنڈی کھولی۔ شامی نے اندر آتے ہی کنڈی پھر بند کر دی اور وہ سائڈ پر لگی باڑھ کی آڑ لیتے ہوئے بنگلے کی طرف بڑھے۔ تیمور نے سرگوشی کی۔ ''یہاں زیادہ ہی خاموشی نہیں ہے؟''

''کہاں بارش کا اتنا شور تو ہے۔'' شامی نے نارمل آواز میں کہا۔

''میرا اشارہ انسانی سرگرمیوں کی طرف ہے۔''

''وہ بھی بنگلے کے اندر ہوگی۔ اس موسم میں سارے دروازے کھڑکیاں بند ہوتے ہیں۔ باہر سے کیا پتا چلے گا۔''

وہ داخلی دروازے تک آئے۔ کسی زمانے میں گول آرچ تلے بنے داخلی دروازے کے سامنے برآمدے کے ستونوں پر بیلیں ہوتی تھیں اور یہاں کی خوب صورتی دیکھنے والی ہوتی تھی مگر اب ایسا لگ رہا تھا کہ بہت عرصے سے یہاں کی ٹھیک سے دیکھ بھال نہیں ہو رہی ہے۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ تیمور نے پوچھا۔ ''اب کیا کریں؟''

''تو دائیں طرف سے جا میں بائیں طرف جاتا ہوں۔ دروازے چیک کر شاید کوئی کھلا مل جائے۔''

تیمور سر ہلا کر دائیں طرف بڑھ گیا اور شامی نے بائیں طرف کا رخ کیا تھا۔ بنگلے کی کھڑکیوں پر گرل تھی۔ اگر کوئی کھڑکی کھلی ہوتی تب بھی وہ اندر نہیں جا سکتے تھے۔ شامی چلتا ہوا بائیں طرف آیا جہاں چھوٹا باغ تھا اور اس کے پاس سرونٹ کوارٹرز بنے ہوئے تھے۔ دو کوارٹرز تاریک تھے اور صرف ایک میں روشنی تھی۔ اس طرف ایک دروازہ تھا جو اندر سے بند تھا۔ شامی سوچ رہا تھا کہ اب کیا کرے۔ عمارت دو منزلہ تھی اوپر کئی بالکونیاں اور ایک کھلا ٹیرس تھا مگر اس تک رسائی آسان نہیں تھی۔ روشن کوارٹر یقیناً قادر بخش کا تھا۔ شامی نے سوچا اور اس طرف بڑھ گیا۔ کوارٹر کے آگے چھوٹی سی چار دیواری تھی جس میں سنگل پٹ والا دروازہ تھا اور وہ کھلا ہوا تھا۔ شامی اندر آیا۔ کوارٹر کے اندر روشنی تھی مگر کوئی آواز یا حرکت محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ شامی نے دروازے پر زور ڈالا تو وہ آسانی سے کھل گیا۔ کوارٹر آگے پیچھے دو کمروں پر مشتمل تھا۔

سامنے والا کمرا نشست گاہ کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ یہاں اعلیٰ درجے کا مگر چھوٹا صوفہ سیٹ اور فرش پر دبیز قالین تھا۔ دوسرا سامان بھی بہت اعلیٰ درجے کا تھا اور کمرا چھوٹا ہونے کے باوجود کسی سرونٹ کوارٹر کا حصہ نہیں لگتا تھا۔ شامی نے چند لمحے سن گن لی اور پھر بیڈ روم کی طرف بڑھا۔ وہ نزدیک آیا تو اسے لگا کہ اندر کوئی بول رہا ہو مگر الفاظ سمجھ سے باہر تھے۔ اس نے بنا آواز کے دروازہ کھولا تو اسے سامنے بیڈ پر گل نار اس حالت میں دکھائی دی کہ اس کے جسم پر بہت کم لباس تھا۔ بیڈ شیٹ پر جا بہ جا خون کے دھبے تھے۔ گل نار کے دونوں ہاتھ پشت کی طرف بندھے ہوئے تھے اور اسی طرح اس کے پیروں میں رسی بندھی تھی۔ اس کا منہ کپڑا ٹھونس کر بند کیا ہوا تھا اور یہ کپڑا اس کی پھٹی قمیص کا

جوتا

اکثر لوگوں کو جوتا بدل بھائی بننے کا شوق ہوتا ہے۔ وہ مسجد سے واپسی پر ایک پیر میں اپنا جوتا اور دوسرے میں کسی اور کا جوتا پہن لیتے ہیں اور یوں کسی انجانے بھائی کے جوتا بدل بھائی بن جاتے ہیں۔

ہمارے یہاں اکثر نوجوان اپنی ڈگریاں ہاتھ میں لیے نوکری کی تلاش میں جوتے چٹخاتے پھرتے ہیں مگر پھر بھی ان کو بغیر سفارش کے نوکری ملتی نہیں اس لیے کہ وہ اعلیٰ عہدے داروں کے جوتے سیدھے نہیں کرتے۔ جوتوں کی بھی اپنی آوازیں ہوتی ہیں جن کو صرف سن کر اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ مثلاً کھٹ کھٹ کھٹ کی آواز بتاتی ہے کہ خاتون سینڈل پہن کر گزری ہے۔ گھسڑ گھسڑ کی آواز سے سمجھ جایئے دادی دروازے سے گزری ہیں۔ ان کے پیروں میں جو درد رہتا ہے۔ ارے یہ کیا ٹک کی آواز آئی ہے۔ اگلا قدم غائب پھر ٹک کی آواز آئی۔ بھلا یہ کون ہے دیکھا تو منا بھائی ایک جوتا پہنے چلا آ رہا ہے۔

گو کے جوتوں کے دانت نہیں ہوتے مگر یہ آپ کو کاٹ بھی سکتے ہیں۔ کبھی کبھی یہ اس وقت کاٹتے ہیں جب آپ اپنی پسند کا جوتا پہن کر دکان دار سے اس کی قیمت پوچھتے ہیں۔ قیمت سنتے ہی آپ کا من پسند جوتا آپ کو کاٹنے کو دوڑتا ہے۔ حکمران طبقہ غریب عوام کو حقیر سمجھتا ہے اور اسے پاؤں کی جوتی سمجھ کر بہت برا سلوک کرتا ہے مگر حکمران نمرود کے انجام کو یاد رکھیں۔

لودھراں سے محمد انعام کی تحقیق

شاگرد (انگریزی کے استاد سے): ''سر چقندر کی انگریزی بتادیں۔''

استاد: ''چقندر کو تو چھوڑو۔''

شاگرد: ''گاجر کی بتادیں۔''

استاد: ''کل بتادوں گا۔''

شاگرد: ''سر مٹر کی بتادیں۔''

استاد: میں نے انگلش میں ایم اے کیا ہے... سبزیوں میں نہیں۔''

محمد انعام لودھراں سے

ایک ٹکڑا تھا۔ وہ ناک سے آوازیں نکال رہی تھی۔ شامی تیزی سے اس کی طرف لپکا۔ اس نے گل نار کا ہاتھ کھولتے ہوئے پوچھا۔

''یہ کس نے کیا ہے؟''

گل نار کا جسم زخم زخم تھا۔ یہ اسی کا خون تھا جو بیڈ شیٹ پر لگا ہوا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ کسی نے اس کے ساتھ بہت درندگی کے ساتھ زیادتی کی تھی۔ اس کا غائب لباس اور زخمی جسم گواہی دے رہا تھا۔ اس کے ہاتھ کھول کر شامی اس کے پاؤں کھول رہا تھا اور اسے خیال نہیں آیا تھا کہ وہ اس کا منہ بھی کھول دے۔ اس نے پھر پوچھا۔ ''یہ کس نے کیا ہے؟''

ہاتھ کھلتے ہی گل نار اٹھ بیٹھی۔۔۔ اس نے ایک ہاتھ پیچھے کیا اور دوسرے سے اپنے منہ میں ٹھنسا کپڑا نکالتے ہوئے تیز لہجے میں بولی۔ ''فولاد خان نے۔''

شامی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تھا کہ اس کا پیچھے والا ہاتھ حرکت میں آیا۔ شامی نے آخری لمحے میں پیتل کے اس برہنہ نسوانی مجسمے کو دیکھا جو گل نار کے ہاتھ میں دبا ہوا تھا۔ یہ صرف سات آٹھ انچ لمبا تھا مگر بہت وزنی تھا۔ شامی نے بچنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا اور مجسمہ بہت قوت سے اس کی کن پٹی پر آ کر لگا۔ شامی کو لگا کہ اس کی آنکھوں کے آگے آتش بازی ہوئی ہو اور... جیسے جیسے آتش بازی مدھم ہوتی گئی اس کا ذہن بھی تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔

☆☆☆

تیمور دبے قدموں بنگلے کی دیوار کے ساتھ چل رہا تھا۔ زمین پر جمع ہونے والا پانی اس کے جوتوں تلے آ رہا تھا۔ اگر وہ زور سے قدم رکھتا تو چپ کی آواز آتی مگر وہ قدم دبا کر چل رہا تھا۔ بنگلے کے دائیں طرف گلی تھی۔ اس کا وسطی حصہ پختہ تھا جبکہ دیوار کے ساتھ کسی زمانے میں کیاری ہوتی تھی مگر اب اس میں پودوں کے بجائے گھاس پھونس اور خود رو پودے اگ آئے تھے۔ بنگلے میں کھڑکیاں ہی کھڑکیاں تھیں۔ ایک کھڑکی کے پاس سے گزرتے ہوئے اچانک اندر کوئی سایہ سا کھڑکی کے سامنے سے گزرا۔ تیمور نے چونک کر دیکھا۔ کھڑکی بند تھی مگر اس کے پردوں کے وسط میں کسی قدر خلا تھا۔ تیمور نے فٹ بھر کے بعد دیوار کے نکلے کنارے پر پاؤں جمائے اور اچک کر کھڑکی کی گرل تھام لی۔ اس نے زور دے کر خود کو اوپر اٹھایا۔ یہ بیڈروم تھا اور پردوں کے خلا سے ایک بیڈ اور اس کے بعد قالین کا کچھ حصہ نظر آ رہا تھا۔ سامنے ڈریسنگ ٹیبل کا آئینہ تھا مگر انسان نظر نہیں آ رہا تھا۔

تیمور نے آئینے کو غور سے دیکھا تو اسے بیڈ کے سامنے قالین پر کوئی پڑا نظر آیا۔ یہ حصہ اس کی نظروں کی براہِ راست زد میں نہیں تھا۔ آئینے میں واضح نظر نہیں آ رہا تھا۔ ڈریسنگ ٹیبل پر سجے لوازمات سے لگ رہا تھا کہ یہ کسی خاتون کی تھی۔ ان ہی لوازمات کی وجہ سے اسے دیکھنے میں دشواری ہو رہی تھی۔ اچانک قالین پر پڑا ہوا شخص آگے کی طرف سرکا جیسے کسی نے اسے پیروں سے پکڑ کر کھینچا ہو۔ تیمور اچھل پڑا۔ یہ فولاد خان تھا۔ اس کا چہرہ ایک لمحے کے لیے آئینے کے واضح والے حصے میں آیا اور دوسرے ہی لمحے غائب ہو گیا۔ کوئی اسے کھینچ کر وہاں سے لے گیا تھا۔ فولاد خان اپنے ہوش میں نہیں تھا اور ایک خدشہ یہ تھا کہ وہ اس دنیا میں ہی نہیں تھا۔ وہ نہ جانے اندر کیسے پہنچا تھا؟ مگر یہ سوال بعد کا تھا ابھی تو اسے فولاد خان کو بچانا تھا اگرچہ کہ وہ زندہ تھا۔

تیمور نیچے اترا اور تیزی سے واپس آیا مگر شامی سامنے والے حصے میں نہیں تھا۔ تیمور بائیں طرف آیا۔ شامی یہاں بھی نظر نہیں آیا اور اب صرف ایک جگہ رہ گئی۔ تیمور نے کوٹھی کے عقبی حصے میں بھی دیکھ لیا۔ اسے وہاں شامی نظر نہیں آیا۔ مگر کوٹھی کے اندر جانے کا راستہ نظر آ گیا تھا۔ یہ کچن کا دروازہ تھا جو ذرا سا کھلا ہوا تھا اور بارش کے ہوا کے زور سے کھل گیا تھا۔ تیمور نے اندر جھانکا تو اسے کچن اور اس سے متصل ڈائننگ روم میں تاریکی نظر آئی تھی۔ صرف کھڑکیوں سے آتی بیرونی روشنی ماحول کو کسی قدر روشن کر رہی تھی۔ اس نے اندر جانے سے پہلے اپنے جوتے اسٹیپ پر رگڑ کر صاف کیے اور پانی جھٹکا۔ وہ اندر کوئی نشان نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ اندر آتے ہی اس نے دروازہ آہستہ سے بند کر دیا۔ اسے خیال آیا کہ شاید شامی نے دروازہ کھلا دیکھ لیا تھا اور وہ اندر گیا ہو مگر اس نے یہ خیال ذہن سے جھٹک دیا۔ اگر شامی راستہ دیکھ لیتا تب بھی پہلے اسے بتاتا۔

اگر تیمور نے فولاد خان کو نہ دیکھ لیا ہوتا تو وہ بھی شامی کے بغیر اندر قدم نہیں رکھتا۔ فولاد خان صرف ہتھیاروں کا ہی نہیں لڑائی کا بھی ماہر تھا اور کوئی اسے آسانی سے قابو نہیں کر سکتا تھا۔ تیمور نے خطرہ محسوس کیا مگر اس کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ اس نے کچن میں دیکھا تو کھڑکی سے آتی روشنی میں کاؤنٹر پر رکھی ایک بڑے سائز کی چھری چمک رہی تھی، اس نے وہی اٹھا لی۔ دبے قدموں آگے بڑھتے ہوئے وہ لاؤنج میں آیا۔ تیمور کو دائیں طرف جانا تھا جہاں بیڈ روم تھے۔ لاؤنج کے آگے ایک راہداری تھی جو اسی سمت جا رہی

تھی۔ تیمور اس جانب مڑا تو اسے لگا کہ دائیں طرف کوئی سایہ سا گیا تھا۔ تیمور کو خیال آیا کہ اسی طرف وہ بیڈروم بھی تھا جس میں فولاد خان پڑا ہوا تھا۔

وہ دبے قدموں بائیں طرف دیوار سے لگتا ہوا آیا اور اس نے راہداری میں دائیں طرف جھانکا مگر اسے کوئی نظر نہیں آیا۔ اس طرف صرف ایک ہی کمرا تھا۔ وہ راہداری میں آگے بڑھا تھا کہ اسے بائیں طرف والے حصے سے کسی کا سایہ سا جھپٹتا محسوس ہوا اور اس سے پہلے کہ تیمور مڑتا کوئی چیز اس کے سر سے ٹکرائی۔ اسے لگا کہ اس کے پیروں سے جان نکل گئی ہے۔ اسے لگا کہ پوری راہداری گھوم گئی ہو۔ وہ نیچے گرا تو اس کی نظروں کے سامنے موجود روشنی جھلملانے لگی۔ اصل میں روشنی بائیں طرف تھی اور اگر کوئی اس طرف حرکت کرتا تو اس کا سایہ دائیں طرف بنتا۔ تیمور نے آنکھیں بند کرلیں اور گہرے سانس لینے لگا۔ وہ بے ہوش نہیں ہوا تھا مگر اس میں ہلنے جلنے کی سکت بھی نہیں رہی تھی۔ کچھ دیر بعد اسے کسی کے گہرے سانسوں کی آواز نزدیک سے آئی۔ کوئی اسے ٹٹول رہا تھا پھر ایک لہراتی ہوئی نسوانی آواز آئی۔

''کیا ہوا؟''

''بے ہوش ہوگیا۔'' مرد نے کہا۔ اس کی آواز بھی لہرا رہی تھی۔ چوٹ نے تیمور کے حواس کو متاثر کیا تھا۔ عورت نے کہا۔

''جو کرنا ہے اب جلدی کرو، تم نے مجھے پہلے ہی بہت پریشان کردیا ہے۔''

''بس کچھ دیر کی بات ہے۔''

عورت کی آواز دور جانے لگی۔ ''میری تو سمجھ میں نہیں آرہا کہ اتنا لمبا چکر چلانے کی کیا ضرورت ہے۔ کیا تم انہیں جانتے نہیں ہو؟''

''جانتا ہوں تب ہی تو اتنا لمبا چکر چلایا ہے۔'' مرد بھی دور چلا گیا تھا۔ ان کی آوازیں لہرا رہی تھیں۔ ساتھ ہی تیمور کی سوچنے کی صلاحیت بھی پوری طرح کام نہیں کررہی تھی اس لیے وہ جان نہیں سکا کہ آوازیں کس کی ہیں؟ چوٹ سر کے پچھلے حصے میں لگی تھی۔ تیمور بے ہوش نہیں ہوا تھا مگر اسے لگ رہا تھا جیسے جسم سے جان نکل گئی ہو۔ یقیناً فولاد خان کو بے ہوش کرنے والا اس کی آمد سے باخبر ہوگیا تھا اور اس نے گھات لگا کر حملہ کرکے اسے بھی قابو کرلیا تھا۔ مرد اور عورت وہاں سے چلے گئے تھے۔ کچھ دیر بعد تیمور نے کوشش کرکے آنکھیں کھولیں اور اس کام میں بھی اسے بہت محنت کرنا پڑی۔ روشنی اب جھلملا نہیں رہی تھی۔ اس کی حالت یقیناً بہتر ہورہی تھی۔ اب اس نے ہاتھ پاؤں ہلانے چاہے تو اس میں بھی کامیابی ہوئی۔ ذرا سی کوشش سے وہ اٹھ بیٹھا تھا۔ اس نے سر کو ہاتھ لگایا تو اس کی انگلیوں پر خون آگیا۔ ضرب نے سر پھاڑ دیا تھا۔ ایک طرح سے یہ اچھا ہوا تھا۔ ضرب کے نتیجے میں اندرونی جریانِ خون زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ فوری یہاں سے نکل جاتا اور مدد حاصل کرتا مگر چکراتے ذہن کے ساتھ اس نے بیڈروم کی طرف جانے کا فیصلہ کیا جہاں فولاد خان دکھائی دیا تھا۔ وہ دیوار کا سہارا لیتا ہوا بیڈروم کے دروازے تک پہنچا اور ہینڈل گھما کر اسے کھولا۔ وہ اندر داخل ہوا اور دروازہ بند کرلیا۔ لیکن کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ ایک دروازہ کمرے میں اور تھا اس نے کھولا تو وہ واش روم ثابت ہوا اور یہ خاصا پُرتعیش واش روم تھا۔ پہلے اس نے پانی سے سر دھونے کا سوچا مگر اسے یاد آگیا کہ سردی کیسی ہے اور پانی کس قدر یخ ہوگا۔ وہاں دواؤں کی کیبنٹ تھی۔ اس نے کیبنٹ کھولی۔ اندر دواؤں کے ساتھ اسے ایمونیا کی شیشی نظر آئی اس نے اس کا ڈھکن کھول کو نوزل ناک سے لگائی اور چند گہرے سانس لیے تو چکر ختم ہوگئے اور وہ خود کو بہتر محسوس کرنے لگا۔ اس کے سوچنے کی صلاحیت بحال ہوگئی تھی۔ اسے پہلی بار محسوس ہوا کہ وہ کتنی سنگین صورتِ حال سے دوچار ہے۔ اسے فوری پولیس سے رابطہ کرنا تھا۔ مگر کیسے کرتا موبائل کار میں رہ گیا تھا۔ اچانک باہر سے کسی کے زور سے بولنے کی آواز آئی تو اس نے پھرتی سے واش روم کی لائٹ اور دروازہ بند کردیا۔ اسی لمحے بیڈروم کا دروازہ کھلا اور اسے قادر بخش کی آواز آئی۔

''یہاں بھی نہیں ہے۔''

''تلاش کرو۔'' ایک ہلکی نسوانی آواز نے کہا۔ ''وہ نکل گیا تو ہم بہت بڑی مشکل میں پڑ جائیں گے۔''

''میں دیکھتا ہوں۔'' قادر بخش نے کہا اور دروازہ بند کردیا۔ تیمور نے اس بار بھی عورت کی آواز شناخت نہیں کی تھی کیونکہ وہ آہستہ بول رہی تھی۔ تیمور دروازے کے ساتھ دم سادھے کھڑا تھا۔ چند لمحے بعد باہر آہٹ سنائی دی۔ کوئی واش روم کی طرف آرہا تھا۔ تیمور نے آس پاس دیکھا اور اسے شاور کے ساتھ لگا ہوا پردہ دکھائی دیا، وہ اس کے عقب میں چلا گیا۔ واش روم کا دروازہ کھلا اور کوئی اندر آیا۔ پردے کے پیچھے وہ واضح... نہیں تھا مگر تیمور کا اندازہ تھا کہ وہ کوئی عورت ہے۔ ایک لمحے کو اس کا دل چاہا کہ باہر نکل کر

عورت کو قابو کرلے۔ وہ عورت کو قابو کرسکتا تھا مگر سر کی چوٹ کے ساتھ قادر بخش جیسے تنومند آدمی سے نہیں نمٹ سکتا تھا اس لیے اس نے خود کو صبر کی تلقین کی۔

☆☆☆

شامی کو لگ رہا تھا جیسے اسے کوئی آوازیں دے رہا تھا۔ پہلے وہ اسے خواب سمجھا تھا پھر اچانک ہی اس کے حواس بحال ہوگئے۔ وہ سرد ترین فرش پر پڑا ہوا تھا اور اس کے برابر میں فولاد خان تھا۔ وہی اسے آوازیں دے رہا تھا۔ مگر نہیں فولاد خان تو بے ہوش پڑا تھا۔ اس کا منہ مضحکہ خیز انداز میں کھلا ہوا اور صرف خراٹوں کی کمی تھی ورنہ ایسا لگتا کہ فولاد خان سو رہا ہے۔ وہ ایک خالی کمرے میں پڑے تھے۔ شاید شامی کی چھٹی حس نے اسے چونکایا تھا کہ اب اٹھ جائے اس سے پہلے کہ دشمن ہمیشہ کی نیند سلا دے۔ یہاں نیم تاریکی اور بے پناہ سردی تھی۔ فولاد خان کا لباس بھیگا ہوا تھا۔ ظاہر ہے وہ بارش میں یہاں دوڑا آیا تھا۔ شامی اپنی برساتی کی وجہ سے بھیگنے سے محفوظ رہا تھا۔ شامی نے کمرے کے سائز سے اندازہ لگایا کہ وہ برابر والے کوارٹر میں ہے۔

شامی کی کنپٹی دکھ رہی تھی اور جب اس نے اسے چھونے کی کوشش کی تو انکشاف ہوا کہ وہ اس کے ہاتھ اور پاؤں دونوں بندھے ہوئے تھے۔ صرف اسی کے نہیں بلکہ فولاد خان کے ہاتھ پاؤں بھی بندھے ہوئے تھے۔ چوٹ کم نہیں تھی اوپر سے واقعات اور حالات نے شامی کو مزید چکرا دیا تھا، وہ سمجھنے سے قطعی قاصر تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ جس وقت گل نار نے اس کے سر پر وار کیا تھا اور فولاد خان کا نام لیا تھا تو اس کا لہجہ بالکل ٹھیک تھا۔ وہ لہجے سے فولاد خان کی ہم قوم و زبان نہیں لگ رہی تھی۔ پھر اس کا حلیہ اور ناکافی لباس، خون خون جسم بتا رہا تھا کہ اس کے ساتھ بُرا ہوا ہے۔ شامی نے چوٹ والی جگہ سرد فرش سے لگائی تو اسے سکون ملا تھا۔ شاید یہ برف کی ٹکور کا متبادل تھا۔ ایک منٹ میں دکھنے والی جگہ سن ہوگئی تھی اور تکلیف پہلے کے مقابلے میں بہت کم رہ گئی تھی۔ شامی کے ہاتھ سامنے بندھے تھے اس لیے وہ کوشش کرکے اٹھ بیٹھا۔ مگر جب ہاتھ کھولنے کی کوشش کی تو اندازہ ہوا کہ گرہیں بہت مضبوط ہیں۔ اس نے فولاد خان کو ہلایا۔

''فولاد خان... اٹھو... ہم خطرے میں ہیں۔''

مگر فولاد خان پر ذرا بھی اثر نہیں ہوا۔ اس کی بے ہوشی خاصی گہری لگ رہی تھی اور یہ صرف سر کی چوٹ کا کمال نہیں تھا۔ شامی کے نزدیک ہوکر اس کا منہ سونگھا تو اسے کلوروفارم کی بو آئی تھی گویا اسے کلوروفارم سونگھا کر زیادہ دیر کے لیے بے ہوش کر دیا گیا تھا۔ شامی کی چھٹی حس کہنے لگی کہ جو ہو رہا ہے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ہو رہا ہے۔ اس سازش میں قادر بخش کے ساتھ گل نار بھی شامل تھی۔ ورنہ شامی کو بے ہوش کرنے کا جواز نہیں تھا۔ فولاد خان کی طرف سے مایوس ہوکر شامی کو تیمور کا خیال آیا۔ اگر وہ آزاد تھا تو ان کے لیے کچھ کرسکتا تھا۔ شامی کے پاس اس کا موبائل تھا۔ اس نے جیکٹ کی جیب ٹٹولی اور گہری سانس لے کر رہ گیا۔ موبائل غائب تھا۔ ہاتھ کھولنا ممکن نہیں تھا لیکن وہ پاؤں کھولنے کی کوشش کرسکتا تھا، اس نے پاؤں سمیٹے اور رسی کی گرہیں ٹٹولنے لگا۔ گرہیں ملیں تو اس نے کھولنے کی کوشش شروع کردی۔ یہ بھی بہت سخت تھیں۔

سردی سے ہاتھ سن اور بندھے ہونے کی وجہ سے بے جان ہو رہے تھے اور گرفت پوری نہیں آرہی تھی مگر شامی نے کوشش جاری رکھی۔ انہیں یہاں بے وجہ نہیں ڈالا گیا تھا۔ جلد یا بدیر وہ اس طرف آتے اور ان کی آمد سے پہلے وہ خود کو آزاد نہیں کراپاتا تو شاید پھر کبھی آزاد نہیں ہو پاتا۔ اچانک دروازے پر آہٹ ہوئی اور شامی پھرتی سے لیٹ کر ساکت ہوگیا۔ آنے والا دروازے پر رکا اور اس نے ایک نظر اندر ڈالی۔ اس کے عقب سے آتی روشنی میں اس کا خاکہ بن رہا تھا۔ شامی نے اسے پہچان لیا، وہ قادر بخش تھا۔ چند لمحے وہ انہیں دیکھتا رہا پھر واپس چلا گیا اس نے دروازہ بند نہیں کیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اسے ان کے فرار یا شور مچانے کا خوف نہیں تھا۔ اول تو بنگلا بہت بڑا تھا اور دوسرے بارش کا شور بھی تھا اگر شامی حلق پھاڑ کر چلاتا تب بھی اس کی آواز باہر تک نہ جاتی۔ قادر بخش کے جانے کے بعد شامی اٹھ بیٹھا اور گرہوں کو ڈھیلا کرنے لگا۔

مسلسل کئی منٹ کی کوشش کے بعد اسے کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ گرہیں ڈھیلی ہوچکی تھیں مگر انہیں کھولنا بھی کسی دشوار مرحلے سے کم نہیں تھا۔ ہاتھ میں بندھی رسیوں کے خلاف کلائیاں موڑنے سے ان میں درد شدید ہو رہا تھا۔ بالآخر پاؤں کی رسی کھل گئی۔ اس نے رسی نکالی اور کھڑا ہوگیا۔ ایک بار پھر فولاد خان کو ہوش میں لانے کی کوشش کی اور اس بار بھی ناکام ہوکر اس نے باہر جانے کا فیصلہ کیا۔ برآمدے میں آنے تک اس کا خیال تھا کہ وہ بنگلے سے نکل جائے اور مدد لائے مگر جب وہ پورچ سے ہوتا ہوا گیٹ تک

آیا تو یہ دیکھ کر اس کا دل ڈوب سا گیا کہ چھوٹے اور بڑے دونوں گیٹ لاک کیے جا چکے تھے اور وہ بندھے ہاتھوں سے گیٹ نہیں پھلانگ سکتا تھا۔ اسے اب کوٹھی کی طرف جانا تھا جہاں وہ ہاتھ کھولنے کی کوئی تدبیر کرسکتا تھا۔

☆☆☆

عورت صرف ہاتھ دھونے آئی تھی، وہ واش روم سے نکل گئی تو تیمور پردہ ہٹا کر دروازے تک آیا۔ اس نے سوچا کہ اب باہر نکلنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ سر پر ضرب لگی تو اس کے ہاتھ میں موجود چاقو گر گیا تھا اور جب وہ اٹھا تو چاقو وہاں نہیں تھا گویا قادر بخش نے چاقو اٹھا لیا تھا۔ تیمور نے ذرا سا دروازہ کھولا تو جہاں تک نظر جا رہی تھی، اسے کمرے میں کوئی نظر نہیں آیا۔ مزید دروازہ کھولنے پر بیڈ روم خالی ثابت ہوا تھا۔ تیمور باہر آیا اور پہلی بار غور سے بیڈ روم کا جائزہ لیا۔ یہ تو طے تھا کہ بیڈ روم عورت کا تھا اور کوٹھی میں قیام کرنے والی واحد عورت بیگم زوار تھی۔ مگر یہاں نہ تو دوائیاں تھیں اور نہ ہی ایسا لگ رہا تھا کہ یہ کسی بیمار عورت کا بیڈ روم ہے۔ اس کے بجائے یہ نارمل بیڈ روم تھا۔ تیمور نے درازیں کھول کر دیکھیں شاید اسے کوئی ہتھیار مل جائے مگر ان میں ایسی کوئی چیز نہیں تھی۔ وہاں ٹیلی فون نہیں تھا اور نہ ہی کوئی موبائل نظر آیا۔

وہ ڈریسنگ ٹیبل کی دراز دیکھ رہا تھا کہ باہر سے قادر بخش کے تیز بولنے کی آواز آئی۔ آواز نزدیک آرہی تھی۔ تیمور کے پاس اتنا موقع نہیں تھا کہ وہ واش روم میں جاتا۔ ایسے میں اسے ایک ہی جگہ سمجھ میں آئی، وہ تیزی سے قالین پر لیٹا اور سرک کر بیڈ کے نیچے چلا گیا۔ جیسے ہی وہ نیچے ہوا بیڈ روم کا دروازہ کھلا تھا۔ آنے والا قادر بخش تھا اور اس کے ساتھ ایک عورت تھی۔ اس نے جس قسم کے جوتے پہن رکھے تھے وہ عورتیں ہی پہنتی ہیں۔ اوپر اس نے لانگ کوٹ پہن رکھا تھا۔ قادر بخش کہہ رہا تھا۔ ”میرا دماغ خراب مت کرو۔ ایک آدمی غائب ہے۔“

”یہ تمہارا قصور ہے۔“ عورت نے سرد لہجے میں کہا تو تیمور اس کی آواز شناخت کر کے حیران رہ گیا، وہ گل نار تھی جو اس وقت بالکل درست اردو بول رہی تھی۔ ”تم نے چیک کیوں نہیں کیا کہ وہ بے ہوش ہو گیا ہے یا نہیں۔ جیسے میں نے اس کے ساتھی کو چیک کیا تھا۔“

”اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“ قادر بخش کی آواز سے لگ رہا تھا کہ وہ خود پر قابو پانے کی کوشش کر رہا

ایک نوجوان لڑکی تیزی سے دوڑتی ہوئی ڈاکٹر کے کیبن میں داخل ہوئی اور بولی۔

”ذرا دیکھیے ڈاکٹر صاحب، مجھے کون کون سی بیماریاں ہیں؟“

”تین بیماریاں ہیں۔“ ڈاکٹر نے نبض پر ہاتھ رکھے بغیر جلدی سے کہا۔ ”پہلی تو یہ کہ آپ زیادہ فیشن کرتی ہیں۔ دوسری یہ کہ آپ بہت جلد باز ہیں اور تیسری بیماری یہ ہے کہ آپ کی نظر کمزور ہے۔“

”وہ کیسے؟“ لڑکی نے حیرت سے پوچھا۔

”وہ ایسے کہ باہر ایک بہت بڑا بورڈ لگا ہوا ہے جس پر لکھا ہے۔۔۔ جانوروں کا ڈاکٹر!“

ہے۔

”کیوں نہیں پڑے گا؟“

”کیونکہ ان تینوں کو ویسے بھی نہیں مارنا۔“

”ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔“ گل نار بولی۔ ”وہ پولیس کو کال کرسکتا ہے۔“

”تمام کام ہو چکا ہے بس ایک آخری کام رہ گیا ہے۔“ قادر بخش اس وقت گل نار کے سامنے کسی قدر دبا ہوا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ دونوں برابر کی حیثیت رکھتے ہوں۔ گل نار مطمئن نہیں تھی، اس نے پھر کہا۔

”اگر وقت سے پہلے پولیس آگئی تو سب ہمارے گلے پڑ جائے گا۔“

”تم اطمینان رکھو ایسا نہیں ہوگا۔“ قادر بخش نے یقین سے کہا۔ ”وہ کوٹھی میں کہیں ہے اور میں نے گیٹ لاک کر دیے ہیں۔ اب کوئی باہر نہیں جاسکتا ہے۔“

”اس کا کیا کرنا ہے؟“

”وہی جو طے ہوا تھا۔“ قادر بخش نے جواب دیا۔ ”خوش قسمتی سے میرے ہاتھ ایک چھری آگئی ہے۔ جس پر غائب ہونے والے شخص کی انگلیوں کے نشانات ہیں۔“

تیمور کو اس چھری کا خیال آیا جو اس نے کچن سے اٹھائی تھی۔ اس کے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔ کیا قادر بخش کسی کو قتل کرنے جا رہا تھا۔ فوراً اسے بیگم زوار کا خیال آیا۔ گل نار کا اشارہ یقیناً بیگم زوار کی طرف تھا۔ قادر بخش کہہ چکا تھا کہ وہ انہیں مارنا نہیں چاہتا۔ ایسے میں بیگم زوار ہی رہ جاتی تھیں۔ اچانک ہی تیمور کو خیال آیا کہ کیا اس نے شاہی کو بھی قابو کر لیا تھا۔ اس نے صرف تیمور کے غائب ہونے کا ذکر کیا

تھا اس کا مطلب تھا کہ فولاد خان کے ساتھ شامی بھی اس کے قبضے میں تھا۔ جب گل نار نے ساتھی کے قابو کرنے کی بات کی تھی تو وہ فولاد خان کی طرف اشارہ سمجھا تھا۔ اب اسے خیال آرہا تھا کہ اس نے شامی کا ذکر کیا تھا۔ وہ دونوں گفتگو کرتے ہوئے بیڈ روم سے چلے گئے۔ شاید وہ تیمور کو ہی تلاش کر رہے تھے۔ ان دونوں کی گفتگو سے یہ نتیجہ نکالنا مشکل تھا کہ ان کا اصل مقصد کیا ہے لیکن یہ واضح تھا کہ وہ کسی مجرمانہ منصوبے پر عمل پیرا تھے اور شاید بیگم زوار کو قتل کر کے اس کا الزام فولاد خان اور ان دونوں پر آتا مگر وہ انہیں کیوں قتل کرنا چاہتے تھے۔ اگر صرف انہیں لوٹنا تھا تو اتنا لمبا چوڑا ڈراما کرنے کی تک سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ فرار یا مدد حاصل کرنے کے بجائے اب اسے اپنے بل بوتے پر حرکت میں آجانا چاہیے تھا اور ان دونوں کو قابو کرنا تھا۔

☆☆☆

شامی کے خیال میں صورتِ حال مضحکہ خیز تھی۔ اسے آج تک ایسی بے بسی کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا جب وہ آزاد ہوتے ہوئے بھی قید تھا۔ اس نے بنگلے کا بایاں پہلو دیکھ لیا تھا اس لیے اب دائیں پہلو کی طرف آیا اور چھوٹی سی گلی سے گزرتے ہوئے وہ عقبی سمت جانے لگا۔ ایک کھڑکی کے پاس سے گزرتے ہوئے اسے اندر سے باتیں کرنے کی آواز آئی۔ کھڑکی زمین سے کوئی چھ فٹ اونچی تھی۔ شامی نے بنیاد کے ابھرے کنارے پر پاؤں رکھا اور بندھے ہاتھوں سے گرل پکڑ کر خود کو اوپر کیا۔ درمیان سے کھڑکی کا پردہ ذرا ہٹا ہوا تھا اور اسے کمرے میں قادر بخش اور گل نار دکھائی دیے۔ اس وقت گل نار بالکل مختلف حلیے میں تھی۔ اس نے پیروں میں لانگ شوز اور اوپر اوور کوٹ پہن رکھا تھا۔ وہ اور قادر بخش بحث کرنے کے انداز میں آپس میں بات کر رہے تھے۔ ان کی آواز آرہی تھی لیکن الفاظ سمجھ میں نہیں آرہے تھے۔ شامی نے کوشش کی پھر بھی سمجھ میں نہیں آئے۔ چند منٹ بعد وہ کمرے سے چلے گئے۔

اتنی دیر میں لٹکے لٹکے شامی کے ہاتھ سن ہونے لگے تھے۔ رسی کا دباؤ دوگنا ہونے سے دورانِ خون رک رہا تھا اور عین اس وقت وہ نیچے ہو گیا جب تیمور بیڈ کے نیچے سے برآمد ہو رہا تھا اس لیے اسے پتا نہیں چلا کہ بیڈ روم میں تیمور بھی ہے اور اب آزاد ہے۔ شامی اب گھوم کر عقبی حصے میں آیا۔ یہاں کچن کا دروازہ تھا۔ اس نے اسے کھولنے کی کوشش کی مگر وہ اندر سے بند نکلا۔ شامی کو غصہ آرہا تھا۔ سردی نے الگ برا حال کیا ہوا تھا۔ اگر اس کے اوپر برساتی نہ ہوتی تو بھیگنے سے صورتِ حال اور خراب ہو جاتی۔ وہ ایک طرف موجود شیڈ کی طرف آیا اسے وہاں کسی اوزار کی تلاش تھی جس سے وہ اپنی رسی کاٹ سکتا مگر وہاں ایسا کوئی اوزار نہیں تھا۔ کھدال تھا یا بیلچہ کچھ کھرپیاں تھیں۔ ان میں سے کسی کی دھار ایسی نہیں تھی جو رسی کاٹ سکتی۔ بنگلے کا پورا چکر لگانے پر اسے تیمور کہیں نظر نہیں آیا تھا اس کا مطلب تھا کہ وہ بھی پکڑا گیا تھا۔ اگر وہ آزاد ہوتا تو اب تک ان کے لیے کچھ نہ کچھ کر چکا ہوتا۔

شیڈ تلے سردی ذرا کم تھی اس لیے شامی وہیں رک گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اب شاید اسے قادر بخش کے کوارٹر میں جانا پڑے۔ وہیں سے اسے کوئی ایسی چیز مل سکتی تھی کہ اس رسی سے نجات حاصل کر سکتا۔ لیکن اس سے پہلے وہ اپنے ارادے کو عملی جامہ پہناتا بنگلے کے عقبی حصے سے گل نار برآمد ہوئی اور ایک پلاسٹک شیٹ سر پر رکھ کر تیز قدموں سے کوارٹرز کی طرف چلی گئی۔ شامی دیکھ رہا تھا کہ اس نے جاتے ہوئے دروازہ بند کرنے کی زحمت نہیں کی اور وہ نیم وا تھا۔ شامی کے لیے یہ ایک موقع تھا۔ وہ اٹھا اور بھاگتا ہوا کچن کے دروازے تک آیا۔ اسے خوف تھا کہ کہیں وہ ہوا کی وجہ سے بند نہ ہو جائے اور پھر اسے اندر سے ہی کھولا جا سکتا ہو۔ اندر داخل ہونے سے پہلے اس نے سن گن لی۔ وہاں کوئی نہیں تھا اور نیم تاریکی تھی۔ شامی اندر آیا اور اس نے دروازہ بند کر دیا۔ وہ ذرا آگے آیا تھا کہ اسے لاؤنج سے کسی.... عورت کے مدھم بولنے کی آواز آئی۔

''کیا تم تیار ہو؟''

''ہاں... لیکن یہ بہت مشکل ہے۔'' قادر بخش نے کہا۔ شامی نے کچن سے جھانک کر دیکھا تو اسے قادر بخش چاقو بدست نظر آیا اور بیگم زوار صوفے پر بیٹھی تھی۔ قادر بخش بیگم زوار کے پیچھے کھڑا ہوا تھا۔

''میں سمجھتی ہوں۔'' بیگم زوار نے کہا۔ ''لیکن تمہارے تمام مسائل کا حل یہی ہے۔ اگر اس دن میں اسپتال میں داخل ہو جاتی تب کچھ اور ہوتا مگر اب یہی مناسب ہے۔''

شامی نے ہاتھ عقب میں لے کر پتلون کی بیلٹ میں اٹکی ہوئی جیک راڈ کو نکالنے کی کوشش کی۔ یہ اس نے ڈکی سے لی تھی۔ مگر دونوں ہاتھ بندھے ہونے کی وجہ سے وہ ناکام رہا تھا۔ پھر اس نے کچن میں دیکھا اور اسے نزدیک ہی بڑے سائز کا فرائنگ پان لٹکا ہوا نظر آیا۔ شامی نے آہستہ سے

اسے اتارا۔ دونوں ہاتھوں سے اس کے ہینڈل کو مضبوطی سے پکڑا اور دبے قدموں لاؤنج میں داخل ہوا۔ قادر بخش اب گھوم کر بیگم زوار کے سامنے آگیا تھا اور شامی کی طرف اس کی پشت ہوگئی تھی۔ بیگم زوار اسے کسی کام پر آمادہ کرنے کی کوشش کر رہی تھیں اور قادر بخش ہچکچا رہا تھا۔ شامی، قادر بخش سے کچھ دور تھا کہ بیگم زوار کی نظر اس پر پڑ گئی اور شامی نے نفی میں سر ہلا کر اسے خاموش رہنے کو کہا مگر وہ چلا اٹھی۔

''قادر پیچھے دیکھو۔''

قادر بخش نے بے ساختہ چاقو والا ہاتھ گھمایا اور شامی نے فرائنگ پان آگے کر دیا۔ چاقو کی نوک اس سے ٹکرائی۔ قادر بخش نے دوسرا وار سنبھل کر کیا اور شامی بال بال بچا تھا۔ قادر بخش جس طرح چاقو لہرا رہا تھا۔ وہ ماہر چاقو باز لگتا تھا۔ پیٹ کی طرف آنے والا وار شامی نے فرائنگ پان سیدھا کر کے روکا اور پھر قادر بخش کے پاؤں پر ٹھوکر ماری۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے گیا تھا۔ شامی نے فرائنگ پان گھما کر قادر بخش کے چاقو والے ہاتھ پر مارا تھا۔ ضرب شدید تھی اور چاقو اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ قادر بخش کے تاثرات وحشیانہ ہوگئے تھے اور اس نے ایک چیخ کے ساتھ اس پر حملہ کیا۔ فرائنگ پان نیچے تھا اور شامی نے اسے پوری قوت سے اوپر کی طرف اٹھایا۔ وہ ٹھیک آگے آتے قادر بخش کے منہ پر لگا۔ ضرب ایسی تھی کہ قادر بخش اچھلا اور قالین پر گر کر ساکت ہوگیا تھا۔ اسی لمحے کوئی عقب سے شامی پر جھپٹا اور ایک بار پھر اس کے مضروب سر پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ شامی قادر بخش کے برابر میں گرا اور ساکت ہوگیا۔

☆☆☆

شامی کو ہوش آیا تو وہ لاؤنج کے صوفے پر پڑا ہوا تھا۔ تیمور آئس پیک سے اس کے سر کی سکائی کر رہا تھا۔ فولاد خان وہاں موجود تھا اور وہ گل نار اور بیگم زوار کے سر پر کھڑا ہوا تھا۔ دونوں سخت چہرے کے ساتھ صوفے پر بیٹھی تھیں۔ قادر بخش قالین پر اسی رسی سے بندھا پڑا تھا جس سے اس نے شامی کو باندھا تھا۔ اسے ہوش میں آتا دیکھ کر تیمور نے اطمینان کا سانس لیا۔ ''شکر ہے تجھے ہوش آگیا ورنہ میں تجھے اسپتال لے جانے والا تھا۔ تیرا سر دو جگہ سے گل نار ہو رہا ہے۔''

''ایک زخم تو گل نار کا دیا ہوا ہے۔'' شامی نے کراہ کر کہا اور اٹھ بیٹھا۔ اس کا سر درد سے پھٹ رہا تھا۔ اس نے تیمور سے آئس پیک لیتے ہوئے پوچھا۔ ''دوسرا وار کس نے کیا تھا؟... قادر بخش تو بے ہوش ہو گیا تھا میرے ہاتھوں۔''

''انہوں نے۔'' تیمور نے بیگم زوار کی طرف اشارہ کیا۔ ''شکر کر میں بروقت پہنچا ورنہ یہ تیری کھوپڑی کو مزید لالہ زار بنانا چاہتی تھیں۔''

تیمور نے بیگم زوار سے ان کی اسٹک چھین لی تھی جس سے انہوں نے شامی کے سر پر وار کیا تھا۔ قادر بخش ہی اصل محرک تھا اس کے بے ہوش ہونے کے بعد حالات آرام سے قابو میں آگئے۔ تیمور نے پہلے اسے بیگم زوار کے ساتھ رسی سے باندھ دیا اور پھر جا کر فولاد خان کو ہوش میں لایا۔ امونیا کی بوتل اس سلسلے میں کارآمد ثابت ہوئی تھی۔ ان دونوں نے گل نار کو قابو کیا۔ فولاد خان اس کا بدلا روپ دیکھ کر دنگ رہ گیا تھا اور اگر تیمور اسے نہ روکتا تو وہ اس دھوکے باز عورت کا گلا دبا دیتا۔ وہ آسانی سے قابو میں نہیں آئی تھی۔ اس نے شدید مزاحمت کی تھی اور فولاد خان سے تھپڑ کھا کر بھی باز نہیں آئی تھی۔ اس کوشش میں اس کا اوور کوٹ اتر گیا تھا جس کے نیچے اس نے وہی... ناکافی لباس پہنا ہوا تھا۔ اگر فولاد خان کو علم ہو جاتا کہ اس نے اس پر کیا الزام لگایا ہے تو شاید اس کی گردن توڑ دیتا۔

بہ مشکل اسے قابو کرنے کے بعد پھر سے اوور کوٹ پہنایا گیا تھا۔ وہ اسے لے کر کوٹھی میں آئے اور پھر تیمور شامی کو ہوش میں لے آیا تھا۔ تیمور نے کافی کا پانی رکھا اور بیگم زوار کے بیڈروم سے پین کلر گولیاں لے آیا۔ سب نے دو دو گولیاں لیں۔ اس دوران میں کافی تیار ہوگئی تھی۔ سیاہ، گرم اور تلخ کافی نے دوا سے زیادہ کام کیا اور شامی خود کو بہتر محسوس کرنے لگا۔ قادر بخش خاصا پہلے ہوش میں آگیا تھا اور قالین پر پڑا کسی درندے کے ہانپنے کے انداز میں سانس لے رہا تھا۔ پہلے فولاد خان نے اپنی رُوداد سنائی کہ اسے گل نار کا فون آیا اور عقب سے قادر بخش اسے قتل کرنے کی دھمکیاں دے رہا تھا۔ اسی وجہ سے فولاد خان بنا سوچے سمجھے دوڑا گیا۔ بنگلے کا چھوٹا دروازہ کھلا ہوا تھا اور وہ اندر گھسا تھا کہ اسے کوٹھی سے گل نار کی چیخ سنائی دی۔ وہ دوڑا گیا تھا۔ گل نار وقتاً فوقتاً چیخوں سے اس کی رہنمائی کر رہی تھی اور جیسے ہی وہ بیگم زوار کے بیڈروم میں داخل ہوا اس کے سر پر ضرب لگی اور وہ بے ہوش ہو گیا۔ اس کے بعد تیمور اسے ہوش میں لایا تھا۔ فولاد خان نے اپنا زخمی سر ٹٹولتے ہوئے اپنے والد صاحب کو یاد کیا۔

''وہ بولتا کہ عورت پر اتنا اعتبار کرو جتنا اپنے دشمن پر کرتے او، والد صیب درست فرماتا۔''

قادر بخش انہیں کھا جانے والی نظروں سے گھور رہا تھا اور بہ ظاہر اس کے دم خم میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ شامی اس کے پاس بیٹھا۔ ''اب بولو، یہ سب کیا چکر ہے؟''

''کوئی چکر نہیں ہے۔'' وہ غرایا۔ ''تم لوگ غلط ارادے سے میرے گھر میں داخل ہوئے اور میری بیوی کو بے آبرو کیا۔ اب یہاں لوٹ مار کرنا چاہ رہے ہو۔ اسی لیے ہمیں پابند کیا ہوا ہے؟''

اس کی بات سن کر شامی اور تیمور دنگ رہ گئے تھے اور فولاد خان کا غصہ عود آیا تھا، اس نے کہا۔ ''یہ اس طرا نہیں مانے گا اس کو ایک منٹ کے لیے امارے سپرد کرو۔ یہ داؤس زبان کو لے گا۔''

تیمور نے ہاتھ کے اشارے سے فولاد خان کو چپ رہنے کو کہا اور گل نار سے پوچھا۔ ''تم کیا کہتی ہو؟''

''قادر بخش ٹھیک کہہ رہا ہے۔'' وہ اطمینان سے بولی۔ وہ صوفے پر یوں تن کر بیٹھی تھی کہ اوور کوٹ بھی اس کے منہ زور شباب کی تاب نہ لا سکا تھا۔ ''تمہارے اس ملازم نے میری عزت لوٹی ہے اور تم لوگ اب یہاں لوٹ مار کرنا چاہتے ہو۔''

فولاد خان اچھل پڑا۔ اس نے شامی سے کہا۔ ''شامی صیب ام نے آج تک کسی عورت کو نہیں مارا مگر آج یہ مارا جائے گا۔''

تیمور نے اسے تسلی دی۔ ''فکر مت کرو یہ بچے گی نہیں۔''

شامی نے گہری سانس لی اور بیگم زوار کی طرف دیکھا۔ ''آپ کیا کہتی ہیں اس بارے میں؟''

''تم لوگ زبردستی گھر میں داخل ہوئے۔ میرے ملازم کے ساتھ مار پیٹ کی۔'' وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

''اس نے جو الزام لگایا ہے، اس کے بارے میں آپ کیا کہیں گی؟'' شامی نے گل نار کی طرف اشارہ کیا۔

''صرف اتنا کہ یہ بات پولیس تک نہیں جانی چاہیے ورنہ...'' بیگم زوار نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ غالباً ان کا مطلب یہ تھا کہ پولیس تک بات گئی تو یہ الزام بھی لگایا جائے گا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ قادر بخش اور گل نار کی ہمنوائی کر رہی تھیں۔ شامی خود کو ٹھنڈا کرتے ہوئے بولا۔

''بیگم صاحبہ ہمارے گیٹ کیپر فولاد خان کو ایک نمبر سے کال آئی اور گل نار نامی خاتون نے اسے مدد کے لیے بلایا۔ فولاد خان بنا سوچے سمجھے اور ہم سے پوچھے بغیر یہاں دوڑا آیا۔ جہاں اسے دھوکے سے سر پر ضرب لگا کر بے ہوش کر دیا گیا۔ اس کی تلاش میں ہم آئے تو ہمارے ساتھ بھی یہی سلوک ہوا۔ خوش قسمتی سے میں نے بر وقت کارروائی کی اور آپ کو قتل کرنے کے درپے قادر بخش کو بے ہوش کر دیا۔ یہاں تک تو ہم آپ کو قادر بخش اور گل نار سے الگ سمجھ رہے تھے لیکن آپ نے اسٹک سے وار کر کے مجھے بے ہوش کیا اور اگر میرا ساتھی بر وقت نہ آتا تو بہ قول اس کے آپ مجھے مار ہی ڈالتیں۔ میں نے آپ کی جان بچائی تھی تو آپ نے میرے ساتھ ایسا سلوک کیوں کیا؟''

''قادر بخش مجھے مار نہیں رہا تھا۔'' بیگم زوار نے بدستور سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''تم نے اسے مارنے کی کوشش کی اور مجھے اس کو بچانے کے لیے تم پر وار کرنا پڑا۔''

''خوب!'' شامی نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''آج تک میں نے صرف سیاست دانوں کو اپنے مفاد کی خاطر یوں ایک ہوتے دیکھا تھا۔ بائی دی وے آپ تینوں کا مفاد کیا ہے؟''

تیمور، شامی کو ایک طرف لے گیا۔ ''بیٹا معاملہ اتنا سیدھا نہیں ہے۔ یہ سب آپس میں ملے ہوئے ہیں۔''

''وہ تو ہے۔'' شامی نے کہا۔ ''لیکن میں نے خود دیکھا تھا قادر بخش بیگم زوار کو قتل کرنے والا تھا اگر میں ایک دو لمحے کی دیر کرتا تو یہ چاقو سے وار کر چکا ہوتا۔''

''تو ٹھیک کہہ رہا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ بیگم زوار کیوں...؟''

''بیگم زوار، قادر بخش اور گل نار سب جائیں بھاڑ میں۔'' تیمور نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ''ہمیں خود کو اس جنجال سے نکالنا ہے۔ اصل مسئلہ فولاد خان کا تھا اور اس نے دیکھ لیا ہے کہ اس کی حماقت نے ہمیں کہاں تک پہنچا دیا ہے اس لیے سب پر لعنت بھیج اور اپنے دفاع کے بارے میں سوچ۔''

شامی نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ''تیرا مطلب ہے کہ ہماری پوزیشن کمزور ہے؟''

''بالکل ذرا غور کر، ہم بیگم زوار کے بنگلے میں رات گئے گھسے، گل نار کا حلیہ اور زخم ہمارے خلاف گواہی ہوں گے۔ مزید یہ بیگم زوار کی لاش کا بندوبست بھی کر دیتے۔ اگرچہ ایسا نہیں ہے مگر گل نار والا مسئلہ ہے۔ ہمارے سروں پر زخم ہیں۔ ہم ان کی کیا وضاحت پیش کریں گے؟ فولاد خان کے عشق کے کئی گواہ بھی بن چکے ہیں۔ ان سب کی گواہی بھی ہمارے خلاف جائے گی۔ اس لیے سب سے بہتر حل یہی ہے کہ معاملہ ختم کر دیا جائے۔ میچ ڈرا ہو گیا نہ تم

ہارو نہ ہم۔“
شامی سوچ رہا تھا۔ وہ خود کو تیمور سے متفق پا رہا تھا مگر ان لوگوں کو آسانی سے بخش دینا بھی مشکل تھا۔ اس نے کہا۔ ”انہوں نے ہمارے ساتھ جو کیا ہے؟“
”تو نے اپنا حساب برابر کرلیا ہے۔“ تیمور نے قادر بخش کی طرف اشارہ کیا۔ ”اب ان عورتوں کو کیا کہیں۔۔۔“
”چل چھوڑ ہم چھوڑ دیتے ہیں مگر انہوں نے جو گورکھ دھندا پھیلایا اور ہمیں بھی اس میں شامل کیا اس کا ابھی تک سرا نہیں ملا ہے۔“
”یہی جانتے ہیں کہ اصل چکر کیا ہے؟“ تیمور نے ان تینوں کی طرف دیکھا۔ ”ان کا رویہ بتا رہا ہے کہ یہ نہیں اُگلیں گے۔“
شامی نے سرد آہ بھری۔ ”یعنی ہمارے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا سوائے ذلت وخواری اور چند زخموں کے۔“
”لگ تو ایسے ہی رہا ہے۔“ تیمور نے کہا۔ ”پھر کیا کہتا ہے۔“
شامی نے سر ہلایا تو تیمور بیگم زوار کے پاس آیا۔ اس نے کہا۔ ”ہمیں نہیں معلوم کہ آپ سب نے مل کر یہ چکر کیوں چلایا ہے اور ہمیں کیوں شامل کیا ہے۔ اب ایک ہی صورت ہے کہ بات ختم کی جائے۔“
”کیسی صورت؟“ بیگم زوار نے پوچھا۔
”آپ ضمانت دیں کہ آپ کی طرف سے کوئی پولیس کے پاس نہیں جائے گا۔“
بیگم زوار نے سر ہلایا۔ ”میں زبان دیتی ہوں کہ یہاں سے پولیس کو رپورٹ نہیں کی جائے گی۔“
”صرف پولیس ہی نہیں بلکہ آپ کی طرف سے کسی قسم کی کارروائی سے مکمل گریز ہونا چاہیے۔ دوسری صورت میں اعلانِ جنگ ہوگا۔“
بیگم زوار کچھ دیر سوچتی رہیں پھر انہوں نے سر ہلایا۔ تیمور نے شامی اور فولاد خان سے کہا۔ ”یہاں جہاں جہاں بھی تم میں سے کسی کی انگلیوں کے نشانات لگے ہوں یا کسی چیز کو چھوا ہو اسے صاف کردو۔“
انہوں نے ہر ممکنہ جگہ سے نشانات صاف کیے، اس میں وہ چاقو بھی تھا جس سے قادر بخش بیگم زوار کا قتل کرنا چاہتا تھا۔ جب انہیں تسلی ہوگئی کہ وہاں کوئی نشان باقی نہیں رہا ہے تو وہ وہاں سے نکل آئے تھے مگر جب وہ بنگلے میں داخل ہوئے تو وہاں نظام دین فولاد خان کی چوکی میں موجود تھا۔ ایک گھنٹے بعد ڈاکٹر کی طرف سے چیک اپ اور مرہم پٹی کے بعد وہ صاف اور گرم لباس میں نواب صاحب کے بیڈ روم میں ان کے سامنے موجود تھے۔ فولاد خان کو آرام کے لیے بھیج دیا تھا اور ان کے نصیب میں اب آرام کہاں تھا؟ شامی اور تیمور کو توقع تھی کہ آج بہت زیادہ شامت آئے گی مگر نواب صاحب نے ان کے لیے کافی منگوائی اور جب کافی آگئی تو انہوں نے فرمایا۔ ”اب فرمائیں یہ کیا ماجرا ہے، اتنی رات گئے آپ تینوں کہاں گئے تھے اور یہ زخم کہاں سے لگوا کر لائے ہیں۔ ہمیں ایک ایک بات بتائی جائے۔ اگر کوئی بات چھوٹ گئی تو آپ کو چھوٹ نہیں ملے گی۔“
اس کے بعد ممکن نہیں تھا کہ وہ نواب صاحب سے کوئی بات چھپاتے۔ انہوں نے شروع سے لے کر اب تک سب بتا دیا۔ فولاد خان کی حماقت پر نواب صاحب کا ردِعمل خاص نہیں تھا۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ انسان کی اول و آخری کمزوری عورت ہے مگر جب شامی نے تیمور اور اپنی مداخلت کی کہانی شروع کی تو نواب صاحب کی کشادہ پیشانی پر لکیریں نمودار ہوئی تھیں اور یہ برہمی کی لکیریں تھیں۔ غنیمت تھا کہ ان کی برہمی شکنوں تک محدود رہی اور اس نے زبان کا رخ نہیں کیا تھا۔ کیونکہ دونوں ہی الگ الگ واقعات کے گواہ تھے اس لیے داستان دونوں نے مل کر سنائی۔ تیمور نے اس کا اختتام کیا جب اس نے بیگم زوار سے ضمانت حاصل کی کہ وہ ان کے خلاف پولیس کارروائی نہیں کریں گی۔ نواب صاحب نے تیکھے انداز میں دریافت فرمایا۔ ”آپ نے اس عورت پر کیسے اعتبار کرلیا جو ایک غیر آدمی کے ہاتھ میں کھیل رہی ہو، کیا وہ اسے قائل نہیں کرسکتا ہے۔“
تیمور خوش ہو رہا تھا کہ نواب صاحب اسے سراہیں گے کہ وہ سب کو اس چکر سے نکال لایا تھا مگر نواب صاحب کے انداز سے لگ رہا تھا کہ اس سے حماقت ہوگئی ہے۔ اس نے مدد طلب نظروں سے شامی کی طرف دیکھا اور خلافِ توقع اس نے مدد بھی کی۔ شامی نے کہا۔ ”دادا جان، شاید وہ غیر آدمی نہیں ہے۔ اگر آپ مجھے اجازت اور کچھ مہلت دیں تو میں شاید اس عقدے کی نقاب کشائی کرسکوں گا۔“
نواب صاحب نے شامی کو دیکھا۔ ”آپ کیا کرسکیں گے برخوردار؟“
”یہ تو ابھی نہیں بتا سکتا کہ صرف ایک مفروضہ ہے، ہاں اس پر کام کیا تو شاید کچھ سامنے آئے۔“
”یعنی آپ ہم سے مزید حماقتوں کی اجازت طلب

فرما رہے ہیں؟''

''بعض باتیں شروع میں حماقت لگتی ہیں۔'' شامی نے اصرار جاری رکھا تو نواب صاحب سوچ میں پڑ گئے پھر انہوں نے سر ہلایا۔

''ٹھیک ہے لیکن واحد شرط یہ ہے کہ آپ کسی طرح بھی ان لوگوں کے پاس نہیں جائیں گے اور جو کچھ معلوم ہوگا وہ پہلے ہمارے علم میں لائیں گے، اپنے طور پر کوئی قدم نہیں اٹھائیں گے۔''

شامی خوش ہوگیا۔ ''سر آنکھوں پر دادا جان۔''

باہر نکل کر تیمور نے پہلے تو سکون کا سانس لیا اور پھر بولا۔ ''اب تو کیا گل کھلانے کا ارادہ رکھتا ہے؟''

''بس ایک خیال میرے ذہن میں آیا ہے۔ ایک بات بتا تجھے افسر یاد ہے؟''

تیمور چونکا۔ ''زوار صاحب کا بیٹا... نہیں یار اسے گئے ہوئے بھی دس سال ہوگئے ہیں اور ہمارا اس سے کون سا ملنا جلنا تھا۔ بس ایسے ہی سامنا ہو جاتا تھا۔''

''درست فرمایا۔'' شامی نے کہا۔ ''صرف تجھے ہی نہیں شاید اس علاقے میں رہنے والے کسی فرد کو بھی افسر یاد نہ ہو کیونکہ وہ روکھا آدمی تھا اور کسی سے ملنا جلنا نہیں تھا۔''

تیمور نے اسے غور سے دیکھا۔ ''تجھے افسر کیوں یاد آگیا؟''

''بس ایک خیال آگیا۔'' شامی نے پُراسرار انداز میں کہا اور اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ اگلے روز اس کا سارا دن ہی شاہنواز کے ساتھ گزرا تھا۔ وہ شام بلکہ رات کے وقت واپس آیا تھا۔ ڈنر بس شروع ہوا تھا اور شامی جس بے تابی سے شریک ہوا، ایسا لگ رہا تھا کہ اسے دن میں کھانے کا موقع نہیں ملا تھا۔ تیمور دفتر سے سیدھا گھر آیا تھا اور شامی کا انتظار کرتا رہا تھا۔ فولاد خان اپنی چوکی میں تھا اور اپنی محبت کی جواں مرگی کا سوگ منا رہا تھا۔ تیمور نے اس سے تعزیت کی تو اس نے کہا۔

''اگر نواب صیب کا خیال نہ ہوتا تو ام یہ سوگ کسی اور طرا سے مناتا۔''

ڈنر مکمل کرتے ہی شامی نے نواب صاحب سے بات کرنے کی اجازت چاہی۔ انہوں نے اپنی اسٹڈی میں بلالیا۔ ایسی گفتگو وہ وہیں کرتے تھے جس سے وہ ملازموں کو بھی بے خبر رکھنا چاہتے تھے۔ البتہ بات شروع کرنے سے پہلے انہوں نے الائچی والا قہوہ منگوالیا تھا جو وہ کھانے کے بعد لیتے تھے۔ باورچی کے باہر جانے کے بعد انہوں نے شامی سے کہا۔ ''فرمایئے آپ کیا تیر چلا کر آئے ہیں؟''

''دادا جان۔'' شامی نے سنسنی خیز لہجے میں کہا۔ ''قادر بخش اصل میں زوار صاحب کا بیٹا افسر ہے۔''

نواب صاحب چونک اٹھے۔ ''آپ پورے وثوق سے کہہ رہے ہیں؟''

''جی دادا جان، نہ صرف وہ افسر ہے بلکہ افسر باہر نہیں بلکہ اندر گیا تھا۔ گیارہ سال پہلے وہ ایک عشرت گاہ میں ایک لڑکی کو قتل کرنے کے جرم میں گرفتار ہوا تھا۔ زوار صاحب نے اپنی دولت اور اثر ورسوخ استعمال کر کے اس خبر کو منظرِ عام پر آنے سے روک دیا تھا اور افسر کے بارے میں مشہور کر دیا کہ وہ بیرونِ ملک چلا گیا ہے۔ وہ خاموشی سے اس کا مقدمہ لڑتے رہے اور ان کی کوششوں کے باوجود وہ بری نہ ہو سکا۔ ان کا ایک با اعتماد وکیل اس کا مقدمہ لڑتا رہا۔ افسر کو سزائے موت ہوئی مگر وکیل نے اپنی چالاکی سے کئی سال اپیلوں میں گزار دیے اور جب تک اس کی آخری اپیل بھی مسترد ہوئی تو ملک میں سزائے موت پر عمل درآمد روک دیا گیا۔ زوار صاحب اکلوتے بیٹے کے غم میں دنیا سے گزر گئے تو بیگم زوار نے ان کی جگہ سنبھال لی۔ انہوں نے افسر کو جیل سے بھگانے کا سوچا۔ انہوں نے دولت کا بے دریغ استعمال کیا اور افسر کو پہلے جیل سے اسپتال منتقل کرایا اور پھر اسے بیماری کے باعث فوت دکھا کر اس کی جگہ کسی اور کی لاش افسر قرار دے کر دفنا دی گئی۔ خدا ہی جانتا ہے کہ بیگم زوار نے اس پر کتنا پیسہ خرچ کیا۔''

''یہ سب آپ کے علم میں کیسے آیا؟''

''بیگم زوار جس طرح قادر بخش یعنی افسر کی پشت پناہی کر رہی تھیں، مجھے خیال آیا کہ ایسا کوئی صرف اپنی اولاد کے لیے کر سکتا ہے۔ افسر نے انہیں قتل کرنے کی کوشش بھی کی۔ اس کے باوجود وہ اسے بچا رہی تھیں۔ میرے پاس قادر بخش کی تصویر اور شناختی کارڈ کی کاپی تھی۔ کاپی جعلی نکلی یعنی یہ شناختی کارڈ کسی اور قادر بخش کا تھا۔ البتہ تصویر اصلی تھی۔ پہلے شاہنواز نے اسے کرمنل ریکارڈ سے چیک کرایا تھا۔ مگر وہاں اس کا ریکارڈ نہیں تھا۔ لیکن جب نادرا سے اس کی میچنگ کرائی تو یہ تصویر افسر کی نکلی۔ ریکارڈ کے مطابق اس کا شناختی کارڈ ایکسپائر ہوگیا تھا اور اس نے ری نیو نہیں کرایا تھا۔ اس کے بعد پاسپورٹ آفس سے تصدیق کی گئی تو وہاں اس کا پاسپورٹ بھی ایکسپائر نکلا۔ دوسرے لفظوں میں وہ نہ تو ملک سے باہر گیا تھا اور نہ ہی اس نے پاسپورٹ استعمال کیا تھا۔ اس پر جیل کا خیال آیا اور جب شاہنواز نے

جیل کا ریکارڈ چیک کرایا تو حیرت انگیز طور پر افسر ولد زوار جیل کا مردہ قیدی ثابت ہوا۔ وہاں سے اس کا ریکارڈ حاصل کیا گیا اس میں اس کے فنگر پرنٹ بھی شامل ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں اس کی تصاویر۔'' شامی نے انلارج کی ہوئی تصاویر نواب صاحب کے سامنے رکھیں۔ اگرچہ افسر نے حلیہ خاصا بدل لیا تھا اور پھر عمر بھی دس سال زیادہ ہوگئی تھی مگر وہ اپنے خدوخال نہیں بدل سکتا تھا۔

''یہ وہی ہے۔'' نواب صاحب نے تصدیق کی۔ ''مگر سوال یہ ہے کہ ان لوگوں نے یہ چکر کیوں چلایا؟''

''یہ ساری معلومات تو میں بارہ بجے تک حاصل کر چکا تھا۔'' شامی نے تصویروں کی طرف اشارہ کیا۔ ''اس کے بعد اس چکر کے بارے میں جاننے میں دیر لگی۔ رجسٹرار آفس کے ریکارڈ کے مطابق بیگم زوار اپنی تمام جائداد فروخت کر چکی ہیں۔ یہ بنگلا بھی جس میں وہ مقیم ہیں اور اب ان کی حیثیت کرائے دار کی ہے وہ بھی صرف چھ مہینے کے لیے۔ اس مہینے کے آخر میں اسے بھی خالی کرنا ہے۔ ایک بات اتفاق سے علم میں آئی اور اسی سے کڑیاں مل گئیں۔ میں اس اسپتال گیا جہاں بیگم زوار کو افسر لے گیا تھا اور وہاں سے مجھے پتا چلا کہ بیگم زوار دل کی ایک خاص بیماری میں مبتلا ہیں جس میں دل مسلسل کمزور ہوتا جاتا ہے اور بالآخر ایک دن بند ہو جاتا ہے اس کا واحد علاج دل کی تبدیلی ہے مگر بیگم زوار نے یہ علاج نہیں آزمایا اور ڈاکٹرز کے مطابق ان کے پاس اب زیادہ مہلت نہیں رہی تھی۔''

تیمور جو خاموشی سے سن رہا تھا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ زوار بیگم نے اپنے قتل کا فیصلہ خود کیا تھا کیونکہ افسر ہچکچا رہا تھا۔''

''ایسا ہی لگتا ہے۔'' شامی نے گہری سانس لی۔ ''اور یہ سب انہوں نے افسر کو بچانے کے لیے کیا تھا۔ وہ اسے ہمیشہ چھپا کر نہیں رکھ سکتی تھیں اور اس کے ساتھ کہیں جا نہیں سکتی تھیں۔ انہوں نے محسوس کیا کہ وہ افسر کے پیروں کی زنجیر بن گئی ہیں۔ اس لیے انہوں نے مرنے کا فیصلہ کیا۔ اس قتل کا الزام ہمارے سر آتا۔ فولاد خان بے گناہ پکڑا جاتا۔'' شامی نے نواب صاحب کے سامنے کھل کر کہنے سے گریز کیا۔ ''افسر اور گل نار مظلوم بن جاتے اور پولیس ان کی طرف دھیان نہیں دیتی۔ معاملہ کلیئر ہوتے ہی وہ دولت سمیٹ کر یہاں سے نکل جاتے اگرچہ یہ خاصا عجیب اور پیچیدہ سا منصوبہ تھا اور اس کے خدوخال سے لگ رہا ہے کہ اسے کئی افراد نے مل کر بنایا ہے۔''

نواب صاحب نے کچھ دیر بعد کہا۔ ''اگرچہ یہ ایک مفروضہ ہے مگر حقائق کی کڑیوں پر پورا اتر رہا ہے۔''

شامی خوش ہو گیا۔ ''آپ کی شرط کے مطابق میں..... ان لوگوں کے نزدیک بھی نہیں گیا۔ اب آپ کو فیصلہ کرنا ہے۔''

نواب صاحب سوچتے رہے اور ٹہلتے رہے۔ سنتے ہوئے ان کا دھیان قہوے کی طرف بھی نہیں رہا تھا اور وہ ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ کشمکش میں تھے کہ کیا کریں۔ خاصی دیر بعد بالآخر انہوں نے رک کر شامی اور تیمور کی طرف دیکھا۔ ''اگرچہ ہم خود اسی طبقے سے تعلق رکھتے ہیں مگر ہم بھی نہیں سوچ سکتے کہ ایک انسان اپنے مفاد کے لیے کہاں تک جا سکتا ہے۔ بیگم زوار اولاد کی محبت میں مجبور نکلیں مگر بہرحال یہ جرم ہے۔ شاہنواز کو کال کرو۔ ہم اس سے بات کریں گے۔''

☆☆☆

شامی اور تیمور لان میں تھے۔ فولاد خان نزدیک ہی کھڑا تھا۔ شامی نے اصل میں فولاد خان کو بتانے کے لیے یہ محفل جمائی تھی۔ وہ زیادہ دیر کے لیے گیٹ سے دور نہیں ہٹ سکتا تھا۔ شامی نے کہا۔ ''دو دن پہلے پولیس نے چھاپا مارا اور افسر عرف قادر بخش کو گرفتار کرلیا۔ بیگم زوار اور گل نار کو عنایت مجرمانہ پر گرفتار کیا کیونکہ انہوں نے...... پھانسی گھاٹ سے فرار ایک مجرم کو چھپایا ہوا تھا۔ بیگم زوار کی عمر اور بیماری کے پیشِ نظر ان کی ضمانت ہو گئی ہے لیکن گل نار پولیس کی تحویل میں ہے۔''

''وہ اس قابل اے۔'' فولاد خان نے جذباتی ہو کر کہا۔ ''ام خوش اوگا جب وہ قادر بخش کے سات سولی پر لٹکے گا۔''

''اسے سزائے موت نہیں ہوگی۔'' شامی نے فولاد خان کو آگاہ کیا۔ ''ہاں شاید چند سال جیل میں گزارنا پڑیں۔''

''اچا۔'' وہ مایوسی سے بولا۔ ''خیر تین چار سال کا جیل بی کم خوفناک نئیں اوتا اے۔ امارا ایک چاچا دوسرے چاچا کو قتل کر کے جیل گیا اور دو سال میں مر گیا۔''

''اسے کیا ہوا تھا؟'' شامی نے چونک کر پوچھا۔

''سولی کا سزا۔'' فولاد خان نے اطمینان سے کہا اور گیٹ کی طرف چلا گیا۔ شامی اور تیمور ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئے اور پھر ہنس دیے۔